مہاتما گاندھی

منصف

بی۔ آر۔ نندا

مترجم

علی جواد زید

وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025

سنہ اشاعت :
پہلا اڈیشن : 1986
دوسرا ایڈیشن : 2002 تعداد 1100
قیمت : =/54
سلسلہ مطبوعات : 526

Mahatma Gandhi

By: B.R. Nanda

Translator: A.J.Zaid

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
~~فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com~~
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد، دہلی۔110006

فہرست

دیباچہ مترجم

مہاتما گاندھی کو جس نسل نے مصروف عمل دیکھا ہے اور جن کی قیادت میں چلنے والی تحریکوں میں خود عملی حصہ لیا ہے، ان میں یہ راقم الحروف بھی ہے۔ اسی لیے ایک جذباتی لمحے میں، میں نے اس کے ترجمے کی پیش کش قبول کر لی تھی، ورنہ اپنی بے شمار مشغولیتوں میں تراجم کے لیے وقت نکالنا تقریباً ناممکن تھا۔ وہی جذباتی وابستگی اس کام کو تکمیل کی منزل تک لے آئی۔ معاصر تاریخ کی یہ عظیم الشان شخصیت اپنی مثال آپ تھی۔ ہم نوجوانوں میں اکثر گاندھی جی کے نظریات سے پورا اتفاق کبھی نہ کر پاتے تھے لیکن پھر بھی، قومی تحریک کے سب سے بڑے سربراہ کی حیثیت سے ہم ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ ہمارا ایشیائی ذہن اہنسا کے بنیادی اصول سے متفق ہوتے ہوئے بھی اسے مستثنیات سے بالاتر نہیں سمجھتا تھا۔ اقتصادی مسائل میں ہم سائنس اور ٹکنالوجی سے پورا فائدہ اٹھانے کے حامی تھے اور تاریخی عوامل کی اثر انگیزی کے قائل تھے۔ نوجوانوں اور طالب علموں نے اپنے ذہنی تحفظات اور شکوک کے باوجود گاندھی جی کی تحریکوں میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے، وہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

اسی طرح تحریک خلافت کے علاوہ، پوری تحریک آزادی میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کا جو تاریخی کردار رہا ہے اور جس کے ڈانڈے 1857 کی تحریک آزادی سے ملتے

ہیں، اس کے ناپنے کا پیمانہ صرف مسلم لیگ اور وہ بھی ایک خاص دور کی مسلم لیگ کی سیاست نہیں ہوسکتی، کیوں کہ خدائی خدمت گار، جمیعتہ علمائے ہند، جموں وکشمیر نیشنل کانفرنس، مجلس احرار، مومن کانفرنس اور شیعہ پولیٹکل کانفرنس جیسی جماعتیں قومی تحریکوں میں پورا عملی حصہ لے رہی تھیں۔ اسی طرح بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مسلمان مجاہدین آزادی نے مہاتما اور ان کے رفقا کو جو تعاون دیا ہے وہ بھی مثالی ہے۔ اس تعاون کو صرف تعداد یا ایک طبقے کے خاص سیاسی رجحان سے تولنا درست نہ ہوگا۔ فرقہ پرستی کو برطانوی سامراج اور مفاد پرست عناصر جس طرح ہوا دے رہے تھے اور پس پردہ اور کھلم کھلا افتراق کی کوششوں میں مصروف تھے، اس سے بھی مورّخ صرف نظر نہیں کرسکتا۔ ان حالات میں گاندھی جی کے روحانی حربے نے جو نمایاں کام کیے ہیں، وہ تاریخ ساز ہیں اور فرقہ واریت کی چوطرفہ لڑائی اور چھوت چھات سے مسلسل جنگ ایک مستقل ''شاہنامہ'' چاہتی ہیں۔

گاندھی جی کے رفقا میں بہت سے نمایاں افراد تھے۔ ان میں سرفہرست جواہر لال نہرو تھے جن سے گاندھی جی اپنے سیاسی جانشین کی طرح پیار کرتے تھے۔ جواہر لال نہرو بائیں اور اپنے داہنے بازووں کے درمیان رابطے کا پُل تو تھے ہی، انھوں نے اشتراکی تصورات کو گاندھی جی کے اہنسائی تصورات سے جس طرح ہم آہنگ کیا تھا، وہ مزید توجہ کا طالب ہے۔ نہرو کے علاوہ سردار ولبھ بھائی پٹیل، سی۔ آر داس، خان عبدالغفار خاں، مولانا محمد علی، پنڈت مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالباری، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر راجندر پرشاد وغیرہ۔ یہ ایک طویل قافلہ تھا۔ ہر سوانح نگار کے لیے یہ مشکل کام ہے کہ وہ ایک مختصر سی جلد میں اِن سبھی افراد اور اداروں کو سمیٹ سکے، لیکن اگر پورے مجمع کے اجتماعی تعاون پر نظر نہ رکھی جائے تو بعض اوقات پڑھنے والوں کے ذہنوں پر افراد بلکہ اداروں تک کے بارے میں غلط تاثر قائم ہونے کا امکان رہتا ہے۔

مصنف نے انگریزی کی روایت کے مطابق گاندھی جی کے نام کے ساتھ 'جی' کا اضافہ نہیں کیا ہے۔ 'مہاتما' کا استعمال بھی ان کی شان میں کم ہی ہوا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت بار بار میرے جی میں آیا کہ اردو ترجمے میں تو گاندھی جی، ہی لکھوں لیکن پھر مترجمانہ صحت پسندی راہ میں حائل

ہوئی اور میں نے انگریزی ہی کی پیروی کی ہے تاکہ اصل کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔

لائق مصنف، جناب بی آر نندا نے نہایت لطیف اور رواں زبان میں ایک متوازن سوانح عمری لکھی ہے۔ اختصار کے باعث اس میں بعض پہلو تشنہ رہ گئے ہیں اور بعض شخصیتوں مثلاً جواہر لال نہرو، خان عبدالغفار خاں اور مولانا آزاد کا حیات گاندھی سے جو گہرا معنوی اور تاریخی رشتہ رہا ہے وہ پوری طرح ابھر کر سامنے نہیں آیا ہے اور اسی طرح اختلافات نظر کے باوجود نوجوانوں، اقلیتوں بلکہ مخالفوں کا گاندھی جی کے ساتھ جو احترام وعقیدت کا رویہ رہا ہے وہ بھی واقعات وتصریحات کے ہجوم میں کچھ دب سا گیا ہے پھر بھی یہ بات بے تامل کہی جاسکتی ہے کہ نندا صاحب نے واقعات کو جس چابک دستی سے یک جا کیا ہے اور جس مہارت سے ترتیب دیا ہے وہ سوانحی ادب میں ایک کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ سوانح عمری پورے دور کے عزائم وحوادث کی ایک دل نشیں داستان بن گئی ہے یقیناً یہ بہترین سوانح عمریوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ جن دوچار باتوں کی طرف میں نے مبہم اشارے کیے ہیں ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ قاری یہ نہ سمجھ لے کہ مترجم بھی مصنف کے تجزیہ وتفسیر کے ہر پہلو سے متفق ہے۔

علی جواد زیدی

پہلی فصل

تشکیلی دور

باب 1

بچپن

ہیڈ ماسٹر نے رجسٹر سے نظر اوپر اُٹھائی اور چودہ سال کے بچے کو کڑی نگاہ سے دیکھا، جو اُن کے سامنے پیش ہوا تھا۔ پھر بولے: ''تم سنیچر کو جمناسٹک کی کلاس سے غیر حاضر کیوں تھے؟''

''میں پتا جی کی تیمار داری کر رہا تھا۔'' بچے نے جواب دیا، ''میرے پاس گھڑی نہیں تھی اور اَبر کی وجہ سے مجھے دھوکا ہو گیا۔ جب میں پہنچا تو سب بچے جا چکے تھے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' ہیڈ ماسٹر نے ترش ہو کر جواب دیا۔

یہ 1883 کی بات ہے اور واقعہ مغربی ہندوستان کی ایک چھوٹی سی ریاست راجکوٹ کا ہے۔ الفریڈ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر، دوراب جی ایدل جی کی ڈسپلن کے معاملے میں سخت تھے۔ انھوں نے اونچے درجے کے طالب علموں کے لیے کھیل لازمی قرار دیا تھا، اور غیر حاضری کے بارے میں کوئی عذر سننے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ یہ بچہ موہن داس گاندھی تھا۔ اس کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ اس پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا جائے۔ وہ بے بسی میں رو پڑا۔ اسے اپنی سچائی پر یقین تو تھا لیکن سوال یہ تھا کہ ہیڈ ماسٹر کو مطمئن کیسے کیا جائے۔ اس واقعے پر غور کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ''سچے آدمی کو محتاط بھی ہونا چاہیے۔'' اس نے یہ بات دل میں ٹھان لی کہ وہ آئندہ

ایسی صورتِ حال کبھی پیدا نہ ہونے دے گا کہ اس کے جواب کو جھوٹ کہہ کر ٹال دیا جائے۔

اُس نے نہ تو کلاس ہی میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل کی نہ کھیل کے میدان میں۔ خاموش، شرمیلا اور گوشہ گیر ہونے کی وجہ سے وہ دوسروں کی صحبت میں زبان بند کیے رہتا۔ اسے اس کی پروانہ تھی کہ لوگ اسے اوسط درجے کا طالب علم سمجھیں گے لیکن اپنے نام کی بڑی لاج تھی۔ اسے اس پر ناز تھا کہ اس نے اپنے استادوں یا ساتھیوں سے کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ اگر اس کے کردار پر ذرا بھی شک کیا جاتا تو اس کے آنسو نکل پڑتے۔

چودہ برس کے بچے کا اخلاقی معاملے میں اتنا حساس ہونا شاید قبل از وقت معلوم ہو لیکن یہ گاندھی خاندان کی روایت کا ایک جز و تھا۔ موہن کے والد کرم چند، اور دادا اتم چند ایمان داری اور راسخ العقیدگی کے لیے مشہور تھے۔

گاندھی خاندان والے قوم کے بنئے تھے۔ کرانے کا کاروبار کرتے تھے اور جوناگڑھ ریاست میں واقع کٹیانا کے رہنے والے تھے۔ گاندھیوں میں ایک مہم پسند شخصیت، ہرجیون گاندھی نے 1977 میں پور بندر میں ایک مکان خریدا تھا اور ان کے بچے کاروباریوں کی طرح رہنے لگے تھے۔ لیکن یہ خاندان نمایاں اُس وقت ہوا جب ہرجیون گاندھی کے ایک بیٹے اتم چند نے راناکھیما جی، والی پور بندر، کو کچھ ایسا متاثر کیا کہ وہ ریاست کے دیوان بنادیے گئے، کاٹھیاواڑ (گجرات) کی لگ بھگ تین سو ریاستوں میں پور بندر بھی ایک تھی ان ریاستوں پر وہ راجے راج کرتے تھے جو اتفاق سے حکمراں خاندانوں میں پیدا ہو گئے تھے اور جن کے تخت و تاج انگریزوں کا اقتدار اعلیٰ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ کاٹھیاواڑ کا نظام جاگیردارانہ تھا اور سیاسی اعتبار سے بھی یہ علاقہ پچھڑا ہوا تھا لیکن وہ اس اصلاحی دھارے سے الگ نہیں تھا جس کی بدولت بھارت کی بنیادی وحدت صدیوں سے برقرار رہی ہے۔ ہندوستان کے بعض مشہور تیرتھ استھان گجرات ہی میں واقع ہیں۔ بالکل مغرب میں دوارکا ہے جو کرشن جی کی زندگی اور موت سے نسبت رکھنے کی بنا پر متبرک ہو گیا ہے، اور وہاں سومناتھ کا تاریخی مندر بھی ہے۔ مہاتما بدھ، مہاویر جی اور ولبھ آچاریہ سبھی کی تعلیمات میں اس مشترک نقطے پر زور دیا گیا ہے کہ ہر ذی روح متبرک ہے۔ میرا بائی کے گیتوں اور نرسنگھ مہتا کی نظموں سے بھی یہاں کے لوگوں کو تحریک ملی ہے۔ گجرات ہمیشہ

اپنے مہم پسند تاجروں کی وجہ سے مشہور رہا ہے اور اس کے علاوہ وہ سماجی اور مذہبی مصلحوں کی بھی جنم بھومی رہی ہے۔ انھیں میں سوامی دیانند بھی تھے۔ جو اصلاح یافتہ ہندومت کے پیغامبر تھے وہ کرم چند کے ہم عصر تھے۔ گجراتی کردار میں ایک طرح کی مستقل مزاجی ہے جو تبلیغی جذبے سے مل کر ہر رکاوٹ کو بہالے جاتی ہے۔ غالباً یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ گاندھی اور جناح۔ جنھوں نے مختلف حیثیتوں سے اس صدی کی ہندوستانی تاریخ کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ دونوں کی رگوں میں گجراتی خون دوڑ رہا تھا۔

اُن دنوں کسی دیسی ریاست کا دیوان ہونا چین آرام کا عہدہ نہیں تھا۔ متلون مزاج ہندوستانی راجاؤں، اقتدار اعلیٰ کے فرعون صفت برٹش پولیٹیکل ایجنٹوں اور مظلوم رعایا کے درمیان اپنی راہ نکال کر بحفاظت گزر جانے کے لیے اعلیٰ درجے کی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی کی ضرورت پڑتی تھی۔ اتم چند گاندھی بے انتہا ذہین وزیر ثابت ہوئے اور انھوں نے پوربندر کو اس بدنظمی اور دیوالیہ پن کی دلدل سے باہر نکالا جس میں یہ ریاست پھنس گئی تھی۔ ان کی بدقسمتی سے رانا کھیما جی، جوانی ہی میں چل بسے اور قائم مقام رانی کے ہاتھوں میں جب حکومت کی باگ ڈور آئی تو وہ دیوان کی ایمانداری اور حریت کی قدر نہ کرسکی چنانچہ جب کوٹھاری نامی ایک چھوٹے مگر ایماندار افسر خزانہ ریاست نے قائم مقام رانی کی بات ماننے سے انکار کیا تو ناگزیر طور پر ٹکراؤ ہوا۔ غضب؟ ناک رانی نے اپنے وزیر اعظم کے گھر کا محاصرہ کر کے اس پر گولہ باری کرنے کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجا۔ ان گولیوں کے نشان، گاندھیوں کے موروثی مکان پر مدتوں باقی رہے۔ خوش قسمتی سے جب برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کو اس فوجی کارروائی کا علم ہوا تو اس نے رکوادیا۔ اتم چند پوربندر کو چھوڑ کر جونا گڑھ ریاست میں واقع اپنے آبائی گاؤں چلے گئے۔ وہاں کے نواب مہربانی سے پیش آئے۔ لیکن دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے نواب کو بائیں ہاتھ سے سلام کیا تھا۔ جب ان سے اس بے ادبی کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اُن پر جو کچھ بھی بیتی ہے اس کے باوجود، وہ اپنا داہنا ہاتھ پوربندر کو رہن کر چکے ہیں۔ دربار کے آداب کی خلاف ورزی کے جرم میں انھیں دس منٹ تک سزا کے طور پر دھوپ میں ننگے پاؤں کھڑا کرایا گیا لیکن نواب میں یہ جاگیردارانہ آن بھی تھی کہ انھوں نے اتم چند کی وفاداری کو سراہا اور ان کو اور ان

کے ورثا کو یہ رعایت دے دی کہ اگر وہ اپنے گاؤں میں تجارت کا پیشہ اختیار کریں تو ان سے کسٹم ڈیوٹی (محصول) نہیں لی جائے گی۔

جب قائم مقام رانی کا دور حکومت ختم ہوا اور رانا وکرم جیت تخت پر بیٹھے تو اتم چند کو پور بندر کے دیوان کی حیثیت سے واپس لانے کی کوشش کی گئی۔ان کے انکار پر 1847 میں یہ عہدہ ان کے پچیس سالہ بیٹے کرم چند کو تفویض ہوا۔انھوں نے دیوان کی حیثیت سے اٹھائیس برس کام کیا۔ اپنے والد ہی کی طرح کرم چند بھی کھرے سچے اور بے خوف وزیر تھے اس لیے ایسا بھی ایک وقت آیا کہ والی ریاست ان سے ناراض ہو گئے انھوں نے وزارت اپنے بھائی تلسی داس کو سونپی اور خود راجکوٹ جا کر وہاں دیوان بن گئے۔اُسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ انھوں نے اسٹنٹ برٹش پولیٹکل ایجنٹ کو اس کی اس حرکت پر ڈانٹ دیا تھا کہ اس نے والی راجکوٹ کی شان میں کچھ گستاخانہ باتیں کہی تھیں۔انھوں نے گرفتار ہو جانا قبول کر لیا لیکن برطانوی ایجنٹ سے معافی مانگنے پر راضی نہ ہوئے۔یہ افسر ایک ہندوستانی وزیر کی یہ ناقابل تسخیر جرأت دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا اور اس نے انھیں چھوڑ دینا ہی بہتر جانا۔

کرم چند نے چار شادیاں کیں۔تین بیویوں کی موت یکے بعد دیگرے ہوئی۔چوتھی بیوی پتلی بائی اپنے شوہر سے بیس سال چھوٹی تھیں۔ان سے تین بیٹے ہوئے:لکشمی داس (کلا) کرسن داس (کرسینا) اور موہن داس (موہنیا) اور ایک بیٹی رلیتا بہن (گوکی) جو تینوں بھائیوں کے بعد تک زندہ رہیں۔پہلی بیویوں سے بھی کرم چند کے دو بیٹیاں تھیں۔

سب سے چھوٹے بیٹے موہن داس (مستقبل کے مہاتما) کی ولادت 2 اکتوبر 1869 کو ہوئی۔جب کرم چند پور بندر کے وزیر اعظم تھے تب بھی وہ اپنے سہ منزلہ آبائی مکان میں اپنے پانچوں بھائیوں اور ان کے بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔جو حصہ مکان انھیں ملا تھا وہ نچلی منزل میں تھا اور اس میں چھوٹے سے رسوئی گھر اور برآمدے کے علاوہ دو کمرے تھے،ایک تیس فٹ لمبا اور تیرہ فٹ چوڑا اور دوسرا پندرہ فٹ لمبا اور بارہ فٹ چوڑا۔اسی مکان میں اپنے بھائیوں، بہنوں اور بہت سے چچاؤں اور چچیرے بھائیوں کے درمیان موہن داس گاندھی پلے اور بڑھے۔شہر پور بندر کی گلیاں تنگ اور بازار گنجان ہیں۔اس کے چاروں طرف چوڑی فصیل ہے جو امتداد زمانہ

سے بہت کچھ گرگئی ہے۔ بحرِ عرب سے یہ شہر پتھر پھینکنے کے فاصلے پر ہے۔ فنِ تعمیر کے لحاظ سے عمارتوں میں کوئی امتیازی شان نہیں ہے لیکن یہ ایسے سفید اور نرم پتھر کی بنی ہیں جو زمانہ گزرنے پر اور سخت ہوتا جاتا ہے اور دوپہر کی دھوپ میں سنگ مرمر کی طرح چمکتا ہے۔ اسی کی بدولت اس شہر کو ''سفید شہر'' کا لقب ملا ہے۔ سڑکوں پر جابجا مندر بنے ہیں۔ گاندھیوں کا آبائی مکان بھی دو مندروں کے اِردگرد ہے۔ اس بندرگاہ کی زندگی کا بنیادی مرکز سمندر کا ساحل ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں بیسیوں خاندان ایسے تھے جو سمندر پار کے ملکوں کا کاروبار کرتے تھے۔ انھیں میں سے ایک خاندان م۔ک گاندھی کے جنوبی افریقہ سے تعارف کا وسیلہ بنا۔

جب موہن سات سال کے ہوئے تو ان کے ماں باپ راج کوٹ سے ایک سو بیس میل دور پورب میں چلے گئے۔ اگرچہ پوربندر سے خاندانی تعلقات قائم رہے لیکن اب راج کوٹ ہی گاندھیوں کا دوسرا وطن ہو گیا۔ راج کوٹ میں گورتیلا ساحل (بیچ) نہیں تھا جہاں جا کر بچے کھیل سکتے۔ یہاں سفید شہر کا خوبصورت منظر بھی نہیں تھا لیکن سیاسی اور سماجی اعتبار سے یہ کم پچھڑا ہوا تھا اور یہاں تعلیم کی سہولتیں بھی زیادہ تھیں۔ موہن نے پوربندر کے ایسے پرائمری اسکول میں تعلیم پائی تھی جہاں بچے اپنی انگلیوں سے زمین پر حروفِ تہجی لکھنے کی مشق کرتے تھے۔ راجکوٹ کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ وہاں ایک ہائی اسکول بھی ہے۔

موہن کی ماں پتلی بائی ایک لائق خاتون تھیں۔ راجہ کے محل سرا کی خواتین سے دوستی کی بنا پر درباری حلقوں میں ان کی اہمیت تسلیم کی جاتی تھی۔ اُن کی دلچسپیوں کا اصلی محور اُن کا گھر تھا۔ گھر میں کوئی بیمار پڑتا تو وہ تیمارداری میں اپنے کوتھکا ڈالتیں۔ ان میں آرائش اور زیور کی وہ عام کمزوری نہ تھی جو اُن کے عہد اور طبقے کی عورتوں کا خاصہ تھی۔ اُن کی زندگی منتوں اور برتوں کا ایک اٹوٹ سلسلہ تھی۔ ان کا کمزور جسم یہ سب مرحلے عقیدے کے بل بوتے پر جھیل لیا کرتا تھا۔ انھوں نے اپنا وقت گھر اور مندر کے درمیان بانٹ رکھا تھا اور دونوں ہی جگہ بچے ان سے لپٹے رہتے تھے۔ ان کی منتوں اور برتوں کو دیکھ کر بچے محوِ حیرت ہوتے اور ان میں وہ اپنے لیے بھی دلکشی کا سامان پاتے۔ انھیں مذہبی کتابوں کا زیادہ گیان نہیں تھا۔ ٹوٹی پھوٹی گجراتی جاننے کے سوا، وہ تقریباً اَن پڑھ تھیں۔ مذہبی معلومات یا تو انھیں گھر سے حاصل ہوئی تھیں یا مذہبی جلسوں میں تقریریں سن کر۔ وہ

مذہبی خیالات میں کٹر بلکہ تو ہم پرست تھیں۔ بچوں کا اچھوتوں کو چھونا یا چندر گرہن دیکھنا انھیں گوارا نہ تھا۔ دوسرے بچوں کے مقابلے میں موہن میں ذوق تجسس زیادہ تھا، وہ جرحی سوالات کرتے رہتے۔ گھر کے بھنگی اوکا کو چھونے سے کوئی کیسے نجس ہوجاتا ہے؟ دیکھنے والے کو چاند گہن کیا نقصان پہنچا سکتا ہے؟ ماں کے جواب ہمیشہ تسلی بخش نہ ہوتے لیکن اس تشکیک کے باوجود انھیں ماں سے بے حد وابستگی تھی اور انھیں زندگی بھر اس رشتے کی استواری کا احساس رہا ''جب وہ اپنی ماں کے بارے میں بات کرتے ہیں تو اُن کی آواز میں نرمی آجاتی ہے۔'' یہ بات ان کے بارے میں ایک مبصر نے 1908 میں لکھی تھی جب موہن انتالیس برس کے ہو چکے تھے ''اور ان کی آنکھوں میں محبت کی چمک پیدا ہوجاتی ہے۔'' موہن کے ذوق تجسس کو عنفوانِ شباب کے پوشیدہ الحاد کی طرف دوڑ جانے سے وہ روک تو نہ پائیں لیکن ان کے اتھاہ پیار، ختم نہ ہونے والے ترکِ لذات اور فولادی قوتِ ارادی نے بچے کو مستقل طور سے متاثر کیا۔ ایک ایسے شخص کے لیے جس کی زندگی فتح نفس کی ایک طویل جدوجہد تھی اور جس کی لڑائیاں انسانی دلوں میں لڑی اور جیتی جانے والی تھیں۔ یہ صفات لازوال تحریک کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔۔ پتلی بائی کے زیر سایہ انھیں عورت کو جو تصور ملا وہ محبت اور قربانی کا تھا۔ ماں کی مامتا کا ایک حصہ انھوں نے بھی اپنا لیا۔ وہ جیوں جیوں بڑھتے گئے اس ممتا کا دھارا بھی آگے بڑھتا رہا۔ اس دھارے میں خاندان اور فرقے کی حدیں توڑ ڈالیں اور رفتہ رفتہ ساری انسانیت اس کے گھیرے میں آگئی۔ موہن کی اپنی ماں کی صرف تیمارداری کا قوی جذبہ ہی نہیں ملا جس کے زیر اثر وہ اپنے آشرم میں کوڑھیوں کے زخم دھویا کرتے تھے بلکہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کا دل موہ لینے کے طریقے کی بھی تحریک ملی۔ یہ وہی طریقہ تھا جسے مائیں اور بیویاں اس زمانے سے آزماتی رہی ہیں جس کی ابتداء کسی کو یاد نہیں ہے۔

موہن کے باپ کو نصابی تعلیم کم ملی تھی لیکن انسانوں اور دنیاوی معاملوں کا تجربہ بہت تھا اپنے بیٹے کے لفظوں میں ''وہ اپنے خاندان کے عاشق، راست گو، اور فیاض تھے۔'' انھیں پیسے جمع کرنے کا شوق نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے بچوں کے لیے کوئی قابل ذکر جائیداد نہیں چھوڑی۔ ان کے گھر میں ''رامائن'' اور ''مہابھارت'' کا برابر ورد ہوتا تھا اور کبھی کبھی جین منیوں اور پارسی اور مسلم عالموں سے مباحثے بھی ہوتے تھے۔ لیکن کرم چند کی نظر میں مذہب بیشتر، پابندی رسوم، کے

مترادف تھا۔ باسٹھ سال کی عمر میں بیٹے کے ذہن میں باپ کی یہ یاد محفوظ تھی ''تم مجھ میں جو خلوص وصفات دیکھتے ہو، وہ میری ماں کا عطیہ ہے، باپ کا نہیں۔''(1)

کرم چند اور ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کے درمیان جو نصف صدی کا فاصلہ تھا اس کی وجہ سے باپ ایک شفیق ساتھی کے بجائے قابل احترام و تعظیم ہستی بن گیا تھا۔ اس ذہنی فضا میں بچے نے ''شردن پرتی بھکتا'' نامی قدیم ناٹک پڑھا تھا جس میں افسانوی لڑکے شرون کے سلسلے میں اپنے والدین کے لیے بے پناہ محبت کا ذکر تھا۔ موہن کے ذہن پر اس واقعے کا نقش تھا کہ تیرتھ کو جاتے وقت شرون نے اپنے کاندھے پر گوپھن (بہنگی) ڈال کے ماں باپ کو اس میں بٹھالیا تھا۔ موہن اس سے بے حد متاثر ہوا۔ شرون ان کے لیے نمونہ بن گیا اور ماں باپ کی اطاعت اُن کا اصول، مکمل اطاعت کا اصول ترقی کر کے والدین سے استادوں تک اور استادوں سے بزرگوں تک پہنچا۔ بچپن کے مراعاتِ خصوصی سے دستبرداری کا یہی اثر حد سے زیادہ بڑھے ہوئے تحمل کی اور مجموعی کیفیت میں رونما ہوا ہوگا اور مریضانہ شرمیلے پن کا رنگ اختیار کر کے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے بلکہ بات چیت کرنے میں بھی مانع ہوا ہوگا۔ اگر انھیں اسکول میں کوئی میڈل یا تمغہ ملتا تو وہ اسے اپنی قابلیت سے بڑھ کر تصور کرتے، اور اس نشانِ امتیاز کو اندر کی جیب میں رکھتے جیسے کہ یہ ڈر ہو کہ دوسروں پر ان کی لیاقت کی کمی آشکار نہ ہو جائے۔

ابھی یہ بچہ عمر کی دوسری دہائی ہی میں تھا کہ اس کے لیے یہ کمزوری گویا ناکافی سمجھی گئی اور تیرہ برس کے سن میں ان کی شادی بھی کر دی گئی۔ والدین کی سہولت اور خرچ میں کفایت کے خیال سے تین تین شادیاں ایک ساتھ رچائی گئیں اور موہن اور ان کے بھائی کرشن داس اور ایک بڑے چچا زاد بھائی بیاہ دیے گئے۔ موہن کی بیوی کستور بائی، پور بندر کے ایک تاجر اور گاندھی خاندان کے دوست گوکل داس ماکن جی کی بیٹی تھیں۔ ان بچوں بالخصوص موہن کے دل میں آغاز جوانی کی محبت آندھی کے جھونکے کی طرح امڈ پڑی۔ ایک گجراتی پمفلٹ پڑھ کر انھوں نے زندگی بھر وفادار رہنے کا معیار اپنایا اور اسی سے انھوں نے بیوی سے وفاداری کے مطالبے اور اس کے حرکات وسکنات پر کڑی نظر رکھنے کا شوہری حق بھی اخذ کیا۔ دوستوں کے پاس یا مندر تک جانے کے لیے

(1) مہادیو دیسائی کی ''ڈائریاں: جلد 1، اندراج مورخہ 31/ مارچ 1932

اسے اجازت لینا پڑتی۔ ایک بدقماش ساتھی کی صحبت کے اثر نے صورت حال بد سے بدتر کردی کیوں کہ وہ ان کے دل میں رقابت کے جذبات اُبھارتا رہتا۔ کستوربا ایک غیور لڑکی تھی وہ ان من مانی رکاوٹوں پر دل ہی دل میں کڑھتی اور خاموشی مگر مستقل مزاجی سے مقاومت کرتی رہی۔ شک وشبہ کے یہ اندھیرے دن، نوجوان شوہر کی تعلیم کے لیے مفید ثابت ہوئے۔ انھوں نے کئی سال بعد جان، ایس ہوئے لینڈ کو بتایا کہ ''میں نے عدم تشدد کا سبق اپنی بیوی سے اس وقت سیکھ لیا جب میں نے اسے اس بات پر مجبور کرنا چاہا کہ وہ میری مرضی پر چلے۔ ایک طرف تو اس کا میری مرضی کا مستقل مزاجی سے مقابلہ کرنا اور دوسری طرف میری حماقت سے جو اس کو دکھ پہنچتا تھا۔ اسے خاموشی سے برداشت کرنا۔ ان دونوں باتوں کی وجہ سے مجھے آخر میں اپنے آپ سے شرمندہ ہونا پڑا، اور مجھے اس احمقانہ خیال سے نجات ملی کہ میں اس پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ آخر کار راہنما کے مسئلے میں وہ میری اُستاد بن گئی۔'' شادی کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ موہن کا اسکول میں ایک پورا سال ضائع ہوگیا لیکن انھوں نے اس کی تلافی اس طرح کر لی کہ آگے چل کر وہ ایک کلاس چھلانگ گئے۔ خوش قسمتی سے ان کے لیے شادی تعلیم کے خاتمے کا پیغام نہ ثابت ہوئی، البتہ ان کے بڑے بھائی اور چچازاد بھائی جن کی شادیاں ایک ساتھ ہوئی تھیں، شادی کے بعد تعلیم چھوڑ بیٹھے۔

موہن دل ہی دل میں اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ وہ فرماں بردار بچے ہیں۔ ''انھوں نے تو یہ سیکھا تھا کہ بڑوں کا حکم بجالایا جائے نہ یہ کہ ان کا جائزہ لیا جائے۔'' لیکن ایسا بھی وقت آیا کہ جب آزادی کا یہ فقدان تکلیف پہنچانے لگا۔ عنفوان شباب کی بغاوت کیا شکل اختیار کرتی ہے اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ جو اوامر ونواہی توڑے جارہے تھے وہ کتنے مضبوط ہیں۔ ویشنو فرقے میں جس سے گاندھیوں کا تعلق تھا گوشت خوری اور تمبا کو نوشی بھاری گناہ سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ دور بغاوت میں انھیں گناہوں کی طرف ترغیب ہوئی۔ اسکول کے ایک ساتھی مہتاب نے میکاویلی ترغیب دہندہ کا کردار ادا کیا۔ اس نے گوشت خوری کی موافقت میں دلیلیں پیش کیں اور اس نے بتایا کہ شہر کے بہت سے لوگ جن میں اسکول کے استاد بھی شامل ہیں، گوشت خور ہیں۔ اگر چہ وہ اس کا اقرار نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ انگریز گوشت خوری کی وجہ سے بڑے محنتی ہوتے ہیں اور سبزی خور ہندوستانیوں کے لیے انھیں نکال باہر کرنا ممکن

نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو گوشت ہر مرض کی دوا ہے۔ اس کے استعمال سے پھوڑے پھنسیاں نہیں نکلتے۔ اور یہ ان بھوتوں کو بھی بھگا سکتا ہے جو موہن کو نیند میں ستاتے ہیں۔

اس دوست کی عیارانہ کج بحثی سے موہن کی تاب مقاومت جاتی رہی لیکن اس خیال سے کہ والدین کے دلوں کو چوٹ نہ پہنچے، وہ دریا کے کنارے ایک گوشۂ تنہائی میں گوشت کی دعوت میں شریک ہونے پر راضی ہو گئے۔ دعوت کے بعد ان کی رات بُری گزری ''بکری میرے پیٹ میں چلاتی رہی'' مناسب وقتوں سے یہ دعوتیں ہوتی رہیں اور انھوں نے ابتدائی نفرت پر قابو پالیا۔ ایک الجھن پھر بھی باقی رہی۔ ان خفیہ دعوتوں میں شرکت کے بعد انھیں گھر پر کھانے کے وقت ماں سے بھوک نہ ہونے کے بہانے تراشنا پڑتے۔ چوں کہ جھوٹ سے انھیں فطری چڑ تھی اس لیے انھوں نے یہ طے کیا کہ تبدیلی طعام کے لیے انھیں اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا جب وہ بڑے ہو جائیں اور اپنے سوا کسی کے سامنے جوابدہ نہ رہیں۔

تمباکو نوشی اس زمانے کی دوسری لغزش تھی۔ ان کے چچا سگریٹ پینے کے بعد جو ٹکڑے پھینک دیا کرتے تھے وہ ایک اور لڑکے سے ساز باز کر کے موہن اٹھالیا کرتے۔ یہ صورت یقیناً غیر اطمینان بخش تھی۔ بچوں کے پاس سگریٹ خریدنے کو پیسے نہ ہوتے اس لیے وہ ملازموں کے پیسے چرانے لگے۔ اس سے بھی ان کا کام نہ چلا تو وہ جنگلی پودے کا ڈنٹھل پینے لگے۔ ان کے اس جوش جوانی کو آخر کار شکست خوردگی کا احساس ہوا۔ انتہائی ناکامی کے عالم میں ایک شام کو وہ چپکے سے ایک مندر میں آخری رسوم ادا کرنے گئے تاکہ خودکشی کر کے یہ پیچیدہ گتھی سلجھالیں۔ اس نازک لمحے میں ان کی ہمت جواب دے گئی اور دنیا چھوڑنے کی بجائے انھوں نے سگریٹ نوشی ترک کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اسی دور کی ایک اور بے قاعدگی یہ تھی کہ اپنے بھائی کا قرض ادا کرنے کے لیے انھوں نے سونے کا ایک ٹکڑا چرایا۔ اس جرم کا بوجھ ان کے ذہن پر اتنا پڑا کہ ناقابل برداشت معلوم ہونے لگا۔ انھوں نے اپنے جرم کا تحریری اقرار کیا اور یہ تحریر اپنے باپ کو پیش کی۔ دونوں کی آنکھوں سے ایک ساتھ آنسو نکل پڑے۔ یہ آنسو بیٹے کا گناہ کا کفارہ بھی تھے اور باپ کی طرف سے معافی کا اعلان بھی۔

موہن کا آغاز شباب بہت سے دوسرے ہم عصروں سے زیادہ طوفانی نہیں تھا۔ ان کی عمر

کے لڑکوں کے لیے گوشت خوری اور سگریٹ نوشی کی ممنوعہ زمین کی سیر اور چھوٹی موٹی چوری نہ اس وقت عجوبہ تھی، نہ اب ہے۔صرف ان مہموں کا طرز اختتام غیر معمولی تھا۔ ہر معاملے میں انھوں نے اپنے سامنے ایک سوال رکھا، اور پھر اخلاقی الجبرا[1] کا ایک فارمولا بنا کے ان کا حل نکالنے کی کوشش کی۔ ہر لغزش کے بعد وہ اپنے آپ سے وعدہ کرتے کہ ''اب پھر کبھی نہیں'' اور وہ اس وعدے پر قائم رہتے۔

غالباً ایک غیر فطری سنجیدگی اور مجہولیت کے علاوہ ان میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو انھیں ان کی عمر کے دوسرے بچوں سے ممتاز کرتی۔ وہ ایسے بچوں میں نہ تھے جو کہنیاں مار کر آگے نکل جاتے ہیں لیکن ان کے سرد اور غیر اثر آفریں ظاہر کے پیچھے اپنی اصلاح کا پر جوش جذبہ تھا۔ان کی عادت تھی کہ جس بات کو وہ ناپسند کرتے اسے بھول جایا کرتے اور جو بات انھیں پسند ہوتی اس پر عمل کرتے رہتے۔ جو چیزیں دوسرے لوگ تفریح طبع کے لیے پڑھتے، وہ سبق لینے کے لیے پڑھتے۔ ہندوستان میں کروڑوں بچوں نے پرہلاد اور ہریش چندر کی کہانیاں سنی ہوں گی۔ پرہلاد نامی بچے نے بے شمار مصائب جھیلے لیکن خدا پر اس کا اعتقاد کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ بادشاہ ہریش چندر کے پاس جو کچھ تھا وہ انھوں نے سچائی کی خاطر قربان کر دیا۔ یہ دونوں ہندو دیومالا کے ہیرو ہیں اور شاعرانہ خیال کی مخلوق، لیکن موہن نے انھیں زندہ نمونہ مان لیا۔ تاریخ اور ادب ان کے لیے عجائب کی ٹکسال یا نادیدہ کان نہیں تھی بلکہ بہتر اور خالص تر زندگی کی محرک بھی تھی۔ جہاں اسکول میں ان کے ہم عمر رسمی انعامات واعزازات کے لیے مقابلے کرتے یہ حساس بچہ اپنے لیے مسائل پیدا کرتا اور ان کا حل ڈھونڈ نکالتا۔

---

(1) علم جبر و مقابلہ

باب 2

انگلستان کو روانگی

موہن نے 1857 میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ ایک سال پہلے باپ کی موت سے خاندان کے وسائل آمدنی پر ایک طرح کا دباؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ خاندان میں یہی بچہ تعلیم میں لگا ہوا تھا اور تمام امیدیں اسی سے وابستہ تھیں اس لیے اسے قریب ترین کالج والے شہر بھاؤ نگر بھیجا گیا۔ موہن کی بدقسمتی سے کالج میں انگریزی ذریعۂ تعلیم تھی۔ لیکچر اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آتے تھے اور وہ آگے پڑھنے سے مایوس ہو چکا تھا۔

اسی دوران میں خاندان کے ایک دوست ماوجی دوے نے یہ مشورہ دیا کہ بیرسٹری کی تعلیم کے لیے موہن کو انگلینڈ جانا چاہیے۔ بیرسٹری بہت آسان تھی۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانی یونیورسٹیوں کی ڈگری حاصل کرنے میں وقت بھی زیادہ لگتا تھا، محنت بھی زیادہ کرنا پڑتی تھی اور خرچ بھی زیادہ ہوتا تھا، اور اس ڈگری کی بازار میں قدر و قیمت بھی کم تھی۔ بمبئی کی ڈگری سے زیادہ سے زیادہ کلرکی کی کوئی جگہ حاصل کی جا سکتی تھی۔ ماوجی دوے نے یہ بھی سمجھایا کہ اگر موہن نے اپنے دادا اور باپ کی طرح کاٹھیاواڑ کی کسی ریاست میں دیوان ہونے کا حوصلہ کیا تو غیر ملکی ڈگری کی حاجت ہوگی۔ کرم چند اور اتم چند گاندھی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور انھوں نے بہت معمولی

تعلیم سے کام چلایا تھا لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا۔اب یونیورسٹیوں سے ہزاروں کی تعداد میں بی اے اور ایل ایل بی نکل رہے تھے۔ یہ اس انگریزی تعلیم کی پیداوار تھے جس کا منصوبہ میکالے نے بنایا تھا۔ یہ تعداد میں ضرورت سے زیادہ تھے، اس لیے اگر ایک غیر ملکی ڈگری پاس ہو تو پبلک سروسوں کے مقابلے میں زیادہ مفید ثابت ہوسکتی تھی۔

بیرونی ممالک میں جانے کے خیال ہی سے موہن اچھل پڑا۔ انگلستان دیکھنے کا اس لیے بھی شوق تھا کہ فلسفیوں اور شاعروں کی سرزمین تھی اور تہذیب کا مرکز، اور اس لیے بھی کہ اسے بھاؤنگر کالج سے نکل بھاگنے کا موقع ملے گا۔ جہاں کے اساتذہ کی تعلیم اس کے سر کے اوپر سے گزر جاتی تھی۔اس کے بڑے بھائی کو یہ تجویز بے شبہ دلکش معلوم ہوتی لیکن سوچ بھی تھی کہ اتنا خرچ کہاں سے آئے گا۔ ماں پتلی بائی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بچے کو سمندر پار ایک غیر جگہ پر نامعلوم ترغیبات اور خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے کیسے بھیجیں؟ کاش اُن کے شوہر آج زندہ ہوتے اور اس بات کا فیصلہ کرتے کیوں کہ وہ خود اپنے میں یہ سکت نہیں پاتی تھیں۔ انھوں نے موہن کو اپنے چچا کی رائے لینے کا مشورہ دیا کیوں کہ وہی بزرگِ خاندان تھے۔موہن اونٹ اور بیل گاڑی کی سواری سے پوربندر چچا سے ملنے گئے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے لیکن بظاہر وہ سمندر پار کے ناپاک سفر کے لیے رضامندی دینے میں ہچکچا رہے تھے، اور جب موہن نے پوربندر کے برطانوی ایڈمنسٹریٹر، مسٹر لیلی سے مل کر انگلستان میں تعلیم کے لیے وظیفے کی درخواست کی تو انھیں ایک اور مایوسی کا سامنا ہوا۔ اگرچہ گاندھیوں نے ریاست کی بے حد خدمت کی تھی لیکن برطانوی افسر نے اُن سے کسی خوش اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کیا اور ان سے کہا کہ پہلے بمبئی یونیورسٹی کی ڈگری لے لو تب وظیفہ طلب کرو۔ ان دل شکن حالات کے باوجود موہن نے ہمت نہ ہاری۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اگر کسی وجہ سے انگلستان جانا نہ ہوا تو انھیں بھاؤنگر کے کلاس روم میں پھر واپس آنا پڑے گا۔ یہ کوئی خوش آئند تصور نہ تھا۔ انھوں نے اپنی بیوی کا زیور بیچنے کی ٹھانی، لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ ان کے فیاض بھائی نے اخراجات مہیا کرنے کا ذمہ لے لیا۔ ان کی ماں کے ذہن کے شکوک بھی اس وقت رفع ہو گئے جب موہن نے ایک جین سادھو بیچار جی سوامی کے سامنے یہ عہد کیا کہ وہ ساحل ہندوستان کو چھوڑنے کے بعد شراب، عورت اور گوشت کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔

موہن جہاز سے روانہ ہونے والے ہی تھے کہ ایک الجھن اور پیدا ہوئی۔ گاندھی مودھ بنیا ذات کے تھے۔ اس ذات کے بزرگوں نے انھیں ذات کی پنچایت کے سامنے طلب کر کے یہ اعلان کیا کہ انگلستان کا سفر ہندو دھرم کے خلاف ہے۔ انیس سال کے اس بچے نے جس کو اپنے اسکول کے وداعی جلسے میں شکریے کے چند لفظ نکالنا مشکل ہو گیا تھا۔ کافی ہمت سے کام لیا اور اپنی ذات کے داڑھی والے قائدوں کی دھمکیوں کا ڈٹ کے مقابلہ کیا۔ اس گستاخی پر خفا ہو کر اس پنچایت نے موہن کو ذات باہر کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس فیصلے کی ضرر رسانی سے پہلے ہی موہن 4 ستمبر 1888 کو بمبئی سے بذریعہ جہاز روانہ ہو گئے۔

راجکوٹ کے دیہاتی ماحول سے نکل کر دُخانی جہاز کے آفاقی ماحول میں پہنچنا، موہن کے لیے زبردست تبدیلی تھی۔ مغربی طرز کے کھانے، لباس اور آداب کی مطابقت کافی تکلیف دہ تھی۔ جب اس کے ساتھی مسافر اس کو مخاطب کرتے تو اس کی زبان بند ہو جاتی۔ اسکول اور کالج میں انگریزی میں جو شُد بُد حاصل بھی کی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ جب بھی وہ کچھ بولتے تو اُن کے دماغ پر یہ بوجھ رہتا کہ وہ بے وقوف بن رہے ہیں۔ سبزی خوری کے عہد کی وجہ سے اُن کی الجھن میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ویٹروں سے یہ پوچھتے ہوئے ڈر لگتا کہ وہ جو سامان خورد و نوش دے رہے ہیں، وہ کن اشیا سے تیار ہوا ہے۔ اس لیے وہ انھیں پھلوں اور مٹھائیوں پر گزر بسر کرتے رہے، جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ مفت کے مشورے بے شمار ملتے رہے۔ ایک مسافر نے کہا کہ عدن چھوڑنے کے بعد گوشت کے بغیر گزارہ ناممکن ہوگا۔ جب وہ عدن سے بخیر و خوبی آگے بڑھے تو اُن کو متنبہ کیا گیا کہ بحر احمر پار کرنے کے بعد گوشت خوری سے مفر نہ ہوگا۔ بحر روم میں ایک بد بخت نے بہت گمبھیر ہو کر یہ پیش گوئی کی کہ خلیج بسکے پہنچ کر موت، شراب، اور گوشت میں سے ایک کو چن لینا پڑے گا۔

انگلستان پہنچ کر اُن کا احساس علاحدگی اور بھی بڑھ گیا۔ تنہائی کے ایک شدید احساس نے انھیں چاروں طرف سے آ دبوچا۔ اس کا ایک سبب تو وہ یادِ وطن تھی جو ہندوستانی طلبا کو ستانے لگتی ہے۔ جب وہ اپنی از خود جلا وطنی کا آغاز کرتا ہے۔ ایک حساس اور وہمی لڑکے کے شکوک اس پر مستزاد تھے۔ ان کے خیالات گھوم پھر کے اُن کے وطن راجکوٹ، اُن کی پیاری ماں، بیوی اور ان کے ننھے بچے کی طرف جاتے۔ پیش آنے والی صورت حال بھیانک معلوم ہونے لگتی۔

ضروری تھا کہ وہ خود کو نئی آب وہوا، نئے ماحول اور نئے طرزِ زندگی کے سانچے میں ڈھال لیں۔انھوں نے جس سبزی خوری کا عہد کیا تھا اس کی وجہ سے مستقل نیم گرسنگی کی سزا بھگتنا اور عام تمسخر کا نشانہ بننا، ان کا مقسوم لگ رہا تھا۔وہ نا قابل بیان حد تک تنہا تھے۔بستر پر لیٹے لیٹے وہ رویا کرتے اور تین برس کی اس طویل مدت پر غور کرتے رہتے جو گھر واپس ہونے سے پہلے انھیں چار و ناچار گزارنا تھی۔

سبزی خوری کا عہد مستقل طور پر ان کی پریشانی کا باعث تھا۔ان کے انگلستانی دوستوں کو ڈر تھا کہ خوراک کے سلسلے میں ان کا جوش وخروش ان کی صحت برباد کر دے گا اور سوسائیٹی میں انھیں نا قابل اختلاط بنا دے گا۔وہ گوشت خوری کے وکیلوں کی دلیلیں رد نہیں کر پاتے تھے۔دل ہی دل میں وہ گوشت کھانا بھی چاہتے تھے لیکن اپنے عہد سے مجبور تھے۔جب وہ بہت زیادہ گھبرا جاتے یا اپنے اندر کمزوری کا احساس کرتے تو وہ سجدے میں گر جاتے اور بھگوان سے پرارتھنا کرتے کہ انھوں نے ماں سے جو عہد کیا تھا اس کے پورا کرنے میں وہ اُن کی مدد کرے۔

ایک دن انگلستان کی سڑکوں پر گھومتے گھومتے انھیں فرنگڈن اسٹریٹ پر ایک سبزیوں، ترکاریوں والا ریسٹورنٹ نظر آیا، انھوں نے اس واقعہ کے بارے میں بعد میں لکھا کہ ''اس ریسٹورنٹ کو دیکھ کر انھیں وہی مسرت ہوئی جو بچے کو اپنی من پسند چیز پا کر ہوتی ہے۔'' اس دن انھیں ہندوستان چھوڑنے کے بعد پہلی بار پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوا۔ریسٹورنٹ میں انھوں نے Plea for Vegetarian (سبزی خوری کی دلیل) نامی کتاب بھی خریدی۔ یہ کتاب سالٹ کی تصنیف تھی۔اس کے استدلال نے دل میں گھر کر لیا۔ابھی تک بے گوشت کی غذا ان کے لیے ایک جذباتی چیز تھی۔اب اس کے اختیار کرنے میں دلیل وعقل ان کے ساتھ تھے۔ماں باپ کے احترام سے سبزی خوری اختیار کرنا ایک تکلیف دہ ذمہ داری معلوم ہوتی تھی لیکن جلد ہی ایک مشن اور جسم وذہن کی غیر معمولی تربیت کا نقطۂ آغاز بن گئی جس نے ان کی ساری زندگی بدل دی۔اس ریسٹورنٹ کی دریافت اس سے کہیں زیادہ معنی خیز نکلی۔ جتنا وہ اس وقت سمجھ رہے تھے۔ان کے سامنے ایک لمبی اور مشکل لیکن پکی راہ کھل گئی جو لنڈن کی فیرنگڈن اسٹریٹ سے شروع ہو کر جنوبی افریقہ کے فونکس اور ٹالسٹائے نامی بستیوں اور ہندوستان کے سابرمتی اور سیوا گرام آشرموں تک جاتی تھی۔

سبزی خوری پر نئے اعتقاد سے گاندھی میں نئی خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اب چاہے وہ دوسروں کی نظر میں خبطی ہوں لیکن انھیں خود اس قسم کا کوئی احساس نہ رہا۔ ان کے دوستوں کا اب بھی یہ خیال قائم رہا کہ بے گوشت کی خوراک کھا کھا کر وہ اپنی صحت کا ستیہ ناس کر لیں گے اور پڑھائی بھی تباہ کریں گے۔ اعتراض کرنے والوں کا منہ بند کرنے کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ سبزی خوری کے باوجود وہ نئے ماحول کا اثر قبول کرنے سے کلیۃً عاری نہیں ہیں، انھوں نے اپنے اوپر ''انگریزی کلچر'' کا گہرا ملمع چڑھانے کا فیصلہ کیا انھیں بہت سی کمیاں پوری کرنا تھیں۔ وہ اسکول اور کالج میں کاٹھیاواڑ کا مقامی لباس پہنا کرتے تھے۔ جہاز پر اور ساحل انگلستان پر اترنے کے بعد بھی انگریزی لباس انھیں کچھ بے ڈول سا لگتا تھا۔ انگریزی زبان پر انھیں بہت کم قابو تھا اور معمولی بول چال میں بھی انھیں بطور ریہرسل مادری زبان سے انگریزی میں منتقل کرنے کا مشکل ذہنی عمل کرنا پڑتا تھا۔

''انگریزی جنٹل مین'' بننے کا مکمل ارادہ کرنے کے بعد انھوں نے وقت اور روپے کی بالکل پروا نہیں کی۔ چاہے کچھ بھی خرچ کیوں نہ ہو، ملمع بہترین چاہیے تھا۔ لندن کے سب سے زیادہ فیشن والے درزیوں سے نئے سوٹ سلوائے گئے۔ گھڑی میں ہندوستان کی بنی ہوئی سونے کی دوہری چین لگائی گئی۔ موسیقی، رقص اور بول چال کے لیے ماہروں کے ٹیوشن کا انتظام کیا گیا۔ لباس اور کلچر کی اس مشق کا نتیجہ نکلا وہ ایک ہم عصر نے بعد میں بیان کیا ہے۔ فروری 1890 میں سچید انند سنہا نے بیس سال کے ایم۔ کے گاندھی کو جب پکاڈلی سرکس میں دیکھا تو وہ کیسے لگے یہ انھیں کے الفاظ میں سنیے: ''وہ ایک اونچی دیوار کی ریشمی ہیٹ لگائے ہوئے تھے جو صفائی کی وجہ سے چم چم کر رہی تھی، سخت کلف دار گلید اسٹونی کالر، ایک ذرا بھڑکیلی قسم کی ٹائی جس میں قوس وقزح کے تقریباً سبھی رنگ جھلک رہے تھے اور اس کے نیچے دھاری دار ریشمی قمیص پہنے ہوئے تھے۔ اس کے اوپر وہ صبح کا کوٹ، ڈبل بریسٹ واسکٹ اور اس سے ملتے جلتے گہرے رنگ کا دھاری دار پینٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں چمڑے کے دستانے تھے اور چاندی کے دستے کی چھڑی، لیکن چشمے نہیں تھے۔ پیروں میں پیٹنٹ چمڑے کے جوتے ہی نہیں ان پر ساق پوش (Spats) بھی۔ انھیں اس زمانے کی بازاری زبان میں رنگیلا، چھبیلا جوان کہہ سکتے تھے۔ وہ

ایسے طالب علم نظر آتے تھے جو تعلیم سے زیادہ فیشن اور خفیف الحرکاتی کا دلدادہ ہو۔''(1)

بہر حال یہ تجربہ کرتے وقت گاندھی نے ایک دم ہوش وحواس نہیں کھوئے۔ اُن کی دروں بینی کی عادت کبھی نہ گئی۔ انگریزی رقص وموسیقی کا سیکھنا ان کے لیے آسان نہ تھا۔ لباس تراش اور رقص گاہ انھیں شریف تر انگریز تو بنا سکتے تھے لیکن صرف قصباتی شریف انگریز۔ ان کے بھائی خاندان کے محدود وسائل پر بار بڑھائے جا رہے تھے بلکہ غالباً قرض بھی لے رہے تھے تا کہ انگلستان میں ان کی تعلیم چلتی رہے۔ انھوں نے جب ان پہلوؤں پر غور کیا تو ''شریف انگریز'' کے Will-o-the wisp کا تعاقب ایک فضول نظر آیا۔

''تین مہینے کی مختصر سیر وتفریح کے بعد، دروں بین اپنے خول میں واپس آ گیا۔ انتہائی فضول خرچی سے پلٹا کھایا تو بے حد محتاط کفایت شعاری پر اُتر آئے۔ وہ جو خرچ کرتے اس کی پائی پائی کا حساب رکھتے۔ اپنا کمرہ خود صاف کرتے، کھانا خود پکاتے اور بس کا پیسہ بچانے کے لیے آٹھ دس میل روزانہ چلتے، وہ اپنے اخراجات گھٹا کے دو پونڈ ماہوار تک لے آئے۔ انھیں شدت سے اپنی خاندانی ذمہ داریوں کا احساس ہونے لگا اور اس بات سے خوشی ہونے لگی کہ بھائی سے بار بار پیسے کا طلب کرنا کم ہو گیا ہے۔ سادگی کی بدولت ان کی اندرونی اور بیرونی زندگی میں یگانگت پیدا ہوئی۔ پہلے تین مہینوں کا چھیلا پن دراصل ان لوگوں کے خلاف ایک دفاعی حربہ تھا جو یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی برطانوی سوسائیٹی میں کھپ نہیں سکتے۔

غذائیات اور مذہبیات میں رشتہ ڈھونڈنا دور کی کوڑی لانا ہے۔ لیکن ایم۔ کے گاندھی کی شخصیت کے ارتقا سے دونوں کا گہرا تعلق ہے۔ ابتدا میں ان کی سبزی خوری اُن کے ویشنو روایات کا ایک حصہ تھی۔ وہ گوشت سے اس لیے پرہیز کرتے تھے کہ اس سے ان کے والدین کو نفرت تھی۔ اسکول کے ایک چالاک ساتھی ''شیخ مہتاب'' نے کچھ دنوں کے لیے گوشت خوری پر مجبور کر دیا تھا لیکن جب ماں باپ کے شبہات سے بچنے کے لیے جھوٹ بولنے کی نوبت آنے لگی تو گوشت خوری ترک کر دی اور طے کیا کہ اس لطیف غذا کا کھانا اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے جب تک کہ وہ والدین کے حدود اختیار کے باہر نہ نکل جائیں۔ انھوں نے گوشت نہ چھونے کا ماں کو جو بچن

---

(1) مضمون مطبوعہ ''امرت بزار پتریکا'' خصوصی شمارہ یوم جمہوریت۔26/جنوری 1950ء

دیا تھا اس پر انگلستان پہنچنے کے بعد سختی سے کار بند رہے لیکن انھیں ہمیشہ یہ خیال رہتا کہ ایسا کرنے میں وہ جذبات کا اتباع کر رہے ہیں نہ کہ عقل کا۔ جب تک انھوں نے سالٹ کی کتاب نہیں پڑھی تھی، ان پر سبزی خوری کی خوبیاں واضح نہیں ہوئی تھیں۔ ایک نومرید کے جوش عقیدت کے ساتھ غذائیات پر کتابیں چاٹ ڈالیں۔ کھانا پکانے میں دلچسپی لینے لگے، مرچ مصالحے کا ذائقہ بچکانہ لگنے لگا۔ اور وہ اس عقلمندانہ فیصلے پر پہنچے کہ ذائقہ کا تعلق زبان سے نہیں ذہن سے ہے۔ ذائقہ پر کنٹرول ان چند ابتدائی اقدامات میں سے تھا جو کئی برس بعد ایک مکمل تزکیہ نفس کی صورت میں اپنے عروج پر پہنچنے والے تھے۔ صحت و کفایت پر مبنی غذائی تجربوں کو ان کے روحانی اور مذہبی ارتقا کا ایک حصہ بن جانا تھا۔

سبزی خوری کا فوری اثر یہ ہوا کہ انگلستان میں انھیں ایک پر سکون خود اعتمادی کا احساس ہونے لگا اور وہ اپنے خول سے باہر نکل آئے۔ صحافت کے میدان میں انھوں نے پہلا اقدام یہ کیا کہ Vegetarian نامی جریدے میں تو مضامین لکھ ڈالے۔ مضامین زیادہ تر بیانیہ تھے۔ ان میں ہندوستانیوں کی خوراک و عادات، سماجی نظام اور تیوہاروں کا ذکر تھا۔ ان میں مزاح بھی کہیں کہیں چھلک اٹھتا تھا۔ اگر ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ بھاؤنگر کالج میں وہ استادوں کے انگریزی لکچر سمجھ نہ پاتے تھے تو ان مضامین کا اشاعت کے لیے بھیجنا ایک قابل قدر کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ لندن ویجیٹرین سوسائٹی کی مجلس منتظمہ کے رکن بن گئے اور سوسائٹی کے بیج کا ڈیزائن بنانے میں دلچسپی لی۔ وہ چند دن بیزوائر میں رہے اور وہاں ایک سبزی خوروں کے کلب کی بنیاد ڈالی۔ یہاں کم از کم ایک نمایاں سبزی خور سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ ریڈوں آرنلڈ تھے جو ''لائٹ آف ایشیا'' اور ''سانگ سلے شیل'' نامی دو کتابوں کے مصنف تھے اور گاندھی ان کتابوں سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ لندن کے سبزی والے ریستورانوں اور بورڈنگ ہاؤسوں میں صرف غذائی خبطی ہی نہیں تھے بلکہ چند عقیدت شعار دیندار بھی تھے۔ انھیں میں سے ایک ملاقاتی کی بدولت وہ انجیل مقدس سے متعارف ہوئے۔

یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ لندن کے تین سالہ قیام کے باوجود ان کا حد سے گزرا ہوا شرمیلا پن ختم نہ ہوسکا۔ ویجیٹرین سوسائیٹی کے علاوہ، وہ صرف ایک اور ادارے کی طرف متوجہ

ہوئے۔ یہ ''انجمن اسلام'' تھا۔ جو ہندوستانی مسلمانوں اور بالخصوص مسلم طلبا نے قائم کیا تھا۔ اور یہاں ہلکے ناشتے کے ساتھ سیاسی اور سماجی مسائل پر اظہار خیال ہوتا تھا۔ غیر مسلم طلبا کو بھی مباحثوں میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔ اس طرح انگلستان میں مقیم بہت سے ہندوستانی طلبا کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ان میں سے کئی ایک نے بعد میں ہندوستان کی پبلک زندگی میں نمایاں جگہ حاصل کی۔ ان میں گاندھی، عبدالرحیم، مظہر الحق، محمد شفیع، سچیدانند سنہا، ہرکرشن لال گابا شامل تھے۔ گاندھی (سنہا و ہرکرشن لال کی طرح) سیاسی معاملات میں قوم پرورانہ خیالات رکھتے تھے، لیکن وہ بولتے کم تھے اور بعض دوسرے حضرات کی طرح زور دے کر بات کہنے کے طریقے سے نا آشنا تھے۔

آٹھویں اور نویں دہائی کے نئے ادبی، سماجی اور سیاسی عناصر انگلستان کو جھنجوڑ رہے تھے؟ لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے کہ گاندھی ان سے کچھ بھی متاثر ہوئے ہوں۔ اپنے قیام انگلستان کے سلسلے میں انھوں نے چالیس صفحات پر مشتمل ایک مضمون لکھا، اس میں کہیں کارل مارکس، ڈارون یا ہکسلے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ سائنس، ادب، اور سیاست سے ان میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ ذاتی اور اخلاقی سوالات میں دن رات غرق رہتے ان کے سامنے مرکزی مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے تمام اندرونی وسائل کو کام میں لا کر کسی طرح اس بچن پر قائم رہیں جو انھوں نے اپنی ماں کو دیا تھا۔ عورت، شراب اور گوشت کی طرف جو بار بار ترغیب ہوتی تھی اس کا کیسے مقابلہ کیا جائے اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں سادگی، کفایت شعاری اور مقصدیت کو کیسے بھر دیا جائے۔ ان کی صحافتی کوششیں ''ویجیٹرین'' کے کالموں تک محدود تھیں اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ گیتا اور عہد نامہ جدید (انجیل) تک۔ مذہب ہی وہ واحد موضوع تھا جو ان کے دل کی گہرائیوں کو چھو لیتا تھا۔ پھر بھی اس وقت تک مذہب کیا، ہندو مذہب کے بارے میں بھی ان کی معلومات محض ابتدائی قسم کی تھیں۔

20 جون 1891 کے ویجیٹرین کے ایک مضمون میں انھوں نے اپنا تجزیہ پیش کیا کہ قیام انگلستان سے انھیں کیا حاصل ہوا: ''آخر میں، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ انگلستان میں اپنے تقریباً تین سالہ قیام میں، بہت سے کام میں نہ کر سکا...... لیکن مجھے اس خیال سے بڑی تسکین ہوتی ہے کہ میں شراب اور گوشت کا استعمال کیے بغیر وطن واپس جا رہا ہوں اور یہ بات میرے ذاتی علم میں

ہے کہ یہاں بہت سے سبزی خور ہیں۔'' یہ ایک ایسی سنجیدہ مگر خود اعتمادی سے محروم نوجوان کا قصہ ہے جس کی دلچسپیوں کا دائرہ واضح مگر محدود تھا۔ کسی جانبدار مبصر کو بھی اس نوجوان بیرسٹر میں اس وقت کوئی امتیازی جھلک نظر نہ آئی ہوگی جب وہ انگلستان سے جہاز پر ہندوستان کے لیے روانہ ہوا تھا۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے مستقبل کی نشو ونما خصوصاً قانون اور سیاست کے میدان میں شاندار ہوگی۔

باب 3

بے موکل بیرسٹر

جب گاندھی جی نے سماجی تکلّفات وآداب اپنانے کا خیال ترک کیا اور تعلیم ہی پر ساری توجہ لگادی تو انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ قانون کے نصاب میں اُن کا پورا وقت صرف نہیں ہوتا اور اُن کے پاس بنیادی تعلیم میں لیاقت بڑھانے کے لیے وقت بچ رہتا ہے۔ ہائی اسکول میں ان کی تربیت معمولی سی ہوئی تھی۔ خاص کر انگریزی میں روانی نہ ہونے سے انھیں بڑی کوفت ہوتی تھی۔ چوں کہ ان کے پاس آکسفورڈ، کیمبرج جانے کے لیے نہ تو وقت تھا نہ ہی پیسہ، اس لیے وہ لندن یونیورسٹی کے میٹریکولیشن امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ پہلی کوشش میں وہ لاطینی زبان میں رہ گئے لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے اور آخر کار امتحان پاس کرلیا۔ قانون کے مطالعے میں لاطینی زبان کا علم ان کے کام آیا۔ جب وہ جنوبی افریقہ کی عدالتوں میں پریکٹس کرنے لگے تو یہ علم بہت مفید ثابت ہوا کیوں کہ ان عدالتوں میں رومن ڈچ قانون عام طور پر رائج تھا۔ لاطینی سے انھیں اپنی سادہ اور چست انگریزی نثر کی تشکیل وتعمیر میں بھی مدد ملی۔

قانون کے امتحان اس زمانے میں مشکل نہ ہوتے تھے۔ ممتحن فیاض ہوتے تھے اور کامیابیوں کی فیصد شرح بہت زیادہ تھی۔ قانون کے اکثر طلبا امتحان کے لیے اپنی درسی کتابوں کے خلاصے رٹ لیا کرتے تھے۔ لیکن گاندھی کا ضمیر ان نزدیک کے چھوٹے راستوں کو اختیار کرنے پر

کب راضی ہونے والا تھا۔ انھوں نے رومن قانون لاطینی زبان میں پڑھا اور بڑی دیدہ ریزی سے روم کے'' قانون عامہ'' اسنل کے قانون معدلت، ٹیوڈر کے اہم مقامات، ونیم اور ایڈورڈ کے حقیقی جائیداد، کا مطالعہ کیا۔ اپنے پُر خلوص رویے اور کم خود اعتمادی کی بدولت انھوں نے قانون کے امتحان کو بھی ایک پر مشقت کام بنالیا۔ جب انھوں نے امتحان پاس کرلیا تو ان کے ذہن میں تازہ شکوک اور الجھنوں نے یلغار کی۔ انھوں نے قانون پڑھ تو لیا تھا، لیکن کیا وہ پریکٹس بھی کر سکتے تھے؟ اُن کے لیے تو اجنبیوں سے چھوٹی سی پارٹی میں بھی باتیں کرنا مشکل ہوجاتا تھا۔ وہ عدالت میں اپنے مخالف سے لفظی جنگ کیسے کریں گے؟ انھوں نے بڑے بڑے قانون داں (مثلاً سر فیروز) کا نام سن رکھا تھا۔ اور وہ سوچا کرتے تھے کہ ان کے مقابلے میں ان کی کیا بے قدری ہوگی۔ انھوں نے گھبرا گھبرا کے مشورہ لینا چاہا۔ عظیم ہندوستانی قانون داں اور سیاست داں دادا بھائی نوروجی سے ملنے کی ہمت نہ پڑی اگرچہ وہ اس زمانے میں انگلستان ہی میں تھے۔ لیکن ایک انگریز قانون داں نے اس ہندوستانی نوجوان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا مطالعہ وسیع کریں، تاریخ کا علم بڑھائیں اور انسانی فطرت کا مطالعہ کریں۔ گاندھی نے سادہ لوحی سے فوراً علم قیافہ پر ایک کتاب خریدی اور پریکٹس کرنے والے قانون داں کا مشکل رول ادا کرنے کے لیے اپنے کو تیار کرنا شروع کیا۔ اس انگریز قانون داں کی رائے تھی کہ غیر معمولی استعداد، حافظہ اور لیاقت ہی وکالت میں کامیابی کے ضروری لوازم نہیں ہیں بلکہ ایمانداری اور محنت سے بھی قانون داں بہت آگے بڑھ سکتا ہے۔ اس رائے سے جتنی بھی تسکین وہ اخذ کر سکتے تھے، انھوں نے لے لی۔ اس طرح مایوسی ملی ہوئی امید کے ساتھ وہ ہندوستان کے لیے جہاز سے چل پڑے۔

بمبئی پہنچتے ہی انھیں ایک بہت بڑے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ انگلینڈ ہی میں تھے کہ ان کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس المناک واقعہ کی خبر جان بوجھ کر ان سے چھپائی گئی تھی۔ ان کے قلب پر یہ بڑی سخت ضرب تھی۔ کئی سال بعد انھوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا کہ ''میری بہت سی تمنائیں پاش پاش ہوگئیں۔'' بہرحال، سادہ زندگی، ناقابل شکست عقیدہ اور ماں کے لیے انتھاہ پیار ان کے دل پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نقش ہوگیا۔ مستقبل کے اس مہاتما کی تشکیل میں جو لنگوٹی بند رہتا تھا کئی کئی دن تک خاموشی اور فاقے کا عہد کرلیا کرتا تھا، خدا سے ہدایت کا طالب

ہوتا تھا اور نفرت کا جواب محبت سے دیتا تھا، اس کی ماں کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔

اب انھیں اس مودھ بنیا ذات سے نبٹنا تھا، جنھوں نے روانگی انگلستان کے وقت اس کو ذات باہر کر دیا تھا۔ کٹّر پنتھیوں کو خاموش کرنے کے لیے ان کے بھائی نے انھیں اس پر آمادہ کیا کہ وہ ناسک جا کر گوداوری کے پاک پانی میں غسل کر کے اپنی لغزشوں کو دھو ڈالیں۔ اس پرائشچت سے مودھ بنیوں کا صرف ایک طبقہ راضی ہوا دوسرا طبقہ بندش نہ ہٹانے پر اڑا رہا۔ گاندھی نے اس ظلم کا مقابلہ غیر روایتی طور پر کیا۔ انھوں نے نہ احتجاج کیا نہ اپنے مخالفین کے خلاف کسی قسم کا عناد کا مظاہرہ کیا بلکہ اپنے خلاف بائیکاٹ کے نفاذ میں انھوں نے خود تعاون کیا۔ اس رویے سے ذات پات کے ظلم کی دھار مڑ گئی اور دل پگھل گئے۔ بعد میں ان کے بہت سے مودھ بنیا معترضین ان کی سماجی اور سیاسی تحریکوں میں دل و جان سے ان کے ساتھ ہو گئے۔ ان ابتدائی تجربات نے ان میں تلخی پیدا نہ ہونے دی۔ وہ ذات کے ادارے، ورن آشرم دھرم کی برابر حمایت کرتے رہے۔ البتہ ان بدعتوں کی موافقت نہیں کی جو بعد میں اس میں شامل کر دی گئی تھیں۔

گاندھی کو یہ بے چینی تھی کہ وہ اپنے خاندان کی تمنائیں پوری کریں۔ کیونکہ خاندان نے ان کی تعلیم پر کافی لاگت لگا دی تھی۔ ان کے بھائی کو امید تھی کہ دولت، نام اور شہرت کی شکل میں معقول منافع حاصل ہوگا۔ لیکن بیرسٹری کی ڈگری ''کھل جا سم سم'' کا جادو نہیں تھا کہ آدمی فوراً وکالت کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ جائے۔ انگلستان کے نصاب قانون میں ہندو اور مسلم کا قانون شامل نہیں تھے۔ گاندھی نے دیکھا کہ بیرسٹروں کے مقابلے میں راجکوٹ کے وکیل ہندوستانی قوانین بھی زیادہ جانتے تھے اور فیس بھی کم لیتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ انھیں بمبئی جا کر ہندوستانی قوانین کا مطالعہ کرنا چاہیے اور ہائی کورٹ کے تجربے کے ساتھ ساتھ مقدمات بھی حاصل کرنا چاہئیں۔ چنانچہ وہ بڑے جوش و خروش سے قانون کے مطالعے میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے قانون شہادت کو بھی اچھی طرح ہضم کر لیا، مین کے ''ہندو لا'' کو چاٹ گئے اور قانونی ضابطۂ دیوانی سے دست و گریباں ہو کر قابو پا لیا۔

اس طرح ہندوستانی قوانین کے بارے میں ان کا علم تو ضرور بڑھا لیکن آمدنی نہیں۔ اُن دنوں پریکٹس جمانے کی خاطر، دلالوں کو مقدمات لانے کے لیے دستوری دینا جائز سمجھا جاتا تھا

لیکن گاندھی اسے پہلے پیشے کے مرتبے سے گری ہوئی چیز سمجھتے تھے۔ مقدمے بہت کم ملتے۔ آخر تکلیف دہ انتظار کے بعد، انھیں پہلے پہل مامی بائی نام کی ایک غریب عورت کا مقدمہ ملا۔ اس سے انھوں نے تیس روپے فیس لی۔ جب وہ عدالت خفیفہ میں ایک گواہ سے جرح کرنے کھڑے ہوئے تو اپنے خیالات کو سمیٹ نہ پائے اور گھبرا کے پھر کرسی پر بیٹھ گئے لی ہوئی فیس موکلہ کو واپس کر دی۔ یہ آغاز شرمناک تھا اور نوجوان بیرسٹر کے دل پر اس پیشے کے مستقبل کے بارے میں گھٹا ٹوپ مایوسی چھا گئی جس میں وہ بھاری رقم خرچ کر کے داخل ہوئے تھے۔

صورتِ حال کی نزاکت کا اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے بمبئی کے ایک ہائی اسکول میں ستر روپے ماہوار کی معمولی تنخواہ کے ٹیچر کی جز وقتی ملازمت کے لیے درخواست دیدی۔ انھوں نے ثانونی زبان لاطینی لے کر لندن کا میٹریکولیشن امتحان پاس کیا تھا، لیکن اسکول والے جو چیز چاہتے تھے وہ ان کے پاس نہ تھی، یعنی ایک ہندوستانی یونیورسٹی کی ڈگری۔ لندن میٹریکولیشن اُن کو ٹیچر کی نوکری تو نہ دلوا سکا لیکن اس سے ان کی انگریزی ضرور تیز ہوگئی تھی۔ انھیں یہ دریافت کر کے کچھ سکون ہوا کہ انھیں عرض داشتوں، درخواستوں کا مسودہ تیار کرنے کا ملکہ تھا اور اس سے ان کی گزر بسر ہوسکتی تھی۔ ایک عرائض نویس کی حیثیت سے کام کرنے کی غرض سے بمبئی کے قیام کو طول دینا غیر ضروری تھا۔ انھوں نے یہاں کا چھوٹا موٹا کاروبار بند کیا اور راجکوٹ واپس آ گئے۔ یہاں عرائض نویسی سے انھیں تقریباً تین سو روپیہ ماہوار مل جایا کرتے تھے۔

اس کا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مسودہ ساز بیرسٹر کی حیثیت سے جم جاتے، لیکن ان کے سر ایک مشکل آ پڑی۔ ان کے بڑے بھائی لکشمی داس جو کبھی ایک سیاسی عہدہ دار رہ چکے تھے، کسی معاملے میں پھنس گئے تھے۔ انھوں نے گاندھی کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ پولیٹیکل ایجنٹ سے ملیں جس سے ان کی انگلستان کی ملاقات تھی۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو یہ مداخلت ناگوار گزری اور اس نے نوجوان بیرسٹر کو گھر سے باہر نکلوا دیا۔ گاندھی کی بے عزتی کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ انھوں نے سوچا کہ انگریز افسر کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ دائر کریں۔ جن لوگوں کو دنیا۔ برٹش دفتری دنیا۔ کا تجربہ تھا انھوں نے مشورہ دیا کہ ایسا طریقۂ کار خود ان کے لیے بیحد تباہ کن ثابت ہوگا۔ بمبئی کے مشہور قانون داں۔ سر فیروز شاہ مہتا کی رائے لی گئی۔ انھوں نے کہا کہ ”ایسے تجربے بہت سے وکیلوں اور

بیرسٹروں کو آئے دن پیش آتے ہیں۔ گاندھی ابھی انگلستان سے تازہ وارد ہوئے ہیں اور ان کا خون گرم ہے۔ اگر انھیں کچھ کمانا ہے تو ایسی بے عزتی جھیلنا ہی پڑے گی۔'' سیاسی بیداری سے پیشتر یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں برطانوی راج کا طوطی بول رہا تھا۔ پیشہ ورطبقوں کو یہ تکلیف دہ احساس رہتا تھا کہ وہ مقامی افسران کے تابع ہیں۔ برطانوی افسروں کے نفس گرم نے بہت سے پرجوش نوجوانوں کا مستقبل تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

چھوٹے چھوٹے راجاؤں اوران کے منظورنظر افراد میں جو باہمی رسہ کشی مستقل طور سے جاری رہتی تھی اس کی وجہ سے کاٹھیاواڑ کا ماحول سازشوں اور رشوت خوری سے مملو ہو گیا تھا۔ یہ کسی طرح گاندھی کو سازگار نہ ہوسکتا تھا۔ ان کا زیادہ تر کام پولیٹیکل ایجنٹ کی عدالت میں پڑتا تھا لیکن گاندھی سے اس کی بدگمانی لاعلاج ہو چکی تھی، ان حالات میں ان کے پاس جیسے ہی جنوبی افریقہ سے ایک کام کی پیش کش آئی تو انھوں نے بے پس وپیش اسے قبول کرلیا۔ چالیس ہزار پونڈ کی مالیت کے ایک مقدمے میں انھیں ایک سال کے لیے کام کا معاہدہ کرنا تھا، معاوضہ ایک سو پانچ پونڈ تھا اور فرسٹ کلاس درجے میں آمد ورفت کا کرایہ دیگر واقعی اخراجات اس کے علاوہ تھے۔ یہ فیس معمولی تھی۔ یہ بھی واضح نہیں تھا کہ انھیں ایک وکیل کی حیثیت سے بلایا گیا تھا یا منشی کی حیثیت سے۔ لیکن موجودہ حالت میں ترک واختیار کا فیصلہ ان کے بس میں نہیں تھا۔ وضاحت چاہے بغیر انھوں نے پیش کش قبول کر لی۔

اب دوسرا سمندری سفر درپیش تھا۔ حالاں کی ستم ظریفی دیکھئے کہ پہلے ہی سفر کی طرح موجودہ سفر بھی مشکلات سے فرار کا ایک ذریعہ بن گیا۔ 1888 میں انھوں نے سفر انگلستان کا اس لیے خیر مقدم کیا تھا کہ بھاؤنگر کالج میں آگے چلنا ناممکن ہو گیا تھا، پانچ سال بعد انھوں نے جنوبی افریقہ میں سال بھر کا بن باس اس لیے لیا کہ ان کے وطن میں اُن کی خود پسندی اور پیشے کے مستقبل کو زبردست طمانچے لگے تھے۔

اس وقت انھیں اس کا تصور بھی نہیں تھا کہ جنوبی افریقہ کی مہم سے ان کے لیے عوام کی خدمت اور بلوغ فکر کی بہت سی راہیں کھل جائیں گی۔ جس مغرور برطانوی افسر نے اس نوجوان بیرسٹر کو اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس نے نادانستہ طور پر برطانوی سلطنت کو سب سے بڑا نقصان پہنچایا۔

باب 4

فیصلہ کن سفر

مئی 1893 میں گاندھی ڈربن پہنچے۔ ان کے موکل عبداللہ جو ناٹال کے ہندوستانی تاجروں میں سب سے زیادہ مالدار تھے، ان کے استقبال کو آئے، نوجوان بیرسٹر کا مغربی لباس اور شہری اطوار دیکھ کر تاجر سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں انھوں نے سفید ہاتھی کو تو اجرت پر نہیں بلا لیا تھا؟ فریق مخالف کی طرف سے پریٹوریا میں (جہاں مقدمہ چل رہا تھا) ان کی راہ میں جو چارہ پھینکا جائے گا۔ کیا یہ اس کے لوبھ سے بچ پائیں گے؟ جیسے نوجوان بیرسٹر اور بوڑھے تاجر کو یہ پتہ چلا کہ وہ دونوں ہی مذہبی رجحان رکھتے ہیں تو یہ سب خدشات مٹ گئے۔

ڈربن کے مختصر قیام کے دوران اُن کی نسلی تعصب کے پریشان کن ثبوت ملے۔ عبداللہ انھیں ڈربن کی عدالت دکھانے لے گئے۔ یوروپین مجسٹریٹ نے انھیں پگڑی اتارنے کا حکم دیا۔ گاندھی نے انکار کر دیا اور عدالت کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ انھوں نے ایک مقامی اخبار میں احتجاجی خط لکھا۔ اخبار میں ان کا ذکر ''ناخوشگوار مہمان'' کے لفظوں میں کیا گیا۔ ان کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اس کے پہلے انھیں اس طرح کے کھلم کھلا نسلی تعصب سے سابقہ نہیں پڑا تھا، اور انگلستان میں تو انھیں بہت سے انگریزوں سے ملنے کا موقع ملا تھا جن کی خوش اخلاقی اور خیر خواہی کی یادیں ان کے ذہن میں محفوظ تھیں۔

ڈربن کے پریٹوریا کے سفر کے دوران میں ان کو جو کچھ پیش آیا، اس کے مقابلے میں ڈربن کا تجربہ ہیچ تھا۔ جب ان کی ٹرین رات گئے میرٹیز برگ پہنچی تو ان سے کہا گیا کہ وہ اس ڈبّے سے چلے جائیں انھوں نے انکار کیا لیکن انھیں بے تکلف فرسٹ کلاس ڈبے سے اتار دیا گیا۔ کڑکڑاتے جاڑے کی رات انھوں نے اندھیرے ویٹنگ روم میں گزاری۔ اُس کمرے میں سکڑے ہوئے وہ گزرے واقعے پر دیر تک سوچتے رہے۔ ان کے موکل نے انھیں اس سے بالکل آگاہ نہیں کیا تھا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانی کو کیسی ذلت کی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ کیا وہ اس معاہدے کو توڑ کر ہندوستان واپس چلے جائیں، وہ ان بدسلوکیوں کو سودے کا حصہ مان کر سر تسلیم خم کردیں؟ ابھی ابھی انھیں ہندوستان اسی لیے چھوڑنا پڑا تھا کہ وہاں کے پولٹیکل ایجنٹ کی ناخوشی مول لے کر راج کوٹ میں ان کے لیے رہنا ناممکن ہوگیا تھا۔ اب کیا وہ اس لیے ہندوستان جائیں کہ جنوبی افریقہ کے حالات ان کے لیے بے حد ناقابل برداشت ہیں؟ انھوں نے محسوس کیا کہ انھیں کہیں نہ کہیں تو خط فاصل کھینچنا ہی ہوگا ''ہرچہ بادا باد'' کہہ کر انھوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔

اس زمانے میں چارلس ٹاؤن ریلوے کا آخری اسٹیشن تھا۔ وہاں سے اسٹینڈرٹن کے لیے انھیں گھوڑا گاڑی لینا تھی۔ انھیں بتایا گیا کہ وہ گاڑی میں یورپین مسافروں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ انھیں کوچبان کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن سے پائدان (فٹ بورڈ) پر سوار ہوکر چلنے کو کہا گیا۔ انھوں نے انکار کیا اور کہا کہ انھیں گاڑی کے اندر کی وہی سیٹ دی جائے جس کے حقدار ہیں۔ گاڑی کے سفید فام افسر متعلقہ کے لیے یہ گستاخی ناقابل برداشت تھی۔ وہ گاندھی پر ٹوٹ پڑا اور انھیں بڑی بے رحمی سے مارنے لگا۔ آخر کار بعض یورپین مسافروں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ گاندھی نے مار برداشت کر لی لیکن اپنی نشست سے سرمو جنبش نہ کی۔ یہ کلاسیکی منظر کسی عظیم فن کار کے لیے مناسب موضوع ہوسکتا تھا۔ خاموشی ہمت اور انسانی تمکنت، نسلی تکبر اور وحشیانہ طاقت سے نبرد آزما تھی۔

اسٹینڈرٹن پہنچ کر گاندھی بعض ہندوستانی تاجروں سے ملے۔ انھوں نے بتایا کہ ان پر آج جو کچھ بیتی ہے وہ ٹرانسوال کے ہندوستانیوں پر آئے دن بیتتی رہتی ہے انھوں نے کوچ کمپنی کے ایجنٹ سے معاملے کی رپورٹ کی لیکن انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ حملہ آوروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا ارادہ نہیں رکھتے۔ جانسبرگ میں وہ گرانڈ ہوٹل پہنچے وہاں ان سے کہا گیا کہ ہندوستانی وہاں

قیام نہیں کر سکتے۔ انھیں جانسبرگ کے اسٹیشن ماسٹر کو ریلوے قواعد کے طویل اقتباسات سنانا اور اس کو خاص طور سے قائل کرنا پڑا تب وہ انھیں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ دینے پر راضی ہوا۔ اگر ایک یورپین مسافر آڑے نہ آیا ہوتا تو شاید وہ دوبارہ فرسٹ کلاس ڈبے سے باہر نکال دیے جاتے۔

ڈربن سے پریٹوریا کا پانچ دن کا سفر ایک طویل المدت سوہان روح بن گیا لیکن اس کی بدولت گاندھی کی نظروں کے سامنے جنوبی افریقہ میں آنے والے ہندوستانیوں کی حالت کا نہایت ہی ڈرامائی منظر پیش ہو گیا۔ ہندوستانی تاجر جس طرح روزانہ کی آمدنی اپنی جیبوں میں ڈال لیا کرتے تھے اسی طرح انھوں نے اس طرح کی ذلت کو بھی جیب میں ڈال کر بھول جانا سیکھ لیا تھا۔ گاندھی کا یہ تجربہ نیا نہیں تھا لیکن ان کا ردّعمل ضرور نیا تھا۔ گاندھی نے ابھی تک اپنی بات پر اڑ جانے کی خصوصیت کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ اس کے برعکس مریضانہ حد تک شرمیلے اور تنہائی پسند تھے لیکن جب میرٹز برگ ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں سنکتی ہوئی ہواؤں کے مایوس کن ماحول میں وہ اپنی بے عزتی کے احساس سے سخت اذیت میں مبتلا ہوئے تو ان پر نہ جانے کیا گزری کہ وہ فولا دان کی روح میں پیوست ہو گیا جب وہ ماضی کا تصور کرتے تو یہ واقعہ ان کی زندگی کا سب سے اہم تخلیقی تجربہ ثابت ہوا اس لمحے سے، انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ناانصافی کو جنوبی افریقہ کا فطری یا غیر فطری دستور نہ مانیں گے۔ وہ بحث کرتے استدلال کرتے۔ حکمراں قوم کی بہتر قوت فیصلہ اور دل میں چھپی ہوئی انسانیت سے اپیل کرتے، مقاومت کرتے لیکن کسی حالت میں نسلی تکبر کا بخوشی نشانہ بننے کو تیار نہ ہوئے یہ اپنی عزت سے زیادہ اپنی قوم، وطن بلکہ انسانیت کی عزت کی بازیابی کا سوال تھا۔ ہندوستانی آبادکاریوں کی کثیر آبادی کا بے چارگی سے حالات پر صبر کرنا، ان کا علم سے محروم ہونا، حقوق کا فقدان اور اپنے حقوق پر اصرار نہ کرنا ان سب نے مل کر ان پر جادو کا اثر کیا اور ان کی ہچکچاہٹ ختم ہو گئی۔ جو احساس کمتری انگلستان میں تعلیم کے دوران اور ہندوستان میں بیرسٹری کے زمانے میں ان کا مسلسل تعاقب کرتا رہا وہ بالکل غائب ہو گیا۔ بمبئی میں معمولی عدالت خفیفہ کا سامنا کرنے میں وہ ناکام ہو گئے تھے لیکن پریٹوریا آنے کے بعد انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ انھوں نے وہاں کے ہندوستانی باشندوں کا ایک جلسہ طلب کیا تاکہ ان کے روبرو ٹرانسوال میں ان کی حالت زار کی تصویر کشی کر سکیں۔ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ گاندھی نے یہ

تجویز پیش کی کہ ہندوستانی برادری کی شکایات کے اظہار کے لیے ایک ادارے کی تشکیل کی جائے اس عملی قیادت کا ایک علامتی مظاہرہ یہ تھا کہ انھوں نے جو ہندوستانی تاجر انگریزی سیکھنا چاہتے تھے انھیں انگریزی سکھانے کی پیش کش کی۔ ان کے پہلے تین شاگردوں میں ایک نائی، ایک کلرک اور ایک چھوٹا دکاندار تھا۔ ان کو ان کی جائے قیام پر وہ مفت پڑھانے جاتے تھے وہ شہر کے ہر ہندوستانی سے واقف ہو گئے انھوں نے ہندوستانی برادری کی مجبوریوں اور مشکلوں کی طرف پریٹوریا کے برطانوی ایجنٹ کی توجہ مبذول کرائی۔ ان کا رویہ ہمدردانہ تھا لیکن ٹرانسوال کے بوئر اسٹیٹ میں واقع ہونے کی وجہ سے جو برطانوی سلطنت کے حدود میں شامل نہ تھا۔ اس نے معذوری ظاہر کی۔ بوئر حکومت پہلے ہی بہت سے ہندوستانی آبادکاروں کو آرینج فری اسٹیٹ سے بھگا چکی تھی۔ جنوبی افریقہ میں عزتِ نفس کا خیال رکھنے والے ہندوستانی کی جگہ نہ تھی۔ اس ذہنی بے چینی کے عالم میں گاندھی نے اور شدت سے یہ سوچنا شروع کیا کہ صورت حال کو کیسے درست کیا جائے۔

اسی دوران میں انھیں اس مقدمے کی طرف متوجہ ہو جانا پڑا جس کی بدولت ان کا جنوبی افریقہ میں آنا ہوا تھا۔ اس مقدمے میں چالیس ہزار پونڈ کی کثیر رقم کے علاوہ، یہ ناٹال کے عبداللہ اور ٹرانسوال کے طیب سیٹھ، جنوبی افریقہ کے دو سب سے بڑے ہندوستانی تاجروں کی تجارتی رقابت اور خاندانی جھگڑوں کا معاملہ تھا۔ اپنے وطن کے مقدمہ بازوں کی روایت کے مطابق ان دونوں تاجروں نے طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو لیکن اس کا آخری فیصلہ کرا کے ہی دم لیں گے۔ گاندھی کو یہ معمولی خدمت سپرد ہوئی تھی کہ وہ عبداللہ کی فرم کے حساب کتاب کی جانچ کریں گے اور وکیل و موکل میں رابطے کی کڑی بنے رہیں گے۔ نوجوان بیرسٹر کو اکاونٹ کلرک کے فرائض برے نہیں لگے جو دوسروں کی نظر میں ذلت کا کام تھا اسے گاندھی نے زرّیں موقع سمجھا۔ انھوں نے مقدمے کی تہہ میں جا کر تمام تفصیلات کو دیکھا، بہی کھاتے اور کاروباری طریقوں کا علم حاصل کیا اور گجراتی زبان سے، جس میں حسابات لکھے جاتے تھے، لمبے لمبے ترجمے کر کے اپنی انگریزی مشق بھی بڑھائی۔ انھوں نے بڑے غور سے دیکھا کہ انھوں نے جو مواد تیار کیا تھا۔ اس کو وکیل کس طرح ترتیب دیتا تھا اور کس طرح مقدمے کی مسل تیار کرتا تھا۔

اس زمانے میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ وکالت کے پیشے میں قوت استدلال و خطابت کی بازی

گری اور قانون کی کتابوں سے اقتباسات پر اقتباسات پیش کرنا ہی نقطۂ عروج ہے۔ اس مقدمے پر سال بھر محنت کرنے کے بعد انھوں نے یہ سیکھا کہ وکیل کا اصلی کام واقعات کی ترتیب اور حقیقت کی دریافت ہے۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ نہ وہ شعلہ بیان مقرر ہیں نہ عالم لیکن کامیابی کے لیے وہ اپنی ایمانداری اور محنت پر بھروسہ کر سکتے تھے۔ اس مقدمے نے انھیں وہ باتیں سکھائیں جو ایک مبتدی بیرسٹر کسی تجربہ کار بیرسٹر کے چیمبر میں سیکھتا ہے۔ اس سے ان میں یہ اعتماد بھی پیدا ہوا کہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ بیرسٹر کی حیثیت سے ناکام رہیں اور یہ بھی کہ قانون کا تین چوتھائی واقعات ہیں اور اگر ہم سچائی کا دامن تھامے رہیں تو قانون فطری طور سے ہماری مدد کو آتا ہے۔

واقعات کے قریبی مطالعے سے انھیں معلوم ہوا کہ عبداللہ کا مقدمہ واقعہ اور قانون کے اعتبار سے مضبوط ہے لیکن انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مقدمہ بازی میں فریقین کی تباہی ہوگی۔ وکیلوں کی چڑھتی ہوئی فیس، معمولی کاروبار میں لازمی خلل اور طرفین میں دشمنی۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے یہ کہیں بہتر تھا کہ عدالت کے باہر مقدمہ طے کر لیا جائے۔ طرفین نے بادل ناخواستہ ثالثی کی منظوری دی۔ ثالثوں نے عبداللہ کے حق میں فیصلہ دیا۔ اگر اس فیصلے کا فوری نفاذ کر دیا جاتا تو طیب سیٹھ کا دیوالہ نکل جاتا۔ گاندھی نے اپنے موکل کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ لمحۂ فتح کے وقت فیاضی کا مظاہرہ کریں اور قسطوں میں ادائیگی پر رضامند ہو جائیں۔ وہ اپنے پہلے اہم مقدمے کو یاد کر کے اطمینان محسوس کرتے تھے ''میں نے مقدمے کی پیروی سیکھ لی تھی، مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ انسانی مزاج کا بہتر پہلو کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے اور انسانوں کے دلوں میں کیسے جگہ بنائی جا سکتی ہے۔ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وکیل کا اصلی کام یہ ہے کہ جو ایک دوسرے سے کٹ گئے ہیں انھیں پھر سے کیسے متحد کیا جائے۔''(1)

اس کے بعد مسلسل طور سے ان کی یہی کوشش رہتی کہ مقدمہ بازی کے بجائے عدالت کے باہر صلح کرا دی جائے اس طریق کار سے صرف مقدمہ بازوں ہی کو فائدہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ''میرا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ روپے بھی ہاتھ سے نہیں گئے اور روح تو یقیناً نہیں گئی'' انھوں نے یہ تاثر کئی برس بعد قلم بند کیا تھا۔

1۔ گاندھی، ا م ک: خودنوشت سوانح، (انگریزی) احمد آباد (1940ء) ص: 168

باب 5

سیاست میں درّانہ داخلہ

پریٹوریا کا دیوانی مقدمہ بخیر وخوبی ختم ہو چکا تھا اور گاندھی کا معاہدہ بھی۔ وہ ہندوستان کے لیے جہاز پکڑنے ڈربن آئے۔ ان کے احسان مند موکل عبداللہ نے انھیں ایک وداعی پارٹی دی۔ وہاں اتفاق سے گاندھی کی نظر ''ناٹال مرکری'' نامی ایک انگریزی اخبار پر پڑی۔ انھوں نے ایک خبر پڑھی جس کا عنوان تھا ''ہندوستانیوں کا حق رائے دہندگی'' ناٹال کی مقنّنہ میں ایک مسودہ قانون اس نظر سے پیش کیا گیا تھا کہ ہندوستانی آبادکاروں کو حق رائے دہندگی سے محروم کر دیا جائے لیکن گاندھی کے میزبان اور دوسرے تاجر جو اس پارٹی میں شامل تھے اس قانون پر کوئی روشنی نہ ڈال سکے۔ وہ اتنی انگریزی ضرور جانتے تھے کہ گوری نسل کے گاہکوں سے انگریزی میں بات چیت کر سکیں لیکن ان میں سے شاذ ہی لوگ اخبار پڑھ سکتے تھے۔ ناٹال کی مقنّنہ کی کارروائی تو خیر سے ان کی سمجھ میں کیا آئی۔ وہ ناٹال میں تجارت کی غرض سے آئے تھے اور سیاست سے انھیں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ انھیں اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ کہ سیاست کا اثر ان کے کاروبار پر بھی پڑ سکتا ہے۔ ابھی کتنے دن پہلے کی بات ہے کہ آرینج فری اسٹیٹ (جنوبی افریقہ کی ایک دوسری ریاست) سے ہندوستانی تاجروں کو نکال باہر کیا گیا تھا اور اب ناٹال میں ایک نسلی قانون پیش ہونے جا رہا تھا۔ ''ہمارے تابوت میں یہ پہلی کیل ہے'' گاندھی نے تبصرہ کیا۔ ناٹال کے ہندوستانی

تاجروں نے ان سے استدعا کی کہ وہ ناٹال میں رک کر ان کے حقوق کے لیے جنگ کریں۔ ابھی تک وہ یورپین بیرسٹروں پر بھروسہ کرتے آئے تھے۔ اب انھیں یہ خوشی تھی کہ ان کے پاس ایک ہندوستانی بیرسٹر موجود ہے وہ اس پر راضی ہو گئے کہ ایک مہینے تک ہندوستان کی واپسی ملتوی کر دیں امید تھی کہ اس عرصے میں ہندوستانیوں کے حق رائے دہندگی کا فیصلہ ہو جائے گا۔

گاندھی نے کام شروع کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں کی۔ وداعی پارٹی ایک سیاسی پارٹی میں تبدیل ہو گئی مقصد یہ تھا کہ مسودہ قانون کے خلاف ہندوستانیوں کی مخالفت کو منظّم کیا جائے۔ خیال ہے کہ کسی سچے اندرونی وجدان نے اس پچیس سالہ بیرسٹر کی رہنمائی کی ہوگی۔ تبھی وہ اپنے پہلے سیاسی آندولن کی تنظیم کر سکے۔ پریٹوریا میں انھیں ہندوستانی تاجروں کے مسائل کا جو علم حاصل ہوا تھا، وہ یہاں بڑے کام آیا۔ انھوں نے ایک تین رخی طریق کار اپنایا۔ پہلے تو ہندوستانی آبادی کے مختلف النوع عناصر کے درمیان یک جہتی کا جذبہ بیدار کرنا تھا۔ مسلمان تاجروں اور پارسی منشیوں، نیم غلام مدراسیوں، معاہدہ بند مزدوروں اور ناٹال زائیدہ ہندوستانی عیسائیوں، سبھوں کو یہ احساس دلانا تھا کہ ان کی اصل ایک ہے۔ ہندوستانی عیسائیوں کو یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ عیسائی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی ہندوستانیت ختم ہو گئی۔ تاجروں کو یہ تسلیم کرانا تھا کہ ان غریب معاہدہ بند مزدوروں سے بھی ان کا رشتہ تھا جنھیں اتھاہ غریبی ناٹال جیسے دور افتادہ مقام پر کھینچ لائی تھی، دوسرے حقوق رائے دہندگی سے محروم کرنے والے قانون کے اثرات اور عوارض سے ہندوستانی برادری کو بھی آگاہ کرنا تھا اور یورپین رائے عامہ کے سمجھ دار حلقے کو بھی۔ سب سے بڑھ کر، ہندوستانیوں کے معاملے کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کرنا تھی تاکہ ہندوستان اور برطانیہ عظمیٰ کی حکومتوں اور عوام کے ضمیر کو جھنجھوڑا جا سکے۔ حکومت ہند خود مختار نہ تھی لیکن اس پر کچھ نہ کچھ اخلاقی ذمہ داری اس لیے عائد ہوتی تھی کہ ناٹال کے یورپینوں کو زیادہ خوش حال بنانے کی غرض سے اسی نے ان لوگوں کو ملک سے باہر جانے کی اجازت دی تھی۔ لندن کی شہنشاہی حکومت کو اس کا اختیار حاصل تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو وہ ناٹال کی مقنّنہ کے پاس کیے ہوئے بلوں کی منظوری نہ دے اور گاندھی کو یہ امید تھی کہ شاید حکومت کو اسی پر آمادہ کیا جا سکے کہ وہ مداخلت کر کے جنوبی افریقہ میں اس نسلی امتیاز کا انسداد کرے جو ملکہ معظّمہ کی ہندوستانی رعایا کے خلاف برتا جا رہا تھا۔

رائے عامہ کے ایک معمار کی حیثیت سے گاندھی کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دسمبر 1894 کے سالانہ اجلاس میں انڈین نیشنل کانگریس نے ناٹال میں رائے دہندگی سے محروم کرنے والے قانون کے خلاف احتجاج کیا اور آنے والے تین برسوں میں ''لنڈن ٹائمز'' نے جنوبی افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کے مسئلے پر آٹھ اداریے لکھے۔ ایک عرض داشت جس کا مسودہ گاندھی نے تیار کیا تھا اور جس پر چار سو ہندوستانیوں کے دستخط تھے۔ ناٹال کی مجلسِ قانون ساز میں پیش کی گئی۔ عرض داشت سے ناٹال کی مجلسِ قانون ساز اور حکومت میں ہلچل پڑ گئی لیکن قانون بہر حال پاس کر دیا گیا۔ ناکامی سے ہندوستانیوں کے حواس معطل نہیں ہوئے۔ کم سے کم وہ اپنی سیاسی کاہلی چھوڑ کر چونک پڑے تھے۔ جہاں تک گاندھی کا تعلق ہے اس سے پہلے سیاسی اندولن کی بدولت جس میں حالات نے انھیں ڈالا تھا۔ ان کو ان کے احساس خودنگری سے چھٹکارا دلا گئے جو ناقابل علاج نظر آتا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ خود پسندی نے ان پر یکا یک حملہ کر دیا ہو کیونکہ انھوں نے دادا بھائی نوروجی کو جو انڈین نیشنل کانگریس کے نمایاں لیڈر اور اسی کے ساتھ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے۔ 5 جولائی 1894 کے خط میں لکھا: ''اپنے بارے میں ایک بات کہہ کر گفتگو ختم کروں گا۔ میں تجربہ کار اور نوجوان ہوں اس لیے اس کا امکان ہے کہ میں غلطیاں کروں جو ذمہ داری میں نے اپنے سر لی ہے اس کو میری صلاحیتوں سے کوئی نسبت نہیں ہے اس لیے آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ میں نے یہ مسئلہ جو میری صلاحیتوں سے باہر ہے اس لیے ہاتھ میں نہیں لیا ہے کہ ہندوستانیوں کو نقصان پہنچا کے خود دولت مند بن جاؤں۔ یہاں میرے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں جو اس مسئلے کو ہاتھ لگائے۔ ان حالات میں آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہوگا اگر آپ مہربانی کر کے مجھے راہ بتائیں حکم دیں اور مجھے ضروری مشوروں سے نوازیں۔ میں ان کا اس طرح خیر مقدم کروں گا جیسے کہ یہ مشورے باپ نے بیٹے کو دیے ہوں۔''

کمتری کا تصور اضافی ہے۔ ایسی برادری میں جو رہنمائی کے لیے گاندھی کی محتاج ہو۔ گاندھی اپنی کوتاہیاں بھول گئے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جس کے سوا وہاں اور کوئی تھا ہی نہیں، گاندھی نے وہ کام سنبھال لیا جس سے کسی دوسری جگہ وہ پیچھے ہٹ گئے ہوتے۔

اب ایک ہی موقع اور باقی رہ گیا تھا۔ ناٹال کی مقنّنہ نے جو بل پاس کیا تھا قانون بننے سے

پہلے اس کے لیے ملکۂ انگلستان کی منظوری ضروری تھی۔ گاندھی نے لندن میں نوآبادیاتی سیکریٹری کے پاس ایک دیوقامت عرض داشت بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ عرض داشت پر دس ہزار افراد کے دستخط تھے۔ ناٹال کے آزاد ہندوستانیوں کی پوری آبادی اس کے گھیرے میں آ گئی تھی۔ گاندھی کا طریق کار یہ تھا کہ اس تحریک میں ہر قدم اس طرح اٹھایا جائے کہ برادری کی سیاسی تعلیم بھی ہوتی چلے۔ مثال کے طور پر اس وقت کسی کو بھی دستخط نہیں کرنے دیا گیا جب تک اس نے اندراجات کو سمجھ کر کلیۃً قبول نہ کر لیا۔ اس کی ایک ہزار کاپیاں چھاپی گئیں اور نمایاں سیاست دانوں اور اخباروں کو ڈاک سے بھیجی گئیں، ہندوستان اور برطانیہ دونوں ہی جگہ ناٹال کے ہندوستانیوں کے معاملات کو وہاں کے اخبارات نے نمایاں طور پر چھاپا۔

اسی دوران میں وہ مہینہ گزر گیا جس میں گاندھی نے اپنا جانا ملتوی کیا تھا۔ ناٹال کے ہندوستانیوں نے ان سے رکنے کی استدعا کی۔ اس کا یقین نہیں تھا کہ برطانوی حکومت اس شرانگیز قانون کو نامنظور کر دے گی۔ اس کے علاوہ کیا خود انھوں نے ہندوستانیوں کو متنبہ نہیں کیا تھا کہ یہ ان کے تابوت میں پہلی کیل ہے؟ کیا اب وہ انھیں منجدھار میں چھوڑ دیں گے اور اپنے کیے کرائے پر پانی پھیر دیں گے؟ گاندھی اپنے قیام کی مدت بڑھانے پر رضامند ہو گئے۔ سوال یہ تھا کہ وہ روزی کیسے کمائیں گے۔ پبلک خدمات کا معاوضہ لینے پر وہ کسی طرح تیار نہ تھے اس لیے بیس تاجروں نے انھیں وکالت کا پیشگی محنتانہ دینے کی پیش کش کی تاکہ کم از کم تین سو پونڈ سالانہ پورے ہو جائیں۔ ڈربن میں ان کے اخراجات کے لیے یہ رقم کافی تھی۔

ناٹال کی بار سوسائٹی نے وہاں کے سپریم کورٹ میں ایک ایڈوکیٹ کی حیثیت سے گاندھی کے داخلے کی مخالفت کی۔ چیف جسٹس نے انھیں داخل کر لیا لیکن پریکٹس کرنے والے بیرسٹروں کے آداب و رسوم کے مطابق انھیں پگڑی اتارنے کا حکم دیا۔ سال بھر پہلے ڈربن کی ایک عدالت ماتحت سے (جہاں وہ ایک مشاہدے کے طور پر گئے تھے) باہر چلے آئے تھے مگر یہ ذلت گوارہ نہ کی تھی۔ اب سپریم کورٹ کے ایک ایڈوکیٹ کی حیثیت سے انھوں نے یہ سوچ کر کڑوی گولی کھالی کہ اگر انھیں نسلی امتیاز کے خلاف جنگ کرنا ہے تو انھیں اس سے بڑے مسائل سے نپٹنا اور دوسرے مواقع کا انتظار کرنا ہوگا۔

گاندھی نے محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کو ایک ایسے مستقل ادارے کی ضرورت ہے جوان کے مفادات کی نگرانی کر سکے۔ دادا بھائی نوروجی نے 1893 کے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی تھی۔ ان کی بزرگی کو مدنظر رکھتے ہوئے گاندھی نے اپنے ادارے کا نام ناٹال انڈین کانگریس تجویز کیا۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے دستورالعمل اوراغراض ومقاصد سے واقف نہ تھے۔ یہ لاعلمی فائدہ بخش ثابت ہوئی کیونکہ انھوں نے اپنے تصورات کے مطابق ناٹال کے ہندوستانیوں کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناٹال انڈین کانگریس کی تشکیل کی۔ اس زمانے کی انڈین نیشنل کانگریس دانشوروں کی ایک بزم مباحثہ تھی اوراس کی سالانہ تقریب میں تقریروں، عرض داشتوں اور احتجاجوں کے بعد درمیانی وقفے میں اس کا نام بھی سنائی نہ دیتا تھا ناٹال ہندوستانی کانگریس کی تشکیل اس طور پر ہوئی تھی کہ ایک فعال ادارے کی حیثیت سے سال بھر کام کرتی رہے اس کا مقصد صرف سیاست نہیں بلکہ اس کے اراکین کی اخلاقی اور سماجی برتری کے لیے کام کرنا بھی تھا۔ اگرچہ یہ ایسی برادری کی خدمت میں مصروف تھی جس کا سیاسی تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیکن یہ کسی شخص واحد کا تماشا نہیں تھی۔ اگرچہ گاندھی نہ تھکنے والے سیکریٹری تھے۔ لیکن انھوں نے ہر قدم پر عام دلچسپی اور ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ممبر سازی اور چندے کی وصولی کو انھوں نے روزمرہ کا معمول بننے سے زیادہ اہمیت دی۔ انھوں نے بادل ناخواستہ موافقت کرنے والوں پر اخلاقی دباؤ ڈالنے کا ایک ایسا طریقہ اپنایا جو نرم تھا مگر جس سے مفر ناممکن تھا۔ ایک دن ایک چھوٹے سے گاؤں میں وہ رات بھر بیٹھے رہے اور انھوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا جب تک صبح کو ان کا میزبان جو ایک ہندوستانی تاجر تھا۔ اپنا چندہ تین پونڈ سے بڑھا کر چھ پونڈ کرنے پر راضی نہ ہوا۔

لندن میں زمانۂ طالب علمی سے ہی گاندھی باقاعدگی سے اپنا روزانہ اخراجات کا حساب رکھتے تھے۔ انھوں نے ناٹال انڈین کانگریس کے حسابات کے سلسلے میں بھی وہی احتساب برتا۔ اس کے حسابات اس خوش اسلوبی سے رکھے جاتے تھے کہ تیس برس بعد انھوں نے یہ لکھا تھا: ''میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ 1894 کے حسابات آج بھی ناٹال انڈین کانگریس کے ریکارڈ میں محفوظ ملیں گے۔'' عوامی فنڈ سے انھوں نے اپنی ذات کے لیے ایک پائی بھی لینا منظور نہیں کیا۔ انھیں یہ احساس تھا کہ اگر وہ ہندوستانی برادری کے بامعاوضہ ترجمان بن گئے تو اس کے بے خوف خادم

نہیں رہ سکتے۔ اس اعتبار سے اعزازی خدمت اربابِ وطن کے سلسلے میں ان کا فریضہ ہی نہ تھی بلکہ خود ان کی آزادیِ نفس کی محافظ بھی تھی۔ سیاسی کارآموزی کے اس ابتدائی دور میں انھوں نے اپنے اصول کار خود بنائے۔ انھوں نے عام پسند نظریے کو کبھی قبول نہیں کیا کہ پارٹی غلط ہو یا صحیح پارٹی کے لیے لڑنا ہی چاہیے۔ تلاشِ واقعات اور حقائق کا جو بے حد شوق انھیں حال ہی میں قانون کی پریکٹس کے سلسلے میں حاصل ہو گیا تھا۔ اس سے انھوں نے سیاست میں بھی کام لیا۔ ان کے نزدیک اگر واقعات موافق ہوں تو ان پر حاشیہ آرائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ مبالغہ سے احتراز کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ناٹال انڈین کانگریس ہندوستانی اقلیت کے سیاسی اور اقتصادی حقوق کی محافظت ہی کا آلۂ کار نہیں تھی بلکہ اندرونی اصلاح اور اتحاد کا وسیلہ بھی تھی۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو بھی نہیں بخشتے تھے اور گھما پھرا کر ان کی کمزوریوں کو بھی سفید کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا معیارِ زندگی بڑھائیں اور کاروبار میں دیانت داری سے کام لیں۔ وہ ناٹامی ہندوستانیوں کے سب سے زیادہ قوی دل وکیل ہی نہیں تھے بلکہ ان کے شدید ترین نقاد بھی تھے۔

ناٹال انڈین کانگریس اور گاندھی ''تاریخ براعظم'' میں جو رول ادا کرنے والے تھے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ اسی منزل پر رک کر ہم ماضی پر ایک نظر دوڑالیں تاکہ مسئلے کا تاریخی پس منظر بخوبی نظر آجائے۔

لارڈ ملنر نے لکھا ہے کہ ''اہل ایشیا اجنبی ہیں اور وہ خود کو ایک ایسی برادری پر عائد کرنا چاہتے ہیں جو ان کو خوش آمدید کہنے سے کترا رہی ہے۔'' سچی بات یہ ہے کہ یورپین نوآبادکاروں کے ایما پر انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ہندوستانیوں کا جنوبی افریقہ میں داخلہ شروع ہوا۔ ان یورپین آبادکاروں کے قبضے میں اچھوتی زمین کے بڑے بڑے رقبے تھے جو چائے کافی اور گنے کی کاشت کے لیے بہت موزوں تھے لیکن ان کے پاس آدمیوں کی کمی تھی۔ غلامی کے خاتمے کے بعد سیاہ فام آبادی کو کام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان حالات میں ناٹال کے یورپینوں نے حکومت ہند سے درخواست کی کہ ہندوستانی مزدوروں کو اس ملک میں جانے کی اجازت دی جائے۔ زمین مالکوں کے بھرتی کرنے والے ایجنٹوں نے مدراس اور بنگال کے سب سے زیادہ گنجان آبادی

والے اور غربت زدہ ضلعوں کا دورہ کر کے ناٹال میں کام کے مواقع کی بڑی خوش آیند تصویر پیش کی۔ سفر خرچ اور کھانا پینا مفت، پہلے سال دس شلنگ ماہانہ اجرت جس میں ہر سال ایک شلنگ کا اضافہ ہوگا اور پانچ سال کے معاہدے کے خاتمے پر ہندوستان واپسی کا کرایہ مفت یا اس کے بدلے میں جس زمین پر کام کرتے رہے ہیں اسی پر آباد ہونے کا استحقاق ان شرائط پر ہزاروں غریب اوران پڑھ ہندوستانی دور دراز ناٹال میں کھنچ آئے۔

معاہدہ بند مزدوروں سے بھرا پہلا جہاز نومبر 1860 میں ڈربن پہنچا۔ 1890 تک تقریباً چالیس ہزار معاہدہ بند مزدوروں کی درآمد ہوئی۔ سر ڈبلو، ڈبلو ہنٹر کے لفظوں میں ان کی حالت نیم غلاموں کی سی تھی۔ سبھی مالک ظالم نہیں تھے لیکن بدسلوکی کی صورت میں مالکوں کو بدلنا ممکن نہیں تھا۔ اگر پانچ سال کے بعد کوئی مزدور اپنے معاہدے کی تجدید نہ کرتا تو اس پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی جاتیں بہرحال بہت سے ہندوستانی جنھوں نے اپنے رشتے ہندوستان سے توڑ لیے تھے انھوں نے ناٹال میں بس جانے کو ترجیح دی۔ انھوں نے چھوٹی چھوٹی آراضیاں خریدیں، ترکاریاں بوئیں، شریفانہ طور پر رہنے لگے اور انھوں نے اپنے بچوں کو تعلیم بھی دلوائی۔ اس سے یورپین تاجروں کا جذبۂ حسد بھڑکا اور انھوں نے شور مچانا شروع کیا کہ ہر ہندستانی مزدور جو اپنی میعاد میں توسیع نہیں کراتا زبردستی اپنے ملک کو واپس بھیج دیا جائے دوسرے لفظوں میں ناٹال میں ہندوستانی کی یا تو غلام کی حیثیت سے ضرورت تھی۔ یا بالکل نہ تھی۔ 1885 میں ہندوستانیوں کے داخلے کے بارے میں ایک کمیشن بٹھایا گیا۔ اس کی تحقیقات کے بموجب یورپین رائے عامہ تجارت، خواہ زراعت دونوں ہی میدانوں میں آزاد ہندوستانیوں کی موجودگی کے سخت خلاف تھی۔ کمیشن کے خیال میں سابق معاہدہ بند ہندوستانی اوراس کی وطن کو واپسی نہ صرف اس کے حق میں غیر منصفانہ تھی۔ بلکہ نوآبادی کی معیشت کے لیے بھی تباہ کن تھی۔ اس کے باوجود یہ دلیل کہ مفاد ذاتی کو روشن خیالی پر مبنی ہونا چاہیے۔ ان حضرت کے حلق کے نیچے نہ اترتا تھا جن کو یہ خوف کھائے جارہا تھا کہ یورپیوں کے مقابلے میں ہندوستانی کم حیثیت طور پر زندگی گزارے گا اور ان سے کم داموں پر چیزیں بیچے گا۔

1893 میں ناٹال کو ذمہ دار حکومت مل جانے کے بعد نسلی امتیاز کی پالیسی کے خلاف لندن

نوآبادیاتی کی جانب سے کی جانے والی رہی سہی روک ٹوک بھی ختم ہوگئی۔ ناٹال سے ایک وفد یہ تجویز لے کر ہندوستان چلا کہ جبری معاہدہ بندی ہو یا جبری طور سے تمام ہندوستانی مزدور وطن کو لوٹا دیے جائیں۔ وفد کی متبادل تجویز یہ تھی کہ فی کس پچیس پونڈ سالانہ (Poll) ٹیکس دیا جائے۔ برطانوی ہند کے افسران ناٹال کے حالات سے جتنے ناواقف تھے اتنے ہی وہ وہاں کے یورپین زمین مالکوں کی کسی نہ کسی طرح مدد کرنے کو بے چین بھی تھے۔حکومت ہند اس بات پر راضی ہوگئی کہ سابق معاہدہ بند مزدوروں کے خاندان کا ہر ایسا رکن جو اس معاہدے کے تحت، جو ہندوستان سے اس کے ترکِ وطن کے وقت ہوا تھا صرف ناٹال میں بسنے کے حق کو استعمال کرنے کے عوض تین پونڈ کا ٹیکس ادا کرے۔غریب ان پڑھ اور غیر منظّم ہونے کی وجہ سے وہ بے دست و پا تھے اور اگر کسی حلقے سے انھیں مدد کی کوئی توقع تھی تو وہ ہندوستانی تاجر تھے۔

ہندوستانی تاجر ہندوستانی مزدوروں کے پیچھے پیچھے جنوبی افریقہ پہنچے تھے اور سیاہ فاموں اور ہندوستانیوں کے درمیان ان کے مال کی اچھی کھپت تھی۔ سیاہ فاموں کو یہ محسوس ہوتا کہ ہندوستانی تاجر یورپین تاجر سے زیادہ خوش اخلاق اور کچھ کم لالچی ہے، بہر حال ہندوستانی تاجر کی بڑھتی ہوئی خوش حالی یورپین تاجر کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ ہندوستانیوں کو حقوق رائے دہندگی سے محروم کرنے کے قانون جس کے باعث گاندھی نے ناٹال میں اپنے قیام کو طول دیا تھا۔ ہندوستانی تاجروں کو ہی نظر میں رکھ کر پیش کیا گیا تھا۔ پچاس پونڈ کی مالیت کی جائیداد غیر منقولہ یا دس پونڈ سالانہ لگان کی جو شرط حق رائے دہندگی کے لیے لگائی گئی تھی اس کے مطابق دس ہزار یورپینوں کے مقابلے میں صرف ڈھائی سو ہندوستانی ووٹروں کی فہرست میں درج ہو پائے تھے۔ چند ہندوستانی ووٹروں کا درج فہرست ہونا بھی یورپینوں کو خطرے کا نشان نظر آ رہا تھا۔ یہ یورپین کسی بھی گہرے رنگ والے کو وہ سیاہ فام ہو، سانولا ہو یا پیلا۔ ناٹال کی دولت یا حکومت میں شریک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ناٹال کے سیاستداں اپنے مقصد کو صیغۂ راز میں رکھنا نہیں چاہتے تھے انھیں میں سے ایک نے یہ مقصد ان لفظوں میں بیان کیا کہ ''ہندوستانیوں کو کافر کی سطح تک پست کر دیا جائے اور مستقبل میں جو جنوبی افریقی قوم (نیشن) بننے جا رہی ہے اس کا حصہ بننے سے روکا جائے۔'' ایک اور سیاست داں نے اعلان کیا کہ قانون کا مقصد یہ تھا کہ ''ہندوستانیوں کی زندگی ناٹال کے

مقابلے میں خود ان کے ملک میں زیادہ آرام دہ بنا دی جائے۔''

ہندوستانیوں کو حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کا مسودہ قانون ناٹال کی مجلس قانون ساز نے پاس کر دیا اور گورنر نے اس کی منظوری بھی دے دی۔ لندن کے نوآبادیاتی آفس نے بڑی حد تک گاندھی کی احتجاجی تحریک سے متاثر ہو کر مسودہ قانون کی منظوری دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اس میں برطانوی سلطنت کے دوسرے حصے کے باشندوں کے خلاف امتیازی سلوک برتا گیا تھا اس نامنظوری (ویٹو) سے ناٹال کے یورپینوں نے ہار نہیں مانی۔ نسل ورنگ کے امتیاز کا واضح لفظوں میں اظہار کیے بغیر انھوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اب ایک ترمیم شدہ قانون پاس کیا گیا اس کے مطابق ''اصلی یورپین ملکوں کو چھوڑ کر'' کسی ایسے ملک کے باشندوں کا نام، جہاں ایسے نمایندہ انتخابی ادارے نہ ہوں۔ جو پارلیمانی حق رائے دہندگی پر مبنی ہوں۔ رائے دہندوں کی فہرست میں گورنر جنرل سے استثنائی حکم حاصل کیے بغیر درج نہیں کیا جا سکتا۔''
اگر چہ یہ ترمیم شدہ مسودہ قانون میں پہلے والے مسودے ہی کی طرح جسے برطانوی حکومت نے ویٹو کر دیا تھا۔ ہندوستانیوں کے حق رائے دہندگی پر مؤثر روک لگا دی گئی تھی لیکن ایک طرح کا فائدہ ہوا تھا کہ قانون میں نسلی امتیاز کا ذکر صریحاً نہیں آیا تھا۔

ہندوستانیوں کی تجارت اور ان کے ملک میں داخلے پر بھی بے پناہ پابندیاں لگائی گئیں۔ آیندہ سے ناٹال میں کوئی بھی لائی سنس حاصل کیے بغیر تجارت نہیں کر سکتا تھا۔ یورپینوں کو یہ لائی سنس منہ مانگے مل جاتا تھا لیکن ہندوستانیوں کو اگر ملتا بھی تھا تو کافی خرچ اور بے حد دوڑ دھوپ کے بعد اور چونکہ اب کسی یورپین زبان میں تعلیمی امتحان ملک میں آنے والے کے لیے لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔ ہندوستان جو لوگ آ سکتے تھے۔ ان کی اکثریت پر دروازہ بند بلکہ مقفل کر دیا گیا۔ بس وہی نیم غلامی معاہدہ بند مزدور ہی آ سکتے تھے اور ان کی درآمد جاری رکھی گئی۔

اس ہندوستان مخالف تحریک میں ناٹال کے یورپین، ٹرانسوال اور آرینج فری اسٹیٹ کے بوئر پڑوسیوں کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ ٹرانسوال (بوئر) ریپبلک کے بلند بانگ صدر کرو گر نے ایک ہندوستانی وفد سے کہا تھا۔ تمہارا سلسلہ نسب اسماعیل سے ملتا ہے اس لیے تمھیں پیدائشی طور پر عیسیٰ کے وارثوں کی غلامی کرنا ہے۔ برطانوی حکومت کا ایک نمائندہ پریٹوریا میں مقیم

تھا لیکن اس نے بے دست و پائی کا اظہار کیا۔ جب جنگ بوئر چھڑی تو بوئر پر جو فرد جرم عائد ہوئی اس میں ہندوستانیوں سے بدسلوکی بھی تھی۔ آگے چل کر ہندوستانیوں کو یہ معلوم ہو جانے والا تھا کہ انھیں نہ برطانوی باشندے سے انصاف مل سکتا تھا نہ بوئر سے۔

ہندوستانیوں کی قانونی محرومیاں ہی کچھ کم بری نہ تھیں لیکن انھیں روزمرہ کی زندگی میں جس بے حرمتی کا سامنا کرنا پڑتا تھا وہ اس سے بھی بری تھیں۔ کسی امتیاز کے بغیر ہر ہندوستانی کو ''قلی'' کہا جاتا تھا۔ ''قلی'' مزدور کا حقارت آمیز نام تھا۔ ہندوستانی اساتذہ کو ''قلی اسکول ماسٹر'' کہہ کر پکارا جاتا تھا اور ہندوستانی اسٹور کیپر ''قلی اسٹور کیپر، کہلاتا تھا۔ گاندھی ''قلی بیرسٹر'' تھے جو اسٹیمر ہندوستانیوں کی ملکیت میں تھے ان تک کو قلی جہاز کہا جاتا تھا۔ عام طور سے ہندوستانیوں کا نقشہ یوں کھینچا جاتا تھا ''ایشیائی گندی جن کو جی بھر کے کوسنا چاہیے، جو عیوب سے لبالب ہیں۔ اور جو چاول اور کالے کیڑے مکوڑوں پر گزارا کرتے ہیں۔'' قانون کی کتاب میں ان کی تعریف یوں کی گئی تھی۔ ''نیم وحشی ایشیائی یا ایشیا کی غیر مہذب نسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد۔'' ان کو فٹ پاتھ پر چلنے یا رات کو پرمٹ لیے بغیر باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کو پہلے اور دوسرے درجے کے ٹکٹ نہیں دیے جاتے تھے۔ اگر کوئی یورپین مسافر اعتراض کرتا تو وہ بیک بنی ودو گوش تو وہ ریل کے ڈبے سے نکال باہر کیے جاتے۔ کبھی کبھی انھیں ٹرین کے فٹ بورڈ پر لٹک کر چلنا پڑتا۔ یورپین ہوٹلوں میں وہ داخل نہیں ہو سکتے تھے ''کیپ ٹائمز''(Cap Times) نے ایک بار لکھا تھا کہ ''ناٹال میں یہ عجیب وغریب منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ملک انھیں لوگوں کے لیے بے پناہ حقارت کا مظاہرہ کرتا ہے جن کے بغیر اس کا ذرّہ برابر کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے تصور میں یہی آتا ہے کہ اگر تمام ہندوستانی آبادی اس نو آبادی سے کنارہ کش ہو جائے تو اس ملک کی تجارت مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ اس کے باوجود ہندوستانی سب سے زیادہ قابل نفرت مخلوق تصور کیا جاتا ہے۔''

ٹرانسوال میں ان مخصوص علاقوں کے علاوہ جسے لندن ''ٹائمز'' نے گھٹو، کے نام سے یاد کیا ہے، کہیں اور نہ رہ سکتے تھے نہ تجارت کر سکتے تھے۔ آرینج فری اسٹیٹ میں ایک قانون کی رو سے اہل ایشیا اور گہرے رنگ والے افراد کو ہر قسم کی تجارت کرنے یا بسنے کی ممانیت تھی۔ ''کیپ ٹائمز'' نے ایک بار لکھا تھا: ''جہاں بھی کوئی ہندوستانی جاتا ہے وہ ہمیشہ مفید اور نکو کار ثابت ہوتا ہے

اور کیسی ہی حکومت سے اس کا سابقہ کیوں نہ پڑے وہ قانون کی پابندی کرتا ہے اس کی ضروریات محدود ہیں اور وہ فطرتاً محنتی ہے۔ لیکن انھیں اوصاف کی وجہ سے وہ جس مزدوری کے بازار میں جاتا ہے وہاں ناقابل شکست حریف بن جاتا ہے۔'' لائنل کرٹس نے بھی کئی برس بعد گاندھی سے یہی بات کہی تھی کہ ہندوستانیوں کی برائیوں سے کہیں زیادہ ان کی خوبیوں کی وجہ سے یورپیوں میں حسد کا جذبہ بیدار ہوتا تھا اور بے چارے ہندوستانیوں کو سیاسی ظلم کا شکار بننا پڑتا تھا۔

باب 6

بے گناہی کی سزا

ان کی پبلک مشغولیتوں کو دیکھا جائے یا ان کی وکالت کی مصروفیتوں کو، ایسا لگتا تھا جیسے گاندھی ناٹال میں اب بس گئے ہیں۔ 1896 کے وسط میں وہ اپنے بال بچوں کو لانے کے لیے ہندوستان گئے۔ ضمناً یہ خیال بھی تھا کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے کاز کے لیے ہر ممکن حمایت حاصل کی جائے۔

وہ کلکتہ میں جہاز سے اترے اور وہاں سے براہِ بمبئی راجکوٹ جانے کے لیے ٹرین سے روانہ ہوئے۔ الہ آباد میں ٹرین پینتالیس منٹ رکتی تھی۔ انھوں نے یہ وقفہ شہر کی سیر میں صرف کرنا چاہا جب پلیٹ فارم پر واپس پہنچے تو انھوں نے گاڑی کو سیٹی پا کر روانہ ہوتے دیکھا۔ الہ آباد کے جبری قیام کے دوران وہ پانیر کے ایڈیٹر چس نی سے ملے۔ موخرالذکر کو جنوبی افریقہ کے سفید فاموں سے جو ہمدردی تھی وہ انھوں نے چھپائی تو نہیں لیکن خوش دلی سے یہ وعدہ بھی کیا کہ ان کے اخبار کے کالم ہندستانی نقطۂ نظر کے اظہار کے لیے بھی کھلے رہیں گے۔

راجکوٹ پہنچ کر مہینے کا بیشتر حصہ انھوں نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے مسائل پر ایک پمفلٹ لکھنے میں صرف کیا اور اس کو چھپوا کر ملک بھر کے با اثر افراد اور اخبارات کو روانہ کیا۔ اس پمفلٹ میں تقریباً وہی سب باتیں مگر زیادہ احتیاط سے لکھی گئی تھیں جو An Appeal to

The Indian Franchise اور Every Briton in S.Africa کے زیرعنوان ناٹال میں لکھے گئے پمفلٹوں میں درج تھیں۔

پمفلٹ کے بعد انھوں نے عام لوگوں کو آگاہ کرنے کی غرض سے ملک بھر کا دورہ کیا بمبئی میں انھوں نے شہر کے بے تاج بادشاہ فیروز شاہ مہتا سے ملاقات کی جن کی وہ لندن کے زمانہ طالب علمی سے مرعوب ہونے کی حد تک عزت کرتے تھے۔جنوبی افریقہ پر گاندھی کو سننے کے لیے سر فیروز شاہ کی ممتاز سرپرستی میں ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔جب وہ اپنی تحریری تقریر پڑھ کر سنانے کے لیے کھڑے ہوئے جسے پہلے تیار کرنے کے لیے کہا گیا تھا تو کھچا کھچ بھرا ہوا ہال ان کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ان کے ہاتھ کانپنے لگے اور ان کی آواز مدھم ہوتے ہوتے کہیں کھو گئی۔باقی تقریر ایک مقامی خطیب واچا نے پڑھ کر سنائی اور اس کا کافی اثر ہوا۔

پونا میں وہ مہاراشٹری سیاست کے دو دیو قامت ارکان، گوکھلے اور تلک سے ملے۔گوکھلے نے اپنے کو ہمہ تن سیاست کے لیے وقف کر رکھا تھا اور وہ وطن پرست نوجوانوں کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔وہ جنوبی افریقہ کے اس نوجوان بیرسٹر کے خلوص سے فوراً متاثر ہو گئے گاندھی کے یہاں ''پہلی ہی نظر میں عشق'' کا معاملہ ہوا۔فوری طور پر دلچسپ بات یہ ہوئی کہ گوکھلے اور تلک جو تقریباً ہر بات پر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے۔اس بات پر راضی ہو گئے کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی شکایات سننے کے لیے پونا میں دونوں کی جانب سے ایک مشترکہ جلسۂ عام ہو۔عظیم تلک، سیاست جن کی رگ رگ میں بسی تھی۔یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ناٹال کا جوان قانون داں ہندستانی سیاست سے حد درجہ ناواقف ہے۔

جنوبی افریقہ میں جس توازن اور قیادت کا مظاہرہ گاندھی نے فطری طور پر کیا تھا ہندوستان کے سرزمین پر آنے کے بعد اس کا پتہ نہ تھا۔انھیں مریضانہ طور پر اپنی ناتجربہ کاری اور کم سنی کا احساس ہوا۔سر فیروز شاہ انھیں ہمالیہ کی یاد دلاتے، تلک سمندر نظر آتے اور گوکھلے کو دیکھ کر مقدس گنگا کا تصور ان کے ذہن میں ابھرتا۔بمبئی میں اس جلسے کی تباہی نے جہاں وہ اپنی تقریر پوری نہ کر سکے تھے۔عدالت کے اس منظر کو زخمی یاد تازہ کر دی تھی جب کہ چار برس پہلے ایک مقامی عدالت میں ان کی زبان نہ کھل پائی تھی اور انھیں بمبئی کا قیام اور وکالت کا پیشہ چھوڑ کر راج کوٹ

میں عرائض نگاری اختیار کرنا پڑی تھی۔ یہ خوش قسمتی تھی کہ انھیں اپنی سیاست کا آغاز جنوبی افریقہ میں کرنا پڑا اگر وہ اس وقت ہندوستانی سیاست میں داخل ہوتے تو حالات اتنے ناسازگار تھے کہ بری طرح ناکام ہوتے۔ اس احساس ناتجربہ کاری سے قطع نظر جو وطن میں ان کا تعاقب کرتا رہتا تھا اس وقت ہندوستانی سیاست میں ان کی تعمیری طباعیوں کے اظہار کے مواقع تقریباً ناپید تھے اور سیاست ذاتیاتی اور جماعتی رقابتوں میں گرفتار ہونے لگی تھی۔ ان سے ہر جگہ جو یکساں طور پر مہربانی کا سلوک ہوا اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جس مقصد کو لے کر اٹھے تھے، یعنی سمندر پار کے ہندوستانیوں کا سوال، اس پر ہر نقطۂ خیال کے سیاست دانوں کا اتفاق تھا۔

ناٹال کے معاہدہ بند مزدوروں کی اکثریت کا تعلق مدراس پریسیڈنسی سے قائدین اور پریس کا بھرپور تعاون ملا۔ تعاون کی پیش کش کرنے والوں میں مدراس کا باثر اخبار ''ہندو'' خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے بارے میں جو پمفلٹ لکھا گیا تھا وہ گرما گرم کیک کی طرح فوراً بک گیا اور تازہ ایڈیشن چھپوانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ کلکتہ میں مقامی لیڈروں اور پریس کی جانب سے اتنا ہمدردانہ تعاون نہ ملا پھر بھی دو برطانوی مالکوں کے اخبار ''اسٹیٹس مین'' اور ''انگلش مین'' میں ان کا انٹرویو نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔

ابھی کلکتہ میں ایک جلسۂ عام کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ گاندھی کو ناٹال سے ایک تار ملا جس میں ان سے فوراً لوٹ آنے کی استدعا کی گئی تھی۔ اس طرح اگرچہ یہ سفر یکایک ختم ہو گیا لیکن ان کا سب سے عزیز مقصد پورا ہو گیا۔ سمندر پار کے ہندوستانیوں کے معاملات میں ان کے اہل وطن کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ تمام بڑے شہروں میں ذی اثر لوگوں کی قیادت میں جلسے ہوئے اور پریس نے جس میں اینگلو انڈین اخبارات بھی شامل تھے۔ سامراجی الماری میں چھپائے ہوئے مردہ ڈھانچے باہر نکالے۔[1]

دورانِ سفر کی ایک مایوسی کا ذکر بہرصورت ضروری ہے۔ گاندھی کی یہ کوشش بالکل بے نتیجہ ثابت ہوئی کہ کچھ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ جنوبی افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کی خدمت کی غرض سے گاندھی کے ساتھ ہو لیں۔ ایک دوست نے تو انھیں یہ رائے

(1) انگریزی محاورہ جس کا مفہوم یہ ہے راز درونِ پردہ افشا کر دیے۔

دی کہ ایک مختصر سی ہندوستانی اقلیت کے لیے ناٹال میں مایوس کن لڑائی لڑنے میں عمر عزیز برباد کیوں کریں جب کہ کروڑوں ہندوستانی اب بھی حکومت خود اختیاری کی نعمت سے محروم ہیں۔ لیکن گاندھی ان لوگوں میں نہ تھے کہ ایک بار کسی کام کو ہاتھ میں لینے کے بعد چھوڑ دیں۔ ان کے نزدیک جنوبی افریقہ میں پبلک خدمت کا میدان تھا اور یہ بھی حرکت وعمل کا سر چشمہ تھا اور یہاں بھی مخصوص خطرات وانعامات تھے۔ یہی بات انھوں نے ایک نوجوان بیرسٹر کو لکھی وہ جس سے وہ ناٹال آنے کا اصرار کر رہے تھے: ''بہر حال مجھے یہ بات تو صاف صاف کہنا چاہیے کہ ہماری موجودہ حالت میں کسی کو یہ سوچ کر جنوبی افریقہ نہ آنا چاہیے کہ وہ یہاں روپیہ بٹور سکے گا۔ یہاں تو قربانی کے جذبے سے آنا چاہیے۔''(1)

وہ جس قربانی کے جذبے کی وکالت کر رہے تھے اس کی جنوبی افریقہ میں واپسی کے بعد انھیں خود ضرورت پیش آ گئی۔ ان کی کارروائیوں اور تقریروں کی خبریں پہلے ہی سے ناٹال پہنچ چکی تھیں نوآبادی کے یورپین برانگیختہ ہو چکے تھے۔ ناٹال کے اخباروں میں رائٹر کے لندن آفس سے ایک چار سطری تار نمایاں طور پر شائع ہو چکا تھا۔ تار سے موصولہ خبر کا متن یہ تھا: ستمبر 14 ، ہندوستان میں مطبوعہ ایک پمفلٹ میں بتایا گیا ہے کہ ناٹال کے ہندوستانی لوٹے جاتے ہیں، ان پر حملہ کیا جاتا ہے اُن سے جانوروں کا سا برتاؤ ہوتا ہے ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ ''ٹائمز آف انڈیا'' اس لیے ان الزامات کی تحقیقات کا مطالبہ کرتا ہے۔''

اس کا تعلق اُسی پمفلٹ سے تھا جو گاندھی نے ہندوستان میں لکھا تھا۔ جونز برگ کے ممتاز اخبار ''دی اسٹار'' نے ایک بار گاندھی کی اس بات پر تعریف کی تھی کہ ''انھوں نے بات زور دے کر متانت سے اور اچھی طرح لکھی ہے۔'' ''ناٹال مرکری'' نے ان کی تحریر کے اعتدال اور توازن کو سراہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی نے ناٹال میں جو کچھ کہا اور لکھا تھا اس کے مقابلے میں ہندوستان کا شائع شدہ پمفلٹ لب ولہجہ میں کچھ زیادہ ہی معتدل تھا۔ ہندوستان میں انھوں نے جو تقریریں کیں وہ غور وخوض کے بعد مرتب کیے ہوئے مسودوں پر مبنی تھیں۔ ان کی انصاف پسندی اتنی ہی نمایاں تھی کہ کلکتہ کے ''انگلش مین'' نامی اخبار کے ایڈیٹر نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانی

---

1 ''مہاتما'' جلد نمبر 1، مصنفہ ٹینڈولکر میں خط مورخہ 18/اکتوبر 1896ء کا اقتباس

مسئلے سے متعلق جو اداریہ لکھا تھا اس کا مسودہ ان کو دکھا دیا تھا۔

بہر حال گاندھی کی کارروائیوں کی سچی خبریں ناٹال نہ پہنچ پائیں۔ اسی عرصے میں لندن کے تار نے انھیں نوآبادی کی سب سے زیادہ نفرت انگیز ہستی بنا دیا ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے اس ملک کے نام پر دھبہ لگایا جس نے انھیں پناہ دی تھی اور انھوں نے ناٹال کے یورپینوں کو گندی نالی میں گھسیٹ کر انھیں اپنی جلد جیسے کالے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے اس غرض سے ایک ایجنسی بنائی کہ ناٹال کو ہندوستانی تارکین وطن سے بھر دیا جائے۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایس ایس کورلینڈ جس سے گاندھی جی کے گھر والے سفر کر رہے تھے اور ایس ایس نادری ایک اور جہاز بمبئی سے ناٹال کے لیے ٹھیک ایک ہی وقت روانہ ہوئے۔ گاندھی کا پہلا موکل اور دوست عبداللہ ایک جہاز کا مالک اور دوسرے کا ایجنٹ تھا۔ دونوں جہازوں پر آٹھ سو مسافر تھے۔ ان میں آدھے ناٹال کے عازم تھے یہ محض اتفاق تھا کہ دونوں جہاز تقریباً ایک ساتھ نومبر 1894 کے آخر میں روانہ ہوئے اور ڈربن بندرگاہ میں 19 / دسمبر کو ایک ساتھ پہنچے۔ ناٹال کے یورپینوں کو جو رائٹر کی خبر سے پہلے ہی برانگیختہ ہو چکے تھے، یہ اتفاق سازش نظر آیا۔ ڈربن کے دو ہزار یورپین ڈربن کے ٹاؤن ہال میں مجتمع ہوئے اور ناٹال حکومت سے مطالبہ کیا کہ آزاد ہندوستانیوں، کو جہاز سے اترنے نہ دیا جائے۔ انھوں نے یہ عہد کیا کہ اس جلسے کا ہر فرد اس بات سے اتفاق کرتا ہے اور اپنے کو اس امر کا پابند کرتا ہے کہ اس کا ملک جو بھی چاہے گا وہ اس کو پورا کرنے کے لیے حکومت کی ہر ممکن مدد کرے گا اس میں ایک ڈھکی چھپی دھمکی بھی تھی کہ دونوں جہازوں کے ہندوستانیوں کے خلاف طاقت استعمال کی جائے گی۔ کچھ دنوں بعد جب دوسرا جلسہ منعقد ہوا تو ہال میں یہ نعرہ گونج رہا تھا کہ ''جہاز کو ڈبو دو۔''

جب جہاز بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا تو یورپینوں نے ہندوستانیوں کو دلاسا دینے، چاپلوسی کرنے اور دھمکانے کا ہر حربہ استعمال کیا۔ جو لوگ جانے کو تیار ہوں ان کے سامنے مفت واپسی کا ٹکٹ لہرایا گیا اور جو انکار کریں ان کو سمندر میں ڈھکیل دینے کی دھمکی دی گئی۔ مالکان جہاز کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اپنا ناخوشگوار ''مال'' ہندوستان کو واپس بھیج دیں یا پھر ناٹال کے یورپینوں اور حکومت کے سنگدلانہ غصے کا مقابلہ کریں۔ جہازوں کو قرنطینہ میں کر دیا گیا اور جب قرنطینے کی مدت پانچ دن

سے بڑھا کر تین ہفتے کر دی گئی تو اس کی سیاسی نوعیت بالکل ہی واضح ہوگئی۔ ان حرکتوں کو بااثر یورپیوں کی، جن میں ناٹال کا اٹارنی جنرل ہیری اسکومب شامل تھا، حمایت حاصل تھی۔ اگر ہندوستانی جن کی اکثریت ناخواندہ تھی اور جو پہلی بار اپنے گھر والوں کے ساتھ بحری سفر پر نکلے تھے، ان دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوئے تو یہ گاندھی کی ہمت اور رجائیت کا کرشمہ تھا جس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ گاندھی کے لیے یہ بے چینی کے دن تھے۔ ان مسافروں کی جانیں جن میں سے اکثر کو وہ جانتے بھی نہیں تھے اور خود ان کے خاندان والوں کی جانیں ان کی وجہ سے خطرے میں تھیں۔ وہی ناٹال کے یورپیوں کے لیے ہوا بن گئے تھے۔ 1896 میں کرسمس کے دن کپتان کے کیبن میں چھوٹی سی پارٹی منعقد ہوئی۔ کسی نے گاندھی سے سوال کیا کہ اگر ناٹال کے یورپیوں نے جو کہا ہے وہی کر دکھایا اور زور کے بل پر ہندوستانیوں کو ساحل پر اترنے سے روکا تو وہ کیا کریں گے؟ انھوں نے جواب دیا ''مجھے امید ہے کہ خدا مجھ میں اتنی طاقت اور سمجھ دے گا کہ میں انھیں معاف کر سکوں اور ان کو پولیس کے حوالے کرنے سے باز رہوں۔ مجھے ان پر غصہ نہیں آتا مجھے صرف ان کی جہل اور تنگ نظری پر افسوس ہوتا ہے۔''

جب اس سیاسی قرنطینے اور دھمکیوں کے تیئیس دن ہندوستانیوں کی تاب مقاومت کو مجروح نہ کر سکے تو 13/جنوری 1897 کو جہازوں کو بندرگاہ میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔ اسکومب نے، جو یورپیوں کو بھڑکانے کا کام بہت کچھ پہلے ہی کر چکا تھا، اب اس داخلے کو روکنا چاہا کہ ملکہ کے نام پر اپیل کرتے ہوئے اس نے اس چار ہزار کے مجمع کو جو وہاں اکٹھا ہو گیا تھا کہ مسافروں کو اترنے سے روکے، منتشر ہو جانے کی صلاح دی۔ گاندھی کے علاوہ سبھی ہندوستانیوں کو اترنے کی اجازت دے دی گئی۔ گاندھی کو اسکومب کا یہ پیغام پہنچا کہ وہ شام تک انتظار کریں۔ شام کو بحری پولیس کے سپرنٹنڈنٹ آ کر انھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ بہرحال سہ پہر کو لافٹن نامی ایک وکیل جو گاندھی کا دوست تھا جہاز پر آیا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ تمام خطرہ ختم ہو چکا ہے اور گاندھی کو یہ بہر حال زیب نہیں دیتا کہ ڈربن میں چوروں کی طرح رات کو چپکے سے جائیں۔ اس لیے یہ طے کیا گیا کہ گاندھی جی کی بیوی اور ان کے بچے فوراً ہی اپنے میزبان رُستم جی کے یہاں گاڑی میں جائیں گے اور گاندھی اور لافٹن بعد میں پیدل چل کر ان سے جا ملیں گے۔ یہ دونوں ابھی زیادہ

دور نہیں گئے تھے کہ یورپین لڑکو نے گاندھی کو پہنچان لیا۔ مجمع اکٹھا ہونے لگا جیسے جیسے ہجوم بڑھتا گیا اس کا انداز جارحانہ ہوتا گیا۔ لافٹن نے ایک رکشے کو آواز دی کہ وہ اس پر سوار کرا کے اپنے دوست کو بچا لے جائے لیکن رکشا چلانے والے زونو قبیلے کے لڑکے کو بھگا دیا گیا۔ اب لافٹن اور گاندھی پہلو بہ پہلو چلنے لگے اور ہجوم ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ جب یہ دونوں وِسٹ اسٹریٹ پہنچے تو لافٹن کو زبردستی الگ کھینچ لیا گیا۔ گاندھی کے چاروں طرف سڑے انڈوں اور اینٹوں کی بارش ہونے لگی۔ ''کیا تمھیں نے پریس میں لکھا تھا؟ ایک یورپین نے چیخ کر کہا اور ایک وحشیانہ ٹھوکر ماری۔ گاندھی تقریباً بے ہوش گئے۔ انھوں نے ایک گھر کا جنگلا پکڑلیا، کہ ذرا سانس پر قابو ہو جائے۔ اس کے بعد وہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھے۔ انھیں زندہ گھر پہنچنے کی امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بہت بعد میں انھیں اتنا ضرور یاد رہا کہ اس خطرناک لمحے میں بھی اُن کا دل اُن کے حملہ آوروں کو قابل الزام نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کے بعد ایک دلچسپ اور بہادری کا واقعہ پیش آیا۔ مقامی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کی اہلیہ مسز الگزانڈر موقع پر پہنچ گئیں انھوں نے گاندھی کو پہچانا اور ان کے پہلو بہ پہلو چلنے لگیں اور اپنی چھتری کھول لی تا کہ ان پر جو کوڑا پتھر پھینکا جا رہا تھا اس سے حفاظت ہو سکے۔ یورپین پاگل ہو رہے تھے لیکن انھیں عورت پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں تھی اس دوران میں کچھ کانسٹبل آگے اور وہ گاندھی کو اپنے ہمراہ ان کے میزبان کے گھر لے گئے۔

ابھی گاندھی کے زخموں کو مرہم پٹی بھی نہ ہو پائی تھی کہ ایک یورپین ہجوم نے گھر کا محاصرہ کر لیا اور کہا کہ اگر گاندھی نے اپنے آپ کو ان کے حوالے نہیں کر دیا تو وہ گھر کو آگ لگا دیں گے سپرنٹنڈنٹ الگزانڈر دروازے پر کھڑے ہو گئے اور ہجوم کی دلجوئی کرنے لگے تا کہ تھوڑی مہلت مل جائے اور گاندھی سے کہلا بھیجا کہ اگر وہ یہ نہیں چاہتے کہ سارے گھر والے جن میں عورتیں اور بچے بھی ہیں زندہ ہی جلا دیے جائیں تو وہ چپکے سے گھر کے باہر لے جائے جانے پر راضی ہو جائیں۔ ایک ہندوستانی کانسٹبل کی وردی پہن کر اور پگڑی کے نیچے دھات کی رکابی رکھ کر اور ایک ہندوستانی تاجر کے لباس میں ایک خفیہ پولیس کے آدمی کو ساتھ لے کر، گاندھی مجمع سے بچ بچا کے نکلے اور جنگلے پھاندتے ہوئے سلاخوں کے بیچ سے دب دبا کے نکلتے ہوئے اور ایک اسٹور سے گزرتے ہوئے پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔

انھیں پولیس اسٹیشن پر زیادہ دیر نہیں رہنا پڑا۔ ناٹال کے یورپین، ہندوستان میں گاندھی کی مشغولیتوں کی رائٹر والی مختصر اور کسی قدر مسخ شدہ رپورٹ پڑھ کر برافروختہ ہوئے تھے۔ جس دن ان پر حملہ کیا گیا اسی صبح کو ایک اخباری نمائند سے ایک ملاقات کے دوران اپنے خلاف لگائے گئے الزامات میں گاندھی نے صحیح صورت حال بیان کر دی تھی۔ یہ بات بہت دیر میں محسوس کی گئی کہ وہ غلط فہمیوں کا شکار ہوئے تھے۔ اخبار ''ناٹال مرکری'' نے جسے کسی طرح بھی ہندوستانی مفادات کا ہمدرد نہیں کہا جا سکتا تھا، لکھا کہ مسٹر گاندھی جو کچھ کر رہے ہیں، اس کا انھیں حق حاصل ہے اور جب تک وہ ایمانداری سے اور بے لاگ طور سے کام کرتے رہیں، ان کو نہ تو ملزم قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ان کے کام میں رکاوٹ ڈالی جا سکتی ہے جہاں تک ہمیں علم ہے ان کا طریقۂ کار ایسا ہی رہا ہے ان کے تازہ ترین پمفلٹ کے بارے میں ہم ایمانداری سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر سے اپنے کیس کو ناجائز اور مناسب طور پر بیان کر رہے ہیں۔ گاندھی کے بیان کو رائٹر کے تار میں بے حد مبالغہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

لندن سے نوآبادیات کے سکریٹری آف اسٹیٹ نے ناٹال حکومت کو تار دیا کہ گاندھی کے حملہ آوروں کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ گاندھی کا ردِّ عمل ان کے مخصوص مزاج کے مطابق ہوا۔ انھوں نے کہا کہ یہ اُن کا اصول ہے کہ ذاتی بے انصافی کی چارہ جوئی عدالت میں نہیں کریں گے۔ اور بہر صورت یہ بات قرین انصاف نہیں معلوم ہوتی کہ متشددانہ کارروائیوں کے لیے چند سر پھرے نوجوانوں کو ماخوذ کر لیا جائے۔ ان ذی اثر یورپینوں کو بھڑکا کر آگ بگولہ کر دیا تھا کوئی باز پرس نہ کی جائے۔

13 رجنوری 1897 کا وہ دن فیصلہ کن تھا۔ گاندھی موت کے منہ سے بچ نکلے تھے۔ اپنے توازن ذہنی اور عالی ظرفی کی بدولت صرف ہندوستانیوں ہی کی نظر میں ان کا وقار بلند نہیں ہوا تھا بلکہ ناٹال کے متوازن یورپینوں کی نگاہوں میں بھی ان کی عزت بڑھ گئی تھی۔ وہ ناٹال انڈین کانگرس کی خدمت اور ہندوستانی برادری کی تنظیم کرتے رہے۔ جب 1899 میں بوئر جنگ پھوٹ پڑی تو انھیں ایک بڑا فیصلہ یہ کرنا پڑا کہ اس جنگ کی طرف ہندوستانیوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے جس سے جنوبی افریقہ کی قسمت، اچھی یا بری، بدل جانے والی تھی۔

باب 7

روٹی کے عوض پتھر

1899 میں جنگ بوئر کا آغاز جنوبی افریقہ پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے برطانوی اور بوئر لوگوں کے مابین کش مکش کا آخری مرحلہ تھا۔ بوئر اور انگریز دونوں ہی کا برتاؤ ہندوستانیوں سے خراب تھا۔ بوئر کا زیادہ ہی وحشیانہ تھا۔ بہت سے ہندوستانیوں کو اس پر کوئی افسوس نہ تھا کہ دونوں ہی سفید نسلیں آپس میں لڑ مریں۔ عدم تشدد اور امن پسندی کے بارے میں گاندھی کے خیالات ہنوز حد بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے بحران میں ہر شہری کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ کس کی طرف انصاف زیادہ تھا۔ ناٹال کے ہندوستانی بنیادی شہری حقوق سے بھی محروم تھے لیکن گاندھی نے یہ دلیل پیش کی جو لوگ حقوق کا مطالبہ بھی کرتے ہیں وہ متعلقہ ذمہ داریوں سے بری الذمہ نہیں ہوسکتے اس خیال کو کہ بوئر کے جیت جانے کا امکان تھا اور جنگ کے بعد ہندوستانیوں کو غیر جانبداری کا فائدہ ہوسکتا ہے، گاندھی کھلی نامردی کے مرادف سمجھتے تھے۔ بیس برس بعد جب وہ وفاداری ترک کر کے باغی بن چکے تھے انھیں 1899 میں جنگ بوئر میں انگریزوں کی حمایت کرنے پر پشیمانی نہ تھی: ''اگر مجھے آج بھی سلطنت برطانیہ پر وہی اعتماد تھا جو اس زمانے میں تھا اور اگر مجھے آج بھی اس کے زیر سایہ آزادی حاصل کرنے کی وہی امید ہوتی جو اس وقت تھی، تو میں آج بھی وہی دلیل پیش کرتا۔ (1)

---

(1) گاندھی: ستیہ گرہ ان ساؤتھ افریقہ، مدراس 1928ء، ص: 116

ناٹال کے ہندوستانیوں کی اکثریت کی رائے کو اپنے موافق کرنے میں انھیں کامیابی ہوئی۔لیکن حکومت کو ہندوستانیوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ناٹال لیجسلیٹو کاؤنسل کے ایک رکن ،جیمس نے گاندھی سے کہا''تم ہندوستانیوں کو جنگ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔فوج کے لیے تم ایک بوجھ ثابت ہوگے۔ہماری مدد کرنے کے بجائے تم خود ہماری دیکھ بھال کے محتاج ہوگے۔'' گاندھی نے کہا ''لیکن کیا ہمارے کرنے کا کوئی کام نہیں ہے؟ کیا ہم اسپتالوں میں معمولی ملازموں کا کام بھی نہیں کرسکتے؟ یقیناً اس کے لیے بہت زیادہ فراست کی ضرورت نہیں ہے۔'' جیمس نے جواب دیا''نہیں ہر کام کے لیے ٹریننگ ضروری ہے۔'' جب ٹوگیلا ندی کے کنارے جنرل بلر کی فوجوں کو بھاری جانی نقصانات ہونے لگے اور برطانوی اعتمادِ نفس بالکل ہی ڈانو ڈول ہونے لگا۔تب ہندوستانیوں کی پیشکش قبول کی گئی اور ایک ہندوستانی ایمبولینس دستہ قائم کرنے کی اجازت ملی۔دستے میں گیارہ سو کے قریب ہندوستانی تھے۔انڈین اینگلی کن مشن کے ڈاکٹر بوتھ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ تھے اور گاندھی اس کے اصلی لیڈر۔یہ دستہ محاذ جنگ پر کولن سو میں جنگی کارروائی کے آغاز کے ذرا پہلے پہنچا اور وہاں ایک ہفتے تک تن دہی اور مشقت سے کام کرتا رہا۔ اُس کے بعد اسپیون کوپ کی لڑائی کے ذرا پہلے بلوا آیا۔دستہ تقریباً تین ہفتے تک میدانِ جنگ میں رہا۔انڈین ایمبولنس دستے میں عام سپاہیوں کو''بیرا'' کہا جاتا تھا۔ان بیروں کا کام یہ تھا کہ زخمی سپاہیوں کو فائرنگ لائن کے باہر فوجیوں سے لے لیں اور پھر تقریباً بیس میل کا فاصلہ پیدل طے کرکے جنگی صدر کیمپ تک پہنچادیں۔اگرچہ ان کے شرائط ملازمت میں فائرنگ لائن کے قریب کام کرنا شامل نہیں تھا،لیکن کئی مواقع پر ہندوستانیوں نے یہ بھی خوشی خوشی کیا۔

''پریٹوریا نیوز'' کے ایڈیٹر ویرے اسٹنٹ نے میدان جنگ میں گاندھی کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے۔''رات بھر کام کرنے کے بعد، جہاں بڑے لحیم وشحیم انسان بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔وہاں میں نے گاندھی کو صبح سویرے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے فوجی ضابطے کا بسکٹ کھاتے ہوئے دیکھا۔(جنرل) ملر کی فوجوں میں ہر آدمی سست اور بجھا ہوا تھا اور ہر چیز کو دل کھول کے برا بھلا کہہ رہا تھا۔لیکن گاندھی کا انداز رواقی تھا۔وہ باتوں میں شاداں وفرحاں اور پُر یقین نظر آرہے تھے اور ان کی آنکھوں میں مہربانی کی چمک تھی۔''

ایمبولنس دستے کے گیارہ سو آدمیوں میں سے تین سو آزاد ہندوستانی تھے اور باقی معاہدہ بند مزدور تھے۔ یہ بیرسڑوں، منیموں، کاریگروں اور مزدوروں کا مخلوط مجمع تھا۔ گاندھی کا کام یہ تھا کہ اِن کو ملائے رکھیں اور ان لوگوں کی خدمت کا جذبہ ان کے دلوں میں ابھاریں جنھیں یہ لوگ ظالم سمجھتے تھے۔

ہندوستانی ایمبولنس دستے کے کام کا ذکر خیر جنرل بلر کے کاغذات میں ہوا اور اس یونٹ کے سینتیس ''لیڈروں'' کو جنگی تمغے دیے گئے۔ ہندوستانیوں کے کام کی اہمیت انگریزوں کے جنگ بوئر کے سلسلے میں ممکن ہے زیادہ نہ رہی ہو اور شاید اس بات کو سب سے پہلے خود گاندھی تسلیم کرتے، لیکن ایک مظلوم اقلیت کی جانب سے نفیس پیش کش تھی۔ کچھ دنوں تک یورپین پریس نے ہندوستانیوں کو ''فرزندانِ سلطنت کے لقب سے مخاطب کر کے اظہار خوشنودی کیا۔ جن لوگوں نے گاندھی کو خراج تحسین ادا کیا ان میں کئی ایسے یورپین بھی تھے جو جنوری 1897، میں ڈربن کے مخالف ہندوستانی مظاہروں کے سرغنہ رہ چکے تھے، وہی مظاہرے جن میں اِن لوگوں نے گاندھی کی گویا جان ہی لے لی تھی۔

جب جنگ کا فیصلہ شک وشبہ سے بالاتر ہوگیا تو گاندھی نے سوچا کہ بدلے ہوئے سیاسی ماحول میں ان کا ہندوستان واپس چلا جانا ممکن ہے۔ ناٹال کے ہندوستانیوں نے اسے اس شرط پر بادل ناخواستہ منظور کیا کہ اگر ایک سال کے اندر ان کی پھر ضرورت پڑی تو وہ واپس آجائیں گے۔

1901 کے آخر میں انھوں نے ساحل بمبئی پر قدم رکھے اور ایسے وقت پہنچے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے کلکتہ سشن میں شرکت ممکن ہوسکی۔ انھیں یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ کانگریس کیمپ میں تنظیم مفقود تھی اور صفائی کا یہ عالم تھا کہ فضا متعدی امراض کے لیے بے حد سازگار بن گئی تھی۔ ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں ناشنا سا ہونے کی وجہ سے وہ ہر جگہ آزادی سے گھوم پھر سکتے تھے اور اپنے مخصوص انکسار کے باعث انھوں نے کانگریس کے جنرل سکریٹری کے لیے کلرک اور چپراسی کی حیثیت سے کام کیا۔ کانگریس کے اجلاس میں انھوں نے جنوبی افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کے بارے میں ایک تجویز پیش کر کے پاس کرائی۔ کانگریس سشن کے بعد تقریباً ایک مہینے تک وہ گوکھلے کے ساتھ رہے۔ گاندھی اور گوکھلے میں جب 1896 کو پہلے سفر ہندوستان کے دوران ملاقات

ہوئی تھی اس کے بعد سے اب تک گوکھلے کے دل میں گاندھی کے لیے مہربانی کا جذبہ قائم تھا اور اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ گوکھلے کی یہ دلی خواہش تھی کہ گاندھی کو ہندوستان کی سیاست میں آگے بڑھایا جائے۔ دونوں ایک دوسرے کی عزت کے رشتے میں بندھ چکے تھے۔ گوکھلے گاندھی کے خلوص، جوش اور طریقۂ کار کے گرویدہ تھے اور گاندھی گوکھلے کی اس ادا پر عاشق کہ انھوں نے اپنی زندگی کو ہندوستان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔

گاندھی رواروی میں ایک مرتبہ رنگون بھی گئے۔ وہاں انھوں نے سنہرا پگوڈا[1] فونگیں دیکھا اور دیکھی برمی عورتوں کی آزادی اور قوت، اور مردوں کی کاہلی۔ کلکتہ واپس آکر انھوں نے ٹرین سے اپنے وطن راجکوٹ کا سفر کیا اور راستے میں بنارس، آگرہ، جے پور اور ہانس پور میں بھی اترے۔ انھوں نے تیسرے درجے میں سفر کیا اور زیادہ تر دھرم شالاؤں میں قیام کیا۔ سفر میں راحت تو نہ ملی لیکن انھوں نے تیسرے درجے کے مسافروں کی تکلیفیں ہندو تیرتھ استھانوں کی بداخلاقیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

کچھ دنوں راجکوٹ پر پریکٹس کرنے کے بعد وہ بمبئی چلے گئے جہاں گوکھلے نے ان سے کام کرنے اور انڈین نیشنل کانگریس کے معاملات میں دلچسپی لینے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ شانتا کروز کے ایک اچھے سے بنگلے میں مقیم ہوئے۔ بہت جلد ان کی پریکٹس خاصی چل نکلی۔ گوکھلے خوش ہوئے کہ ہندوستان وطن پروروں کے مختصر سے جھرمٹ میں۔ ایک مخلص کارکن کا اضافہ ہوا۔ لیکن گاندھی اور گوکھلے کے منصوبے دھرے رہ گئے جب جنوبی افریقہ سے ایک تار آیا کہ گاندھی وہاں فوراً پہنچیں اور انھیں جس بحران کا سامنا تھا اس میں ان کی رہنمائی کریں۔

اس فوری طلبی کا سبب یہ تھا کہ برطانوی کابینہ کے نوآبادیاتی سکریٹری چیمبرلین، جنوبی افریقہ آئے تھے اور وہاں کے مقیم ہندوستانیوں کی نئی اور پرانی شکایتوں کے پیش کرنے کا یہ اچھا موقع تھا۔

جب جنگ بوئر چھڑی تھی تو لارڈ لینس ڈاؤن برطانیہ کے جنگی سکریٹری آف اسٹیٹ نے یہ اعلان کیا تھا کہ بوئروں کی بدسلوکیوں میں سب سے زیادہ جس بات پر انھیں غصہ آتا تھا وہ

---

(1) مخروطی شکل کا مندر

ٹرانسوال کے برطانیوی ہندوستانیوں سے ان کی بدسلوکی تھی۔ ٹرانسوال اور آرینج ری اسٹیٹ کی حکومتوں کی نسلی تفوق ڈھکی چھپی نہ تھی۔ انھوں نے دھڑلّے سے ہندوستانیوں کے خلاف امتیازی قوانین بنائے تھے لیکن دوہ دوسرے امور میں اتنے مشغول تھے اور انھیں اپنے وجود کا خطرہ اس طرح لاحق رہتا تھا کہ وہ ان قوانین پر کبھی سختی سے عمل پیرا نہ ہو سکے تھے۔

جنگ بوئر کے خاتمے کے بعد برطانوی حکومت نے اس غرض سے ایک کمیٹی بنائی کہ بوئروں کے قوانین ملکی کی جانچ کی جائے اور ایسے قوانین کو مسترد کیا جائے جو برطانوی آئین کی روح کے منافی اور ملکہ وکٹوریہ کی رعایا کی آزادی سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ کمیٹی نے رعایا کی آزادی کا مفہوم سفید فام رعایا کی آزادی لیا اور اس طرح ہندوستانی ان اصلاحات کے دائرے سے خارج رہے۔ بوئروں کے دورِ حکومت میں ہندوستانیوں کے خلاف جتنے قوانین بنائے گئے تھے اب ان کو مرتب کر کے صرف ایک دستی کتابچہ تیار کر دیا گیا۔ نیا پہرہ شروع ہونا چاہیے 1904 میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر سر ہنری کاٹن نے کہا کہ ''ٹرانسوال کے برطانوی حاکموں نے بوئر قوانین کا برطانوی جوش وخروش اور ضابطہ پرستی کے ساتھ نفاذ کیا۔ ہندوستانی آبادکاری کے معاملے میں انگریزوں کی چھنگلیا بھی مسٹر کروگر کی کمر سے موٹی ثابت ہوئی کیوں کہ جہاں کروگر کوڑے سے کام لیا کرتے تھے وہاں انگریز حاکم بچھوؤں کے ذریعے تادیب کیا کرتے تھے۔'' ایک نیا محکمہ ٹرانسوال کے ایشیائیوں کے معاملات سے متعلق قائم کیا گیا۔ اس میں زیادہ تر ایسے برطانوی افسر تھے جو پہلے ہندوستان میں کام کر چکے تھے یہ دفتری مظالم کا ذریعہ بن گیا۔ حکومت نے جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد جو ایمرجنسی اختیارات حاصل کیے تھے۔ اس محکمے نے اس غرض سے ان کا استعمال شروع کر دیا کہ واپس آنے والے ان مہاجرین پر بھی ٹرانسوال کے دروازے بند کر دیے جائیں جو ٹرانسوال میں کئی برس رہ چکے تھے اور جنگ شروع ہونے پر ملک سے باہر چلے گئے تھے۔

دسمبر 1902 میں جب گاندھی ڈربن میں اترے تو انھیں معلوم ہوا کہ ہندوستانیوں کو ان پرانی بیڑیوں سے ہی چھٹکارا نہیں پانا ہے جو انھیں ناٹال میں پنھادی گئی تھیں بلکہ نئی زنجیریں بھی توڑنا ہیں جو ان کے لیے ٹرانسوال میں ڈھالی جا رہی تھیں۔ ڈربن میں نوآبادیاتی سکریٹری کے

پاس جو وفد گیا اس کی قیادت گاندھی نے کی۔ چیمبرلین نے حسب دستور ہمدردانہ شنوائی، کی لیکن دلیل یہ پیش کی کہ نوآبادیاں خودمختار ہیں اس لیے ہندوستانیوں کو انھیں سے معاملت کرنا چاہیے۔

ناٹال کے بعد نوآبادیاتی سکریٹری کو ٹرانسوال جانا تھا۔ اپنے قدیم دوست سپرنٹنڈنٹ پولیس الگزانڈر کی مدد سے انھوں نے ٹرانسوال میں داخلے کا اجازت نامہ حاصل کیا تا کہ ٹرانسوال کی ہندوستانیوں کا معاملہ نوآبادیاتی سکریٹری کے سامنے پیش کرسکیں۔ لیکن ٹرانسوال کی حکومت نے انھیں اُس وفد سے خارج کردیا جو نوآبادیاتی سکریٹری سے ملاقات کرنے والا تھا۔ یہ گاندھی کی ہتک عزت تو تھی ہی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا تھا کہ ٹرانسوال کے ہندوستانیوں کو آگے کیا پیش آنے والا تھا۔

جس مقصد کے لیے گاندھی کو ہندوستان سے بلایا گیا تھا یعنی نوآبادیاتی سکریٹری سے ملاقات، وہ ختم ہو چکا تھا۔ گاندھی کے دل میں اپنے بال بچوں میں واپس جانے اور ہندوستان میں پیشے اور سیاست کی مشغولیتوں میں پھر حصہ لینے کی رغبت بہت زیادہ تھی لیکن ہندوستانی برادری کو خطرہ اتنا شدید لاحق تھا اور انھیں گاندھی پر اعتماد اتنا قوی تھا کہ انھوں نے اور خود عائد کی ہوئی جلاوطنی کی میعاد بڑھائی۔ 1983 میں وہ جنوبی افریقہ ایک سال کے لیے آئے تھے اور آٹھ سال رہ گئے تھے۔ 1902 میں وہ چھ مہینے کے لیے آئے اور بارہ برس رہ پڑے۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ اس وقت تک جنوبی افریقہ میں ضرور قیام کریں گے جب تک ''گھرے ہوئے بادل چھٹ نہ جائیں یا ٹوٹ کے برس نہ پڑیں اور پھر ہماری ساری مدافعانہ کارروائیوں کے باوجود وہ سب کچھ بہالے جائیں۔''

انھوں نے خود ٹرانسوال سپریم کورٹ میں وکیل کی حیثیت سے اپنا نام لکھوالیا تھا اور جونزبرگ میں اپنا دفتر قائم کرلیا تھا۔ یہی آئندہ کے لیے ان کی تمام کارروائیوں کا مرکز ہوگیا۔

گاندھی کے مشاغل کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ بوئروں پر برطانیہ کی فتح کے بعد ناٹال اور ٹرانسوال کے یورپین آبادکاروں کی نسلی اور ہندوستانیوں کے مخالف پالیسیوں کے دھارے کا رخ بدل جانے کے بجائے ان پالیسیوں کو نئی شہ ملنے لگی۔ ہندوستانیوں کو یورپینوں سے مساوات کے برتاؤ کے لیے نہیں بلکہ ابتدائی شہری حقوق کے لیے اور ان مفادات کے تحفظ کے لیے جنگ کرنا

پڑ رہی تھی جوانھوں نے ربع صدی کی محنت شاقہ سے حاصل کیے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ جنگ نابرابر تھی اور پتا نہیں تھا کہ یہ کتنے دن طول کھینچے گی۔ اس جنگ کی قیادت کی ذمہ داری لے کر گاندھی گویا اپنی کشتیاں جلا بیٹھے تھے۔ ان کے کاروبار کا مستقبل اوران کے بال بچے، اس مقصد کے سامنے ہیچ تھے جو گاندھی کے پیش نظر تھا ان کی زندگی نہ صرف ظاہری طور سے اور رہنے سہنے کے انداز کے اعتبار سے بلکہ نئی قدروں کے حصول کے اعتبار سے بھی بالکل ہی بدل گئی۔

اس تبدیلی کی کہانی بذاتِ خود بے حد دل آویز ہونے کے علاوہ اس سے اخلاقی اور روحانی طاقت کے اس سرچشمے کا سراغ لگتا ہے جس کی بدولت گاندھی کو دو براعظموں کی پبلک لائف میں بے مثال کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔

باب 8

مذہبی جستجو

گاندھی کے باپ کرم چند، جو پور بندر ریاست اور بعد میں راجکوٹ ریاست کے دیوان تھے، دنیا دار آدمی تھے اور ان کی شخصیت کی ساخت میں روحانیت کو زیادہ دخل نہیں تھا۔ لیکن ان میں وہ مذہبی کلچر ضرور موجود تھا جو ان کے زمانے اور ان کے طبقے کے تہذیبی اثاثے کا جزو تھا۔ اپنی طویل علالت کے دوران وہ کبھی کبھی اپنے پاس ہندو پنڈتوں جین منیوں اور پارسی اور مسلم عالموں کو مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیال کے لیے بلایا کرتے تھے۔ اپنے والد کے تیماردار کی حیثیت سے موہن ان مذاکرات کے موقع پر اکثر موجود رہتا تھا اور اگر چہ وہ اِن کی باتیں پوری طرح سمجھ نہیں پاتا تھا، یہ حقیقت کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے دوستانہ طریقہ پر بحث کر سکتے ہیں اس کم عمری میں اس کے لیے رواداری کا سبق بن گئی تھی۔

گاندھی کی ماں پتلی بائی کا تو اوڑھنا بچھونا ہی مذہب تھا۔ ان کی زندگی بَرتوں اور مذہبی سنسکاروں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھی۔ اس کے باوجود گاندھی کے گھر میں باقاعدہ مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ موہن جیسے بچے کے لیے جس کے یہاں مذہبی اور اخلاقی مسائل سے دل چسپی کا نشو ونما کافی قبل از وقت ہو چکا تھا یہ ایک اہم کوتاہی تھی۔ مذہبی رسوم کی جگمگاہٹ اور شان وشوکت سے ان کی تشفی بالکل نہیں ہوتی تھی۔ اپنے والد کے کتب خانے کی

کتابیں دیکھتے دیکھتے ان کی نظر منوسمرتی کے قصۂ تخلیق پر پڑی تھی۔ یہ انھیں اطمینان بخش نہ معلوم ہوئی، لیکن کسی نے ان کے شکوک رفع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت ان کی اُلجھن اور بھی بڑھ گئی جب وہ لامذہبیت کی طرف کھنچنے لگے اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ رجحان ہر قسم کے اقتدار کے خلاف ان کے عنفوان شباب کی بغاوت کا جز وتھا۔

جب اٹھارہ برس کے سن میں گاندھی لندن پہنچے تو اپنے پیدائشی مذہب کے بارے میں ان کی معلومات بے حد ناقص تھیں۔ ان کے تھیوسفٹ دوستوں نے جب انھیں سر ایڈون آرنالڈ کی کتاب (غیبی نغمہ)The song Celestial پڑھنے کی دعوت دی تو انھیں یہ تسلیم کرتے ہوئے شرم سی محسوس ہوئی کہ انھوں نے بھگوت گیتا نہ تو سنسکرت میں پڑھی ہے اور نہ اپنی مادری زبان گجراتی میں۔ اس طرح ان کا ایسی کتاب سے تعارف ہوا جو آگے چل کر ان کی روحانی کتاب الہدایت بننے والی تھی۔ سر ایڈون کی کی دوسری کتاب (نور ایشیا)The Light of Asia بھی بہت دل کش ثابت ہوئی۔ گوتم بدھ کی کہانی، ان کی زندگی ترک دنیا اور تعلیمات، سبھی نے انھیں جھنجھوڑ ڈالا۔

گاندھی تھیاسوفیکل سوسائٹی میں شامل نہیں ہوئے لیکن اس کے لٹریچر کو پڑھ کر مذہب میں ان کی دل چسپی ضرور بڑھ گئی یہیں ان کے ایک جوشیلے سبزی خور ساتھی نے انجیل سے بھی انھیں متعارف کرایا۔ عہد جدید والے حصے، بالخصوص تہاڑ کے وعظ نے ان کے دل کو براہ راست متاثر کیا۔ انجیل کی یہ عبارت پڑھ کر کہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ تم شر کی مقاومت نہ کرنا، لیکن جو کوئی تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دینا۔ اور اگر کوئی تمہارے خلاف قانونی کارروائی کرے اور تمھارا کوئی کوٹ زبردستی لے لے تو تم اُسے لبادہ بھی لے جانے دو۔'' گاندھی کو گجراتی شاعر شام لال بھٹ کے یہ شعر یاد آ گئے جو وہ بچپن میں گنگنایا کرتے تھے۔

پانی کے پیار کے بدلے، بھر پیٹ کھانا کھلاؤ
مہربان ہو کر سلام کرنے والے کے سامنے جوش وخروش سے جھک جاؤ
ایک پیسے کے بدلے میں سونا دے دو
اگر کوئی جان بچائے تو اس کے لیے جان دینے میں عار نہ کرو

اسی طرح عقلمندوں کے قول وفعل کا لحاظ کرو
اور چھوٹی موٹی خدمت کا بھی دس گنا صلہ دو
لیکن جو لوگ صحیح معنوں میں شریف ہوتے ہیں وہ تمام انسانوں کو ایک مانتے ہیں
اور برائی کے بدلے میں بھی خوشی خوشی بھلائی دیتے ہیں

انجیل، بدھ اور بھٹ ان کے ذہن میں یکجا ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے نفرت کے بدلے میں محبت اور شر کے بدلے میں خیر دینے کے خیال سے وہ مسحور ہو گئے۔ ابھی وہ اِسے پوری طرح سمجھ نہیں پا رہے تھے لیکن ان کے اثر پذیر ذہن میں یہ خیال پکتا رہا۔ انگلستان چھوڑنے کے پہلے ہی گاندھی نے وہ ''لا مذہبیت کا صحرا[1]'' پار کر لیا تھا جہاں وہ عنفوان شباب میں بھٹک کر پہنچ گئے تھے۔

جنوبی افریقہ کے قیام میں پہلے ہی سال انھیں کچھ پُر جوش کویکر[2] مل گئے تھے، جنھوں نے گاندھی کے مذہبی رجحان کو دیکھ کر انھیں عیسائیت کے دامن میں سمیٹ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انھوں نے عیسائی دینیات اور تاریخ کی کتابوں کا ان کے سامنے انبار لگا دیا، وہ ان پر زور تبلیغ صرف کرتے رہے اور ان کے ساتھ اور ان کے لیے دعا کرتے رہے آخر میں وہ انھیں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے ایک کنونشن میں اس امید سے لے گئے کہ وہ بھی اجتماعی جذبات کی زد میں بہہ جائیں گے۔ گاندھی کو یکروں کے کردار کی تعریف میں پوری فیاضی سے کام لیتے رہے لیکن انھوں نے دوٹوک طور پر کہہ دیا کہ ان کے دل میں ہندودھرم کو چھوڑنے اور عیسائیت کو قبول کرنے کا خیال بھی نہیں آتا۔

گاندھی کے عیسائی دوستوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تبدیل مذہب کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر قدم پیچھے ہٹا لیے۔ ایک اجنبی ملک میں کویکر تبلیغ کا پہلا اثر ان پر یقیناً زبردست ہوا لیکن انھیں پریٹوریا میں عیسائی بننے کی اس سے زیادہ جلدی نہ تھی جتنی لندن میں تھیا سوفسٹ بننے کی تھی۔ اب بھی ہندومت کے بارے میں ان کی معلومات سطحی تھیں

---

(1) خودنوشت سوانح: 92

(2) Quacker ایک عیسائی فرقہ

لیکن اپنے پیدائشی مذہب کے لیے ان کے دل میں شدید وابستگی کا جذبہ تھا۔ ان کے ایک کو یکر دوست، کوٹس نے ان سے کہا کہ وہ ویشنو مالا اپنی گردن سے اتارڈالیں۔'' یہ تو ہم پرستی آپ کے شایانِ شان نہیں۔ آیئے، میں یہ مالا آپ کی طرف سے توڑ دوں۔'' گاندھی نے جواب دیا ''نہیں، آپ ایسا نہیں کریں گے یہ میری ماں کا مقدس تحفہ ہے۔'' کوٹس نے پوچھا'' لیکن آپ کا اس پر اعتقاد بھی ہے؟ گاندھی نے جواب دیا میں اس کی پراسرار اہمیت سے واقف نہیں ہوں میں یہ تو نہیں سمجھتا کہ اگر میں نہ پہنوں تو میں کسی بلا میں مبتلا ہو جاؤں گا، لیکن معقول اور کافی دلائل کے بغیر میں اس ہار کو چھوڑ بھی نہیں سکتا جو انھوں نے اتنی محبت سے پنھائے ہیں(1) '' ہار ایک علامت تھا اسی طرح ان کے لیے ہندومت کو ترک کرنا بھی قوی اور معقول دلائل کے بغیر ناممکن تھا۔ ہندومت اور مالا دونوں ہی انھیں اپنے چاہنے والے والدین سے ورثے میں ملے تھے۔ اس کے علاوہ اگر ایک طرف عیسائیت کے بعض پہلو۔ عیسیٰ کی زندگی اور موت، کا وعظ اور بعض عیسائیوں کی صاف وشفاف پاکیزگی۔ جاذب توجہ تھے تو دوسرے پہلو ایسے بھی تھے جن سے راحت ہوتی تھی۔ بچپن میں راجکوٹ کی ایک سڑک کے کونے پر انھوں نے ایک عیسائی مبلغ کو ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کا مذاق اڑاتے سنا تھا، ان کے تصور میں عیسائی تبدیلی مذہب کا مطلب گوشت خوری، تمبا کونوشی اور شراب نوشی سے تھا۔ ویشنو برادری میں جس سے گاندھی کا تعلق تھا یہ گناہ کبیرہ سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ان ہندوستانی مزدوروں کے بچے جو ناٹال میں پیدا ہوئے تھے اور جو اپنا مذہب بدل کے عیسائی ہو گئے تھے بالکل عیسائی پادریوں کی مٹھی میں تھے۔

تبدیلی مذہب سے وابستہ ان تصورات کے علاوہ، انھیں نظریاتی نوعیت کی مشکلات بھی درپیش تھیں۔ انھوں نے عیسائیت کی ایسی تفسیریں بھی دیکھی تھیں جو موجودہ عقائد سے متضاد تھیں۔ جب انھوں نے ٹالسٹائے کی سلطنت خدا دل کے اندر Kingdom of God is With in you پڑھی تو انھیں محسوس ہوا کہ انھیں اس ایک کتاب سے جو علم حاصل ہوا وہ ان تمام کتابوں سے نہ ہوسکا تھا جو ان کے کویکر دوست انھیں پڑھایا کرتے تھے۔ ٹالسٹائے نے ہر عیسائی فرقے کے چرچ کی مذمت کی کیوں کہ انھوں نے عوام پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے عیسیٰ کی صحیح

(1) خودنوشت سوانح عمری: ص۱۰۰،۱۰۴

تعلیمات کو مسخ کر دیا تھا۔ ٹالسٹائے نے عیسیٰ کی تعلیمات اور عیسائیوں کی روزمرہ کی زندگی کے تضادات بھی دکھائے تھے۔ پہلے کی ایک کتاب (میرے معتقدات What I be Lieve) میں ٹالسٹائے نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ عیسیٰ عبادات اور ذاتی بخشائش کے ایک مذہب ہی کے بانی نہیں تھے بلکہ عیسیٰ کی تعلیمات ایک فلسفیانہ، اخلاقی اور سماجی نظریے کی حامل تھیں۔ ایک مزاج پسند عیسائی کے یہ خیالات اس نظریاتی تبلیغ کی مؤثر رد ثابت ہوئے جو کو یکر گاندھی کے ذہن پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ گاندھی کی عصبیت بعض بنیادی عیسائیوں کے معتقدات کو قبول کرنے پر کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ وہ عیسیٰ کی تاریخی شخصیت کو قبول نہ کر سکے۔ وہ کہتے کہ ''خدا نے صلیب انیس سو برس پہلے نہیں اٹھائی تھی۔ وہ آج بھی صلیب لیے ہوئے ہے۔'' وہ اِسے بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ عیسیٰ کی موت اور ان کا خون تمام دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔ گاندھی کے نزدیک دنیا کو گناہوں کے نتائج سے نجات پانے کے بجائے اس کی ضرورت ہے کہ دنیا میں کوئی گناہ ہی نہ کرے۔ وہ یہ بھی ماننے کو تیار نہ تھے کہ عیسائیت ہی تنہا مذہب حق پر ہے۔ وہ عیسیٰ کو تنہا تخت پر بٹھانے کو راضی نہ تھے۔[1] ''وہ (عیسیٰ) بھی میری زندگی کو کچھ کم متاثر نہیں کرتے کیوں کہ میں بے شمار فرزندان خدا میں انھیں بھی شمار کرتا ہوں۔ میں فرزندان، کے الفاظ لغوی معنوں میں نہیں بلکہ زیادہ گہرے اور غالباً زیادہ شاندار معنوں میں استعمال کرتا ہوں۔ میرے نزدیک اس سے روحانی پیدائش مراد ہے۔''

اگرچہ 1901 میں بھی وہ ایک مشہور ہندوستانی عیسائی سے روشنی حاصل کرنے کے لیے ملے، لیکن اس مذہب کو اختیار کرنے کے امکانات پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے اور دوسرے مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سارے مذہب ٹھیک ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ خامی ہے کیوں کہ ان کی تشریح و تفسیر معمولی دماغ والے اور بعض اوقات معمولی دل والے کرتے ہیں بلکہ زیادہ تر ان کی غلط تشریح کی جاتی ہے۔'' کارلائل کی کتاب ''ہیرو ورشپ'' میں ''ہیرو بحیثیت پیغمبر'' کے زیر عنوان مضمون کو پڑھ کر گاندھی پہلے پہل اسلام سے متعارف ہوئے۔ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اور واشنگٹن ارونگ کی لکھی ہوئی پیغمبر حضرت محمد صلی

(1) ڈوک جے: ام کے گاندھی آین انڈین پیٹریٹ اِن ساؤتھ افریقا: ص ۹۴

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت پڑھی اور پیغمبر کے فقر اور انکسار اور ان کی زور اور ان کے اولین پیروؤں کی اس جرأت کا حال پڑھ کر جس سے انھوں نے ذلتوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کیا تھا وہ محو حیرت ہو گئے۔

جنوبی افریقہ میں عیسائیت اور اسلام پرستی پر کتابیں آسانی سے مل جاتی تھیں لیکن ہندومت کی کتابیں انھیں ہندوستان سے منگوانا پڑتی تھیں۔ انھوں نے مذہبی موضوعات پر اپنے دوست رائے چند بھائی سے خط وکتابت شروع کی۔ انھوں نے گاندھی کو استقلال کا مشورہ دیا تاکہ ہندومت کی بے مثال باریکیوں، خیال کی گہرائی، روح کے متعلق اس کی بصیرت اور فکر کی وضاحت، ان پر آشکارا ہو جائے، رائے چند کی عالمانہ تشریحات نے ہندومت سے گاندھی کے جذباتی لگاؤ کو اور گہرا کر دیا اور اُس دور میں یہ تشریحات فیصلہ کن ثابت ہوئیں جب ان سے عیسائی دوست تقریباً یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ گاندھی بپتسمہ کی راہ پر چل پڑے ہیں۔

آخر میں، ہندومت سے ان کا رشتہ جس کتاب نے سب سے زیادہ استوار کیا اور ان کی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ بھگوت گیتا تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے اِسے 1890 میں افریقہ میں پڑھا تھا۔ یہ سرایڈون آرنالڈ کا منظوم ترجمہ Song Celestial تھا۔ انھوں نے دوسرے ترجمے بھی اصل کے ساتھ پڑھے اور وہ اس کتاب کو روزانہ پڑھنے لگے۔ وہ روزانہ صبح کو غسل وطہارت کرتے وقت اس کا ایک اشلوک حفظ کر لیا کرتے تھے یہاں تک کہ انھیں پوری نظم زبانی یاد ہو گئی۔

''مہابھارت'' کے رزمیے میں جس کا ایک حصہ ''گیتا'' بھی ہے، بنیادی کہانی کورووں اور پانڈووں کے خاندانی جھگڑے پر مشتمل ہے۔ اس میں آخری خوں ریزی کروکشیتر کے میدان جنگ میں ہوئی۔ یہ رزمیہ گزشتہ ڈھائی ہزار برسوں سے ہندو وراثت کا حصہ رہا ہے۔ گاندھی شروع ہی سے سمجھتے تھے کہ یہ رزمیہ کوئی تاریخی کتاب نہیں بلکہ تمثیلی ہے۔ جہاں تک گاندھی سمجھ سکتے تھے گیتا کا اصلی مقصد خود شناسی کی منزل کی طرف رہنمائی کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ بے لوث عمل ہی جو عواقب کے خوف اور انعام کی خواہش کے بغیر کیا جائے، منزل تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ وہ گیتا کے لغوی معنی کو قبول نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ کرشن جی نے جنگجو ارجن کو شاعرانہ زبان میں للکارا ہے کہ وہ کرو

کشتیر کی جنگ میں آگے بڑھ کر اپنے چچازاد بھائیوں کا مقابلہ کریں، وہ دراصل ایک علامت ہے اُس جنگ کی جو خیر وشر کے درمیان ہر انسانی دل میں جاری رہتی ہے۔ دریودھن اور اس کی جماعت انسان کے جذبات اسفلی اور ارجن اور اُن کی جماعت جذبات علوی کی نمائندگی کرتے ہیں اور دلوں میں بسنے والے، خود کرشن ہیں۔ جو لوگ مہابھارت کی کہانی کو لغوی معانی میں تسلیم کیے جانے پر مصر تھے ان کو گاندھی نے بتایا کہ اگر اس کہانی کو ظاہری شکل میں تسلیم کیا جائے تو مہابھارت کے مصنف نے تشدد کے بے کار اور لاحاصل ہونے کو قطعی طور سے ثابت کر دیا تھا۔ جنگ کا خاتمہ ہمہ گیر بربادی کی صورت میں نکلا اور فاتح کا حال بھی مفتوح سے کچھ بہتر نہ تھا۔

گیتا کے بارے میں یہ نظر روایتی نظریے اور بال گنگادھر تلک اور اروبندو گھوش جیسے اہم اور مستند اصحاب کی مستند تفسیر وتشریح سے بالکل ہی مختلف تھا۔ علما کے نزدیک کروکشتیر کی لڑائی کے تاریخی بیانات سے انکار، حقائق سے انکار کے مرادف ہے۔ انھیں یہ شبہ تھا کہ گاندھی گیتا کے حقائق کو اس لیے توڑ مروڑ رہے ہیں کہ یہ ان کی نظریۂ عدم تشدد سے کسی طرح ہم آہنگ ہو سکے۔ یہ بھی اشارہ کیا جاتا تھا کہ ان کے نقطۂ نظر پر انجیل، بالخصوص پہاڑ کے وعظ کے مطالعے کا اثر ہے۔

گاندھی نے اِسے تسلیم کیا ہے کہ کس طرح پہاڑ کے وعظ کے اس ٹکڑے کو کہ ''جو کوئی تمھارے داہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دینا'' انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں پڑھا تھا اور تبھی سے یہ ان کے ذہن پر چھا گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ وِشنٹ شین نے لکھا ہے ''اِس سے یہ فرض لینا کہ وہ گیتا کی عیسوی تشریح پیش کر رہے تھے، حق بجانب نہ ہوگا۔ اگر ہم ان کی اس ابتدائی دلیرانہ تشریح کو قبول کر لیں گے کہ کروکشتیر خود انسانی قلب ہے، تو انھوں نے اس کے بعد جو بھی تشریح وتفسیر کی ہے وہ اپنشد اور گیتا کے مشن کے عین مطابق ٹھہرتی ہے۔ اس دلیرانہ تشریح کے جو وجوہ انھوں نے بتائے ہیں وہ بدیہی حقیقت کے اس مشاہدے پر مبنی ہیں یعنی ان کی نظر میں بدیہی جو انھیں گیتا کے طویل مطالعے سے حاصل ہوا۔[1]''

گاندھی ایک ایک اشلوک کے تجزیے میں گھنٹوں صرف کر سکتے تھے، لیکن وہ اس سے بھی واقف تھے کہ وہ عالم اور پنڈت نہیں ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ گیتا صرف عالموں کے

(1) شین، ونسنٹ: Lead kindby Light، ص:291

لیے لکھی گئی ہے۔ اس کے پیغام کا مقصد یہ ہے کہ اسے زندگی میں برتا بھی جائے۔'' یہ مان لینا چاہیے کہ '' گیتا'' کے لغوی معانی کے اعتبار سے یہ کہنا ممکن ہے کہ جنگ اور (عمل کے) پھل کے ترک میں پوری موافقت ہے، لیکن چالیس برس تک اس بات کی پوری اور لگاتار کوشش کرنے کے بعد کہ میں اپنی زندگی کو گیتا کی تعلیمات کا نمونۂ عمل بناؤں میں نے بڑے انکسار کے ساتھ یہ محسوس کیا ہے کہ ہر شکل اور صورت میں اہنسا پر عمل کیے بغیر مکمل ترک ناممکن ہے۔ (1) ۔''

انھوں نے اس بات کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا کہ کوئی صحیفہ کتنا ہی مقدس کیوں نہ ہو اس کے مفاہیم زمان ومکاں سے ہم آہنگ نہیں ہوتے اور صرف ایک ہی معنی تک اُن کی تشریح محدود ہوتی ہے۔ عظیم صحائف کے معانی میں بھی ارتقائی کیفیت جاری رہتی ہے۔ اگر گیتا کے مصنف کو '' بے تعلق عمل'' اور تشدد میں کوئی تضاد نظر نہیں آیا تھا تو اس سے گاندھی کو کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنے معانی پنھا لیے۔

گاندھی کے لیے گیتا ایک روحانی ڈکشنری (فرہنگ) بن گئی اور اخلاقی تعلیم کے لیے ایک مرشدِ برحق: '' جب کبھی مجھے افق پر روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی، میں بھگوت گیتا سے رجوع کرتا ہوں اور مجھے کوئی نہ کوئی اشلوک ایسا مل جاتا ہے جس سے میرا قلب مطمئن ہو جاتا ہے اور میں محیطِ غم میں گھرا ہونے کے باوجود مسکرانے لگتا ہوں۔ میری زندگی المیوں سے بھری گزری ہے اور اگر اُن المیوں سے میرے دل میں کوئی نمایاں یا ناقابل فراموش داغ نہیں پڑے تو یہ بھگوت گیتا کی تعلیمات کی برکت ہے (2) ۔''

وہ الفاظ '' اپری گرہ'' (عدم ملکیت) اور سمبھاؤ (ہمواری) نے ان کے سامنے لاتعداد راہیں کھول دی تھیں۔ عدم ملکیت کا مفہوم یہ تھا کہ جیسے جہاز کو ہلکا کرنے کے لیے سامان پھینک دیا جاتا ہے اسی طرح مادی سامان جس کے بوجھ تلے روح دب جاتی ہے اتار پھینکا جائے اور روپے، جائداد اور جنس کے رشتے توڑ دیے جائیں اور جو علاحدہ نہ کیا جا سکے اس کا اپنے کو مالک نہیں بلکہ متولی سمجھا جائے۔ ہمواری کا مقصد یہ ہے کہ رنج و راحت فتح و شکست میں یکساں طور پر

---

(1) ڈیسائی، ام ڈی: The Gita According to Gandhi، ص: 130

(2) مہاتما گاندھی کی تقریریں اور تحریریں (انگریزی) از نٹےسن۔ مدراس (چوتھا اڈیشن) ص: 1061

پُرسکون رہنا اور کامیابی کی امید اور ناکامی کے خوف یا مختصر لفظوں میں عمل کے پھل کے پروا کیے بغیر کام کیا جائے، اسی طرح سے وہ بے عزتی کرنے والے اور گستاخ اور بد اطوار افسروں سے اور ایسے ساتھیوں سے جو کل ساتھی تھے اور آج بے معنی مخالفت کر رہے تھے اور ایسے لوگوں سے جنھوں نے ان کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا، یکساں برتاؤ کر پائے۔ کئی برس بعد گاندھی نے عیسائی مبلغین کے ایک گروہ پر یہ راز افشا کیا کہ ''ہندومت کو جیسا کہ میں سمجھتا ہوں اُس سے میری روح کو اطمینان ملتا ہے اور میری تمام شخصیت میں رواں دواں ہے اور مجھے بھگوت گیتا سے وہ سکون روح حاصل ہوتا ہے جو وعظ سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہندو عقیدے کی بدولت تمام زندگی ایک وحدت ہے۔ ان کے اپنے عقیدۂ عدم تشدد (اہنسا) کی تصدیق بھی ہوئی اور یہ عقیدہ بھی برقرار رہا۔ وہ ہندوؤں کی ہر رسم یا ہر عقیدے کو نہیں مانتے تھے۔ وہ ہر مذہب کے ہر اصول اور قاعدے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ اگر انسانیت سوز یا غیر منصفانہ رسوم کے لیے مقدس کتابوں کی سند پیش کی جاتی تھی تو ان کا ردِّعمل کھلم کھلا عدم اعتماد کا ہوتا تھا۔ یہ قول جو بار بار دہرایا جاتا ہے کہ عورتوں کے لیے کوئی آزادی نہیں ہوسکتی، اور جس کو واضع قانون منو سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کو وہ بعد کا اضافہ تصور کرتے تھے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ یہی کہیں گے کہ منو کے زمانے میں عورتوں کو وہ درجہ حاصل نہ تھا جس کی وہ مستحق تھیں۔ اسی طرح انھوں نے ان لوگوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا جو چھوت چھات کا جواز ویدوں سے مہیا کرنا چاہتے تھے۔ آخر کار ان کا ہندو دھرم چند اساسی معتقدات میں محدود ہو گیا۔ یہ معتقدات تھے ایشور (خدا) کی حقیقت مطلق، تمام زندگی کی وحدت اور عرفانِ الٰہی کے واسطے محبت کی اہمیت (اہنسا) ایسے بنیادی مذہب میں علاحدگی پسندی اور تنگ نظری کی گنجائش نہیں تھی۔ ان کے خیال میں ہندومت کی خوبی یہ تھی کہ اس میں تمام دنیا کے پیغمبروں کی پرستش کی گنجائش تھی۔ یہ عرف عام میں تبلیغی مذہب نہیں ہے۔ ہندومت ہر ایک سے یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے دھرم یا مذہب کے اعتبار سے خدا کی پرستش کرے اور اسی وجہ سے یہ تمام مذہبوں سے صلح کا برتاؤ کرتا ہے۔

انھوں نے عیسائی مبلغین کی اس بات پر سرزنش کی کہ وہ لوگوں کو اپنے مذہب میں لانے کے لیے ''غیر مذہبی جُوا کھیلتے ہیں۔ جو شے کسی شخص کو اچھا عیسائی، یا اچھا مسلمان روحوں کو بچانے کے لیے مشنریوں کی کوشش انھیں متکبرانہ معلوم ہوئی۔ آسام کے آدی باسیوں اور پہاڑیوں کے

بارے میں انھوں نے کہا کہ ''میں ان کے پاس کیا لے کر جاؤں؟ میں ان کے پاس اپنی برہنگی ہی لے کر جاسکتا ہوں۔ انھیں اپنی پرارتھنا سبھاؤں میں شامل ہونے کی دعوت دینے کی بجائے مجھے خود ان کی دعاؤں میں شرکت کرنا چاہیے۔''

مذاہب کے تقابلی مطالعے، ان کی دینیات کی کتابوں کے تھوڑے بہت مطالعے اور مختلف مذاہب کے علما سے گفتگو اور خط وکتابت سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اصلی مذہب میں دل کا معاملہ زیادہ ہے اور دانشوری کا کم اور اصلی اعتقاد وہی ہے جس پر خود عمل بھی کیا جاسکے۔ یہ ان لوگوں کی سمجھ میں مشکل ہی سے آسکتا تھا جن کے پاس بقول سویفٹؔ اتنا مذہب تو تھا کہ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرسکیں لیکن اتنا نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے سے محبت بھی کرسکیں۔ گاندھی کو ان کی زندگی میں مختلف القاب سے یاد کیا گیا۔ سناتنی (کٹّر) ہندو، مرتد ہندو، بودھ، تھیا سوفسٹ، عیسائی اور عیسائی مسلمان۔ وہ یہ سب تھے اور اِن کے علاوہ کچھ اور بھی۔ عقائد ورسوم کے ٹکراؤ کی تہ میں انھوں نے ایک وحدت ڈھونڈ لی تھی۔ ایک مکتوب نگار نے گاندھی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ عیسائیت قبول کرکے اپنی روح کو بچالیں۔

گاندھی نے جواب میں لکھا ہے ''خدا کسی لوہے کی الماری میں بند نہیں ہے کہ اُس تک الماری کے ایک چھوٹے سے سوراخ میں داخل ہوکر ہی پہنچا جاسکتا ہو۔ وہ تو کھلا ہوا ہے۔ اور اس تک اربوں راہوں سے پہنچا جاسکتا ہے، بس انکسار اور دل کی صفائی شرط ہے[1]۔''

(1) The Diaries of Mahaulev Desai ج1، مندرجات مورخہ 4 ستمبر 1932ء

باب6

قلب ماہیت

1891 میں لندن سے واپسی کے بعد گاندھی نے اپنے رہن سہن میں جدت پسندی لانا شروع کردی تھی اور اِس کی ایک نوجوان بیرسٹر سے توقع بھی رکھنا چاہیے تھی۔ جئی کی دلیا، کوکو، مغربی انداز کا فرنیچر اور لباس جیسی اصلاحات، نے گاندھی کے گھر کے بڑھتے ہوتے اخراجات میں اور بھی اضافہ کردیا تھا دراں حال یہ کہ گھر کی آمدنی میں گاندھی برائے نام ہی اضافہ کرپاتے تھے۔ بیرسٹر کا طرز حیات تو بہرحال قائم رکھنا ضروری تھا۔ جب وہ 1893 میں ڈربن کے لیے روانہ ہوئے۔ اور انھیں فرسٹ کلاس میں جگہ نہ مل سکی تھی تو انھوں نے ڈیک پر سفر کرنے کی ذلت سے بچنے کے لیے کسی نہ کسی طرح کیپٹن کے کیبن میں گھس پیٹھ کر کے رہنے کی جگہ حاصل کرلی تھی۔ ڈربن میں جو جو ذلتیں برداشت کرنا پڑیں ان کو گاندھی نے اور بھی شدت سے اِس لیے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی مغربی تعلیم اور اِنر ٹمپل کی بیرسٹری کے مرتبے کا احساس بھی رکھتے تھے۔

جب ان کی بیوی اور بچے اُن کے ساتھ ناٹال گئے تو انھیں پارسیوں کا لباس پہننا پڑا کیوں کہ یورپین لباس کے بعد یہی سب سے زیادہ جدید سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ اپنے کاٹھیاواڑی لباس اور غذا کے آزادانہ استعمال کے عادی تھے اور اس لیے تبدیلی کو قبول کرانے کے لیے کوشش کرنا پڑی۔ گاندھی نے بعد میں تسلیم کیا کہ وہ لوگ ان کے دلائل سے قائل نہیں ہوئے بلکہ ان کے اختیار کلی کی بنا پر انھوں نے بات مان لی۔

ٹالسٹائے نے لکھا ہے کہ ''تبدیلی عقیدہ کے پہلے ان کا فلسفہ حیات یہ تھا کہ انسان کو اس طرح رہنا چاہیے وہ خود اور اس کے گھر والے بہترین طور پر بسر کر سکیں فطرت اور زندگی سے زیادہ عقلمند ہونے کی کوشش نہ کرنا چاہیے۔'' گاندھی کے عقائد بھی بدلے تھے لیکن اس زمانے میں بھی جو بعد میں انھیں ہدایت نایافتہ معلوم ہوتے تھے، وہ کبھی صرف اپنی ذات اور اپنے کنبے کے لیے زندگی بسر نہیں کی۔ ڈربن اور جانسبرگ دونوں ہی جگہ ان کا دسترخوان ہمیشہ کشادہ رہا۔ اُن کے منشی اور جونیئر وکیل عام طور سے انھیں کے ساتھ ٹھہرتے اور ان سے خاندان والوں کا سا برتاؤ کیا جاتا۔ اس پر مستزاد یہ تھا کہ تقریباً روزانہ ہی ان کے یہاں ہندوستانی اور یورپین مہمان ہوتے۔ ان کی بیوی کے لیے یہ برادری بھنڈار کی زندگی سخت امتحان کی ثابت ہوتی۔ ایک بار ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ گاندھی نے خودنوشت سوانح میں اس کی ہو بہو تصویر کشی کی ہے۔ کستور بائی نے ایک ایسے عیسائی منشی کے لیے جس کے والدین (اچھوت) ذات کے تھے پیشاب دان صاف کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا یہ متعصّبانہ رویہ ان کے شوہر کو عقل کے خلاف نظر آیا۔ انھوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ وہ یا تو اس ناخوشگوار فریضے کو خوشی خوشی انجام دیں یا ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ اُن کے اخلاقی جوش وخروش نے انھیں غصے سے اندھا کر دیا تھا اور انھیں یہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا کہ ان کی بیوی پر اس کا کتنا بڑا بوجھ پڑ رہا ہے۔ کئی برس کے بعد انھوں نے لکھا کہ وہ ایک ''ظالم نما مہربان شوہر'' تھے۔

ان دنوں میں بھی جب ان کے بقول آرام وراحت سے بسر ہوتی تھی، انھیں روپیہ بٹورنے سے دلچسپی نہیں تھی۔ ایک ابھرتے ہوئے بیرسٹر کی حیثیت سے انھیں یہ خیال تو ضرور تھا کہ کام اچھی طرح چلے اور ان کے خاندان کو کچھ پیسے ملیں لیکن وہ ایسی تدبیریں اختیار کرنے کو تیار نہیں تھے جو نفع بخش ہونے کے ساتھ ساتھ خلاف اخلاق ہوں۔ انھیں کسی وکیل کے بارے میں بتایا گیا کہ تین ہزار روپے ماہوار کی پریکٹس ہے اور وہ دلالوں کے ذریعے سے مقدمات حاصل کرتے ہیں اور انھیں غیر قانونی کمیشن دیتے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ ''مجھے ان کے نقش قدم پر چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تین سو روپے ماہوار پر گزارا کر لوں گا۔ آخر میرے والد بھی تو اتنا ہی پاتے تھے۔'' قسمت کی پستی اس وقت حد کو پہنچ گئی تھی جب بمبئی کے ایک اسکول میں جز وقتی جگہ کے لیے انھیں ستر روپے ماہوار کی جگہ کے لیے مسترد کر دیا گیا تھا۔ جنوبی افریقہ میں آنے کے بعد

ہی انھیں قانون دان کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔ 1874ء میں انھیں کم سے کم تین سو پونڈ سالانہ کے محنتانے سے شروع ہوکر دھیرے دھیرے اُن کی آمدنی پانچ ہزار پونڈ سالانہ تک پہنچ گئی تھی۔ ان کے قومی خدمات ان کی پریکٹس بڑھانے میں مددگار ہوئیں لیکن ان کا بہت سا وقت بھی انھیں کاموں میں صرف ہونے لگا۔ ان کے پاس جتنے مقدمے آتے وہ سب ہی قبول نہیں کرلیا کرتے تھے۔ وہ اسے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داری نہیں سمجھتے تھے کہ اگر ان کے موکل کا قصور ہو تب بھی وہ اس کی پیروی ضرور کریں۔ اگر دوران مقدمہ میں بھی انھیں یہ معلوم ہوجاتا کہ ان کے موکل نے ان سے کچھ ضروری باتیں چھپائی تھیں تو وہ برسرعدالت اس کی پیروی سے انکار کرتے نہ جھجکتے۔ وہ اسے کسی طرح نہ بھولتے کہ ایام طفلی میں ان کے والد نے کیسے اس بات پر بخش دیا تھا کہ انھوں نے جو چھوٹی سی چوری کی تھی اس کا اقرار کرلیا تھا اور خود انھیں اس پر کتنی پشیمانی ہوئی تھی۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ غلطی کو تسلیم ضرور کرنا چاہیے اور اس کا کفارہ بھی دینا چاہیے۔ ڈربن کے ایک مالدار تاجر اور گاندھی کے قریبی دوست پارسی رستم جی، ایک بار کسٹم ڈیوٹی ادا نہ کرنے کے سلسلے میں مشکل میں پھنس گئے اور ان کے پاس مشورہ کی غرض سے آئے۔ گاندھی نے انھیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اسی مسئلے میں نہیں بلکہ اسی طرح کی اور دھاندلیوں کے بارے میں بھی اقرار جرم کرلیں اور ٹیکس مع جرمانہ ادا کردیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ پشیمان تاجر نے اپنے اقرار جرم کو لکھ ڈالا اور اس دستاویز کو فریم کرا کے اپنی اولاد کی اخلاقی اصلاح کے لیے گھر کے اندر لٹکا دیا۔

جنوبی افریقہ میں پہلا دیوانی مقدمہ لڑنے کے بعد گاندھی کو یہ یقین ہوگیا کہ مقدمات اس لیے زیادہ دنوں تک چلتے رہتے ہیں کہ وکیلوں کو اپنی فیس کے نقصان اور مؤکلوں کو اپنی لاج کا دھیان زیادہ رہتا ہے۔ خود اپنے مؤکلوں کے اور تعلقات ان کے نقدی رشتے سے بالا ہوتے تھے۔ ان کے پیشہ ورانہ بلکہ گھریلو معاملات میں بھی صلاح لی جاتی تھی، خاندان کا بجٹ کیسے متوازن رکھا جائے یا بچے کا دودھ کیسے چھڑایا جائے۔ کئی مؤکل ان کی دیکھ ریکھ میں مٹی اور پانی کا علاج کرایا کرتے تھے۔ اِن میں سے ایک لٹاون سنگھ کو، جس نے اپنے قانون داں ڈاکٹر کو چکمہ دیا تھا، گاندھی نے اپنی کتاب ''ستیہ گرہ اِن ساؤتھ افریقا'' میں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ اس کی عمر ستر سے اوپر ہوچکی تھی اور وہ دمے کا مریض تھا۔ گاندھی نے اس کا فاقے اور مالش کا علاج شروع

کیا اور دورانِ علاج تمبا کو نوشی کی قطعی ممانعت کر دی۔ اپنے مریض کی صحتیابی کی رفتار کے مدھم ہونے سے گاندھی پریشان تھے۔ ایک شام کو وہ ایسی جگہ سوئے جہاں سے لٹاون سنگھ پر اس طرح نگاہ رکھ سکیں اور لٹاون سنگھ انھیں دیکھ نہ پائے۔ نصف شب کے قریب روشنی سی ہوئی۔ گاندھی نے اپنا بجلی کا ٹارچ جلایا اور دیکھا کہ لٹاون سنگھ چوری چھپے سگریٹ پی رہا ہے۔ لٹاون سنگھ نے معافی مانگ لی اور وعدہ کیا کہ دورانِ علاج وہ سگریٹ نہ پیے گا۔ اُس کا ڈاکٹر یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا اور وہ بہت جلد صحتیاب ہو گیا۔

گاندھی کے معاصرین میں یقیناً ان سے زیادہ لائق اور مالدار وکیل تھے۔ لیکن وکالت کے پیشے میں انسانی برتاؤ کے سلسلے میں اُن کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کوئی مؤکل ان کا محنتانہ ادا نہ کرتا تو وہ قانونی چارہ جوئی نہ کرتے بلکہ یہ کہتے کہ یہ نقصان انھیں کی بدولت ہوا کیوں کہ انھوں نے مؤکل کو پہچاننے میں غلطی کی اسی طرح ایک ساتھی نے شکایت کی کہ مؤکل اتوار کو بھی آجاتے ہیں۔ گاندھی نے جواب دیا کہ ''مصیبت کا مارا اتوار کو آرام نہیں کر سکتا۔''

انگلستان سے واپسی کے بعد کی دہائی میں، گاندھی کے یہاں دو متضاد رجحانات اظہار کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف روایت کی کشش ہے اور اس بات کی خواہش ہے کہ انگریزی تربیت یافتہ بیرسٹر کے معیار کے مطابق زندگی بسر کی جائے اور دوسری طرف سادگی کی طرف قلبی جھکاؤ ہے۔ انگلستان میں ان کی ملاقات ایک لا اُبالی عالم، نرائن ہیم چندر سے ہوئی تھی جو اپنے دھوتی کرتے میں اور تقریباً خالی جیب ایک براعظم سے دوسرے براعظم خوش خوش اُچھلتے گھوم پھر چکے تھے۔ انھیں سادہ زندگی کا سبق گیتا سے بھی ملا جس کو وہ روز پڑھتے اور اس کی تعلیمات پر غور کرتے تھے۔

اَپری گرہ (عدم ملکیت) کا آدرش ان کے دل میں پرورش پاتا رہا۔ وہ غیر ضروری چیزوں کا بوجھ اپنے اوپر کیوں لادیں؟ یہ سچ ہے کہ ان پر ایک خاندان کا بوجھ تھا لیکن کیا یہ سوچنا گستاخی نہ تھی کہ ان کی پرورش خدا کی نہیں ان کی ذمہ داری تھی۔ انھوں نے ایک باتونی بیمہ ایجنٹ کی باتوں میں آ کر دس ہزار روپیوں کا بیمہ کرایا تھا۔ اب انھوں نے اس بیمہ پالیسی کو منسوخ کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے اپنی ضروریات کو کم کرنا شروع کیا۔ اور وہ ان امور کی طرف جن میں متوسط طبقے

میں ''شان'' سمجھا جاتا تھا کم توجہ کرنے لگے۔

ایک دن ڈربن کی عدالت میں دل چسپی کا کافی سامان مہیا ہوگیا۔ گاندھی کے کالر سے کلف ٹپکنے لگا۔ یہ کسی بے پروا دھوبی کی کارگزاری نہ تھی بلکہ کپڑے دھونے کا یہ اُن کا پہلا ذاتی تجربہ تھا۔ ایک اور موقع پر یہ دیکھ کر گاندھی کے ساتھی وکیلوں کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑنے لگے کہ ان کے سر کے بال عجب بے ہنگم طریقے سے کٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے تشریح کی کہ سفید فام حجام نے ان کے بال کاٹنے سے انکار کیا تھا اس لیے وہ اپنے حجام آپ بن گئے تھے۔ انھوں نے ایک خیراتی اسپتال میں کمپاؤنڈری کی تربیت بھی حاصل کی۔ وہاں وہ معاہدہ بند مزدوروں کو دوا دیتے جو جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں میں سب سے زیادہ غریب تھے۔ انھوں نے نرسنگ اور دایہ گری کے بارے میں بھی محنت و توجہ سے پڑھا تھا اور اس لیے اپنے سب سے چھوٹے بچے کی ولادت کے وقت دایہ کے فرائض خود انجام دیے تھے کیوں کہ جس نرس کو آنا تھا وہ وقت پر نہ آئی تھی۔ حجام، کمپاؤنڈر اور نرس ہونے کے علاوہ وہ اسکول ماسٹر بھی تھے۔ انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے وہ سہولت رعایتاً حاصل کریں جو دوسرے بچے استحقاق کے طور پر حاصل نہ کر پائیں، اس لیے ان کے بچوں کو یورپین اسکولوں کے باہر ہی رہنا پڑا۔ ان بچوں کو اسی ٹوٹی پھوٹی تعلیم پر قناعت کرنا پڑی جو انھیں اپنے باپ سے اس وقت ملتی جب گھر سے جانسبرگ والے دفتر تک کا دس میل کا فاصلہ پیدل طے کرتے اور یہ بچے آمد و رفت میں ان کے ہمراہ ہوتے۔ اکثر اس سفری درس میں بھی مؤکل یا ان کے ساتھ حارج ہوتے لیکن ماں کے احتجاج کے باوجود گاندھی نے اپنے بچوں کو یورپین اسکولوں میں پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔

سادگی کے اس رجحان کو 1904 میں زبردست بڑھاوا ملا۔ اس سال ایک شام کو جب وہ جانسبرگ سے ڈربن کے لیے ٹرین پر سوار ہو رہے تھے ان کے صحافی دوست پولک نے انھیں ایک کتاب دی۔ یہ رسکن کی In to this last تھی۔ گاندھی نے رات بھر بیٹھ کر از اول تا آخر یہ کتاب ختم کر ڈالی۔ رِسکن نے ان کلاسیکی ماہرین اقتصادیات کی ملامت کی تھی جن کی اقتصادیات کا تصور انسانی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے مرتب نہیں ہوا تھا۔ رِسکن نے اس عزبت اور بے انصافی کی مذمت کی تھی جو صنعتی نظام کی پیدا کردہ تھی یا جسے اس نظام نے اور شدید کر دیا تھا۔ آگے

چل کر یہ اوراسی طرح کے دوسرے خیالات گاندھی کے ذہن میں ہلچل ڈالنےاوران کے نقطۂ نظر میں رنگ بھرنے والے ثابت ہوئے۔فوری طور پر جس بات سے گاندھی سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ رسکن کا سادہ زندگی کا معیارتھا جس میں اپنے ہاتھ سے کام کرنا ہی زندگی کی خوشی ہو۔خود نوشت سوانح میں یہ الفاظ ملتے ہیں: ''کتاب سے میرے بعض دلی معتقدات کی تصدیق ہوئی اور ان کومزید تقویت ملی۔'' کئی برس پہلے نرمدا شنکر کی ''دھرم وچار'' کے دیباچے کو پڑھ کر گاندھی اس انقلاب پر محو حیرت ہو گئے تھے جو مذہبی تعلیمات سے شاعر کی زندگی میں رونما ہوا تھا۔آج خود ان کے یہاں ایسی ہی قلب ماہیت ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو جب ٹرین ڈربن پہنچی تو گاندھی رسکن کے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کر چکے تھے۔اُن کے اپنے ایک یورپین دوست البرٹ وسٹ اس زمانے میں ''انڈین اوپی نین'' کی ادارت کا کام دیکھ رہے تھے۔گاندھی نے ان سے مشورہ کیا کہ رسالے کوایک فارم پر لے جایا جائے جہاں آبادکار صحیح معنوں میں اپنی محنت کی روٹی کھاتے ہوں۔مقصد کے لیے ایک سو ایکڑ کی آراضی جس پر شکر کی کاشت ہوتی تھی جہاں ایک چشمہ بھی موجود تھا اور جو پھل دار درختوں اور سانپوں سے بھری ہوئی تھی، ایک ہزار پونڈ میں خرید لی گئی۔قریب ترین ریلوے اسٹیشن،فونکس، وہاں سے ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا۔اس آراضی کا ڈربن سے فاصلہ چودہ میل تھا۔پولک اور وسٹ کے علاوہ،اوّلین آبادکاروں میں گاندھی کے چچیرے بھائی اور بھتیجے تھے جو ان کے ساتھ جنوبی افریقہ گئے تھے۔ایک 75 فٹ لمبے اور 50فٹ چوڑے ہال میں پریس لگایا گیا۔چھوٹی سی نوآبادی میں ٹین اور پھوس کی چھتوں والے آٹھ مکانات بنائے گئے۔مٹی کی دیواریں کاشتکاروں کے شایانِ شان زیادہ ہوتیں کیوں کہ یہ سب کے سب کاشتکار بننے کا تصور ہی لے کر یہاں آئے تھے لیکن پیسوں کی کمی تھی اور گاندھی کو اپنا منصوبہ مکمل کرنے کی جلدی تھی۔ ہر نو آبادکار کو تین ایکڑ زمین تقسیم کی گئی۔اس کا بیچنا منع تھا لیکن یہ دسرے آبادکار کو منتقل کی جا سکتی تھی۔ صفائی کے انتظامات قدیم وضع کے ہوتے ہوئے بھی،مؤثر تھے۔کنواں کھودنے بھر کے پیسے نہ تھے۔اور مختصر نوآبادی کو برسات کے موسم میں چھتوں پر پانی جمع کر لینا پڑتا تھا۔

''انڈین اوپی نین'' فونکس سے شائع ہونا شروع ہوا۔اخبار کے نکلنے، سپرد ڈاک کیے

جانے کے دن پوری نوآبادی بھڑوں کے چھتے کی طرح مصروف کار رہتی۔ گاندھی اور پولک پروف پڑھتے، چھاپنے والے تصحیح شدہ صفحات کی طباعت میں مشغول ہوتے اور بچے رسالے کو موڑتے اور ان پر پتے والے کاغذ لگاتے۔

نوآبادی کی اجتماعی زندگی کا محور گاندھی کا مسکن تھا۔ اتوار کے دن تمام باشندے گاندھی کے کمرے میں اجتماعی عبادت کے لیے جمع ہوتے اور وہاں گیتا اور انجیل کا پاٹھ ہوتا۔ عیسائی اور گجراتی بھجنوں کی ملی جلی صدائیں حاضرین کو قریبی ماحول سے بلند کر کے نسل و مذہب کی حدوں کے پار لے جاتیں۔ جہاں تک گاندھی کا تعلق تھا، انھیں شہروں کی گرمی اور گرد سے دور ایک گوشۂ خاموشی مل گیا تھا جہاں انسانی طمع و نفرت کی رسائی نہیں تھی۔ یہاں فارم پر وہ ایسے لوگوں کے ساتھ مل جل کر کام کرتے جن کے خیالات ہم آہنگ تھے۔ یہاں انھیں اپنی روحانی نشو و نما کے سوال پر غور کرنے کا موقع ملا۔

فونکس کا احساسِ تکمیل، گاندھی کے ذہن میں زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہا۔ پبلک اور پیشہ وارانہ مشاغل کی وجہ سے اُن کی جانسبرگ کو واپسی ضروری ہوگئی۔ جانسبرگ کی گھریلو زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر، اسی مکان میں قیام کرنے والی خاتون ملی گراہم پولک اپنی کتاب ''مسٹر گاندھی: دی مین'' میں کھینچی ہے۔ یہ چھوٹے پیمانے پر اجتماعی زندگی تھی۔ ایک فیاض بزرگ خاندان کی حیثیت سے گاندھی کو شاید اس کے علاوہ اور کوئی خصوصی اختیارات نہیں تھے کہ وہ دوسروں کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔ وہ تفریح کا سامان بھی بن جاتے اور بآسانی تفریح پذیر بھی تھے۔ ہاتھ کی چکی سے آٹا پیسنے میں جب ہر صبح کو بچے اپنے والدین کے ساتھ شریک ہوتے تو گھر قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ شام کے کھانے کا وقت بھی خوش گوار گزرتا۔ بیچ بیچ میں ہلکی پھلکی گفتگو اور گمبھیر بحثیں چلتی رہتیں۔ کستور بائی انگریزی بولنے کی جو کوشش فرماتیں اس سے ماحول میں جان پڑ جاتی تھی۔ کھانے کے بعد گاندھی مذہب اور فلسفے کے بارے میں بحث اور گیتا کا پاٹھ کرتے۔ جو زف جے ڈوک نے جو گاندھی کے پہلے سوانح نگار اور جانسبرگ کے بپٹسٹ پادری تھے گاندھی کی زندگی کی تیسری دہائی کے آخری حصے کی ایک واقف کارانہ تصویر کشی کی ہے۔[1] انھوں نے گاندھی

(1) دوک، جوزف جے: اِم، کے، گاندھی، مدراس، ص: 8-96

کو پہلی بار دسمبر 1907 میں دیکھا تھا۔

''مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ میرے سامنے ایک مختصر، لچکدار اور چھریرے قد کا آدمی کھڑا تھا اور ایک شائستہ، پرخلوص چہرہ میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جلد سیاہ تھی، آنکھیں کالی تھیں لیکن چہرے پر جو مسکراہٹ دیے جلائے ہوئے تھی اور براہ راست نڈر نظریں، دونوں دل کو اس طرح اڑا لیتی تھیں جیسے طوفان اور چیزوں کو اڑا لے جاتا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ ان کا سن اڑتیں کے قریب ہوگا۔ یہ صحیح نکلا لیکن کام کا بوجھ ان کے کھچڑی بالوں سے ظاہر ہونے لگا تھا۔ وہ انگریزی بہت خوب بولتے تھے یہ بات عیاں تھی کہ ایک بڑے تہذیب یافتہ انسان ہیں۔

ان کی ذات میں ایک ایسی خاموش اور پُر از یقین طاقت وسعت قلب اور شفاف ایمان داری کا احساس ہوتا تھا جس سے میرا دل اس ہندوستانی لیڈر کی طرف خود بخود کھنچ گیا۔ جب ہم جدا ہوئے تو دوست بن چکے تھے۔

ہمارا ہندوستان دوست عام انسانوں کے مقابلے میں اعلا تر سطح پر رہتا ہے۔ ان کے کاموں کو مریم بیتھانی کے کاموں کی طرح، اکثر سنک میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کا غلط مفہوم نکالا جاتا ہے۔ جو انھیں جانتے نہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کاموں کے پس پردہ کوئی ناسزاوار مقصد اور کوئی مشرقی عیاری ہوگی جو دنیاداری سے ایسی مکمل بیزاری کا جواز ہوسکتی ہے۔ لیکن جو ان سے بخوبی واقف ہیں وہ ان کے سامنے پہنچ کر شرم محسوس کرنے لگتے ہیں۔''

میرا خیال ہے کہ دولت ان کے لیے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ ان کے ہم وطن ناراض ہیں وہ کہتے ہیں'' وہ کچھ بھی نہیں لیتے جو پیسے ہم نے انھیں اس وقت دیے تھے جب وہ ہماری نیابت کرنے انگلستان گئے تھے، وہ سب انھوں نے لندن کی واپسی پر لوٹا دیے۔ ہم نے ان کو ناٹال میں جو تحفے دیے وہ انھوں نے ہمارے پبلک فنڈ میں واپس کردیے۔ وہ اس لیے غریب ہیں کہ وہ غریب رہنا ہی چاہتے ہیں۔''

وہ ان کی باتوں پر تعجب کرتے ہیں، ان کی عجیب وغریب بے غرضی پر خفا ہوتے ہیں اور فخر اور اعتماد بھری محبت ان پر نچھاور کرتے ہیں۔ وہ ان بلند قامت کرداروں میں ہیں جن کے ساتھ چلنے سے وسیع النظر کی تعلیم ملتی ہے اور ان کو جانتے ہی انسان محبت کرنے لگتا ہے۔''

ڈوک نے یہ بھی لکھا کہ ان کی مثبت خوشیاں یہ تھیں کہ جسم پر مضبوطی سے قابو رکھا جائے۔ اس کو صلیب پر چڑھا دیا جائے اور تھوریو اور ٹالسٹائے کی طرح اپنی زندگی کی ضروریات کو جہاں تک ممکن ہو سکے کم کر دیا جائے۔ ان کی ان خوشیوں کی برابری صرف ایک اور خوشی کر سکتی تھی اور وہ یہ تھی کہ دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلایا جائے۔ اس لیے اب ہم گاندھی کی اس جدوجہد کی کہانی سنا سکتے ہیں جو انھوں نے جسم پر روح کا غلبہ حاصل کرنے کے لیے کی تھی اور جس سے ان کی نجی اور پبلک زندگی پوری قوت سے متاثر ہوئی۔

☆☆☆

باب 10

جسم اور روح

بچپن کی شادی کے ظالمانہ رواج کے مطابق جو اس وقت ہندو سوسائٹی میں جاری وساری تھا اور جو اب بھی کلیۃً ختم نہیں ہوا ہے، گاندھی کی شادی تیرہ برس کے سن میں ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں بچے کی شادی اُسی طرح والدین کا فریضہ مانی جاتی تھی، جیسے آج کل تعلیم۔ اس نادر موقع پر برادری کے تمام لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے اور دور کے اور قریبی رشتے کے چچیرے، ممیرے اور خلیرے بھائی بہن ملتے اور چھوٹی موٹی رنگ رلیوں میں مصروف ہو جاتے۔ کرم چند گاندھی اور ان کے بھائی کا سن بڑھتا جا رہا تھا اس لیے 1882 میں انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ موہن، ان کے بڑے بھائی اور ایک چچیرے بھائی تینوں کی شادیاں ایک ساتھ رچا کے اپنی زندگیوں میں آخری بار جشن منالیں[1]، اس وقت یہ تینوں بچے بیس سال سے کم ہی عمر کے تھے۔

اس خورد سال دولھا کی کہانی خودنوشت سوانح میں بڑی جرأت، مگر افسوس اور پشیمانی کے ملے جلے جذبے کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ پھر بھی اس تأثر سے دامن بچانا ناممکن ہے کہ بالغ مہاتما کم سن موہن پر بے رحمانہ تنقید کر رہا ہے۔ بچپن کی شادی کا الزام بھی وہ اپنے ہی سر لیتے ہیں، اگرچہ اس بارے میں ان سے کوئی رائے نہیں لی گئی تھی۔ شادیاں پوربندر میں ہونے والی تھیں۔

---

(1) خودنوشت سوانح، ص:19

وہاں جاتے ہوئے ایک حادثے میں ان کے والد کچھ زخمی ہوگئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ''شادی کی بچکانہ خوشی میں والد کے زخم کا غم بھول گیا۔ اس دن مجھے ہر شے صحیح، درست اور خوشگوار لگ رہی تھی۔ اس میں شادی کرنے کا میرا ذاتی شوق بھی شامل تھا۔'' اس پر وہ اضافہ کرتے ہیں۔ میں اپنی کم سن بیوی کو دل وجان سے یوں چاہنے لگا کہ اس کا خیال اپنی کلاس کے کمرے میں بھی مجھے ستانے لگا اور رات بھر ''فضول کی باتیں'' کر کے اسے جگائے رکھتا۔ دو معصوم بچوں نے[1] غیر محسوس طریقے پر اپنے کو زندگی کے سمندر میں لا ڈالا تھا۔

لیکن جب وہ بہے جا رہے تھے اس وقت ان کے دل میں نہ ڈوبنے کا ارادہ مصمم تھا۔ ایک ایسے لڑکے کے لیے جس نے ابھی زندگی کی بیس بہاریں بھی نہ دیکھی ہوں یہ جدوجہد اذیت رساں تھی کہ وہ بیک وقت محبتی شوہر، ایک فرض شناس بیٹا اور ایک اچھا طالب بن جائے۔ ایک معنی میں یہ جہد البقا تھی یہ اسی سے ظاہر ہے کہ موہن کے بڑے بھائی جن کی شادی ساتھ ساتھ ہوئی تھی اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ موہن اس کشمکش سے فتحیاب نکلے، لیکن یہ کشمکش ان پر زخموں کے نشان چھوڑ گئی ان میں ایک زخم تو یہ تھا کہ انھوں نے جنس کو احساس گناہ کے ساتھ ملوث قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں: میں اپنے والدین سے بے حد محبت کرتا تھا، لیکن میں ان جذبات سے بھی دلی وابستگی محسوس کرتا تھا جو جسم سے متعلق ہوتے ہیں۔ مجھے ابھی تک یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ماں باپ کے فرض شناسانہ خدمت کرنے کی خاطر ہر خوشی اور عیش کو قربان کر دینا چاہیے۔''

زندگی کے پچاسویں سال میں داخل ہونے کے بعد یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ پندرہ سال کے لڑکے کے جذباتی مسائل پر انصاف پسندی سے غور کیا جا سکے، چاہے یہ غور کرنے والا خود ہی وہ لڑکا کیوں نہ رہا ہو۔ ماضی پر نظر کرتے وقت، مہاتما کو اپنے عنفوان شباب کا ریکارڈ اخلاقی اعتبار سے قابل فخر نہیں نظر آتا تھا۔ ان کے خودنوشت سوانح کی صاف گوئی سے یہ مبالغہ آمیز تصور پیدا ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں انھوں نے خود کو بے عنان چھوڑ دیا تھا۔ کسی اعتبار سے بھی بچپن کی شادی میں ان کی پسند کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اور اگر ان کی جنسی زندگی کا ایک پہلو قبل از وقت ذہنی بلوغ ہے تو اس کا ایک دم سے رخصت ہو جانا دوسرا بلکہ زیادہ اہم پہلو ہے۔ اپنے بچپن میں انھوں

---

(1) خودنوشت سوانح

نے ایک گجراتی پمفلٹ میں یہ مشورہ پڑھا تھا کہ شوہر کو ہمیشہ بیوی کا وفادار ہونا چاہیے۔اس کے بعد سے کسی ایک کا ہوکر رہ جانے کا آدرش ان کے ذہن پر نقش ہوکر رہ گیا تھا۔

''کسی دوسری عورت کے لیےان معنوں میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتا تھا جن معنوں میں ان (کستور بائی) کے لیے کرتا تھا۔ میں اتنا زیادہ وفادار شوہر تھااور ماں کے سامنے میں نے جو عہد کیا تھااس کا اتنا پابند تھا کہ میں کسی غیر عورت کا غلام نہیں ہوسکتا تھا۔''(1)

خودنوشت سوانح میں انھوں نے قارئین کوان لغزشوں سے آگاہ کیا ہے،جن میں ایام جوانی میں وہ جبری طور پر مبتلا ہوگئے تھے، وہ چھوٹا موٹا بدمعاش، مہتاب جو گاندھی کی بہت سی ابتدائی لغزشوں کا ذمہ دار تھا۔ایک مرتبہ انھیں قحبہ خانے میں بھی لے گیا تھا۔وہ لکھتے ہیں کہ ''میں بدی کے اس غار میں پہنچ کر گویا اندھا اور گونگا ہوگیا۔میں عورت کے قریب اس کے پلنگ پر بیٹھا لیکن مری زبان نہ کھلی۔فطری طور سے وہ یہ صورت زیادہ دیر تک برداشت نہ کرسکی اوراس نے گالیوں اور بے عزتی کے ساتھ مجھے دروازے کا راستہ دکھایا۔(2) ''اسی طرح انگلستان کی ایک ساحلی تفریح گاہ پر ایک دن شام کو وہ ایک میرج پارٹی سے بھاگ کر اپنے کمرے میں ''کانپتے'' تھراتے چلے آئے تھے اور دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے کسی تعاقب کرنے والے سے کوئی شکار بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔(3) جنوبی افریقہ کے پہلے بحری سفر کے دوران جہاز کا کپتان ایک بار انھیں سیر کے لیے ساتھ لے گیا اس سلسلے میں نیگرو عورتوں کے کوارٹروں پر بھی لے گیا۔انھوں نے بعد میں لکھا کہ ''میں جیسے اندر گیا ویسے ہی باہر لوٹ آیا۔''

ان واقعات کے سلسلے میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اگر چہ انھوں نے گناہ کے کھلے دہانے میں اپنے کو چلے جانے دیا لیکن ہر بار وہ صاف بچ نکلے۔ بعد میں انھیں یہ محسوس ہوا کہ خدا کی رحمت یا خوش قسمتی ہی نے انھیں بچائے رکھا۔ سچ تو یہ ہے اُن کے شکست کھانے کے امکانات بہت کم تھے۔جب وہ تحریص وترغیب کے کنارے کھڑے ہوکر تھرتھرانے لگتے تو طاقت وراثرات

---

(1) گاندھی جی (مؤلفہ ٹینڈولکر) سے اقتباس:ص۱۲

(2) خودنوشت سوانح،ص:37

(3) خودنوشت سوانح،ص:95

انھیں اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔سب سے پہلے تو ایک ہی عورت کا ہورہنے کا آدرش تھا جسے وہ بچپن سے کلیجے سے لگائے ہوئے تھے اور دوسری طرف انھوں نے ماں سے انگلینڈ کے سفر کی اجازت لیتے وقت عورت، شراب اور گوشت سے بچنے کا جو عہد کیا تھا وہ انھیں روکے رہتا تھا۔خود ان کا شرمیلا پن اس پر مستزاد تھا۔انگلستان کی طالب علمانہ زندگی کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ "اگر میں اس سے باتیں بھی نہ کرتا تو کوئی بھی لڑکی ہوتی مجھ سے بات کرنے یا میرے ساتھ جانے کو تضیع اوقات ہی سمجھتی۔"

لڑکپن اور جوانی کے وہ گناہ جن پر وہ بعد میں اظہار پشیمانی کرتے رہے، نااہلی زندگی کے زمانے ہی میں کیے گئے تھے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی جنسی زندگی کا چکر بھی بہت لمبا نہیں چلا۔ تیرہ سال کی عمر میں شادی اور اٹھارہ برس کے سن میں انگلستان کا سفر درپیش ہوا۔اس درمیان میں اُن کی اہلیہ ان کے ساتھ مشکل سے تین برس رہیں اور ان کی بیوی نے باقی وقت رواج کے مطابق اپنے میکے میں اپنے والدین کے ساتھ گزارا اور جب گاندھی بیرسٹری کی سند لے کر 1891 میں واپس لوٹے تو زیادہ تر وقت تلاش معاش میں سفر کرتے گزرا۔وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ مشکل سے چھ مہینہ رہ پائے تھے کہ انھیں 1893 میں جنوبی افریقہ جانے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔وہ لکھتے ہیں کہ جب جنوبی افریقہ سے طلبی ہوئی تو ان کی جنسی بھوک تقریباً ختم ہوچکی تھی۔[1] اس وقت وہ چوبیس سال کے تھے۔ان کی بیوی اور دونوں بچے 1896 میں وہ اپنے ذہن میں یہ فیصلہ کرچکے تھے کہ وہ بچوں کی تعداد زیادہ بڑھنے نہ دیں گے۔ چوں کہ وہ مانع حمل اشیا کے استعمال کے ہمیشہ خلاف رہے اس لیے اس فیصلے کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ وہ پرہیز گاری کی زندگی بسر کرنے لگیں۔1906 میں انھوں نے تجرد (برہمچریہ) کا عہد کرلیا۔

اس کے بعد وہ اور ان کی اہلیہ بہت سے باہمی رشتوں میں بندھ گئیں لیکن شادی کا خصوصی رشتہ نہ رہا۔اس وقت تک ان دونوں کے مابین پوری ہم آہنگی پیدا ہوچکی تھی۔تیسویں سال میں داخل ہونے کے بعد وہ عنفوان شباب کی جھلک جھلک کے دور سے بالکل ہی باہر نکل آئے تھے۔ کستور بائی اب بھی اَن پڑھ تھیں لیکن جو بات ان کی عقل سمجھ نہ پائی تھی وہ ان کا دل اکثر محسوس

(1) خودنوشت سوانح:ص:25

کر لیتا تھا۔ متوسط طبقے کی ہر عورت کی طرح، ان کے دل میں بھی آرام اور اپنے بچوں کے مستقبل کے تحفظ کی تمنا تھی۔ وہ 1897 میں جس دن ناٹال میں وارد ہوئیں اسی دن سے انھیں یہ محسوس کر کے ایک زبردست دھچکا سا لگا کہ ان کے شوہر، جن کو ڈربن کی سڑکوں پر تقریباً مار کر چھوڑ دیا گیا تھا، خطرناک طور پر معروف ہو چکے ہیں۔ گاندھی کے جسم میں ایک مضطرب روح تھی انھیں صرف سیاست ہی سے نہیں بلکہ سماجی سیوا کے ہر شعبے سے دل چسپی تھی۔ ہم پیشہ اور سیاسی ساتھیوں کے لیے ان کا گھر بورڈنگ ہاؤس سا بن گیا تھا۔ ان کی ساری بچت ایک سبزی خور رستوراں کی امداد سے لے کر ایک سیاسی جریدے کے چلانے تک کے قومی کاموں میں صرف ہو جاتی تھی۔ قومی فرض کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے وہ اپنے بال بچوں کو ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں بھیج سکتے تھے۔ ایک تار آ جانے پر گھر والوں کو بمبئی سے ڈربن اور ڈربن سے بمبئی کے بحری سفر پر روانہ کیا جا سکتا تھا۔ ایسے آدرشوں کے لیے جو کستوربائی کی سمجھ میں اکثر نہ آتے تھے گاندھی جی اپنی ذات اور اپنے بال بچوں پر تجربے کیا کرتے تھے۔ فونکس فارم ان کے شوہر کی نظر میں مثالی زندگی کے خواب کی تعبیر تھا۔ جب وہ وہاں پہنچیں تو وہ اپنی حیرت اور جھنجھلاہٹ کو چھپا نہ سکیں۔ سونے کے ہار اور ہیرے کی انگوٹھیاں بیچ ڈالنے تک تو انھوں نے خود کو راضی برضا کر لیا تھا لیکن رہے سہے آرام کو بھی خیر باد کہنے اور راتوں رات ایک بیرسٹر کی بیوی سے ایک کسان کی بیوی کا روپ دھارن کرنے کے لیے انھیں کافی کوشش کرنا پڑی۔ گاندھی لکھتے ہیں کہ جب 1906 میں انھوں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ وہ بقیہ زندگی مجردانہ بسر کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا انھوں نے پہلے ہی اپنے ظاہری ماحول کی از سر تا پا تبدیلی کو گوارا کر لیا تھا اب وہ زن و شوہر کے باہمی خصوصی رشتے کو تیاگ دینے پر بھی رضامند ہو گئیں۔

تجرد کی زندگی بسر کرنے کا عہد انھوں نے 1906 کی زولو بغاوت کے وقت کیا۔ اس وقت گاندھی ایک رضا کار ایمبولینس کی قیادت کر رہے تھے۔ زولولینڈ کے افریقی گاگوں کی سنجیدہ خاموشیوں میں ان پر یہ بات منکشف ہوئی کہ جس طرح کی خدمت وہ اس وقت کر رہے ہیں ویسی ہی خدمت آئندہ بھی کرتے رہنے کی اہلیت ان میں تبھی باقی رہ سکتی ہے جب وہ متاہلانہ زندگی کی دلچسپیوں اور اضافۂ نسل اور بچوں کی پرورش و پرداخت سے دستبردار ہو جائیں۔ مختصر یہ کہ وہ روح

ونفس دونوں کے پیچھے ساتھ ساتھ دوڑ نہیں سکتے تھے۔ نفسانی زندگی تو پہلے ختم ہوتے ہوتے صفر تک پہنچ چکی تھی۔ 1899 میں ہی انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ چار بچے پہلے ہی سے تھے اور بچے پیدا نہیں کریں گے۔ انیس برس کے بعد انھوں نے یہ تشریح کی ان کے برہمچر یہ کی بنیاد یقیناً اخلاقی تھی لیکن اس کی ابتدا ضبط تولید کی خواہش سے ہوئی تھی میرا معاملہ خاص طور سے اسی مقصد کے ماتحت پیش آیا۔ اس لیے جو زبردست اخلاقی نتائج مرتب ہوئے وہ ایسے بعداز وقوع خیالات کا ثمرہ تھے جو فطری طور سے یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے رہے۔[1] یہ خیال کہ اپنی بیوی سے بھی جنسی کنارہ کشی کی جاسکتی ہے، انھیں گجراتی جوہری شاعر اور فلسفی رائے چند بھائی سے ملا جن کو وہ روحانی بحران میں پناہ گاہ مانتے تھے۔ یہ تجویز پہلے تو ان کے کانوں پر گراں گزری لیکن رائے چند بھائی نے موافق زمین پر بیج ڈالا تھا۔ شروع شروع میں جنسی مطالبات اور فرائض فرزندی کے مطالبات ڈالا تھا۔ شروع شروع میں جنسی مطالبات اور فرائض فرزندی کے مطالبات کے درمیان گاندھی کے ذہن میں جو کشاکش تھی اس کی وجہ سے اوّل الذکر تہہ دل سے قبول کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوئی تھی۔ لیکن نفسانی زندگی جو موسلا دھار بارش کی طرح شروع ہوئی تھی بہت جلد سرد پڑنے لگی اور آخر کار 1902 میں حتمی طور سے ترک کردی گئی۔

عہد لینے کے فوراً بعد والے زمانے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''مجھے اس کا اقرار کرنا پڑے گا کہ میں نے جس بات کا عہد کیا تھا اس کی اہمیت اور وسعت کا مجھے پورا اندازہ نہیں تھا۔'' انھوں نے غذائی تجربے شروع کیے، بے نمک، بے دال، بے دودھ غذاؤں پر تجربے کیے تاکہ وہ اپنے لیے ایسی غذائیں تجویز کرسکیں جن سے اچھی صحت قائم رہے اور شہوانی جذبات کی روک تھام بھی ہوسکے۔ انھیں برت مفید معلوم ہوئے تجربے نے یہ بتایا کہ صرف جسم پر قابو پانا کافی نہیں ہے۔ شہوانیت کی جڑیں دماغ میں تھیں۔ صرف شعوری دماغ کو بھی قابو میں رکھنا کافی نہیں تھا۔ شہوت کو لاشعور سے بھی بھگا دینا تھا۔ وہ اکثر گذری ہوئی عیاشیوں کے خواب دیکھنے لگے اور اس سے انھیں ڈر لگنے لگا۔ اس جدوجہد میں ہمیشہ ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔ کبھی کبھی جب یہ معلوم ہونے لگتا کہ لڑائی جیتی جا چکی ہے دشمن یکایک حملہ کردیتا۔ مثال کے طور پر نو برس اپنے عہد پر

---

(1) ینگ انڈیا۔ 2 اپریل 1923ء

برقرار رہنے کے بعد جب وہ 1915 میں ہندوستان واپس آئے تو یہاں کی نئی صحبت نے سوئے ہوئے شیطان کو پھر بیدار کردیا اور اسے زیر کرنے کے لیے انھیں کچھ کوشش پھر کرنا پڑی۔[1]

ان کے دوسرے آدرشوں کی طرح برہمچر یہ کا آدرش بھی ارتقائی منزلوں سے گزرا اور آخر میں یہ پرہیزگاری سے بڑھ کے کچھ اور وسیع ہوگیا کیوں کہ اس میں خواہشات ہی سے نہیں بلکہ خواہشات کے خیال سے بھی چھٹکارا مل گیا۔ جیسے جیسے دن بیتتے گئے اس کا دائرہ کار پھیلتا گیا اور آخر میں اصولِ زندگی بن گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو برہما (خدا) سے ملا دیا جائے اور اسے موکش (نجات) کا راستہ دکھا دیا جائے اس طرح جو بات ضبط تولید کے وسیلے کے طور پر شروع ہوئی تھی وہ زمانہ گزرنے پر اور تجربے کی روشنی میں ترقی کر کے نجات کا وسیلہ بن گئی۔ آخر کار گاندھی اس نتیجے پر پہنچے کہ جنسی احتیاط کے محدود معنی میں برہمچر یہ پر عمل کرنا وسیع معنوں میں برہمچر یہ یعنی تمام حواسِ خمسہ پر عمل قول اور خیال کی تمام صورتوں پر قابو پائے بغیر ناقابل عمل ہے یہ کسی ایک بھوک کی تربیت کا نہیں بلکہ ہر بھوک کی تربیت کا سوال ہے۔ یہ ایک اصولِ زندگی، ایک.................. ہے ۔انھوں نے لکھا کہ ''برہمچاری اور غیر برہمچاری کی زندگی کے درمیان واضح لکیر ہونا چاہیے۔ دونوں میں مشابہتیں سطحی ہیں۔ دونوں بصارت کا استعمال کرتے ہیں لیکن برہمچاری خدا کو دیکھنے کے لیے اور دوسرے اپنے گرد و پیش کی ہرزہ کاریوں کے نظارے کے لیے۔ دونوں اپنی سماعت کا استعمال کرتے ہیں، لیکن جہاں ایک خدا کی تعریفوں کے علاوہ کچھ اور نہیں سنتا، دوسرا صرف بے ادبیوں سے اپنے کانوں کی تواضع کرتا ہے۔ دونوں اکثر دیر تک جاگتے رہتے ہیں، لیکن ایک وہ وقت عبادت میں گزارتا ہے اور دوسرا وحشیانہ اور فضول کی رنگ رلیوں میں ضائع کرتا ہے۔ دونوں پیٹ بھرتے ہیں لیکن ایک صرف بھگوان کے اندرونی مندر کو درست حالت میں رکھنے کے لیے اور دوسرا حلق تک کھانا ٹھونس لیتا ہے اور ایک مقدس برتن کو بدبودار نالی میں تبدیل کر لیتا ہے۔''[2]

یہ ایک ایسی زندگی کا آدرش تھا جو خدا اور انسان کی خدمت کے لیے وقف تھی۔ گاندھی کے خیال میں مرضی الٰہی کے بغیر اس کا حصول ناممکن تھا۔ صرف انسانی کوشش سے یہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

(1) ہری جن، 15 رجون 1947ء

(2) خود نوشت سوانح، ص: 239

جولوگ اس طرح کی زندگی کا حوصلہ رکھتے ہوں اُن کو گاندھی کا مشورہ یہ تھا کہ وہ شادی نہ کریں۔ جولوگ انسانی برادری کی خدمت کو واحد خوشی سمجھتے ہوں اُن کو کسی اور خوشی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ انھیں پالین کے اس قول سے اتفاق تھا کہ جلنے سے یہ بہتر ہے کہ شادی کرلے جائے لیکن شادی کو ایک ایسا مقدس عہد سمجھنا چاہیے جس میں جنس سب سے کم اہم عنصر ہو۔ یہ اُن لوگوں کو بھی پرہیزگاری کا درس دیتے تھے جن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اُن کے خیال میں اگر افزائش نسل مقصود نہ ہو تو جنسی زندگی جسمانی اعتبار سے نقصان رساں اور اخلاقی اعتبار سے گناہ ہے کیوں کہ وہ مانع حمل آلوں کی مذمت کرتے تھے کیوں کہ یہ فطرت کو دھوکا دیتے ہیں اور مردوں اور عورتوں سے ضبط نفس کی صلاحیت چھین لیتے ہیں۔ وہ اس قسم کی غذا، ورزش، غسل، مطالعہ اور تفریح تجویز کرتے تھے جن سے جذباتِ اسفلی دبے رہیں۔ اور اگر ان تمام احتیاطی تدبیروں کے باوجود، جسم کمزور پڑے تو انسان کو گھٹنوں کے بل جھک کر خدا سے حفاظت کی دعا مانگنا چاہیے۔

ان خیالات کی توضیح وتشریح اُن مضامین اور بے شمار خطوط کے جواب میں کی گئی جو اُن کے جریدے میں شائع ہوئے۔ ان کا ایک انگریزی مجموعہ ''ضبط نفس بنام تن پروری'' چھپا اور ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اس میں ان خیالات کی ہر دلعزیزی سے کہیں زیادہ شاید اس شوق جستجو کو دخل تھا جو موضوع نے بیدار کر دیا تھا۔ یہ بات گاندھی کے ذہن میں صاف تھی کہ وہ سنیاسیوں کے برہمچریہ کی تبلیغ نہیں کر رہے تھے بلکہ انھیں جب لوگوں نے سنیاسی کے لقب سے یاد کرنا چاہا تو انھوں نے اِسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ ''وہ ایک اوسط درجے کے انسان ہیں اور ان میں اوسط درجے سے بھی کم کی صلاحیتیں ہیں[1]۔''، انھیں یقین تھا جو مرتبہ انھوں نے حاصل کیا ہے وہ کوئی بھی مرد یا عورت حاصل کرسکتی ہے، بشرطیکہ وہ اُسی طرح کوشش کرے اور ویسی ہی امید اور اعتقاد پیدا کرے۔ مشکل تو اسی شرط سے پیش آئی تھی۔ کتنوں میں ان کی سی کوشش، امید اور اعتقاد مجتمع ہو سکتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی ڈسپلن کا نظریہ مرتب کر لینا ایک بات ہے اور اس پر عمل کرنا بالکل ہی دوسری بات۔ ایک مشہور ہم عصر ٹالسٹائے نے بھی جن کا گاندھی نے اپنی جوانی کے تشکیلی دور میں بے حد اثر قبول کیا تھا، انسانی زندگی میں جنس کے مقام پر کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔

---

(1) ہریجن، 3 اکتوبر، 1936

ٹالسٹائے نے علی الاعلان یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ''انسان زلزلوں، وباؤں، بیماریوں اور ہرطرح کی مصیبتوں کوجھیل کر بچ نکلتے ہیں لیکن خلوت ہم بستری کے المیہ سے بڑھ کر نہ کوئی المیہ ہے نہ تھا نہ ہوگا'' کرٹزر سناٹا کی اشاعت کے بعد ٹالسٹائے نے اس امر کی توثیق کی کہ محبت الٰہی اور محبت ابنائے جنس کے عیسائی آدرش میں اور جنسی محبت یا شادی میں باہمی تضاد ہے۔ کیوں کہ مؤخر الذکر کا مقصد نفس پرستی ہے۔ عیب جو نقادوں کا کہنا تھا کہ ''کروٹرز سناٹا'' کا مصنف جو خود تیرہ بچوں کا باپ ہے اب بوڑھا ہو چلا ہے اس لیے اب انگور کھٹے ہو گئے ہیں۔ یہ حقیقت کہ تجرد کا عہد کر لینے کے بعد کئی برس تک ٹالسٹائے ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا رہا۔ اس کا ثبوت اس کی ڈائریوں سے بھی ملتا ہے جب تک وہ اکیاسی برس کا نہیں ہو گیا، یعنی مرنے سے ایک برس پہلے تک۔ جنسی خواہشات سے اُسے چھٹکارا نہ مل پایا تھا۔

تجرد کی جدوجہد میں ٹالسٹائے نے اپنی اخلاقی اور روحانی قوتوں پر بوجھ نہیں ڈالا تھا بلکہ ازدواجی پیکر کو جو پہلے ہی سے کمزور ہو چلا تھا چور چور کر دیا تھا۔ ان کی بیوی سونیا پر ہسٹریا کی کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ چلاتیں کہ ''میں اپنے کو مار ڈالنا چاہتی ہوں، کہیں بھاگ جانا چاہتی ہوں، کسی سے عشق کر لینا چاہتی ہوں۔'' ان کی زندگی لڑائی جھگڑوں اور صلح مصالحت کا ایک چکر بن کر رہ گئی تھی۔ ڈائریوں میں درج ایک قضیے کا اختتام اس خوفناک فیصلے پر ہوا ہے: ''ہم دونوں کے درمیان جو جدوجہد جاری ہے وہ موت تک جاری رہے گی۔ یا تو خدا ملے گا یا کوئی خدا نہ رہے گا۔'' کاؤنٹس کے لیے اپنے شوہر کے آدرشوں کا قبول کرنا تو دور رہا، وہ تو اسے سمجھ ہی نہ پائی تھی۔ گاندھی اپنی زندگی میں جو تبدیلیاں لائے وہ کچھ کم انتہا پسندانہ نہ تھیں اور انھوں نے اپنے خاندان کے لیے جو آدرش مقرر کیے تھے وہ ٹالسٹائے سے کچھ کم انقلابی نہ تھے۔ گاندھی کے گھر والے اِن تکالیف کو اس لیے برداشت کر گئے کہ کچھ تو شوہر نے زیادہ ہوشیاری سے کام لیا اور کچھ اس لیے کہ بیوی نے قربانیاں دیں۔ متوسط طبقے کی عورتوں کی طرح کستور بائی کو خاندان کے آرام و راحت اور اس کی کفالت کی ضمانت کا خیال تھا جس عورت کی بچت کو اس کا شوہر قومی کاموں میں صرف کر دیتا ہو، جس کے بچوں کو اسکول کی باقاعدہ تعلیم نہ مل پاتی ہو، جس کا بنا بنایا گھر سیاسی اسباب کی بنا پر بگڑ جاتا ہو اور جس کی گھریلو زندگی پر بھی اجتماعی زندگی کا سایہ پڑتا رہتا ہو، اس عورت کی زندگی پر یقیناً غیر

معمولی بوجھ پڑ جاتا ہے۔لیکن کستور بائی کوبحیثیت ایک ہندو بیوی کے دھرم کا سہارا تھا۔وہ اپنے شوہر کے نقش قدم پر چلتی رہیں، چاہے یہ ان کے مزاج کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ رہا ہو۔ان کے شوہر کی اصلاحات کے معاملے میں اُن کا ردعمل یکے بعد دیگرے استعجاب ، مخالفت، قبول، اختیار اور تبلیغ کا رہا ہے۔چاہے وہ چھوت چھات کے خاتمے کا مسئلہ ہو یا گھر کے کتے ہوئے سوت کی کھادی کے کپڑے پہننے کا۔شروع شروع میں اپنے شوہر کے خیالات سے مطابقت پیدا کرنا ان کو مشکل ہی نظر آیا،لیکن انھوں نے جب یہ خیالات اپنائے تو پھر دل وجان سے اپنائے۔ بلکہ دوسروں میں اس کی تبلیغ بھی کی۔ٹالسٹائے کی بیوی نے اپنے شوہر کے چیلوں کو ایک بار'' کالے کالے لوگ،فریبی،جعلیے اور ریاکار'' کے ناموں سے یاد کیا،لیکن شریمتی گاندھی کی نظر میں ان کے شوہر کے چیلے ان کے بیٹوں کی طرح تھے۔جنسی زندگی کے بارے میں خیالات کی تبدیلی سے گاندھیوں کی گھریلو زندگی میں کوئی ابتری نہیں آئی۔گاندھی کو یہ یقین تھا کہ اس سے زندگی میں مٹھاس بڑھ جاتی ہے اور زندگی مالا مال ہوجاتی ہے۔

رادھا کرشنن نے''ہندو نظریہ زندگی''

میں لکھا ہے کہ جنس اور زندگی کے بارے میں یہ خیالات ان معنوں میں ہندوؤں کے نظریۂ حیات کا جز نہیں تھے جو ہندو دھرم کے شارحین نے بتائے ہیں۔''دیوتا بھی شادیاں کرتے ہیں جب ہندو وجود کا مطلق کی حمد وثنا سے نیچے اتر کر جسمانی دیوتا کی عبادت اختیار کرتا ہے تو اس دیوتا کی بیوی ضرور ہوتی ہے۔جنسی زندگی کوئی جرم یا مخرب اخلاق کام نہیں ہے۔'' اور جہاں عیسائیت اور بدھ مت کے بعض فرقے سنت سادھوؤں کی زندگی کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کو کم تر شمار کرتے ہیں اور ان کا بس چلے تو شاید ساری دنیا کو ایک ہی ریلے میں خانقاہ نشین کرادیں، ہندو دھرم سنیاسی کی زندگی کو وقعت کی نگاہ سے دیکھنے کے باوجود گھریلو زندگی کو برا نہیں سمجھتا۔'' زندگی کی چاروں منزلوں میں سے چار آشرم۔ برہمچریہ،تربیت کا دور، گرہستیہ، گھریلو زندگی کا دور وان پرستھیہ،اعتکاف اور سنیاس،ترک دنیا۔ ہر منزل اپنی جگہ اہم ہے اور ہندو طرز زندگی کے سفر میں ضروری سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

گاندھی کا نظریہ جنسیات نفسیات کے ماہرین کی تحقیقات سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔

جہاں تک ان کا تعلق ہے، فرائڈ شاید زندہ ہی نہ رہتا۔ نفسیات کے عالموں کا کہنا ہے کہ ضبطِ نفس پر اعتماد کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور اس لیے اس قوی جنسی جذبے پر باندھ بنا کر روکنے کے بجائے اس کے اظہار کا فطری اور سماجی حیثیت سے قابل قبول طریقہ اپنانا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ گاندھی کے تصورِ زندگی میں جنسی جذبے کی روک تھام جسم و دماغ کی وسیع تر تربیت کا ایک حصہ ہے لیکن اس وسیع تر تربیت کا حصول موجودہ سوسائٹی کے ایک معمولی فرد کے لیے پہاڑ پر چڑھائی سے کم نہیں ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ جنس اور شادی کے بارے میں گاندھی کا نقطۂ نظر، ایک عجیب و غریب ذاتی افتادِ طبع کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے ان کی نجی اور پبلک زندگی کے پس منظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز قبل از وقت جنسی زندگی سے ہے جس کے بھنور میں انھیں بچپن کی شادی نے پھنسا دیا تھا۔ اس کی حیثیت قبل از وقت بلوغ کے خلاف ردِّ عمل کی تھی زندگی کے حق میں اثاثہ ثابت ہوا۔ ان کی شخصیت کی نرمی میں کوئی کمی نہیں آنے پائی اور یہ عورتوں کی طرف ان کے طرزِ عمل میں گمراہ زاہدوں کی خشونت آنے پائی۔ وہ عورت کو محض حرص کا پھندا نہیں سمجھتے تھے وہ اس کو ایسا آتشیں جہاز بھی نہیں مانتے تھے جو ہمیشہ انسانی جنگی جہاز کے پہلو بہ پہلو اس لیے چلتا رہے کہ ایک دھماکے میں اسے اڑا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ عورتیں جن میں بعض بہت ہی ذہین اور شریف تھیں، ان کے ساتھ ساتھ اور ان کی تحریکوں میں پیش پیش رہتی تھیں۔ وہ عورتوں کی سیاسی اور سماجی آزادی کے پُر جوش مبلغ تھے۔ انھوں نے پردے کے ظلم بچپن کی شادی کی بے انصافی شادی بیوگان بلکہ ہر اس بوجھ کے خلاف جس کے نیچے ہندوستانی عورت دبی ہوئی تھی آواز بلند کی۔ انھوں نے ہندوستانی عورتوں میں عزت اور طاقت کا جذبہ بیدار کیا۔

جب انھوں نے برہمچریہ کا بچن لیا تھا تو یہ بات اُن کے سان گمان میں بھی نہیں تھی کہ ٹرانسوال کی حکومت بہت جلد ان کی ایک ستیہ گرہ اندولن چلانے پر مجبور کر دے گی جب یہ وقت آپڑا تو انھیں اندازہ ہوا کہ وہ اس جدوجہد کے لیے جو لاشعوری تیاریاں کر رہے تھے یہ عہد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ انھوں نے وہ سب مشترک رشتے توڑ دیے تھے جو انسانوں کو اپنے ضمیر کے حکم پر چلنے سے روکتے ہیں۔ اس معنی میں انھیں ذاتی ترکِ لذات سے پبلک زندگی میں بیش بہا

مدد ملی۔ 1914 کے ہبیرٹ جرنل میں پروفیسر گلبرٹ مرے کا ایک مضمون شائع ہوا ہے اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''ارباب اقتدار کو اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ ایک ایسے شخص سے کیا سلوک کرتے ہیں جو نہ تو شہوانی عیش کی پروا کرتا ہے، نہ مال و دولت کی نہ آرام و تعریف اور ترقیوں کی، لیکن اگر وہ کسی بات کو ٹھیک سمجھتا ہے تو اس کے سرانجام دینے میں اٹل رہتا ہے۔ وہ خطرناک اور تکلیف دہ دشمن ہے کیوں کہ اس کے جسم پر تو آپ بآسانی فتح پا سکتے ہیں لیکن یہ جسم آپ کو اس کی روح پر کوئی رسوخ نہیں دلوا سکتا۔

باب 11

ستیہ گرہ کی دریافت

سرایلین برنس نے لکھا ہے کہ جنوبی افریقہ کی دیسی پالیسی تنزل کرتے کرتے سفید فاموں کے دفاع کا ذریعہ بن گئی تھی اور یہ سفید فام خود ایک ایسے نظام کی پیداوار تھے جس کا مقصد ہی غیر سفید فاموں کو ذلیل کرنا تھا۔ تہذیبی اختلافات اور مختلف طرز ہائے زندگی کی نمائشی دلیلوں کا پردہ ہٹادیا جائے تو معاشی رقابت کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ لائنل کرٹس کا تعلق ٹرانسوال کے برطانوی عملے سے تھا اور 1919 کے ہندوستانی اصلاحات کے دوعملی نظام کی تشکیل میں بھی اُس کا ہاتھ رہا ہے۔ اُس نے گاندھی سے 1903 کی ایک گفتگو کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

''انھوں نے (گاندھی) گفتگو کا آغاز اپنے ہم وطنوں کے کردار کی خصوصیات، محنت کفایت شعاری اور صبر کے بارے میں باور کرانے کے طور پر کیا۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی بات سننے کے بعد میں نے ان سے کہا تھا کہ ''مسٹر گاندھی، آپ جس شخص پر زور تبلیغ صرف کر رہے ہیں اس کا عقیدہ پہلے ہی سے بدل چکا ہے۔ اس ملک کے یورپین ہندوستانیوں کی بُرائیوں سے نہیں بلکہ ان کی خوبیوں سے خائف ہیں۔

ناٹال کے یورپیوں نے ہزاروں نیم غلام معاہدہ بند ہندوستانی مزدوروں کی درآمد گنّے کے فارموں اور کانوں میں کام کرنے کے لیے کی تھی۔ لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان کے

درمیان آزاد ہندوستانی تاجروں اور کاشتکاروں کی حیثیت سے رہیں۔ بلکہ بوئر کی لڑائی کے بعد تو انھوں نے ''ایشیائی حملے'' کا نعرہ لگایا 1903 میں برطانوی ہائی کمشنر کی جانب سے مقرر کی ہوئی ایک کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ ہندوستانیوں کو ٹرانسوال میں چوری چھپے لانے کا الزام بے بنیاد ہے۔ اگرچہ بہت سے ہندوستانی خاندان جنھوں نے لڑائی چھڑنے کے بعد ٹرانسوال چھوڑ دیا تھا۔ جنگ بندی کے بعد واپس آ گئے تھے پھر بھی 1903 میں ٹرنسوال کی مجموعی ہندوستانی آبادی 1899 کی آبادی کے مقابلے میں کم تھی۔

یورپیوں کا یہ خوف کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانی تارکین وطن کا سیلاب آ رہا ہے، مبالغہ آمیز تھا۔ گاندھی اس خوف کو خلاف عقل قرار دیتے تھے لیکن وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ اس موضوع پر یورپیوں کے جذبات بجاطور پر برانگیختہ ہیں۔ وہ یورپیوں کے تعصب کے پیش نظر اس حد تک جانے کو تیار تھے کہ ہندوستانی مزدوروں کی مزید برآمد پر مکمل پابندی لگا دی جائے۔ ناٹال میں اور معاہدہ بند مزدور آنے نہ دیئے جائیں لیکن ہندوستانی تاجروں کے یہاں محاسب اور منشی کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ایک مختصر تعداد کی ضرورت ہوگی۔ مقامی حکومتوں کی پشت پناہی سے یورپیوں اور ہندوستانی برادری کے درمیان جو اور مسائل اٹھ کھڑے ہوئے تھے اُن کے حل کی خاطر گاندھی کافی دور تک جانے کو تیار تھے۔ ہندوستانی تجارت کو لائسنس کے ذریعے ضابطہ بندی جاری رکھنے پر بھی وہ اس شرط کے ساتھ تھے کہ مقامی ادارے (لوکل باڈیز) سپریم کورٹ کی نگرانی میں لائسنس جاری کریں۔ ہندوستانی اس پر بھی راضی تھے کہ زمین کی ملکیت اور حق رہائش کے بارے میں میونسپل اور مقامی قوانین کی پابندی کریں گے بشرطیکہ یہ قوانین ہندوستانیوں اور یورپیوں پر یکساں لاگو ہوں۔ گاندھی حق رائے دہندگی کا مطالبہ نہیں کر رہے تھے انھوں نے جنوبی افریقہ کے ہائی کمشنر کو بتایا کہ ''ہم (ہندوستانی) سیاسی طاقت نہیں چاہتے ہیں، لیکن ہم دوسری برطانوی رعایا کے دوش بدوش، امن وآشتی، عزت نفس اور وقار کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ یہی تو بوئر اور برطانیہ والے چاہتے نہیں تھے۔ بعض میں جنرل اسمٹس نے یہ اعلان کیا کہ حکومت نے یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ ''اس ملک کو سفید فاموں کا ملک بنایا جائے گا اور چاہے اس راستے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں، ہم نے اپنے قدم جما دیئے ہیں اور وہاں سے یہ قدم ہٹائیں گے نہیں۔''

وہ منزل بھی جلد ہی آ گئی جہاں گاندھی کی مصالحت اور ''جیواور جینے دو'' کی پالیسی کو زبردست دھچکا لگنے والا تھا۔ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کی رجسٹری کے سوال پرٹکراؤ کی نوبت آ ہی گئی۔ پہلے یہ کافی سمجھا جاتا تھا کہ لوگوں کے دستخط یا اَن پڑھ ہونے کی صورت میں نشانی انگوٹھا لے لیا جائے۔اس کے بعد فوٹو کی بھی قید لگائی گئی اور ہندوستانیوں کے لیے نیا پرمٹ لینا ضروری قرار دیا گیا۔ جب گاندھی ''زولو بغاوت'' کی مہم سے واپس آئے جہاں وہ اپنے اُس وقت کے تصورات کے مطابق سلطنت کے شہری کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کرنے گئے تھے تو انھیں پتہ چلا کہ ایک نئے قانون کی رو سے ہندوستانیوں کی رجسٹری کے ضوابط کو جتنا پریشان کن اور ذلت آمیز بنایا جاسکتا تھا، بنا دیا گیا ہے۔انھوں نے جب 23 اگست 1906 کے ٹرانسوال گزٹ میں اس مسودۂ قانون کے دفعات پڑھے جوٹرانسوال کی مجلس قانون ساز میں پیش کیا جانے والا تھا تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔اس کی رو سے ہر ہندوستانی مرد،عورت اور آٹھ برس سے زائد عمر کے بچے کے لیے یہ لازمی قرار دیا گیا تھا کہ وہ رجسٹری کرائے اور رجسٹری کے فارم پر انگلیوں اور انگوٹھے کا نشان لگائے اگر والدین نابالغ بچوں کی انگلیوں کا نشان لگوانے سے انکار کریں تو سولہ برس کی عمر پوری کرنے پر انھیں ایسا کرنا تھا۔اس ضابطے سے روگردانی کی سزا جرمانہ،قید یا ملک بدر ہوسکتی تھی۔ عدالتوں میں، مال کے دفتروں میں کسی وقت اور کسی بھی جگہ ان سے کہا جاسکتا تھا کہ وہ اپنا رجسٹری کا سرٹیفکیٹ پیش کریں، پرمٹوں کے معائنے کے لیے پولیس افسر کسی بھی ہندوستانی کے گھر میں داخل ہوسکتا تھا۔اگر اس مسودہ قانون کو کتے کے پٹے ،کا نام دیا گیا تو ٹھیک ہی تھا۔مبینہ طور پر اس شدید قانون کا مقصد یہ تھا کہ ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کے غیر قانونی داخلے کو روکا جائے۔یہی نہیں کہ اُس وقت ہندوستانیوں کے کسی بڑے پیمانے پر داخلے کا کوئی ثبوت نہ تھا بلکہ موجودہ قوانین بھی اس سلسلے میں کافی سخت تھے۔1905 اور 1906 کے درمیان ڈیڑھ سو افراد کے خلاف حکومت نے غیر قانونی داخلے کا الزام لگا کر مقدمے جیتے تھے۔ایک مقدمے میں ایک غریب ہندوستانی عورت کو اپنے شوہر سے الگ کر کے ایک مجسٹریٹ نے سات گھنٹے کے اندر ملک چھوڑ دینے کا حکم دیا تھا۔ ایک گیارہ برس کا بچہ گرفتار کرلیا گیا تھا اور اس کو تیس پونڈ یا تین ماہ کی سزا کا حکم سنایا گیا تھا۔

نئے قانون کا مقصد بظاہر یہی تھا کہ تعلیم یافتہ اور مالدار ہندوستانیوں کو ذلیل کیا جائے ان کے

اعتمادِ نفس کو متزلزل کیا جائے اور ٹرانسوال میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ اُن کا رہنا مشکل ہو جائے۔ گاندھی کو یہ یقین تھا کہ اگر یہ بل قانون بن گیا اور ہندوستانیوں نے اسے منظور کر لیا تو وہ بالکل برباد ہو جائیں گے۔ اُن کے خیال میں ہندوستانیوں کے لیے اس قانون کو منظور کرنے کے بجائے مرجانا زیادہ بہتر تھا۔ لیکن مرا بھی کیوں کر جائے۔ انھیں کیا کرنا چاہیے اور جرأت کا کس طرح مظاہرہ کرنا چاہیے کہ فتح اور موت میں سے کسی ایک کو اختیار کر لینے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہ جائے۔ اُن کے سامنے ایسی دیوار تھی جس میں شگاف نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کے آر پار دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

1906 کی خزاں میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا سیاسی مستقبل بالکل تاریک نظر آ رہا تھا۔ جنگ بوئر میں برطانوی فتح سے برطانوی آبادیوں کے ہندوستانیوں کی حالت میں کچھ بھی سدھار نہیں ہوا تھا۔ سابقہ بوئر ریاستوں میں تو حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے تھے۔ جنوبی افریقہ کے نئے حاکموں میں اشتراک کا ایک نیا باب شروع ہو رہا تھا، لیکن یہ اشتراک اہل برطانیہ اور اہل بوئر ریاستوں کے مابین ہی ہونے جا رہا تھا۔ ناٹال اور ٹرانسوال کی ہندوستانی برادری کے ابتدائی شہری حقوق کے حصول کی تحریک چلاتے ہوئے بارہ سال ہو چکے تھے اور گاندھی جی جب اس مدت کے بارے میں غور کرتے تو انھیں یہ احساس ہوتا کہ محبت کا سودا بے سود ہی ہے۔ جنوبی افریقہ، ہندوستان اور برطانیہ کی پبلک کو حالات سے آگاہ کرا کے ہندوستانیوں کی حالت سدھارنے کی امید گھٹتی جا رہی تھی سوائے چند یورپینوں، عیسائی مشنریوں یا نوجوان عینیت پسندوں کے گاندھی جی جنوبی افریقہ کے یورپینوں کو قابل ذکر طور پر متأثر نہیں کر سکے تھے۔ یہ افریقی یورپین ہندوستانیوں کے مسئلے کو سیاسی اخلاقیات کا مسئلہ نہیں بلکہ اسے وہ اپنے اور اپنے بال بچوں کی ''روٹی اور مکھن'' کا سوال سمجھتے تھے۔ سفید فاموں نے اپنے خون اور اپنی دولت کی بازی اس لیے لگائی تھی کہ وہ اس حصہ دنیا میں اپنا اقتدار قائم کریں اور وہ اس کا پکا ارادہ کیے ہوئے تھے کہ وہ اپنی محنتوں سے ایشیا کے اُس جمِ غفیر کو ملک میں داخلہ دے کر نہ کھانے دیں گے جو انتظار میں کھڑا ہے۔[1] اس پر ہندوستان میں بڑی ہمدردی تھی اور اس پر ہر سیاسی طبقۂ خیال میں ایسا اتحاد تھا جو شاذ نظر آتا ہے اور جس کا مظاہرہ انڈین نیشنل کانگریس کی ان تجویزوں سے ہوتا تھا جو سال بہ سال

---

(1) خودنوشت سوانح، ص:84

پاس ہوتی رہتی تھیں۔ ہندوستانی سیاست دانوں کو اپنی کوتاہیوں کا بہر حال احساس تھا۔ یہ زبانی احتجاج کتنے غیر حقیقی تھے، اِس کو سر فیروز شاہ مہتا نے گاندھی سے اُس دن کھل کر بیان کر دیا تھا جب دونوں 1901 کے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے کلکتہ جا رہے تھے۔'' لیکن ہمیں خود اپنے ملک میں کیا حقوق حاصل ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ جب تک ہمیں اپنے ملک میں اختیارات حاصل نہ ہوں گے، نو آبادیات میں بہتر سلوک کی امید رکھنا فضول ہے۔''

بعض موقعوں پر ہندوستانیوں کے حقوق کی جدوجہد کے سلسلے میں گاندھی کو انگلستان کے ذی اثر حلقوں بالخصوص ''ٹائمز'' لندن کی مدد حاصل ہوئی لیکن برطانوی دفتر نو آبادیات، جنوبی افریقہ کے سفید فاموں کو ہی خوش کرنے میں لگا رہتا تھا اور وہ ''حکومت خود اختیاری کی منطق'' ہی بگھارتا رہتا تھا۔ اس منطق کی رو سے نو آبادیوں کو سب کچھ کرنے، حتیٰ کہ سلطنت برطانیہ کی ہندوستانی رعایا کو پیسنے تک کی آزادی تھی۔

یہ بات بالکل صاف تھی کہ اہل ایشیا کی نئی رجسٹری کے قانون کی شکل میں اُن کی عزت نفس پر جو حملہ کیا گیا تھا اس کے انسداد کے لیے ہندوستانیوں کو اپنے ذرائع پر بھروسا کرنا تھا مجالس قانون ساز میں نہ اُن کا کوئی ووٹ نہ ان کی نمائندگی۔ 11 ستمبر 1906 کو ہندوستانیوں نے جانسبرگ کے امپائر تھیٹر میں ایک جلسۂ عام کیا جو فرش سے چھت تک کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔[1] ایجنڈا کا خاص رزولیوشن مسودہ گاندھی کا لکھا ہوا تھا۔ اس میں یہ کہا گیا کہ ہندوستانی برادری نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ اہل ایشیا کی رجسٹری کے مجوزہ قانون کے آگے سپر انداز نہ ہوں گے جب ایک مقرر نے خدا کی قسم کھا کر یہ کہا کہ وہ کسی شکل میں بھی اس قانون کے آگے سر نہ جھکائے گا تو گاندھی ''چونک پڑے اور چوکنے ہو گئے'' ایک سنجیدہ قسم کا اشارہ پا کر انھوں نے ''لمحے بھر میں ممکن نتائج کو سوچ لیا۔'' اور ''اُن کی ذہنی الجھن جوش وخروش میں تبدیل ہو گئی۔'' گاندھی کی نظر میں سنجیدہ قسم کی بڑی اہمیت تھی۔ جو عہد انھوں نے خود لئے تھے اُن کی زندگی تو اسی سانچے میں ڈھل ہی گئی تھی۔ یعنی انھوں نے لندن جاتے وقت جو تین عہد کیے تھے اُس کا ان پر زبردست اثر پڑا تھا۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے ملکیت اور کاہلی زندگی سے اس لیے رشتہ منقطع کر لیا تھا کہ وہ عوامی خدمت کے لیے

(1) ستیا گرہ ان ساؤتھ افریکا، ص: 161

اپنے کو ہمہ تن وقف کرسکیں۔ خدا کو حاضر و ناظر مان کر اور عواقب سے بے نیاز ہو کر ایک نا منصفانہ قانون کا مقابلہ کرنے کے عہد سے بیچ کی وہ دیوار ڈھہ گئی جو اُن کے نقطۂ نگاہ کو دھندلا رہی تھی۔ اُن کی ویسی ہی خوشی اور طمانیت ہوئی جو کسی ریاضی داں کو کوئی نا قابل حل سوال کا حل نکال کر ہوتی ہے۔ یہ حل دھوکے میں نہیں نکل آیا تھا۔ اُن کی ساری زندگی اس کی تیاریوں میں صرف ہوئی تھی۔ نجی زندگی میں بچپن ہی سے سچائی کا اصول اُن کا رہنما تھا اور ہر قیمت پر اِسے برتنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے اُن تمام معمولی بندشوں سے چھٹکارا حاصل کرلیا تھا جو انسانوں کو بزدل بنا دیتی ہیں۔ اس تاریخی موقع پر انھوں نے جس ہمت اور اعتقاد کا مظاہرہ کیا اُس کے پس پشت زندگی بھر کی تربیت تھی۔ جو ہندوستانی بھائی جانسبرگ کے امپائر تھیٹر میں جمع تھے اُن کے سامنے انھوں نے بے خوف ہو کر کہا ''میری طرح کے لوگوں کے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ جان دے دیں مگر اس قانون کے آگے نہ جھکیں۔ اس کا امکان تو نہیں ہے لیکن اگر ہر شخص پیچھے ہٹنے لگے اور مجھے میدان میں تنہا چھوڑ جائے تو بھی مجھے یقین ہے کہ میں اپنے عہد سے پیچھے نہ ہٹوں گا۔(1)

انھوں نے مجمع سے کہا کہ وہ اپنے دلوں کو ٹٹولے۔ انھوں نے متنبہ کیا کہ جو لوگ حکومت کا حکم ماننے سے گریز کریں گے اُن کے لیے جائداد ضبط کر لیے جانے، قید، فاقے، کوڑوں کی مار اور موت تک کا خطرہ ہے۔ جلسے کے خاتمے پر ''تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر، ہاتھ اٹھا کر اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر'' سنجیدگی سے یہ قسم کھائی کہ ایشیائی رجسٹری آرڈی نینس اگر قانون بن گیا تو وہ اس کو تسلیم نہیں کریں گے اور مقاومت کریں گے۔ گاندھی نے یہ نہیں بتایا کہ اس مقاومت کی شکل کیا ہوگی۔ غالباً یہ چیز خود ان کے ذہن میں بہت واضح نہیں تھی۔ یہ بات البتہ یقینی تھی کہ اس میں تشدد کو کوئی دخل نہ ہوگا۔ گاندھی کو دھندلا دھندلا احساس ہو گیا تھا کہ سیاسی اور سماجی برائیوں سے لڑنے کے لیے ایک نئے اصول کا جنم ہو چکا ہے۔ اس نئے اصول کو پہلے مقاومت مجہول، کا نام دیا گیا۔ لیکن انگلستان میں حق رائے دہندگی کے حامیوں کی جانب سے اس لفظ کی آڑ میں دشنام طرازیوں اور جسمانی تشدد کا جو مظاہرہ پہلے ہو چکا تھا اس کی وجہ سے یہ اصطلاح تشفی بخش نہیں سمجھی گئی۔ ''انڈین اوپی نین'' میں جو آگے چل کر گاندھی کی تحریک کا ترجمان بننے والا تھا، مناسب

---

(1) ستیا گرہ ان افریقا، ص:168

اصطلاح کے سلسلے میں تجویزیں مانگی گئیں۔ ''سداگرہ'' جس کے معنی ہیں اچھے عمل پر مضبوطی سے جم جانا) گاندھی کو اچھا معلوم ہوا لیکن بعد میں انھوں نے بدل کر اس کی جگہ ستیہ گرہ (سچ) پر مضبوطی سے جم جانا) کو اختیار کیا۔ لیکن اس نئی تحریک کے اصول و تکنیک کا ارتقا آنے والے ماہ و سال میں آہستہ آہستہ ہونے والا تھا۔ اس کا مصنف ایسا شخص تھا جس کے نزدیک نظریہ عمل کا خادم تھا۔

اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ اس تحریک پر خود اُن کے مخصوص ارتقا کی چھاپ 1908 میں ڈوک نے اُن سے ستیہ گرہ کی ابتداء کے بارے میں سوال کیا تھا اور ان لفظوں میں جواب درج کیا تھا:

''اصول (مقاومت مجہول) کی پیدائش اور ارتقا کو مسٹر گاندھی بذاتہٖ کئی دوسرے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مجھے یاد ہے کہ جب میں بچہ تھا تو میں نے اسکول میں گجراتی نظم کا ایک شعر پڑھا تھا۔ یہ شعر میرے ذہن میں محفوظ رہ گیا۔ اس کا لب لباب یہ تھا: اگر تمھیں کوئی شخص پانی دے اور اس کے بدلے میں تم بھی پانی دے دو تو یہ کوئی بات نہیں ہوئی حسین بات تو یہ ہوگی کہ بُرائی کے جواب میں بھی تم بھلائی کرو، بچپن میں اس شعر کا مجھ پر بے حد اثر ا ہوا تھا اور میں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اُس کے بعد پہاڑی کے وعظ کی باری آئی۔''

''میں نے کہا 'لیکن بھگوت گیتا' نے پہلے اثر ڈالا ہوگا؟''

''انھوں نے جواب دیا نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں سنسکرت زبان کی ''بھگوت گیتا'' کو اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس وقت میں نے اس خاص مسئلے پر تعلیمات گیتا کو مطالعہ کا موضوع نہیں بنایا تھا۔ مقاومت مجہول کی صحت اور قیمت کا خیال سب سے پہلے مجھے 'عہد نامہ جدید' پڑھ کر آیا۔ جب میں نے ''پہاڑی کے وعظ کو پڑھا تو ایسے حصے جیسے ''جو بُرا ہو اس سے مقاومت نہ کرو بلکہ جو تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے تم بایاں گال بھی اُس کی طرف کردو، اور اپنے دشمنوں سے محبت کرو اور جو تم پر ظلم کرتے ہیں تم اُن کے لیے دعا کرو تاکہ تمہارا آسمانی باپ تمھیں بیٹا سمجھے۔ میرے لیے انتہائی خوشی کا سبب بنے۔ میری رائے کی تصدیق ایسی جگہ ملی جہاں سے مجھے توقع بھی نہیں تھی۔ بھگوت پڑھ کر یہ تاثر اور گہرا ہوگیا اور ٹالسٹائے کی کتاب The kingdom of God is with in you (خدا کی عظمت تمھارے دل میں ہے) کے مطالعے کے بعد اس نے مستقل شکل اختیار کرلی۔''

(1) ڈوک، جوزف جے: ام۔ کے۔ گاندھی، ص88

باب 12

پہلی تحریک ستیہ گرہ

ہندوستانی برادری کی متحدہ اور پرجوش مخالفت کے باوجود ایشیائی رجسٹری بل جوں کا توں ٹرانسوال کی مجلس قانون ساز سے پاس ہوگیا۔ایک آخری امید رہ گئی تھی کہ تاج برطانیہ اختیارات خصوصی استعمال کر کے ایک ایسے قانون کو مسترد کردے گا جو اُس کی ہندوستانی رعایا سے امتیازی سلوک روا رکھتا ہے۔ دو افراد گاندھی اور اچ۔او۔علی پر مشتمل ایک وفد اس غرض سے انگلستان بھیجا گیا کہ وہاں اس بل کی نامنظوری کے لیے جدوجہد کرے۔گاندھی انگلستان میں چھ ہفتے رہے۔وہ دادا بھائی نوروجی اور پارلیمنٹ کے ہندوستان دوستوں اور پریس والوں سے ملے۔نوآبادیاتی سکریٹری لارڈ الگن ہمدرد نظر آئے مگر حیلے حوالے کرتے رہے۔لوٹتے وقت انھیں تار سے معلوم ہوا کہ بادشاہ نے سچ مچ ایشیائی رجسٹری بل کو نامنظور کردیا۔خبر اتنی اچھی تھی کہ یقین نہ آتا تھا۔اصل معاملہ صرف اتنا تھا کہ لارڈ الگن نے حکومت ٹرانسوال کی ہمدردیاں ضائع کیے بغیر، سامراجی حکومت کی بھی لاج رکھ لی تھی، انھوں نے ٹرانسوال کے نمائندوں کو لندن میں یہ بتایا کہ اگر ذمہ دار حکومت کے قیام کے بعد یہی بل ٹرانسوال کی مجلس قانون ساز سے پاس ہوجائے گا تو اِس سے شاہی منظوری دے دی جائے گی۔ ہوا یہ کہ نئے آئین کے تحت وجود میں آنے والی مجلس قانون ساز نے جو سب سے پہلا قانون پاس کیا وہ ایشیائی رجسٹری بل تھا۔ یہ بات اب بالکل واضح تھی

کہ اسے شاہی منظوری مل جائے گی۔ اعلان ہوا کہ پہلی جولائی 1907 سے یہ نیا قانون نافذ ہوجائے گا۔

ہندوستانی شنوائی حاصل کرنے میں ناکام رہ گئے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ گاندھی اس نامنصفانہ قانون کے خلاف مقاومت کا عہد پورا کریں۔ اندولن چلانے کی غرض سے انھوں نے انجمن مقاومت مجہول، قائم کی اگر چہ ستمبر 1906 کو امپائر تھیٹر کے تاریخی جلسے میں تمام ہندوستانی حاضرین جلسہ نے اس نفرت انگیز قانون کی مخالفت کرنے کا بہ قسم عہد لیا تھا، لیکن انھوں نے دوبارہ عہد لینے کو کہا تا کہ جن کے دل ڈانواڈول ہوں وہ علاحدہ ہوجائیں۔ ''انڈین اوپی نین'' جو مدتوں اُن کے جیب کا بار بنا رہا، ہندوستانی برادری کی رائے عامہ کو ہموار کرنے میں مفید ثابت ہوا۔ اس نے جنوبی افریقہ میں وہی کام کیا جو ''ینگ انڈیا'' اور ''ہریجن'' نے ہندوستان میں کیا۔ اسے صرف اُن کے ساتھی اور شرکائے کار ہی نہیں بلکہ مخالفین بھی پڑھتے تھے کیوں کہ اس میں اُن کا لائحہ عمل بے کم وکاست درج ہوتا تھا۔ اس کی ہردلعزیزی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایسے ملک میں جہاں ہندوستانی قارئین کی مجموعی تعداد میں ہزار سے زائد نہ ہوگی اور جہاں رسائل کے ایک گھر سے دوسرے گھر گشت کرنے کا بھی رواج تھا۔ اس رسالے کی اشاعت ساڑھے تین ہزار تک پہنچ گئی۔

جنرل بوتھا نے گاندھی کے ایک آزادخیال دوست ولیم ہوسکن جانسبرگ بھیجا کہ وہ وہاں جا کر ہندوستانیوں کے جلسہ عام میں شریک ہوں جس کو گاندھی خطاب کرنے والے تھے۔ جوسکن نے اعلان کیا کہ ''میں جنرل بوتھا کے کہنے پر یہاں آیا ہوں۔ اُن کے دل میں آپ کی عزت ہے اور وہ آپ کے جذبات کو سمجھتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ وہ مجبور ہیں۔ ٹرانسوال کے سبھی یورپین ایسے قانون کی مانگ کر رہے ہیں۔ ہندوستانیوں کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ٹرانسوال حکومت کتنی مضبوط ہے۔ حکومت سے مزاحمت کرنا دیوار سے سرٹکرانے کے مرادف ہے۔ مجھے خوف ہے کہ لاحاصل مخالفت کرکے آپ کی برادری تباہ ہوجائے گی یا اپنے کوخواہ مخواہ مصائب میں مبتلا کرے گی۔ جلسے کے سامنے اس تقریر کا ترجمہ کرنے کا فرض گاندھی نے انجام دیا اور حاضرین کے جذبات کی شاندار ترجمانی محمد کچھالیا نے کی۔ یہ ایک ہندوستانی تاجر تھے جنھوں نے اب تک سیاسیات میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن آگے چل کر گاندھی کی تحریک میں انھیں زبردست حصہ لینا تھا۔

کچھالیا نے کہا: ''میں نے مسٹر ہوسکن کی تقریر سنی۔ ہمیں معلوم ہے کہ ٹرانسوال حکومت کتنی مضبوط ہے۔ لیکن ایسا قانون بنانے کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں کر سکتی۔ یہ ہمیں جیلوں میں بند کر دے گی۔ ہماری جائدادیں ضبط کرے گی، ملک بدر کر دے گی۔ یا پھانسی پر چڑھا دے گی۔ ہم یہ سب خوشی خوشی برداشت کریں گے لیکن ہم اس قانون کو برداشت نہیں کریں گے۔'' اُس کے بعد اپنے گلے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں پھانسی پر چڑھ جاؤں گا لیکن اس قانون کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گا اور میری تمنا ہے کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ بھی ایسا ہی کریں۔''[1]

حکومت نے بڑے بڑے شہروں میں پرمٹ کے دفتر کھولے اور ٹرانسوال کے ہندوستانی باشندوں کو کہا گیا کہ 31/جولائی 1907 تک یا تو نام درج رجسٹر کرالیں ورنہ وہ قانونی سزاؤں کے مستحق قرار پائیں گے۔ انجمن مقاومت مجہول نے ہندوستانی برادری کو یہ ہدایت کی وہ پرمت کے دفتروں کا بائیکاٹ کریں۔ اس جاذب توجہ سرخی کے تحت پوسٹر نمودار ہوئے: ''بادشاہ سے وفاداری کا مطالبہ یہ ہے کہ بادشاہوں کے بادشاہ سے وفاداری کی جائے...... ہندوستانیو! آزاد ہو، گاندھی نے پرمٹ کے دفتروں کی پکٹنگ کا منصوبہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ مرتب کیا۔ انھوں نے رضا کار بھرتی کیے۔ اِن میں سے کچھ ابھی بیس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے۔ ان رضا کاروں کو انھوں نے پرمٹ دفتروں کے باہر متعین کیا کہ جو ہندوستانی نئے قانون کے تحت رجسٹری کرانے کے لیے جانا چاہیں انھیں اندر جانے سے روکیں۔ لیکن رضا کاروں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ جو لوگ رجسٹری کرانے پر اصرار کریں اُن سے کوئی تشدد نہ کیا جائے اور نہ اُن سے کوئی نامناسب برتاؤ کیا جائے۔ اگر پولیس انھیں گرفتار کرنا چاہے تو وہ خوشی خوشی آمادہ ہو جائیں۔ اگرچہ اس جدوجہد میں ہر طرح کا دباؤ ممنوع کر دیا گیا تھا لیکن خود رائے عامہ کا دباؤ ایسے دغابازوں کے لیے کافی تھا۔ اس طرح کی دو ایک مثالیں سامنے آئیں جن میں بعض لوگوں نے پرمٹ دفتر کے عملے سے مل کر رات کو پرمٹ بنوائے لیکن بحیثیت مجموعی بائیکاٹ بے حد موثر رہا۔ حکومت نے رجسٹری کی تاریخ بڑھا دی لیکن 30/نومبر 1907 تک کل ملا کر 511 ہندوستانیوں نے رجسٹری کا سرٹیفکٹ لیا تھا۔

اسی دوران میں ٹرانسوال کے ہندوستانیوں کو ایک اور زخم لگا۔26/دسمبر 1907 کو ٹرانسوال کی مجلس قانون ساز کے منظور کردہ آباد ہونے کے لیے آنے والوں کے خلاف بل کو شاہی منظوری مل گئی۔اس کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی جو محدود تعداد ٹرانسوال میں آجاتی تھی وہ بھی نہ آنے پائے گی۔دوسرے دن گاندھی نے جانس برگ کے ایک جلسہ میں تقریر کی۔ ''لارڈ الگن (برطانوی حکومت میں نوآبادیاتی سکریٹری) نے ہندوستانیوں کی وفاداری کو ناقابل برداشت آزمائش میں ڈال دیا ہے۔سامراجی حکومت کو تامل سے کام لینا چاہیے کہ ہندوستانی عوام محبت سے قابو میں رکھے جاسکتے ہیں بندوق کی نوک پر نہیں۔ایسی صورت میں ممکن ہے کہ انگلستان کو ہندوستان اور نوآبادیات میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑے۔'' جنرل اسمٹس ٹرانسوال کی کابینہ میں ہندوستانیوں کے معاملات کے ذمہ دار تھے۔انھوں نے ہندوستانیوں کی دھمکیوں کو حقارت سے نظرانداز کردیا۔اُن کے خیال میں اندولن'' گاندھی اور اُن کے پٹھوؤں نے کھڑا کیا تھا۔''

۲۸دسمبر 1907 کو گاندھی اور اُن کے چھبیس ممتاز ساتھی جانسبرگ کی ایک عدالت میں یہ بتانے کے لیے طلب کیے گئے کہ قانون کے ماتحت رجسٹری نہ کرانے کے جرم میں انھیں سمندر پار کیوں نہ بھیج دیا جائے۔انھیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ دن کے اندر ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ان لوگوں نے اِن احکام کی تعمیل نہ کی اور 10 جنوری 1908 کو دوبارہ حاضر ہوکر انھوں نے اقرار جرم کیا اور عواقب کا سامنا کرنے کے لیے خود کو پیش کیا۔تحریک کے بانی کی حیثیت سے گاندھی نے زیادہ سے زیادہ سزا کی استدعا کی۔اُسی عدالت میں جہاں وہ اکثر ایک وکیل کی حیثیت سے حاضر ہوا کرتے تھے، آج ایک ملزم کی صورت میں کھڑے ہوکر انھوں نے عدالت سے ایک مختصر سا بیان دینے کی اجازت چاہی مجسٹریٹ نے جواب دیا کہ'' سیاسی تقریریں نہیں ہوگی۔'' اور اس طرح اس نے آئندہ کے فیصلوں کا رُخ مقرر کردیا۔اُس نے کہا کہ'' مسٹر گاندھی کی اُن کے ہم وطنوں کے دلوں میں جو بھی عزت ہو اور اُن کی نیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، قانون منصفانہ ہو یا نامنصفانہ، عدالت کو تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ قانون کی موجودہ شکل کیا ہے اور اُسی کے حساب سے فیصلہ کرنا ہے۔''

گاندھی کو دو مہینے قید محض کی سزا ملی۔اگر حکومت نے یہ سمجھا کہ لیڈر کو جیل میں بند کر کے

عام لوگوں کی روح کو دبا سکیں گے تو یہ اُس کی زبردست غلطی تھی۔ جیل جانے کے لیے ہندوستانی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لگ گئے۔ قید ہونے کا خوف دلوں سے نکل چکا تھا۔ جیل کو لوگ ''شارہ ایڈورڈ کا ہوٹل کہنے لگے۔ جانسبرگ کا قید خانہ چھلکنے لگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جہاں کل پچاس قیدیوں کی گنجائش تھی، وہاں ایک سو پچپن مقاومت مجہول کے مجرم موجود تھے۔ وہ زمین پر سوتے تھے اور انھیں کھانا ملتا تھا جسے صرف کافر[1] ہی مزا لے کر کھا سکتے تھے۔ ان کا اعتمادِ نفس بہت بلند تھا انھوں نے جیل والوں سے کہا کہ انھیں کوئی کام کرنے کو دیا جائے لیکن چوں کہ علی العموم اُن کی سزا میں قید با مشقت کی شرط نہیں تھی اس لیے جیل والوں نے بات نہ مانی۔

ابھی گاندھی ٹھیک طرح سے جیل میں جم کر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ اُن کے دوست البرٹ کارٹ رائٹ اُن سے ملنے کے لیے آئے۔ یہ خیالات کے اعتبار سے لبرل تھے اور اِن کا اخبار ''دی ٹرانسوال لیڈر'' اکثر ہندوستانیوں کی تائید کرتا تھا۔ کارٹ رائٹ نے گاندھی سے کہا کہ وہ جنرل اسمٹس سے ملے تھے اور وہ اپنے ساتھ ایک مسودہ مصالحت کا لائے ہیں جس کی رو سے ایشیائی رجسٹری ایکٹ کو اس شرط پر واپس لیا جاسکتا تھا کہ ہندوستانی از خود اپنا نام درجِ رجسٹر کرانے پر راضی ہو جائیں۔ دو دن کے بعد گاندھی کو قیدی ہونے کے باوجود جنرل اسمٹس نے اپنے دفتر پریٹوریا میں بُلایا۔ انھوں نے ہندوستانیوں کے استقلال کی تعریف کی لیکن انھوں نے رجسٹری کے معاملے میں یورپینوں کے شدید جذبات کے پیشِ نظر کچھ کرنے سے معذوری ظاہر کی اور کارٹ رائٹ کے ذریعے سے انھوں نے جو یقین دہانی کی تھی اس کا اعادہ کیا اگر ہندوستانی از خود رجسٹری کرا لیں تو ایشیائی رجسٹری قانون کو مسترد کر دیا جائے گا۔ گاندھی نے دو ایک ترمیمیں تجویز کیں۔ جنرل اسمٹس نے انھیں منظور کر لیا۔ گاندھی نے پوچھا ''مجھے اب کہاں جانا ہے؟'' جنرل اسمٹس نے ہنس کر جواب دیا کہ ''میں قید خانے کے عمال کو ٹیلی فون کر رہا ہوں کہ وہ کل صبح دوسرے قیدیوں کو بھی چھوڑ دیں۔''

شام کے سات بج چکے تھے۔ گاندھی کے پاس پیسہ بھی نہیں تھا۔ انھوں نے جنرل اسمٹس

---

(1) یہاں خصوصی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مفہوم ہے جنوبی افریقہ کے قبائل بانٹو کا کوئی فرد یا ایشیا میں واقع کافرستان کا باشندہ

کے سکریٹری سے ریل کے کرایے کی رقم اُدھار لی۔ بڑی عجلت سے اسٹیشن پہنچے اور جانسبرگ جانے والی آخری ٹرین پکڑی۔ وہاں پہنچنے کے چند ہی گھنٹوں کے اندر انھوں نے ہندوستانی برادری کا جلسہ بلایا تاکہ انھوں نے جنرل اسمٹس سے جو غیر رسمی مصالحت کی تھی اُس پر تبادلۂ خیال کیا جائے۔ وہاں اس پر کافی تنقید کی گئی۔ کیا وہ حکومت کے ہاتھوں میں کھیل نہیں رہے تھے؟ رضا کارانہ رجسٹری کرانے سے پہلے ہی قانون مسترد کیوں نہ کر دیا گیا؟ اگر ٹرانسوال کی حکومت اپنے وعدے پر قائم نہیں رہتی تو کیا ہوگا؟ گاندھی نے وضاحت کی کہ یہ ستیاگرہی کا فرض ہے کہ وہ دشمن کی بات پر بھی اعتماد کرے۔ اگر حکومت وعدہ خلافی کرتی ہے تو ہندوستانیوں کو پھر سے مقاومت شروع کرنے کا اختیار ہوگا۔ ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد کا ایک اُجڈ پٹھان بار بار گاندھی کو ٹوکتا رہا۔ اُس نے گاندھی پر یہ بھی الزام لگایا کہ انھوں نے 15000 پونڈ کے عوض جنرل اسمٹس کے ہندوستانی برادری کو بیچ ڈالا ہے۔ ''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جو بھی رجسٹری کی درخواست دینے میں پہل کرے گا اُسے مار ڈالوں گا۔''[1] گاندھی کو پٹھان کے عائد کردہ الزامِ رشوت کو رد کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی جہاں تک خونخوار پٹھان کی دھمکی کا سوال تھا، گاندھی نے جواب دیا: ''اپنے ایک بھائی کے ہاتھوں غصے اور تلخی کے بغیر مارا جانا افسوس کی بات نہ ہوگی۔''

10 فروری 1908 کی صبح کو پبلک سے کیے گئے وعدے اور جنرل اسمٹس سے کی گئی مصالحت کی شرائط کے مطابق، پہلا رجسٹری سرٹیفکٹ لینے وہ اپنے گھر سے باہر نکلے۔ جیسے ہی وہ اپنے دفتر پہنچے جو تحریک ستیہ گرہ کا صدر مقام بھی تھا تو انھوں نے چند پٹھانوں کو گلی میں گھومتے دیکھا۔ انھیں میں میر عالم نے گاندھی کے سلام کا جواب سرسری طور پر دیا اور اُن کے پیچھے ہولیا۔ فانا پر یٹڈسن اسٹریٹ پر پہنچ کر میر عالم نے گاندھی سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ جواب دیں میر عالم اور اُس کے ساتھی گاندھی پر ٹوٹ پڑے۔ یہ مشتِ خاک ''ہے رام'' کہہ کر بے ہوش ہوگئی۔ اور اُن کے چند ساتھیوں نے وار روک نہ لیا ہوتا اور اگر کچھ یورپین راہرو حائل نہ ہو گئے ہوتے تو گاندھی وہیں مار ڈالے گئے ہوتے۔

خون تیزی سے جاری تھا اور انھیں اٹھا کر قریب کی دوکان میں لے جایا گیا۔ جب وہ ہوش

---

(1) گاندھی! ستیہ گرہ اِن ساؤتھ افریقا، ص: 251

میں آئے تو انھوں نے اپنے دوست ڈوک سے پہلا سوال یہ کیا کہ میر عالم کہاں ہے؟ ڈوک بھی موقع واردات پر پہنچ گئے تھے۔ ڈوک نے جواب دیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔ گاندھی نے کہا ''اُس کو رہا کر دینا چاہیے۔'' ڈوک نے کہا کہ ''یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن آپ یہاں ایک اجنبی کے دفتر میں ہیں اور آپ کے ہونٹوں اور گال پر پٹی بندھی ہے۔ پولیس آپ کو اسپتال لے جانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ لیکن اگر آپ میرے گھر چلیں تو میں اور مسز ڈوک مل کر حتی الوسع آپ کو آرام وسکون دینے کی کوشش کریں گے۔

گاندھی نے ڈوک کے گھر پر جانا پسند کیا۔ وہاں پہنچتے ہی انھوں نے رجسٹری کے کاغذات منگوائے اور جیسا کہ انھوں نے وعدہ کیا تھا پہلا سرٹیفکٹ حاصل کیا۔ ایشیائیوں کے رجسٹرار، مسٹر چمینی پر ''انڈین اوپی نین'' میں اکثر وبیشتر اعتراضات ہوا کرتے تھے لیکن جب وہ اُس دن گاندھی کے پاس رجسٹری کے کاغذات لائے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میر عالم اور اُن کے پٹھان ساتھیوں کے بارے میں، گاندھی قانون کی راہ نہ روک سکے لیکن اُن کو گواہ کی حیثیت سے نہیں بلایا گیا۔ دس دن تک ڈوک اور اُن کی بیوی نے بڑی محبت سے گاندھی کی تیمارداری کی، اُن کا گھر ایک کارواں سرا ہو گیا۔ سیکڑوں ہندوستانی لکھپتیوں سے لے کر غریب ترین پھیری والے اور مزدور تک، سبھی اپنے لیڈر کی خیریت دریافت کرنے آئے۔ دس دن تک ڈوک کے پاس رہنے کے بعد گاندھی جانسبرگ کے مضافات میں پولک کی قیام گاہ پر منتقل ہو گئے۔ سفر کے قابل ہوتے ہی وہ فونکس جا کر کستور بائی اور بچوں سے ملے۔ اگر اِن کے پاس ریل کا کرایہ ہوتا تو حملے کی خبر سن کر یہ لوگ جانسبرگ ہی میں گاندھی سے ملے ہوتے۔

اُن کی جان لینے کے لیے اور بھی حملے ہوئے کچھ دنوں کے بعد ڈربن کے ایک جلسے میں ایک پٹھان بڑا سا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر اُن کی طرف لپکا اور روشنیاں گل ہو گئیں سپرنٹنڈنٹ پولیس، الگزینڈر نے ہندوستانی لیڈر کی حفاظت کے لیے ایک پولیس پارٹی ساتھ کر دی۔ گیارہ سال پہلے اُنھیں نے گاندھی کو یورپینوں کے غصے کی زد سے بچایا تھا اور آج ہندوستانیوں کے تشدد سے بچا رہے تھے۔

گاندھی نے اسمٹس سے جو معاہدہ کیا تھا اُس سلسلے میں اپنے حصے کا کام کرنے کے لیے

انھوں نے جان تک کی بازی لگا رکھی تھی لیکن بوئر حکومت ایسی بے شرمی سے اپنے وعدے سے مکر گئی کہ گاندھی اور ایماندار مصالحت کرانے والے البرٹ کارٹ رائٹ ہکے بکے رہ گئے۔ ٹرانسوال حکومت نے ایشیائی رجسٹری قانون کو مسترد نہیں کیا بلکہ اُس نے رضا کارانہ رجسٹری کو ضابطے کے اندر لانے کے لیے ایک نیا قانون پاس کیا۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ آئندہ بھی جو تارکین وطن اِس ملک میں آئیں گے اُن کو بھی اس کالے قانون کی پابندی لازمی ہوگی۔ گاندھی نے ''انڈین اوپی نین'' میں ''دھوکا بازی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اُن کے دوست اُن کو سادہ لوحی کا طعنہ دیتے۔ انھوں نے اسمٹس کو خط لکھا اور البرٹ کارٹ رائٹ اور جنرل کی بات چیت یاد دلائی۔ لیکن بدقسمتی سے جنرل کی یادداشت، گاندھی کی یادداشت سے ہم آہنگ نہ نکلی۔

باب13

دوسرا دور

معلوم ہورہا تھا کہ ہندوستانیوں کے چھکے بالکل ہی چھوٹ چکے ہیں۔ انھوں نے خود سے ''کتے کا پٹا پہن لیا تھا اور جس قانون کے خلاف وہ جنگ کر رہے تھے وہ کتاب قوانین پر بدستور موجود تھا۔ حکومت نے ہندوستانیوں کی اصلی درخواستیں جو انھوں نے رجسٹری کے لیے رضا کارانہ دی تھیں واپس دینے سے انکار کر دیا۔ گاندھی نے اعلان کیا کہ ہندوستانی رجسٹری کے سرٹیفکٹوں کو جلا دیں گے اور پھر جو عواقب ہوں گے وہ بصد انکسار قبول کریں گے۔

1907 کی خزاں میں تحریک پہلے پہل شروع ہوئی تھی تو اس کا پلان خود بخود بنتا چلا گیا تھا۔ اب انھیں اپنے لوگوں کے مزاج کا اندازہ بھی زیادہ ہو گیا تھا اور جونئی تکنیک انھوں نے اختیار کی تھی۔ اُس پر بھی انھیں زیادہ قابو حاصل ہو چکا تھا۔ اس لیے گاندھی نے تحریک ستیہ گرہ کا دوسرا دور شروع کیا۔ ایک بہت بڑا الاؤ جلایا گیا جس میں ٹرانسوال کے بہت سے ہندوستانیوں نے اپنے رجسٹری کے سرٹیفکٹ نذرِ آتش کر دیئے۔ ڈیلی نیل کے نامہ نگار مقیم جانسبرگ نے اس واقعے کا مقابلہ ''بوسٹن کی چائے پارٹی'' سے کیا تھا۔ ٹرانسوال کے ہندوستانیوں کی یہ جدوجہد اتنی تاریخی نہ رہی ہو جتنی امریکہ کی جنگ آزادی تھی لیکن سرٹیفکٹوں کا جلایا جانا یقیناً نافرمانی کا ایک بہادرانہ اقدام تھا۔ ممکن ہے کہ جنرل اسمٹس گاندھی کی ہزیمت پر دل ہی دل میں خوش ہوئے ہوں

لیکن اُن کو آخر تک ہنسنے کا موقع یقیناً نہیں ملا۔ مظاہرے کا سب سے اہم واقعہ یہ تھا کہ میر عالم بھی جواب جیل سے چھوٹ کر آ چکا تھا، وہاں موجود تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر گاندھی سے ہاتھ ملایا اور گاندھی نے اُسے یقین دلایا کہ اُن کے دل میں حملہ آوروں کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں تھی۔

اس درمیان میں ٹرانسوال کی مجلس قانون ساز نے ایک اور قانون ایسا پاس کر دیا تھا جس کی رو سے کسی اور تارک وطن کا ہندوستان سے آنا ناممکن تھا۔ گاندھی نے حکومت کو لکھا کہ ستیہ گرہ کی تحریک نئے قانون کے خلاف بھی چلے گی۔ جنرل اسمٹس نے گاندھی پر الزام لگایا کہ وہ نئے سوالات اٹھا رہے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانیوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اُن کا نمائندہ ایسا شخص ہے کہ اُسے انچ بھر جگہ دی جاتی ہے تو ہاتھ بھر جگہ مانگنے لگتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ گاندھی لگاتار اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اپنی تحریک کے دائرۂ کار اور وسعت کو محدود رکھا جائے اور اور بڑی مشکل سے جنوبی افریقہ کی دوسری نو آبادیوں کے ہندوستانی آباد کاروں کو ہمدردانہ تحریک چلانے سے باز رکھا تھا۔

ہندوستانی قید خانے بھرنے کو تیار تھے۔ اگست 1908 میں ناٹال کے چند ممتاز ہندوستانی باشندوں نے جنھیں ٹرانسوال میں مستقل سکونت کے پرانے حقوق حاصل تھے۔ ٹرانسوال میں بسنے کے خیال سے نہیں بلکہ رجسٹری قانون کی خلاف ورزی کرنے کی نیت سے سرحد کو پار کیا۔ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ٹرانسوال میں شاہ ایڈورڈ ہوٹل (گاندھی نے جیلوں کو یہ نام دیا تھا) جانے کا آسان ترین پاسپورٹ لائسنس کے بغیر پھیری لگانا تھا۔ جن پھیری والوں کے پاس لائسنس ہوتا تھا۔ اُن سے بھی جب لائسنس مانگے جاتے تو وہ نہ دکھاتے اور سیدھے جیل کی راہ لیتے۔ ان کی پیروی مالدار ہندوستانی تاجروں اور بیرسٹروں نے بھی کی جو راتوں رات پھیری والے بن گئے اور لائسنس کے بغیر ترکاریاں بیچنے لگے اور قید خانے چلے گئے۔ پہلی ستیہ گرہ کے برعکس اب کے دی جانے والی سزائیں مختلف تھیں۔ اس بار قید بامشقت کی سزائیں ملیں۔ ہندوستانی قیدیوں پر جیل میں سختیاں بھی کی گئی۔ بالکل ہی نوعمر بچوں کو پتھر توڑنے سڑکوں پر جھاڑو لگانے اور تالاب کھودنے کا کام دیا گیا۔ اِن میں سے ایک اٹھارہ سالہ نوجوان کو جس کا نام ناگپا تھا کڑکڑاتے جاڑے کی ایک صبح کو کام پر لے گئے اور وہ نمونیہ سے مر گیا۔

گاندھی ٹرانسوال کے ایک قید خانے میں اکتوبر میں وارد ہوئے۔ وہاں انھیں بھی اسی طرح کی سختی کا سامنا کرنا پڑا پہلی رات انھیں بعض کافروں کی صحبت میں رکھا گیا۔ یہ کافر صورت سے خوفناک، خونخوار بدکار اور غیر مہذب معلوم ہوتے تھے۔ گاندھی نے گیتا کے اشلوک پڑھ پڑھ کر اپنی دلجمعی برقرار رکھی۔ انھوں نے جیل کی جتنی سزائیں بھگتیں اُن میں یہ سب سے سخت نکلی۔ صبح سویرے یہ قیدیوں کے ایک گروہ کے ساتھ ہاتھ میں پھاوڑا لے کر سخت زمین کی کھودائی کرتے تھے اور ایک بے رحم اورسیر اُن کی نگرانی کرتا تھا۔ جیسے جیسے دن ڈھلتا جاتا، یہ پیٹھ جھکائے اور چھالے بھرے ہاتھوں سے اپنے ساتھیوں کا دل بڑھاتے نظر آتے۔ ان میں کئی ایک ایسے تھے جو اتنی تکلیف کے باعث ہمت تقریباً چھوڑ چکے تھے۔ شامیں اور اتوار کا دن وہ گیتا اور دستیاب رسلن اور تھوریو وغیرہ کی کتابوں کے مطالعے میں گزارتے جیل کے پر مشقت لیل ونہار، اس فلسفۂ زندگی سے ہم آہنگ تھے جس کی وہ تشکیل کر رہے تھے، یعنی عام آسایشوں کا ترک اور نفس کا خدمت خلق کی شکل میں ارتفاع۔ اُن کی شخصیت کا ارتقا ہوتا رہا اور اُن میں وہ فولادی قوت آتی گئی جو آگے چل کر ایک زبردست طاقت بن جانے والی تھی۔ مسز پولک کا بیان ہے کہ ''ہر بار جب باہر آتے تو یہ محسوس ہوتا کہ جیل کے قیام میں اُن کے اندر ایک ناقابل تشریح نشو ونما ہو گئی ہے۔''[1]

قید و بند ہندوستانیوں کی ہمت توڑنے میں ناکام رہے اور اتنے لوگوں کو جیل میں رکھنے سے اخراجات بڑھ جاتے تھے۔ اس لیے حکومت ٹرانسوال نے ایک سستی مگر زیادہ بے رحمانہ ترکیب نکالی۔ ایشیائی رجسٹری قانون میں جو سزائیں تجویز کی گئی تھیں اُن میں جلاوطنی بھی تھی۔ اب تک اُس کا یہ مفہوم لیا جاتا تھا کہ ناٹال یا آرینج فری اسٹیٹ کی پڑوسی ریاستوں میں زبردستی بھیج دیا جائے۔ اب اس سزا کی پاداش میں ہندوستان واپس بھیجا جانے لگا۔ ایسی انسانیت دشمن پالیسی صرف اندھی نسلی نفرت ہی اختیار کر سکتی تھی۔ ان غریب، بے سہارا ہندوستانی مزدوروں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ جنوبی افریقہ میں گزارا تھا ان میں اس کی بالکل سکت نہیں تھی کہ وہ ہندوستان جا کر اپنے کو ازسرنو آباد کر سکیں۔ گاندھی نے 25 اپریل 1910 کو گوکھلے کو جو خط[2] لکھا تھا اس میں

---

(1) پولک، ام! مسٹر گاندھی، دی مین، ص: 94

(2) تیندولکر: مہاتما، ج: 1، ص: 140

اس آبادکاری کے انسانی پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی گئی تھی۔ ’’میں جلاوطن کیے جانے والوں کی بہادر بیویوں، بہنوں اور ماؤں سے برابر ملتا رہا ہوں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ جلاوطنوں کے ہمراہ ہندوستان واپس جانا چاہیں گی۔ وہ غصے میں کہتیں ’’ہم کیسے جا سکتے ہیں؟ جب ہم یہاں لائے گئے۔تو ہم بچے تھے۔اب ہم ہندوستان میں کسی کو نہیں جانتے۔ہم ہندوستان جانے کے مقابلے میں یہیں مرجانا گوارا کرلیں گے کیوں کہ ہندوستان ہمارے لیے اب پردیس بن چکا ہے۔‘‘ یہ طرز فکر کتنا ہی افسوسناک کیوں نہ ہو، واقعہ یہ ہے کہ اِن مردوں اور عورتوں کی جڑیں اگر کہیں ہیں تو جنوبی افریقہ کی سرزمین ہی پر ہیں۔‘‘

ان بدنصیبوں کی مشکلات کم کرنے کی جو تھوڑی بہت کوشش گاندھی کرسکتے تھے وہ انھوں نے کی۔ انھوں نے اپنے بعض ساتھیوں کو اُن کے ساتھ بھیجا۔ انھوں نے ’انڈین ریویو‘ والے دوست نیٹسن کو لکھا کہ اِن وطن لوٹائے جانے والوں کی مدد کریں جن کی اکثریت مدراس کے تملوں پر مشتمل تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اس مسئلے کو سپریم کورٹ تک لے گئے۔ جس نے ہندوستانیوں کو جلاوطن کیا جانا خلافِ قانون قرار دیا۔اب ہندوستانیوں کی تحریک پر حملہ کرنے کا ایک اور انوکھا طریقہ ایجاد کیا گیا۔بعض ممتاز ہندوستانی تاجروں کو جو گاندھی کی تحریک میں پیش پیش تھے۔اپنی روزی اور آزادی دونوں سے محروم ہوجانے کا اندیشہ درپیش ہوگیا۔محمد کچھالیا ایک مالدار تاجر تھے۔اُن کو گاندھی کی تحریک میں حصہ لینے کی یہ سزا ملی کہ اُن کے یورپین قرض خواہوں نے ایک ساتھ مل کر اور بیک وقت وصولی کا مطالبہ کرکے انھیں دیوالیہ کردیا۔

مقدمہ بازی، جلاوطنی اور اقتصادی دباؤ، ہر حربہ ستیہ گرہ تحریک کو توڑنے میں ناکام رہا۔ پھر بھی یہ تحریک ہمیشہ یکساں زور شور سے نہیں چل سکتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس میں اتار کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ ہندوستانی برادری کے دلوں میں اس جنگ سے تھکن کا احساس پیدا ہونے لگا۔ مالدار طبقہ اس سے خاص طور پر متاثر تھا۔ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ہندوستانیوں نے لڑائی ترک تو نہیں کی تھی لیکن وہ کوئی حیرت انگیز تاثر تھا۔ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ ہندوستانیوں نے لڑائی ترک تو نہیں کی تھی لیکن وہ کوئی حیرت انگیز تاثر پیدا نہیں کر پا رہے تھے۔

اسی دوران 1909 میں گاندھی نے انگلستان کا سفر کیا۔ وہاں جنوبی افریقہ کی تمام یورپی

ریاستوں کے اتحاد پر بات چیت چل رہی تھی۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ نیا بوئر۔ برٹش اشتراک جس کی تشکیل ہونے والی ہے۔ اُس میں ہندوستانیوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ شاید ہی کوئی ایسا سیاست داں یا صحافی ہوگا جو ہندوستان کے معاملات سے دل چسپی رکھتا ہوا اور اُس سے اس سفر کے دوران گاندھی نہ ملے ہوں۔ وہ ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ، لارڈ مورے، نوآبادیات کے سکریٹری آف اسٹیٹ، لارڈ کریو اور لارڈ ایمپٹ ربل نوجوانوں لارڈ ہونے کے باوجود ہندوستانیوں کے مطالبات کے موید تھے، ان سب سے ملے۔ یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ جنوبی افریقہ کے سیاست داں ہندوستان کے ساتھ کوئی تعدیہ رعایت کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اور برطانوی حکومت کو خود مختار نوآبادیات کے مسائل میں، ہندوستانیوں کی خاطر، مداخلت کرنے میں پس وپیش تھا۔ گاندھی نے اقرار کیا کہ اس مشن کے خاتمے پر اُن کو ''تھکن اور اکتاہٹ'' کا احساس تھا یہ مشن بے ثمر اور بے نتیجہ رہا۔

انگلستان کے اس بے نتیجہ سفر کے بعد گاندھی کو یہ صاف نظر آنے لگا کہ ہندوستانیوں کے حقوق کی جنگ طویل ہوگی۔ ٹرانسوال حکومت کے ظلم وتعدی کا اثر وہاں کی مختصر سی ہندوستانی برادری پر پڑنے لگا تھا۔ بہت سے تاجروں کو بھاری نقصانات ہوئے تھے اور وہ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ پھر بھی ستیہ گرہیوں کا ایک مختصر سا گروہ اپنے کو قید کے لیے پیش کرتا رہا۔ ان ستیہ گرہیوں کے خاندانوں کو ستیہ گرہ اسوسی ایشن کی جانب سے آزوقہ الاؤنس ملتا رہتا تھا، لیکن اب اسوسی ایشن کے فنڈ ختم ہو رہے تھے۔ 1906 سے گاندھی کی سیاسی مشغولیتوں کی وجہ سے اُن کی پریکٹس ٹھپ ہو کر رہ گئی تھی اور ان کی ساری بچت اِس تحریک کی نذر ہو چکی تھی۔ مشکل میں مبتلا خاندانوں کی امداد ہی کے لیے روپے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ جانسبرگ اور لندن میں تحریک کے دفاتر چلانے اور انڈین اوپی نین، کو زندہ رکھنے کے لیے روپے درکار تھے۔ اس آہستہ آہستہ نا کارہ کرنے کی لڑائی میں دیر کرنے سے حکومت ٹرانسوال ہی کا فائدہ تھا کیوں کہ مقابلہ کرنے والوں کے لیے یہ خطرہ تھا کہ انھیں فاقہ کرا کرا کے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ ہندوستانی صنعت کار، سررتن ٹاٹا کی طرف سے پچیس ہزار روپیوں کا عطیہ ٹھیک وقت پر پہنچا۔ اس کے بعد انڈین نیشنل کانگریس، آل انڈیا مسلم لیگ۔ اور نظام حیدرآباد کی جانب سے بھی عطیات آئے۔ لیکن یہ

داد دہش بھی غیر معین مدت تک کام نہیں آسکتی تھی۔ گاندھی نے محسوس کیا کہ اگر تحریک کو جاری رکھنا ہے تو اخراجات کم ہی کرنا پڑیں گے۔ انھوں نے طے کیا کہ سب سے سستا طریقہ یہ ہوگا کہ ستیہ گرہی قیدیوں کے خاندانوں کو ایک امداد باہمی فارم پر رکھا جائے۔ 1904 میں انھوں نے ڈربن میں جس فونکس نو آبادی کی بنیاد رکھی تھی فطری طور سے اُسی پر نظر پڑی۔ لیکن اِسے اس لیے نظر انداز کرنا پڑا کہ یہ جانسبرگ سے بہت دور تھا۔ ٹرین سے تیس گھنٹے کا راستہ تھا۔

ایک جرمن ماہر تعمیرات، کیلن باخ، جو گاندھی کے ساتھ ہولیا تھا، آڑے آیا، اُس نے جانسبرگ سے اکیس میل کے فاصلے پر 1100 ایکڑ کا ایک فارم خریدا اور کرایے کے بغیر، ستیہ گرہیوں کے استعمال کے لیے دے دیا۔ اس جائداد میں، جس کا نام ''ٹالسٹائے فارم'' رکھا گیا، ہزاروں پھل دار درخت اور ایک چھوٹا سا مکان تھا، جو کچھ سامان اور جتنے مزدور مقامی طور پر مل سکتے تھے انہیں کو لے کر گاندھی اور کیلن باخ نے ایک پوری نو آبادی کے لیے ٹین کی عمارتیں کھڑی کر دیں۔ ٹالسٹائے فارم کے رہنے والوں کی تعداد پچاس اور پچھتر کے درمیان تھی۔ یہ لوگ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے تھے اور اُن میں ہندو، مسلم، پارسی اور عیسائی سب شامل تھے۔ مشترکہ سبزی خوروں کے باورچی خانے سے اِن کو کھانا ملتا تھا اور یہ لوگ تنگی اور محنت کی زندگی گزارتے تھے۔ دراصل جیل کی زندگی سے یہ زندگی زیادہ سخت تھی ہر رہنے والے کو 'جس میں بچے بھی شامل تھے' اپنے حصے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ نو آبادی خود کفیل رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی ورک شاپ میں، جو کیلن باخ کی ماہرانہ نگرانی میں چلتی تھی، کچھ متفرق چیزیں بنتی تھیں۔ کیلن باخ نے ایک خانقاہ کے قیام کے دوران جرمن راہبوں سے جوتا بنانا سیکھا تھا۔ انھوں نے گاندھی سمیت سبھی باشندوں کو جوتا بنانا سکھا دیا۔ گاندھی لکھتے ہیں ''ہم سب مزدور بن گئے تھے اور اس لیے یورپی روش کے مزدوروں کا لباس یعنی مزدوروں کا پاجامہ اور قمیص پہن لیا تھا۔ اور یہ قیدیوں کی وردی کی نقل تھی[1]' جو لوگ اپنے کسی ذاتی کام سے شہر جاتے اُنھیں جانسبرگ سے آنے جانے میں بیالیس میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ اگر چہ گاندھی کی عمر چالیس سے اوپر ہو چکی تھی اور وہ بھی صرف پھلوں پر گزارا کرتے تھے لیکن انھیں ایک دن میں چالیس میل پیدل چلنے میں کوئی خاص تکلیف

(1) ستیہ گرہ ان ساؤتھ افریکا، ص:375

نہیں ہوتی تھی اور ایک بار تو کچھ تکلیف محسوس کیے بغیر پچپن میل تک چلے گئے تھے۔

ٹالسٹاے فارم کے لڑکے بہت خوشی خوشی گڑھے کھودتے تھے، پیڑوں کو کاٹ کر گراتے تھے، بوجھ اٹھاتے تھے، بڑھئی کا کام اور جوتے بنانے کا کام سیکھتے تھے۔ بحیثیت ایک معلم، گاندھی اپنے فرائض کا بہت اعلیٰ تصور رکھتے تھے۔ ''اگر میں خود جھوٹ بولوں اور لڑکوں سے کہتا رہوں کہ سچ بولا کرو تو یہ ایک بیکار سی بات ہوگی۔ ایک بزدل استاد اپنے لڑکوں کو بہادر بنانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا...... اِسی لیے میں نے محسوس کیا کہ مجھے اُن لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے جو میرے ساتھ رہتے ہیں، مستقل طور پر ایک مثالی سبق خود بن جانا چاہیے۔ اس طرح ایک معنی میں وہ میرے استاد بن گئے اور میں ان سے سیکھتا تھا کہ مجھے نیک ہونا چاہیے، صحیح قسم کی زندگی بسر کرنا چاہیے، اور یہ سب مجھے خواہ اُن کی خاطر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔''

ٹالسٹاے فارم پر گاندھی نے ضبط نفس اور زندگی میں نظم وانضباط کی روز افزوں تربیت حاصل کرلی، اُن کے خیال میں یہ ایک معلم کی حیثیت سے کام کرنے کا نتیجہ تھا اور جس نے اُن کے احساس ذمہ داری کو بڑھا دیا تھا۔ گاندھی کی نشوونما میں ٹالسٹائے فارم ایک دوسرا سنگ میل ثابت ہوا۔ ستیہ گرہ کی جدوجہد میں یہ فارم نمایاں طور پر مددگار ثابت ہوا۔ یہ ستیہ گرہی قیدیوں کے خاندان والوں کے لیے ایک پناہ گھر ہی نہیں تھا بلکہ یہاں وہ منظر دیکھنے کو ملتا تھا کہ مٹھی بھر محبِّ وطن وہندوستانی لوگ حکومت ٹرانسوال کی منظّم طاقت کے آگے سر جھکا دینے کے بجائے غربت اور عسرت کی زندگی کیسے خوشی خوشی بسر کر رہے ہیں۔ اور جب گاندھی نے اپنی ستیہ گرہی جدوجہد کا آخری دور شروع کیا تو یہی لوگ بقیہ ہندوستانی جماعت کے لیے ایک اثر انگیز مثال بن گئے۔ اور اُن مردوں، عورتوں اور بچوں کو جو ٹالسٹائے فارم پر سخت تربیت حاصل کر چکے تھے جہاں سے خوف کھانے کا کوئی سوال ہی نہ رہا۔

ستیہ گرہی جدوجہد چار سال تک قائم رہی۔ ہندوستانی جیلوں میں جاتے رہے اور باہر آتے رہے۔ اگرچہ اس ہندوستانی جماعت کے کمزور اور مالدار افراد جدوجہد کا جوش وخروش قائم نہ رکھ سکے۔ پھر بھی گاندھی کی قیادت میں اس ہندوستانی اقلیت کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ اِدھر ہندوستان کی رائے عامہ میں بھی اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ گوکھلے نے قانون ساز کونسل میں کوشش

کر کے ایک تجویز منظور کرالی کہ جنوبی افریقہ کے لیے ہندوستان سے معاہدہ بند مزدوروں کی برآمد بند کر دی جائے۔ چوں کہ جارج پنجم کی تاج پوشی کا زمانہ قریب آ رہا تھا شاہی حکومت بھی فکر مند ہوگئی کہ کسی طرح بھڑکتے ہوئے شعلوں پر پانی کے چھینٹے ڈال دیے جائیں اور ہندوستان کی رائے عامہ کو ہموار کر لیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فروری 1911ء میں جنوبی افریقہ کی حکومت نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ نسلی امتیاز ختم کر دے گی اور ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کے داخلے پر ایشیائی ہونے کے باعث پابندی نہیں لگائی جائے گی، البتہ اُن کی تعلیم کا ایک سخت امتحان لینے کے بعد ہی داخلہ ہو سکے گا۔

27رمئی 1911 کو ''انڈین اوپی نین'' نے اعلان شائع کیا کہ حکومت سے ایک عارضی صلح نامہ ہو گیا ہے جس کی رو سے ہندوستانیوں اور چینی لوگوں کو اپنے اپنے کاروبار کو از سر نو شروع کرنے کی آزادی مل گئی ہے۔ پہلی جون کو ستیہ گرہی قیدی رہا کر دیے گئے۔ بادل چھٹ گئے اور فضا میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ 5رجون کو جانسبرگ میں پریٹوریا کی اور مقامی مقاومت مجہول والی ٹیموں کے درمیان ایک فٹ بال میچ کھیلا گیا۔

یہ صلح 1912 کے اختتام تک برقرار رہی۔ ہندوستانی جماعت تخت برطانیہ سے وفاداری کا اظہار کرتی رہی لیکن اس نے جنوبی افریقہ میں تاج پوشی کے سلسلے میں منائے جانے والے سرکاری جشن میں حصہ نہیں لیا۔ گاندھی نے اس موقف کی تشریح انڈین اوپی نین میں اس طرح کی: ''ایک اجنبی کو یہ بات بے تکی معلوم ہو سکتی ہے کہ جنوبی افریقہ میں برطانوی ہندوستانی اس سر پر حکومت سے کیوں اپنی وفاداری کریں اور اس کے بادشاہ کی تاج پوشی کے وقت کیوں کر خوشیاں منائیں جس کی مملکت میں انھیں مہذب انسانوں کے معمولی شہری حقوق بھی حاصل نہیں ہیں۔ شاہان برطانیہ اصولاً عدلیہ کی مساوات اور پاکیزگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ برطانوی سیاستداں بھی صمیم قلب سے اعلا اصولوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس میں وہ اکثر بُری طرح ناکام رہتے ہیں، یہ بھی بالکل واضح اور صحیح ہے۔ لیکن یہ بات اُس مسئلے سے غیر متعلق ہے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

1912 کا سب سے اہم واقعہ گوکھلے کا ورود تھا۔ پندرہ سال سے گوکھلے نے گاندھی سے

رابطہ قائم کر رکھا تھا اور اُن کی بڑی مدد کلکتہ کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل (شاہی مجلس قانون ساز) کے اندر اور باہر رہ کر کی تھی۔ اُن کا جنوبی افریقہ کا یہ سفر حکومت برطانیہ کی منظوری سے کیا گیا تھا۔ وہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے آئے، ریلوں کے سفر میں انھیں سیلون دیا گیا۔ گاندھی نے اُن کا خیر مقدم کیپ ٹاؤن میں کیا اور اُن کے پورے ایک ماہ کے سفر کے دوران اُن کے سکریٹری۔ اور خاص خدمت گار کی طرح کام کیا۔ گوکھلے کے لیے ہر ریلوے اسٹیشن پر روشنیاں کی گئیں اور سرخ فرش ان کے لیے بچھائے گئے۔ ہندوستانی لوگوں نے سپاسنامے اور تحفے پیش کیے اور ہر جگہ اُن کا استقبال شاہانہ طور پر کیا۔ یونین (حکومت جنوبی افریقہ) کی راجدھانی پریٹوریا میں وہاں کے سرکاری وزراء سے ملنے کے بعد انھوں نے گاندھی سے کہا: ''تم کو ایک سال کے اندر ہندوستان ضرور واپس چلا جانا چاہیے۔ ہر بات طے ہوگئی ہے۔ سیاہ قانون، واپس لے لیا جائے گا۔ ترک وطن کرنے والے قانون سے نسلی امتیاز کی روک ٹوک ہٹا دی جائے گی۔ تین پونڈ والا ٹیکس ختم کر دیا جائے گا۔'' گاندھی نے جواب دیا: ''مجھے اس میں بہت شک ہے۔ اِن وزیروں کو جتنا میں جانتا ہوں آپ نہیں جانتے۔''

جیسے ہی گوکھلے جنوبی افریقہ سے واپس ہوئے، یہ واضح ہوگیا کہ اُن کو دھوکا دیا گیا تھا۔ جنرل اسمٹس نے جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ کو بتایا کہ ناٹال میں رہنے والے یوروپی باشندوں کے احساسات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ممکن نہ ہو سکے گا کہ سابق معاہدہ بند مزدوروں اور اُن کے گھر والوں کے لیے تین پونڈ کا ٹیکس ختم کر دیا جائے۔

اس دوسری وعدہ خلافی نے ستیہ گرہ تحریک کو ایک نئی زندگی بخش دی۔ اب تک گاندھی ستیہ گرہ کے دائرۂ کار کو وسیع کرنے کے تمام مشورے رد کرتے رہے تھے اور اُسے صرف بنیادی شکایات تک محدود رکھا تھا جو ترک وطن کر کے وہاں آنے والوں اور اُن کے رجسٹریشن سے متعلق تھیں۔ اب چوں کہ جنوبی افریقہ کی حکومت نے اُس معاہدے کی خلاف ورزی کی جو اس نے گوکھلے سے کیا تھا، تو تین پونڈ والی شکایت کو بھی جائز طور پر تحریک کا ایک جزو بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ معاہدہ بند مزدوروں کی شمولیت سے بھی اس تحریک میں بڑی قوت آ گئی تھی اگرچہ اس ناخواندہ بڑے مجمع کو، جس کا سیاسی میدان میں کوئی تجربہ نہ تھا، قابو میں رکھنا بلاشبہ خطرات سے خالی

نہ تھا لیکن گاندھی نے اپنے ناٹال میں قیام کے دوران ان معاہدہ بند مزدوروں کے ساتھ بڑی ہمدردی کی تھی اس لیے گاندھی ان لوگوں میں بہت مقبول ہی نہ تھے، اُن کے مسائل اور مزاج سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔

گاندھی، حکومت کے خلاف زور شور سے مدافعت کا منصوبہ بنا ہی رہے تھے کہ ہندوستانیوں پر ایک دوسرا بم گرا۔ وہاں کی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) کے ایک فیصلے نے اُن تمام شادیوں کو بہ یک جنبش قلم کالعدم قرار دے دیا، جو عیسائی رسم کے مطابق نہیں ہوئی تھیں اور جن کی رجسٹری شادیوں کے رجسٹرار کے دفتر میں نہیں ہوئی تھی۔ بہ الفاظ دیگر، تمام ہندو، مسلم اور پارسیوں کی شادیاں غیر قانونی اور اُن کی اولادیں حرامی قرار پائیں۔ گاندھی نے حکومت سے درخواست کی کہ وہ یا تو اس عجیب وغریب قانونی تشریح کو ماننے سے انکار کردے یا اس قانون میں ترمیم کرے لیکن گاندھی کو کامیابی نہیں ہوئی۔

یونین حکومت کی گوکھلے کے ساتھ وعدہ خلافی کی طرح ہندوستانیوں کی خودداری کی یہ سخت اہانت بھی گاندھی کی اس حکمت عملی کے لیے مناسب ٹھہری جو وہ جنوبی افریقہ میں اپنی آخری مہم میں اختیار کرنے جا رہے تھے۔ ابھی تک عورتوں کو ستیہ گرہی جدوجہد سے دور رکھا گیا تھا لیکن اب تو اُن کی عزت پر حرف آ رہا تھا، اس لیے مردوں کے ساتھ ساتھ اُن کی عورتوں کو بھی عدم تشدد کی جنگ میں شرکت کرنے کے لیے بلایا گیا۔

باب 14

آخری مرحلہ

گاندھی پر یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی تھی کہ حکومت اپنی چال بازیوں سے معاملات کو یہاں تک گھسٹنا چاہتی ہے کہ ہندوستانی تھک ہار کر بیٹھ رہیں۔ انڈین اوپی نین کی اشاعت مورخہ 13رستمبر 1913 میں گفت وشنید کی ناکامی کا اعلان ہوا۔ ایسی صلح جو صلح کی روح سے عاری ہو صلح ہی نہیں ہے...... لیس پوت کی صلح سے کھلم کھلا لڑائی کہیں بہتر ہے۔ اس بار جنوبی افریقہ کی حکومت اور یورپین آبادی کی روح کو بدلنے کے لیے لڑنا ہوگا۔ ایک طویل مدت تک سخت شدائد برداشت کرنے ہی سے نتائج نکلیں گے۔ اوراسی طرح حکومت اور اُس کے شریک غالب کے دل پگھلیں گے۔''

گاندھی نے آخری بار اندولن چلانے اور اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دینے کا فیصلہ کیا۔ گوکھلے نے ہندوستان سے خط لکھ کر پوچھا تھا کہ اُس ''فوج صلح'' کی تعداد کیا ہے جو اندولن۔ چلانے والی ہے۔'' گاندھی نے لکھا کہ میں کم از کم سولہ اور زیادہ سے زیادہ چھیاسٹھ ستیہ گرہوں پر بھروسہ کرسکتا ہوں۔ گوکھلے جیسا تجربہ کار سیاستداں یہ اعداد وشمار سن کر بہت محظوظ اور متعجب ہوا۔ مٹھی بھر افراد کے سامنے ٹرانسوال حکومت کیوں کر گھٹنے ٹیک سکتی ہے؟ لیکن گوکھلے کو گاندھی کی حکمت عملی کا پہلے سے تصور بھی نہیں تھا۔ اس تحریک کی تہیں دھیرے دھیرے کھلنے والی تھیں اور آگے چل کر ہزاروں ہندوستانی اس تحریک میں کھنچ کر آ جانے والے تھے۔

گاندھی کا پہلا قدم یہ تھا کہ سولہہ افراد کا ایک جتھا ناٹال میں واقع فونکس کی نو آبادی سے ٹرانسوال بھیجا جائے اس جتھے میں مسز گاندھی بھی شامل تھیں۔ پرمٹ کے بغیر ٹرانسوال میں داخل ہونے کے جرم میں 3 رستمبر کو اِن کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا کچھ دنوں بعد گیارہ عورتوں کا ایک جتھا ٹرانسوال کے ٹالسٹائے فارم سے ناٹال میں پرمٹ کے بغیر داخل ہوا اور نیوکیسل کی طرف چل پڑا۔ گرفتار ہونے سے پہلے انھوں نے ہندوستانی کان مزدوروں کو ہڑتال کر دینے پر آمادہ کر لیا۔

کوئلے کی کانوں میں ہڑتال بہت ہی اہم بات تھی۔ گاندھی نے نیوکیسل پہنچ کر معاملے کا چارج خود لے لیا تا کہ ہڑتالیوں کی طرف سے کوئی بدنظمی یا تشدد نہ ہونے پائے۔ کان مالکوں نے انھیں ڈربن بلایا اور یہ طعنہ دیا کہ ''آپ کا نقصان تو کچھ ہونے کا نہیں لیکن کیا آپ کان مزدوروں کا نقصان پورا کر دیں گے؟'' گاندھی نے جواب دیا کہ ''مزدوروں کو معلوم ہے کہ انھیں کن خطروں کا سامنا ہے۔ پھر کسی بھی صورت میں عزت نفس کے نقصان سے بڑھ کر کوئی اور نقصان نہیں ہوسکتا۔ تین پونڈ کی چنگی ادا کر کے وہ کئی برس سے عزت کا یہ نقصان اُٹھاتے چلے آرہے ہیں۔'' نیوکیسل پہنچ کر انھوں نے مزدوروں کو بتایا کہ کیسی دھمکیاں دی جارہی ہیں لیکن مزدوروں کے قدم ڈگمگائے نہیں۔ انھیں ''گاندھی بھائی'' پر پورا اعتماد تھا۔

کان مالکوں نے سب پیچ کسنا شروع کیے۔ انھوں نے کان مالکوں کے کوارٹروں کے پانی اور بجلی کے کنکشن کاٹ دیے۔ غریب ہندوستانی اپنے کوارٹروں سے اپنی مختصر سی پونجی لے کر باہر نکل آئے۔ گاندھی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ان بے روزگار اور بے گھر لوگوں کا کیا کریں۔ نیوکیسل کے ہندوستانی تاجر اس ڈر سے اِن کی مدد نہیں کرتے تھے کہ ان پر حکومت کا عتاب نازل ہو جائے گا۔ ایک ہندوستانی عیسائی خاندان نے ان کے کھلانے پلانے کی پیش کش کی لیکن وہ کب تک کھلا پلا سکتے تھے؟ سیکڑوں اَن پڑھ اور بے روزگار افراد کے اِدھر اُدھر بے ضرورت گھومتے رہنے میں بھی بہت خطرات پوشیدہ تھے۔ گاندھی نے اس فوج کو اس خیال سے ٹرانسوال تک مارچ کرنے کا فیصلہ کیا کہ راستے میں حکومت اِن کو اپنی نگرانی میں لے لے گی اور انھیں قید خانوں میں بھر دے گی لیکن اگر کسی معجزے سے یہ کان مزدور قید سے بچ گئے تو پھر ٹالسٹائے فارم پر کام کر کے یہ لوگ اپنا

پیٹ پال لیں گے۔

آدھی روٹی، آدھی چھٹا نک شکر اور ایک پونڈ کے راشن پر اِن لوگوں نے نیوکیسل سے چارلی ٹاؤن کا فاصلہ چھتیس میل دودن میں طے کیا۔ یہ جگہ ٹرانسوال کی سرحد پر واقع تھی۔ اس جماعت میں 4037 مرد، 127 عورتیں اور 57 بچے شامل تھے۔ ''سنڈے پوسٹ'' نے لکھا کہ ''جن یاتریوں کی رہبری گاندھی کررہے ہیں وہ ایک قابل دید گروہ ہے۔ یوں دیکھنے میں تو یہ لوگ بالکل بے بضاعت، مریل، معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے پاؤں کیا، چھڑیاں ہیں۔ لیکن تقریباً فاقے کے راشن پر یہ لوگ جس طرح مارچ کررہے ہیں اُس سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ واقعتہً قوی ہیں۔'' عدم انضباط کے بھی کچھ واقعات ضرور ہوئے لیکن بحیثیت مجموعی اِن غریب اور اَن پڑھ مزدوروں نے جس نظم وضبط اور ہمت کا مظاہرہ کیا وہ حیرت انگیز تھا۔ وہ سیاست سے ناواقف تھے لیکن وہ اپنے لیڈر کو جانتے تھے اور اُس کی بات اُن کی نگاہ میں قانون کی طرح اٹل تھی۔ ایک عورت گود میں بچہ لیے ہوئے مارچ کررہی تھی۔ جب وہ ایک چشمے کو پار کررہی تھی تو بچہ اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر چشمے میں گر پڑا اور ڈوب گیا۔ اس نے کہا ''جو مر گیا ہمیں اس کے غم میں گھلنا نہیں چاہیے ہمیں ان لوگوں کے لیے کام کرنا چاہیے جو زندہ ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑی۔

ٹرانسوال کی سرحد پار کرنے سے پہلے گاندھی نے حکومت کو لکھا کہ ہندوستانی کان مزدور ٹرانسوال میں بسنے کے لیے نہیں آرہے ہیں بلکہ ان کا مقصد حکومت کی وعدہ خلافی کے خلاف احتجاج کرنا ہے۔ اگر تین پونڈ کا چنگی ٹیکس ختم کردیا جائے تو وہ بھی ہڑتال ختم کردیں گے۔ جب اُن کے خطوں اور تاروں کا جواب نہیں ملا تو گاندھی نے جنرل اسمٹس کو ٹیلی فون کیا۔ جنرل اسمٹس کے سکریٹری نے انھیں یہ سوکھا جواب دیا کہ ''آپ کے جی میں جو آئے، آپ کیجئے۔ جنرل اسمٹس کو آپ سے کوئی سروکار نہیں۔'' فوکس رسٹ، سرحدی گاؤں تھا۔ وہاں کے جنگ جو یورپینوں نے یہ دھمکی دی کہ وہ ہندوستانیوں کو خرگوشوں کی طرح گولی سے اڑادیں گے۔ یہاں پریشانی کا امکان تھا لیکن خوش قسمتی سے یہ جلوس اس گاؤں سے بخیر وخوبی گزر گیا۔ گاندھی کو گرفتار کرکے فوکس رسٹ میں مقدمہ چلانے کے لیے لایا گیا استغاثہ کی طرف سے مقدمے کی تیاری کے لیے وقت مانگا گیا۔ گاندھی کو ضمانت پر چھوڑ دیا گیا اور وہ ہڑتالیوں سے آملے وہ دوبارہ گرفتار کئے گئے۔ پھر

ضمانت پر رہا ہوئے اور پھر اپنے قافلے سے جا ملے اگر انھیں یہ خیال نہ ہوتا کہ جس گٹھ ردَل کی وہ قیادت کررہے ہیں اُس کو قابو میں رکھنے کے لیے اُن کی موجودگی ضروری ہے تو وہ کبھی ضمانت کی خواہش نہ کرتے اور عدالت بھی ضمانت منظور نہ کرتی اگر قتل کے علاوہ دوسرے سبھی جرائم کے لیے ضمانت کا قانونی حق موجود نہ ہوتا۔ قافلہ جیسے ہی جانسبرگ پہنچا، گاندھی کو گرفتار کرلیا گیا۔ چار دنوں کے اندر یہ اُن کی تیسری گرفتاری تھی۔ اُن پر ناٹال کے قانونِ معاہدۂ مزدوری کے تحت مقدمہ چلا اور ساٹھ پونڈ جرمانے یا نو ماہ قید سخت کی سزا ملی۔ انھوں نے جیل خانہ جانا پسند کیا۔

اگر حکومت یہ سمجھتی تھی کہ گاندھی کی گرفتاری کے بعد مارچ کرنے والوں کی ہمتیں ٹوٹ جائیں گی تو اُسے یقیناً مایوسی ہوئی۔ بالفور اسٹیشن پر مارچ کرنے والے گرفتار کر کے تین اسپیشل ٹرینوں میں سوار کیے گئے۔ جن کے ذریعے وہ ناٹال کی طرف شہر بدر کیے جارہے تھے۔ ایک نازک مرحلہ اس وقت آیا جب ہڑتالیوں نے گاندھی بھائی کے حکم کے بغیر ٹرین پر سوار ہونے سے انکار کردیا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح وہ یہ حکم ماننے پر راضی کرلیے گئے۔ راستے بھر انھیں کچھ کھانے کو نہیں دیا گیا۔ ناٹال پہنچ کر اُن پر مقدمہ چلا اور وہ جیل بھیج دیئے گئے۔ حکومت کو اچ کی سوجھی اور اُس نے بہ یک وقت ہڑتالیوں کو سزا دینے اور کانوں کو چلانے کی ایک تدبیر سوچی۔ کانوں کے احاطوں کو ڈنڈی اور نیوکیل جیلوں کا محصلاتی علاقہ قرار دے دیا گیا اور کان مالکوں کے یورپین اسٹاف کو ان کے جیلوں کا داروغہ مقرر کیا گیا۔ اِس ظالمانہ مذاق کی تکمیل کے لیے کان میں کام کو سزا کا جز قرار دے دیا گیا۔ مزدور بہادر تھے اور انھوں نے زیرِ زمین جبری کام کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر انھیں بے رحمی سے کوڑے مارے گئے۔ اس بے رحمانہ ظلم کی خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ اور ناٹال کے اُتر اور پچھّم میں بلاتحریک ہڑتالیں ہوگئیں اور مزدور باغوں اور کانوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ حکومت نے ''خون اور فولاد'' کی پالیسی پر کام کرنا شروع کیا۔ نسلی جذبے اور مفاد پرستی کے زیرِ اثر غریب ہندوستانی مزدوروں کو وحشیانہ سزائیں دی گئیں اور سوار ملٹری پولیس نے مزدوروں کو کانوں میں کام کرنے کے لیے زبردستی دھکیل دیا۔ جب گاندھی کو اِن مظالم کی خبر ملی تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ گولیاں گویا اُن کے دل کے آر پار ہورہی ہیں۔

فوکس رسٹ جیل میں گاندھی سے پتھر کھودنے اور جیل کے صحن میں جھاڑو دینے کا کام لیا

گیا۔ بعد میں انھیں پر ٹیوریا جیل کی ایک اندھیری کوٹھری میں ڈال دیا گیا جو صرف دس فٹ لمبی اور سات فٹ چوڑی تھی۔ اس میں بس رات میں روشنی ہوتی وہ بھی قیدی پر نظر رکھنے کے لیے انھیں ایک بنچ تک نہیں ملی اور کوٹھری میں چہل قدمی کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اس طرح بے شمار ذہنی سوئیاں چبھوئی جاتی رہیں۔ ایک مقدمے میں گواہی کے لیے انھیں طلب کیا گیا تو عدالت تک اس حالت میں پیدل لے جایا گیا کہ اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔

حکومت جنوبی افریقہ کی ''خون وفولاد'' کی پالیسی نے سارے ہندوستان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ گوکھلے گاندھی سے خط اور تار کے ذریعے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے ستیہ گرہوں کی مالی اور اخلاقی مدد کے لیے ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ ہندوستان کے سب سے بڑے پادری بشپ لفرائے، نے ہندوستانیوں کے سوال پر ہندوستانیوں کی حمایت کرتے ہوئے پریس میں ایک کھلا خط لکھا اور اُس میں بڑی صاف گوئی سے کام لیا۔ ملک کے برانگیختہ جذبات کا وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر بڑا اثر پڑا۔ ان کو صلاح کے طور پر یہ بتایا گیا کہ عظیم بغاوت (غدر) سے آج تک ایسی تحریک نہیں چلی ہے۔ ہارڈنگ کی اُس زمانے کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ جنوبی افریقیائی یونین کی حکومت کے کاموں اور لندن کے ڈومی نین آفس کی بے عملی سے کس قدر نالاں تھے یہ احساس اس وقت اُبال کے نقطے تک پہنچ گیا۔ جب نومبر 1913 کے آخر میں مدراس جاتے وقت اُنھوں نے وہ سرکاری تار پڑھے جن میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے مصائب کی داستان درج تھی۔ مہاجن سبھا کی طرف سری نواس شاستری نے انھیں جو ایڈریس پیش کیا تھا اُس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے اعلان کیا کہ جنوبی افریقہ میں مقاومت کرنے والوں کو ہندوستان کی ہمدردیاں حاصل ہیں اور ''اُن لوگوں کی ہمدردیاں بھی جو میری طرح ہندوستانی نہ ہوتے ہوئے بھی اس ملک کے عوام کے لیے ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ لیکن ماضی قریب کے واقعات نے نازک صورت حال اختیار کر لی ہے۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ اُن مبینہ الزامات کو کتنی وسیع پبلسٹی ملی ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ مقاومت مجہول کی اس تحریک پر قابو پانے کے لیے ایسے ایسے اقدامات کیے گئے ہیں جن کو ایسا کوئی ملک روا نہیں رکھ سکتا جو خود کو تہذیب یافتہ کہتا ہے''[1]

---

(1) ہارڈنگ آف پن شروٹ: تائی انڈین ایریس، لندن، 1948، ص 91

آگے چل کر وائسرائے نے جنوبی افریقی حکومت پر لگائے گئے ظالمانہ برتاؤ کے الزامات کی غیر جانبدارانہ جانچ کی مانگ کی۔ اس تقریر سے ہندوستان میں لارڈ ہارڈنگ کا وقار بہت بڑھ گیا لیکن لندن اور پرٹیوریا میں اُن پر سخت نکتہ چینی ہوئی۔ جنرل بوتھا اور جنرل اسمٹس نے یہ زور دیا کہ وہ واپس بلا لئے جائیں اور اس پر برطانوی کابینہ نے بہت سنجیدگی سے غور بھی کیا لیکن یہ سوچ کر کہ ہندوستان کی رائے عامہ پر اس کا ردِّعمل ہونا لازمی ہے، یہ تجویز غیر عملی سمجھ کر رد کر دی گئی۔[1]

ایک طرف خود جنرل اسمٹس کا کھٹکتا ہوا ضمیر تھا اور دوسری طرف جنوبی افریقہ کے یورپیوں کی ضد تھی جسے خود جنرل نے بڑھاوا دیا تھا۔ اِن دونوں کے مابین جنرل کی پوزیشن نا قابل رشک تھی۔ اُن کی حیثیت اُس سانپ کی تھی جس نے پورا چوہا منہ میں بھر تو لیا تھا لیکن اب نہ نگلتے بنتا تھا اور نہ اُگلتے[2] آخر کار انھوں نے لاج رکھنے کا وہی حربہ استعمال کیا جو ہمیشہ سے رائج چلا آ رہا ہے، یعنی تحقیقاتی کمیشن مقرر کر دیا جائے۔ اُس کمیشن میں ایک بھی ہندوستانی نہیں تھا اور اُس کے تین ممبروں میں سے دو تو اپنی ہندوستان دشمنی رایوں کے لیے بدنام تھے۔ گاندھی نے محسوس کیا کہ اگر کمیشن کی دوبارہ تشکیل نہیں ہوئی تو ہندوستانیوں کو اس سے انصاف نہیں مل سکتا۔ گوکھلے نے اینڈ ریوز اور پیرسن کو مصالحت کی مدد کے لیے بھیجا۔ گاندھی نے کہا کہ وہ کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کا عہد کر چکے ہیں۔ وائسرائے نے معتدل رویہ اختیار کرنے کی رائے دی۔ گوکھلے اور گاندھی کے درمیان کئی تار آئے اور گئے۔ گوکھلے کا خیال تھا کہ بائیکاٹ سے ہندوستان کو نقصان پہنچے گا۔ وہ الجھن اور پریشانی سے تھک گئے تھے اور اُن کی ذیابیطس بڑھ گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ''گاندھی کو حق نہ تھا کہ وہ ایک عہد کر کے اپنے کو اس طرح باندھ لیں۔ یہ سیاست ہے اور مصالحت اس کا لازمی عنصر ہے۔ گوکھلے کو خوف تھا کہ گاندھی کے رویے سے لارڈ ہارڈنگ ناراض ہو جائیں گے۔ اگرچہ گاندھی وائسرائے کی حمایت کی قدر و قیمت جانتے تھے لیکن اس حمایت کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے اصولوں کی قربانی پر تیار نہ تھے۔

---

(1) ہارڈنگ آف پن شروٹ: تائی انڈین ایرس، لندن ء1948 ص91

(2) جنوبی افریقہ کی ستیہ گرہ ص:485

اس دوران میں جنرل اسمٹس نے اشارہ کیا کہ تحقیقاتی کمیشن کا مقصد صرف یہ تھا کہ انھوں نے جو فیصلے کیے ہیں ان کا تحریری اعادہ کردے اور اس کی ہندوستان دشمن غالب رُکنی اکثریت سے جنوبی افریقہ کی حکومت کو یہ مدد ملے گی کہ وہ ہندوستانیوں کے لیے نئی پالیسی بنانے میں قانون ساز جماعت کو ساتھ لے کر چل سکے گی۔ گاندھی نے دو اچھے اور معنی خیز اقدام کیے جو ستیہ گرہ کی حکمت عملی کا حصہ تھے لیکن اس کا اُن کے مخالفوں پر بڑا اثر پڑا۔ ساؤتھ امریکن ریلوے کے یورپین مزدوروں نے ہڑتال کردی تھی لیکن گاندھی نے حکومت کی اس مشکل سے فائدہ اٹھانے سے انکار کردیا اور اپنی تحریک کے اگلے اقدام کو کچھ دنوں کے لیے ملتوی کردیا۔ دل جوئی کا دوسرا قدم انھوں نے یہ اٹھایا کہ اپنے ساتھیوں کی شدید مخالفت کے باوجود ہندوستانیوں پر کان مالکوں اور فوجیوں کے ڈھائے گئے اُن مظالم کی تحقیقات کے مطالبے پر مزید زور نہیں دیا۔

پریٹوریا میں گاندھی اور اسمٹس کے درمیان مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی۔ ڈربن کے کئی تار آئے کہ مسز گاندھی جو حال ہی میں رہا ہوئی تھیں، اُن کی حالت نازک ہے۔ لیکن گاندھی اس وقت تک پریٹوریا سے ملنے پر راضی نہ ہوئے جب تک اسمٹس نے معاہدے میں ایک خاص فقرہ شامل کرنے کی رضامندی نہیں دی۔ انڈریوز خود سے اسمٹس سے ملنے گئے اور اُن سے مسز گاندھی کی علالت کا حال بتایا، جس فقرے پر جھگڑا تھا اُس کے شامل کرنے پر اُن کی رضامندی حاصل کی اور آخر کار اس معاہدے پر دستخط ہوگئے۔[1] وہ خاص خاص باتیں جن پر تحریک ستیہ گرہ کا آغاز ہوا تھا مان لی گئیں۔ سابق معاہدہ بند مزدوروں پر جو تین پونڈ کا ٹیکس لگایا گیا تھا وہ ہٹالیا گیا۔ ہندوستانی قاعدے سے کی گئی شادیوں کو قانونی حیثیت دے دی گئی اور ایسے رہائشی سرٹیفکٹ کو جس پر حامل کے انگوٹھے کا نشان ہو جنوبی افریقہ یونین میں داخل ہونے کے حق کا کافی ثبوت مان لیا گیا۔ گاندھی اور اسمٹس کے درمیان اس مسئلے پر خط و کتابت ہوئی کہ انتظامی سہولیتیں (قانون ساز مجلس سے ملنے والی سہولتوں کے علاوہ) مہیا کی جائیں اور اس میں ایسے مسئلے شامل ہوں جیسے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا کیپ کالونی میں داخل ہونے کا حق، پیچھے تین برسوں میں جو تعلیم یافتہ ہندوستانی آئے ہیں اُن کی حیثیت کا سوال، موجودہ ایک سے زائد بیویوں کو جنوبی افریقہ آکر اپنے شوہروں

(1) چترویدی اورام سائکس، چارلس فریرا اینڈریوز، لندن، 1949، ص: 97

کے ساتھ رہنے کی اجازت جنرل اسمٹس نے یقین دلایا کہ ''حکومت کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے اور رہے گی کہ موجودہ قوانین کا نفاذ انصاف کے ساتھ کیا جائے اور مستقل حقوق کا احترام کیا جائے۔''

وہ ستیہ گرہ تحریک جو اتار چڑھاؤ کے ساتھ تقریباً آٹھ برس سے چل رہی تھی باضابطہ طور پر واپس لے لی گئی۔ ہندوستانیوں کی تمام شکایتوں کا ازالہ نہیں ہوا تھا۔ سونے کا قانون، تجارتی لائسنس کا قانون، مزدور بستیوں کی جائے وقوع کی تعین، بین صوبائی مہاجرت پر پابندی اور زمین کی خریداری کا امتناع بدستور باقی رہے۔ گاندھی کو امید تھی کہ نئے ماحول سے اِن بے انصافیوں کے ازالے میں آسانی ہوگی۔

جنرل اسمٹس کے لڑکے نے لکھا ہے کہ گاندھی نے میرے باپ سے پوری طرح چڑ کا کھایا وہ ناکامی کے اسی احساس کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوئے کہ وہاں اچھی طرح غور کریں اور اسکیمیں بنائیں۔[1] لیکن اُن کے باپ کی یہ رائے نہیں تھی۔ انہوں نے 1939 میں لکھا کہ ''ایک ایسے انسان کا مخالف ہونا میری قسمت میں تھا۔ جس کی میں اُس وقت بھی بڑی عزت کرتا تھا۔'' ستیہ گرہ تحریک کے بارے میں اُن کی یادداشت یہ تھی کہ ''اِس سے خود گاندھی کو تھوڑی مدت کے لیے جیل میں آرام اور تنہائی مل گئی جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔ اُن کے حساب سے ہر چیز اُن کے منصوبے کے مطابق چل رہی تھی۔ میں قانون اور نظم و نسق کا محافظ تھا۔ مجھے عام طور پر مشکل مرحلے کا سامنا تھا۔ ایک تو مجھے ایسے قانون کا نفاذ کرنا تھا جسے پبلک کی قوی حمایت حاصل نہیں تھی اور پھر یہ چھکے چھڑا دینے والی منزل کہ اُسی قانون کو واپس بھی لینا پڑا۔ انھوں نے تو کامیابی سے پانسہ پلٹ دیا تھا۔''[2]

جیل میں گاندھی نے جنرل اسمٹس کے لیے چپلوں کی ایک جوڑی تیار کی۔ جنرل کو یاد تھا کہ (دونوں کے درمیان) ''کوئی نفرت یا بُرائی کا جذبہ نہیں تھا اور لڑائی کے خاتمے کے بعد'' ''فضا ایسی تھی کہ شریفانہ طور پر صلح کی جا سکتی تھی۔''

---

(1) اسمٹس، جے، سی: جان کرسچین اسمٹس ص:106

(2) رادھا کرشنن، ایس (جامع): مہاتما گاندھی، لندن، 1939ء ص:78-277

گاندھی اسمٹس معاہدے سے اُن تمام مشکلات کا حل نہیں نکلا جن میں ہندوستانی اُس وقت مبتلا تھے اور آج بھی ہیں۔ 1924 میں ''جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ کی تاریخ'' کی تصنیف سے فارغ ہونے کے بعد گاندھی نے اُس اذیت رساں تضاد کو محسوس کیا جو تحریک ستیہ گرہ کے خوش گوار انجام اور جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی موجودہ حالت کے درمیان نظر آتا ہے۔'' وہ یہ سوچنے لگے کہ کہیں ہندوستانیوں کی قربانیاں بے سود تو نہیں رہیں۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی آئندہ برتے جانے والے نسلی امتیازات سے اپنے کو بچانے میں ناکام رہے۔ بعض صورتوں میں اُن کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ ستیہ گرہ کے ہتھیار کند ہو گئے تھے بلکہ یہ تھا کہ گاندھی کی تحریک کے جانے پہچانے رہنما سہراب جی، کچھالیا، نیڈو، پارسی رستم جی وغیرہ وفات پا گئے تھے۔ گاندھی نے لکھا کہ ''فطرت کا قانون یہی ہے کہ کوئی چیز صرف انھیں ذرائع سے باقی رکھی جا سکتی ہے جن ذرائع سے وہ حاصل کی جاتی ہے۔ جو فتح تشدد سے حاصل ہوتی ہے اُس کو طاقت ہی سے برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ 1914 میں اہنسا سے جو فتح حاصل ہوئی تھی اُسے اہنسا ہی سے باقی رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن گاندھی کے جنوبی افریقہ سے چلے آنے کے بعد وہاں ایسا کوئی بھی نہیں رہ گیا تھا جس میں کافی صلاحیت بھی ہو اور اتنی ہمت بھی کہ وہاں کے ہندوستانی آبادکاروں کی طرف سے وہ موثر طور پر اہنسا کی تحریک کا آغاز بھی کر سکے اور اُس کی تنظیم بھی۔

باب15

جنوبی افریقہ کی تجربہ گاہ

گاندھی کے اقدامات سے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے مسئلے کا کوئی مستقل حل نہیں نکل پایا۔ اس سے ہندوستانی اقلیت کے بُرے دن کچھ دنوں کے لیے ٹل گئے۔ بعض ایسی طاقتیں جن سے وہ آشنا تھے اور جن کے خلاف وہ جدوجہد کر چکے تھے اور کچھ نئی طاقتیں جو مستقبل میں ابھرنے والی تھیں۔ یہ سب مل کر جو نئے، بے رحمانہ اور شرمناک نسلی مظالم ڈھانے والے تھے اُن کا تصور بھی 1914 کے قبل کی دنیا نہیں کر سکتی تھی۔ جن سوالوں پر گاندھی نے آٹھ برس تک ستیہ گرہ تحریک چلائی اور جیتی تھی اُن سے آج ہماری دلچسپی صرف علمی نوعیت کی رہ گئی ہے۔

بہر حال، گاندھی نے جنوبی افریقہ کے لیے جو کچھ کیا وہ اُس سے کم اہم ہے جو جنوبی افریقہ نے اُن کے ساتھ کیا۔ وہ ایک جونیر وکیل کی حیثیت سے ایک تجارتی فرم کی طرف سے ایک سو پانچ پونڈ سالانہ معاوضے پر جنوبی افریقہ گئے تھے۔ وہاں رہے تو اُن کی پریکٹس پانچ ہزار پونڈ سالانہ تک پہنچ گئی اور پھر انھوں نے اِسے خود سے چھوڑ دیا۔ جہاں بمبئی میں ایک نوجوان وکیل کی حیثیت سے ایک معمولی سے دیوانی مقدمے کے ایک گواہ سے جرح کرتے وقت گھبرا کے بیٹھ گئے تھے وہاں جنوبی افریقہ پہنچ کر انھوں نے ایک جہاں دیدہ سیاست داں کی مضبوط گرفت کے ساتھ ایک نئے سیاسی ادارے کی بنا ڈالی۔ یورپین سیاست دانوں اور افسروں کی مخالفت اور ہندوستانی تاجروں

اور مزدوروں کی بے دست و پائی سے ان کے سارے جوہر کھل کر سامنے آ گئے۔ انھوں نے دادا بھائی نوروجی کو لکھا تھا کہ ''یہاں بس میں ہی ایک ایسا شخص ہوں جو اس مسئلے کو نمٹا سکتا ہوں۔'' اُن ہندستانیوں کو بچانا ضروری تھا جنھیں نہ تو حق رائے دہندگی حاصل تھا اور نہ حق نمائندگی۔ ڈر تھا کہ انھیں چوٹی سے نیچے نہ ڈھکیل دیا جائے۔ گاندھی اُن کی مدد سے کترا نہیں سکتے تھے۔ انھیں کسی چمکتے انعام کی توقع نہیں تھی۔ خطرات کا دائرہ پیشہ ورانہ چھیڑ چھاڑ سے مار پیٹ تک پھیلا ہوا تھا۔ اِن تمام باتوں کے باوجود، یہ خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے پیسے اور سیاست کے کام جنوبی افریقہ میں شروع کیے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں اور وکیلوں کے سامنے انھوں نے جس طرح بودے پن کا احساس کیا تھا اُن کو دیکھتے ہوئے اس کا امکان کم تھا کہ اپنے وطن میں وہ زیادہ پیش قدمی کر پاتے۔ جب پچیس برس کے سن میں انھوں نے ناٹال انڈین کانگریس کی نیو ڈالی تو وہ ایک سادہ تختی پر لکھ رہے تھے۔ وہ یہاں ایسے نئے نئے خیالات کا تجربہ کر سکتے تھے جن کو مستحکم سیاسی ادارے ہنسی میں اُڑا دیتے۔ سیاست میں سچائی اور قول وقسم کا کیا کام؟ ہندوستانی سیاست میں یہ سوال بار بار اٹھا تھا اور اگر گاندھی اس الجھن میں نہیں پڑے تھے تو اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے بہت پہلے، افریقہ میں اِن دونوں کے باہمی تعلق کو محسوس کیا تھا اور اُس کی تصدیق کر لی تھی۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو نظریہ پرست نہ ہو، اور نظریے جس کے عمل کا ہمیشہ ساتھ نہ دے سکیں، یہ قطعی طور سے فائدے کی چیز تھی کہ اُس کی ابتدائی کارروائیوں کا مرکز کار ایسی جگہ ہو جہاں وہ سیاسی نظائر اور پیشہ ورانہ سیاست دونوں طرح کے بندھنوں سے آزاد ہو۔ ناٹال اور ٹرانسوال دونوں ہی ہندوستان کے بعض سب سے چھوٹے صوبوں سے شاید ہی بڑے رہے ہوں۔ گاندھی نے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کہیں بڑے پیانے پر اور کہیں بڑے مسئلوں پر چلائی لیکن کئی موقعے ایسے بھی آئے کہ انھوں نے اپنے جنوبی افریقائی تجربوں سے استفادہ کیا۔ انھوں نے ناٹال اور ٹرانسوال کے ہندو مسلمانوں کو مل جل کر کام کرتے دیکھا تھا اس لیے ہندو مسلم اتحاد پر اُن کا اعتقاد ہمیشہ باقی رہا۔ ایشیائی رجسٹریشن قانون کے متعلق چلائی گئی ستیہ گرہ تحریک کے اتار چڑھاؤ وہ دیکھ چکے تھے۔ اسی لیے ہندوستانی تحریک آزادی کے جوار بھاٹے سے بھی وہ کبھی بددل نہیں ہوئے۔ وہ یہ دیکھ چکے تھے کہ ہزاروں غریب اور جاہل مزدور، جن کے پاس مال دنیا میں سے تقریباً کچھ بھی

نہیں تھا۔ قدم سے قدم ملا کے رواں دواں تھے اور قید، کوڑے لگنا، گولیاں کھانا، اِن خطرات کا اُن پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ انھیں خطرات کا سامنا کرنا ہے۔ پھر تعجب کیا ہے کہ وہ ستیہ گرہ کو عوام کے لیے قابل عمل سمجھتے تھے۔

اُن کی سیاست ہی نہیں بلکہ شخصیت کی تشکیل بھی جنوبی افریقہ میں ہوئی۔ اُن کی زندگی کا تشکیلی حصہ وہیں گزرا۔ مذہبی اور اخلاقی سوالوں سے اُن کی دل چسپی کا آغاز بچپن ہی سے ہو گیا تو لیکن اِن مسائل کا باضابطہ مطالعہ کرنے کا موقع انھیں جنوبی افریقہ ہی میں ملا۔ کویکر تحریک کے دوستوں نے اُن کے پرٹیوریا آنے پر جان لڑا دی لیکن وہ انھیں عیسائی بنانے میں ناکام رہے۔ یہ ضرور ہوا کہ انھوں نے مذہبیات کے مطالعے کا شوق تیز تر کر دیا۔ انھوں نے اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب اور عیسائیت کا گہرا مطالعہ کیا۔ گیتا کے زیر اثر انھوں نے ''تیاگ'' (ترک) کا نصب العین اختیار کیا اور اس کے بعد وہ اختیاری غربت کی راہ پر چل پڑے ''بے لوث خدمت'' اور ''بے تعلقانہ عمل'' کے معیاروں سے ان کا مطمح نظر وسیع ہوا اور پبلک لائف کے لیے اُن کو غیر معمولی قوت اور اعتقاد سے لیس کر دیا۔

گاندھی نے ایک بار جیل سے لکھا کہ ''اس دنیا میں اچھی کتابوں سے اچھے مصاحبوں کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔'' ہم میں اکثر کے لیے مطالعہ ایک دل چسپ مشغلہ ہے لیکن گاندھی کے لیے کبھی نہ تھا وہ کبھی پڑھتے نہ تھے۔ انیس برس کے سن تک انھوں نے اخبار نہیں دیکھا تھا۔ انگلستان میں انھوں نے درسی کتابوں سے باہر کی دنیا میں بھی قدم رکھا لیکن صرف سبزی خوری اور مذہب کے مضامین کی کتابوں کی حد سے آگے نہ بڑھے۔ جنوبی افریقہ آ کر اِن موضوعات پر انھوں نے اور کچھ بھی پڑھا۔ سیاست میں داخلے کے پہلے ہی سال میں انھوں نے اسی کے قریب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان میں سے اکثر مذہبیات پر تھیں۔ انھیں میں ٹائسٹائے کی کتاب ''ملک خدا تمہارے اندر ہے۔'' بھی تھی۔ ٹالسٹائے اُن کا پسندیدہ مصنف بن گیا اور بعد میں انھوں نے ''عشائے ربانی، مختصر، ''کیا کرنا چاہیے؟ ''آرٹ کیا ہے؟'' ''دور حاضر کی غلامی''، ''پہلا قدم''، ''ہم کیسے بچیں گے''؟ ایک ہندو کے نام خطوط'' وغیرہ کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ٹالسٹائے کی جرأت مندانہ تصوریت اور بے باکی نے اُن کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اُس کے مذہبی خلفشار نے اُس مذہب

کا طلسم توڑ دیا جو ایک بندھا ٹکا ادارہ بن چکا تھا۔ ٹالسٹائے روزمرہ کی زندگی اور اخلاقی اصولوں کے۔ مابین ہم آہنگی پر زور دیتا تھا۔ اس سے گاندھی کا عقیدہ اس بات پر اور مضبوط ہو گیا کہ اصلاح نفس کو کوششیں جاری رکھی جائیں۔ گاندھی کی طرح کم ہی لوگ ہوں گے جنھوں نے اتنا کم پڑھ کے اتنا زیادہ فائدہ اٹھایا ہو۔ کتاب، گاندھی کی نگاہ میں، وقت گذاری کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ تجربات کا ذخیرہ تھی اور اس قابل کہ یا تو اُسے قبول کیا جائے یا مسترد کر دیا جائے۔ اس طرح اُن پر کتابوں کا حیرت انگیز اثر ہوتا تھا۔ ریلن کی کتاب ''آخرکار'' نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ فوراً ناٹال کا دارالحکومت ترک کر کے زولولینڈ کی ویرانیوں میں اختیاری غربت کی زندگی بسر کرنے کا فوری تجربہ شروع کر دیں اور صحیح معنوں میں گاڑھے پسینے کی روزی کمائیں۔ ٹالسٹائے کی کتابوں نے گاندھی پر سب سے زیادہ اثر کیا۔ بہر حال، انھیں آنکھیں بند کر کے تقلید کی عادت نہیں تھی لیکن ٹالسٹائے میں انھیں ایسا مصنف مل گیا جس کے خیالات میں وہ اُن کے اپنے ادھورے مختصرات کی تشریح و تفسیر مل گئی۔ گاندھی کو ٹالسٹائے سے صرف دور حاضر کی ریاستوں کے منظّم یا خفیہ تشدد اور شہریوں کے حق سِول نافرمانی پر ہی اپنے خیالات کی تصدیق نہیں ملی بلکہ موجودہ تہذیب اور صنعت پسندی سے لے کر جنسیات اور مدارس تک کے بے شمار موضوعات پر گاندھی ٹالسٹائے کی تحلیل سے سے لے کر جنسیات اور مدارس تک کے بے شمار موضوعات پر گاندھی ٹالسٹائے کی تحلیل سے متفق نظر آنے لگے۔ دونوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اُس سے ایک طرف ایسے نوجوان ہندوستانی کی احسان مندی اور تعظیم کا پتہ چلتا ہے جو اپنے معاشی زندگی کے پہلے دروازے پر کھڑا ہوا اور دوسری طرف اُس بوڑھے ٹالسٹائے کے خوشگوار تعجب کا جس پر گھریلو ٹریجڈی اور موت کے سائے لہرا رہے تھے۔ ٹالسٹائے کے بہت سے خیالات کو اُس کا یہی ہندوستانی مداح عملی جامہ پہنانے والا تھا اور اُس کی جانچ پرکھ کرنے والا تھا۔ ٹالسٹائے کی ڈائریوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی تاہلی زندگی کی خانہ جنگی کے پس منظر میں کس طرح اپنے اُن خیالات پر عمل کرنے سے قاصر رہا جن کی وہ تبلیغ کرتا رہتا تھا اور یہ ناقابل برداشت تضاد کس طرح اس کے ذہن پر ایک بوجھ بن کر لدا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ جب باتیں برداشت سے باہر ہو گئیں تو وہ یاسنیا پولیانا سے بھاگ کر ایک مضافاتی اسٹیشن پر مرنے چلا گیا۔

''ہندسوراج'' یا ''انڈین ہوم رول'' جو گاندھی نے لندن سے جنوبی افریقہ جاتے ہوئے بحری سفر کے دوران 1908 میں لکھی تھی اس پر ٹالسٹائے اور رسکن دونوں کی چھاپ ہے۔ اس کے مخاطب تشدد پسند اسکول سے وابستہ وہ نراجی نوجوان ہیں جو مغرب کے خلاف مغرب ہی کے ہتھیار یعنی پستول بم وغیرہ استعمال کرکے ہندوستان کو نجات دلانا چاہتے تھے۔ ''ہندسوراج'' ایک جامع سیاسی منشور ہے۔ یہ ایک وسیع میدان کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ اس میں 'ہوم رول' ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے سرچشموں، قومی بے اطمینانی، ہندوستان میں برطانوی راج کا لیکھا جوکھا، پارلیمانی طریق حکومت کی نوعیت، مغرب کی صنعتی اور مادی تہذیب کا عذاب، ہندو مسلم سوال، اور وحشیانہ طاقت اور مقاومت مجہول کی تقابلی تاثیر سے بحث کی گئی ہے۔

جب 1912 میں گوکھلے نے یہ کتاب پڑھی تو انھیں یہ نیم پختہ لگی اور انھوں نے یہ پیش گوئی کی کہ ہندوستان میں سال بھر رہنے کے بعد گاندھی اس کتاب کو خود ہی ضائع کردیں گے۔ گاندھی نے یہ کتاب ضائع نہیں کی۔ 1921 میں انھوں نے ''ینگ انڈیا'' میں لکھا کہ انھوں نے ایک لفظ کے سوا اس کتاب سے کچھ بھی کم نہیں کیا اور وہ لفظ بھی ایک خاتون دوست کی خاطر سے ایسا کیا۔ لیکن انھوں نے قاری کو یہ متنبہ بھی کیا کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں آج وہ سوراج چاہتا ہوں جس کا اس کتاب میں ذکر ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ ہندوستان ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہے...... میں انفرادی طور پر اُس حکومت خود اختیاری کے لیے کوشش کررہا ہوں جس کا اس میں ذکر ہے۔ لیکن آج میری اجتماعی کوششوں کا ہدف یقیناً ایسے پارلیمانی سوراج کا حصول ہے جو ہندوستانی قوم کی خواہشات کے موافق ہے۔

''ہندسوراج'' کے معیار، گاندھی اور اُن کے قریب ترین ساتھیوں کے ذاتی معیار بن گئے تھے۔ ریلوے، اسپتال، اسکول، کارخانے، پارلیمانی ادارے اور مغربی تہذیب کا ساز وسامان جن کی انھوں نے ملامت کی تھی، وہ اب مستقل شکل اختیار کرچکے ہیں بلکہ ترقی کررہے ہیں۔ اپنی زندگی میں بھی وہ اِن کو ضروری شر سمجھ کر ان سے درگزر کرتے رہے۔ انھوں نے اقرار کیا کہ ''ہندوستان ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہے۔'' واقعہ یہ ہے کہ اُن کے فلسفے کا یہ حصہ اُن کے پیروؤں کو بھی یا تو قبل از وقت یا بہت بعد از وقت معلوم ہوتا تھا۔ گاندھی کے خیال میں

''ہندسوراج'' میں درج عقاید کے غیر عملی ہونے سے اُن کی معقولیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ کسی بھی مسئلے پر بے خوفی سے سوچنے سے گریز نہیں کرتے تھے اور اس فکر سے جو نتائج اخذ ہو سکتے تھے اُن کا سامنا کرنے سے ہچکچاتے نہیں تھے۔ سیاست، فلسفہ، مذہب جنسیات کچھ بھی ہو ہر مسئلے میں وہ آزادی سے نظریے قائم کرتے تھے جہاں تک ممکن ہوتا تھا اُن پر عمل کرتے تھے، اور دوسروں سے یہ چاہتے تھے کہ جہاں تک اُن کا دل قبول کرے وہ بھی (اُن نظریات کو) تسلیم کریں یہ بات اُن کے مزاج کے خلاف تھی کہ وہ اپنے نظریے کسی پر ٹھونسیں چاہے وہ اُن کا قریب ترین ساتھی ہی کیوں نہ ہو اور اگر وہ ایک کی اقلیت میں بھی رہ جاتے تو بُرا نہیں مانتے تھے۔ گاندھی نے جب 1914ء میں جنوبی افریقہ کو خیر باد کہا تو وہ اُس ناتجربہ کار اور اعتماد نفس سے عاری نوجوان سے بالکل ہی بدل چکے تھے۔ جو 1893 میں ڈربن آیا تھا۔ جنوبی افریقہ نے اُن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور انھیں سیاہ افریقہ پر سفید اقوام کے استحصال سے پیدا ہونے والے نسلی مسئلے کے بھنور میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت جو رسّہ کشی ہوئی اُس نے گاندھی کو تجربہ کار بنا دیا۔ ایک طبع زاد سیاسی فلسفے اور سیاسی اور سماجی اندولن چلانے کی ایک خاص تکنیک بھی انھیں یہیں سے ملی۔ آنے والے تیس برسوں تک اسی تکنیک کو ہندوستانی سیاست میں اہم رول ادا کرنا تھا۔

دوسری فصل

گاندھی منظر عام پر

باب16

آزمائشی دور

گاندھی نے جنوبی افریقہ کے ایک وداعی جلسے میں کہا کہ ''میں ہندوستان کے لیے اجنبی ہوگیا ہوں وہ 1888 میں انگلستان کو روانہ ہوئے تھے۔ 1914 میں وہ آخری بار جنوبی افریقہ سے رخصت ہوئے۔ اس تمام مدت میں انھوں نے صرف چار برس ہندوستان میں گزارے تھے۔

لیکن وہ ہندوستان کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ 1912 میں جنوبی افریقہ کے سفر سے واپس آکر گوکھلے نے اپنے ہم وطنوں کو بتایا تھا کہ بے شک گاندھی کے خمیر میں وہ عناصر شامل ہیں جن سے ہیرو اور شہید بنتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن میں وہ روحانی طاقت موجود ہے جس سے وہ اپنے گردوپیش کے معمولی افراد کو ہیرو اور شہید بنا سکتے ہیں۔''

9 رجنوری 1910 کو جب وہ بمبئی کے اپالو بندر پر اترے تو اُن کا ایک ہیرو جیسا استقبال ہوا۔ تین دن بعد، جہانگیر پٹٹ کے قصر نما مکان میں اُن کے اعزاز میں ایک عظیم الشان استقبالیہ ہوا بمبئی کے بے تاج بادشاہ، سر فیروز شاہ مہتا اگر چہ پہلے گاندھی کی جنوب افریقائی تحریک کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کر چکے تھے لیکن آج انھوں نے گاندھی کو ''ہندوستان کی تحریک آزادی کا ہیرو'' اور مسز گاندھی کو ''جنوبی افریقہ کی ہیروئین'' کہہ کر اُن کا خیر مقدم کیا۔ گاندھی اپنی کاٹھیاواڑی پگڑی اور لبادے میں اور مسز گاندھی سادی ساری میں تھیں وہ دونوں بمبئی کے مغرب

زدہ شرفا کے اس مجمع میں جو بیوروکریسی اور تجارتی دنیا کے چنے ہوئے لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہ دونوں اجنبی فضا کا احساس کر رہے تھے۔ اپنی مخصوص بے خوفی کے ساتھ گاندھی نے اقرار کیا کہ شہر بمبئی کے مقابلے میں وہ ناٹال کے معاہدہ بند مزدوروں کے درمیان زیادہ بے تکلفی کا احساس کرتے تھے۔ اپنے بہت سے میزبانوں کو وہ عجیب وغریب اور مست قسم کے انسان نظر آئے۔ ایک ہم عصر کی رائے میں وہ انگلستان پلٹ۔ تعلیم یافتہ۔ ہندوستانی کا عجیب وغریب نمونہ تھے[1] ایک پارسی اخباری نمائندے نے جب اُن سے انگریزی میں بات کی تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹوکا کہ ''جنوبی افریقہ میں رہ کر میں اپنی مادری زبان بھول نہیں گیا ہوں۔'' بمبئی کے گجراتیوں کی ایک پارٹی میں انھوں نے تمام روایات کو توڑتے ہوئے گجراتی میں شکریہ ادا کیا۔ وہ جنوبی افریقہ کے کارناموں کا ذکر بڑھ چڑھ کر نہیں کرتے تھے۔ وہ علی الاعلان کہتے کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو اُن سے نہیں بلکہ اُن کو وہاں کے ہندوستانیوں سے تحریک ملی کسی نے کستور بائی کا ذکر کرتے ہوئے انھیں عظیم گاندھی، کی بیوی کہا تو گاندھی نے کہا کہ انھیں اِس عظیم شخص کا علم نہیں۔

حکومت ہند نے بھی اعزاز کی بارش میں عوام کا ساتھ دیا۔ 1910 کو بادشاہ کی پیدائش کے دن کے اعزازات کی فہرست میں اُن کا نام قیصر ہند طلائی تمغہ پانے والوں میں تھا۔ گوکھلے سے اُن کے تعلقات اُن کے محفوظ سیاست داں ہونے کی ضمانت تھے۔ 1910 میں ہندوستان واپس ہونے سے کچھ ہی قبل انھوں نے لندن میں مقیم ہندوستانیوں کی ایک ایمبولینس کور بنائی تھی جو یورپی محاذ جنگ پر امدادی کام کر رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے جنوبی افریقہ میں ایک غیر آئینی تحریک چلائی تھی، قانون شکنی کی تھی، جیلوں کو بھر دیا تھا لیکن وہ جس مقصد کے لیے لڑ رہے تھے وہ مقصد جتنا سیاسی تھا اتنا ہی انسانی بھی تھا اس لیے اُن سبھی ہندوستانیوں اور انگریزوں کو عزیز تھا جن کا جذبۂ انسانیت نسلی تفاخر یا سیاسی مصلحت پسندی سے بالکل ہی کند نہیں ہوگیا تھا۔ جب لارڈ ہارڈنگ نے ستیہ گرہ تحریک کی کھلم کھلا حمایت کردی تھی تو افریقہ کے ہندوستانیوں کی تحریک کے دامن سے 'بغاوت' کا دھبہ مٹ گیا تھا۔

بمبئی آنے کے فوراً بعد گوکھلے کی ہدایت کے مطابق گاندھی نے بمبئی کے گورنر سے ملاقات

(1) اچاریہ جے پی کرپلانی گاندھی جی کی زندگی کے واقعات۔'' (مرتبہ شکلا) بمبئی 1949، ص:118

کی۔ لارڈ ولنگڈن نے کہا کہ ''میں آپ سے صرف ایک بات کا طالب ہوں۔ آپ حکومت کے بارے میں جب بھی کوئی قدم اٹھائیں مجھ سے پہلے مل ضرور لیں۔'' گاندھی نے بخوشی وعدہ کر لیا کیوں کہ یہ ستیہ گرہ کی تکنیک تھی کہ مخالف کو سمجھانے اور راہ راست پر لانے کی ہر تدبیر کر لی جائے۔ اس چھوٹے سے واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک تیز ذہن برطانی حاکم نے اُس وقت کیا کچھ بھانپ لیا تھا جب بہت سے برطانوی اور ہندوستانی مبصروں کی نظر میں ہندوستانیوں کی مغربی تہذیب پر برتری، اور بچپن کی شادی اور چھوت چھات کے خاتمے کے بارے میں اپنے عجیب وغریب خیالات کی وجہ سے گاندھی ایک دوسرے مہاتما منشی رام یا سوامی وویکانند یعنی ایک مذہبی یا سماجی مصلح نظر آ رہے ہوں گے جن کی قوتیں غیر سیاسی عمل کے بے ضرر پرنالوں سے بہہ نکلنے کا امکان رکھتی تھیں۔

گاندھی کو خود سیاست میں پھاند پڑنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ہندوستانی فضا میں اُن کے رہنما گوکھلے تھے۔ اٹھارہ برس تک انھوں نے گاندھی کی طرف سے کبھی نظریں ہٹائی نہیں تھیں مجھے امید ہے کہ ایک دن آپ لوگ ایسے شخص کو دیکھیں گے جس کی قسمت میں ہندوستان کے لیے بڑے کارہائے نمایاں کرنا ہیں[1] گوکھلے کے اس پیش گوئی پر کچھ ایسے عناصر آس لگائے اور وقت کے انتظار میں بیٹھے تھے جن پر گاندھی اور گوکھلے کسی کا زور چلنے والا نہ تھا۔ 1912 کے سفر جنوبی افریقہ کے دوران گوکھلے نے گاندھی کو ہندوستان کی سیاست کے بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں۔ گاندھی ہندوستانی حالات سے مایوس کن حد تک نابلد تھے۔ اُن کے بعض خیالات پر گوکھلے ہنس پڑے تھے اور انھوں نے کہا تھا کہ ''ہندوستان میں ایک سال قیام کرنے کے بعد تمہارے خیالات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔'' سب سے پہلی چیز گوکھلے نے یہ کی کہ انھوں نے گاندھی سے وعدہ لے لیا کہ وہ سال بھر تک عوامی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کریں گے اور یہ آزمائش کا سال ہوگا۔

گوکھلے کی دلی خواہش تھی کہ گاندھی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں شامل ہو جائیں یہ سوسائٹی گوکھلے نے قائم کی تھی اور اس میں بڑی احتیاط سے چنے ہوئے سماجی کارکنوں اور عالموں

(1) اقتباس از راجکماری امرت کور: گاندھی جی کی زندگی کے واقعات (مرتبہ شکلا) بمبئی 1949، ص: 7

کی ایک مختصر سی جماعت شامل تھی جو صرف اتنی اجرت لیتے تھے کہ اُن کا پیٹ بھر جائے اور جنھوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ خدمت ملک کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں گے۔ گاندھی، گوکھلے کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے کو بالکل آمادہ تھے لیکن سوسائٹی کے کئی رکن ڈرتے تھے کہ سوسائٹی کے مطمح نظر اور طریق اور گاندھی کے طریقہ کار اور خیالات کے درمیان بہت بڑا خلا تھا۔ مغربی تہذیب اور جدید سائنس کی طرف ان کا ناقدانہ رجحان فکر، آئے دن کے سماجی اور اقتصادی مسائل کو بیان کرنے کے سلسلے میں مذہبی اصطلاحات کا استعمال اور اُن کے سیاسی اندولن کا غیر آئینی طریقہ (ستیہ گرہ) خادمان ہند (سرونٹس آف انڈیا) کے اس مختصر اور محدود حلقے کو گوارا نہ تھا۔ ابھی سرونٹس آف انڈیا میں گاندھی کی شمولیت کے سوال پر بحث ہی چل رہی تھی کہ گاندھی اپنے وطن پور بندر اور راج کوٹ کو چلے گئے اور وہاں سے شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی آفاقی یونیورسٹی شانتی نکیتن (مغربی بنگال) پہنچے۔ ٹیگور نے پہلے ہی سے عارضی طور پر ایسے قریبی عزیزوں اور پیروؤں کو اپنے یہاں ٹھہرالیا تھا جو گاندھی سے اپنی قسمتیں وابستہ کرکے جنوبی افریقہ چھوڑ کر چلے آئے تھے۔

ظاہر بیں نگاہوں میں کوئی دو شخصیتیں گاندھی اور ٹیگور سے زیادہ ایک دوسرے سے مختلف نہ ہوسکتی تھیں۔ اُن کے ناموں سے دو مختلف دنیاؤں کا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے۔ ایک دوسرے سے اتنی مختلف جتنی وادی کشمیر سندھ کے میدانوں سے...... اُن کے طرز ہائے زندگی و خیال ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے جسمانی شکل سے بھی وہ دو مختلف نسلی گروہوں سے متعلق نظر آتے تھے۔ آگے چل کر دونوں سیاست میں بھی اختلاف کرنے والے تھے۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ ایک دوسرے کی تصدیق اور موافقت کرتے تھے۔ اور ہندوستانی تہذیب کی بنیادی ہم آہنگی کے نمائندے تھے۔ (1)

گاندھی ایک ہی ہفتے شانتی نکیتن میں تھے اُن میں اینڈریوز اور پیرسن دو بہترین عیسائی نوجوان بھی تھے جو گوکھلے کے کہنے پر ستیہ گرہ تحریک کے آخری دور میں جنوبی افریقہ بھی گئے تھے اور کرپلانی اور کالیکر بھی تھے جو بہت جلد گاندھی کے زندگی بھر کے پیرو بن جانے والے تھے۔ اپنے مختصر قیام کے دوران گاندھی نے اپنی مدد آپ کے تجربے کا شانتی نکیتن والوں میں بھی شوق پیدا

(1) جے پی کرپلانی: گاندھی، ہز وایند ٹیگور، ص:1

کیا۔انہوں نے طلبہ اور اساتذہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنا باورچی خانہ خود چلائیں اور اُن تمیں برہمن باورچیوں کو برخاست کردیں۔جن میں قدامت پرستی اور گندگی دونوں ہی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ٹیگور ان استادوں اور طالب علموں کو فرش صاف کرتے اور برتن باسن دھوتے دیکھ کر خوش اور محظوظ ہوتے۔اس تجربے پر پورے چالیس دن تک عمل ہوتا رہا اور اُس کے بعد ترک کر دیا گیا،شاعر جو اپی کیورپائی[1] تھے،کھانے کے معاملے میں گاندھی کی شدت پسندی کا اکثر مذاق اُڑاتے۔ایک دن گاندھی نے کہا کہ روٹی کو گھی یا تیل میں تلنا،روٹی کو زہر بنادیتا ہے۔شاعر نے بڑی متانت سے جواب دیا کہ ''یہ بہت ہی دیراثر زہر ہوگا کیوں کہ میں زندگی بھر پوریاں کھاتا رہا ہوں اور اب تک تو مجھے کوئی نقصان پہنچا نہیں۔

پونا سے تار آیا کہ گھوکھلے وفات پاگئے تار پاتے ہی شانتی نکیتین کا یہ قیام یکا یک تمام ہوگیا۔گاندھی دم بخود رہ گئے اور لمحہ بھر کے لیے وہ کھو گئے۔انھوں نے بعد میں لکھا کہ ہندوستانی سیاسی زندگی کے طوفانی سمندر میں کشتی ڈالنے سے پہلے مجھے ایک تجربہ کار اور معتبر جہاز راں کی تلاش تھی۔ایسا جہاراں مجھے گوکھلے کی ذات میں مل گیا تھا اور ان کی نگرانی میں میں اپنے کو محفوظ تصور کرتا تھا۔[2]انھوں نے سال بھر تک ننگے پاؤں چل کر گوکھلے کا غم منایا اور اپنے دوست،فلسفی اور رہنما کی عزت بھری یاد کے زیر اثر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں داخلے کی ایک بار اور کوشش کی۔یہ دیکھ کر کہ اس مسئلے میں سوسائٹی شدید اختلاف رائے سے دوچار ہے انھوں نے سری نواس شاستری کو جو گوکھلے کی جگہ سوسائٹی کے سربراہ ہوئے تھے،لکھا کہ میں اپنی درخواست داخلہ واپس لینا چاہتا ہوں اور جو لوگ میرے مخالف ہیں اُن کو ایک بدنما صورت حال میں مبتلا ہونے سے بچانا چاہتا ہوں۔

آزمائشی سال کا بقیہ حصہ اِس لمبے چوڑے ملک کے سفر میں گزرا۔کلکتہ کی بازدید اور برما کے مختصر سفر کے بعد ہردوار کی یاترا کی جہاں اُس وقت کمبھ کا زبردست میلہ ہو رہا تھا۔اگرچہ

---

(1) یونانی فلسفی اپی کیورو کا تابع۔اس فلسفی کا کہنا تھا کہ لذت ہی سب سے بڑی اچھائی ہے۔اپی کیورائی اسے کہیں گے جو کھاؤ، پیو،مست رہو، پرکار بند ہو۔

(2) گاندھی آٹو بایوگرافی،ص:471

ہندوستانی عوام کے لیے وہ ابھی تک ایسی جانی پہچانی ہستی نہ بنے تھے جیسی کہ کچھ برس بعد ہوگئے پھر بھی درشن کے سیکڑوں مشتاقوں کا ہروقت تعاقب میں رہنا، ایک مستقل امتحان بن گیا تھا۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی اندولن کی کہانی صرف پریسیڈنسی کے بڑے شہروں کے سفید کالر والی جماعت کو ہی نہیں معلوم تھی بلکہ رستے رستے یہ خبر عوام تک پہنچ چکی تھی۔ ہردوار میں انھوں نے دیکھا کہ ہندومت کے نام پر کیا کیا بدعنوانی اور ریاکاری ہوتی تھی۔ سادھوؤں کے جمگھٹ کیسے پوری قوم کو چوس رہے تھے اور یاتریوں کا آخری پیسہ تک نکال لینے کے لیے مذہبی پیشوا کیسے کیسے جال لگاتے تھے۔ انھوں نے اپنے اردگرد جو ناانصافی دیکھی اُس کے پرائشچت کے طور پر انھوں نے عہد کیا کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں پانچ چیزوں سے زیادہ نہیں کھائیں گے اور غروب آفتاب کے بعد کچھ بھی تناول نہ کریں گے یہاں وہ دوسروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کررہے تھے۔ یہ پہلی یا آخری بار نہیں تھا کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے گناہوں اور رنج وملال کی خاطر خود اذیت برداشت کررہے تھے۔

1910 کے دوران جو آزمائشی سال تھا۔ گاندھی سیاسیات سے یک لخت کنارہ کش رہے اور اس زمانے میں۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں کو صرف سماج اور فرد کی اصلاح تک محدود رکھا اور ہندوستانی سیاست پر جو مسائل چھائے ہوئے تھے اُن سے الگ تھلگ رہے یہ کنارہ کشی کچھ تو از خود عائد کی ہوئی خاموشی کی وجہ سے تھی اور کچھ اس سبب سے کہ وہ ابھی ہندوستان کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے اور کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہے تھے۔

باب 17

سابرمتی آشرم

ابھی گاندھی کے سیاسی خیالات کی تشکیل نہیں ہوئی تھی لیکن اُن کے سامنے فوری طور سے یہ سوال تھا کہ عزیزوں اور جنوبی افریقہ کی تحریک کے ساتھیوں کی اُس مختصر سی جماعت کو جس نے اپنی قسمت گاندھی سے وابستہ کر لی تھی ایک دھرے پر لگا دیا جائے۔ ابھی گاندھی انگلستان میں تھے کہ ملن لال کی قیادت میں فونکس (ناٹال) سے اٹھارہ لڑکوں کی ایک پارٹی ہندوستان پہنچ گئی۔ یہاں گروکل کانگڑی اور شانتی نکیتن دو عظیم ثقافتی اور تعلیمی اداروں نے اُن کی خاطر داری کی شانتی نکیتن میں ٹیگور نے اُن کی محبت بھری پذیرائی کی اور گاندھی کو اس بات کے لیے شکریے کا خط لکھا کہ انھوں نے ''اپنے بچوں کو ہمارے بچے بننے کی بھی اجازت دی اور اس لیے ہم دونوں کی زندگیوں کی سادھنا (ریاضت) میں ایک زندہ رابطہ قائم کیا۔'' لیکن گاندھی ایک ایسا آشرم قائم کرنے کی فکر میں تھے جہاں وہ ان بچوں اور دوسرے ساتھیوں کو ٹھہرا سکیں تا کہ وہاں خدمت اور سادگی کی زندگی جس کی آغوش میں وہ جنوبی افریقہ میں پلے تھے، پھر سے شروع کر سکیں۔

گوکھلے نے اس آشرم کے اخراجات کی کفالت کا وعدہ کیا تھا لیکن فروری 1910 میں وہ چل بسے۔ گاندھی کو ملک کے مختلف گوشوں سے یہ درخواستیں ملیں کہ آشرم وہاں قائم کیا جائے۔ اُن کے وطن راجکوٹ سے، متبرک ہردوار سے اور کلکتہ سے لیکن خود انھوں نے احمد آباد کو منتخب کیا۔ اس

بات کے علاوہ کہ وہ وہاں کے بھی صنعت کاروں نے ایک آشرم قائم کرنے اور چلانے کے لیے پیسہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا، انھوں نے یہ محسوس کیا کہ جس صوبے میں وہ پیدا ہوئے تھے وہاں کے باشندوں کی خدمت وہ بہتر طریقے پر کر سکتے تھے۔ یہ بات بھی تھی کہ احمد آباد جو پارچہ بافی کا بڑا مرکز تھا ہاتھ کی کتائی اور بنائی کے تجربے کے لیے بھی موزوں جگہ تھی۔ اُن کے خیال میں ہاتھ کی کتائی اور بنائی ہندوستانی دیہاتوں کے کم کام اور کم خوراک پانے والے عوام کے لیے قابل عمل ضمنی پیشے تھے۔

ستیہ گرہ آشرم، احمد آباد کے قریب کوچرب نامی گاؤں کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں قائم ہوا جو وہاں کے ایک وکیل کی ملکیت تھا اور آشرم کی آبادی پچیس مرد عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھی۔ عمارت آشرم کی جماعتی زندگی کی ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر نہیں بنائی گئی تھی۔ اس لیے بہت جلد بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ناکافی ہوگئی۔ گاؤں میں طاعون کے وبا پھیل جانے کی وجہ سے آشرم کو دریائے سابرمتی کے کنارے ایک جگہ مستقل طور سے اور جلدی سے منتقل کر دیا گیا۔ جنگل کاٹ کر صاف کیا گیا اور ایک نو آبادی قائم ہوگئی۔ ہوتے ہوتے یہ آشرم ڈیڑھ سو ایکڑ پر پھیل گیا۔ اس میں گاندھی جی کے لیے، استادوں اور اُن کے خاندانوں کے لیے رہائش گاہ اور ایک دارالطعام (بھوجنالے) ایک اسکول، ایک کتب خانہ، کتائی اور بنائی کے شیڈ، ڈیری فارم، قابل زراعت آراضی جس میں ترکاری اور روئی کی کاشت ہوتی تھی، یہ سب کچھ ہوگیا۔

گاندھی کے پاس صرف اتنی فرصت تھی کہ وہ آشرم کا ''پلان'' (منصوبہ) تیار کرسکیں۔ ملک کے مختلف حصوں سے جو بلاوے آتے رہتے تھے اُس کے پیش نظر اس پلان کو بروئے کار لانا مگن لال کے انَ تھک اور ماہرانہ ہاتھوں کے سپرد کر دیا گیا۔ مگن لال کی وفاداری، عملی صلاحیت اور دشواریوں پر قابو پانے کی اہلیت کی بدولت ہی جنوبی افریقہ میں فونکس کی نو آبادی اور ٹالسٹائے فارم کامیابی سے روشناس ہوا تھا۔ گاندھی کس قدر مگن لال کے زیر بار احسان تھے اس کا اندازہ ان کے اس بے مثال اور زندہ جاوید تعزیتی فقرے سے ہوتا ہے جو انھوں نے اُن کی وفات پر لکھا تھا کہ ''ان کی موت نے مجھے بیوہ کر دیا ہے۔'' ام۔ کے۔ گاندھی۔

آشرم کو قائم ہوئے مشکل سے چند مہینے ہوئے ہوں گے جب اُسے ایک بحران سے دوچار

ہونا پڑا۔ گاندھی نے ہمیشہ چھوت چھات کی مخالفت کی تھی جس کی بدولت کروڑوں ہندو بونوں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ انھیں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے امرت لال ٹھاکر سے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ ایک ایماندار اور غریب اچھوت خاندان آشرم میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ یہ خاندان جس میں دادا بھائی جو بمبئی میں ٹیچر رہ چکے تھے۔ اُن کی بیوی دانی بہن اور ان کی بچی لکشمی شامل تھے، آشرم کے اصولوں کی پابندی کرنے پر تیار ہوگئے اور انھیں آشرم میں شامل کرلیا گیا لیکن اس داخلے سے خلاف عقل مگر گہرے تعصب اُبھر پڑے اور آشرم کے اندر اور باہر دونوں طرف سے گاندھی کے سر پر ایک طوفان امنڈ پڑا۔ احمد آباد کے ذہنی تاجر لوگ جن کی امداد پر آشرم چل رہا تھا روایتی معتقدات کے خلاف اس بے حرمتی سے بوکھلا گئے اور انھوں نے امداد بند کردی۔ آشرم کے فنڈ ختم ہوگئے۔ گاندھی نے فیصلہ کیا کہ وہ احمد آباد کی گندی بستیوں میں اچھوتوں کے مکانوں میں رہیں گے اور اپنے ہاتھ سے کام کر کے رزق مہیا کریں گے لیکن ایک نامعلوم ذریعے سے تیرہ ہزار روپے کا عطیہ آ گیا جس کی وجہ سے یہ سخت مایوسانہ اقدام رُک گیا۔ عطیہ دینے والے احمد آباد کے بہت بڑے تاجر امبالال سارابائی تھے جن سے کچھ دنوں بعد گاندھی کا ٹکراؤ ہونے والا تھا۔

مالی بحران پر تو قابو پالیا گیا لیکن اب گاندھی کے سامنے دوسرا اور زیادہ مشکل بحران آشرم کے اندر سے ابھر رہا تھا۔ آشرم کے کچھ رہنے والے اس بات سے ناراض تھے کہ ایک اچھوت خاندان وارد ہوگیا ہے۔ ناراض ہونے والوں میں کستور بائی بھی تھیں۔ جنوبی افریقہ میں انھوں نے اپنے شوہر کی بدعت برداشت کرلی تھی۔ لیکن اپنے وطنی ماحول میں اچھوتوں کے بارے میں اُن کے عصبیت پھر زوروں سے جاگ اٹھی۔ گاندھی کو اس سے سخت صدمہ ہوا۔ آشرم کا قانون شخصیتوں کا احترام کرنا نہیں جانتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو اس کی اجازت کیسے دے سکتے تھے کہ وہ اس قاعدہ کی خلاف ورزی کریں جو دوسرے ہر شخص کے ناقابل اشرواد تھا۔ انھوں نے اپنے کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اپنی بیوی کے سامنے یہ حیرت ناک تجویز رکھیں کہ وہ دو باتوں میں سے ایک چن لیں یعنی یا تو وہ چھوت چھات کو ترک کریں یا پھر آشرم چھوڑ دیں۔ کستور بائی کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ اپنے شوہر کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ یہ جھوٹی دھمکی نہیں ہوسکتی تھی۔ انھوں نے اپنے ضمیر کی تمام قوت سمیٹ کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس اچھوت خاندان کو اپنے خاندان کی طرح قبول کریں گی۔

گاندھی کے لیے ایک اور امتحان باقی تھا۔ مگن لال جو اُن کے سب سے وفادار چیلے تھے اور جنھوں نے جنوبی افریقہ میں آشرم چلایا تھا اور جو نئے آشرم کا سب سے ضروری پُرزہ تھے۔ انھوں نے اس کا اقرار کیا کہ وہ اور اُن کی بیوی کے دلوں کی گہرائیوں میں یہ خوف ہے کہ اچھوتوں کے ساتھ رہ کر وہ ناپاک ہو جائیں گے۔ انھوں نے اپنا سامان سمیٹا اور خدا حافظ کہنے آئے۔ مگن لال بے حد افسردہ تھے اور یہی حال گاندھی کا بھی تھا۔ جلدی سے ایک مصالحت کا راستہ ڈھونڈ نکالا گیا کہ مگن لال چند مہینے مدارس میں رہ کر بنائی کا کام سیکھیں اور ساتھ ہی ساتھ اچھوتوں کے خلاف تعصّبات کو بھلا دیں۔

''تاریخ ستیہ گرہ آشرم، میں جس کی تصنیف یراودا جیل میں 1932 میں شروع ہوئی اور جو اُن کے مرنے کے بعد شائع ہوئی۔ گاندھی نے آشرم کی یہ تعریف کی تھی ''جماعتی زندگی جو مذہبی جذبے کے ساتھ بسر کی جائے۔'' یہاں لفظ ''مذہبی'' اپنے وسیع ترین معنوں میں استعمال ہوا ہے گاندھی کے آشرم میں خاص اصولِ دین یا رسوم مذہبی، نافذ نہیں کی گئی تھیں۔ ذاتی چال چلن کے کچھ سادے اصول ضرور تھے۔ آشرم میں جو بعض عہد لینا پڑتے تھے مثلاً صداقت، عدم تشدد اور پاکیزگی وہ تو آفاقی تھے۔ دوسرے عہد مثلاً چھوت چھات کو ختم کرنا، جسمانی محنت کرنا اور بے خوفی سے رہنا اس زمانے کے سوسائٹی کے مخصوص حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اختیار کیے گئے تھے، کیوں کہ یہ سماج ذات پات کی لعنت میں گرفتار تھا مزدوری کی عظمت کا قائل نہ تھا اور اس پر ایک بیرونی حکومت مسلط تھی۔

اس عہد پر سمجھداری سے اور تخلیقی طور پر عمل کرنا ہوتا تھا۔ یہ میکانیکی فارمولے نہیں تھے بلکہ اخلاقی اور وحانی ترقی کے لیے معاون کی حیثیت رکھتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ پیش پا افتادہ معلوم ہوں پھر بھی یہ عہد پرانی صداقتوں کے حامل تھے اور اگر روزمرہ کی زندگی میں انسان اس پر عمل پیرا نہ ہو سکے تھے تو اِن کی اہمیت کم نہیں ہوئی تھی۔

آیئے، پہلے صداقت کے عہد کو لیں۔ گاندھی نے لکھا کہ ''ستیہ گرہ آشرم کا وجود ہی تلاش حق اور حق وصداقت پر عمل کرنے کی کوشش پر مبنی ہے۔[1] سچائی کے لیے کوئی بنا بنایا فارمولہ نہیں ہوتا

(1) گاندھی: فرام یرودا مندر، ص: 1

انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ جو بات ایک کو سچ معلوم ہوتی ہے ممکن ہے دوسرے کو نہ معلوم ہو۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق جسے صداقت سمجھتا ہے اسی کی پیروی کرے بلکہ یہ تو اس کا فرض ہے کہ وہ ایسا ہی کرے۔''

'اہنسا، کا عہد کسی دوسرے کو ضرب نہ لگانے کا منفی تصور ہی نہیں ہے۔ اور نہ روزمرہ کی زندگی میں اُس کا کسی ایسے منطقی مگر ناقابل عمل نتیجے تک پہنچانے کا نام ہے کہ سانس لینے اور ترکاریاں کھانے سے بھی جاندار اجسام فنا ہو جاتے ہیں۔ اہنسا کی قوت جارحانہ یعنی ہر ذی روح سے محبت کو سمجھ داری کے ساتھ حقائق پر منطبق کرنا چاہیے۔ ہندوستان کی قدامت پرستی کو اُس وقت زبردست دھچکا لگا جب گاندھی نے سابرمتی آشرم میں ایک ایسے بچھڑے کے ازراہ رحم مارنے کی اجازت دے دی جو تڑپا دینے والے اور ناقابل علاج درد میں مبتلا تھا۔ اسی طرح اگرچہ وہ گائے کے بڑے علم بردار تھے، اور اُسے ''رحم کی نظم' کہا کرتے تھے، مگر وہ چمڑے کے اقتصادیات کی جزویات پر گفتگو کر سکتے تھے کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ اگر گائے کی لاش کے ہر حصے کو استعمال نہیں کیا جاتا تو اس کی اہمیت ہندوستان کے دوسرے دُدھارے مویشیوں مثلاً بھینس کے مقابلے میں باقی نہ رہ سکے گی۔ اُن کے نزدیک عدم تشدد یا اہنسا صرف یہ نہیں ہے کہ جانداروں کو جسمانی ضرب نہ پہنچے، انھیں یہ معلوم تھا کہ بندوقوں بموں اور کٹاروں سے اتنی انسانی جانیں ضائع نہیں ہوتیں جتنی عداوت، بدخواہی اور نفرت سے جو انسانیت کو ایک ایک انچ کر کے مارتی اور اپاہج بناتی رہتی ہیں۔ گاندھیائی عدم تشدد کا مقصد یہ تھا کہ مردوں اور عورتوں کو اندرونی اور بیرونی تشدد سے نجات دلائی جائے۔

ایک اور عہد برہمچریہ، (رہبانیت) کا تھا یہ اُن لوگوں کے لیے تھا جو اپنے کو ہمہ تن خدمت خلق کے لیے وقف کر دینا چاہتے تھے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ گاندھی لوگوں کو زاہدانہ ظلم کا نشانہ بنا رہے تھے اور فطرت انسانی کو ناقابل برداشت حد تک دبا رہے تھے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جنسی خواہشات کی روک تھام ایک ایسے وسیع نظم وضبط اور ڈسپلن کا حصہ تھا جس کی وہ تعلیم دے رہے تھے۔ اس میں کھانے جسمانی محنت، خدمت خلق، عبادت اور سونا سبھی طرح کی پابندیاں شامل تھیں۔

اس طرح کے آشرم میں چوری نہ کرنے کا عہد ایک پیش پا افتادہ بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں ایک گہری سماجی معنویت بھی تھی۔ 'گیتا' سے گاندھی نے 'عدم ملکیت'' کا تصور اپنایا تھا۔ معیاری طور پر چڑیوں کی طرح انسان کو اپنے سر کے اوپر نہ چھت رکھنا چاہیے نہ کپڑے، نہ کل کے لیے کھانے کا اسٹاک۔ ظاہر ہے کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اُن میں اُس کا حصول ناممکن ہے لیکن گاندھی یہ چاہتے تھے کہ انسان اپنی خواہشات کو کم سے کم کردے۔ انھوں نے اپنے کو روپے اور جائداد کے بوجھ سے پہلے ہی آزاد کرلیا تھا۔ اور دنیوی سامان اُن کے پاس بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ اُن کے ضمیر میں خلش پیدا ہو جاتی جب وہ یہ محسوس کرتے کہ کھانا اور مکان جو انہیں میسر ہے یہ بھی گویا اُن کا 'قبضہ مخالفانہ ہے کیوں کہ ہر جگہ بہت سے بھوکے اور بے گھر لوگوں کی ضرورت ان سے زیادہ شدید ہے۔

سابرمتی آشرم میں چوری کا ایک قصہ اس لیے اہم ہے کہ اس سے موہن داس کرم چند گاندھی کے سماجی فلسفے پر روشنی پڑتی ہے۔ چور کستور بائی کا ایک صندوق لے بھاگے تھے۔ پولیس میں رپورٹ کرنے کی بجائے گاندھی نے کہا کہ بظاہر چوروں کو یقین تھا کہ آشرم میں چوری کے قابل چیزیں ہیں اور ایسا اس لیے ہوا کہ وہ پاس پڑوس کے باشندوں اور ہونے والے چوروں کو آشرم کی روح سے آشنا کرانے میں ناکام رہے ہیں۔ کستور با کے صندوق کے بارے میں انھوں نے کہا کہ مجھے حیرت ہے کہ اُن کے پاس ایک صندوق بھی تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اس میں تو صرف اُن کے پوتوں کے کپڑے تھے تو گاندھی نے جواب دیا کہ یہ کام اُن کے بیٹوں اور پوتوں کا تھا کہ وہ اپنے کپڑوں کی خود نگہداری کریں۔ اُس دن کے بعد گاندھی کے ہمراہیوں میں سب سے کم اثاثہ کستور با ہی کا ہوتا تھا۔

سابرمتی آشرم میں دو باتوں کا اور پیمان لینا پڑتا تھا۔ ایک بے خوفی اور دوسرے چھوت چھات سے احتراز۔ اِن کا ایک محدود اور معاصرانہ اثر تھا۔ برطانوی حکومت کے خوف اور اچھوتوں سے بدسلوکی نے ہندوستانی عوام کو مختلف طریقوں سے کچل رکھا تھا اور آشرم کے آراکین کو ان بندھنوں سے اوپر اٹھنا تھا۔

ان عہد ناموں کی گنتی گنانے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آشرم کی زندگی کتنی سخت وسادہ

تھی اور بے حد مصروف بھی تھی ہر شخص کو کچھ نہ کچھ جسمانی محنت ضرور کرنا پڑتی تھی۔ ایک بنائی اور کتائی کا شعبہ تھا، گایوں کے لیے ایک شیڈ تھا اور ایک وسیع فارم۔ آشرم کے ہر رہنے والے کو اپنی پلیٹیں اور کپڑے خود دھونا پڑتے تھے۔ ملازم بالکل نہیں تھے۔ پھر بھی ماحول، راہبانہ نہیں تھا بلکہ ایک ایسے بڑے خاندان کا تھا جہاں بزرگ خاندان مہربان بھی تھا اور سخت گیر بھی گاندھی باپو تھے، اس خاندان کے باپ، کستور بائی بایعنی ماں تھیں۔ یہ ایک ملا جلا گردہ تھا جس میں بچوں سے لے کر اسّی سال کے بوڑھے تک، اور امریکن اور یورپین یونیورسٹیوں کے گریجوٹیوں سے لے کر سنسکرت کے دوران تک دل وجان سے اعتقاد رکھنے والوں سے لے کر چھپے ہوئے متشکک تک شامل تھے۔ یہ ایک ایسی انسانی تجربہ گاہ تھی۔ جہاں گاندھی اپنے اخلاقی اور روحانی نظریے سے جانچا کرتے تھے۔ آشرم اُن کے لیے وہ سب کچھ بھی تھا جو خاندان پیشتر لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ دنیا کے غبار وشور سے فرار کی جگہ یہ ایسا خاندان نہ تھا جو خون کے رشتوں سے یا جائداد سے یا مشترک معیاروں کے اتباع سے وابستہ ہوتا ہے۔ بزرگ خاندان بڑا جمہوریت پسند تھا۔ اُس نے ایک بار صبح اور شام کے لیے دعاؤں کا انتخاب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اگر اُن کے پاس کوئی درخواست یا شکایت لے کر آتا تو ہنس کر کہتے کہ میں تو آشرم کا مہمان ہوں، آشرم پر ان کی حکومت تھی لیکن آشرم کے کسی رکن سے کوئی سخت لغزش ہوتی تو وہ الزام اپنے اوپر لے لیتے تھے اور کفارے کے طور پر برت رکھتے تھے۔

کستوربا (جس نام سے وہ بعد میں مشہور ہوگئیں) رسوئی گھر میں ہاتھ بٹاتیں اور بہت سے مہمانوں کی دیکھ بھال کرتیں۔ اُن کے لیے کوئی بھی کام نہ چھوٹا تھا نہ شان سے گرا ہوا۔ انھیں گویا اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ کتنی بڑی ہستی کی بیوی ہیں۔ ایک بار پرارتھنا سبھا (جلسۂ عبادت) میں آشرم کی تقریباً ساری آبادی کے روبرو اس بات پر اُن کو تنبیہ کی گئی کہ انھیں آشرم کے ایک ساتھی کی بیماری کی خبر نہ تھی۔ اُن کے شوہر نے کہا کہ ''اگر دیوداس (گاندھی کے سب سے چھوٹے لڑکے) بیمار ہوتے تو تمھیں اس کا حال ضرور معلوم ہوتا۔'' یہ دل پر چوٹ لگانے والی تنبیہ تھی لیکن اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے قریبی ساتھیوں سے بہت ہی اونچے معیارِ عمل کے خواہاں تھے۔

آشرم ایک ایسی تجربہ گاہ تھا جہاں گاندھی اپنے اوپر اور دوسروں پر تجربے کرتے رہتے

تھے۔ مردوں اور عورتوں کو بے تشدد کی جنگ لڑنے کی تربیت کے لیے اُسے گویا ایک فوجی اکادمی بھی کہا جاسکتا ہے۔ 1910 کے آغاز میں انھوں نے ایک بار سی ایف انڈریوز سے کہا تھا کہ وہ پانچ برس تک کسی ستیہ گرہ کی پیش بینی نہیں کر سکتے۔ پھر بھی کہ اُن کے آشرم میں نوجوان مردوں اور عورتوں کے ایک گروہ کو جذبات اور اخلاقیات پر کنٹرول رکھنے کی تربیت ضروردی جارہی تھی اور یہ ستیہ گرہ کے لیے بے حد ضروری تھی تا کہ جذبات کے بھڑکائے جانے پر بھی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے اور نفرت وتشدد کا مظاہرہ نہ ہو جائے۔ سابرمتی آشرم کو 1920 اور 1930 کی ستیہ گرہ تحریکوں میں وہی رول ادا کرنا تھا جو ٹالسٹائے فارم اور فونکس نے جنوبی افریقہ میں کیا تھا۔ یہیں سے وہ تعمیری کام کرنے والے جوان مرد اور عورتیں بھی ملنے والی تھیں جو ستیہ گرہ تحریکوں کے درمیانی وقفے میں قوم کے اعتمادِ نفس کو برقرار رکھ سکیں۔

باب 18

ہندوستانی قوم پرستی

جب گاندھی ہندوستانی منظر پر نمودار ہوئے تو تعلیم یافتہ اور پیشہ ور طبقوں میں قومی تحریک پہلے ہی جڑ پکڑ چکی تھی۔ جب وہ بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہندوستان سے انگلستان روانہ ہوئے تھے اُس سے کوئی تین سال پہلے دسمبر 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس نے بمبی میں اپنا پہلا جلسہ کیا تھا۔ انگلستان میں اور وہاں سے واپس آ کر ہندوستان میں بھی انھوں نے سیاست سے کسی طرح کی دل چسپی کا اظہار نہیں کیا۔ 1894 سے لگا تار بیس برس تک وہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانی برادری کی بقا کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف رہے۔ اس کے باوجود، جنوبی افریقہ سے واپسی کے چند ہی برسوں کے بعد اُس قومی تحریک کی باگ ڈور اُن کے ہاتھوں میں آ جانے والی تھی جس کا وہ اب تک دور ہی سے تماشا دیکھتے رہے تھے اور یہ باگ ڈور مرتے دم تک انھیں کے ہاتھوں میں رہنے والی تھی۔ اس منزل پر ذرا پیچھے مڑ کر اگر ہم اس تحریک پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو ہمیں 1910 میں ہندوستانی سیاست کی حالت اور اُس پر گاندھی کے اثر کی نوعیت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

یہ بات تو تھامسن منرو اور ماؤنٹسٹارٹ الفسٹن نے پہلے ہی سے سوچ لی تھی کہ ہندوستان میں برطانوی فتح ہمیشہ باقی رہنے والی چیز نہیں ہے۔ انگریزوں سے پہلے بھی ہندوستان پر غیر ملکیوں نے اُتر پچھّم سے حملہ کر کے سات سو سال تک حکومت کی تھی لیکن وہ آہستہ آہستہ ہندوستان کی ہیئت

سیاسیہ میں مدغم ہو گئے تھے۔ طامس منرو نے لکھا ہے کہ اس کے پہلے بھی غیر ملکی فاتح آئے تھے جو زیادہ متشدد اور ظالم تھے لیکن کسی نے بھی نہ تو ہندوستانیوں سے ایسی دلی نفرت کا اظہار کیا تھا اور نہ پوری قوم کی قوم کو ناقابل اعتبار قرار دے دیا تھا۔ سر ہنری لارنس نے طنزیہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ برطانوی افسر کالے آدمیوں کی بات یوں کرتے ہیں گویا یہ غریب اپنے ہی ملک میں اِن (حاکموں) کا راستہ روکے ہوئے کھڑے ہوں اور اُن سے صرف آرام اور شان بڑھانے کا کام لیا جا سکتا ہو! بغاوت نے یہ نسلی تفریق اور شدید کر دی تھی۔ یہ خالص فوجی یا اصلاً مسلم تیغ آزمائی تو نہ رہی ہوگی لیکن اس کے برعکس یہ جنگ آزادی بھی نہ تھی، البتہ شمالی اور وسطی ہند میں برطانیہ دشمن جذبات نے اِس کو ہوا ضرور دی۔ اس کی قیادت جاگیردارانہ تھی۔ یہ ایک شکست خوردہ مقصد کی جنگ تھی اور ناکامی پہلے ہی سے اس کا مقسوم تھی۔ (1)

بغاوت ایک بے رحمانہ جنگ تھی اور دونوں طرف سے جرائم کا ارتکاب ہوا۔ انگریز اُن لوگوں کی بہادری اور قربانی کی یادوں کو گلے لگائے رہے جو اس بغاوت میں لڑے تھے اور جنھوں نے اس کو ناکام بنایا تھا۔ ہندوستانی اُن لوگوں کی یادوں کو سینے سے لگائے رہے جو غیر ملکیوں کی برتر طاقتوں سے نبرد آزما ہوئے اور ناکام رہے۔ فاتحوں کو اس میں شبہ نہیں تھا کہ اُن کے حق میں جنگ کا پلہ خدا نے جھکا دیا تھا۔ ''جن لوگوں نے شروع میں انگریزوں کو مٹھی بھر گنا تھا وہ یہ گننا بھول گئے تھے کہ خدا کس طرف ہے۔'' بغاوت خوف اور شبہ کی ایک تلخ وراثت اپنے پیچھے چھوڑ گئی، گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے، جو اس لیے ''احمدل کیننگ'' کے نام سے بدنام ہوئے تھے کہ انھوں نے مقامی باشندوں سے کافی سختی نہیں برتی تھی، ملکہ وکٹوریہ کو لکھا تھا کہ ''ایک مجنونانہ اور بے امتیاز انتقام کی ہوا ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ٹائمس کا نامہ نگار اس شکست خوردہ نتیجے پر پہنچا تھا کہ ''غالباً اب دوبارہ اعتماد کبھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔'' برطانوی کمانڈر اور سول حکام کو دوبارہ اعتماد قائم کرنے کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی اس بات کی تھی کہ ملک پر اُن کی گرفت اتنی مضبوط ہو جائے کہ اس کا اعادہ نہ ہو سکے۔

---

(1) اس جنگ کا مقصد انگریزی اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ متضاد قومی عناصر مختلف مقاصد کے ماتحت اس میں شامل ہو گئے تھے اور مجموعی طور پر بالخصوص اپنے اندرونی محرکات کے دوام کے اعتبار سے یہ یقیناً جنگ آزادی تھی۔ جنگ کی نوعیت کا اندازہ آغاز سے نہیں بلکہ جنگ کی پوری تاریخ اور رفتار ترقی سے لگایا جائے گا۔ (مترجم)

1807 کے بعد ہندوستانی فوج کی تنظیم جدید کی رپورٹ میں اس خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ کافی یورپی فوج کی عظیم جوابی تدبیر کے بعد ہی ملکی (نیٹیو) کے مقابل ملکی کی جوابی تدبیر کا نمبر آتا ہے۔ آئندہ سے قبضہ جمانے والی فوج میں برطانوی فوج کا تناسب کافی ہونے والا تھا اور ہندوستانی سپاہیوں کی بھرتی ایسے علاقوں اور قوموں میں محدود کی جانے والی تھی جن کی وفاداری بغاوت کے امتحان میں پوری اتری تھی ہندوستانی ریاستوں سے نرمی کا برتاؤ کیا گیا اور آئندہ کی ممکنہ بغاوتوں میں راہ کی رکاوٹ کے طور پر اُن کی تعمیر کی گئی۔ اب برطانوی حکام اور ہندوستانی عوام کے درمیان انیسویں صدی کے نصف اوّل تک کی علاحدگی کی پہلے سے کہیں زیادہ چوڑی اور گہری ہوگئی تھی۔ ایک طرف حد سے بڑھا ہوا اقتدار یا نخوت تھی اور دوسری طرف حد سے افزوں حساسیت یا محکومیت اگلے ساٹھ برس تک (کسی والی ریاست کو چھوڑ کر) کوئی ہندوستانی کسی عام انگریز سے وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری سوائے رام موہن رائے کے ملاقات نہ کر سکتا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ ملک کو غیر مسلح کر کے اور برطانوی حفاظتی دستوں کو بڑھ کر ہندوستانیوں کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا گیا ہے لیکن سنگین کی نوک سے سب کچھ کیا جا سکتا ہے مگر اُس پر کوئی بیٹھ نہیں سکتا اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے بیرونی حکومت کے خلاف سماجی، اقتصادی اور سیاسی طاقتوں کو ہمیشہ کے لیے بندھ بنا کر روکا نہیں جا سکتا تھا برطانوی حکام اپنے کینٹونمنٹوں اور سول لائنوں نے خلوت میں چین کی بنسی بجا کر اُسی طرح اس لہر کو روکنے سے قاصر تھے۔ جیسے شاہ کینوٹ سمندر کی لہروں کو نہ روک سکا تھا۔

انیسویں صدی کے نصف اوّل میں سات قحط پڑے اور نصف آخر میں چوبیس 1870 میں شرقی بنگال[1] اور دکن کے کسانوں میں بے چینی اُبل پڑی تھی۔ اور حکومت کو مجبور ہو کر کسانوں کی حفاظت کے لیے قانون بنانا پڑا اور ایک ضابطۂ قوانین قحط وجود میں آیا تھا۔ دیہاتوں میں کسانوں کی بے چینی کے ساتھ ساتھ شہروں میں بھی بے اطمینانی کی صدائیں اٹھنے لگی تھیں۔ وہ تعلیم یافتہ طبقہ جس نے جان اسٹورٹ مل کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ برطانوی آزاد خیالی کے اصولوں کو ہندوستانی پر بھی منطبق کرنے اور قول وفعل کے درمیانی خلا کو محسوس کرنے لگا تھا۔

---

(1) موجودہ بنگلہ دیش

رابندر ناتھ ٹیگور نے لکھا ہے کہ وہ شروع میں انگریزوں کے محرف تھے۔ وہ نوجوان بچے تھے تو انھوں نے جان برائٹ کو پارلیمنٹ کے اندر اور باہر سنا تھا۔ اُن تقریروں کی وسیع الخیال آزادہ روی کا، جو قومیت کے بندھنوں کی پروانہ کرتی تھیں، اُن پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ مدن موہن مالویہ نے نوجوانی کے عالم میں سوال کیا تھا۔ ''رائے دہندگی کے اداروں کے بغیر انگریز میں کیا رہ جاتا ہے۔ اور'' پھر خود ہی جواب دیا تھا۔'' پوچھنا کیا ہے، وہ سرے سے انگریز ہی نہیں رہ جاتا، ایک فریب اور ایک حقیر ادارہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اُن برطانوی کار پردازوں کی تشکیک میں کچھ حقیقت تھی جنھوں نے ہندوستان میں مغربی طریق تعلیم کے نفاذ میں خطرے کا احساس کیا تھا۔ مکالے کی مغربی تعلیم پائے ہوئے طلبہ اُس کے بعد آنے والوں سے یہ مطالبہ کر سکتے تھے کہ وہ اپنی روایتوں پر کاربند تو ہوں۔ برطانوی افسر جو ہندوستان پر حکومت کرتے تھے وہ لبرل (آزادخیال) یا ریڈیکل مصلح کلی نہیں تھے۔ لیکن ہندوستان کے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے ذہنوں میں برطانیہ کی تمام خوبیاں آزادخیال سیاست اور اصلاح پسندانہ اقتصادیات سے وابستہ تھیں۔ مغربی تعلیم پائے ہوئے ہندوستانیوں کا پہلا مطالبہ یہ ہوا کہ ملک کے نظم ونسق میں ان کا بھی حصہ ہو۔

سول سروس میں ہندوستانیوں کی بھرتی کے سوال پر 78-1877 میں ہندوستان میں پہلا منظّم اندولن ہوا اور بنگال کے زبردست خطیب، سریندر ناتھ بنرجی نے ملک بھر کا دورہ کر کے بڑے بڑے جلسوں میں یہ مطالبہ کیا کہ انڈین سول سروس (آئی سی ایس) میں بھرتی کے لیے ہندوستان اور انگلستان میں بیک وقت امتحانات لیے جائیں۔

متوسط طبقوں کو مذہبی اور سماجی اصلاح کی اُن تحریکوں نے بھی جھنجھوڑا جو ہندوستانی تاریخ کے زریں دور کے افسانے دہراتی تھیں۔ سوامی دیانند رام کرشن پرم ہنس اور سوامی وویکانند نے اس بات پر زور دے کر ہندوؤں میں بیداری کی لہر دوڑائی کہ اُن کی روحانی اور ثقافتی وراثت بڑی حد تک سیاسی طور سے اُس پامردی واعتمادنفس کی کمی کو پورا کرے گی جو بیرونی حکومت میں لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہے بیرونی لوگوں نے، جن میں آرکاٹ کی طرح کے تھیا سوفی بھی شامل تھے اور میکس ملر کی طرح کے عالم بھی، ہندوستانی فلسفے اور مذہب کے خزینوں سے فیض حاصل کر کے، دانش وروں میں اپنی عزت آپ کرنے کا جذبہ اُبھارا۔

بغاوت کے بعد نسلی علاحدگی اور حاکم قوم کا سرد جذبات کے ساتھ اپنے کو الگ تھلگ رکھنا حساس ہندوستانیوں کو ایک مسلسل ذلت معلوم ہوتا تھا۔ ایسے کئی مقدمات ہوئے جن میں یورپین کسی ہندوستانی قلی یا ملازم کے قتل کے الزام سے معمولی بہانوں پر بری کر دیتے گئے۔ عدالتیں یہ عذر آنکھ بند کر کے قبول کر لیتی تھیں کہ کالا مقتول بہت بدمزاج اور کینہ پرور تھا طبقات کی جی حضوری اور محکومانہ تابعداری کو جو حکومت کی فیاضی پر پھلتے پھولتے تھے۔ تحقیر اور مربیانہ برتری کے ملے جلے جذبات سے گوارا کیا جاتا تھا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال سنئے۔ 1868 میں حکومت ہند کے ایک باقاعدہ رزولیوشن کے ذریعہ یہ اجازت دی گئی کہ ''نیٹو'' شرفا یورپی فیشن کے بوٹ اور جوتے پہن کر اس مخصوص حلیے میں، درباروں اور اسی طرح کی تقریبوں کے موقع پر آسکتے ہیں اور جو ہندوستانی طرز کے جوتے پہنتے تھے انہیں یہ حکم ملا کہ رواجی حدود کے اندر وہ جوتے اُتار دیں۔ اسپرٹ بل کے ذریعے لارڈ رپن نے یہ کوشش کی تھی کہ عدالتی امور میں نسلی تفریق ختم کر دی جائے۔ اس بل کی یورپی حکام وتجارت کی طرف سے جو پرزور مخالت ہوئی اس سے ہندوستانی متوسط طبقے کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی کامیابی سے پتہ چل گیا کہ صرف منظّم اندولن کے سامنے ہی حکومت گھٹنے ٹیک سکتی تھی۔

ہندوستان میں جدید صنعتوں کے قیام سے قوم پروارانہ محرکات میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہوا۔ بمبئی میں کپڑے کا سب سے پہلا کارخانہ 1854 میں قائم ہوا پچاس برس کے اندر اندر ایسے کارخانوں کی تعداد دوسو تک پہنچ گئی۔ چوں کہ اپنے گھر(1) کی صنعت سے مقابلہ تھا اس لیے ہندوستانی صنعت کی طرف حکومت کا رویہ غیر ہمدردانہ تھا۔ 1882 میں کپاس کی درآمد پر سے ڈیوٹی ختم کر دی گئی۔ ہندی صنعت کاروں کو معلوم ہو گیا کہ اس کا فائدہ ہندوستانی صارفین کو نہیں بلکہ لنکا شائر اور مانچسٹر کے کپڑا بنانے والے کارخانوں کو پہنچے گا۔

تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس، جس نے ہندوستان سے برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ایک برطانوی ذہن کی پیداوار اور اُسی

(1) انگریزوں کی ہندوستانی حکومت بھی جب برطانیہ کی بات کرتی تو Home کا لفظ استعمال کرتی تھی۔ یہ اس کا لفظی ترجمہ ہے۔

کی قائم کردہ تھی۔ ایلن آکٹے وین ہیوم، سابق سکریٹری حکومت ہند، 1882 میں تیس برس کی ملازمت مکمل کر کے آئی سی ایس سے پنشن یاب ہوا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگرچہ انگلستان نے ہندوستان میں امن قائم کر دیا لیکن وہ ہندوستان کے اقتصادی مسائل حل نہیں کر پایا۔ اور حکومت اور عوام کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے اور یہ کہ ملک کے نظم میں نمائندہ ہندوستانی عنصر کا اضافہ کر کے صورت حال کو بدلنا چاہیے۔ اس کے نزدیک ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جو اُن طاقتوں کے مقابلے میں جنھیں ہمارے ہی اعمال وافعال نے ابھارا ہے ایک حفاظتی نکاس کا کام دے سکے۔ جب وہ وائسرائے ڈفرن سے ملا اور اُن کے سامنے اپنی یہ تجویز رکھی کہ سال میں ایک بار جلسہ کر کے سماجی مسائل پر بحث کی جائے تو وائسرائے نے کہا کہ اس بحث میں انتظامی امور بھی شامل رہیں۔ اپنی تجویز کی تائید حاصل کرنے کی غرض سے ہیوم ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں گیا، پھر انگلستان کا ایک عاجلانہ سفر کر کے ٹھیک اس وقت پلٹا جب مجوزہ کل ہند جلسہ سر پر آ پہنچا تھا۔ 28/دسمبر 1885 کو ہندوستان کے مختلف حصوں کے بہتر نمائندوں نے بمبئی میں کلکتے کے مشہور بیرسٹر ڈبلیو۔ سی بونرجی (بنرجی) کی صدارت میں جلسہ کیا۔ بونرجی نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستانیوں کی یہ خواہش کہ یورپ میں حکومت کے جو تصورات رائج ہیں انھیں کے مطابق ہندوستان میں بھی حکومت کا کاروبار چلے، کسی طرح بھی برطانوی حکومت کی مکمل وفاداری کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ 1885 میں پہلی تجویز کی پہلی تقریر میں ''خدا کی رحیمانہ مرضی'' کا ذکر تھا جس کی بدولت ہندوستان عظیم برطانوی طاقت کے زیر حکومت آیا تھا!

وفاداری کے جملوں کی گہری تہہ کو دیکھ کر زمانۂ حال کے نقادوں نے کانگریس کے دور اوّل کو ''سیاسی گداگری'' کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کرنا چاہا ہے۔ ابتدائی پچیس اجلاسوں میں سے پانچ کی صدارت یورپینوں نے کی 1892 میں سے ذمہ دارانہ طور پر لندن میں بھی ایک اجلاس کرنے کی تجویز کی گئی اگر ریمزے میکڈانلڈ کی بیوی وفات نہ پا گئی ہوتیں تو 1911 کے اجلاس کی صدارت انھوں نے کی ہوتی۔ کانگریس کی ان تجویزوں کو دیکھ کر جو سال بہ سال دہرائی جاتی تھیں آج یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''لفاظی کی مشق'' تھی لیکن اس زمانے کے برطانوی حاکموں کو اس خطابت میں بھی خطرے کا نشان دکھائی دیتا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سرکاری نقطہ نگاہ

مربیانہ فیاضی سے مشکل سے چھپنے والی مخالفت میں بدل گیا۔ لارڈ ڈفرن جنھوں نے 1885 میں کانگریس کے جنم کو خوش آمدید کہا تھا تین سال کے بعد اسے ایک خوردبینی[1] اقلیت'' کہہ کر اس کی اہمیت گھٹانا چاہا۔ 1890 میں حکومت کے حکام سے کہا گیا کہ وہ اس کے جلسوں میں شرکت نہ کریں۔ 1898 میں لارڈ الگن نے یونائیڈ سروس کلب شملہ کے ایک جلسے میں اعلان کیا۔''ہندوستان کو تلوار سے فتح کیا گیا ہے اور تلوار ہی سے اس پر حکومت کی جائے گی۔'' لارڈ الگن کے جانشین، لارڈ کرزن نے کوشش کی کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی کو اُس کا صحیح مقام دکھا دیا جائے اور 1900 میں انھوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا کہ'' کانگریس لڑکھڑا کر گرنے ہی والی ہے اور ہندوستان کے دورانِ قیام میں میری سب سے بڑی دلی تمنا یہ ہے کہ اس کی پُر امن موت میں مدد کروں۔''

مگر لارڈ کرزن کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ وہ ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اور انڈین نیشنل کانگریس میں ایک نئی روح پھونکیں۔ تقسیم ہند کی انتظامی خوبیاں کچھ ہی کیوں نہ رہی ہوں، لیکن بنگالیوں نے اس کا یہ مطلب نکالا کہ ان کے صوبے کی سالمیت پر حملہ ہے اور ایک بہت ہی پر جوش، تحریک اُبل پڑی۔ برطانوی چیزوں کے بائیکاٹ کا اندولن چل پڑا اور یورپینوں کے خلاف تشدد پسندی کے اکادکا واقعات بھی ہوئے۔

1905 کے بعد سے کانگریس کے معتدل اور انتہا پسند گروہوں میں باہمی رسہ کشی شروع ہوگئی۔ اسی سالہ دادا بھائی نوروجی کو انگلستان سے بلا کر اور 1906 میں ان سے کلکتہ کے سالانہ جلسے کی صدارت کرا کے کسی طرح پھوٹ کو روکا گیا۔ اگلے سال کانگریس کا اجلاس سورت میں تناؤ کے ماحول میں ہوا۔ ایک طرف اعتدال پسندوں کو یقین تھا کہ کانگریس کے اجلاس میں ان کی اکثریت ہوگی دوسری طرف انتہا پسندوں کو اس کا احساس تھا کہ ملک میں وہ ہر دل عزیز ہیں۔ اجلاس میں گڑبڑ ہوئی اور جلسہ ہلّڑ بازی پر ختم ہوگیا۔ سولہ سو مندوبین (ڈیلی گیٹوں) میں سے ایک ہزار معتدل مندوبوں نے پولیس کی حفاظت میں کانفرنس کی اور ایک آئین کی تشکیل کی جس میں اس عقیدے کا دوبارہ اظہار کیا گیا کہ'' آئینی طریقوں میں موجودہ طرز حکومت میں لگاتار اصلاح

(1) مائکروسکوپک اتنی چھوٹی کہ صرف خوردبین سے دیکھی جاسکے، خوردبینی

کی جائے۔ پہلے مرحلے میں انتہا پسندوں کی ہار ہوئی۔

ایک ہوشیار مبصر ویلنٹن چیرول نے لکھا ہے کہ ''1907 کے کانگریس سشن میں جو بھی ہوا وہ جو کچھ باہر ہو رہا تھا اُس کا دھندلا سا عکس ہے......سوراج کے نعرے نے دل موہ لیے ہیں اور اس کی گونج برطانوی ہند کے ہر صوبے میں سنائی دیتی ہے۔'' اس بے اطمینانی کا اظہار تشدد کے اُن اکادکا واقعات میں بھی ہوتا تھا جو برطانوی افسروں اور وفادار ہندوستانیوں کے خلاف رونما ہوتے تھے۔ ہندوستانی زبانوں کے اخبارات بالخصوص مہاراشٹر میں بال گنگا دھر تلک کا ''کیسری'' اور آروبندر گھوش کا ''بندے ماترم'' عوام کے جذبات کو بھڑکا رہے تھے۔ بدعملی پھیلانے والی سوسائٹیاں بڑھ رہی تھیں۔ بنگال میں جو سرکاری کمیٹی انقلابی تحریکوں کے پھیلے ہوئے اثرات کی تحقیقات کے لیے مقرر ہوئی تھی اس کا تبصرہ اس تحریک کے بارے میں یہ تھا۔ ''مفصل، مسلسل اور بے باک'' گاندھی کا قیام اُس وقت جنوبی افریقہ میں تھا اور وہ ہندوستانی سیاست کے ایک غیر جانبدار مبصر تھے۔ یہاں تشدد کی اٹھتی ہوئی لہروں کو دیکھ کر وہ اتنا گھبرائے کہ انھوں نے ہندوستان کے انتشار پھیلانے والوں کو از سرِ نو تعلیم دینے کے خیال سے اپنے اخبار ''انڈین اوپی نین'' میں مقالات کا ایک پورا سلسلہ سپردِ قلم کیا۔

اس اثناء میں حکومت اعتدال پسندوں کی رائے کو ہموار کرنے کے خیال سے آئینی اصلاحات کی بھوک اور تیز ہو جاتی۔ منٹو مارلے کے اصلاحات میں اسمبلیوں میں منتخب عنصر بڑھا دیا گیا لیکن اتنا نہیں کہ وہ وٹنگ میں سرکاری بلاک کو ہٹا سکے۔ لارڈ مورلے کے بقول حکومت کو اس کی بڑی فکر تھی کہ ''پارلیمانی حق رائے دہندگی کی پرچھائیں نہ پڑنے پائے......ہم کسی طرح کی پارلیمنٹ چاہتے ہی نہ تھے۔ ہم کاؤنسلیں چاہتے تھے اس سے بھی بدتر یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کے لیے فرقہ وارانہ انتخاب کا طریقہ رائج کیا گیا اور جمہوریت کے ارتقاء میں شروع ہی سے زہر گھول دیا گیا۔

اس صدی کی پہلی دہائی کی عام سیاسی ہلچل نے متوسط طبقے کے مسلمانوں کو بھی اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ ویلنٹن چیرول نے انڈین اَن اِسٹ (1910) میں لکھا ہے کہ ''اس کے پہلے کبھی بھی ہندوستانی مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اپنے مفادات اور عزائم کو برطانوی حکومت کے

استحکام اور استمرار نے اس طرح وابستہ نہیں کیا تھا۔لیکن مسلمانوں کا متوسط طبقہ اتنا پختہ مزاج نہیں تھا جتنا کہ چیرول نے اپنے آپ کو باور کرانا چاہا ہے۔ 1906 میں اپنے آغاز ہی سے مسلم لیگ مسلمانوں کی وفاداری کا اظہار اور ملازمتوں اور کونسلوں میں زیادہ نمائندگی حاصل کرنے کا ایک آلہ کار رہی ہے لیکن لیگ کی نوجوان نسل وفاداری کے اُس لبادے سے جو بزرگوں کی تھی جو پرانی نسل والوں نے اس بُری طرح اوڑھ رکھا تھا اُن میں ابتداء بے چینی کسی مقامی یا قومی شکایات سے نہیں بلکہ بیرون ملک ذرائع سے اُبھرنے والی تھی۔ 1857 کی بغاوت نے مسلمانوں کے متوسط طبقے کی شہنشاہی کے خواب پاش پاش کر دیے تھے اس لیے وہ اب مسلمان ملکوں کی طرف رہنمائی کے لیے نظریں جمائے تھے۔ مشرق وسطیٰ کے واقعات سے مسلمانوں کو بڑا دھچکا لگا۔ ایران کو برطانوی اور روسی دو منطقہ ہائے اثر میں بانٹ دیا گیا تھا۔ جنگ بلقان سے برطانیہ اگرچہ الگ رہا تھا مگر اس جنگ کے نتیجے میں ترکی سامراج سے اس کے کئی یورپی صوبے چھن گئے تھے۔ تاریخی اعتبار سے جنگ بلقان کو از کار رفتہ ترکی سامراج اور جنوبی مشرقی یورپ کی قوم پرورانہ طاقتوں کا باہمی نزاع سمجھنا چاہیے لیکن ہندوستانی مسلمانوں نے اسے اسلام اور عیسائیت کو مایوس کن جنگ سمجھا۔ اقبال اور شبلی جیسے شاعروں اور ابوالکلام آزاد اور محمد علی جیسے عالموں اور زعیموں نے مسلم متوسط طبقوں کو اُن خطرات سے آگاہ کرانا شروع کیا جو اسلامی دنیا کو گھیرے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی وفاداری کی آواز مدھم پڑنے لگی۔ 1913 میں مسلم لیگ کا مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہی نہیں رہ گیا بلکہ ایسی ''سلف گورنمنٹ کا حصول بن گیا جو ہندوستان کے لیے موزوں ہو، اسی سال ایک مسلمان (نواب سید محمد) نے انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت کی۔ انھوں نے اس پر اظہار خوشی کیا کہ لیگ نے اپنے مقاصد میں توسیع کر لی ہے اور یہ امید ظاہر کی کہ دونوں جماعتیں ملک کی بھلائی کے لیے مل جل کر کام کریں گے۔

1914 میں جنگ چھڑ جانے سے مسلم متوسط طبقے کے لیے ایک گومگو کی سی صورت پیدا ہو گئی۔ ایک مسلمان لیڈر کے لفظوں میں، الجھن یہ تھی کہ ''ہمارے خلیفہ کی حکومت (ترکی) نے ہمارے شہنشاہ معظم کی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ اس طرح مسلمان متوسط طبقے کا سیاسی احساس بیرونی واقعات سے شدید تر ہوا۔ ہندو متوسط طبقے کا سیاسی احساس اور حسیت

اندرون ملک حکومت کے افعال اور فروگزاشتوں سے متاثر تھی۔ بے چینی اور بے اطمینانی کے یہ دونوں دھارے 1916ء میں اُس وقت ملے جب 1916 میں نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے۔

1910 کے آغاز میں جب گاندھی نے ساحل بمبئی پر قدم رکھا تو ہندوستان کی سیاسی زندگی پر جزر کا عالم تھا۔ حکومت نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے ماتحت وسیع اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ کانگریس پر فیروز شاہ مہتا، واچا اور گوکھلے جیسے اعتدال پسندوں کا قبضہ تھا۔ مہاراشٹر اور کانگریس کے انتہا پسند گروہ کے عظیم لیڈر تلک، جو حال میں جیل سے رہا ہوئے تھے ابھی الگ تھلک رہنا چاہتے تھے۔ پنجاب کے آتش بیان مقرر لالہ لاجپت رائے ملک بدر تھے، آرویند وگھوش سیاست سے کنارہ کش ہو کر پانڈیچری چلے گئے تھے۔ ابوالکلام آزاد اور علی برادران جو برطانیہ کی ترک پالیسی کے نقاد تھے۔ چند ہی مہینوں میں قید خانوں کی سیر کرنے والے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی سیاست میں ایک رُکاؤ کی کیفیت پیدا ہونے والی تھی اور یہ رکاؤ اس حکومت کے لیے خوش آئند تھا جو جنگ کے مسائل میں الجھی پڑی تھی۔

باب 19

شاندار کنارہ کشی

جو ہندوستانی سیاست 1915 کے آغاز میں ایسی رکی رکی نظر آ رہی تھی اس میں ہوم رول تحریک کی بدولت نئی ہلچل پیدا ہونے والی تھی۔ اس تحریک کی بانی مسز اینی بیسنٹ تھیں جنھوں نے ہندوستان پبلک زندگی میں اپنے لیے بے مثال جگہ بنالی تھی۔ یہ تھیا سوفی تحریک کی لیڈر اور ملک میں اعلیٰ درجے کی ماہر تعلیم تھیں۔ انھوں نے اپنی شخصیت کو ہندوستان کی شخصیت میں محو کر دیا تھا۔ انھیں کے ایک بڑے ہم عصر اور دوست وی، سرینواس شاستری کے لفظوں میں ''ان کو یہ اعتقاد تھا کہ وہ ذہنی اور روحانی طور پر اسی ملک کی ہیں۔ یہاں کا مذہب، تہذیب اور فلسفہ ان کا اپنا ہے اور یہ کہ وہ مستقبل میں پھر اسی ملک میں جنم لیں گی تا کہ وہ یہاں کا کلچر سیکھ سکیں۔ اس فلسفے کی تبلیغ کر سکیں اور یہاں کے مذہب کا درس دے سکیں، ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ انھیں ہندوستانی سمجھا جائے اور ایک ہندوستانی ہی کی حیثیت سے وہ ہر گھر میں پہچانی جائیں۔''

پہلی عالمی جنگ کے چند ہی دن پہلے انھوں نے لندن کے ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان کی وفاداری کی قیمت ہندوستان کی آزادی ہے 1915 کے موسم بہار میں انھوں نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ وہ ایک سیاسی تحریک چلائیں گی انھوں نے دسمبر 1915 میں کانگریس کے سالانہ اجلاس سے اس تحریک کی تائید چاہی، کانگریس کے اعتدال پسندوں نے

مخالفت کی۔ لیکن اس مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھوں نے ستمبر 1916 میں ''ہوم رول لیگ'' کی بنیاد ڈالی۔

مسز بیسنٹ نے گاندھی کی تائید بھی حاصل کرنا چاہی تھی لیکن یہ انھیں نہ مل سکی گاندھی ایسی تحریک کے خلاف تھے جو جنگ کے دوران حکومت کو الجھن میں ڈالے۔ ان کا خیال تھا کہ آئینی اصلاحات کا وقت جنگ ختم ہونے کے بعد آئے گا۔ مسز بیسنٹ گاندھی کے اس عقیدے پر دل ہی دل میں مسکرائیں کہ جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کو حکومت خود اختیاری لازماً مل جائے گی۔ انھوں نے گاندھی سے کہا کہ برطانیہ تبھی ہندوستان کو آزادی دینے پر مجبور کیا جاسکتا ہے جب کہ ایک عالمی جنگ کے مطالبات اس کو ہر طرف سے پریشان کیے ہوں۔'' گاندھی نے جواب دیا ''مسز بیسنٹ آپ کو برٹش پر عدم اعتماد ہے مجھے نہیں، اور جنگ کے دوران میں میں ان کے خلاف کسی تحریک میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گا۔''(1)

آئینی طریقوں سے اور قانون کی حدوں میں رہتے ہوئے سلطنت برطانیہ کے اندر ہندوستان کی حکومت خود اختیاری کا مطالبہ جو کہ ہوم رول لیگ، کا مقصد تھا، بعد کی تاریخ کی روشنی میں ممکن ہے کہ پھسپھسا معلوم ہو، لیکن 17-1916 میں ہندوستانی سیاست پر اس ادارے کا اثر تیزی سے اور بہت زیادہ پڑا۔ تعلیم یافتہ طبقوں کے لیے اس تحریک میں اس وجہ سے دل کشی تھی کہ اس میں ان کے اپنے نو آغاز عزائم کا جواب موجود تھا اور جنگ نے جو ابال کی کیفیت پیدا کر دی تھی اس کے نکاس کا ایک راستہ تھا۔ مسز بیسنٹ کو پروپیگنڈے اور تنظیم کا جو ملکہ حاصل تھا اس کے باعث انھوں نے سیاسی بیرومیٹر کا پارہ چڑھا دیا جارج برنارڈ شا نے جوان کی نوجوانی کے شناساؤں میں تھے، ان کے بارے میں کہا تھا کہ وہ بیک وقت تین مردوں کی ذمہ داریاں سنبھال سکتی ہیں۔ زبردست تنظیم کار، شیوا بیان خطیب اور بے جھجک صاحب قلم ہونے کی وجہ سے انھوں نے تعلیم یافتہ طبقے کی سیاسی حسیت کو تیز کر دیا۔ ان کی پرزور صحافت کا اندازہ 1917 کے آغاز میں ''نیو انڈیا'' کے بعض اقتباسات سے ہوسکتا ہے۔

''ہندوستان کو اب تمھاری عنایت، تمھاری مراعات اور ان وعدوں کی ضرورت نہیں رہ گئی

(1) کانجی دوارکا داس: گاندھی تھرو ماتی ڈائری لیوز (ص:10)

جوتم کرتے رہے ہو، ہندوستان اپنے گھر کی مالکہ ہونا چاہتا ہے۔'' (2 فروری 1917)

جن لوگوں نے سلطنت کے لیے اپنا خون دیا ہے ان کو یہ قابل نفرت اور شرمناک سزا (یعنی کوڑے مارنا) دی جاتی ہے، اور یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ جو ہیرو کی طرح لڑتے ہیں انھیں غلاموں کی طرح کوڑے لگائے جائیں۔'' (20 مارچ، 1917)

''مطلق العنانی کا روس میں خاتمہ کردیا گیا، جرمنی میں یہ دم توڑ رہی ہے، یہ صرف انگلستان کے پرچم تلے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ (4 جون 1917)

حکومت ہند ہوم رول لیگ کی مقبولیت کا بڑھتی ہوئی بے چینی سے مشاہدہ کرتی رہی۔ 17 جنوری 1917 کے ایک نوٹ میں ہوم ممبر ریجینالڈ کریڈک نے لکھا ہے کہ جو لوگ اخبارات پڑھتے ہیں، ان کے دماغوں میں حکومت برطانیہ کے خلاف زہر بھرا جارہا ہے اور ہوم رول کی ترویج اتنی ایک آئینی اصلاح کے طور پر نہیں کی جارہی ہے جتنی ان بے شمار شکایات اور مظالم سے نجات کے طور پر جن سے آج ہندوستان کراہ رہا ہے۔ حکومت کے نقطۂ نگاہ سے اس کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ اسے عوام کی تائید حاصل ہے۔ ''صورت حال کافی مشکل ہے۔ زبان رکھنے والے طبقوں میں اعتدال پسند لیڈروں کو ذرا بھی حمایت نہیں ملتی اور یہ طبقے تلک اور بیسنٹ کے قدموں میں جا پڑے ہیں۔ اعتدال پسندوں میں جو بڑی شخصیتیں تھیں وہ چل بسیں اور اب تک ان کے جانشین پیدا نہیں ہوئے۔''

آگے چل کر، کریڈک نے مسز بیسنٹ کا یہ کہہ کر مذاق اڑانا چاہا ہے کہ ''وہ مغرور بڑھیا'' ہیں جن کے دل میں تحریکوں کی قیادت کا بے پناہ جذبہ ابل رہا ہے اور تلک کے بارے میں یہ گل افشانی کی کہ ان کی محرک ہر برطانوی چیز سے نفرت اور اس کے بارے میں ان کے دل کا زہر ہے۔'' اس کے باوجود ان دونوں سیاست دانوں نے حکومت کے لیے جو انتظامی اور آئینی مسائل کھڑے کردیے تھے کریڈک نے ان کی نزاکت گھٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ''ہندوستان میں باغیانہ خیالات کی مثال اس طوفان کی ہے جو ساحل کو کاٹتا جاتا ہو اور سمندر آگے گھستا چلا جارہا ہو۔ سب سے بڑا آخری طوفان 8-1907 میں آیا تھا وہ طوفان فرو ہو گیا لیکن اب یہ تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اب یہ اس اونچائی تک پہنچنے والا ہے جہاں اس کے پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ ہمیں ایک

باندھ بنالینا چاہیے ورنہ یہ اچھی زمین کو غرقاب کردے گا۔''

حکومت ہند کو اس تحریک کا کیسے مقابلہ کرنا چاہیے تھا؟ یکم فروری 1917 کے ایک نوٹ میں لکھا کہ اگرچہ مسز بیسنٹ، تلک اور ہوم لیگ تحریک کے دوسرے لیڈروں کے خلاف سرسری کارروائی کا حکم نافذ کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ان کے خلاف مناسب ثبوت مہیا ہوجائیں۔ پھر بھی ''موجودہ صورت حال یہ ہے کہ وہ حکومت خود اختیاری جسے ہم ہندوستان میں برطانوی حکومت کا آخری مقصد قرار دیتے اور جس کی سفارش کرتے ہیں اس میں اور اس ہوم رول میں جس کی مسز بیسنٹ اور تلک سفارش کرتے ہیں، کاغذ پر خط فاصل کھینچنا ناممکن ہے اگرچہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ دونوں پالیسیوں میں قطبین کا فاصلہ ہے۔ ان حالات میں میری تجویز یہ ہوگی اور ہمارے لیے صاف راستہ یہی ہے کہ قلیل ترین تاخیر کے ساتھ اپنی پالیسی کا اعلان کردیں اور ایک خیالی ہوم رول اسکیم کے مقابلے میں اپنی سنجیدہ اور علمی تجاویز رکھ دیں۔''

18 مئی 1917 کو لارڈ چیمسفورڈ نے سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام ایک تار میں اس بات پر زور دیا کہ آئینی اور انتظامی تبدیلیوں کا فوراً اعلان کیا جائے تا کہ ہندوستان میں ایک خطرناک بے چینی کے امکانات سے بچا جاسکے اور ''ان لوگوں کی حمایت حاصل کی جاسکے جو ذی اثر مگر بزدل اور غیر منظم ہیں اور اپنے خیالات کو مربوط اور واضح طور پر سامنے رکھنے سے قاصر ہیں اور دستور میں کسی اچانک اور شدید تبدیلی سے خائف بلکہ اس کے مخالف ہیں اور انتہا پسندانہ پروپیگنڈے کے مقابلے میں سرکاری اعانت کے خواہاں رہتے ہیں'' شہنشاہ معظم کی حکومت سے اس قسم کے اعلان کی خواہش کرتے ہیں وائسرائے کے ذہن میں کسی دوررس فوری تبدیلی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وائسرائے نے یہ بعد کے ٹیلی گرام مورخہ 11/جون میں واضح کردی۔ ''میری خیال میں جب ہم اپنی منزل کی تشریح کا فیصلہ کریں تو ہم اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا مقصد اس خیال سے آزاد اداروں کو فروغ دینا ہے کہ آخری منزل حکومت خود اختیاری حاصل ہوسکے۔ اگر ایسا اعلان کیا جائے تو اسی کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح واضح کردی جائے کہ یہ آخری منزل کافی دور ہے اور اگر کوئی اس فریب میں مبتلا ہے کہ یہ مقصد آج ہی یا مستقبل قریب میں قابل حصول ہے تو وہ نہ حکومت کا دوست ہے اور نہ خود ہندوستان کا۔''

اس طرح ہوم رول کا اندولن اگست 1917 کے اس مشہور اعلان کا محرک ہوا کہ شہنشاہ معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ نظم ونسق کے ہر شعبے سے ہندوستانیوں کی وابستگی میں روزافزوں اضافہ کیا جائے اور تدریجی طور پر خود اختیاری اداروں کو فروغ دیا جائے تاکہ سلطنت برطانیہ کے ایک جزو کی حیثیت سے ہندوستان ذمہ دار حکومت کے قیام کا مقصد منزل بمنزل حاصل کر سکے۔''

گاندھی جی نے نہ تو ہوم رول کے اندولن میں حصہ لیا تھا اور نہ اس صلح کی گفتگو میں جس کے نتیجے کے طور پر انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے درمیان معاہدۂ لکھنؤ ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ گاندھی بڑی حد تک ہندوستانی سیاست کے عام دھارے سے الگ تھلگ تھے۔ یہ گاندھی نہیں بلکہ تلک۔ بیسنٹ اتحاد تھا جو سارے ماحول پر چھایا ہوا تھا اور جو حکومت پر اثر انداز ہوا تھا۔ 1917 میں اِڈوِن مانٹیگو نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ اس وقت ہندوستان میں سب سے طاقتور شخصیت غالباً تلک کی ہے گاندھی کے بارے میں اس کا تصور یہ تھا کہ وہ ''ایک سماجی مصلح ہیں جن میں لوگوں کی تکالیف معلوم کرنے اور ان کو دور کرنے کی سچی خواہش ہے، ذاتی اشتہار کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ بنی نوع انسان کی حالت سدھارنا چاہتے ہیں، وہ ایک قلی کی طرح کا لباس پہنتے ہیں، ذاتی ترقیوں کے حصول سے کنارہ کش وہ تقریباً ہوا پر زندگی بسر کرتے ہیں اور خالص تخیل پرست ہیں۔''

گاندھی اس زمانے کی سیاست میں اس لیے زیادہ نمایاں نہیں ہوئے کہ انھوں نے ضبط نفس کر کے اپنے اوپر خود یہ قانون عاید کر لیا تھا کہ وہ جنگ کے دوران میں سیاسی اندولنوں میں کوئی حصہ نہیں لیں گے۔ اس کے علاوہ ایک سبب اور بھی تھا۔ ان کے خیالات اور طریق کار کا انڈین نیشنل کانگریس کے دونوں حاوی گروپوں سے تال میل نہیں تھا۔ گوکھلے نے جو اعتدال پسند لیڈر تھے اور جن کو گاندھی ہندوستانی سیاست میں اپنا استاد مانتے تھے گاندھی کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں انھوں نے کہا تھا کہ '' گاندھی کی ذات میں ہندوستانی انسانیت اپنے انتہائی نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ہے۔'' لیکن 1915 میں گوکھلے نے دیکھا کہ ان کے قریب ترین ساتھی بھی گاندھی کو سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں شامل کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ بہر حال گوکھلے گاندھی کے ہندوستان آنے کے فوراً بعد فوت ہو گئے، گاندھی کا گوکھلے کے اس

قدر قریب ہونا ایسا واقعہ نہ تھا جو گاندھی کو ان انتہا پسندوں میں ہر دل عزیز بنا سکتا جن کے دلوں میں ممکن ہے کہ جنوبی افریقہ کے اکتسابات کی قدر رہی ہے لیکن جو جنگ کے دوران برطانیہ کو الجھن میں نہ ڈالنے کی گاندھی کی حکمت عملی کی قدر کرنا تو درکنار، اس کو سمجھ بھی نہیں پاتے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح مسز بیسنٹ ہوم رول تحریک کے حق میں گاندھی کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ جب 1917 میں اوٹکامانڈ میں نظر بند ہوئیں تو ان کے بعض پیرو گاندھی سے ملے اور ان کو رہا کرانے میں گاندھی سے مدد کے طالب ہو گئے گاندھی کی یہ تجویز کہ سورضا کار بمبئی سے اوٹکامانڈ ایک ہزار میل کا سفر پا پیادہ کریں کچھ ایسی مضحکہ خیز حماقت نہیں تھی جیسی کہ ان انتہا پسند سیاست دانوں کو معلوم ہوئی۔ بالخصوص اگر ہم یہ بھی یاد رکھیں کہ گاندھی کی قیادت میں جنوبی افریقہ میں جو پیادہ مارچ ہوئے تھے ان کا وہاں کی رائے عامہ پر کتنا زبردست اثر پڑا تھا۔ لیکن اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں دونوں ہی کے لیے ان کے طریق کار کو سمجھنا کتنا مشکل تھا۔

جس طریق کار سے ہندوستانی سیاست پر گاندھی کے اثر کے نوعیت اور ساعت کا تعین ہونے والا تھا۔ اس کی تشکیل و تعمیر انھوں نے جنوبی افریقہ میں کی تھی ہندوستان اس ابتدائی زمانۂ قیام (18-1915) جب کہ وہ اپنا ہل اکیلے ہی چلا رہے تھے، ان کی شخصیت اور سیاست مستقل طور سے ان کے اپنے سانچے میں ڈھل چکی تھی۔ ہوم رول کی تحریک میں شامل نہ ہونے کا سبب انھوں نے اپنے دوستوں کو یہ بتایا کہ ''زندگی کے اس موڑ پر جب کہ بہت سے معاملات میں میری خود ایک مستحکم رائے قائم ہو چکی تھی میں کسی ادارے میں اسی نظر سے شامل ہو سکتا تھا کہ اس کی پالیسی پر اثر انداز رہوں، نہ اس لیے کہ خود ہی اس کے زیر اثر آجاؤں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کسی گوشے سے مجھے نئی روشنی ملے تو میں اسے کھلے ذہن سے قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں صرف اس بات پر زور دینا چاہتا تھا کہ یہ نئی روشنی ایسی ہی چکا چوند کرنے والی ہونا چاہیے کہ میں اس میں محو ہو سکوں۔''(1)

(1) گاندھی جی'' ص:215 میں مشمولہ جی۔ اے نیٹسن کا مضمون بعنوان ''یادیں'' یہ کتاب 1944 میں گاندھی کی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر چھپی۔

ستیہ گرہ سے زیادہ چکا چوند کرنے والی روشنی اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ ستیہ گرہ عدم تشدد پر مبنی عمل کا طریق کار تھا ار جس کی روشنی میں تقریباً ایک دہائی تک انھوں نے ذاتی اور پبلک دائرہ ہائے کار میں اپنی زندگی کے لیے راستہ بنایا تھا۔

گاندھی کا یہ عقیدہ تھا کہ انھوں نے ایسا موثر آلہ معلوم کرلیا ہے جس سے ناانصافی کی تلافی ہوسکتی ہے، غلطیاں درست کی جاسکتی ہیں اور تضادات دور کیے جاسکتے ہیں۔ اس کو دریافت کرنے اور جنوبی افریقہ میں ایک حد تک کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کے بعد، انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اس سے اپنے ان ہم وطنوں کو محروم نہیں رکھ سکتے تھے جو ان کے پاس مدد کے لیے آتے تھے۔ اگرچہ وہ دوران جنگ میں سیاست سے کنارہ کشی کا عہد کر چکے تھے لیکن ایسی سچی شکایات کے ازالے کے لیے دیر نہیں کی جاسکتی تھی اور یہ عہد ان کی راہ میں حائل نہیں ہوتا تھا۔

باب20

کسان اور مزدور

امداد کے لیے پہلی آواز ایسے گوشے سے اٹھی جس کا گاندھی کو وہم وگمان بھی نہ تھا۔ کافی دنوں سے بہار کے چمپارن ضلع میں زرعی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ تیل کے کارخانوں کے یورپی مالکوں اور ہندوستانی کسانوں کے تعلقات میں جو کھنچاؤ تھا اس کو نسلی عنصر نے اور بھی ہوا دی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کلکتہ منعقدہ دسمبر 1916 میں گاندھی بھی موجود تھے اور وہاں چمپارن کی بے چینی بھی زیر بحث آئی تھی۔ ان سے اس بحث میں حصہ لینے کو کہا گیا لیکن انھوں نے اس لیے انکار کر دیا کہ اس کے بارے میں انھیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ان کے لیے چمپارن کے ایک کسان راج کمار شکلا نے گاندھی سے درخواست کی کہ وہ چمپارن تشریف لائیں اور وہاں کی صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ شکلا بھی اپنی دھن کے پکے تھے۔ وہ ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک گاندھی کے پیچھے لگے رہے اور انھیں اپنے ساتھ چمپارن لا کر اُس مسئلہ کے روبرو لا کھڑا کیا جو تقریباً ایک صدی سے باغات کے مالکوں اور کسانوں کے تعلقات خراب کیے ہوئے تھا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں یورپین مالکوں نے نیل کے فارم اور کارخانے چمپارن ضلع میں قائم کیے تھے۔ بیتیہ راج نے، جو بہار کا سب سے بڑا زمیندار گھرانا تھا، ان کو اراضیات پٹے پر دی تھیں۔ ان میں سے بہتر آراضیاں ہل، بیل اور مقامی مزدوروں کے ذریعے جوتی بوئی جاتی تھیں

اوران مزدوروں کو کارخانے اس کام پر لگائے ہوئے تھے۔لیکن نیل کی کاشت زیادہ تر''تین کٹھیا'' طریقے پر کی جاتی تھی۔اس طریقے کے ماتحت کسان اپنی اراضی کا $\frac{3}{20}$ حصہ (جو علی العموم) بہترین حصہ ہوتا تھا کارخانے کی دیکھ ریکھ میں نیل کی کاشت کے لیے مخصوص کر دیتا تھا۔ کارخانہ ساری پیداوار کو مقررہ اور عام طور پر غیر منافع بخش قیمت پر خرید لیتا تھا۔اس یک طرفہ انتظام کو قانونی معاہدوں کا لبادہ اڑھا دیا جاتا تھا جس پر تہدید و ترغیب کے ذریعے کسانوں سے دستخط کرا لیے جاتے تھے۔کسانوں کی بے چینی 1867 کی طرح بعض اوقات ایک بے بس غصے کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔باغ مالکوں کا صوبائی حکومت اور حکام ضلع پر جو اثر و نفوذ تھا اور مقدمات میں جو تاخیر اور مصارف ہوتے تھے ان سب کے باعث کسانوں کو انصاف پانے کی امید نہیں رہ جاتی تھی۔

کسانوں کی درخواستوں سے اور گاہے گاہے کی تشدد سے جو بات حاصل نہ ہوسکی اسے جرمن صنعت نے موجودہ صدی کے آغاز میں کر دکھایا۔مصنوعی نیل نے فطری نیل کو بازار باہر کر دیا۔چمپارن ضلع میں نیل کی کاشت 97-1892 میں 91 ہزار ایکڑ سے گھٹ کر 1914 میں صرف آٹھ ہزار ایک سوا ایکڑ رہ گئی۔باغ مالکوں نے اب مجبوری کو ایک کار خیر بنالیا اور کسانوں کے پرانے معاہدے کے تحت نیل کی کاشت کرنے کی ذمہ داری اٹھالی، اور ایسا کرنے میں انھوں نے نیل کاشت نہ کرنے کا معاوضہ، یا خسارہ بھی لیا۔لگان بڑھ گئے عام طور سے ساٹھ فی صد کے قریب اضافہ ہوگیا۔لگان بڑھانے کے علاوہ باغ مالک کسانوں سے نقد وجنس کی شکل میں بہت سی غیر قانونی وصولیاں کرنے لگے۔ان سے ایسی نہروں سے پانی لینے کا ٹیکس لیا جاتا جن کا وجود بھی نہیں تھا۔باغ مالک ہاتھی، مکان یا کار خریدتا تو کسانوں کو اس میں بھی حصہ رسدی دینا پڑتا۔ قانونی طور سے جائز وراثت کو تسلیم کرنے کے لیے بھی انھیں موت ٹیکس دینا پڑتا۔ان میں سے بھی غیر قانونی رقمیں ہندوستانی زمیندار بھی وصول کیا کرتے تھے۔لیکن ہندوستانی زمینداروں کا حکام پر اس کا آدھا اثر بھی نہیں تھا جو یورپی باغ مالکوں کا تھا۔اس لیے زمیندار کسانوں کا خون کم چوس پاتے تھے۔ایسی بھی مثالیں تھیں کہ یورپی باغ مالکوں اور ان کے ایجنٹوں نے کسانوں کو برسر عدالت زدوکوب کیا۔

راج کمار شکلا نے چمپارن میں باغ مالک اور کسانوں کی باہمی نزاع کی بعض تفصیلات گاندھی کو بتادی تھیں۔ بہار میں آنے کے بعد گاندھی نے اتنا کچھ اور سنا کہ وہ معاملات کی بطور خود تفتیش پر آمادہ ہوگئے۔ وہ پٹنہ سے مظفر پور، اور مظفر پور سے موتیہاری گئے جو ضلع چمپارن کا صدر مقام تھا۔ وہاں انھیں ایک نوٹس ملا کہ ''سب سے پہلی ٹرین سے'' ضلع چھوڑ دیں کیوں کہ ان کی موجودگی سے نقصِ امن عامہ کا خطرہ تھا۔ انھوں نے نوٹس لینے سے انکار کر دیا۔ جس مجسٹریٹ کی عدالت میں 18 اپریل 1917 میں مقدمہ پیش ہوا اس سے کہا ''ایک قانون کا احترام کرنے والے شہری کی حیثیت سے، فطری طور سے میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آنا چاہیے تھا اور آیا بھی کہ صادر شدہ حکم پر عمل کروں۔ لیکن اگر میں ایسا کرتا ہوں تو ان لوگوں کے بارے میں اپنے احساس فرض کو مجروح کرتا جن کے لیے میں یہاں آیا تھا...... مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ اگر کوئی شخص پبلک زندگی میں میری سی اہمیت کا حامل ہو تو اسے مثال قائم کرنے میں بہت محتاط ہونا چاہیے...... اپنے اوپر صادر شدہ حکم کی خلاف ورزی میں نے اس لیے نہیں کی کہ قانونی منصب کی میرے دل میں عزت نہیں ہے بلکہ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ اپنی ہستی کے اس اعلاتر قانون کی پیروی میں کیا ہے جسے ضمیر کی آواز کہتے ہیں۔''

ترہت کمشنری کے کمشنر نے اعلیٰ حکام کے مشورہ کے بغیر ہی گاندھی کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے تھے۔ حکومت بہار نے بعد میں (23 رمئی 1917) حکومت ہند کو یہ وضاحت پیش کی کہ ''لفٹننٹ گورنر۔ اِن۔ کاونسل کا خیال ہے کہ کمشنر نے گاندھی کے بارے میں ایسا طریق کار کرنے اور مقامی حکومت کی منظوری کے ایسے قدم اٹھانے، دونوں ہی میں فیصلے کی شدید غلطی کی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اس منزل پر مسٹر گاندھی جیسے تجربہ کار شخص کو تحقیقات کرنے سے روکنا ناممکن تھا۔ کمشنر نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس سے تو جنتا کی دل چسپی اور بڑھے گی اور دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوگا کہ حکومت تحقیقات کا گلا گھونٹ دینا چاہتی ہے۔ اس لیے کمشنر ڈپٹی ڈسٹرکٹ افسر دونوں کو احکام جاری کیے گئے کہ وہ مقدمے کی مزید سماعت سے احتراز کریں اور مسٹر گاندھی کو ہر معقول سہولت فراہم کریں لیکن انھیں یہ متنبہ بھی کر دیں کہ رعیت (کسان) ایسی حالت میں ہے کہ کہ اسے آسانی سے بھڑکایا جاسکتا ہے۔''

اب گاندھی کسانوں کی شکایات کے بارے میں تحقیقات جاری رکھنے کے لیے آزاد تھے انھوں نے شہادتوں کی اچھی طرح چھان بین کی ہر گواہ کی اس طرح جرح کی کہ سچائی معلوم ہو سکے اور مبالغہ آمیزی سے روکا۔ ایک نوجوان برطانوی افسر ڈبلو۔ اے۔ لوئی، آئی سی ایس، حاکم پرگنہ بیتیہ نے ڈبلو۔ ایچ ہے کاک، ضلع مجسٹریٹ، چمپارن کو ایک خط (مورخہ 29، اپریل 1917) لکھا اس میں اس نے گاندھی کی مشغولیتوں کی ایک جیتی جاگتی اور ایماندارانہ تصویر کھینچی ہے۔

''مسٹر گاندھی یہاں اتوار کی صبح کو آئے اور دوشنبہ کی صبح کو مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے مجھ سے اپنی تحقیقات کا مقصد بیان کیا کہ وہ ان قطعی زیادتیوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں جو ان کے خیال میں رعیت (کسان) پر ہو رہی ہیں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ ان کے پاس مقامی مسائل پر کافی معلومات اکٹھا ہو چکی ہیں مسٹر گاندھی نے مجھ سے پرزور لفظوں میں یہ کہا کہ ان کی خواہش یہ ہے کہ تحقیقات غیر جانبدارانہ ہو۔

''بدھ کی سہ پہر کو میں سوار ہو کر ایک ایسے گاؤں میں پہنچا جہاں وہ معلومات یکجا کر رہے تھے جس وقت پوچھ تاچھ چل رہی تھی اس وقت میں تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاس بیٹھا بھی۔ ہر گواہ سے شدید جرح ہوتی تھی کیوں کہ مسٹر گاندھی طے کر چکے ہیں کہ وہ صرف ناقابل تردید حقائق یکجا کریں گے۔ مسٹر گاندھی کے ساتھ بابو برج کشور ہیں اور وہ بھی ان ہی خطوط پر کام کر رہے ہیں...... وہ بیانات کو قلم بند بھی کرتے جاتے ہیں۔

''مجھے آپ کے یہ احکام مل گئے ہیں کہ مسٹر گاندھی کو ہر سہولت دی جائے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ بابو برج کشور کو بھی یہ سہولتیں حاصل ہوں گی؟ نہ تو بابو برج کشور ابھی تک مجھ سے ملنے آئے ہیں اور انھوں نے یہ درخواست کی ہے کہ انھیں ملاقات کا موقع دیا جائے۔

''باغ مالک مسٹر گاندھی کو بالکل فطری طور سے اپنا فطری دشمن قرار دیتے ہیں۔ ان کارخانوں کو بھی ملا کر جن کے نظم و نسق کو ہم بہتر سمجھتے ہیں، کارخانوں کی بڑی اکثریت موجودہ صورت حال میں اقتصادی تفصیلات کی اس کڑی ناقدانہ تعلیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں جو اِس وقت کی جا رہی ہے۔ اور مسٹر گاندھی کو ناقابل تردید حقائق کا ایسا ذخیرہ ہاتھ لگے گا جس کی بنیاد پر وہ زبردست فردِ جرم عائد کر سکیں گے۔

''میں خاص طور سے اس اثر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو رعیت پر مسٹر گاندھی کی موجودگی سے پڑ رہا ہے۔ ہم مسٹر گاندھی کو عینیت پرست، کٹر پنتھی یا انقلابی جو کچھ بھی چاہیں اپنے خیالات کے مطابق کہہ لیں۔ لیکن رعیت کی نگاہوں میں وہ ان کے نجات دہندہ ہیں اور وہ انھیں فوق فطرت طاقت کا ایک مالک سمجھتی ہے۔ وہ دیہات دیہات جاتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں اپنی اپنی شکایتیں بیان کریں۔ وہ جاہل عوام کو جلد آنے والے عہد زرّیں کا خواب دکھا کر ان کے تصورات بدل رہے ہیں۔ میں نے مسٹر گاندھی کے سامنے اس خطرے کو بیان کیا تو وہ کہنے لگے کہ ان کے بیانات اتنے محتاط ہیں کہ ان سے کسی طرح بھی بغاوت کی تشویق نہیں مل سکتی۔ میں مسٹر گاندھی کی بات ماننے کو تیار ہوں کیوں کہ میرے خیال میں ان کا خلوص شک وشبہ سے بالا ہے۔ لیکن وہ اپنے تمام پیرووں کی زبانوں کو تو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔

''میں نے مسٹر گاندھی سے پوچھا کہ اگر یکا یک صورت حال مخدوش ہو جائے تو کیا وہ اس کی ذمہ داری قبول کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس کی ذمہ داری تو نہیں لے سکتے لیکن انھیں ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ صورت حال یکا یک بگڑ اٹھے گی۔ اس بات پر میں ان سے متفق نہیں ہوں............

مجھے مسٹر گاندھی کے بارے میں سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں ہے کہ انھیں ہر قسم کی سہولت دینے کا مجھے احکام ملے ہیں......

''میں نے مسٹر گاندھی سے پوچھا کہ وہ کسی مقامی افسر کی معیت میں رانچی جا کر وہاں حکومت کے سامنے اپنا منصوبہ رکھنے پر تیار ہوں گے۔ مسٹر گاندھی نے کہا کہ وہ تیار ہیں۔

''جن معاملات میں فوری دادرسی کی ضرورت ہے، اس کے حصول کے لیے مسٹر گاندھی کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ قربانی کے لیے بھی تیار ہیں۔ وہ اس وقت تک ضلع سے باہر نہیں جائیں گے جب تک کہ یہاں بڑی تبدیلیاں نہ لائی جائیں لیکن وہ اِن مسائل کو حل کرنے کی خاطر مناسب بات سننے کو بھی تیار نہیں۔''

گاندھی کی ضلع چمپارن میں موجودگی اور بہار کے نیل والے ضلعوں میں ستیہ گرہ تحریک کے چل پڑنے کے امکان سے حکومت ہند پریشان تھی۔ ہوم ممبر کریڈک کی تجویز پر وائسرائے نے

سر ایڈورڈ گیٹ گورنر بہار کو لکھا کہ ایک انکوائری کمیشن مقرر کی جائے اور اس میں ایک نشست مسٹر گاندھی کو بھی دی جائے۔ مسٹر ایڈورڈ نے شروع میں اس کی مخالفت کی۔ انھوں نے لارڈ چیمسفورڈ کو لکھا کہ: ''مسٹر گاندھی کو ٹالنے کی ایک ترکیب ضرور ہے لیکن یہ یقینی نہیں کہ کامیاب بھی ہوگی۔'' اس لیے ظاہر ہے کہ ''زرعی کمیٹی'' حکومت کے ایما پر بٹھائی گئی تھی نہ اس لیے کہ گورنر بہار 'اچھے' آدمی تھے اور یہی بات گاندھی نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھی ہے۔

آٹھ ہزار افراد کی گواہی لے چکنے کے بعد، زرعی مسئلہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہ گیا تھا جس سے گاندھی خود واقف نہ ہوں۔ واقف کار، بات منوانے کے گُر سے آشنا اور قوی عزم ہونے کی وجہ سے انھوں نے کسانوں کے حق میں ناقابل تردید مقدمہ تیار کیا تھا۔ کمیٹی نے مشترکہ طور پر یہ سفارش کی کہ اذیت رساں ''تین کٹھیا'' طریقے اور غیر قانونی طور پر کسانوں سے لیے جانے والے ٹیکسوں کو ختم کیا جائے جس کے بوجھ سے کسان کراہ رہے تھے۔ جو رقمیں کسانوں سے غیر قانونی طور پر وصول کر لی گئی تھیں ان میں سے 25 فی صدی کی واپسی کی بھی سفارش کی گئی۔ گاندھی کے بہت سے ساتھیوں کو تعجب ہوا کہ ''سو فی صدی واپسی کے لیے کیوں نہیں اڑے۔ گاندھی نے اپنے اوپر جو روک لگائی تھی اس کا سبب ڈاکٹر راجیندر پرشاد نے یہ بیان کیا ہے کہ ''مجھے یاد ہے کہ گاندھی جی نے ہمیں بتایا تھا کہ باغ مالک رعیت پر یہ سب لادنے میں صرف اپنی سطوت کی بدولت کامیاب ہوئے تھے۔ انھیں اضافے کا ایک حصہ ترک کرنا پڑا۔ اور وصول کی ہوئی رقم کا ایک حصہ نقد واپس کرنا پڑا، اس سے اگرچہ ان کی اس شان وسطوت کا پوری طرح خاتمہ نہیں ہوا۔ پھر بھی وہ بری طرح مجروح ضرور ہوگئی۔ (1)

ایک ایسی ہی جزوی تفصیل پر صلح کر لینے سے جس سے باغ مالک فوری طور پر خوش ہوگئے ہوں، یہ حقیقت بدل نہیں سکی کہ کسانوں کے سروں کے خوف کا جادو اتر گیا تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات کی بنا پر جو قانون نافذ کیا گیا اس سے بھی زیادہ یہ ذہنی تبدیلی تھی جس نے دس برس کے اندر باغ مالکوں کو ضلع سے باہر نکال دیا۔ گاندھی نے مصلحت شناسی سے کام لے کر جو ہتھیار ڈال

(1) ڈاکٹر راجیندر پرساد ''جب سے وہ چمپارن آئے۔ مشمولہ مولفہ، شکلا بمبئی، 1949، ص: 270

دیئے تھے اس میں دراصل ان کی موقع شناسانہ جیت چھپی ہوئی تھی۔

اس وقت ہوم رول کی تحریک پورے شباب پر تھی۔ اپنے رفقائے کار کو اس تحریک سے الگ رکھنے کے لیے گاندھی کو کوشش کرنا پڑی۔ یہ بات چھوڑ کر وہ جنگ کے زمانے میں حکومت کو کسی الجھن میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ فوری طور پر جو کام ہاتھ میں لیا گیا ہے اس پر پوری توجہ مرکوز ہونا چاہیے۔ انھوں نے چمپارن کے کام سے اشتہاری شہرت کو دور ہی رکھا۔ قومی لیڈروں اور اخباروں کو جو رپورٹیں بھیجتے تھے وہ برائے اشاعت نہیں بلکہ صرف بغرض اطلاع بھیجی جاتی تھیں۔ انھوں نے پوری کوشش کر کے مسئلے کو نسلی رنگ اختیار نہ کرنے دیا۔ جارج رینی گاندھی کے ساتھ تحقیقاتی کمیٹی کے ممبر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کہا تھا کہ ''گاندھی کو دیکھ کر مجھے سینٹ پال کی یاد آجاتی ہے۔'' یورپین افسروں اور باغ مالکوں کے خلاف اس تحریک کے زمانے میں ایک برطانوی پادری ہاچ نے اپنی یادداشتوں میں گاندھی اور ان کے گھر والوں سے اپنے خوشگوار تعلقات کا ذکر کیا ہے۔

تحقیقات کے دوران چمپارن کے کسانوں کے بارے میں اندرونی اطلاعات ملیں ان سے گاندھی کو یہ یقین ہو گیا کہ ان تمام مشکلات کی جڑ کسانوں کی جہالت ہے اور اسی لاعلمی کی بنا پر وہ چھوٹے موٹے مظالم کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے تعمیری کام کے سلسلے میں اپنا پہلا تجربہ چمپارن میں شروع کیا۔ اس تجربے میں ان کا ہاتھ بٹانے والے کستور بائی، دیوداس (ان کے سب سے چھوٹے لڑکے) اور دو گجراتی مہادیو دیسائی اور نرہری پارکھ، جو ان کے قافلے میں شامل ہو گئے تھے، اور ان کی بیویاں ''سرونٹس آف انڈیا سوسائیٹی'' کے ڈاکٹر دیو اور پروفیسر کرپلانی تھے۔ گاؤں میں وقتی طور پر بنائے گئے مٹی کے کانوں میں یا مقامی مخیّر حضرات کی عطا کردہ عمارتوں میں پرائمری اسکول کھولے گئے۔ استادوں کا خرچ گاؤں والے چلاتے تھے۔ نصاب میں ابتدائی لکھائی پڑھائی کے ساتھ صفائی اور حفظان صحت کے بنیادی اصول بھی تھے۔ شہری مسائل حل کرنے میں استاد دوسروں کے لیے نمونہ بن گئے۔ وہ گاؤں کی سڑکوں پر جھاڑو لگاتے اور گندے پانی کو صاف کرتے تھے۔ بدقسمتی سے جب گاندھی اور ان کے ساتھی چمپارن سے چلے گئے تو مقامی لوگ اس تحریک کو نہ چلا سکے۔

جس زمانے میں گاندھی بہار میں مشغول تھے اسی زمانے میں احمد آباد کی کپڑوں کی صنعت میں بھی بے چینی کی آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ اگست 1917 سے طاعون بونس کی اسکیم چل رہی تھی۔ اس اسکیم کے تحت بعض حالات میں مزدوری کے اسی فی صد تک کی رقم اس لیے بونس کے طور پر دی جا رہی تھی کہ طاعون کے زمانے میں مزدور شہر چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں۔ جب طاعون ختم ہو گیا تو مل مالکوں نے اس بونس کو بند کر دینا چاہا۔ مزدوروں نے اس اقدام کی مخالفت یہ کہہ کر کی کہ جنگ کے دوران رہن سہن کے اخراجات دُگنے ہو گئے ہیں اور قوت خرید میں جو کمی آ گئی ہے اس کو یہ بونس بس تھوڑی ہی حد تک پورا کرتا ہے۔ اس اندیشے سے کہ کہیں مل مالکوں اور مزدوروں میں جھگڑا نہ ہو جائے احمد آباد کے برطانوی کلکٹر نے گاندھی کو لکھا کہ وہ اپنے اثرات سے مل مالکوں اور مزدوروں کے درمیان مصالحت کرا دیں۔ بڑے مل مالکوں میں امبالال سارا بائی گاندھی خاندان کے دوست تھے۔ انھیں کے گمنام عطیے پر سابرمتی آشرم کو ان ابتدائی دنوں میں بچالیا تھا جب کہ ایک ہریجن کے داخلے پر ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ گاندھی نے مل مالکوں اور مزدوروں کے نمائندوں سے طویل گفتگو کی۔ اس پر طرفین اس بات پر رضا مند ہو گئے کہ ایک مشترکہ ثالثی بورڈ قائم کیا جائے جس میں تین نمائندے مل مالکوں کے اور تین مزدوروں کے ہوں اور کلکٹر اس کے چیئرمین ہوں۔ قبل اس کے ثالثی بورڈ اپنا کام شروع کرلے کہیں پر ایک ہڑتال ہو گئی اور اس کا فائدہ اٹھا کر مل مالکوں نے اعلان کر دیا کہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ انھوں نے ثالثی ماننے سے انکار کر دیا اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ جو مزدور بیس فی صد بونس لینا قبول نہیں کرے گا وہ برخاست کر دیا جائے گا۔

احمد آباد اور بمبئی میں کپڑے کی ملوں میں پیداوار کی لاگت اور اس کے منافع اور اخراجات زندگی اور بازار کی عام حالت سے متعلق سارے ضخیم مواد کا گاندھی نے بڑی سکون سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ 35 فیصدی اضافہ مناسب ہوگا۔ مزدور جو مزدوریوں میں پچاس فیصدی اضافے کی مانگ کر رہے تھے انھیں گاندھی نے کسی طرح 35 فیصدی پر آمادہ کر لیا لیکن کارخانہ دار بیس فیصدی سے زیادہ کی بات سننے ہی کو تیار نہیں تھے۔ کلکٹر نے گاندھی سے کہا تھا کہ کارخانہ داروں پر اپنے اثر کو کام میں لائیں لیکن جب مل مالکوں نے ثالثی کی بات ہی نامنظور کر دی تو گاندھی نے

مزدوروں کی طرف سے ان کی شکایتوں کے ازالے کے لیے کوشش کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔

جب مل مالکوں نے اپنے مزدوروں کے خلاف متحدہ اقدام کرنے کی دھمکی دی تو گاندھی نے یہ تبصرہ کیا کہ یہ چیونٹیوں کی یونین کے مقابلہ میں ہاتھیوں کی یونین ہوگی۔'' اب ستیہ گرہ کے ایک دوسرے تجربے کے طور پر انھوں نے مزدوروں کے حق میں لڑنے کا فیصلہ کیا۔ بنیادی سوال یہ تھا کہ احمد آباد کپڑا مزدوروں کی جائز مانگیں پُر امن اور اہنسا (عدم تشدد) پر مبنی ہڑتال کے ذریعے پوری کرائی جاسکتی ہیں۔ یہ مانگ گھٹا کر 35 فیصدی پہلے ہی کردی گئی تھی کیوں کہ گاندھی کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ مطالبہ کم سے کم ہے اور اس کو گھٹایا نہیں جاسکتا۔ ستیہ گرہ کے اصول پر جو ہڑتال کی جانے والی تھی اُسے عام ہڑتالوں سے مختلف ہونا ہی تھا۔ اب کے مزدوروں کے جذبات کو بھڑکا کر ان کی تاب استقامت کو نہیں بڑھانا تھا مل مالکوں یا ان کا ساتھ نہ دینے والے مزدوروں کے خلاف کسی طرح کا تشدد نہیں ہونا تھا۔ کسی قسم کی تلخی، شکایت سازی، مطالبات میں مبالغے یا گالی گلوج کے مقابلے کی گنجائش نہیں تھی۔ ہڑتالیوں کی جبری بے کاری کو کسی تعمیری کام میں صرف کرنا تھا، ایسے کام دھندے سیکھنا تھے جو موجودہ مزدوری کا بدل ہوسکیں۔ مزدوروں کے مکانوں کی مرمت کرنا تھی اور ان کی بستیوں کی سڑکوں کو صاف رکھنا تھا۔

اس قضیے کا یہ پہلو کچھ کم دل چسپ نہ تھا کہ امبالال سارابائی کی بہن آنسویا بہن ہڑتال کی تنظیم میں گاندھی کی سب سے اہم کرتا دھرتا تھیں۔ وہ روزانہ کئی گھنٹے مزدوروں کی جھونپڑیوں میں گزارتیں اور جن کو فاقہ کشی کا سامنا ہوتا ان کے لیے کام مہیا کرتیں۔ روزانہ سہ پہر کو ایک مقرر وقت پر سابرمتی ندی کے کنارے ایک ببول کے پیڑ کے نیچے سب مزدور گاندھی کو سننے کے لیے جمع ہوتے۔ ان جلسوں میں جہاں تقریروں کا موضوع اور مقررین کا لہجہ دونوں ہی سنجیدہ ہوتے پورے نظم وضبط کا مظاہرہ ہوتا۔ گالی گلوج ہی نہیں بلکہ مخالفوں کا مذاق اڑانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ایک خبرنامہ روزانہ جاری کیا جاتا جو گاندھی لکھتے اور انسویا بہن چھاپتی تھیں۔ گاندھی کا استدلال یہ تھا کہ مالک اور مزدور کے باہمی رشتے کی بنیاد ذاتی مفاد نہ ہونا چاہیے بلکہ باہمی عزت پر مبنی اُس جذبے کے ساتھ ہونا چاہیے جس کا اظہار رسکن نے ''اَن ٹوڈِس لاسٹ'' میں کیا ہے۔ مل مالک اس عینیت پسندی کے قائل نہیں تھے وہ اپنے خبرنامے خود چھاپتے اور اُن ''بیرونی عناصر''

کی تنقید کرتے جو مل مالکوں کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی ہمت کرتے تھے۔ [1]

جیسے جیسے ہڑتال چلتی گئی، گاندھی کی بے چینی بڑھتی گئی۔ مزدوروں کی تابِ استقامت کچھ دنوں کے بعد کمزور پڑنے لگی۔ ان میں سے اکثر کے لیے کام اور مزدوری کے بغیر زندہ رہنا ناممکن تھا۔ مٹھی بھر کے لوگوں کو چھوڑ کر متبادل کام کی فراہمی بھی قابل عمل نہ تھی۔ ہڑتال کو جاری رکھنے کے لیے باہر سے مالی مدد لینا بھی ستیہ گرہ کی روح کے خلاف تھا۔ مل مالک اُن لوگوں کو کام پر واپس لینے کو تیار تھے جو بیس فیصدی بونس لینے کو تیار ہوں۔ گاندھی کے ایک ساتھی نے ایک مزدور کا یہ جملہ کسی طرح سن لیا ''کچھ بھی ہو، گاندھی کا اور انسویا بہن کا تو کچھ بگڑنے والا نہیں۔ وہ کاروں میں چلتے ہیں اور ان کے پاس کھانے پینے کو کافی ہے۔'' جب گاندھی کو یہ جملہ سنایا گیا تو ان کا دل غصے سے نہیں بلکہ ذہنی اذیت سے پُر ہو گیا۔ اُس دن ببول کے نیچے ہونے والے جلسے میں حاضرین کی تعداد بھی کم تھی اور حاضرین کے چہروں پر جلی حرفوں میں لکھی ہوئی مایوسی پڑھی جا سکتی تھی۔ ظاہر تھا کہ ہڑتال مزدوروں کی تابِ مقاومت کا کڑا امتحان لے رہی تھی۔ اس موقع پر گاندھی نے برت رکھنے کے فیصلے کا اعلان کیا۔ انھوں نے اسٹرائک کے شروع ہی میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ اگر فاقہ کشی کی نوبت بھی آئی تو وہ سب سے پہلے فاقہ کریں گے برت کا مقصد مزدوروں کو ایک مرکز پر نئی توانائی کے ساتھ سمیٹنا تھا۔ لیکن اس کا اثر مل مالکوں پر بھی پڑنا لازمی تھا۔ ان میں سے بعض ان کی عزت کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مل مالکوں پر بے ارادہ مگر یقینی دباؤ پڑنے لگا۔ [2]

گاندھی نے یہ محسوس کر کے کہ ان کے فاقے سے ایک طرح کا دباؤ پڑ رہا تھا اور زبردستی غصہ شامل ہو رہا تھا، تین دن کے فاقے کے بعد ایک صلح کر لی جس کے نتیجے میں ہڑتالیوں کا عہد لفظاً تو نہیں لیکن حقیقتاً پورا ہو گیا۔ ہڑتالی اس وقت کام پر لوٹے جب ان سے وعدہ کیا گیا کہ انھیں پہلے دن مزدوری میں 35 فیصدی اضافہ، دوسرے دن 20 فیصدی اضافہ اور تیسرے دن سے جب تک ثالثی کا فیصلہ نہ ہو جائے 27 فیصدی اضافہ ملتا رہے گا۔ یہاں بھی ایک شاطرانہ ہار میں آخری فتح کے جراثیم موجود تھے بنیادی سوال جس پر بات چیت کا خاتمہ ہو گیا یہ تھا کہ مالکوں نے

(1)

(2) ڈیسائی، اِم ڈی: ایک دھرم یُدھ (ایک نیک جنگ) ص: 45

ثالثی اصول ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ سوال پر اب انھیں جھکنا پڑا تھا۔ ثالثوں کا فیصلہ مزدوروں کے حق میں ہوا آخرکار انھیں 35 فیصدی کا اضافہ مل ہی گیا۔

احمد آباد میں مل مالکوں اور مزدوروں کے تعلقات میں یہ ہڑتال ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ گلزاری لال نندا نے لکھا ہے کہ ''اس طرح ثالثی کے اصول اور طریق کار جنھوں نے آج کے ٹیک ٹائل لیبر ایسوسی ایشن کی تشکیل میں بڑا زبردست رول ادا کیا ہے، اس ملک میں پہلی بار رائج ہوئے۔'' دو سال کے بعد گاندھی نے مزدوروں کی پہلی منظّم جماعت کا افتتاح کیا جو پھل پھول کر احمد آباد ٹیکسٹائل لیبر ایسوسی ایشن، کی شکل میں نمودار ہوئی اور جس پر گاندھی کے تصورات کے مطابق مل مالک اور مزدور تعلقات کی چھاپ ہے۔ ایسوسی ایشن کے پاس اپنی لائبریریاں، ریڈنگ روم، اسکول، اسپتال، کھیل کود کے مرکز، بینک اور اخبار ہیں۔ اس طرح ایک صنعتی جھگڑے میں مداخلت کر کے گاندھی نے تعمیری کام کرنے کے لیے ایک بڑی عمارت کھڑی کر دی۔ اگرچہ دوسرے کاموں میں الجھے ہونے کی وجہ سے آنے والے دنوں میں وہ صنعتی تعلقات کے سدھارنے میں اپنا زیادہ وقت نہ دے سکے لیکن انھوں نے احمد آباد کے ٹیکسٹائل مزدوروں اور ان کے اسوسی ایشن کے معاملات سے دلچسپی لینا کبھی نہ چھوڑا۔ کیوں کہ انھیں وہ ہندوستان کی ٹریڈ یونین کے لیے بہترین نمونہ سمجھتے تھے۔

ابھی احمد آباد کے مزدوروں کا جھگڑا مشکل سے نپٹنے پایا تھا کہ گاندھی بمبئی پریسیڈنسی کے کھیڑا ضلع کے کسانوں اور مقامی حکام کے مابین لگان میں چھوٹ کے سوال پر جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور گاندھی کو اس میں بھی پھاندنا ہی پڑا۔ ضلع میں قحط کے سبب فصل ماری گئی تھی۔'' قانونِ مالگذاری'' کے تحت اگر فصل، معمولی پیداوار کے پچیس فیصدی سے کم ہو تو لگان میں پوری چھوٹ ملنی چاہیے تھی۔ لیکن اس مسئلے پر اختلاف رائے تھا کہ فصل کو واقعتاً کتنا نقصان ہوا تھا۔ سرونٹس آف انڈیا سوسائیٹی کے تین ممبروں نے موقع پر جا کر جانچ کی تھی اور اس وقت بمبئی لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن وی جے پٹیل اور گاندھی کے تخمینوں کے مطابق تین چوتھائی سے زیادہ فصل تباہ ہو چکی تھی۔ حکام یہ کہہ کر ان تخمینوں کی اہمیت گھٹانا چاہتے تھے کہ یہ تخمینے بیرونی عناصر کے لگائے ہوئے ہیں۔ کسانوں کی درخواستیں یہ کہہ کر لوٹائی جا رہی تھیں کہ باضابطہ وسیلوں سے نہیں آتی ہیں۔ ضلع افسروں

سے ملاقاتیں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئیں۔اور جب گورنر بمبئی سے ایک با اثر وفد ملا تو ان کا جواب یہ تھا کہ ان کے نزدیک ایک ایسے مسئلے میں مداخلت کا کوئی جواز نہیں ہے جو کھلے طور پر مقامی حکام کے حلقہ کار میں شامل ہے۔

گاندھی اس وقت گجرات سبھا کے صدر تھے اور اس سبھا نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ جب درخواستوں، ملاقاتوں اور اخباری بیانوں سے کسانوں کو کچھ بھی حاصل نہ ہوسکا تو تحریک خود بخود گاندھی کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ جنگ کے زمانے میں حکومت کو الجھن میں مبتلا کرنے میں انھیں تامل تھا لیکن انھیں حکام کی یہ ہٹ دھرمی دیکھ کر دھچکا سا لگا کہ وہ حالات کا سامنا کرنے اور دکھی کسانوں سے انسانیت کا برتاؤ کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔انھوں نے فصل کے نقصان کی جانچ کرنے کے لیے ایک کمیٹی کے تقرری کا مطالبہ کیا۔ یہ مانگ نامنظور کر دی گئی اور کمشنر نے یہ دھمکی دی کہ جو لوگ پورا لگان نہ ادا کریں گے ان کی زمینیں ضبط کر لی جائیں گی۔اس پر گاندھی نے کسانوں کو للکارا کہ ''ایسے انتقامی اور ظالمانہ جذبے کے خلاف جنگ کرنے میں وہ جان تک کی بازی لگادیں'' اور لگان دینے سے انکار کردیں۔انھوں نے اعلان کیا کہ جنگ کو ظلم اور ناانصافی کا بہانہ نہیں بنایا جاسکتا۔ان کی دلیل یہ تھی کہ کسان ناانصافی کا مقابلہ کر کے ایک بہت بڑا مسئلہ حل کردیں گے اور یہ دکھادیں گے کہ ''انسانوں پر ان کی مرضی کے خلاف حکومت نہیں کی جاسکتی۔''

سچ پوچھیے تو یہ پہلی زرعی ستیاگرہ تھی جو گاندھی نے ہندوستان میں چلائی۔بنیادی بات یہ تھی کہ کسانوں کے دلوں سے خوف دور کر دیا جائے، چاہے وہ حکام کا خوف ہو یا زمین اور املاک کی ضبطی کا خوف۔گاندھی اور ولبھ بھائی پٹیل نے کھیڑا کے گاؤں کا دورہ کیا۔عوام کو ستیہ گرہ کے اسرار وغوامض سمجھائے حکومت نے ٹیکس کی وصولی میں سختی برتنا شروع کی۔جن لوگوں نے دینے سے انکار کیا ان سے سختی کا برتاؤ کیا گیا۔ان کے مویشی اور گھر بار کا سامان چھین لیا گیا۔کھیتوں میں کھڑی فصلیں تک قرق کر لی گئیں۔کسانوں نے بڑی ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔لیکن ایسے ضلع پر جو قحط کے اثرات کے بعد اور طاعون اور گرانی سے پہلے ہی سے کراہ رہا تھا اس ظلم وتعدی کا اثر محسوس کیا جانے لگا۔گاندھی کو یہ احساس ہوا کہ کسان اب تھک کر چور ہو چکے ہیں اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ انھیں بالکل ہی برباد ہونے سے بچالیا جائے۔اسی وقت حکومت نے یہ احکام

جاری کیے کہ لگان صرف انھیں سے وصول کیا جائے جن میں دینے کی صلاحیت ہو۔ اور واقعتاً غریب کسانوں پر جبر نہ کیا جائے۔ یہ سن کر گاندھی نے محسوس کیا کہ اب عدم ادائیگی ٹیکس کی ستیا گرہ کے واپس لینے کا وقت آ گیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کو بات کی پچ رکھنے کا ایک طریقہ اور بڑی امیدوں سے شروع کی گئی تحریک کا ایک پھس پھسا خاتمہ سمجھا گیا ہو لیکن بالواسطہ طور سے اس کا قابل ذکر اثر پڑا۔ اس سے گاندھی کے وطن گجرات کے کسان جاگ اٹھے اور ان کو ولبھ بھائی پٹیل جیسا لیڈر مل گیا پٹیل نے احمد آباد کی عدالتوں میں وکالت چھوڑ دی اور بہت سی آنے والے اندولنوں میں گاندھی کے معتمد علیہ نائب بن گئے۔

ستیا گرہ کے ان ابتدائی تجربات کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنے کے لیے ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ اس وقت پہلی عالمی جنگ چل رہی تھی اور گاندھی حکومت کی توجہ ادھر سے ہٹانا نہیں چاہتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوا انھوں نے اپنے کو ٹکراؤ سے بچایا۔ چمپارن اور کھیڑا میں یہ ٹکراؤ بچایا تو نہ جا سکا لیکن انھوں نے کوشش کی کہ تحریکیں مقامی ہی رہیں اور ان کے ایسے حل ڈھونڈھے جن سے کسانوں کو تھوڑا بہت انصاف مل گیا اور کوئی قومی بحران پیدا نہیں ہونے پایا۔

جنگ کے بارے میں ان کا رویہ انھیں دوسرے نمایاں لیڈروں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی اس امید میں بہت ہی کم صاحب فہم لیڈر شریک تھے کہ اگر ہندوستانی برطانیہ کی جنگی کوششوں پورا پورا ساتھ دیں تو جنگ کے خاتمے پر انھیں حکومت خود اختیاری مل جائے گی۔

جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو گاندھی سمندری سفر پر تھے اور اپنے وطن لوٹ رہے تھے انھیں یہ بھی خیال تھا کہ وہ چند ہفتے انگلستان میں بھی گزاریں گے۔ 6 اگست 1914 کو انھوں نے انگریزوں کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اور فوراً ہی اپنے ہندوستانی دوستوں کا ایک جلسہ بلا کر اس میں ایک طبی دستہ قائم کرنے کی تجویز کی۔ وہ اس دلیل سے متاثر نہیں ہوئے کہ سلطنت کے بحران ہی میں ہندوستان کے لیے موقع ہے۔'' مجھے ایک ہندوستانی اور ایک انگریز کی حیثیتوں کا فرق معلوم تھا لیکن مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ ہماری حالت غلاموں کی سی سمجھی جاتی ہے۔ میں اس وقت یہ محسوس کرتا تھا کہ اس میں برطانوی نظام سے کہیں بی زیادہ انفرادی افسروں کا قصور ہے۔ اور میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ محبت سے ان کا رویہ بدلا جا سکتا ہے۔ اگر ہم برٹش کی مدد اور تعاون سے اپنی

حیثیت بہتر کرنا چاہتے ہیں تو ان کی مصیبت کے وقت ان کے کام آ کر ان کی مدد حاصل کرنا ہمارا فرض ہوتا ہے۔''(1)

اگر ان پر پلورسی کا زبردست حملہ نہ ہو گیا ہوتا تو وہ شائد اس طبی دستے میں کام کرتے ہی رہتے جو انھوں نے قائم کیا تھا اور ہندوستان میں ان کی آمد غیر معین مدت کے لیے ٹل گئی ہوتی۔

جب وہ ہندوستان پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ یہاں کے قوم پروروں کی رائے جنگی کوششوں میں غیر مشروط امداد کی مخالف ہے۔ صرف وہ لوگ جو سیاسی اعتبار سے پسماندہ تھے یا جو سرکاری عنایات پر پلتے تھے وہی ہر قیمت پر وفاداری کے قائل تھے۔ گاندھی کسی قسم کی قیمت لے کر تعاون کی پیش کش کر کے حکومت سے سودا چکانے کے حق میں نہیں تھے۔ اور نومبر 1917 میں انھوں نے گجرات پولیٹکل کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات کہ ایک مشکل کے وقت ہم وفادار رہے ہیں سوراج کے لیے ہماری اہلیت کا امتحان نہیں ہے۔ وفاداری کوئی خوبی نہیں ہے۔ یہ دنیا بھر میں ایک شہری ضرورت ہے۔(2)

1918 کے آغاز میں جنگی حالات اتحادیوں کے حق میں خراب ہو رہے تھے۔ یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ جرمن مغربی محاذ پر شدید حملہ کریں گے۔ وائسرائے نے ہندوستانی رائے عامہ کے نمائندہ لیڈروں کو دہلی میں ہونے والی جنگی کانفرنس میں مدعو کیا۔ کئی قوم پرور لیڈر جن میں تلک، جناح اور کھپارڈے شامل تھے اس لیے نہیں بلائے گئے کہ انھوں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ کن شرائط پر حکومت سے تعاون کرنا چاہیے۔ ہندوستان میں سیاسی رائے ایسے وعدوں کی شدت سے مخالف ہو گئی تھی۔ جس کی پشت پناہی آئینی مرعات سے نہ ہوتی ہو۔'' اتحادیوں کے بارے میں یہ افواہ بھی گرم تھی کہ انھوں نے کوئی خفیہ صلح کر رکھی ہے۔ اگر چہ وہ زبان سے کچھ اور کہہ رہے ہیں۔ گاندھی کے دل میں پہلا خیال تو یہی آیا کہ وہ اس کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیں لیکن انھیں اس کی شرکت پر آمادہ کر لیا گیا۔ بھرتی کے بارے میں جو رزولیوشن پیش کیا گیا تھا اس کی تائید میں انھوں نے ہندی کا صرف ایک جملہ کہا ''اپنی ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ میں اس تجویز کی موافقت کرتا ہوں۔''

---

(1) گاندھی / سوانح عمری، ص: 425

(2) نیٹسن: اسپیچز اینڈ رائٹنگ آف مہاتما گاندھی، ص: 409

جنگی کانفرنس کے بعد انھوں نے اپنے ضمیر کی تسکین کے لیے وائسرائے کو ایک خط لکھا اور اس میں قوم پرستوں کی شکایتیں گنائیں۔ دلی کے دوران قیام میں انھوں نے ہوم ممبر سر ولیم وِنسنٹ سے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی رہائی کا مطالبہ بھی کیا۔ سر ولیم ونسنٹ نے ان سے پوچھا کہ اس مسئلے سے اور جنگ سے کیا تعلق ہے۔ گاندھی نے جواب دیا کہ ''اس سے بھرتی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' سر ولیم نے جواب میں کہا ''شاید۔ لیکن خود آپ نے جنگی کوششوں کی مدد کرنے کے سلسلے میں کیا کیا ہے؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ نے مقامی ارباب حکومت کو پریشان کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا ہے۔'' یہ ایک بے رحمانہ چوٹ تھی لیکن یہ گاندھی کے ضمیر میں چبھ گئی۔ جنگی کانفرنس میں ایک تیرہ لفظی سنجیدہ تقریر نے اُن پر ایک ذمہ داری عاید کر دی تھی جسے وہ اب پورا کرنا چاہتے تھے۔

وہ بھرتی کی تحریک میں دل و جان سے لگ گئے۔ یہ بات مضحکہ خیز تھی کہ اہنسا کا یہ پجاری، اس لیے گجرات کے گاؤں کا دورہ کر رہا تھا کہ وہاں سے برطانیہ کی ہندوستانی فوج کے لیے رنگروٹ بھرتی کرے تا کہ وہ یورپ اور مشرق وسطیٰ کے محاذوں پر جا کر جنگ میں شریک ہوں۔ وہ کھیڑا ضلع میں پہنچے جہاں کچھ دنوں پہلے عدم ادائیگی ٹیکس کی تحریک چلا رہے تھے۔ انھیں معلوم ہوا کہ کسانوں کو قید خانے جانے والوں کی قطار میں کھڑے ہونے پر آمادہ کرنا آسان تھا لیکن بھرتی کی قطار میں نہیں۔ گاندھی اور ہم راہی ولبھ بھائی پٹیل کو بہت جلد یہ پتہ چل گیا کہ ابھی حال میں وہ اس خطۂ زمین کے ہیرو ضرور تھے لیکن اب نہیں رہ گئے۔ اُس گاؤں میں جو حکومت کا مقابلہ کرنے میں پیش پیش تھا کوئی ان سے ملنے بھی نہیں آیا۔ وہ تین دن تک گاؤں کی سرحد پر پڑے رہے اور اپنے ہاتھ سے اپنا کھانا پکاتے رہے۔

برطانوی افسران یہ دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرائے ہوں گے کہ عدمِ ادائیگی ٹیکس کے سابق لیڈر بھرتی کے سارجنٹ بن گئے ہیں لیکن انھیں بہت جلد ہی یہ پتہ چل گیا کہ وہ میٹھے قسم کے وفادار نہیں تھے۔ ایک مقامی جنگی کانفرنس میں علاقے کے کمشنر بھی موجود تھے۔ وہاں گاندھی نے کہا کہ ''ہندوستان میں برطانوی حکومت نے جو بہت سے برے کام کیے ہیں ان میں سے تاریخ اس قانون کو سیاہ ترین قرار دے گی جس کے تحت ایک پوری قوم کو ہتھیاروں سے محروم کر دیا گیا

ہے۔'' انھوں نے لارڈ ولنگڈن گورنر بمبئی کو قانون اسلحہ کی منسوخی کے لیے لکھا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گورنر نے ان عظیم خدمات کے لیے گاندھی کو تہ دل سے شکریہ ادا کیا جو وہ انتھک طور پر بھرتی کی تحریک چلا کر سلطنت کے حق میں انجام دے رہے ہیں۔''

اکثر ایسا ہوتا کہ بیل گاڑی وغیرہ نہ ملنے کی وجہ سے گاندھی اور ان کے ساتھی بیس بیس میل پیدل چلتے۔ اس کا بوجھ ان کے لیے ناقابل برداشت ہوا۔ اور بالآخر انھیں پیچش ہوگئی اور وہ صاحب فراش ہوگئے۔ چوں کہ وہ دواؤں کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے اس لیے انھوں نے برت رکھنا شروع کیا، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ انجکشن کے لیے وہ تیار نہ ہوئے۔ انھوں نے بعد میں بتایا کہ اس کا سبب انجکشن کے بارے میں ان کی لاعلمی مضحکہ خیز تھی۔ ان کے دوست امبالال سارابائی انھیں احمد آباد اپنے قصر نما مکان میں لے گئے۔ لیکن وہ ڈاکٹری علاج کے لیے تیار نہ ہوئے اور صرف تیمارداری سے صحت عود نہ کرسکی۔ ایک دن وہ بہت تیز بخار میں مبتلا تھے۔ اس حالت میں انھوں نے یہ اصرار کرنا شروع کیا کہ انھیں سابرمتی آشرم میں منتقل کردیا جائے۔ ڈاکٹر راجندر پرساد دوسرے دن انھیں دیکھنے گئے تو وہ جسمانی طور پر بہت دبلے اور روحانی طور پر وقت آخر کی آمد پر تیار نظر آئے۔ گاندھی نے اس موقع پر متاسفانہ طور پر کہا کہ ان کی ساری زندگی کچھ اس طرح بیتی کہ انھوں نے کام ہاتھ میں لیے اور ادھورا چھوڑ دیا اور اب وہ دنیا ہی سے جارہے تھے۔ بہرحال اگر خدا کی مرضی یونہی ہے، تو کیا کیا جاسکتا ہے۔

گاندھی کو یہ یقین تھا کہ وہ موت کے دروازے پر پہنچ چکے ہیں۔ وہ گیتا کا پاتھ کرنے لگے اور سابرمتی آشرم میں رہنے والوں کو طلب کیا۔ وہ سب کے سب خاموشی سے حاضر ہوگئے۔ انھوں نے کہا کہ ''ہندوستان کو میرا آخری پیغام یہ ہے کہ اس کی نجات کا ذریعہ صرف اہنسا (عدم تشدد) ہوگا اور عدم تشدد کے ذریعہ ہندوستان دنیا کی نجات میں مدد دے گا۔''

ابھی وہ سخت تکلیف میں بستر پر پڑے اپنے جسم کو دھیرے دھیرے گھلتے دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک برف کا ڈاکٹر نمودار ہوا۔ گاندھی نے اس کو برف کے ذریعے علاج کی اجازت دے دی۔ اس سے ان میں تازہ طاقت اور امید آگئی اور زندہ رہنے کی خواہش بھی پلٹ آئی۔ اس کی ایک علامت تو یہ تھی کہ کستور با کے کہنے پر وہ بکری کا دودھ پینے پر راضی ہوگئے۔ کستور با نے انھیں یہ کہہ

کر رضا مند کیا کہ کئی سال پہلے انھوں نے دودھ نہ پینے کا جو عہد کیا تھا اس کا تعلق گائے کے دودھ سے تھا۔ بہر حال یہ لفظی ہیرا پھیری تھی اور اس پر آپ بیتی میں بڑی صاف گوئی سے تبصرہ کیا ہے۔ زندہ رہنے کی خواہش سچ سے وفاداری پر غالب آئی۔''

گاندھی کو زندہ رہنے کا سب سے زیادہ حوصلہ حکومت ہند نے دیا۔ راولٹ کمیٹی رپورٹ اور راولٹ ایکٹ کی اشاعت نے ان کی روح کو جھنجھوڑ دیا۔ انھوں نے کہا کہ ''اگر میں اچھا ہوتا تو میں ہندوستان کو بیدار کرنے کے لیے سارے ملک کا دورہ کرتا'' دوست ان کے پاس مشورہ کرنے آتے ملک اس نئے قانون کے خلاف کیسے جنگ کرے جس کے ذریعے شہری آزادی پر حملہ کیا گیا تھا؟ جس وقت گاندھی ان مسائل پر غور کرتے تو انھیں یاد آتا کہ انھیں نے کس طرح مشکل وقت میں برطانیہ کی مدد اس امید پر کی تھی کہ جنگ کے خاتمے کے بعد کوئی شایان شان پیش قدمی ہو گی۔ انھوں نے بھر پور کوشش کی تھی کہ جنگ کے زمانے میں وہ سیاسی شورشوں سے اپنے کو الگ رکھیں۔ اب ان کا ضمیر انھیں آواز دے رہا تھا کہ زمانۂ امن میں جو زیادتی کی جا رہی ہے اس کے خلاف وہ جنگ کریں۔ اس آواز کو وہ دبا نہ سکتے تھے۔

باب 21

امرتسر کا سایہ

راولٹ بل نامی مسودہ ہائے قانون کی خبر سن کر گاندھی بیماری کے بستر سے اُٹھ پڑے۔ یہ مسودے راولٹ کمیٹی کی سفارش پر مبنی تھے۔ اس کمیٹی نے سیاسی تشدد کو روکنے کی تدبیروں کے بارے میں سفارش کی تھی۔ ایک مسودۂ قانون میں یہ انتظام کیا گیا تھا کہ مقدموں کی سماعت خاص عدالتوں میں خفیہ طور پر ہو اور اپیل کا حق نہ رہے۔ اگر کسی کے جرم کرنے کا احتمال بھی ہو تو اس سے ضمانت طلب کر لی جائے اور شبہ پر بھی لوگوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ دوسرے بل کے ذریعے فوجداری قانون میں ایسی مستقل تبدیلیاں کی جانے والی تھیں جن کی رو سے باغیانہ تحریر کا پاس رکھنا بھی دو برس کی قید سخت کا موجب قرار دیا گیا تھا۔

گاندھی سے بڑھ کر سیاسی تشدد کا کوئی بھی مخالف نہیں رہا تھا۔ دس سال پہلے، جب کہ راولٹ بلوں کا تصور بھی ذہنوں میں نہ تھا، اُنھوں نے ''ہند سوراج'' میں اخلاقی اور عملی دونوں طرح کی انقلابی سرگرمیوں کی مخالفت کی تھی۔ انھوں نے ستیہ گرہ (قوتِ روحانی) کو بم اور پستول کا برتر اور موثر تر متبادل قرار دیا تھا۔ چوں کہ وہ تشدد کے خلاف تھے اِس لیے اُن کا کہنا تھا کہ تشدد کے واقعات تو دو چار ہی جگہ رونما ہوتے ہیں پھر ایسے ہمہ گیر اور سخت قوانین بنانا کیسے درست ہو سکتا ہے جو ہندوستان بھر پر نافذ ہو سکیں۔ وہ اس کے بھی خلاف تھے کہ ایسی انتظامیہ کو جو ابھی تک عوام کے

سامنے جواب دہ نہیں تھی اتنے وسیع اختیارات دے دیے جائیں۔

لیکن راولٹ بل سب سے پہلا ظالمانہ قانون نہیں تھا۔ فوجداری کا ترمیمی قانون، 1908 پریس ایکٹ 1910 اور ڈِفنس آف انڈیا قانون 1915 پہلے ہی نافذ ہو چکے تھے۔ موخرالذکر قانون تو 1919 تک برابر جاری رہا۔ حکومت کے دوست بھی یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ نئے قانون کے بدیہی محرکات کیا ہیں؟ اس کے علاوہ راولٹ بل سے زیادہ کوئی چیز بے موقع و بے محل نہیں ہوسکتی تھی۔ ہندوستان کی رائے عامہ اس انتظار میں تھی کہ جنگ کے بعد کوئی قابل ذکر پیش قدمی ہوگی نہ یہ کہ اُلٹے رہی سہی شہری آزادی کے بھی پر کتر دیے جائیں گے۔ دلی کی جنگی کانفرنس کے بعد گاندھی نے 1918 میں لار''ڈ چمیس فورڈ'' کو لکھا تھا ''یہ ہمارا متبرک عہد اس امید پر مبنی ہے کہ مستقبل بہتر ہوگا۔ جنگ کے دوران میں وہ برابر یہی دلیل پیش کرتے رہے کہ جنگ ختم ہونے پر برطانیہ ہندوستان کے ساتھ مناسب برتاؤ کرے گا۔ اس معاملے میں وہ ہندوستان کے قوم پرست لیڈروں میں عموماً تنہا ہوتے تھے۔ اینی بیسنٹ اور تلک نے انھیں آگاہ کر دیا تھا کہ اس راہ میں انھیں مایوسی کا سامنا ہوگا اور جب تک انگریزوں پر کوئی زبردست دباؤ نہیں پڑتا وہ طاقت چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

راولٹ بل کی مخالفت کے سلسلے میں ہندوستانی لیڈر غیر معمولی طور پر متحد الخیال تھے۔ جناح نے کہا تھا کہ جو حکومت زمانۂ امن میں اس طرح کے قوانین بنائے اُسے مہذب حکومت کہے جانے کا حق سلب ہوجاتا ہے۔ سپرو نے کہا تھا کہ ''یہ قوانین اصولاً غلط بروئے کار لائے جانے میں ناقص اور بے جا حد تک وسیع ہیں۔ اور وی، جی پٹیل نے کہا تھا کہ ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ بل پاس ہوگئے تو ہماری ہر طرح کی آئینی تحریک بے موت مرجائے گی۔''

اس تحریک کے خلاف حکومت ہند کا ردّ عمل وہی ہوا جو اس کی خصلت بن چکا تھا۔ اُس نے تحریک کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا اور اِسے ہندوستانی سیاست دانوں کے عوامی ہسٹریا سے تعبیر کیا۔ اس کا اصرار تھا کہ انارکسٹوں (نراجیوں) سے نپٹنے کے لیے جو نظر نہ آنے والے اور بے باک دشمن ہیں۔ ضلع افسروں کو خصوصی اختیارات دینا بالکل لازمی ہے۔ لووٹ وائسرائے کاونسل کے ممبر تھے انھوں نے ہندوستانی لیڈروں پر زور دیا کہ تشدد کے مقابلے کے لیے اقدامات کیے

جانے کا بندوبست کرنے میں انھیں عوام کی رہنمائی کرنا چاہیے نہ کہ اُن کا اتباع۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حکومت، برطانیہ میں مقیم مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے قدامت پرست نکتہ چینوں کو یہ یقین دلانا چاہتی تھی کہ چند آئینی مراعات دی جارہی تھیں اُن کے باوجود برٹش راج کمزور نہیں ہوا تھا۔ مارچ 1919 میں حکومت ہند نے یہ قانون نامناسب عجلت کے ساتھ امپریل لیجسلیٹو کاونسل سے پاس کرالیا۔ شاذ ہی ایسا ہوا ہوگا کہ کاونسل کی نشست آٹھ گھنٹے سے زیادہ ہوئی ہو لیکن راولٹ بل پر مباحثہ گیارہ بجے صبح سے شروع ہوا اور آدھی رات کے بعد بھی چلتا رہا۔ صرف لنچ اور ڈنر کے لیے بیچ میں تھوڑا التوا ہوا تھا۔ جتنے بھی منتخب ہندوستانی لیڈر تھے سب نے اس بل کی مخالفت میں ووٹ دیا۔ پھر بھی یہ قانون تو بن ہی گیا۔ پہلے روالٹ بل کے پاس ہونے پر گاندھی کی آنکھیں کھلیں۔ وہ امپریل لیجسلیٹو کاونسل میں مباحثہ سن رہے تھے اور یہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستانی نمائندوں کی منطقی اور موثر تقریروں کا سرکاری پنچوں کے بیٹھنے والوں پر ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا اور یہ ساری منطق اور زور بیان ضائع ہو رہا تھا، انھوں نے بعد میں لکھا کہ ''آپ کسی کو بھی جگا سکتے ہیں بشرط یہ کہ وہ سو رہا ہو لیکن اگر وہ سونے کا بہانہ کیے ہوئے ہے تو آپ کچھ بھی کر ڈالیں اُس پر ذرا بھی اثر نہیں ہونے کا۔'' انھیں اس کا یقین ہوگیا کہ ''گریٹ سول سروس کارپوریشن'' اور برطانیہ کے تجارتی حلقوں نے حکومت ہند کو ایسا بنا دیا ہے کہ اُس پر عوامی جذبات کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی حکومت کو رائے عامہ کا واقعی پاس ہوتا تو وہ ایسا قانون کبھی نہ بناتی جس کے خلاف ہندوستانی رائے عامہ کا ہر طبقہ خیال تھا۔ اور وہ حکومت جو آئینی اصلاحات کا ایک معقول قانون نافذ کرنے کی سوچ رہی ہو، حکومت خود اختیاری کی ایک قسط کی اس سے بڑی تمہید پیش نہیں کرسکتی تھی۔

راوَلٹ بل کی آئینی مخالفت کے بے سود ثابت ہوجانے کے بعد گاندھی نے محسوس کیا کہ راولٹ ایکٹ کی منسوخی کے لیے ستیہ گرہ کا حربہ اختیار کرنا چاہیے۔ فروری 1919 میں وہ پہلے ہی راولٹ بل کی مخالفت کے ایک عہد نامہ کا مسودہ تیار کر کے اُسے لوگوں میں تقسیم بھی کر چکے تھے۔ اگر یہ بل قانون بن گئے تو جب تک یہ واپس نہ لے لیے جائیں ہم آئینی طریقوں سے اِن قوانین اور ایسے دوسرے قوانین کی نافرمانی کریں گے جن کو اس کے بعد مقرر ہونے والی کمیٹی مناسب سمجھ

کر بنائے گی۔ ہم یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ اس جدوجہد میں ہم ایمانداری سے سچ کی پیروی کریں گے اور جان، مال اور ذات کے خلاف تشدد سے پرہیز کریں گے۔

حکومت راولٹ بل کو رجسٹر قوانین میں درج کر چکی تھی۔ اس لیے اگرچہ گاندھی پچھلی بیماری سے پوری طرح سنبھل نہیں پائے تھے لیکن وہ مقابلے کو نکل پڑے۔ انھوں نے ملک بھر کا دورہ اس خیال سے کیا کہ وہ عوام کو عہد نامہ ستیہ گرہ کے رموز و عواقب بتائیں۔ انھوں نے ستیہ گرہ سبھا کے نام سے ایک جماعت بھی بنائی۔ ایک روز صبح کو مدراس میں جاگے تو انھوں نے اپنے میزبان راج گوپال اچاریہ سے کہا کہ جب وہ خواب اور بیداری کے درمیانی دھندلکے کے عالم میں تھے تو انھیں اچانک یہ خیال آیا کہ ملک سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ ایک دن ہڑتال منائے۔ تمام کاروبار بند ہو جائے اور لوگ اس نفرت انگیز قانون کے خلاف برت رکھیں اور دعا کریں۔ پہلے 26 مارچ کی تاریخ ہڑتال کے لیے مقرر کی گئی لیکن بعد میں اِسے بدل کے 6/اپریل کر دیا گیا۔ ہندوستان کے لیے اظہارِ غم یا احتجاج کے طور پر ہڑتال کرنے کا خیال نیا نہیں تھا لیکن ایک دن کی ملک گیر ہڑتال یقیناً ایک ماہرانہ وار تھا۔ بمبئی میں کاوبار بند کرنے کی علاوہ حکومت کی جانب سے ضبط شدہ کتابیں بیچ کے سول نافرمانی کی ابتدا بھی کی گئی۔ ان کتابوں میں گاندھی کی ''ہندسوراج'' اور سرودے بھی شامل تھیں۔ جن پر یہ الزام لگا کر ضبط کیا جا چکا تھا کہ ان میں باغیانہ مواد ہے۔ 7 اپریل کو گاندھی کی ادارت میں ''ستیاگرہ'' نامی ایک خبرنامہ پریس ایکٹ کی خلاف ورزی میں چھاپا اور شائع کیا گیا۔

ایک غلط فہمی کی بنا پر دلّی میں 6/اپریل کی بجائے 30 مارچ ہی کو ہڑتال کر دی گئی اور اس میں کچھ فساد بھی ہو گیا۔ گاندھی نے فوراً جمِ غفیر کی زیادہ تیوں کی بھی مذمت کی اور اُن مقامی افسران کی زیادتیوں کی بھی جنھوں نے (ان کے الفاظ میں) ایک مکھی کو مارنے کے لیے بڑا ہتھوڑا استعمال کیا تھا۔ پنجاب میں تناؤ بڑھ رہا تھا اور مقامی لیڈروں کا خیال تھا کہ اس موقع پر گاندھی کی موجودگی سے وہاں امن و امان قائم رکھنے میں مدد ملے گی۔ لیکن حکومت نے گاندھی کو پنجاب پہنچنے نہیں دیا۔ دلی جاتے وقت انھیں بیچ کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اُتار لیا گیا اور ایک دوسرے ٹرین میں بٹھا کر بمبئی روانہ کر دیا گیا اور وہاں پہنچنے کے بعد انھیں رہا کر دیا گیا۔ اگر انھیں یہ پتہ نہ چلتا کہ اُن کی عدم موجودگی میں جو بمبئی، احمد آباد، ناڈیڑ اور اُن کے صوبے کے دوسرے مقامات پر

فسادات ہوگئے تو وہ دوبارہ دلّی ضرور جاتے۔ انھیں یہ خیال نہ تھا کہ خود ان کا صوبہ اہنسا کی تعلیمات بھلا دے گا۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انھوں نے تشدد کی چھپی ہوئی طاقتوں کا اندازہ لگانے میں کوتاہی کی تھی۔ انھوں نے اپنا بڑھتا ہوا قدم پیچھے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ دوبارہ گرفتاری کا ارادہ ترک کر بیٹھے اور انھوں نے ستیہ گرہ کو محدود کرنے اور بالآخر ملتوی کردینے کا فیصلہ کیا۔ اس بات کا اطمینان کیے بغیر کہ لوگ صحیح طور پر ایک عوامی تحریک کے لیے تیار ہیں یا نہیں گاندھی نے تحریک شروع کردی تھی بعد میں اندازہ ہوا کہ غلطی کی تھی جب اس غلطی کا احساس کیا تو اس کے کفارے کے طور پر تین دن کا برت رکھا۔

اس دوران میں پنجاب میں حالات کا رخ ایک الم ناک انتہا کی طرف مڑ چکا تھا۔ پنجاب میں کئی طرح کی بے اطمینانیوں کے اندر اندر بہنے والے دھارے بیک وقت چل رہے تھے۔ یہاں سے تقریباً پانچ لاکھ رنگ روٹ پہلی جنگ عظیم میں بھرتی ہوئے تھے۔ انفلوئنزا کی وبا کے سلسلے میں کافی اتلاف جان ہوا تھا اور پنجاب کو اس کے عواقب بھگتنا پڑے تھے۔ ہندوستان کی دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی اشیاء زندگی کی گرانی کی مصیبت جھیلنا پڑی تھی۔ یہاں کی مسلم اکثریت ان اسلامی خیالات سے بھی ذہنی طور پر متاثر تھی۔ اگرچہ گاندھی یہاں کبھی آئے نہیں تھے لیکن ان کا نام اس صوبے میں ایک طرح کا جادو جگادیتا تھا۔ دلّی کے قریب اُن کر گرفتاری سے یہاں کے لوگوں میں ہیجان پیدا ہوا، 10 / اپریل کو امرتسر میں دو مقامی لیڈروں کی گرفتاری کے بعد ایک مجمع مشتعل ہوگیا اور اُس نے ٹاؤن ہال اور ڈاک خانے کو جلا دیا۔ ٹیلی گراف کے تار کاٹ دیے اور چند یورپیوں کو جن میں دو عورتیں بھی شامل تھیں زخمی کیا۔ بریگیڈیر جنرل ڈائر کی سرکردگی میں فوج بلاکر شہر کے اندر امن قائم کیا گیا۔ اگلے دو دنوں تک شہر میں سکون رہا لیکن 13 اپریل کو بیساکھی کے تیوہار کے موقع پر جلیان والا باغ میں ایک جلسہ ہوا اس جگہ قیامت کا منظر دیکھنے میں آیا۔ ڈائر نے فیصلہ کیا کہ مجمع منتشر کردیا جائے۔ داخلہ ہونے کا راستہ اتنا تنگ تھا کہ مسلح گاڑیاں اندر نہیں جاسکتی تھیں۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ مارچ کرتا ہوا باغ میں داخل ہوا۔ فوج نے دس منٹ میں 1650 راؤنڈ گولیاں چلائیں۔ چھٹی کے دن کا مجمع جس میں غیر مسلح مرد عورتیں اور بچے بھی تھے، دیواروں سے گھرے ہوئے باغ سے بھاگ نہ پایا اور چوہے دان میں پھنسے چوہوں کی طرح

پھنس گیا حکومت پنجاب کا تخمینہ یہ تھا کہ 379 آدمی مارے گئے، لیکن ہنٹر کمیٹی کے ایک رکن سر چمن لال سیتل واد نے تخمینہ لگایا کہ چار سو مارے گئے اور 1200 زخمی ہوئے۔[1]

بعد میں ڈائر نے اس بات کی تشریح کی کہ اُس کا مقصد ایک مضبوط اقدام سے ''اخلاقی اثر'' پیدا کرنا تھا۔ وہ جس حکومت کو بچانے کے دعوے کر رہا تھا اُس پر اِس سے زبردست وار وہ کر نہیں سکتا تھا۔ ہند 7 برطانیہ تعلقات کے سلسلے میں امرتسر ایک اہم موڑ بن گیا۔ تقریباً ویسا ہی اہم موڑ جیسے کہ غدر[2] امرتسر کے المیے کو ایک الگ تھلگ واقعہ نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ اس ''غدر کے ذہنی واہمے'' کی ایک علامت تھا جس میں ہندوستان کے انگریز وقتاً فوقتاً مبتلا ہو جایا کرتے تھے۔ حکومت پنجاب کے جس کا سربراہ سر مائیکل اوڈوائر تھا۔ خود کو یہ باور کرا لیا تھا کہ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش دور دور تک پھیل چکی ہے۔ سازش کے اس نظریے کی کوئی بنیاد نہ تھی۔ یہ اُس خفیہ مراسلت سے ثابت ہو جاتا ہے جو ام۔ ال۔ رابرٹسن انسپکٹر جنرل پولیس بمبئی اور حکومت ہند کے انٹیلی جنس بیورو کے ڈاکٹر سرسی، آر، کلیولینڈ کے درمیان ہوئی۔ اور یہ دو اشخاص وہ ہیں جنھیں حکومت کے نقطۂ نظر سے یہاں کے سیاسی حالات سے سب سے زیادہ آگاہ ہونا چاہیے تھا۔ 19 مئی 1919 کو رابرٹسن نے لکھا۔ ''کیا آپ کو کسی منظّم سازش کا کوئی بھی پتہ نشان ملا ہے؟ ہمیں احمد آباد میں ایسا کوئی پتہ نہیں ملتا؟۔''

کلیولینڈ نے 23 مئی کو جواب دیا۔ ابھی تک پنجاب میں کسی منظّم سازش کا پتہ نہیں لگ پایا ہے۔ منظّم شورش ضرور ہوئی اور خاص مقامات پر لوگ پاگل ہو گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ ''ٹائمز آف انڈیا'' اور ''پائنیر'' ہندوستان کی بے چینی کے لیے بالشوزم اور مصری تحریک کے نظریے پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ میں مطمئن ہوں کہ اس نظریے کی تائید میں کوئی قابل ذکر ثبوت موجود نہیں ہے۔ مجھے غلط تشخیص پر افسوس ہوتا ہے کیوں کہ اس طرح علاج بھی تیر تکا ہی قسم کا ہو سکتا ہے۔

سر مائیکل اوڈوائر کی کتاب ''پنجاب میری نظر میں''

میں ایک باب ہے 1919 کی پنجابی بغاوت اس میں وہ برطانوی راج کا تختہ پلٹنے کے

---

(1) سیتا واد: یادیں اور تأثرات، ص: 307

(2) ٹامسن اور ریٹ (ہندوستان میں برطانوی راج کا عروج تکمیل)، ص: 609

لیے ہندو انتہا پسندوں، پان اسلامی عقیدہ والوں اور سکھ انقلاب پسندوں کے ایک متبرک اتحاد کا ذکر کرتا ہے۔ 10 اپریل کو صورت اتنی ہی نازک سمجھی گئی تھی کہ یورپین عورتوں اور بچوں کو گورنگر کی جائے قیام پر اکٹھا کر لیا گیا تھا۔ 13 / اپریل کو جلیان والا باغ میں جنرل ڈائر کے گولی چلانے کے حکم سے پہلے ہی سر مائیکل نے شملہ میں ایک وائرلیس پیغام بھیج کر امرتسر اور لاہور کے ضلعوں میں مارشل لا نافذ کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ وہ اپنے بیان واقعات میں یہ بتانا چاہتا ہے کہ ایک غیر مسلح مجمع نے ایک ہزار سے بھی زیادہ فوجیوں کو جو کہ امرتسر میں جنرل ڈائر کی قیادت میں تھے گھیر کر الگ کر لیا تھا! جنرل ڈائر نے ڈویژنل کمانڈر جنرل بائی نن کو جو اپنی پہلی رپورٹ بھیجی اس میں بھی یہی لکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس فوج کم ہے اور ہچکچاہٹ کرنے میں اس کا خوف تھا کہ خود ہم پر حملہ نہ ہو جائے۔ ''میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس فوج کم ہے اور ہچکچاہٹ کرنے میں اس کا خوف تھا کہ خود ہم پر حملہ نہ ہو جائے۔'' گویا جنرل ڈائر کو اپنے فوجیوں کو گولی چلانے کا حکم حفاظت خود اختیاری کے طور پر دینا پڑا!

1919 کے موسم بہار اور شروعِ گرما میں پنجاب میں جو المناک واقعات رونما ہوئے ان کے سمجھنے کی کنجی وہی ''غدر کا ذہنی واہمہ'' تھا جس میں اس وقت حکام اور بالخصوص یورپی طبقہ مبتلا تھا۔ اس زمانے میں بہت سے فوجی اور سول افسروں نے ہندوستانیوں خاص کر پڑھے لکھے اور سیاسی طور پر بیدار طبقے پر ناقابل ذکر ذلتیں اور سخت سے سخت سزائیں وارد کیں۔ اس ظالمانہ دور حکومت کی تفصیلات میں جانا غیر ضروری ہے۔ ان میں سب سے بدنام واقعہ یہ ہے کہ ڈائر نے ہندوستانیوں کو اُس سڑک پر پیٹ کے بل چلوایا جہاں ایک یورپین عورت پر حملہ ہوا تھا۔ اگر کوئی یورپین سڑک سے گزرتا تو ہندوستانیوں سے کہا جاتا کہ وہ سواریوں سے نیچے اتر کر اس یورپین کو سلام کریں۔ کئی دیہاتوں پر مسلح گاڑیوں پر لگی مشین گنوں اور ہوائی جہازوں سے حملہ کیا گیا۔ ہندوستانی مالکوں کی کاریں فوجی کام کے لیے طلب کر لی گئیں۔ لاہور کالجوں کے تقریباً ایک ہزار طالب علموں کو کرنل جانسن نے حکم دیا کہ وہ مئی کی چلچلاتی دھوپ میں تین ہفتے تک دن میں چار بار سولہ میل روزانہ مارچ کریں اور وہاں حاضری لگوائیں۔ ایک کالج کی دیوار پر چسپاں نوٹس نُچی پائی گئی تو کالج کی چار دیواری کے اندر کے ہر مرد کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس میں پروفیسر بھی شامل تھے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ فوجی افسر یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ تاریخ کے ایک نازک مرحلے پر برطانی سلطنت کا ایک قلعہ مضبوطی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ان میں سے کئی ایک اُسی زمانے میں مشرق وسطیٰ یا یورپی جنگی محاذوں سے واپس ہوئے تھے اور ادھورا کام کرنے کے قابل نہ تھے۔رابندر ناتھ ٹیگور نے ،جنھوں نے سر کا خطاب پنجاب کے واقعات پر احتجاجاً واپس کر دیا تھا۔سارے فساد کے جڑ کو خوب ہی تشخیص کی تھی۔''جلیان والا باغ میں جو کچھ ہوا وہ ایک انسانیت سوز جنگ کی انسانیت سوز اولاد ہے۔''

حکومت نے جان بوجھ کر پنجاب کے المیے پر نقاب ڈال دی۔گاندھی نے 18 اپریل کو سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لی تھی۔وہ پنجاب جانے کے لیے بے چین تھے۔حکومت سے ٹکراؤ بچانا چاہتے تھے۔اس لیے انھوں نے صوبے میں داخل ہونے کے لیے وائسرائے سے رسمی اجازت مانگی۔یہ اجازت انھیں چھ مہینے تک نہیں مل پائی۔سی،اِف،اینڈریوز نے اس صوبے کے اضطراب انگیز حالات لکھ بھیجے حکومت نے لارڈ ہنٹر کی قیادت میں ایک کمیٹی مقرر کی تاکہ پنجاب کے فسادات کی ماہیت معلوم کی جائے۔انڈین نیشنل کانگریس نے ہنٹر کمیٹی کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور نمایاں قانون دانوں پر مشتمل ایک غیر سرکاری کمیٹی مقرر کی۔اس میں موتی لال نہرو،سی آرداس ،عباس طیب جی، ام، آر جیکر اور گاندھی شامل تھے۔اسی غیر سرکاری کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے انھیں پنجاب کے مارشل لا کی حقیقت معلوم ہوئی۔انھیں مظالم کے دل ہلا دینے والی مثالیں ملیں جو ناقابل انکار شہادتوں پر مبنی تھیں۔ایسی شہادتیں جن کی چھان بین خود گاندھی نے کی تھی۔برطانوی سلطنت کی وہ ذہنی تصویر کہ یہ ایک رحم دلانہ نظامِ مشیت ہے اور جس کو وہ عزیز رکھتے تھے، زمین پر گر کر چور چور ہوگئی۔پھر بھی وہ اپنے دل کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ پنجاب کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے اُس کے ذمہ دار کچھ سر پھرے افسر ہیں۔اور جب سچ ظاہر ہوگا تو حکومت اس کی تلافی کرے گی۔

24 ردسمبر 1919 کو شاہ جارج پنجم نے ایک اعلانِ عام کے ذریعے قانون اصلاحات ہند کو اپنی منظوری دی اور تمام سیاسی قیدیوں کے چھوڑے جانے کے احکام۔بادشاہ نے حکام اور عوام کو ایک دوسرے سے تعاون کا پیغام دیا۔گاندھی نے لکھا کہ ''یہ ایسی دستاویز ہے جس پر

برطانوی عوام بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں اور جس سے ہر ہندوستانی کو مطمئن ہوجانا چاہیے۔ اس اعلان عام سے عدم اعتماد کی جگہ اعتماد نے لے لی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کا نفوذ سول سروس کی سطح تک بھی پہنچتا ہے یا نہیں۔'' اُس کے فوراً بعد ہی امرتسر میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا اور گاندھی نے اپنا اثر استعمال کر کے آئینی اصلاحات پر عمل کرنے کی موافقت میں فضا ہموار کر لی۔ انھوں نے ملک سے اپیل کی کہ وہ خاموشی سے کام میں لگ جائے تا کہ نیا آئین کامیاب ہو سکے۔ لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ کانگریس کی سبجکٹس کمیٹی پنجاب میں عوام کی طرف سے ہوئی زیادتیوں کی مذمت کرنے میں ہچکچا رہی ہے تو وہ کمیٹی سے تقریباً واک آؤٹ کر کے باہر چلے آئے۔ انھوں نے کہا کہ ''میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ حکومت کی طرف سے زبردست اشتعال انگیزی ہوئی تھی، لیکن ہمارے عوام بھی پاگل ہو گئے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ پاگل پن کا جواب پاگل پن سے نہ دو بلکہ پاگل پن کا جواب سمجھ داری سے دو۔ اور پھر ساری صورت حال تمھارے موافق ہو جائے گی۔

گاندھی نے جس بات کو 19 دسمبر 1919 کے شاہی اعلان کی روح سمجھ رکھا تھا وہ چھن کر ہندوستان کی برطانوی انتظامیہ تک نہیں پہنچی۔ وہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے تبدیلی قلب کی اپیلیں کرتے رہے مگر بے سود۔ جب مارچ 1920 میں پنجاب کے بیس مارشل لا قیدیوں کی اپیلیں جو ان کی سزائے موت کے خلاف دائر کی گئی تھیں۔ خارج ہو گئیں تو انھوں نے لکھا کہ ''سب سے اونچی عدالتوں کے فیصلے بھی دقیق سیاسی تخیلات سے تاثر پذیر ہو جاتے ہیں۔'' انھیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ افسران جو پنجاب کی بدنظمی کے ذمہ دار تھے انھیں واپس نہیں بلایا گیا اور یورپی برادری ان کو سروں پر اٹھائے گھوم رہی ہے جب ہنٹر کمیٹی رپورٹ شائع ہوئی تھی تو وہ انھیں ایسی لیس پوت نظر آئی تھی جس پر ہلکے پردے پڑے ہوں۔ کیا ہندوستان میں طبقہ حکام کے لیے کوئی خاص ضابطہ کار ہے جس کے سامنے عظیم برٹش قوم کا بہترین طبقہ سربسجود گر پڑتا ہے؟'' ہنٹر کمیٹی کے ہندوستانی ممبروں نے یورپی ممبروں کی رائے سے اختلاف کیا تھا۔ سر ستیل واد نے ہمیں بتایا ہے کہ ایک بار کمیٹی کی رپورٹ کے مسودے پر بحث کے دوران سر ہنٹر اپنا توازنِ مزاجی کھو بیٹھے اور چلا اٹھے تھے۔'' آپ لوگ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں۔ ستیل واد کے کہنے

کے مطابق سر ہنٹر اور ہندوستانی ممبروں نے ایک ہی چھت کے نیچے بیٹھنے کے باوجود ایک دوسرے سے بات چیت کرنا تقریباً ترک کر دیا۔[1]

گاندھی نے علی الاعلان گورنر پنجاب، سر مائیکل اوڈوائر اور وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اوّل الذکر کا اس لیے کہ وہ مارشل لا دورِ حکومت سے عملی طور پر وابستہ تھے اور موخر الذکر کا اس لیے کہ وہ اپنے ظالم گورنروں کو روکنے میں ناکام رہے تھے۔ انھیں یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوا کہ پنجاب کے المیے کے بارے میں ہندستانی خدمات کو ہمدردانہ طور پر سمجھا نہیں جا رہا تھا۔ سروجنی نائڈو اُس وقت انگلستان میں تھیں انھوں نے ہاؤس آف کامنس کا مباحثہ سننے کے بعد اس کو قابل افسوس اور المناک کہا تھا۔ انھوں نے لکھا کہ ہمارے دوستوں نے اپنی لاعلمی کا اور ہمارے دشمنوں نے اپنی بدتمیزی اور گستاخی کا مظاہرہ کیا۔ ہاؤس آف کامنس کی تقریروں سے یہ ظاہر ہوا کہ بااثر حلقوں میں بھی ان برطانوی افسروں کے لیے ہمدردی پائی جاتی تھی جو مارشل لا دورِ حکومت میں مقیم تھے۔ جنرل ڈائر کو فوج سے استعفا دینا پڑا تھا لیکن ان کے لیے ''مارننگ پوسٹ'' نے عوامی چندہ کر کے تیس ہزار پونڈ اکٹھا کر لیے تھے۔

آخرکار بادل ناخواستہ اور تقریباً متاسفانہ طور پر گاندھی یہ ماننے پر مجبور ہوئے کہ وہ نظامِ حکومت جس کی وہ اصلاح کرنا چاہتے تھے ختم کیے جانے ہی کے لائق ہے۔ دسمبر 1919 میں انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کو یہ رائے دی تھی کہ برطانوی حکومت نے اصلاحات کی جو نئی قسط عطا کی ہے اُسے کامیاب بنایا جائے اور اس طرح زیادہ مکمل ذمہ داریوں کے لیے تیاری کی جائے۔ ستمبر 1920 میں انھوں نے یہ اعلان کیا کہ اصلاح شدہ کونسلیں اور ہندوستانیوں کا گورنر بنایا جانا اصل میں ہمیں نکما بنانے کا ایک لطیف طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ Punjab Wrong اور The khilfat Betrayal کے پڑھنے سے بھی اُن کو رائے بدلنے میں آسانی ہوئی۔

(1) سی ستیل واد: یادیں اور تأثرات: ص: 311

باب 22

تحریک خلافت

1919 کے پنجاب کے واقعات سے گاندھی کی وفاداری متزلزل ہوگئی تھی۔ پھر بھی اگر ہندوستانی سیاست کا ایک اور شاخسانہ تحریکِ خلافت کے روپ میں نمودار نہ ہوگیا ہوتا تو ایک ہی سال کے اندر اُن کے رشتے برطانوی سلطنت سے اس ڈرامائی طور پر نہ ٹوٹتے۔

مسلم لیگ کے آئین کی تشریح کے بموجب 1913 تک برطانوی حکومت سے وفاداری اور مسلم حقوق کا حصول ہی اس جماعت کے مقاصد تھے۔ آنے والے واقعات سے یہ ثابت ہوجانے والا تھا کہ مسلم وفاداری کوئی نہ بدلنے والی نہ تھی۔ مسلم دانش ور طبقے کو پیاپے دھچکے لگے تھے۔ 1911 میں تقسیم بنگال کے استرداد کو جس سے مشرقی بنگال میں ایک مسلم اکثریت کا صوبہ بن گیا تھا۔ مسلم جماعت کے ایک طبقے نے سیاسی شکست قرار دیا۔ مسلم لیگ کا زیادہ نوجوان اور آزاد خیال طبقہ مسلم جماعت کو انڈین نیشنل کانگریس کی طرح بنانا چاہتا تھا۔ مسلم متوسط طبقہ اپنے ملک کی سیاست سے زیادہ مشرق وسطی کے ملکوں کے واقعات سے دل چسپی لے رہا تھا۔ اس طبقے کا ذہن اس صورت حال سے پریشان تھا جسے وہ اسلام کے خلاف عیسائیت کی سازش سمجھ رہا تھا۔ مصر پر برطانیہ کا اقتدار مراقش میں برطانوی، فرانسیسی گٹھ جوڑ، ایران میں حلقہ ہائے اثر کی تقسیم کرنے کے لیے انگلستان اور روس کا باہمی سمجھوتہ، طرابلس پر اطالوی حملہ اور ترکی سلطنت کے حصے بخرے، ایک

مشترکہ خطرے کے اجزاء نظر آنے لگے۔ ہمیں اقبال وشبلی کی نظموں میں اور دو لائق صحافی ابوالکلام آزاد اور محمد علی کے باآب وتاب مضامین میں مسلم متوسط طبقے کی بے چینیوں کی پرجوش ترجمانی ملتی ہے۔

1914 کی عالمی جنگ سے ہندوستان کی مسلم جماعت کی بے چینی میں اور اضافہ ہوا، اُن کا خلیفہ سلطانِ ترکی اُن کے اپنے بادشاہ۔شہنشاہ [1] کے خلاف قیصر [2] کا حلیف تھا۔ ہندوستانی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل تھا اور حکومت مسلمانوں کی بے چینی کا ازالہ کرنا چاہتی تھی، برطانیہ کے وزیراعظم نے پالیسی کے بارے میں ایک اعلان جاری کیا اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں کے شبہات کو دور کیا جائے۔ لائیڈ جارج نے کہا کہ ''ہم اس لیے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ایشیائے کوچک اور تھریس کی زرخیز اور مشہور زمینوں سے جہاں ترکوں کی اکثریت ہے۔ ترکی کو بے دخل کر دیا جائے۔ ہندوستان کے وائسرائے نے یہ بھی اعلان کیا کہ عرب، میسوپوٹامیا (عراق) اور جدّہ میں مسلمانوں کے مقدس مقامات محفوظ رہیں گے۔

1914 میں انگلستان کے مختصر سفر کے دوران گاندھی کو اُس کشمکش کا کچھ اندازہ ہوگیا تھا۔ جس نے سیاسی طور سے بیدار مسلمانوں میں ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ 18-1915 کے درمیان جب وہ جان بوجھ کر اختلافی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے تھے مسلمان لیڈروں نے خلافت [3] کے مستقبل کے بارے میں اکثر اُن کی رائے پوچھی۔ مسلم لیگ کے سامنے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انھیں تقریریں کرنے کے مواقع ملے۔ انھوں نے ہر بار اپنے مسلم ہم وطنوں کو صبر سے کام لینے اور گہری مایوسیوں کے باوجود تشدد کے ہر خیال کو دل سے نکال دینے کا مشورہ دیا۔ محمد علی تحریک خلافت کے ایک لیڈر تھے اور انھیں قید بھی کر دیا گیا تھا۔ گاندھی نے اُن سے خط وکتابت کے ذریعے رابطہ قائم رکھا، 1918 میں دلّی کی جنگی کانفرنس میں گاندھی نے محمد علی کی رہائی کا مطالبہ کیا اور حکومت سے یہ یقین دہانی چاہی کہ ترکی کے مستقبل کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کا خیال رکھا جائے گا۔

---

(1) برطانیہ وشہنشاہ ہندوستان وغیرہ (2) قیصر جرمنی

(3) انگریزی میں Cali Phate کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں لیکن خلافت کی تحریک کے سلسلے میں اسے Khilafat ہی لکھنے لگے۔

نومبر 1918 میں جنگ کے خاتمے پر خلافت کا مسئلہ ایک بار پھر اُبھر کر سامنے آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شکست خوردہ ترکی سلطنت سے تھریس کے علاوہ عرب صوبے اور ایشیائے کوچک کے بہترین حصے چھین لیے جائیں گے۔ سلطان ترکی اب اسلامی دنیا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام نہیں کرسکتا تھا۔ انگریز، شیخ حسین شریفِ مکہ کوٹی۔ ای لارنس کے کٹھ پتلی کی حیثیت سے خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ اس پس منظر میں اور دسمبر 1919 میں محمد علی اور اُن کے بھائی شوکت علی کی رہائی سے تحریک خلافت میں ایک نئی توانائی آ گئی۔ جنوری 1920 میں ایک مسلم وفد وائسرائے سے ملا لیکن لارڈ چیمسفورڈ اس سے زیادہ وعدہ نہ کر سکے کہ اگر مسلمانوں کا کوئی وفد انگلستان جانا چاہے تو وہ تمام ضروری سہولتیں مہیا کر دیں گے۔

بعض مسلمان لیڈر، جن میں ''الہلال'' کے مدیر ابوالکلام آزاد بھی شامل تھے وائسرائے کی خدمت میں عرضیاں دینے اور انگلستان میں وفود لے جانے کی افادیت پر اعتماد کھو چکے تھے۔ خلافت کے قائدین کسی فیصلے پر پہنچے بغیر چھ گھنٹے تک بحث کرتے رہے۔ گاندھی نے جنھیں اس جلسے میں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا یہ تجویز رکھی کہ اس سوال پر مزید غور وخوض کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی بنادی جائے۔ یہ سب کمیٹی ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں اور گاندھی پر مشتمل تھی۔ آزاد نے لکھا کہ ''یہیں عدم تعاون کی تحریک وجود میں آئی۔''(1) دوسرے دن جب مسلمان لیڈروں کے سامنے گاندھی نے برطانوی حکومت سے عدم تعاون کا ایک پروگرام پیش کیا تو اِن لیڈروں کی اکثریت اپنی سراسیمگی کو چھپا نہ سکی اور اس نے مزید غور کے لیے وقت مانگا۔

فروری 1920 میں ابوالکلام آزاد نے کلکتہ میں خلافت کانفرنس کی صدارت کی اور انھوں نے گاندھی کے پروگرام کو منظور کر لینے کی دعوت دی۔ اسی دوران میں ترکی سے صلح نامہ کی اشاعت سے مسلمانوں کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ ترکی سے اُس نرمی کا برتاؤ نہیں کیا گیا جس کی مسلمانوں کو توقع تھی اور جس کے لیے وہ برابر جدوجہد کر رہے تھے۔ وائسرائے کا یہ مشورہ کہ وہ (مسلمان) اپنے ہم مذہب ترکوں کی دگرگونی قسمت کو صبر وسکون سے برداشت کریں، ہندوستانی مسلمانوں کو جھوٹی تسلی معلوم ہوا۔ اب مسلمانوں کی مایوسی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ خلافت کے لیڈر اپنی

(1) مہادیو ڈیسائی: مولانا آزاد: آگرہ 1940ء، ص: 27

اس ناراضگی کو ظاہر کرنے کے لیے فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ جب 9 جون کہ الٰہ آباد میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا تو انھوں نے ایک رائے ہو کر گاندھی کا پیش کیا ہوا عدم تعاون کا پروگرام منظور کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ گاندھی کو اختیار دیا گیا کہ وہ وائسرائے کو ایک مہینہ کا نوٹس دے کر عدم تعاون کے پروگرام پر عمل شروع کر دیں۔ پندرہ دن کے بعد گاندھی نے لارڈ چیمسفورڈ کو اطلاع دی صلح نامہ ترکی کے شرائط مسلمانوں سے کیے گئے برطانوی وعدوں کے مطابق تبدیل نہیں کیے گئے تو وہ مسلمانوں سے کہیں گے کہ حکومت سے تعاون ترک کر دیں اور ہندوؤں کو بھی اس تحریک میں شرکت کی دعوت دیں گے۔ اسی دوران مئی کے مہینے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس میں عدم تعاون کے پروگرام پر بھی غور کیا گیا۔ گاندھی نے پنجاب کے مظالم، قانون اصطلاحات کی خامیوں اور خلافت کے مطالبے کو محرکات خصوصی بنا لیا۔ اے۔ آئی۔ سی۔ سی (آل انڈیا کانگریس کمیٹی) کی مجلس عاملہ نے یہ تجویز کیا کہ ستمبر 1920 میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس کلکتہ میں بلایا جائے تا کہ وہ حکومت سے عدم تعاون کے ہنگامی سوال پہ غور وخوض کرے یہ اس لیے ضروری تھا کہ کانگریس پہلی بار غیر آئینی طریق احتجاج کو اپنانے جا رہی تھی۔ یہ سوال اٹھتا ہے کہ وائسرائے کو لکھنے اور تحریک شروع کرنے سے پہلے کلکتہ کانگریس کے فیصلے کا انتظار کیوں نہیں کیا گیا؟ کیا گاندھی کانگریس کے لیے پہلے سے مشکلات پیدا کر دینا چاہتے تھے یا حالات نے انھیں انتظار کا موقع ہی نہ دیا؟

کم سے کم ایک بات ایسی ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ جون 1920 تک گاندھی اور برطانوی راج کے مابین علاحدگی مکمل ہو چکی تھی۔ ترکی کے صلح نامہ سیوریز اور ہنٹر کمیٹی رپورٹ سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ سرکاری دنیا میں تبدیلی قلب کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔ مسلمانوں کی بے چینی اُبل کے چھلکی پڑ رہی تھی۔ قرآنی احکام کے ماتحت (جب اسلام پر یورش ہو تو مسلمان یا تو ملک چھوڑ دے یا لڑنے پر آمادہ ہو جائیں) شمالی مغربی اضلاع سے ہزاروں مسلمان ہجرت کر کے قریب ترین اسلامی ملک افغانستان کو چلے گئے اور اس کے نتائج تباہ کن ہوئے۔ اس کا خطرہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں کی محبوس مایوسی کہیں باندھ توڑ کر تشدد کی نہروں میں نہ بہہ نکلے۔ مسلمانوں کی اس مزاجی کیفیت کے علاوہ خود سیاست کے بارے میں گاندھی کے عام طریق

کار سے بھی اس بات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ایک متشددانہ بغاوت کا اعلان کرنے سے پہلے انھوں نے کانگریس کے خصوصی اجلاس کا انتظام کیوں نہیں کیا۔ جب انھیں اس بات کا یقین ہو جاتا تھا کہ ایک مخصوص طریق کار درست ہے تو چاہے اکیلے ہی کیوں نہ ہوں، ان کا عقیدہ تھا کہ وہ طریق کار اختیار کر ہی لینا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال ہو سکتا ہے کہ کانگریس کے انعقاد کے پہلے ہی یہ تحریک اپنی توانائی کا مظاہرہ کر لیتی ہے تو غالباً کانگریس عدم تعاون کی تحریک کو زیادہ آسانی سے منظور کرے گی۔ ستیہ گرہ وہ حربہ تھا جو دوران جنگ میں اپنے اوپر عائد کی ہوئی پابندیوں کے باوجود وہ بہار میں نیل کے کسانوں، احمد آباد میں کپڑے کے کارخانے کے مزدوروں اور گجرات کے کاشتکاروں کی شکایات کے ازالے کے لیے وہ استعمال کر چکے تھے۔ اب وہ مسلمانوں کی مدد اس لیے کر رہے تھے کہ وہ اسلام کی عزت کا بول بالا کر سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ برطانیہ سے اس بات پر اصرار کر کے کہ وہ پنے کیے ہوئے وعدے کی لاج رکھے، گاندھی خود برطانیہ کی خدمت کر رہے تھے۔ گاندھی کی نجی زندگی کی تشکیل میں، عہد، کا بڑا ہاتھ تھا۔ اور اُن کی نظر میں وعدے اور عہد کی بڑی وقعت تھی۔ اس کے علاوہ گاندھی اپنے گہرے مذہبی طرز فکر سے یورپینوں، اور تعلیم یافتہ ہندوؤں کے برعکس خلافت کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کو سمجھ سکتے تھے اور چاہے وہ پوری طرح متفق نہ بھی ہوں تو بھی وہ اس سے ہمدردی کر سکتے تھے۔ وہ یہ محسوس نہ کر سکے کہ خلافت کا ادارہ ویسے ہی موت کی آغوش میں تھا۔ خود ترک اس سے عاجز تھے اور جنگ کے بعد عثمانی سلطنت اُسی طرح باقی نہیں رہ سکتی تھی جیسے کہ ہیپس برگ سلطنت اور یہ بھی نہ دیکھ پائے کہ چھوٹے چھوٹے ممالک، جس میں عرب اور غیر عرب شامل تھے۔ ترکی کے پنجے سے رہائی پانے کے لیے جدوجہد میں مصروف تھے۔

خلافت کے مسئلے میں نقطہ ہائے نظر کے اختلاف سے قطع نظر، برطانیہ کی پالیسی ٹال مٹول اور لیس پوت کی تھی۔ برطانیہ میں یہ دلیل پیش کی جاتی تھی کہ ترک اس سے بہتر سلوک کے حقدار نہیں ہیں۔ ہندوستان میں وائسرائے پرائیوٹ گفتگو میں یہ تسلیم کرتے تھے کہ ترکوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لیکن چوں کہ امپیریل حکومت کی اعلیٰ پالیسی کا مسئلہ تھا اس لیے وہ مجبوب تھے۔ اس آخری دلیل کے سلسلے میں گاندھی کا جواب یہ تھا کہ وائسرائے کو ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک کی

سربراہی کر کے اپنا فرض اسی طرح ادا کرنا چاہیے تھا جیسے لارڈ ہارڈنگ نے 1913 میں جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی تحریک کی حمایت کا اعلان کر کے کیا تھا۔ لیکن لارڈ چیمسفورڈ ایسی کوئی ڈرائی پیش کش نہیں کرنا چاہتے تھے جس کے باعث لارڈ ہارڈنگ تقریباً برطرف ہی کر دیئے گئے تھے۔

ہندوؤں سے گاندھی نے یہ اپیل کی کہ "ایک برادرانہ جماعت کا اُن پر بھی حق ہے اور وہ اس فرض کو پورا کریں۔ "ان کا دکھ ہمارا دکھ ہے۔" پھر ایک سو سال تک ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کا ایسا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ خلافت خالص مسلمانوں کا مسئلہ ہے اور ایک بین الاقوامی مسئلہ بھی۔ لیکن جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے یہ ہندوستان کی آزادی کے سوال سے بھی جڑا ہوا ہے ایک غیر آزاد ہندوستان مظلوم ترکی کی مدد کیسے کر سکتا ہے؟ ایک مفلوج آدمی دوسرے کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ اگر وہ کچھ کر سکتا ہے تو یہ کہ اپنے فالج سے نجات حاصل کرے۔"

جب انڈین نیشنل کانگریس نے ستمبر 1920 کے خصوصی اجلاس میں عدم تعاون کے پروگرام کو منظور کر لیا تو گاندھی قومی اور خلافت دونوں ہی تحریکوں کے رہنما بن گئے۔ انھوں نے علی برادران کے ساتھ ہندوستان کا دورہ کیا اور ہندو مسلم اتحاد اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ گاندھی کی بات ہندو اور مسلمان دونوں ہی احترام سے سنتے تھے۔ وہ مسلمان عورتوں کے ایسے جلسوں میں بلائے جاتے تھے جہاں کوئی مرد گاندھی کے علاوہ آنکھوں پر پٹی باندھے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن گاندھی کو پرہیزگار مانا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلی اتحاد کے خواب کی تعبیر انھوں نے پالی تھی۔

اب وہ ایسی عوامی تحریک کی قیادت کر رہے تھے جس کا اعلانیہ مقصد بیرونی حکومت کا خاتمہ کرنا تھا۔ یہ ایک کھلی ہوئی مگر عدم تشدد پر مبنی بغاوت تھی۔

وہ سلطنت سے بغاوت کی راہ پر بہت دور تک چلے آئے تھے لیکن یہ انھوں نے بادل نخواستہ کیا تھا۔ یہ وہی سلطنت تھی جس کا قومی ترانہ انھوں نے گایا تھا اور اپنے اہنسا کے باوجود اس کی جنگیں انھیں اپنی جنگیں معلوم ہوتی تھیں۔

باب23

بغاوت کی راہ

گاندھی نے 21؍دسمبر 1921 کے ''ینگ انڈیا'' میں لکھا کہ ''لارڈ ریڈنگ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ عدم تعاون کرنے والے حکومت سے برسر جنگ ہیں۔ انھوں نے اُس کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کیا ہے۔''

یہ وہی گاندھی ہیں جنھوں نے اپریل 1915 میں مدراس کے قانون دانوں کے ڈنر کے موقع پر کہا تھا کہ ''اس اہم اور عظیم اجتماع میں آج کی شام مجھے برطانوی سلطنت کی وفاداری کا دوبارہ اعلان کرتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ یہ میری دریافت ہے کہ برطانوی سلطنت برطانیہ کی ہر رعایا اپنی عزت اور طاقت وصلاحیت کو بروئے کار لانے کے لیے پوری طرح آزاد ہے اور وہ جو کچھ سوچتی ہے وہ اُس کے ضمیر کی صدائے بازگشت ہے۔[1]

جنوبی افریقہ کی جدوجہد کے بیس سالہ تجربے کے پس منظر میں گاندھی پر یہ حقیقت واضح ہو۔ چاہیے تھی کہ وہاں حاکم ومحکوم میں اور سیاہ فام اور سفید فام میں کسی طرح کی بھی مساوات نہ تھی جن نوآبادیوں پر یورپینوں کو غلبہ حاصل تھا وہ تو تیزی سے مادری ملک (انگلستان) کے مقابلے میں مساوات کا رتبہ حاصل کرتی جارہی تھیں لیکن جن ملکوں کو برطانیہ کا ماتحت سمجھا جاتا تھا وہاں یا تو

(1) مہاتما گاندھی کی تقاریر وتجاویز، ص:310

ٹھہراؤ کی کیفیت تھی یا اگر وہ خواختیاری حکومت کی طرف آگے بڑھ بھی رہے تھے تو چیونٹی کی چال سے۔ گاندھی اسے ناواقف نہ تھے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی ابتداء کیوں کر ہوئی اور وہ کس بنیاد پر قائم تھی۔ انھوں نے ’ہندسوراج‘‘ میں ہندوستانی تاریخ کا بے لاگ تجزیہ کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ ہندوستانی راجاؤں کی آپسی پھوٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کی کامیابیوں کی ذمہ دار تھی۔ برطانوی امن کے تصور کی تنقید کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ یہ فقط نام کا امن ہے۔ اور اس نے ہندوستانی قوم کو لاغر اور بزدل بنادیا ہے۔ ریلوے ہو، قانونی عدالتیں ہوں یا نظام تعلیم، سب کا ایک ہی مقصد رہا ہے کہ قوت مسلط کی گرفت اور سخت کی جائے۔‘‘ برطانوی راج کے خلاف یہ ایک تندوشدید فردجرم تھی اس کے باوجود انھوں نے اس سے بالکل ہی نرالا نتیجہ نکالا۔ ہندوستان کو پیس کر رکھ دینے والا برطانوی راج نہیں تھا بلکہ مغربی تہذیب تھی جس نے اس راج کو استحکام بخشا تھا۔ خود اہل برطانیہ اس تہذیب کا شکار تھا۔ وہ قابل نفرت نہیں قابل رحم تھے۔ گاندھی فاتحوں کو روحانی حربوں سے فتح کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ’’میں حکومت برطانیہ کو اپنی وفاداری پیش کرتا ہوں اور یہ میں بالکل خود غرضی سے کر رہا ہوں۔ میں خود برطانوی نسل سے یہ کام لینا چاہوں گا کہ وہ اہنسا کا عظیم الشان پیغام (دوسروں تک) پہنچائے۔‘‘ 16-1915 میں انھوں نے مغرب کی مادیت، مشرق کے قدیم کلچر، بیواؤں کی شادی چھوت چھات کے خاتمے، کرگھے کی صنعت کے فروغ اور ہندوستانی زبانوں کے احیا پر جس طرح زور دیا اُس سے وہ خیال پرست عجیب طرح کے غیر سیاسی اور کچھ دوسری دنیا کی انسان معلوم ہونے لگے تھے۔ اس کے باوجود جو لوگ یہ سوچنے لگے تھے کہ اُن کی تمام قوت عمل سماجی اصلاح کی غیر مضرت رساں راہوں پر لگ جائے گی وہ غلطی پر تھے۔ اُن کے طرزِ فکر وحیات میں سیاسی اور غیر سیاسی کے درمیان کوئی واضح خطِ فاصل نہیں تھا۔ انھوں نے جب لوگوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ مذہب کو اپنائیں تو انھوں نے سودیشی عقیدہ کی ترویج مذہبی جذبے کے ساتھ کی جو ہمیں اپنے پاس و پڑوس کی خدمت اور اس سے استفادے پر مجبور ومقید کرتا ہے اور اس لیے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر ہندوستان خود اپنے لیے زندہ نہیں رہ سکتا، لنکا شائر کے لیے کیا زندہ رہے گا۔ انھوں نے ایک غیر ملکی زبان کے ملکی زبان بنائے جانے پر احتجاج کیا اور 1918 کی جنگی کانفرنس میں ہندوستانی میں تقریر کر کے گویا ایک بم

گرادیا۔حکومت کو بہت جلد یہ معلوم ہوگیا کہ یہ خیال پرست ایک انسانی ڈائنامائٹ (آتش گیر مادہ) ہے۔کوئی کچھ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس وقت کیا کر بیٹھے گا۔اوراس کو کسی طرح قابو میں نہیں لایا جاسکتا۔

1916 میں بنارس ہندویونیورسٹی کے افتتاح کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے بلند آواز میں اپنے خیالات پیش کرنے شروع کردیے۔انھوں نے ہندوستانی راجاؤں کے زر وجواہر اور زرق برق پوشاکوں پراُن کی تنبیہ کی ''جب بھی یہ سنتا ہوں کہ برطانوی ہند میں یا ہندوستان کے اس حصے میں جہاں ہمارے بڑے بڑے راجاؤں کی حکومت ہے،کوئی نیا محل بن رہا ہے تو مجھ میں فوراً رشک وحسد کا جذبہ بیدار ہوجاتا ہے اور میں کہنے لگتا ہوں کہ ارے یہ تو وہ دولت ہے جو کسانوں سے آئی ہے۔اگر ہمیں خدا پر بھروسہ ہے اور ہم صرف اس سے ڈرتے ہیں تو ہمیں دوسروں سے ڈرنا چھوڑ دینا ہوگا۔ ہم کسی سے بھی نہیں ڈریں گے چاہے وہ مہاراجہ ہوں یا وائسرائے۔نہ ہم خفیہ محکمے والوں سے ڈریں گے اور نہ خود شاہ جارج سے۔'' اینی بیسنٹ جو اُس جلیل القدر مجمع میں موجود تھیں اس بلند آواز سے ان کے خیالات کے اظہار کو برداشت نہ کرپائیں اور چلاّ اٹھیں ''براہِ کرم یہ ختم کیجیے۔'' ایک برطانوی افسر بڑبڑایا۔'' ہمیں اس آدمی کو بکواس بند کرانا ہوگی۔''

لیکن جس بات کو گاندھی درست سمجھتے ہوں،اس کے کہنے یا کرنے سے انھیں کوئی باز نہیں رکھ سکتا تھا۔انھوں نے چمپارن کے مجسٹریٹ سے کہا تھا کہ ''جو حکم مجھ پر صادر کیا گیا ہے میں اس کو قابل توجہ نہیں سمجھتا۔اس لیے نہیں کہ میرے دل میں قانونی اقتدار کی عزت نہیں بلکہ اس لیے کہ میں اپنے وجود کے ایک اعلا قانون کے تابع ہوں اور وہ قانون ہے ضمیر کی آواز'' اُس زمانے میں جو انقلابی سیاستیں چل رہی تھیں اُن میں یہ سب سے زیادہ انقلابی عقیدہ تھا۔

اس ابتدائی زمانے کے تجربات سے اُن کی لاعلمی کا وہ خلا پُر ہوگیا جو جنوبی افریقہ میں خود سے عائد کی ہوئی طویل جلاوطنی کے باعث پیدا ہوگیا تھا۔ برطانوی سلطنت کا جو بت بنا کر کھڑا کردیا گیا تھا اُس کے ناخوشگوار پہلوؤں سے گاندھی واقف تھے۔ چوبیس برس کی عمر میں ایک برطانوی سیاسی ایجنٹ کی انتقام جوئی کا نشانہ بن کر انھیں مجبوراً جنوبی افریقہ میں کام تلاش کرنا پڑا تھا

انھیں 1902 میں راجکوٹ اور بمبئی کی عدالتوں کا مختصر تجربہ بھی تھا جس سے انہیں یہ پتہ چل گیا تھا کہ انگریز حکام کتنے لاعلم اور ناعاقبت اندیش ہیں[1] ہندوستان واپس آتے وقت بحری سفر کے دوران انھیں جہاز کے یورپین اور ہندوستانی مسافروں کے درمیان ایک فاصلہ محسوس ہوا تھا۔ یہ حاکم و محکوم کی درمیانی خلیج تھی۔ وہ پہلے اِن تمام تجربوں کو بعض انگریزوں کی انفرادی کج روی کا نتیجہ سمجھ لیا کرتے تھے اور اس عقیدہ پر قائم تھے کہ بحیثیت مجموعی یہ نظام منصفانہ اور ہندوستان کے لیے فائدہ بخش ہے لیکن وطن پہنچ کر جب انھوں نے حالات کو قریب سے دیکھا تو اُن کی آنکھیں کھل گئیں۔

انھیں اپنے ملک کی غریبی کا کچھ اندازہ پہلے سے تھا اور انھوں نے ''ہند سوراج'' میں اس کا ذکر بھی کیا تھا، لیکن جب سچائی کھل کر سامنے آئی تو صورت حال ان کے تصور سے بھی زیادہ خراب نظر آئی۔ بہار کے ایک گاؤں میں انھوں نے ایک عورت کو میلے کچیلے کپڑے پہنے دیکھا۔ انھوں نے کستور بائی سے کہا کہ اس سے بات کریں۔ وہ عورت کستور بائی کو اپنی جھونپڑی میں لے گئی اور کہا اس جھونپڑی میں نہ کوئی بکس ہے اور نہ صندوق جس میں کپڑے رکھے جاسکیں۔ میرے پاس بس یہی ایک ساڑی ہے جو پہنے ہوئے ہوں۔ میں اسے کیسے دھوؤں؟ مہاتما جی سے کہیے کہ مجھے ایک اور ساڑی لا دیں تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ روز نہاؤں گی اور صاف ستھری رہوں گی۔

دسمبر 1917 کے ''انڈین اوپی نین'' میں جو جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا ترجمان تھا، انھوں نے لکھا تھا کہ ان سے یہ امید نہ رکھی جائے کہ وہ جنوبی افریقہ کے سیلاب زدہ علاقوں میں امدادی کام کے لیے چندہ حاصل کریں گے۔ میں اس ملک میں جس طرح کی غریبی دیکھ رہا ہوں اس کو دیکھتے ہوئے میں وہاں کے بے مددگاروں کو مالی امداد دینے کی بات بھی نہیں سوچ سکتا۔ اس ملک میں ایک پیسہ بھی بڑی چیز ہے۔ میں اس وقت ایسے ہزاروں افراد کے درمیان زندگی گزار رہا ہوں جو بھنے چنے اور پانی اور نمک میں گھلے ستو پر گزارا کر رہے ہیں۔

نومبر 1917 میں گجرات سیاسی کانفرنس کے صدارتی خطبے میں انھوں نے ایسی غریبی کا ذکر کیا جو روز بروز شدید ہوتی جارہی تھی اور گورنمنٹ ایمانداری سے یہ سوچ رہی تھی کہ ملک کی

(1) خودنوشت سوانح ص300

خوشحالی بڑھتی جارہی ہے۔''نیلی کتابوں میں جو چھپتا تھا اس پر حکومت کا اٹل وِشواس تھا۔''

شروع شروع میں اعلا برطانوی حکام اُن کا اس لیے احترام کرتے تھے کہ وہ گاندھی کی برطانوی تعلقات سے وابستگی کو شک وشبہ سے بالاتر سمجھتے تھے۔ جب وہ برطانیہ کی کسی خاص پالیسی یا افسر کی تنقید کرتے تو ان کی محبوبیت ختم ہوجاتی۔ صوبائی اور مرکزی سکریٹریوں کے مقابلے میں ضلع کے افسر اندولنوں سے جلد گھبرا جاتے تھے اور انھیں خطرہ نظر آنے لگتا تھا۔ گاندھی کا اقتدار سے پہلا ٹکراؤ بہار میں ترہت کمشنری کے کمشنر سے اور دوسرا بمبئی پریسیڈنسی میں احمد آباد کے کمشنر سے ہوا، موخرالذکر کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ ''کمشنر کا رویہ جرمن خطرے سے بھی بڑا خطرہ ہے اور میں اس اندرونی خطرے سے بچانے کی کوشش کرکے سلطنت کی خدمت کررہا ہوں۔'' 1917 کے آتے آتے خفیہ پولیس نے گاندھی کا تعاقب کرنا شروع کردیا تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ سِول سروس کی حکومت خوف کی حکومت تھی۔ برطانوی افسروں کو خبط تھا کہ اُن کے بارے میں یہ نہ کہا جائے کہ وہ عوامی تحریک جیسی کسی چیز کے سامنے جھک گئے۔ انھوں نے جب یہ دیکھ لیا کہ سرکاری مشینری کتنی بے لچک، عزت کے سوال پر کتنی حساس، غلطیوں کے تسلیم کرنے میں کتنی سست اور تلافی کرنے کے لیے کتنی نارضامند ہے تو حکومت سے سارے ناطے اس طرح سے ٹوٹے کہ پچھلی حالت پر واپس آنے کا سوال ہی نہ رہا۔ انھوں نے لکھا کہ ''یہ بات میری فطرت کے خلاف ہے کہ میں انسانوں کی گراوٹ پر یقین کرلوں لیکن دفتری ذہنیت کی ایسی گراوٹ کا ثبوت ضرور ملتا ہے۔ یہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہے۔''[1] دفتری نظام سے اسی مایوسی کے باعث ہی اُن کو یہ یقین بھی ہوگیا کہ سارے نظام حکومت کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وائسرائے نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا کہ جہاں گاندھی ایک قابل قدر حلیف ہوسکتے ہیں وہاں وہ ایک خوفناک دشمن بھی بن سکتے ہیں۔ 18-1917 میں لارڈ چیمسفورڈ نے گاندھی کی خیر خواہی برقرار رکھنے کی کوشش بھی کی۔ مثال کے طور پر چمپارن کے بحران اور دلّی جنگی کانفرنس کے دوران۔ لیکن اگلے دو برسوں میں وہ بھی سِول سروس کے دوسرے

---

(1) ینگ انڈیا، 20ر اکتوبر 1921ء

ارکان کی طرح اس نقطہ نظر کے حامی بن گئے کہ گاندھی حکام سے جھگڑا مول لینے کے بہانے ڈھونڈتے رہے ہیں اور وہ ناقابل مصالحت ہیں۔ ان ابتدائی برسوں میں گاندھی کی طرف برطانوی رویے میں نفرت اور لگاؤ۔ کی عجیب وغریب آمیزش نظر آتی ہے۔ ذاتی طور سے ان کے لیے ایک احترام تھا لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو اُن کی پالیسی اور نیت پر عجیب مگر مبہم شبہات کی ایک تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ سرکاری دنیا کو ''ستیا گرہ'' میں ''برطانوی راج کے لیے چیلنج ہی نظر آتا تھا۔ وہ یہ سمجھ نہ پاتی تھی کہ گاندھی کی نظر میں چیلنج سے زیادہ اہم چیز اس کی اخلاقی اور تشدد دشمن بنیاد تھی۔ برطانیہ کو ہندوستان سے اہنسائی طور پر نکالے جانے میں کوئی خاص اچھائی نظر نہ آتی تھی اور اس کا بھی ثبوت نہیں ملتا کہ اسے اس کا یقین رہا ہو کہ عوامی تحریک غیر متشدد رہ سکے گی۔ اس کے لیے گاندھی کا یہ مشورہ قبول کرنا مشکل تھا کہ رولٹ بل یا ترکی کے سوال پر جھک کے جیتنے سے حکومت کی عزت بڑھے گی۔ وہ وفاداری اور دوستی کے جو دعوے کرتے تھے اُن پر برطانیہ کو اعتبار نہیں ہوتا تھا۔

ہم عصر کاغذات سے گاندھی اور حکومت کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

گاندھی بنام پرائیویٹ سکریٹری ٹو وائسرائے 20/اپریل 1918

آپ نے وعدہ کیا تھا کہ علی برادران[1] کے بارے میں جواب بھیج دیں گے۔ مجھے اب تک انتظار ہے۔

''آپ کو شاید یہ معلوم ہو کہ میں کھیڑا کی فصلوں[2] کے بارے میں مقامی حکام سے ایک طرح کے خانگی جھگڑے میں الجھا ہوا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ عوام کی فریاد کا وزن محسوس کیا جائے گا اور اُن کی رائے کی عزت کی جائے گی۔

''جو بات مجھے پریشان کر رہی ہے وہ علی برادران کا معاملہ ہے ایسے وقت میں جب کہ مجھے سلطنت کے ایک معزز شہری کی حیثیت سے جنگ میں اپنے حصے کا کام کرنا چاہیے تھا، میں ملک کے نظم ونسق کے ذمہ داروں کو ہمیشہ پریشان ہی کرتا ہوا نظر آتا ہوں۔ مجھے میسوپوٹامیہ یا فرانس میں رہ کر زیادہ خوشی محسوس ہوتی۔ دوبار میں نے اپنی خدمات پیش بھی کیں لیکن وہ قبول نہ کی

---

(1) مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی

(2) بیسواں باب۔

گئیں۔اس کے برعکس مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں حکومت کو بار بار پریشان کن صورتِ حال میں الجھانے کا ذمہ دار ہوں۔اور میں ایک ایسے اندولن میں گھرتا جاتا ہوں جس کا بڑے پیمانے پر ہونا ہی حکومت کی پریشانی کا سبب ہوسکتا ہے۔میرے دل میں لارڈ چیمسفورڈ کی اتنی زیادہ عزت ہے کہ میں ان کی پریشانیوں میں ہرگز اضافہ کرنا نہ چاہوں گا لیکن اسی کے ساتھ علی برادران کے سلسلے میں جو واضح ذمہ داری ہے اُس سے منہ بھی نہیں موڑسکتا۔اُن کی نظر بندی سے مسلم فرقے میں تلخی پیدا ہوگئی ہے۔ایک ہندو کی حیثیت سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اُن بھائیوں کی رہائی حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیے کیوں کہ میں پبلک کے سامنے اُن کے خلاف کوئی مقدمہ کھڑا کرکے،حکومت کی کارروائی کا جواز پیدا نہیں کرسکتا۔اس لیے اگر حکومت کے پاس اُن کے خلاف کوئی کیس ہے تو اُسے پیش کرکے فضائل کے تکدر کو دور کرنا چاہیے۔

''اگر لارڈ چیمسفورڈ کا یہ خیال ہے کہ انھیں ہرگز رہا نہ کرنا چاہیے تو حکومت کو ایک ایسے ایجی ٹیشن کے لیے تیار ہوجانا چاہیے جس کا نتیجہ اس کے لیڈروں کی گرفتاری ہوگا۔لیکن میں اپنی پوری قوت سے اُن کی رہائی ہی کی سفارش کروں گا۔رائے عامہ کا احترام کرکے حکومت اپنی ہی عزت بڑھائے گی۔رہا حکومت کے خطرے کا سوال،تو میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر اُن کی رہائی سے حکومت کے اعتماد پر آنچ آئے گی تو میں اپنی جان کی بازی لگادوں گا۔''

گاندھی بنام پرائیویٹ سکریٹری ٹو وائسرائے۔14اپریل1918

جیسا کہ آپ دیکھیں گے،مندرجہ بالا مسودہ 10 تاریخ کو تیار ہوا تھا،لیکن گزری ہوئی راتوں میں اسے الگ رکھ کر سوتا رہا۔میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں باعزت طریقے پر بے باک ہوکر ہی حکومت کی خدمت کرسکتا ہوں۔پچھلے چار دنوں میں جنگ نے اور نازک صورت اختیار کرلی ہے۔اس سے میرا یہ ارادہ قوی تر ہوگیا ہے کہ میں خط بھیج ہی دوں۔میں پوری عاجزی سے لارڈ چیمسفورڈ سے یہ مطالبہ کروں گا کہ وہ نہ صرف یہ کہ علی برادران کو رہا کردیں بلکہ اُن کو اور مسٹر تلک کو بھی شریک مشورت کرلیں۔''

پرائیویٹ سکریٹری ٹو وائسرائے بنام ولیم ونسنٹ ہوم ممبر 17/اپریل1918

ہز اکسیلنسی وائسرائے نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اپنے نام لکھے گئے مسٹر گاندھی کے منسلکہ

خط مورخہ 10/اپریل کو آپ کے پاس بھیج کر فوری طور سے اس بارے میں آپ کے رائے لوں کہ مسٹر گاندھی سے یہ کہنا مناسب ہوگا یا نہیں کہ وہ وائسرائے سے آ کر ملیں۔ اس کا امکان ہے کہ ان کی بے چین کارروائیوں کا رخ مفید راستوں کی طرف مڑ جائے۔ اس کے برعکس اگر انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تو اُن کی تحریکوں اور طاقتوں سے صرف پریشانیاں ہی ہاتھ آتی رہیں گی۔

سرولیم ونسنٹ بنام پرائیویٹ سکریٹری ٹو وائسرائے

آپ کا نیم سرکاری خط مورخہ 17/اپریل جس کے ساتھ محمد علی کی رہائی کے بارے میں گاندھی کا خط ملفوف تھا، موصول ہوا۔ میرے خیال میں یہ اچھا ہوگا کہ ہزاکسیلنسی مسٹر گاندھی کو شملہ بلائیں اور اُن پر صورت حال واضح کریں۔ میں تو یہ بھی کہنے کی جرأت کروں گا کہ بہتر ہوگا کہ مسٹر گاندھی کو یہ بتایا جائے کہ محمد علی اور ان کے بھائی کے بارے میں جو تحریک چل رہی ہے اُس کی حمایت کا خیال مسٹر گاندھی کے اُن پُر جوش دعووَں سے تال میل نہیں کھاتا جو وہ موجودہ بحران میں حکومت سے تعاون کے سلسلے میں کرتے رہتے ہیں۔ میں ہزاکسیلنی کو بھی مشورہ دوں گا کہ وہ مسٹر گاندھی سے کہیں کہ وہ اپنے اثر درسوخ کو اس طرح کام میں لائیں اور اپنی کارروائیوں کا رخ اِس طرح موڑیں کہ سلطنت کی سچی خدمت ہو سکے نہ کہ حکومت کی دشواریوں میں اضافہ ہو۔''

میں یہ بھی واضح کرنا چاہوں گا کہ دونوں بھائیوں کے مقدمات کی شنوائی ایک جوڈیشل ٹریبونل کرے گا۔

ذاتی طور سے میں اس خط کو ایک چھپی ہوئی دھمکی سے کچھ ہی کم سمجھتا ہوں اس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایسے وقت میں حکومت پر دباؤ ڈالا جائے جب کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سلطنت کی حالت نازک ہے۔ مسٹر گاندھی بظاہر میسوپوٹامیہ یا فرانس میں کسی جنگی خدمت پر جانے کے لیے آمادہ ہیں۔ اگر انھیں کسی حیثیت سے میسوپوٹامیہ بھیجا جا سکے تو ہم بہت سے پریشانیوں سے نجات پا جائیں گے۔

شاید وائسرائے مسٹر گاندھی کو یہ بھی بتانا چاہیں کہ کھیڑا میں اُن کے اقدام کا اثر کتنا شرانگیز تھا؟

گاندھی بنام پرائیویٹ سکریٹری ٹو وائسرائے مورخہ 20 فروری 1919

چوں کہ میری صحت اب بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی ہے اور اگر میں ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل کروں تو مجھے کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جس میں کافی تکان پہنچنے کا اندیشہ ہو، اس

لیے میں سوچا تھا کہ جب تک میری صحت اور سنبھل نہ جائے مجھے ایسی کارروائیوں سے پرہیز کرنا چاہیے لیکن ابھی حال میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں۔ انھوں نے مجھے مندرجہ ذیل باتیں کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ہم لوگوں کے درمیان میں جو آخری خط و کتابت ہوئی تھی اس کے بعد میں نے مسٹر ولیم ونسنٹ سے خط و کتابت کا آغاز کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں علی برادران کے بارے میں حکومت کو مشورہ دینے کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ اس کمیٹی نے باقاعدہ طور پر حکومت کو رپورٹ کر دی ہے۔ لیکن ابھی تک حکومت کے فیصلے کا اعلان نہیں ہوا ہے۔

اگر اس سے میرے انکسار کو ٹھیس پہنچے گی لیکن میں لارڈ چیمسفورڈ کو ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں۔ دسمبر 1917 میں مسلم لیگ کی جو نشست کلکتہ میں ہوئی تھی اُس کے بعد سے ان لوگوں (علی برادران) نے میرا مشورا پوری طرح قبول کر لیا تھا اور اُن ممتاز مسلمانوں نے بھی بات مان لی تھی جو میرے مشورہ کی عدم موجودگی میں اس کی بہت پہلے ایک طاقتور اور پریشان کن تحریک چلا چکے ہوتے۔ میں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ اگر دادرسی نہیں ہوتی تو ستیہ گرہ شروع کر دی جائے گی۔ میں ستیہ گرہ کے لیے مقاومت مجہول، کی ترکیب سے نفرت کرتا ہوں کیوں کہ اس میں اس عظیم سچائی کی بہت ہی غیر مکمل ترجمانی ہوتی ہے جو عام فہم سنسکرت لفظ ''ستیہ گرہ'' سے واضح ہو جاتی ہے۔ میں نے انھیں یقین دلایا تھا کہ حکومت سے علی برادران کی رہائی کے بارے میں خط و کتابت کر رہا ہوں۔ ایک ستیہ گرہی کی حیثیت سے میں نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ اس سلسلے میں کوئی عوامی اندولن چلانے سے پہلے اُس مسئلے پر حکومت کا نظریہ معلوم ہونا چاہیے اور جو ہلکے پھلکے علاج ممکن ہیں وہ کر لینا چاہئیں تا کہ ہم غیر جانب دار مبصروں کو اطمینان دلا سکیں کہ اندولن شروع کرنے سے پہلے ہم نے ہر ممکن صورت اختیار کر لی تھی۔

''میں علی برادران اور اُن تمام اصحاب کا شکر گزار ہوں جن کے ساتھ مجھے کام کرنے کا فخر حاصل رہا ہے اور اُنھوں نے میرے مشورے پر اس کے باوجود عمل کیا کہ تاخیر ایک خطرناک منزل تک پہنچ چکی ہے۔'' مجھے یقین ہے کہ علی برادران کو رہا کر کے حکومت ملک کو ایک بہت ہی طاقتور اندولن سے بچالے گی۔''

گاندھی بنام سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ 12 مارچ 1919

''علی برادران کے متعلق میں صرف ایک بات کہنا چاہوں گا...... مجھے حکومت کرنے کا فن تو نہیں آتا اور میں نے دنیا بھر میں اس کا جو رنگ دیکھا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ پسند بھی نہیں لیکن یہ بات عجیب وغریب ہے کہ حکومت اس چیز کو نظرانداز کر رہی ہے جو حکومت کے باہر ہر شخص کو واضح طور پر دکھائی دے رہی ہے۔ اور وہ ہے دھیرے دھیرے سلگتی ہوئی آگ کی شدت جسے وہ ظلم کی راکھ کے نیچے چھپائے رکھنا چاہتی ہے۔ کیا حکومت کے نزدیک لیاقت ایمانداری اور مذہبی اعتقاد کو قید کر رکھنا اچھا ہے؟

گاندھی بنام پرائیوٹ سکریٹری ٹو انسرائے 11/مارچ 1919

اس آخری لمحے میں بھی میں ہزاکسیلنسی اور ان کی حکومت سے ادب کے ساتھ درخواست کروں گا کہ وہ ذرا تامل کریں اور راولٹ بل پاس کرنے سے پہلے اس پر غور کرلیں۔ بجا ہو یا بے جا، اس قانون کے بارے میں عوام کی رائے کی شدت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے یقین ہے کہ حکومت موجودہ تلخیوں کی شدت اور بڑھانا نہیں چاہتی......رائے عامہ کے سامنے جھک کر (حکومت) جذبات کو ہموار کر سکے گی اور اپنی حقیقی عزت بھی بڑھائے گی۔''

گاندھی بنام پرائیوٹ سکریٹری ٹو وائسرائے 11 مارچ 1919

میں نے آپ کو جو ٹیلی گرام بھیجا ہے اس کی ایک نقل منسلک ہے۔ اس پر میں ایک نجی بات کے علاوہ کچھ اور اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ جب تک جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ چلتی رہی، مجھے جنرل اسمٹس سے اُن کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر لین کے ذریعہ خط وکتابت کرنے کی خوش نصیبی حاصل تھی۔ جیسے جیسے تحریک زور پکڑتی گئی، حکومت (جس کی نمائندگی جنرل اسمٹس کر رہے تھے) اور ہندوستانیوں کے درمیان (جن کی نمائندگی میں کر رہا تھا) مسٹر لین فرشتۂ امن بنے ہوئے تھے۔ اُن کی کبھی ساتھ نہ چھوڑنے والی خوش مزاجی اور خوش خلقی کے بغیر شاید ایسا اطمینان بخش نتیجہ اور اتنی جلد برآمد نہ ہو پاتا۔

''کیا میں آپ سے ایسی خدمات کی توقع رکھ سکتا ہوں؟ کیوں کہ اگر تحریک نے طول پکڑا تو جنوبی افریقہ ہی کی طرح ہندوستان میں بھی مجھے پرائیوٹ سکریٹری کو بار بار زحمت دینا پڑے گی

اور برابر میری یہی کوشش رہے گی کہ حکومت اور جن لوگوں کی میں نمائندگی کر رہا ہوں وہ ایک دوسرے کے قریب آ جائیں۔

''......امید ہے کہ لارڈ چیمسفورڈ کا بخار اب اتر گیا ہوگا اور اس کے اثرات زائل ہو چکے ہوں گے۔ ایسے ذاتی خط کو میرے ہی ہاتھوں لکھا جانا چاہیے تھا لیکن میری بیماری نے مجھے کئی طریقوں سے ناکارہ بنا دیا ہے لکھتے وقت میرا ہاتھ کانپتا بھی ہے اور بہت جلد تھک بھی جاتا ہے۔ اس لیے مجھے مجبوراً املا کرانا پڑتا ہے۔ اس سے بس بہت ہی نجی خط و کتابت مستثنیٰ ہے۔

پرائیوٹ سکریٹری ٹو وائسرائے بنام گاندھی، مورخہ 13 مارچ 1919

آپ کا تار مورخہ 11 مارچ مجھے مل گیا اور میں نے ہز ایکسلینسی کو دکھا بھی دیا۔ یہ آپ کی عنایت ہے کہ آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں کہ وہ کردار ادا کر سکوں گا جو مسٹر لین نے جنوبی افریقہ میں انجام دیا تھا۔ پھر بھی یہ بات منطقی کم نظر آتی ہے کہ آپ فرشتہ امن کے پروں کی اتنی قدر بھی کرتے ہیں اور خود اپنے لیے نہایت ہی عاجلانہ طور پر طوفانی پطریل[1] کے پر پسند کرتے ہیں۔ آپ کو بھی جنوبی افریقہ میں اس لیے کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ آپ جس مقصد کو لے کر اُٹھے تھے وہ آپ کے ہم وطنوں کے جوش و خروش اور ان کی زندگیوں کے شایانِ شان تھا۔ آپ ایک مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں اور اسی مناسبت سے آپ پر ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔ لوگ آپ کی اتباع اس لیے نہیں کرتے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ٹھیک راستے ہیں بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ اُن کے خیال میں مسٹر گاندھی صحیح راستے پر ہیں۔

''اگر ایسی تحریک شروع ہوئی جس کے امکان کا آپ نے اشارہ کیا ہے تو مجھے افسوس ہوگا، لیکن جو لوگ آپ سے واقف ہیں اور جن میں عمال حکومت بھی شامل ہیں، اُن سب کو یہ دیکھ کر افسوس ہوگا کہ آپ اُس بلندی سے نیچے اتر آئے جہاں آپ ہمارے ہمیشہ ممدوح رہے ہیں۔''

گاندھی بنام پرائیوٹ سکریٹری ٹو وائسرائے مورخہ 11 رمئی 1919

ہندوستان میں سچ مچ واقعات بڑی تیزی سے رونما ہو رہے ہیں۔ ہم بیک وقت اتنی

---

(1) پطریل (Petrel) شمالی ایٹلانٹک کا ایک پرندہ جس کے پر سیاہ و سفید ہوتے ہیں اور جس کو اکثر طوفانوں سے وابستہ سمجھتے ہیں۔

ساری سرنگوں پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ معلوم نہیں کون سی سرنگ کس وقت پھٹ جائے۔ افغانستان کی خبر موجودہ صورت حال کو اور پیچیدہ بناتی ہے......

''آپ کا خط آنے کے پہلے ہی میں نے اپنے طور پر اس کی کوشش شروع کر دی تھی کہ اپنی سرحدوں کے اندر پُرامن ماحول قائم رہے، مجھے اس کا اعتراف ہے کہ صورتِ حال نازک ہے۔ اس بات کا یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اندرونی امن وامان قائم رکھنے کے لیے میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دوں گا، لیکن اگر حکومت کی جانب سے مجھے کوئی مدد نہیں ملتی تو میرا وزن کچھ بھی نہ رہے گا۔ میں صرف یہ مدد چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مسئلے پر اطمینان بخش اعلان کیا جائے اور راوَلٹ ایجی ٹیشن واپس لیا جائے۔ اگر یہ مدد مل سکے تو میرا خیال ہے کہ بے شک وشبہ آپ ہندوستان کو مطمئن کر سکیں گے۔''

یہ صاف ظاہر ہے کہ حکومت ہند گاندھی کو اپنی طرف رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ ان کی رائے پر چلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی 1920 کے وسط تک اس نے گاندھی کو ایک باغی سمجھ کر اُن سے بالکل ہی ہاتھ دھولیا تھا۔ گاندھی کے بارے میں لارڈ چیمسفورڈ کی بھی وہی رائے ہوگئی تھی جو اُن کے دہلوی صلاح کاروں بلکہ صوبائی مرکزوں اور ضلعوں کے بیشتر برطانوی افسروں کی تھی۔ لیکن سکریٹری آف اسٹیٹ کو مطمئن کرنا اُن کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان بنام وائسرائے مورخہ 12 اگست 1919

گاندھی کے تحریکات۔ مہربانی کر کے اپنے 5/ اگست کے تار کی طرف رجوع کریں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں آپ کے یا مقامی حکومت کے خیالات سے اتفاق نہ کر سکوں۔ لائڈ[1] سے بات چیت کے بعد گاندھی اس پر راضی ہو گئے تھے کہ وہ فی الحال ستیہ گرہ کا خیال چھوڑ دیں گے۔ ابھی تک میرے علم میں ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ ہندوستان کے کسی حصے میں بھی گاندھی کی آمد کا غیر سکون بخش اثر پڑا ہو۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ جو لوگ کھلم کھلا قانون توڑ رہے ہوں، اُن کی نقل وحرکت پر پابندی لگانے کی افسوسناک ضرورت پیش آسکتی ہے لیکن ایسے شخص پر پابندیاں کیوں لگائی جائیں جس کا رویہ برا نہ ہو؟

(1) سر جارج لائڈ، گورنر بمبئی پریسیڈنسی

وائسرائے بنام سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان مورخہ 14 اگست 1919

گاندھی اپنے تار مورخہ 12 ماہ رواں کی طرف رجوع کریں۔ گاندھی کی مجرمانہ حماقتوں کا دردناک تجربہ مجھے بھی ہے اور مقامی حکومتوں کو بھی۔ میں نے تمام صوبوں کے سربراہوں کے سامنے پابندیاں منسوخ کرنے کا مسئلہ رکھا۔ اِن میں سے تقریباً سبھی نے اپنے اپنے حلقہ ہائے کار میں گاندھی کو رہنے دینے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ ہمیں آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ گاندھی کی موجودگی کا سکون بخش اثر پڑتا ہے۔ ہمارا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ گاندھی لگاتار ہمیں قانون شکنی کی دھمکیاں دیتے رہے ہیں اور انھوں نے صرف سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا اعلان کیا ہے۔

سکریٹری آف اسٹیٹ بنام وائسرائے مورخہ 15 اگست 1919

براہِ کرم اپنے نجی ٹیلی گرام مورخہ 14 ماہ رواں کی طرف دھیان دیں۔ اس موضوع پر ہماری گفت وشنید کو طول دینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ پھر بھی یہ کہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں ہنوز آپ سے اور مقامی حکومتوں کے خیالات سے متفق نہیں ہوں۔ میں نے آج تک ایک واقعہ بھی ایسا نہیں سنا ہے کہ جس میں گاندھی کی موجودگی کا سکون بخش اثر نہ ہوا ہو۔ احمد آباد اور بمبئی میں حالیہ فسادات کے دوران، بہار واُڑیسہ میں اور جنوبی افریقہ میں ہر جگہ یقیناً اچھا ہی اثر پڑا ہے۔ اس کے علاوہ میں اس بات کو شدت سے ناپسند کرتا ہوں کہ امن وامان قائم رکھنے کی کوشش میں اکھاڑے کے چاروں طرف گھیرا ڈالنے کی کوشش کی جائے اور میں اس پالیسی کو بڑی حد تک پنجاب کی آتش افروز صورت حال کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ تیسرے میرے خیال میں گاندھی نے سول نافرمانی کو ختم کرنے کی بجائے ملتوی اس لیے کیا ہے کہ پسپائی کے لیے ایک راہ نکالی جائے اور انھوں نے لائڈ سے وعدہ کیا ہے کہ پہلے سے نوٹس دیئے بغیر وہ پھر سے نافرمانی شروع نہ کریں گے۔ لائڈ کو اطمینان ہے کہ وہ سول نافرمانی کی تجدید کرنا نہیں چاہتے اور جہاں تک میں نے سنا ہے گاندھی اُن لوگوں میں ہیں جو وعدے کے پابند ہیں۔''

ان سب باتوں کے باوجود وہائٹ ہال پر مقامی حکام کے اثر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہی سکریٹری آف اسٹیٹ 1922 میں گاندھی کی گرفتاری پر زور دینے اور اس بات

پر تعجب کا اظہار کرنے لگا کہ اس میں دیر کیوں کی جا رہی ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ صرف 1920 کے جاڑوں اور گرمیوں کے واقعات میں گاندھی کے وفادار سے باغی ہو جانے کے اسباب وعلل کی تلاش کرنا ایک سطحی تفہیم کی کوشش ہوگی۔ ان واقعات سے اس ذہنی عمل کی تکمیل ہوگئی جس کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا۔ 1920 کے شکست خواب کی شدت سے اُس خواب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جسے وہ سینے سے لگائے ہوئے تھے وہ خواب یہ تھا کہ جنگ کے بعد مشکل کے وقت رعایا کی جانب سے دی گئی امداد کا احسان ماننے والی سلطنت ایک نئی زمین اور نیا آسمان تعمیر کر دے گی۔ حکومت ہر طرح کے شورشوں کو ناقابل برداشت سمجھتی رہی اور گاندھی اس پر زور دیتے رہے کہ سیاسی یا اقتصادی بے انصافی کی پر امن طور پر مخالفت ایک پیدائشی حق ہے۔ اسی صورت میں ٹکراؤ ناگزیر ہی تھا۔ یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ ٹکراؤ کیوں ہوا۔ بلکہ تعجب اس پر ہے کہ اس میں اتنی دیر کیوں لگی۔ جب تک جنگ جاری تھی، گاندھی انتظامیہ کو الجھنوں میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے اور انتظامیہ بھی اُن کی ہمدردی سے اپنے کو اس طرح محروم کر لینے میں پس و پیش کر رہی تھی کہ پھر تلافی ہی نہ ہو سکے کوئی حکومت، وہ بھی غیر ملکی حکومت، رعایا کے اِس حق کو تسلیم ہی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس کے قوانین اور انتظامیہ کو للکار سکے چاہے یہ للکار پُر امن ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے جب گاندھی نے پنجاب میں سرکاری زیادتیوں اور ترکی میں برطانوی پالیسی کے خلاف احتجاج کے طور پر پُر امن بغاوت کی سرداری قبول کر لی تو حکومت سے اس کی توقع فضول تھی کہ وہ اِس چیلنج کو قبول نہ کرے گی۔

گاندھی میں بے انتہا بھل منساہت اور انسانیت تھی کہ وہ سیاست کے معاملے میں بھی تقریباً جذباتی تھے۔ 1919 کے خاتمے اور 1920 کے شروع کے مہینوں میں وہ پورے افق کا جائزہ اس خیال سے لے رہے تھے کہ شاید کوئی اشارہ ایسا بھی مل جائے جس سے برطانوی انصاف کی فرماں روائی پر ان کا اعتقاد از سر نو قائم ہو سکے۔ وہ ہر تنکے کو مضبوطی سے پکڑتے تھے۔ 1919 کے جس شاہی اعلان، کا استقبال انھوں نے ایک نئے دور کا بشارتی کہہ کر کیا تھا، وہ ایسے موقعوں پر استعمال کیے جانے والے مبارک بادی جملوں کا فقط ایک طریقۂ اظہار نکلا اور بس۔ کم از کم ہندوستان میں ملک معظم کی حکومت اس اعلان کی روح تک نہ پہنچ پائی۔ گاندھی نے یہ محسوس

کیا کہ خلافت اور پنجاب دونوں ہی مسئلوں پر حکومت کہتی کچھ اور تھی اور کرتی کچھ اور چوں کہ وہ فطرتاً دوسروں پر بھروسہ کرتے تھے اس لیے جب تک حکومت کے خلوص پر انھیں اعتماد رہا، وہ حکومت کے لیے بہت سی گنجائشیں نکالتے رہے۔لیکن جب وہ اعتماد ہی متزلزل ہوگیا تو انھوں نے برطانوی راج کو بالکل ہی نئی روشنی میں دیکھنا شروع کیا۔ایک وقت وہ تھا کہ انھوں نے انفرادی کج رویوں کو حکومت کی کوتاہیوں کا ذمہ دار قرار دیا تھا،اب اگر حکومت میں کوئی خوبی نظر آتی تو وہ اُسے اتفاقی یا ضمنی سمجھنے لگے۔انھوں نے ''ینگ انڈیا'' (21 دسمبر 1931) میں لکھا کہ ''میں کہا کرتا تھا کہ ایسی کوئی ریاست نہیں ہے، چاہے وہ نہرو اور مسولینی ہی کی کیوں نہ ہو، جس میں کوئی نہ کوئی خوبی موجود نہ ہو۔لیکن جب ہمیں پورے نظام میں عدم تعاون کرنا ہو تو ہمیں سب کچھ مسترد کر دینا ہوگا۔ برطانوی حکومت کے فائدہ بخش ادارے اس افسانوی سانپ کے مانند ہیں جس کے سر پر ایک انتہائی چمک دار جواہر ہو لیکن جس کے پھن میں زہر بھرا ہو......

باب24

ایک سال میں سورج

گاندھی نے خلافت کمیٹی اور انڈین نیشنل کانگریس کے سامنے حکومت سے اہنسا پر مبنی عدم تعاون کا جو پروگرام پیش کیا تھا، وہ حکومت کو کتنا ہی انقلابی کیوں نہ لگا ہو، لیکن اس میں وہی تمام عناصر موجود تھے جو مدتوں سے گاندھی کی شخصیت اور فلسفے کا جزو بن چکے تھے۔ انھوں نے 1909 میں لکھا تھا کہ ''انگریزوں نے ہندوستان کو لیا نہیں ہے بلکہ ہم نے انھیں دے دیا ہے۔ وہ ہندوستان میں اپنی طاقت کے بل بوتے پر نہیں ہیں بلکہ اس لیے ہیں کہ ہم انھیں یہاں رکھے ہوئے ہیں۔[1] ایک سال بعد انڈین نیشنل کانگریس کے نام ایک پیغام میں انھوں نے یہ تجویز رکھی تھی کہ وہ بہت سی خرابیاں جن میں ہندوستان مبتلا ہے، اُن کا تیر بہدف علاج مقاومت مجہول ہے۔ اس لیے جب وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ حکومت میں اپنے کو خود سے سدھرنے کی صلاحیت نہیں ہے اور وہ اصلاح کی منزلوں سے گزر چکی ہے تو انھوں نے یہ نظریہ اپنایا کہ رعایا کو قدیم الایام سے یہ حق حاصل رہا ہے کہ اُس حاکم کی مدد نہ کرے جو بُری طرح حکومت کرتا ہے۔[2] انھوں نے رسمی اسکولوں کا بائیکاٹ کر کے قومی اسکول قائم کرنے کی جو اسکیم بنائی اس کے بارے میں اُن کے

---

(1) گاندھی: ہندسوراج: 37

(2) خط بنام لارڈ چیمسفورڈ مورخہ 22 جون 1930ء

نمایاں ہم عصروں مثلاً رابندر ناتھ ٹیگور، مدن موہن مالویہ سری نواس شاستری اور سی آرداس، کو شبہات تھے لیکن گاندھی اپنے بچوں پر تجربہ کر چکے تھے انھوں نے اسکولوں میں انگریزی کے استعمال کی اس بنا پر تنقید کی تھی کہ اس سے ہندوستانی بچے اپنے ہی ملک میں اجنبی بن جاتے تھے۔ وہ جو کچھ کہتے اُس پر عمل بھی کرتے تھے۔ 1915 میں انھیں جو استقبالیہ ایڈریس دیا گیا تھا اُس کا جواب گجراتی میں دے کر کیا انھوں نے بمبئی کے ممتاز طبقے کو محوِ حیرت نہیں کر دیا تھا اور کیا 1918 کو جنگی کانفرنس میں ہندی میں بول کر انھوں نے وائسرائے اور اُس کے ساتھیوں کی دل آزاری کا سامان مہیا نہیں کیا تھا؟

جہاں تک ہندوستانی عدالتوں کا تعلق ہے، اُن کے بارے میں انھوں نے اپنا فیصلہ 1908 کے ہند سوراج ہی میں سنا دیا تھا۔ ''وکیلوں نے ہندوستان کو غلام بنا دیا ہے، ہندو مسلم تفریق کو ہوا دی ہے اور انگیزی اقتدار کو مستحکم بنایا ہے۔'' ہندوستان میں مقدمات کی تاخیر اور اُن پر مصارف کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اور اس کی تشریح کی مزید ضرورت نہیں۔ موتی لال نہرو نے جو ملک کے کامیاب ترین وکیلوں میں تھے، مقدمہ بازی کے برباد کن نتائج کو اس کہاوت سے واضح کیا تھا کہ ''ہندوستان میں جو جیتا سو ہارا اور جو ہارا سو مرا۔

تحریک عدم تعاون کا دوسرا شاخسانہ سودیشی یا ملکی اشیاء کا استعمال تھا۔ اس کی تبلیغ بھی وہ جنوبی افریقہ سے واپسی کے وقت سے ہی کرتے چلے آرہے تھے۔ انھوں نے فروری 1916 میں عیسائی مشنریوں کی ایک کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک اس ملک میں خود اپنے لیے زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے۔ ہندوستان لنکا شائر کی خاطر زندہ نہیں رہ سکتا۔[1] عدم تعاون کی تحریک کے دوران بدیشی کپڑوں کے بائیکاٹ اور ہاتھ کے کتے اور بُنے کپڑے (کھادی) کے استعمال کے لیے اُن کے پرچار کا حکومت اور بیشتر قوم پروروں نے یہ مطلب نکالا کہ یہ برطانیہ کے سب سے نازک مقام، یعنی ہندوستان سے اس کی تجارت پر چوٹ تھی۔ لیکن گاندھی کے نقطۂ خیال سے بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ کسی طرح بھی دباؤ ڈالنے کی چال نہ تھی بلکہ

(1) انیٹسن: ''مہاتما گاندھی کی تحریریں اور تقریریں'' Speeches and Writing fo Mahatma Gandhi ص:341

ہندوستان کی قدیم ترین گھریلو صنعت کے احیاء کا ذریعہ تھی۔ زمین پر بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے، کسان کو مدتوں سے زراعت سے پوری روزی فراہم نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے ہاتھ کی کتائی سے معمولی سال میں وہ کچھ اور کمائی کر سکتا تھا اور قحط اور سیلاب کے زمانے میں اس کے لیے یہ بنی بنائی بیمہ پالیسی ہو سکتی تھی۔ گاندھی نے کتائی کی سفارش عوام سے اقتصادی بنیاد پر اور پڑھے لکھے سے روحانی بنیاد پر کی کیوں کہ اس سے ملک کے غریب ترین لوگوں سے ایک رشتہ قائم ہوتا تھا۔ گاندھی کی نگاہ میں کھادی ہندوستانی عوام کی بیداری کسوٹی بھی تھی۔ جو ملک بدیشی کپڑوں پر ہونے والے ساٹھ کروڑ روپے سالانہ بچا سکے اور اُسے کتائی اور بنائی کرنے والوں میں اُن کے دیہاتی گھروں تک پہنچ کر بانٹ سکے۔'' اس میں تنظیم اور محنت کی ایسی طاقت آ چکی ہوگی کہ وہ اپنی عضوی نامیات کے لیے ہر ضروری کام انجام دے سکے گا۔''

جہاں تک کاؤنسلوں کے بائیکاٹ کا تعلق ہے، یہ سوال کانگریس میں پہلے سے جھگڑے کی بنیاد بنا ہوا تھا اور آگے بھی اس پر رسہ کشی ہونا تھی۔ گاندھی اس دعوے کے حق میں نہیں تھے کہ سلف گورنمنٹ (حکومت خود اختیاری) کے لیے لیجسلیچر ایک ضروری تربیت گاہ ہے۔ اُن کے لیے اس حکومت عملی میں بھی کوئی کشش نہیں تھی کہ لیجسلیچروں (قانون ساز ایوانوں) پر اندر گھس کر توڑنے کے لیے قبضہ جمانا چاہیے ابھی دسمبر 1919 ہی کی بات تھی کہ انھوں کے مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کو بُرے بھلے جیسے بھی ہوں قبول کیے جانے کی وکالت کی تھی کیوں کہ اس وقت تک انھیں برطانوی خلوص پر تھوڑا بہت یقین تھا۔ جب وہ یقین جاتا رہا تو یہ کاؤنسلیں ہندوستانی قوم پروروں کی راہ میں انھیں لال ہرنگ مچھلیاں[1] نظر آنے لگیں۔

مختصر لفظوں میں یہ تھا وہ پروگرام جو گاندھی نے ہندوستان کے سامنے رکھا۔ برطانوی عدالتوں، اسکولوں، کاؤنسلوں اور کپڑوں کا بائیکاٹ۔ گاندھی نے یہ دعویٰ کیا کہ اُن کی تحریک غیر آئینی نہیں تھی۔[2] بظاہر اُن کے لغت میں (آئینی) اور اخلاقی، مرادف اصطلاحیں تھیں۔ برطانیہ

---

(1) ہرنگ مچھلی جو نمک اور دھوئیں میں اس طرح پکی ہو کہ لال ہو جائے۔ یہ مچھلیاں بحر اٹلانٹک میں ہوتی ہیں اور ساحل تک جھنڈ کے جھنڈ بنا کے آتی ہیں اور کھانے میں بہت استعمال ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ انگریزی میں محاورہ بن گئی ہے۔

(2) مہاتما گاندھی کی تحریریں ار تقریریں، ص:523

نے محسوس کرلیا کہ اگر یہ پروگرام کامیاب ہوگیا تو اس کا سارا نظم ونسق مفلوج ہوجائے گا۔ پہلے تو لارڈ چیمسفورڈ نے اِسے ''تمام احمقانہ اسکیموں میں سب سے زیادہ احمقانہ اسکیم'' بنا کر مذاق ہی مذاق میں ختم کردینا چاہا کیوں کہ (اُن کے خیال میں) اس سے اُن سبھی لوگوں کو تباہی آتی جو حکومت سے وابستہ تھے وہ ملکیت رکھنے والے طبقے کے دلوں میں بھی ڈر پیدا کرنے کی اعلانیہ کوشش کررہے تھے۔ کئی ''معتدل'' لیڈروں نے عوامی تحریک عدم تعاون میں مضمر خطروں پر زور دے کر سرکاری مبصروں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ محمد علی جناح نے دسمبر 1920 کے ناگپور اجلاس میں ''ٹھہر جانے'' کا نعرہ بلند کیا۔ گوکھلے کے سیاسی وارث، سری نواس شاستری اپنے اہل ملک کو اُس راہ کے خطرات سے آگاہ کیا جس راہ پر وہ بہک کے چل پڑے تھے اور حکومت کی اندھا دھند مخالفت میں غیر عملی پروگرام اختیار کررہے تھے۔'' رابندر ناتھ ٹیگور جو راؤلٹ بل، کی مخالفت کے زمانے میں ستیہ گرہ کی اس بنا پر تعریف کرچکے تھے کہ یہ ایک مثالی چیز ہے اور بدلہ لینے کی پوشیدہ خواہش کی بزدلی اور خوفزدہ شخص کی مرعوب سپر اندا ختگی دونوں ہی کے خلاف ہے، انھیں ٹیگور نے یورپ اور امریکہ سے واپسی پر 1921 کے آغاز میں 'ماڈرن ریویو' میں عدم تعاون کی تحریک پر تنقید کرتے ہوئے اُسے ایک ''ایسا منفیانہ، علاحدگی پسندانہ اور مایوسانہ نظریہ' بتایا'' جس سے ہندوستان اور مغرب کے درمیان دیوار چین کھڑی ہو جانے کا اندیشہ تھا۔'' گاندھی نے ٹیگور کو (جنھیں وہ ''عظیم نگہبان'' کا لقب دے چکے تھے) ''ینگ انڈیا'' میں ایسے لہجے میں جواب دیا جو شاعر کے جذبات اور اندازِ خطابت کا ہم پلہ تھا۔ انھوں نے اس الزام کی تردید کی کہ اُن کی تحریک منفیانہ یا علاحدگی پسندانہ تھی۔ گاندھی کا استدلال یہ تھا کہ شر سے عدم تعاون ویسی ہی مثبت چیز ہے، جیسے خیر سے تعاون۔ عدم تعاون برطانوی حکومت کو ہندوستانی قوم سے خود اسی کی شرطوں پر تعاون کی دعوت ہے اور یہ ہر قوم کا حق اور ہر اچھی حکومت کا فرض ہے۔'' جہاں تک مغرب سے کنارہ کشی کا سوال ہے اور جس پر ٹیگور نے اظہار افسوس کیا تھا اس کے بارے میں گاندھی نے کہا کہ ہندوستان کے پاس بے عزتی، افلاس اور طاعونوں کے سوا رہا ہی کیا تھا جس میں وہ اشتراک کرے! شاعر کو ہاتھ سے کتے ہوئے کپڑے پر زور دیے جانے پر بھی اعتراض تھا۔ اگر بڑی مشینیں فتنہ ہیں تو چھوٹی مشینیں بھی ہوسکتی ہیں۔ گاندھی نے جواب دیا کہ ''میرے لیے آج تک یہ

ممکن نہیں ہوسکا کہ میں تکلیف میں مبتلا مریض کو کبیر کے گیتوں سے تسلی دے سکوں۔ کروڑوں بھوکے صرف ایک نظم مانگتے ہیں۔ طاقتور غذا''اور چرخا ہی انھیں ایک ایسی امدادی صنعت نظر آئی جو''آسانی سے مہیا ہوسکتی ہے اور غریبی کے مارے دیہاتوں کے لیے گویا آبِ حیات ہے۔''

عدم تعاون کے خلاف سب سے بڑا استدلال، خواہ حکومت کی طرف سے ہو خواہ معتدل، لیڈروں کی طرف سے، یہ تھا کہ اِس سے نراج کے باندھ کے دروازے کھل جانے کا امکان تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وائسرائے کی ایکزیکیوٹیو کاؤنسل کے ایک سابق ممبر سرشنکرن نائر، کی ایک کتاب ''گاندھی اور نراج'' کے رُسوا کن عنوان سے مارچ 1923 میں شائع بھی ہوئی۔ انھوں نے ''ہندسوراج'' سے اقتباس دے کر یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ گاندھی کسی بھی حکومت کے کسی بھی شکل میں مخالف ہیں۔ وہ قانون کی عزت اور جان و مال کی حفاظت کی جڑیں کھود رہے ہیں۔ انھیں پارلیمانی حکومت ناپسند ہے۔ انھوں نے صرف خلافت اور پنجاب کے معاملات کو آئینی اصلاحات کی توڑ پھوڑ کا بہانہ بنالیا ہے اور بدامنی کے ایسے عناصر کو ڈھیل دے رہے ہیں جن کو قابو میں رکھنا اُن کے بس سے باہر ہے۔ گاندھی نے ''ہندسوراج'' کے معیاری اصولوں میں عقیدہ رکھنے سے کبھی روگردانی نہیں کی بلکہ انھوں نے تو خود بے باکی سے اس کا اقرار کیا کہ یہ معیار مٹھی بھر سے زیادہ افراد کو پسند نہ آئیں گے۔ 26 جنوری 1921 کے ''ینگ انڈیا'' میں انھوں نے لکھا ''میں ذاتی طور سے اُس خود اختیاری حکومت کے لیے کوشش کررہا ہوں جس کا اس میں نوکر ہے۔ لیکن آج میری اجتماعی کوششوں کا رُخ قطعی طور سے ایسے پارلیمانی سوراج کے حصول کی طرف ہے جو ہندوستانی عوام کی خواہشات کے مطابق ہو۔ ریلوں اور اسپتالوں کا برباد کرنا میرا مطمحِ نظر نہیں ہے، گو اگر یہ فطری طور سے ختم ہو جائیں تو کیا ہی اچھی بات ہو۔ میں عدالتوں کی مستقل بربادی کی بھی کوشش نہیں کررہا ہوں۔ اگرچہ ایسے مقصد کے حصول کو میں اس قابل سمجھتا ہوں کہ دل سے اس کی خواہش کی جائے اور یہ خیال تو اس سے بھی زیادہ میرے ارادوں سے دور ہے کہ ہندوستان کی ملیں اور مشینیں تباہ ہو جائیں۔ اعلا سادگی اور تیاگ کے لیے لوگ جس قدر آمادہ ہیں اُس سے کہیں زیادہ آمادگی کی ضرورت ہے۔ اس وقت ملک میں پروگرام کے جس حصے پر عمل ہو رہا ہے وہ اہنسا کا ہے لیکن اُس پر بھی ویسا عمل نہیں ہو رہا ہے جو روحِ کتابت کے مطابق ہو۔''

جو لوگ تحریک کو منفیانہ اور خطرناک بتا کر اس کی علانیہ مذمت کر رہے تھے وہ اُن احتیاطی تدابیر کو نظر انداز کر جاتے تھے جو محرک نے اختیار کی تھیں۔ جس تحریک کا مقصد صرف چند اداروں کی شکست وریخت نہیں تھا بلکہ اُس کی جگہ دوسرے ادارے قائم کرنا بھی تھا اس کے لیے عدم تعاون کی نامکمل اصطلاح کئی اعتبار سے گمراہ کن بھی تھی۔ جو طلبہ اور اساتذہ سرکاری اور امدادی اسکولوں اور کالجوں سے باہر نکل آئے تھے ان کو قومی اسکولوں اور کالجوں میں داخلے کی دعوت دی گئی جن وکیلوں اور موکلوں نے عدالتوں کا بائیکاٹ کیا تھا اُن سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے مقدمے ثالثی بورڈوں میں لے جائیں۔ جنھوں نے فوج اور پولیس سے استعفا دیا تھا انھیں کانگریس یا خلافت میں رضا کار بننا تھا۔ درآمدی کپڑے کا بائیکاٹ کر کے ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے کپڑے کو فروغ دینا تھا تا کہ دیہاتوں اور قصبوں میں لوگ پہن سکیں۔ اس طرح اِن بائیکاٹ کے نتیجے میں کوئی خلا پیدا نہیں ہونے دیا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ تحریک کی ہوشیاری سے وقفہ بندی کی گئی تھی۔ گورنمنٹ کو خطابات اور اعزازی عہدے واپس کرنے اور عوامی سول نافرمانی اور ٹیکسوں کی عدم ادائیگی کے درمیان کئی مرحلے تھے جو ہر ایک ضلع یا صوبے کی ڈسپلن کی سطح اور تنظیمی صلاحیت کو نظر میں رکھ کر بنائے گئے تھے۔ اپنے مرکزی کنٹرول سے، گاندھی تحریکِ عدم تعاون کا اتنا ہی کرنٹ گزرنے کی اجازت دیتے جو لوگ قبول کر سکیں اور انھوں نے یہ بات بالکل صاف کر دی تھی کہ اگر کہیں بھی تشدد کی چنگاری نظر آئی تو وہ مین (بجلی کے خزانے) کا سوچ ہی بند کر دیں گے کہ آگ بھڑکنے نہ پائے۔ وہ عدم تشدد پر جو بار بار زور دے رہے تھے وہ امن کی سب سے بڑی ضمانت تھا۔ برطانوی راج کی علامتوں اور اداروں سے عدم تعاون میں انگریزوں سے نفرت کی بھی ممانعت تھی گاندھی نے بار بار یہ اعلان کیا تھا وہ انگریز سے ایسی کوئی بات نہیں کریں گے جو وہ اپنے خون کے رشتے کے بھائی سے نہیں کرتے انھوں نے علی الاعلان یہ بات یاد دلائی کہ اصول کے معاملے میں وہ اپنے بھائی سے بھی عدم تعاون کر چکے ہیں۔

انھوں نے تحریک کے تطہیری حصے اور اس کے درون بین اور اخلاقی پہلوؤں کی طرف عدم تعاون کرنے والوں کو بار بار متوجہ کیا۔ اہنسا، چھوٹ اور لوگوں کی بدعنوانیوں سے بیرونی حکومت مضبوط ہوتی ہے۔ اس لیے عوام کو اِن برائیوں کے مقابلے میں اپنے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرنا

ہوگی۔ وہ جس تسخیر قلوب کی کوشش کررہے تھے وہ تبدیلی پہلے ہندوستانیوں میں اور تب انگریزیوں میں آنا تھی۔ اس کے لیے ہندوستانی عوام کو حکومت کا خوف دلوں سے مٹانا اور فرقہ پرستی، چھوت چھات، شراب خوری، جبری بیگار اور دوسری سماجی برائیوں کو اپنے سے دور کرنا لازم تھا۔

ستمبر 1920 میں گاندھی نے انڈین نیشنل کانگریس کے کلکتہ میں منعقد ہونے والے خصوصی اجلاس میں کہا تھا کہ اگر اُن کے عدم تعاون کے پروگرام کو خاطر خواہ کامیابی ملی تو سوراج ایک سال میں حاصل ہوجائے گا۔ انھوں نے لفظ سوراج کی کوئی منطقی تعریف نہیں کی تھی۔ جواہر لال نہرو لکھتے ہیں ''اسی موضوع پر گاندھی جی پُرلطف طریقے سے مبہم رہتے تھے۔'' ایک موقعے پر انھوں نے ''سوراج'' کی تعریف کرتے ہوئے ''موت کے خوف کا تیاگ'' کہا اور دوسرے موقع پر انھوں نے سوراج کا مطلب ''ہندوستان کے ہر رہنے والے کو اپنا ہی بھائی اور بہن سمجھنے کی صلاحیت'' بتایا۔ تیسری بار سوراج کی یہ تعریف کی گئی کہ ''بے بسی سے چھٹکارا پانے کی عوام کی اہلیت۔'' ان تعریفوں کی خوبی یہ تھی کہ یہ سیدھی سادی قسم کی تھیں۔ ان سے باقاعدہ تشریح نہیں ہوئی تھی بلکہ گاندھی جس قسم کا نظام لانا چاہتے تھے اُس کی صرف ایک جھلک دکھائی دیتی تھی وہ سیاسی توضیح کے قریب تر سب سے پہلے ''ینگ انڈیا'' کی 20 دسمبر 1920 کی اشاعت میں پہنچ پائے۔ اس میں انھوں نے سوراج کے بارے میں لکھا کہ ''جدید اور رائج الوقت اصطلاح میں ہندوستان کی پارلیمانی حکومت''، ممکن ہے کہ ہندوستان کی تعلیم یافتہ رائے عامہ کے حق میں یہ ایک رعایت کی گئی ہو کیوں کہ یہ (پڑھے لکھے) لوگ انگلستان کے جمہوری ڈھانچے کے قریب قریب متفقہ طور پر قدرداں تھے۔ خود گاندھی انگلستان کی پارلیمانی حکومت کی قدر بالکل نہیں کرتے تھے۔ ''ہندسوراج'' میں انھوں نے ''مادر پارلیمنٹ کو'' بانجھ عورت'' سے تشبیہ دی تھی۔ بہرحال انھیں سوراج کی ہیئت کی نہیں بلکہ مواد کی فکر تھی۔ حکومت کے کل پرزوں پر انھیں ٹالسٹائے ہی کی طرح گہرا عدم اعتماد تھا۔ وہ انیسویں صدی کے اس نظریے سے ضرور اتفاق کرسکتے تھے کہ ''وہی حکومت سب سے اچھی ہے جو سب سے کم حکومت کرے۔'' لیکن انھیں یہ پوری طرح معلوم تھا کہ اُن کے رفیق اور پیرواُن کے ساتھ اِس حد تک جانے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے معاملہ اِس مرحلے پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا کہ وقت آنے پر سوراج کی اسکیم عوام کے نمائندے

مرتب کریں گے۔ سبھاش چندر بوس نے لکھا کہ ایک سال کے اندر سوراج کا وعدہ خلاف عقل ہی نہیں بچکانہ بھی تھا۔[1] بادی النظر میں یہ نظریہ بڑی ہی خوش فہمی پر مبنی معلوم ہوتا تھا کہ وہ برطانوی سلطنت جو ایک صدی سے زیادہ قائم تھی اسے ایک سال کی مدت میں عدم تشدد پر مبنی ایجی ٹیشن کے ذریعے اکھاڑ پھینکا جاسکتا ہے۔ لیکن گاندھی کی رائے میں لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے دل سے ڈر کو دور کرنے اور ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط بنانے کے لیے ایک سال کی مدت کافی تھی۔ ہندوستانی عوام کی اخلاقی قلب ۔ ماہیئت برطانوی حکومت اور برطانوی عوام کی قلب ماہیئت کا پیش خیمہ ہوسکتی تھی۔ گاندھی نے لکھا کہ ''آزادی، ولادت کی طرح ہے۔ جب تک ہم پوری طرح آزاد نہیں ہوجاتے ہم غلام ہیں۔ ہر ولادت بس ایک لمحے میں ہوجاتی ہے۔'' انھوں نے اعلان کیا کہ میں نے ملک کے سامنے ایک عملی پروگرام رکھا ہے۔ اگر قوم زمانہ دراز کی لعنت (چھوت چھات) سے چھٹکارا حاصل کرسکے، شراب نوشی کی عادت ترک کرسکے اور جو فرصت کا وقت ملے اس میں 60 کروڑ روپیوں کی مالیت کا کپڑا ایک سال میں تیار کرسکے، تو اُس قوم کی قلب ماہیت ضرور ہوجائے گی۔ ایسی قوم میں اتنی ڈسپلن، ہمت اور خود اعتمادی آجائے گی کہ وہ برطانیہ کو یقین دلا سکے کہ ہندوستان سے صرف مساویانہ اشتراک کی بنیاد پر سلوک کیا جاسکتا ہے۔ سوراج برطانیہ کے تحفے کے طور پر آنے والا نہیں تھا۔ گاندھی نے لکھا تھا کہ ''پارلیمانی ایکٹ ہندوستانی عوام کی اعلان کردہ خواہشات کی محض شائستہ تائید ہوگی جیسا کہ یونین آف ساؤتھ افریقہ کے معاملے میں ہوا تھا۔

---

(1) بوس، ایس سی: انڈین اسٹرگل، کلکتہ، 1948ء، ص: 104

باب25

کانگریس مہاتما کے نقش قدم پر

خلافت کمیٹی نے حکومت سے عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کے پروگرام کو گاندھی کی قیادت میں منظور کر لیا تھا لیکن انڈین نیشنل کانگریس کی منظوری کے بغیر اس کو قومی پروگرام کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے مسئلے کو اتنا اہم سمجھا کہ اس کے لیے مکمل اجلاس طلب کیا۔ سالانہ اجلاس دسمبر 1920 میں ناگپور میں ہونے والا تھا لیکن حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے اس لیے ستمبر میں کلکتہ میں ایک خصوصی اجلاس بلایا گیا اور لالہ لاجپت رائے نے اس کی صدارت کی۔ اس اجلاس کے خاص رزولیوشن کی عبارت یہ تھی کہ ''دو زیادتیوں کی تلافی کے بغیر (یعنی خلافت اور پنجاب) ہندوستان میں سکون نہیں ہو سکتا۔ اور قومی وقار کی لاج رکھنے اور مستقبل میں ایسی زیادتیوں کے انسداد کا واحد موثر ذریعہ سوراج (خود اختیاری حکومت) کا قیام ہے۔ کانگریس کا یہ بھی خیال ہے کہ اب ہندوستانی عوام کے لیے سوائے اس کے کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا ہے کہ وہ تدریجی غیر متشددانہ عدم تعاون کی راہ اُس وقت تک اپنائے رہیں جب تک کہ اِن زیادتیوں کا ازالہ نہ کر دیا جائے اور سوراج قائم نہ ہو جائے۔''

گاندھی کے آندھی جیسے دوروں اور پریس میں اُن کے بولتے ہوئے مضامین نے پہلے ہی سے ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔ لیکن شروع شروع میں بیشتر کانگریس لیڈروں کا ردّعمل شک و شبہ

کا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ گاندھی بہت تیز اور بہت دور چلے جا رہے ہیں۔ عدم تعاون کے پروگرام یا اس کے بعض اجزاء کے مخالفین میں لالہ لاجپت رائے بھی شامل تھے جو اپنے زمانے کے سب سے ممتاز پنجابی رہنما اور کانگریس کے کلکتہ سشن کے صدر تھے۔ ان کے علاوہ سی۔ آر۔ داس اور بی، سی پال تھے جو بنگال کی دوسب سے زیادہ ذی اثر شخصیتیں تھیں۔ پھر اینی بیسنٹ تھیں جن کے ہوم رول کی تحریک جنگ کے زمانے میں ہندوستانی سیاست پر چھائی ہوئی تھی اور مدن موہن مالویہ، جناح اور معتدل، رنگ کے اور بہت سے لیڈر تھے۔

جنوبی افریقہ سے واپسی کے بعد گاندھی نے کانگریس کی تقریباً سبھی اجلاسوں میں شرکت کی تھی۔ اگرچہ اُن کی عزت ہوتی تھی اور وہ سمندر پار کے ہندوستانیوں کے مسائل پر ایک سند کی حیثیت رکھتے تھے لیکن ان کی نہ اپنی کوئی پارٹی تھی اور نہ کوئی پیرو۔ امرتسر کے اجلاس (1919) میں انھوں نے زیادہ عملی حصہ لیا تھا لیکن وہاں انھوں نے تلک، موتی لال نہرو، مالویہ اور سی آر داس ہی کو سب سے زیادہ نمایاں بنائے رکھا۔ اگست 1920 میں تلک مر گئے اور دوسرے آزمودہ لیڈر جو شریک اجلاس تھے سب کے سب عدم تعاون کے پروگرام کے بارے میں مبتلائے شک تھے۔ ابھی تک سیاست کا مطلب یہ تھا کہ قانون ساز مجلسوں کے اندر اور باہر تقریریں کی جائیں۔ بیانات نکالے جائیں، گورنروں اور وائسرایوں سے ملاقاتیں کی جائیں اور آخر کار انگلستان میں وفد لے جائیں ہر مجسٹی کی حکومت کے وزیروں سے ملاقات کی جائے۔ دراصل کلکتہ کانگریس میں کسی معمولی شخص نے نہیں بلکہ خود سی آر داس نے یہ تجویز رکھی تھی کہ کانگریس کے مطالبات کو پر زور طور پر پیش کرنے کے لیے ایک وفد انگلستان بھیجا جائے۔ کاؤنسلوں کے بائیکاٹ کی گاندھیائی اسکیم کی مخالفت کی سربراہی سی آر داس نے کی تھی اور دلیل یہ دی تھی کہ کانگریس حکومت کے خلاف جنگ میں ترجیحی نقاط سے محروم ہو جائے گی۔ وہ آئر لینڈ کے ماڈل پر ہر محاذ پر گورنمنٹ کے کام میں رُکاوٹ کے حامی تھے چاہے وہ محاذ قانون ساز اسمبلیوں کے اندر ہو یا باہر، کیوں کہ اس سے انتظامیہ کے لیے الجھن بڑھے گی اور اس کا وقار گھٹے گا۔ اِس طریق خیال سے بہت سے کانگریس لیڈر متفق تھے۔ اور گاندھی کے خیالات سے بہت مختلف تھے۔ گاندھی اِن مخالفین کی راہ میں صرف رکاوٹیں ڈالنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان سے اپنی رائے منوانا بھی چاہتے تھے۔

کلکتہ کانگریس میں عدم تعاون کا رزولیوشن 1855 ووٹوں کی موافقت اور 873 ووٹوں کی مخالفت سے پاس ہوا۔ اس ساعت فتح میں گاندھی نے غیر معمولی ضبطِ نفس اور انکسار کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے اپنے معترضین کو نہ تو برگشتہ خاطر ہونے دیا اور نہ ان کی نیت پر شک کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند مہینوں کے اندر سی آر داس، لاجپت رائے اور دوسرے قائدین عدم تعاون کی تحریک کے ہراول دستے میں نظر آنے لگے۔ کانگریس کو تقسیم کیے بغیر، گاندھی اپنے انتہا پسندانہ پروگرام کو چلانے میں کامیاب ہو گئے۔

جب پچیس برس کی عمر میں ناٹالی ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے لڑنے کی خاطر گاندھی نے ناٹال انڈین کانگریس قائم کی تھی اُسی وقت انھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ کوئی سیاسی پروگرام تبھی کامیاب ہو سکے گا جب تک کہ اس کو بروئے کار لانے کے لیے معقول تنظیم بھی ہو۔ اب اگر انڈین نیشنل کانگریس کو غیر متشددانہ عدم تعاون کا کارگزار آلۂ کار بنانا تھا تو اس کی تشکیل نو لازمی تھی۔ گاندھی نے اس کو محسوس کر لیا کہ ملک کو ایسے فورم کی ضرورت نہیں تھی جو ایک سالانہ پرشکوہ منظر اور خطابت کے اعلیٰ نمونے پیش کرے بلکہ ایک لڑنے والی تنظیم کی ضرورت تھی جس کا عوام سے براہ راست رابطہ ہو۔ کانگریس کے دسمبر 1920 کے اجلاس میں انڈین نیشنل کانگریس کا ترمیم شدہ آئین، جو زیادہ تر گاندھی ہی کا تیار کردہ تھا، پاس کیا گیا۔ اس میں کانگریسی عقیدہ یوں بیان کیا گیا۔ ہر جائز اور پُر امن طریقے سے سوراج کا حصول۔ اس طرح کانگریس کے آئین کے حدود اربعہ میں ستیہ گرہ داخل ہو گئی۔ گاؤں کانگریس کمیٹی کانگریس کی سب سے چھوٹی تنظیمی اکائی قرار پائی۔ اس طرح کی کئی کمیٹیوں کو ملا کر منڈل کانگریس کمیٹی اور کئی منڈل کانگریس کمیٹیوں سے تحصیل کمیٹی، تحصیل کانگریس کمیٹیوں سے ضلع کانگریس کمیٹیاں بننے والی تھیں اور پھر یہ ضلع کانگریس کمیٹیاں صوبائی کمیٹی کا انتخاب کرنے والی تھیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں صوبوں کی نمائندگی کے لیے 350 نمائندے شامل ہونا تھے۔ اس طرح کانگریس ایک چوڑی سطح کی تنظیم بن گئی۔ کوئی بھی شخص جو کانگریس کے عقیدے سے متفق ہو اور چار آنہ سالانہ چندہ ادا کرے وہ اس تنظیم کا ممبر ہو سکتا تھا۔ سال کے کانگریس صدر کی قیادت میں ایک چھوٹی سی مجلس عاملہ کانگریس کی سب سے بڑی عاملہ قرار پائی۔ اس طریقے سے کانگریس کی تشکیل جدید نہ صرف زیادہ نمائندہ بنیادوں پر ہوئی بلکہ اب یہ اس قابل بھی

ہوگئی کہ دو اجلاسوں کے درمیان پوری اہلیت کے ساتھ کام کرتی رہے۔ یہ اب اعلیٰ اور متوسط طبقوں کی اجارہ داری نہیں رہ گئی بلکہ اس کے دروازے ان چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں کے عوام کے لیے بھی کھل گئے جن کی سیاسی بیداری کی رفتار گاندھی تیز کر رہے تھے۔

کلکتہ کے خاص اجلاس میں تین مہینے پہلے جو فیصلہ کیے گئے تھے اُن پر دسمبر 1940 کے ناگپور اجلاس میں مہر تصدیق ثبت کر دی گئی۔ عدم تعاون کے پروگرام کی مخالفت بڑی مشکلوں سے ختم ہوئی۔ کانگریس کے اس جلاس کے صدر جے جے راگھو آچاریہ مخالف تھے اور مختلف درجوں میں کیلکر، جناح اور اینی بیسنٹ بھی۔ خوش قسمتی سے سی آر داس کو موافق بنا لیا گیا، کیوں کہ کاؤنسلوں کا بائیکاٹ اب کوئی زندہ سوال نہیں رہ گیا تھا۔ کاؤنسلوں کے الیکشن پہلے ہی تمام ہو چکے تھے۔ عام مندوبین کا جوش وخروش لیڈروں تک متعدی مرض کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔ عدم تعاون اب باضابطہ پروگرام بن گیا اور گاندھی کانگریس کے متفقہ لیڈر مان لیے گئے۔ اُس وقت سے اپنی موت کے وقت تک گاندھی انڈین نیشنل کانگریس اور ہندوستانی سیاست کو بے مثال طور پر متاثر کرتے رہے۔ یہاں یہ سوال بالکل برمحل ہوگا کہ گاندھی اس سب سے زیادہ نمایاں مقام تک کیسے پہنچے؟

جب 1915 کے اوائل میں گاندھی جنوبی افریقہ سے انگلستان ہوتے ہوئے ہندوستان لوٹے تو ان کی شخصیت کے گرد فتح کا ہالہ تھا لیکن وہ کسی طرح بھی ہندوستان کی صف اوّل کے سیاست دانوں میں گنے نہیں جاتے تھے۔ مانٹیگو نے 1917 میں اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ اس وقت تلک غالباً ہندوستان کی سب سے طاقتور ہستی ہیں اور اگر وہ چاہیں تو ہماری جنگی کوششوں میں سب سے زیادہ ہماری ماڈی مدد کر سکتے ہیں۔'' جنگ کے دوران اینی بیسنٹ ہندوستانی سیاست پر چھائی رہیں۔ انھوں نے تلک کے ساتھ مل کر جو ہوم رول کی تحریک چلائی تھی اُس سے گاندھی الگ تھلگ رہے۔ گاندھی کی یہ فکر کہ جنگ کے دوران وہ حکومت کو پریشان نہ کریں اور اُن کی یہ وکالت کہ جنگی کوششوں کی غیر مشروط حمایت کی جائے۔ اُن کو زیادہ جنگجو سیاست دانوں سے بالکل کنارہ کش بنا چکی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ بہار اور بمبئی میں انھوں نے چھوٹے پیمانے پر جو ستیہ گرہیں چلائی تھیں اس کے باعث وہ اس ساکھ کو بھی کھو بیٹھے جو انھیں حکومت کی نگاہوں میں حاصل تھی۔ تعلیم یافتہ طبقے پر اُن کے اعتراضات، سیاسی سودے بازی پر اُن کا عدم اعتماد اور اُن کا ایسے مسائل

میں کھوئے رہنا جن پر ستیہ گرہ کی تکنیک نافذ کی جا سکے، ایسے اسباب تھے جن کی بنا پر وہ کانگریس کے اندرون مشاورتی حلقے کے باہر ہی رہے۔ انھوں نے آئینی اصلاحات کی اُس کانگریس۔ لیگ اسکیم کے بنانے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ 1916 کے لکھنو معاہدہ کی شکل میں سامنے آئی تھی اور جو آنے والے دو برس تک کانگریس کا ''پلیٹ فارم'' بنی رہی۔ کانگریس میں خود اُن کی کوئی پارٹی نہیں تھی۔ معتدل، لیڈروں کو اُن کا ستیہ گرہ کا غیر آئینی ہتھیار پسند نہیں تھا اور پسند لیڈر حکومت کی طرف اُن کے سوچے سمجھے اعتدال کو ناپسند کرتے تھے۔

گاندھی ہندوستانی سیاست میں اپنے شرائط پر اور اپنے طریقے پر شامل ہونا چاہتے تھے۔ اُن کے پاس پارٹی نہیں تھی لیکن اُن کے پاس ایسی تکنیک ضرور تھی جس کے وہ خود ہی مصنف بھی تھے اور اُس پر تنہا عامل بھی تیس برس سے زیادہ عرصے سے ہندوستانی سیاست داں تجویزوں، درخواستوں اور وفدوں کے ذریعے سے حکومت کی زیادتیوں کے ازالے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن وہ ذرا بھی آگے نہیں بڑھ پائے تھے۔ چند سر پھرے نو جوان مردوں اور عورتوں نے حکمراں نسل کے خلاف اکاڈ کا تشدد کے مظاہرے بھی کیے تھے لیکن بہتر طور پر منظّم اور بہتر طور پر مسلح دشمن کے خلاف، جس کے پاس موجودہ دور کی حکومتوں کے تمام جابرانہ وسائل موجود ہوں۔ تشدد کا استعمال مہنگا بھی پڑتا اور بے سود بھی ہوتا اور یہ بھی تھا کہ سفید کالر کے کانگریسی لیڈر نہ تو بندوق کی لبلبی دبا سکتے تھے اور نہ بم پھینک سکتے تھے، گاندھی کے آنے سے پہلے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کا رویہ اُس مزدور جیسا تھا جو اپنے مالک کے پاس جا کر تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کرتا تھا اور دھمکاتا تھا کہ اگر یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا تو وہ بدستور خدمت کرتا رہے گا۔'' گاندھی نے زبانی تشدد اور خود کو قربان کرنے والے سیاسی جرم کی حماقت کا ایک عملی متبادل پیش کیا۔

اگر گوکھلے یا تلک زندہ ہوتے تو کیا 1920 میں گاندھی ملک کی قیادت کر سکتے تھے؟ اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے۔ گوکھلے کی موت کے تقریباً چھ برس بعد 1921 میں گاندھی نے لکھا کہ یہ سوچنا بے ادبی ہے کہ اگر گوکھلے زندہ ہوتے تو آج کیا ہوتا؟ مجھے معلوم ہے کہ میں ان کے ماتحت کام کرتا ہوں۔'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ جذبات نے کیا تھا سیاسی امکانات نے نہیں، کیوں کہ سری نواس شاستری اور گوکھلے کے دوسرے ساتھی گاندھی کی تحریک عام میں شامل

نہیں ہوئے۔ جہاں تک تلک کا تعلق ہے گاندھی نے ایک بار اُن کی مثال سمندر سے دی تھی۔ ایک دوسرے کی عزت کرنے کے باوجود، دونوں میں سیاسی راہ کا اختلاف تھا۔ ''سیاست دنیاوی لوگوں کا کھیل ہے۔'' تلک نے ایک بار گاندھی کو لکھا تھا، اور سادھوؤں کا نہیں ہے۔ تلک نے گاندھی کی اس روش پر اعتراض کیا کہ انھوں نے برطانوی جنگی کوشش میں غیر مشروط مدد کی پیش کش کی۔ حکومت جب تک لوگوں کو اس کے بدلے میں کچھ نہ دے وہ حکومت سے کوئی تعاون نہ کریں گے۔ وہ موثر اقدام کی خاطر حکمت عملی میں تبدیلی کے لیے بھی آمادہ تھے۔ اپنی موت کے پندرہ روز پہلے انھوں نے گاندھی سے کہا تھا کہ وہ ستیہ گرہ کے بارے میں بداعتقاد نہیں ہیں لیکن انھیں اس کے بارے میں شبہ ہے کہ عوام کو اس کے قبول کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے وہ یکم اگست 1920 کو انتقال کر گئے لیکن اگر وہ جیتے بھی ہوتے، امکان اسی بات کا تھا کہ تحریک کی باگ ڈور گاندھی ہی کے ہاتھوں میں ہوتی۔

''مجھے اُن کی رسی علمیت کا دعویٰ نہیں ہے۔ مجھ میں اُن کی سی تنظیمی طاقت نہیں ہے۔ میرے پاس کوئی گٹھی ہوئی اور منظّم پارٹی نہیں ہے جس کی قیادت کروں اور اکیس برس تک ملک بدر ہونے کی وجہ سے میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے بارے میں مجھے لوکمانیہ جیسا علم ہے۔'' یہ وہ الفاظ ہیں جو گاندھی نے تلک کی وفات کے بعد لکھے تھے۔ لیکن ٹھیک اسی وجہ سے کہ وہ پچھلی دہائیوں میں مختلف گروہوں میں سے کسی ایک سے وابستہ نہیں رہے تھے، وہ کانگریس کے مختلف گروہوں کے قابل قبول ہو گئے تھے۔ اور ''ستیہ گرہ'' کے بانی ہونے کی وجہ سے جب کانگریس نے اِن کے پروگرام کو منظور کر لیا تو ان کے لیے کانگریس کی قیادت کرنا ناگزیر ہو گیا۔ لاجپت رائے اور سی آر داس جو ابتداء میں معترض تھے۔ آخر کار اُن کے سپاہی بن گئے اس لیے اس کا امکان ہے کہ تلک جو زندگی بھر برٹش راج کی مخالفت کرتے رہے، (اگر زندہ ہوتے) تو عدم تعاون کی تحریک کے صف اول کے لیڈروں میں ہوتے۔ یہ کہنا کہ تلک گاندھی کے ماتحت نہ ہوتے، مہاراشٹر کے اس عظیم لیڈر کا غلط اندازہ لگانا ہے۔ کیوں کہ ان سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا سوراج ملنے پر وہ وزیر اعظم بنیں گے۔ تو انھوں نے جواب دیا تھا: ''جی نہیں! سوراج ملنے پر میں کسی سودیشی کالج میں ریاضیات کا پروفیسر بنوں گا۔ اور پبلک لائف سے ریٹائر ہو جاؤں گا۔''

اس طرح کی قیاس آرائیوں میں اس کا امکان ہے کہ ہم بنیادی حقیقت نظر انداز کر جائیں کہ عوامی تحریک میں آخری فیصلے کا انحصار عوام پر ہوتا ہے۔ گاندھی کو جیسے آندھی کی کوئی رو 20، 1919ء میں اعلیٰ ترین سطح تک اس لیے اڑا لے گئی کہ انھوں نے ملک کے ذہن کو تسخیر کر لیا تھا۔ لیڈر عوام کے ساتھ قدم ملا کے چلنے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے اور عوام میں گاندھی کی تحریروں اور تقریروں نے ایک نیا جوش اور ولولہ بھر دیا تھا۔ صدر ناگپور کانگریس نے جہاں دسمبر 1920 میں عدم تعاون کی تحریک پر منظوری کی مہر لگائی گئی تھی، صحیح طور پر اِن لفظوں میں اجلاس کا جائزہ لیا تھا کہ ''بجائے اس کے صدر اور لیڈر عوام کو راہ پر لگائیں، عوام نے ان کو اور لیڈروں کو راستے پر لگا دیا۔''

اب گاندھی، مہاتما (روحِ عظیم) بن چکے تھے، اپنی از خود عائد کردہ غریبی، سادگی، انکسار اور روحانیت کی وجہ سے وہ پرانے زمانے کے رشی نظر آنے لگے تھے جو کسی قدیم رزمیہ کے صفحات سے اس لیے باہر نکل آئے تھے کہ اپنے ملک کو آزاد کرائیں۔ نہیں نہیں، کروڑوں کی نظر میں وہ خدا کا اوتار تھے۔ بہار کے دورے کے دوران ایک جگہ ان کی کار کا ٹائر پھٹ گیا۔ اس وقت انھیں سڑک کے کنارے ایک بڑھیا کھڑی دکھائی دی۔ پوچھا کہ ''تم کس کا انتظار کر رہی ہو۔'' میرے بچے، مہاتما گاندھی کون ہیں؟'' اس نے جواب میں پوچھا۔ اب گاندھی بالکل اس کے پہلو میں کھڑے ہو چکے تھے۔ انھوں نے پوچھا'' تم ان سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟'' عورت نے جواب دیا کہ ''وہ اوتار (انسانی قالب میں خدا) ہیں۔'' آنے والی ربع صدی میں، لوگ اُن کے پاس صرف اُن کے پیغام کی خاطر نہیں آتے تھے بلکہ ''درشن'' کے لیے بھی آتے تھے۔ مہاتما کا درشن پاک شہر بنارس کی زیارت کے مترادف تھا۔ عوام کے بے سوچے سمجھے اظہار عقیدت سے بعض وقت انھیں چڑ سی ہو جاتی تھی۔ انھوں نے لکھا کہ ''مہاتماؤں کی مصیبتیں صرف مہاتماؤں ہی کو معلوم ہیں۔'' لیکن وہ عظیم الشان اثر و نفوذ جو انھیں ہندوستان کی پبلک زندگی میں حاصل ہو گیا تھا اُسی کا سرچشمہ یہی عقیدت تھی۔ اُن سے نوجوان اور بوڑھوں دونوں ہی کو تحریک ملتی تھی۔ اپنی آپ بیتی میں جواہر لال نہرو نے ایک ایسے لڑکے کی کہانی بڑے ہی موثر انداز میں لکھی ہے جو عنفوان شباب میں تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں گرفتار ہوا تھا۔ اسے ننگا کر کے ایک کھمبے سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس پر کوڑے برسائے جا رہے تھے جب کوڑا اس کے جسم پر پڑتا اور اُس کی جلد کاٹتا تھا تو نوجوان چلاتا

تھا۔ ’’مہاتما گاندھی کی جے‘‘ آخر کار وہ بے ہوش ہو گیا۔

گاندھی نے ہندوستانی انسانیت کے دلوں کے اندرونی تار چھو لیے تھے۔ بہادری اور قربانی کے لیے اُن کی پکار پر لوگ جوش و خروش سے لبیک کہتے کیوں کہ وہ خود اِن خوبیوں کا مجسمہ تھے۔ چرچل نے انھیں ’’ننگے فقیر‘‘ کا لقب دیا تھا اور وہ ننگے فقیر تھے اور چوں کہ ان کی زندگی سادگی اور نفس کشی کی زندگی تھی۔ اس لیے اُن کے اور ہندوستانی عوام کے درمیان ایک جذباتی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ایسے فقیروں کی تعداد میں بہت جلد اضافہ ہو جانے والا تھا جن لوگوں نے اپنی اچھی اچھی آمدنیوں کے پیشے تیاگ دیے اور گاندھی کی قیادت میں قید خانے جانے والوں کی قطار میں کھڑے ہو گئے ان میں موتی لال نہرو، راجیندر پرساد، سی آر داس، ولبھ بھائی پٹیل اور سی راجگو پال اچاریہ شامل تھے۔ ان کے لیے زندگی میں ایک نئی معنویت پیدا ہو گئی تھی۔ بڑودا کے ایک سابق چیف جسٹس، عباس طیب جی نے انھیں ایک گاؤں سے لکھا کہ وہ اپنے کو بیس سال جواں تر محسوس کر رہے ہیں۔ انھوں نے استعجاب سے کہا ’’یا خدا، یہ کیسا تجربہ ہے! عام لوگوں کے لیے جن کی صف میں شامل ہونا اب باعث افتخار ہے، میرے دل میں کتنی محبت اور الفت امنڈ پڑی ہے۔ فقیر کے لباس ہی نے یہ دیواریں توڑ ڈالی ہیں۔‘‘ موتی لال نہرو نے الہ آباد کے ایوانِ وکالت میں اپنی شاندار پریکٹس تیاگ کر گاندھی کو ایک چھوٹی سی صحت گاہ سے جہاں وہ بیماری کے بعد آرام کر رہے تھے لکھا: دو باورچی خانوں کی جگہ ایک تانبے کے چولھے نے لے لی ہے، پرانے نوکروں کی ٹولی کی جگہ اکیلے خادم نے لے لی ہے جو بہت زیادہ ذہین نہیں ہے۔ ایک پورے خچر کے بوجھ کے کھانے پکانے کے سامان کی جگہ اب چاول دال اور مسالے کی تین بوریاں رہ گئی ہیں۔ شکار کی جگہ لمبی چہل قدمی، اور رائفلوں اور بندوقوں کی جگہ کتابیں، اخبار اور رسالے......اے اہل ملک یہ کتنی بڑی افتاد ہے! لیکن سچ یہ ہے کہ میں نے کسی زندگی میں اس سے زیادہ لطف نہیں اٹھایا۔

اور یہی وہ زمانہ ہے جب جواہر لال نہرو نے تحریر کیا تھا کہ وہ تحریک میں سرتاپا کھو گئے ہیں۔ اور اس تحریک نے انھیں چاروں طرف سے اس طرح گھیر لیا ہے کہ اُن کے تمام روابط اور راہ و رسم پرانے احباب، کتابیں، حتیٰ کہ اخبار بھی چھوٹ گئے ہیں۔ بس اتنے ہی سے سروکار رہ گیا ہے جو پیش نظر کام کے لیے ضروری ہے............میں تقریباً اپنے خاندان، اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو بھول گیا۔‘‘[1]

(1) نہرو، جے ال: ٹوورڈس فریڈم (آزادی کی طرف) آپ کی بیتی: لندن 1945 ص: 77

باب26

نقطۂ عروج

1921 ہندوستان کا سالِ بیداری تھا۔ بڑھتے ہوئے جوش وخروش کی زد میں تحریک عدم تعاون بڑھتی ہی چلی گئی۔ ایک سال کے اندر سوراج، کے امکان نے صدیوں کے بندھن توڑ پھینکے اور خوف کا طلسم ٹوٹ گیا۔ کئی دہائیوں سے سیاست افسردگی کی طرف بہکتی جا رہی تھی۔ گاندھی نے جو قربانی اور ہمت کی دعوتِ عام دی تو سیاست اس جال سے باہر نکل آئی۔ حکومت متفکر تھی لیکن عارضی طور سے گومگو کی حالت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ وہ اس سوچ میں پڑ گئی کہ تشدد کے پرانے طریقوں کے استعمال سے ستیہ گرہ دب جائے گی یا اور ابھرے گی۔

یہ زمانہ گاندھی کے لیے لگاتار حرکت کا تھا جس سے ان کی طاقت برداشت پر ایک حد تک ناقابل تحمل بوجھ پڑ رہا تھا۔ وہ پورے ملک کا دورہ کرتے۔ مقامی لیڈروں سے رابطہ بنائے رکھتے کبھی انھیں راہ دکھاتے کبھی مشورہ دیتے اور کبھی جھڑکتے بھی تھے۔ ان کی روزانہ کی ڈاک بہت زیادہ ہونے لگی تھی اور وہ اس پر ذاتی توجہ کرتے تھے۔ ان کے سکریٹریوں کے لیے ریلوے ٹائم ٹیبلوں پر اور پوسٹ اینڈ ٹیلیگرافس کی گائڈ بکوں کی مدد سے بھی دور دراز کے گاؤں کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا تھا بعض وقت اگر دستخط کا پڑھنا مشکل ہوتا تو وہ دستخط والا ٹکڑا کاٹ کے لفافے پر چپکا دیتے کہ پتے کا کام دے۔ اس طرح لگاتار کام میں گھرے ہونے کے باوجود گاندھی ینگ انڈیا میں

لکھنے کے لیے وقت نکال لیتے تھے اور اس کے صفحات پر اپنی روح نکال کر رکھ دیتے تھے۔ بہت سے ایسے مضامین جن سے ملک کو ہمت ملتی تھی چلتی ٹرین کے تیسرے درجے کے ڈبے میں لکھے گئے تھے۔ پبلک مشغولیتوں کے بعد چار پانچ گھنٹے سونے کو مل جاتے تھے، لیکن یہ نیند بھی ریلوے اسٹیشنوں پر درشن کے لیے سمٹ کر آنے والوں کی شب و روز کی بھیڑ اور جوش وخروش میں اچٹ جاتی تھی۔ کرشن داس کی کتاب ''مہاتما گاندھی کے ساتھ سات مہینے'' میں آسام کے ایک گاؤں کے لوگوں کا ایک دل چسپ قصہ نظر پڑا۔ انھوں نے دھمکی دی تھی کہ جس گاڑی سے مہاتما جا رہے تھے اگر وہ ان کے اسٹیشن پر نہ رکی تو وہ پٹری پر لمبے لمبے لیٹ کر گاڑی روک لیں گے۔ انھوں نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا۔ وہ سوتی رات کو مشعلیں جلائے ڈبے میں گھس آئے اور مہاتما گاندھی کی جے کے نعروں سے ہلچل مچا دی۔

اس طرح کی ہیرو پوجا سے گاندھی دکھی ہوتے تھے۔ انھوں نے باریسال کے ایک مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''جب میں مہاتما گاندھی کی جے'' کے نعرے سنتا ہوں تو اس کا ایک ایک لفظ میرے دل میں تیر کی طرح چبھ جاتا ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یہ خیال ہوتا کہ اس نعرے سے تمھیں سوراج مل جائے گا تو میں یہ دکھ بھی جھیل لیتا لیکن جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ عوام کا وقت اور ان کی طاقت بیکار کی نعرہ بازی میں صرف ہو رہی ہے اور ایسی حالت میں (صرف ہو رہی ہے) ضروری کام کرنے کو پڑا ہوا ہے تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ میرا نام لے لے کر چلانے کی بجائے یہ لوگ میرے لیے ایک چِتا تیار کر دیتے تاکہ میں اس میں چھلانگ لگا کر اس آگ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھا دیتا جو میرے دل کو پھونکے دے رہی ہے۔''

بڑے کڑے بول تھے لیکن وہ تحریک کے وقتی جوش میں ظاہری دھوم دھام سے زیادہ تعمیری کام کو اہم سمجھتے تھے۔

عوام کی بیداری سے، جس میں گاندھی کی تحریک بھی کام کر رہی تھی، گاندھی کو خوشی ہوتی تھی۔ اپنے دوروں کے دوران انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ''تلسی داس نے جس نرم دلی کے گیت گائے تھے وہ مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا پیغام سادہ تھا ہندوستان کی غلامی برطانوی بندوقوں سے کہیں زیادہ خود ہندوستانیوں کی کمزوریوں کی بدولت تھی۔ اگر ہندوستان کی اجتماعی زندگی

چھوت چھات، فرقہ وارانہ جھگڑے، شراب نوشی، نشہ بازی اور غیر ملکی کپڑوں اور برٹش سرکار کی طرف یا اس کی امداد سے چلنے والے اداروں سے چھٹکارا حاصل کرے تو اسے نئی طاقت مل سکتی ہے۔ سوراج برطانوی پارلیمنٹ کی طرف سے تحفے کے طور سے نہیں آئے گا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ''میں نے یہاں تک کہنے کی جرأت کرڈالی کہ سوراج خدا کا بھی عطیہ نہیں ہوگا۔ یہ ہمیں اپنے خون پسینے سے حاصل کرنا ہوگا۔''

اپریل 1919 میں گاندھی کی قانون شکنی کا ابتدائی ردِّعمل مرکزی اور صوبائی حکومتوں پر تیز اور سخت ہوا تھا جیسا کہ مندرجہ ذیل ''لائن صاف'' تاروں سے ظاہر ہوگا۔

گورنر بمبئی بنام وائسرائے۔اپریل 1919/8/7

کل کے مظاہرے بڑے پیمانے پر ہوئے لیکن فوج کی موجودگی کا علم ہونے کی وجہ سے جلد ہی ختم ہوگئے۔ قانونی مزاحمت کا ابھی آغاز ہوا ہے۔ آج سہ پہر کو گاندھی نے کمشنر پولیس کو یہ خط لکھا ہے......

''اگرچہ ایک تکنیکی جرم (یعنی اجازت کے بغیر اخبار چھاپنے کا) انتخاب کیا گیا ہے لیکن میرے لیے تقریباً یقینی طور پر یہ ضروری ہوجائے گا کہ اس یا کسی دوسرے قانون شکنی پر گاندھی اور دوسروں کے خلاف کارروائی کروں۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اس طرح کے اقدام سے یہاں اور غالباً دوسری جگہوں پر فساد ہوجائے، میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کو فوراً اطلاع دوں اور آپ کے یہاں سے اس تار کی رسید کی اطلاع آنے تک مزید کارروائی ملتوی رکھوں۔''

وائسرائے بنام سکریٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ 8اپریل 1919

براہِ کرم ہزایکسیلینسی گورنر بمبئی کے ''لائن صاف'' تار مورخہ 8اپریل 1919 کو دیکھیں۔ میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مقاومت مجہول کی تحریک کے بڑھنے کے امکان کو نظر میں رکھتے ہوئے ہوم ڈپارٹمنٹ میں ایک باقاعدہ حکمت عملی فوراً مرتب کی جائے تاکہ تمام صوبوں میں کیے جانے والے اقدام مربوط رہیں۔

گاندھی کے پہلے اقدام کا مقابلہ غالباً پریس کو ضبط کرکے کیا جائے۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ ہر اس صوبے میں جہاں مقاومت کی تحریک کی خطرناک علامتیں ظاہر ہونے لگیں، مقامی

حکومت کے سر براہ کو سیدھے سادے لفظوں میں رولٹ بل کی صورت حال اغراض ومقاصد اور دائرہ کار کے بارے میں ایک مینی فسٹو جاری کرنا چاہیے۔اس میں عاقلانہ اختلاف سے ہمدردی بھی ہواوران لوگوں کی ملامت بھی جو حکومت کو مشکل میں ڈال کر شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اس میں دلی کے واقعے سے ہونے والے سبق کا ذکر ہوااور تمام سنجیدہ لوگوں سے یہ کہا جائے کہ اس مسودہ قانون کے بارے میں ان کے خیالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، وہ حکومت کو مشکل میں پھنسانے اوراس پر ڈرادھمکا کر دباؤ ڈالنے کی پالیسی کی ہمت شکنی کریں۔اس میں یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ ملک میں امن وامان قائم رکھنے اور ایسی تمام تحریکوں سے مضبوطی سے نپٹنے کا مصمم فیصلہ کرلیا گیا ہے جو شہریوں کے بہت بڑے حصے کی حفاظت مال وامن کو خطرے میں ڈال سکتی ہوں۔

جہاں جہاں مقامی حکومت مناسب سمجھے وہاں غالباً جوابی تحریک مقاومت مجہول کی تنظیم اور امداد کی جا سکتی ہے۔''

سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ بنام پرائیوٹ سکریٹری ٹو وائسرائے 9/اپریل 1919

(لائن صاف کیجئے) دلی اور پنجاب میں گاندھی کے متعلق ونسنٹ اور اوڈوائر کے درمیان تاروں کا تبادلہ ہوا ہے اور بیرون نے بھی آج ہیلی سے مشورہ کیا ہے۔

''اوڈوائر کی رائے یہ ہے کہ صورت حال سنگین ہوگئی ہے اور 1818 کے رگولیشن اس کے ماتحت گاندھی کو ملک بدر کر کے برما بھیج دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔1907 میں لاجپت رائے کا اسی طرح جلاوطن کیا جانا موثر ثابت ہوا تھا............لیکن ونسنٹ کم ازکم فی الحال گاندھی کی جلاوطنی کے بارے میں اوڈوائر کے نظریہ سے متفق نہیں ہے کیوں کہ ایسے بہت سے لوگوں کی ہمدردیاں زائل ہو جائیں گی جو گاندھی کے طریق کار سے اتفاق نہیں رکھتے۔مصر میں جلاوطنوں کا ماضی قریب میں یہ تجربہ رہا ہے کہ جلاوطنی سے عام طور پر آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

''سر جیمس مسٹن اور سر جارج لاؤنڈس کے مشورہ کرنے کے بعد ہوم منسٹر نے پنجاب اور یوپی کی حکومتوں اور چیف کمشنر دلّی کو تار دے دیا ہے۔اس میں یہ اجازت دی گئی ہے کہ مجموعہ قانون تحفظاتِ ہند کے قاعدہ ۳ (ب) کے ماتحت ایک حکم نامہ جاری کیا جائے۔اور گاندھی کو بمبئی پریسیڈنسی کے حدود کے اندر ہی رہنے کو کہا جائے۔انھیں یہ بھی اطلاع دے دی گئی ہے کہ اس حکم

نامے کو بروئے کار لانے کے لیے تمام مناسب اقدام کیے جائیں۔اس کی خبر تمام دوسری مقامی حکومتوں کو بھی کر دی گئی ہے۔......''

سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ بنام چیف سکریٹری بمبئی 18/اپریل 1919

مہربانی کر کے 7/اپریل 1919ء کے اس تار کو دیکھیں جو ہز ا کسیلینسی گورنر بمبئی نے ہز ا کسیلینسی وائسرائے کو بھیجا تھا۔اگر حکومت بمبئی کو یہ اطمینان ہے کہ یہ قانون شکنی کا صاف معاملہ بن چکا ہے تو حکومت ہند کے خیال میں گاندھی یا کسی اور شخص پر مقدمہ چلانا چاہیے۔اگر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا جائے تو کام کم سے کم تاخیر میں انجام پانا چاہیے تاکہ گاندھی کو ملک میں گھومنے پھرنے اور دوسری جگہوں پر بھی ایسی گڑبڑ مچانے سے روکا جاسکے۔حکومت ہند ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا استعمال نامناسب سمجھتی ہے، سوائے اس صورت کے کہ کوئی اور چارۂ کار رہ ہی نہ جائے۔ لائق صاف تار سے یہ رپورٹ بھیجئے کہ کیا کارروائی کرنے کا ارادہ ہے۔

سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ بنام چیف سکریٹری بمبئی 8/اپریل 1919

(اس کی نقول دوسری مقامی حکومتوں کو بھیجی گئیں۔)

ہمارے تار مورخہ 8/4/1919 کی طرف دھیان دیں۔ہم کو یہ اطلاع ملی ہے کہ 18/اپریل کو گاندھی دلّی کے لیے روانہ ہوگئے ہیں۔حکومت پنجاب اور دلّی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے ڈیفنس آف انڈیا (کنسالیڈٹیڈ) رولز کے قاعدہ (س) کے بموجب انھیں ان صوبوں میں داخل نہ ہونے دینے کے احکام صادر کر دیے گئے ہیں......اس کا اثر یہ ہوگا کہ وہ دلّی، پنجاب یا ممکن ہے یوپی میں داخل ہوں گے تو انھیں بمبئی پریسیڈنسی واپس بھیج دیا جائے گا۔وہاں اگر حکومت مناسب سمجھے گی تو مزید پابندیاں لگا سکتی ہے......کسی بھی صورت میں گاندھی کو بمبئی پریسیڈنسی کے باہر نہ جانے دیا جائے۔''

جیسا ہم پہلے دیکھ آئے ہیں[1] ہوا یہ کہ گاندھی دلّی جاتے ہوئے 19/اپریل کو گرفتار کر لیے گئے اور انھیں ایک ٹرین میں بٹھا کر بمبئی لے جایا گیا، جہاں انھیں رہا کر دیا گیا۔ان کی عدم موجودگی میں ان کے صوبے میں جو فسادات ہوئے اور کچھ ہی دنوں بعد پنجاب میں جو المیہ رونما

---

(1) اکیسواں باب

ہوا، اس کی بظاہر انھیں عارضی طور سے تحریک کوملتوی کر دینا پڑا۔

جس سختی کا گورنروں اور وائسرائے نے اپریل میں 1919 کے تیسرے ہفتے میں مظاہرہ کیا تھا اس کا اعادہ تقریباً تین برس تک نہیں کیا جاسکا۔ غالبًا جوش وخروش کے پہلے اُبال میں انھوں نے گاندھی کی قید اور ان پر مقدمہ چلانے کی ناگزیری کو بہت آسانی سے قبول کرلیا تھا۔ جب انھیں از سر نو غور کرنے کا موقع ملا تو انھیں صورت حال کی ضروریات اور ستیہ گرہ سے نپٹنے کے لیے صحیح طاقت اور صحیح وقت کے انداز کے بارے میں پہلا سا یقین باقی نہیں رہ گیا۔ 1919 کے موسم بہار کے واقعات نے کم سے کم یہ تو ثابت کر دیا تھا کہ عوام کے دلوں پر گاندھی کی گرفت کتنی مضبوط ہے اور ان کی گرفتاری میں کتنے خطرے ہیں۔ اس کے ساتھ 1919 کی گرمیوں میں ان کے ضبط نفس کو دیکھ کر اہل حکومت کو یہ امید بندھی کہ شاید وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی حکومت کی کھلم کھلا اور بڑے پیمانے پر نافرمانی نہ کریں گے یا یہ کہ ان کے لیے کانگریس کے دوسرے لیڈروں اور گروہوں کو ساتھ لے کر چلنا ممکن نہ ہوگا۔

سر ولیم ونسنٹ نے لکھا کہ میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگ جلد ہی مسئلہ گاندھی اور ان کی پریشانیوں سے عاجز آجائیں گے۔ سر جارج لائڈ گورنر بمبئی نے بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار وائسرائے کے نام لکھے گئے 11/ جون 1919 کے خط میں کیا تھا۔

''میں یہاں کے حالات کے بارے میں کچھ فکر مند ہو رہا ہوں کیوں کہ گاندھی بہت بےچین ہونا شروع ہو گئے ہیں...... پنجاب میں وہ کوئی کھیل رچانے والے ہیں لیکن ہم ابھی تک اس کا پتہ چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ یہ کیا ہوگا۔ ان کے جلسوں میں بہت زیادہ مجمع نہیں ہوتا اور ان کے متبعین بہت بددل ہو رہے ہیں۔ جلاوطنی ہوتے ہی خاصا طوفان برپا ہو جائے گا۔ مقدمہ چلانے کا طریقہ بھی مجھے اطمینان بخش معلوم نہیں ہوتا۔ جہاں تک اور چیزوں کا تعلق ہے اس پریسیڈنسی میں ہوم رول پارٹی ٹکرے ٹکرے ہو چکی ہے۔ کئی اہم لیڈروں کے استعفوں کی وجہ سے اس کو بہت چوٹ لگی ہے۔ اگر گاندھی نہ ہوتے تو سب ٹھیک ٹھاک رہتا لیکن وہ یہاں واقعی خطرے کا نشان ہیں۔ اگر وہ ہمیں مجبور نہ کر دیں تو ان کا جیل کے باہر رہنا اندر رہنے کے مقابلے میں کم خطرناک ہے کیوں کہ ان کا اثر روز بروز کم ہوتا جاتا ہے لیکن اس بات کا علم انھیں بے باکانہ

اقدامات پر اکساتا ہے تا کہ وہ اپنے جاتے ہوئے اثر کو باز یافت کر سکیں۔‘‘

انھیں تصورات کے پیش نظر ستمبر 1920 میں انڈین نیشنل کانگریس کے عدم تعاونی پروگرام منظور کر لینے کے باوجود حکومت نے ’’عدم مداخلت‘‘ کی ’’عاقلانہ پالیسی‘‘ 4 ستمبر 1920 کی گشتی چھٹی میں اپنائی۔ عدم تعاون کی تحریک بنیادی طور پر اتنی احمقانہ ہے کہ حکومت کو پورا یقین ہے کہ ہندوستان کی عقل عامہ اسے مسترد کر دے گی......فی الحال عدم مداخلت ہی سب سے عاقلانہ پالیسی ہے۔ حکومت ہند کا خیال ہے کہ اگر اس منزل پر حکومت اسپیشل یا ایمرجنسی قوانین کے ماتحت تحریک کے لیڈروں کے خلاف انتظامی نوعیت کے جبری اقدامات کرے گی یا مجموعی قانون تعزیرات کے تحت فوری طور پر ان کے خلاف بھی چلائے گی تو یہ غلطی ہوگی کیوں کہ ایسے اقدام کا نتیجہ انھیں شہید بنانے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا اور ان لوگوں کو بھی ان کے پیچھے چلنے پر مجبور کرے گا جو گاندھی سے اپنے کو الگ رکھے ہوئے ہیں۔

’’حکومت اس بات سے بھی متاثر ہوئی ہے کہ اس کے قانونی مشیروں ایڈوکیٹ جنرل اور اسٹینڈنگ کاؤنسل کی رائے میں مسٹر گاندھی اور مسٹر شوکت علی کے خلاف عمومی فوجداری عدالتوں میں مقدمہ چلا کر کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں اور انھیں اس آخری مرحلے کے پہلے سزا نہیں مل سکتی جب تک وہ فوج اور پولیس سے عدم تعاون اور ٹیکس دینے سے انکار کے پروگرام پر عمل شروع نہ کر دیں۔

......(جہاں تک دیہاتوں اور قصبوں کے مقامی مفسدوں کا تعلق ہے) انھیں سرکار کی بے باکانہ حکم عدولی کے لیے کھلا نہ چھوڑ دینا چاہیے۔ اہنسا کے پیغامبر، مسٹر گاندھی کی ہم جلیسی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے نمایاں سے نمایاں شریک کار کو بھی اگر وہ متشددانہ لہجے میں تقریر کر کے قانون کی خلاف ورزی کریں تو مقدمہ چلائے جانے سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔

برطانیہ کی قانونی روایتوں کو یہ بھی ایک خراج تحسین ہے کہ جسے وہ سب سے بڑا باغی سمجھتے تھے اس سے نپٹنے کے لیے بھی انھوں نے قانونی مشیروں سے رائے مانگی اور ان مشیروں میں یہ کہنے کی جرأت تھی کہ جب تک کچھ مخصوص جرائم کا ارتکاب نہ ہو گاندھی کو مجرم قرار دینے کے لیے قانون کو ربڑ کی طرح کھینچا نہیں جا سکتا۔

2/اپریل 1921 لارڈ چیمسفورڈ کی جگہ لارڈ ریڈنگ ہندوستان کے وائسرائے ہوئے۔ مہینے کے خاتمے پر نئے وائسرائے نے لکھا ''جب تک میں انگلستان میں تھا میں ہندوستان کی نازک صورت حال سے بہت زیادہ کبیدہ خاطر نہیں تھا۔ لیکن یہاں آ کر جو میں نے جائزہ لیا ہے اس کے بعد میں اس کو زیادہ نازک سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ ان کے سوانح نگار بیٹے کے لفظوں میں، انھوں نے تحریک پر بھرپور وار کے لیے وقت کا تعین کرنے کے سلسلے میں ''فیبین حکمت عملی[1]'' اختیار کی۔ مئی کے نصف آخر میں وہ گاندھی سے ملے۔ یہ ملاقات مدن موہن مالویہ کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ ان چند غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے جو اس لیے پیدا ہوئی تھیں کہ تحریک کے لیڈروں نے مبینہ طور پر لوگوں کو تشدد پر بھڑکایا تھا۔ چوں کہ خلافت کی تحریک عدم تعاون کی تحریک سے ناقابل تقسیم طور پر جڑی ہوئی تھی اس لیے شکایت پیدا ہوئی کہ مولانا محمد علی نے کسی سلسلے میں افغانستان کا ذکر چھیڑا تھا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ ہندوستان میں یہ افواہ گرم تھی کہ امیر افغانستان ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ گاندھی اور ریڈنگ کے مابین کل ملا کر چھ ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی گفتگو کا میدان کافی وسیع تھا۔ 1919 کے پنجاب کے فسادات، تحریک خلافت، سوراج کا مفہوم اپنے بیٹے کے نام ایک نجی خط میں وائسرائے نے اس غیر معمولی ملاقاتی سے ملنے کے بعد اپنے جذباتِ تحریک اور اہتزازی کیفیت کا اقرار کیا تھا۔ انھوں نے گاندھی کے مذہبی اور اخلاقی خیالات کو تو بے حد قابل تعریف بتایا لیکن ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ سیاسیات میں ان خیالات پر کیسے عمل کریں گے۔ گاندھی محمد علی سے یہ کہنے پر راضی ہو گئے کہ وہ (محمد علی) اپنی تقریروں کے وہ اجزا علانیہ واپس لے لیں جن سے تشدد بھڑکانے کے معنی نکالے جاسکتے ہوں۔ انھوں نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ اپنے پیروؤں اور وائسرائے دونوں ہی پر یہ واضح کر دینا چاہتے تھے کہ عدم تشدد تحریک کا بنیادی اصول ہے۔ اس موقع پر وائسرائے نے اور ہی طریقے پر سوچا۔ وہ (محمد علی) اس صورتِ حال کا اصلی عنصر ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین وہی ظاہری رشتہ ہیں۔ اگر ان میں اور گاندھی میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں تو وہ پل ٹوٹ جائے گا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان حائل خلیج کے اوپر بن

(1) پراحتیاط، طویل اور شاطرانہ حکمت عملی

گیا ہے، جو گاندھی چاہتے ہیں اگر محمد علی وہ کر دیتے ہیں۔ جس کا بے شبہ مطلب ہے کہ وہ اعلان کریں تو محمد علی پبلک کی نظروں سے گر جائیں گے۔[1]

گاندھی سے ایسا دانش مندانہ سلوک کرنے پر سکریٹری آف اسٹیٹس نے وائسرائے کو مبارک باد کا تار دیا۔ حکومت گاندھی اور علی[2] برادران کے درمیان جو کشیدگی کا خواب دیکھ رہی تھی وہ پیدا نہیں ہوئی۔ جب ستمبر 1921 میں علی برادران گرفتار کئے گئے تو حکومت بمبئی نے ایک سرکاری اعلان میں ان پر ہندوستانی سپاہیوں کی وفاداری میں خلل اندازی کا الزام لگایا اور اسی کو گرفتاری کا سبب بتایا گیا۔ اس پر تقریباً پچاس لیڈروں نے جن میں گاندھی بھی شامل تھے ایک مینی فسٹو جاری کیا جس میں ہندوستانی سپاہیوں اور سوِل ملازمین کو روزگار کی کوئی اور سبیل ڈھونڈنے کی دعوت دی گئی۔

اگر گاندھی اور خلافت کی تحریک والوں کے درمیان پھوٹ نہ پڑی تو کیا کانگریس میں پھوٹ پڑ سکتی تھی؟ حکومت بمبئی نے، جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ گاندھی کی لیاقت کا ماہرانہ علم رکھتی ہے، ابھی 28/اگست 1920 کو یہ پیش گوئی کی تھی کہ کانگریس کیمپ میں بس پھوٹ پڑنے ہی والی ہے۔ گاندھی پر مقدمہ چلائے جانے کے خلاف سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے کانگریس پارٹی میں پھوٹ ڈالنے کے سلسلے میں بڑا کام کیا ہے، اور اگر انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اس طرح کا کام کرتے رہیں گے۔ پونہ کے قوم پرست ان سے بیحد ناراض ہیں اور وہ ناگپور میں ان کا تختہ الٹنے کی کوشش کریں گے۔ اپنے علانیہ برطانیہ دشمن طرز فکر سے انھوں نے ہوم رول لیگ کے خاصے بڑے طبقے کی ہمدردیاں کھودی ہیں۔'' ابھی تک حکومت کو یہ معلوم نہیں ہو پایا تھا کہ اگر منزل مقصود ایک ہو تو پالیسی اور مزاجوں کے اختلاف کے باوجود گاندھی میں اپنے ساتھیوں کو ملا کر لے چلنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ 1920 کے اجلاس ناگپور نے ان رشتوں کو توڑنے کی بجائے اور مضبوط کر دیا جو گاندھی اور کانگریس کے لیڈروں کے مابین تھے۔ جو ان کے ساتھ نہ چل سکے ان کی عزت واثر میں کمی آ گئی۔

---

(1) ریڈنگ، مارکوئی آف۔ روفس آئزکس۔ پہلا مارکوئی آف ریڈنگ جلد 2، ص: 199

(2) مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو علی برادران کہا جاتا تھا۔

آنے والے بارہ مہینوں میں برطانوی حکام بے چینی سے اس کا انتظار کرتے رہے کہ قوم پرستانہ لہروں میں سکون آئے۔ ستمبر 1921 میں بمبئی کی حکومت نے یہ رپورٹ دی کہ گاندھی کی غیر حاضری میں کھدر اور گاندھی ٹوپی پہننے کا جوش وخروش کم ہوگیا ہے اور بدیسی کپڑوں کے جلائے جانے کا روزانہ اوسط چھ پرانی قمیضوں، ساریوں، کوٹوں اور پرانے ہیٹوں اور ٹوپیوں کا رہ گیا ہے۔'' 17 ستمبر 1921 کو حکومت بنگال نے لکھا کہ گاندھی اور محمد علی نے چٹا گانگ (چٹگام) میں ایک زبردست مجمع کو خطاب کیا لیکن چوں کہ تقریریں ہندی میں ہوئی تھیں، عام طور سے سمجھی نہیں گئیں اور زیادہ جوش وخروش نہیں پھیلا۔'' کچھ دنوں بعد حکومت بنگال نے لکھا کہ کانگریس کمیٹی میں داخلی اختلافات ہوگئے ہیں اور ایک ''خوش گوار'' بات یہ کہ اس سے زیادہ ضلعوں میں نمایاں زمینداروں اور کھیت مالکوں کا تعاون حکام کو حاصل ہوگیا۔'' 19 ستمبر 1921 میں یو پی حکومت نے لکھا کہ ''جو لوگ باغیانہ تقریریں سننے کو آتے ہیں ان میں اکثریت ایسوں کی ہے جن کی زمینیں چھن گئی ہیں اور جنھیں یقین ہے کہ گاندھی ان کی زمینیں واپس دلا دیں گے۔ اسی مہینے میں حکومت پنجاب کے چیف سکریٹری کو یہ محسوس ہوا کہ امرتسر میں عدم تعاون پارٹی ناکام ہوگئی ہے اور کمشنر انبالہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ موپلہ فسادات سے ہندوؤں کو دکھ پہنچا ہے اور عدم تعاون پر عوام کا اعتقاد متزلزل ہوگیا ہے۔ بہار کی حکومت نے خوش ہوکر لکھا کہ ''عدم تعاون کرنے والوں کی پنچایتی عدالتیں بدنام ہوگئی ہیں رضا کار جماعتیں مقبولیت کھو چکی ہیں اور نیشنل اسکول ٹوٹتے جارہے ہیں۔

یہ فیصلہ مشکل ہے کہ یہ نتائج کہاں تک آرزومندانہ تصور پر مبنی تھے۔ بہرحال اتنا تو ظاہر ہوتا ہی ہے کہ مقامی (صوبائی) حکومتیں عوامی بے چینی سے عام طور پر پریشان تھیں لیکن وہ خاص لیڈروں اور مظاہروں کی اہمیت کو گھٹانے پر مائل تھیں۔ ایسی صورت حال میں جو بیک وقت خطرناک بھی معلوم ہوتی تھی اور بدلتی بھی رہتی تھی۔ وہ (حکومتیں) آسانی سے گھبرا بھی اٹھتی تھیں اور اتنی ہی آسانی سے مطمئن بھی ہوجاتی تھیں۔ نومبر 1921 میں کلکتہ کے کمشنر پولیس نے انٹلی جنس بیورو (خفیہ بیورو) کے ایک افسر وِون شا کو بتایا تھا کہ پولیس مینوں کی بہت بڑی تعداد نے استعفیٰ دے دیا ہے اور ان کا خیال تھا کہ ''سب کے سب نوکری چھوڑ دیں گے۔''

22-1920 کے جاڑوں میں کانگریس اور حکومت کے درمیان کشیدگی گھٹنے کی بجائے برابر بڑھتی ہی گئی۔فوج کی وفاداری میں خلل ڈالنے کے جرم میں علی برادران ستمبر 1921 میں گرفتار کر لیے گئے تھے یہی جرم گاندھی سمیت اور لیڈروں نے بھی کیا۔ یہ ایسا چیلنج تھا جس کو قبول نہ کرنا حکومت کے لیے مشکل تھا۔ یہ امید کہ اندرونی اختلافات یا عوام کی بےتعلقی کی وجہ سے یہ تحریک دھیرے دھیرے ختم ہو جائے گی 1921 کی قران تک پوری نہ ہوئی گاندھی سے ٹکرانا ناگزیر معلوم ہو رہا تھا۔صرف یہ سوال رہ گیا تھا کہ حکومت اس پر عمل کرنے کے لیے کونسا وقت منتخب کرے۔ لارڈ ریڈنگ اور ان کے مشیروں کے سامنے یہ سوال تھا کہ گاندھی کو گرفتار کیا جائے یا نہیں؟ سر ولیم ونسنٹ ہوم ممبر نے 10 /اکتوبر 1921 کو غیر معمولی مصروفیت سے لکھی گئی ایک یادداشت میں گاندھی پر اعلان نامے پر دستخط کرنے کے جرم میں مقدمہ چلائے جانے یا نہ چلائے جانے کے سلسلے میں اظہارِ رائے کیا ہے (اس اعلان نامے (مینی فسٹو) میں یہ کہا گیا تھا کہ کسی ہندوستانی سویلین، خاص کر سپاہی کی حیثیت سے ملازمت کرنا وقار قومی کے خلاف ہے)

مقدمہ چلائے جانے کی موافقت میں دلائل

(ا) گزیٹڈ عہدوں سے لے کر نیچے تک کے عہدوں پر متعین افسروں پر اور انتظامیہ پر اس کا شدید اثر پڑ رہا ہے کہ علانیہ بغاوت (تقریری) کے مقابل حکومت خاموش ہے۔

(ب) معتدل رائے رکھنے والے حلقوں میں بددلی پھیل رہی ہے...... ہماری بےعملی سے بہت سے ایسے لوگ جو عدم تعاون کے خلاف ہیں کھل کر سامنے نہیں آ پا رہے ہیں اور بہت سے لوگ گاندھی کے کیمپ میں چلے جا رہے ہیں۔

(ج) مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ صرف انھیں کے خلاف مقدمات چل رہے ہیں اور ہندوؤں کا کہیں زیادہ خیال رکھا جا رہا ہے۔ چاہے یہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن عام طور سے یہ خیال پھیلا ہوا ہے۔

(د) جب تک گاندھی اپنا پروگرام ترک نہ کر دیں یا مصالحت نہ کر لیں مقدمہ چلایا جانا ناگزیر ہے اور اگر ہمیں یقین ہے کہ مجبور ہو کر ایسا مقدمہ چلانا ہی پڑے گا تو موجودہ زمانہ جب کہ موسم سرما شروع ہونے کو ہے ایسا مقدمہ چلانے اور ہر بدامنی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناموزوں

نہیں ہے۔

(ہ) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہزرائل ہائی نس (پرنس آف ویلز) ہندوستان میں ہوں اس وقت گاندھی ہم کومقدمہ چلانے پرمجبور کریں۔ اِس وقت کی بہ نسبت اُس وقت مقدمہ چلانا زیادہ فساد انگیز ثابت ہوگا۔

(و) تاخیر کرنے میں اصلی خطرہ یہ ہے کہ کوئی بھی حکومت جوحکومت ہند کی پوزیشن میں ہو اگراس طرح کی کھلی بغاوت یافوج اور پولیس پرحملوں کو بے روک ٹوک چھوڑ دےتو وہ اس خطرے میں مبتلا ہوئے بغیرنہیں رہ سکتی کہ زہر اتنی دور تک پھیل جائے کہ مقدمہ چلانا واقعتہً ناممکن ہوجائے۔

مقدمہ چلائے جانے کی خلاف دلائل

(ا) گاندھی یہ عہد کرچکے ہیں کہ دسمبر کے آخر تک سوراج دلا دیں گےاوراس عہد کے پورا کرنے میں ناکامی کی وجہ سے وہ یہ تحریک ترک کردیں گے اوراس طرح وہ فطری اوریقینی طور پر نظروں سے گرجائیں گے۔

(ب)ان کے بہت سے تعلیم یافتہ موئدین اس وجہ سےان کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں کہ وہ ان کی موجودہ کارروائیوں کے خلاف ہیں۔مسلمان اس لیے غصے میں بھرے بیٹھے ہیں کہ ان کے لیڈروں پرمقدمے چلائے گئے ہیں۔ ہندواس بات پرناراض ہیں کہ خلافت کو بہت بڑھایاچڑھایا جارہاہے۔موپلاتحریک کی وجہ سے مدراس میں کپڑے کی تحریک کی کامیابی کے امکانات نہیں ہیں اورمہاراشٹر میں......

(ج)اس موقعے پر گاندھی کے قید کیے جانے میں یہ خطرہ ہوگا کہ ان کا اثر بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔آج وہ صرف ایک عظیم قومی ہیرو ہی نہیں بلکہ ان کی نگاہ میں تقریباً دیوتا ہو چکے ہیں۔ان کے جیل میں بند کیے جانے سے ان کے مقصد کی طرف اور بھی بہت سے لوگ کھنچ آئیں گے اور غالبًا وہ اس سے آگاہ بھی ہیں۔ وہ اپنی تحریک کے لیے مزید تائید حاصل کرنے کی خاطر یقیناً شہید بن جانا چاہتے ہیں۔تاکہ وہ اس تحریک کوایسے وقت میں مضبوط بناسکیں جب کہ ان کے بہت سی اسکیمیں ناکام ہوچکی ہیں۔اسی طرح یہ بھی یقینی ہے کہ وہ ہمیں مقدمہ چلانے کے لیےحکومت

کے نفع کی خاطر نہیں للکار رہے ہیں بلکہ اس وجہ سے للکار رہے ہیں کہ اس سے انھیں کچھ فوائد حاصل ہونے کا یقین ہے۔

(د) مقدمہ چلائے جانے کا اثر یہ ہوگا تا کہ بے چینی بہت زیادہ بڑھے گی اور غالبًا گڑ بڑ بھی پھیلے گی اور وہ بھی ٹھیک پرنس آف ولز کی آمد کے موقع پر۔

(ہ) اگر ہم گاندھی کو اس وقت گرفتار نہیں کرتے تو (پرنس آف ویلز کی آمد کے سلسلے کی) تقریبات سے غیر حاضریوں اور ہڑتالوں کی توقع رکھنا چاہیے......اس کے برعکس اگر ہم گرفتار کرتے ہیں تو اس سے ہزرائل ہائی نس کے خلاف کھلے مظاہروں کو یقیناً شہ ملے گی اور شاید اتنے وسیع پیمانے پر گڑ بڑ ہو کر ہمیں یہ تشریف آوری ملتوی ہی کرنا پڑے۔

(و) مجھے معلوم نہیں کہ صلح نامے کے شرائط میں کسی حد تک ردوبدل ہوسکتا ہے لیکن اگر ہم ترکی کے حق میں کچھ ٹھوس تبدیلیاں کرا سکیں تو جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ہم گاندھی کی تحریک کو روک سکیں گے۔

بحیثیت مجموعی میرا یہ خیال ہے کہ مصلحت اسی میں ہے کہ کم از کم فی الحال گاندھی کے خلاف کارروائی کو ملتوی کر دیا جائے......اگر ضروری ہوا تو ہم بعد میں مثلاً دسمبر یا جنوری میں مقدمہ چلا سکتے ہیں۔ اس وقت تک گاندھی کچھ اور غلطیاں کر چکے ہوں گے یا تحریک ہی سے دست بردار ہو گئے ہوں گے...... مجھے اس طریق کار کے خطروں کا علم ہے اور میری رائے مستقبل قریب میں ہزرائل ہائی نس کی تشریف آوری سے خاص طور پر متاثر ہے۔ اگر یہ آمد ملتوی ہو جائے تو میرا خیال ہے کہ میں فوراً مقدمہ چلائے جانے کی رائے دوں گا اور دوسرے خطرات مول لوں گا۔''

لارڈ ریڈنگ کے وائسرائے ہونے کے پہلے ہی پرنس آف ویلز کی آمد کا منصوبہ بنایا جا چکا تھا لیکن ہنگامہ خیز سیاسی حالات کے باوجود لارڈ ریڈنگ نے آمد کو ملتوی کرنے کی رائے دی۔ انھوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا کہ ''التوا میں سب سے بڑی مضرت یہ ہے کہ اس کو (عدم تعاون) تحریک کی طاقت پر محمول کیا جائے گا سب سے بڑھ کر یہ ہوگا کہ انگلستان برطانوی مقبوضات اور ساری دنیا میں یہ تصور پھیل جائے گا کہ ہندوستان اتنا غیر وفادار ہو چکا ہے کہ وہاں پرنس کی تشریف آوری خطرے سے خالی نہیں رہ گئی ہے 17 نومبر 1921 کو جب پرنس کا بمبئی

میں ورود ہوا تو عدم تعاون کرنے والوں نے سرکاری تقریبات میں شرکت کرنے سے پرہیز کیا گاندھی اس روز بمبئ میں تھےاور برطانوی کپڑوں کےایک بڑے انبار میں آگ لگانے کے لیے مجتمع ایک بڑے جلسے میں صبح کو موجود تھے۔شام کو فسادات پھوٹ پڑے اور جن یوروپینوں، پارسیوں اور دوسرے لوگوں نے پرنس ایڈورڈ کے استقبال کی تقریبات میں شرکت کی تھی ان کو مارا پیٹا گیا۔ذاتی اپیلوں، گاندھی کے برت اوران کے ساتھیوں کی جاں توڑ کوششوں سے شہر بمبئ تشدد کے اس گورکھ دھندے سے باہر نکل آیا جس میں وہ پھنس گیا تھا۔خوش قسمتی سے دوسرے شہروں میں فسادات نہیں ہوئے لیکن عوام نے برطانوی راج کے خلاف اپنے غم وغصہ بھرے جذبات کا غیر مشکوک طور پر اظہار کر دیا۔ پرنس جہاں جہاں گئے وہاں ان کے اعزاز میں پریڈوں استقبالیہ دعوتوں اور عام دعوتوں کا حکام نے انتظام کیا لیکن (جیسا کہ ڈیوک آف ونڈسر نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے)''پرنس کی نظر یہ محسوس کرنے سے نہیں چوکی کہ سڑکیں خالی تھیں، کھڑکیاں بند تھیں اور ایک گمبھیر خاموشی چھائی تھی۔''

دسمبر 1921 کے آخری ہفتے میں پرنس آف ویلز کو کلکتہ جانا تھا۔کلکتہ میں ہڑتال اور مخالفانہ مظاہروں سے بچنے کے لیے وائسرائے نے حکومت اور کانگریس کے مابین صلح کرانے میں مدن موہن مالویہ کی کوششوں کی ہمت افزائی کی۔16 دسمبر 1921 کو مالویہ نے گاندھی کو تار دیا کہ وائسرائے کے پاس ایک وفد اس غرض سے لے جانا چاہتے ہیں کہ گول میز کانفرنس بلائے جانے پر زور دیں۔اگر وائسرائے نے یہ تجویز مان لی تو کیا گاندھی پرنس اف ویلز کی آمد کے خلاف بائیکاٹ کی تحریک واپس لے لیں گے اور کانفرنس کے خاتمے تک سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لیں گے؟ ساتھ ہی ساتھ مالویہ نے یہی تجویز سی آر داس کے سامنے بھی رکھی جو اس وقت پریسیڈنسی جیل کلکتہ میں سزا کاٹ رہے تھے۔سی آر داس نے سوچا اور ابوالکلام آزاد بھی ان سے متفق ہوئے کہ مالویہ جو''پیشکش''لائے ہیں وہ غور کرنے کے قابل ہے۔انھوں نے ایک تار میں گاندھی سے کہا کہ اسے منظور کر لیں۔گاندھی نے اپنی منظوری دو یقین وہانیوں پر مشروط کی۔ایک تو یہ کہ کانفرنس کی تشکیل اور تاریخ پہلے سے طے کر لی جائے اور دوسرے یہ کہ جو سیاسی قیدی چھوڑے جائیں ان میں علی برادران شامل ہوں۔مالویہ یہ یقین دہانیاں نہیں کرا سکے اور گفتگوئے

مصالحت ختم ہوگئی' 'انڈین اسٹرگل' ' میں سبھاش چندر بوس نے سی آر داس کے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ غصے اور تنفر سے دیش بندھو آپے میں نہیں تھے۔ انھوں نے کہا کہ جو موقع عمر بھر میں ملا تھا وہ کھو دیا گیا۔ سی آر داس اس لیے مایوس نہیں تھے کہ انھیں گمان تھا کہ مالویہ کی مجوزہ کانفرنس سے سوراج مل جائے گا بلکہ اس لیے کہ ان کی نظر میں کانفرنس ایک اچھی حکمت عملی تھی۔ مہاتما نے سال بھر کے اندر سوراج کا وعدہ کیا تھا اور اگر 1921 کے آخری پندرہ روز میں گول میز کانفرنس کے انعقاد یا سیاسی قیدیوں کی رہائی کی شکل میں کوئی جاذبِ نظر کام کانگریس کے رسوخ کی وجہ سے انجام پا جاتا تو اس ادارے کی لاج رہ جاتی اور وقار اور عوامی اعتماد بڑھ جاتا۔

غالباً سی آر داس کی طرح وائسرائے بھی حکمت عملی کی ایسی چال سوچ رہے تھے جس کا فائدہ انھیں پہنچے۔ ہوم ممبر سر ولیم ونسنٹ نے 10 نومبر 1921 کی یادداشت میں سول نافرمانی کے خطرے سے نپٹنے کے لیے ممکن عملی راہوں سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''(ایک راہ تو یہ ہے کہ) اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کی ایک کانفرنس تجویز کی جائے۔ یہ مسٹر شرما کی تجویز ہے اور اس کا مقصد میرے خیال میں یہ ہے کہ پرنس آف ویلز کی آمد کے زمانے میں پیدا ہونے والی مشکلات پر قابو پایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک صلح نامہ ترکی کے شرائط میں تبدیلی نہیں کی جاتی، ایسی کانفرنس سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔''

گاندھی کو یہ معلوم کرنے کا پورا حق تھا کہ یہ گول میز کانفرنس کب اور کہاں ہوگی اور اس میں کون کون لوگ شامل ہوں گے۔ وہ خلافت اور عدم تعاون دونوں ہی تحریکوں کے لیڈر تھے اور وہ خلافت کے لیڈروں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اس گفتگوئے مصالحت سے جو گرما گرم اور دلچسپی پیدا ہوئی تھی اس کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مالویہ اور سی آر داس نے اس کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مبالغے سے کام لیا تھا۔ وائسرائے خوشی سے ایسی چال چلنے کے حق میں رہتا جس سے کانگریس ایک منزل پر جا کر ٹھہر جائے لیکن یہ امر مشکوک ہے کہ کوئی ٹھوس سیاسی مراعات دینے پر راضی ہوتا۔

بہر حال کوئی مصالحت نہ ہو سکی اور حکومت اور کانگریس کے درمیان کھنچاؤ بڑھتا رہا۔ انتظامیے کے طرز فکر میں سختی آ گئی۔ 24 نومبر 1921 کو وائسرائے نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو

جو تار بھیجا تھا اس سے حکومت کی نئی مزاجی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(گاندھی کے) یا عدم تعاون کے دوسرے نمایاں (لیڈروں) کے آئندہ اقدامات کے بارے میں قطعیت سے کوئی پیش گوئی کرنا ناممکن ہے۔

''............سِول نافرمانی کے علاوہ تحریک عدم تعاون کے دوسرے پہلوؤں کی نوعیت زیادہ تشویش ناک ہوگئی ہے اور ہمیں اس کا یقین ہوگیا ہے کہ زیادہ وسیع پیمانے پر اور شدید قسم کے اقدامات ضروری ہیں............''

''............ہم نے فسادات اور جھڑپوں کے خطرے کو نظر انداز نہیں کیا ہے لیکن یہ خطرہ اقتدار کے نقصان اور طاقت کی ہمت شکنی کے مقابلے میں جورکاوٹ ڈالنے والوں سے نپٹنے میں کوتاہی کا لازمی نتیجہ ہوگا، کم تر برائی ہوگی۔ مقامی حکومتوں کو یہ یقین دلایا جارہا ہے کہ اگر واجبی فرائض کے ادا کرنے میں فوج اور پولیس کو گولی چلانا پڑے تو ہماری پوری حمایت حاصل ہوگی۔

''ہم انھیں یہ اطلاع دے رہے ہیں اگر قیام امن اور اقتدار کی عزت کے لیے وہ نمایاں سے نمایاں ہستیوں کی گرفتاری کریں یا اُن پر مقدمہ چلانا ضروری سمجھیں تو دفعہ 124 الف یا تعزیراتِ ہند کی کسی اور دفعہ کے استعمال میں پس وپیش نہ کریں۔''

دسمبر 1921 اور جنوری 1922 میں تقریباً تیس ہزار افراد کو گرفتار کیا گیا۔ رضا کار جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ جلسوں اور جلوسوں کو بزور منتشر کردیا جاتا۔ کانگریس اور خلافت کے دفتروں پر آدھی رات کو چھاپے مارنا معمولی بات ہوگئی اور سیاسی قیدیوں کے ساتھ سلوک بہت سخت ہونے لگا۔ دسمبر 1921 میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس احمد آباد میں ہوا اور گاندھی کو واحد انتظامی سربراہ مقرر کردیا گیا۔ کانگریس کے اندر ان پر یہ دباؤ بڑھ رہا تھا کہ وہ آندولن کی رفتار تیز تر کردیں اور عوامی سِول نافرمانی کی تحریک چلادیں۔ گاندھی کے ستیہ گرہی اسلحہ خانے میں عوامی آندولن (جدوجہد) سب سے موثر اور خطرناک ہتھیار تھا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نومبر 1921 میں پہلے ہی صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو یہ اختیار دے چکی تھی کہ وہ اپنی ذمہ داری پر سِول نافرمانی جس میں ٹیکسوں کی عدم ادائیگی شامل تھی، شروع کرسکتے ہیں۔ لیکن گاندھی نے کانگریس کمیٹیوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ عام سِول نافرمانی شروع نہ کریں بلکہ گاندھی خود بعض منتخب

علاقوں میں جوتحریکیں چلا رہے تھے وہ ان کو دیکھتے رہیں اور انتظار کریں۔ انہوں نے عوامی سول نافرمانی کو ایک زلزلے سے تشبیہ دی۔ سیاسی سطح پر ایک طرح کی عام اتھل پتھل سے حکومت کا کاروبار بند ہوجاتا ہے۔ پولیس اسٹیشن، عدالتیں، دفاتر، حکومت کی ملکیت نہیں رہ جاتے اور عوام ان پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

گاندھی کا پلان یہ تھا کہ پہلے ایک ضلع میں سول نافرمانی کریں گے۔ اگر یہ ایک ضلع میں کامیاب ہوئی تو اُسے قریب کے ضلع میں چلائیں گے۔ یہاں تک کہ پورا ہندوستان آزاد ہوجائے گا۔ انھوں نے متنبہ کیا کہ اگر ملک کے کسی حصے میں کسی طرح کا بھی تشدد رونما ہوا تو یہ تحریک پُر امن تحریک نہیں کہی جاسکے گی۔ وہ حال ہوگا کہ ایک تار کے ٹوٹنے سے سارے ستار سے بے ہنگم صدا نکلنے لگتی ہے۔

جب نومبر 1921 میں پرنس آف ویلز کی آمد کے موقع پر فسادات نے بمبئی کا چہرہ مسخ کر دیا تھا تو گاندھی نے سول نافرمانی ملتوی کر دی تھی۔ کیوں کہ اس وقت بظاہر، ایسے انتہا پسند اقدام کے لیے ماحول بہت زیادہ سازگار نہیں تھا۔ مگر بعد کے دو مہینوں میں کانگریس کارکنوں اور رضا کاروں کی اندھا دھند گرفتاری اور ان پر مقدمات کے چلائے جانے کے باعث گاندھی کو از سر نو حالات کا جائزہ لینا پڑا۔ حکومت جلسے نہیں ہونے دے رہی تھی اور پریس کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ گاندھی کے لفظوں میں ''اپنے تمام یقینی خطروں کے باوجود عوامی سِول نافرمانی اور عوام قانونی اقدامات پر قانونی تشدد میں سے ایک کو اختیار کرنا تھا۔'' انھوں نے خطرہ مول لینے اور اپنی ذاتی نگرانی میں گجرات کے باردولی تعلقے میں عوامی سِول نافرمانی کی ابتدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ سِول نافرمانی کے لیے باردولی کو ہراول نقطے کی حیثیت سے چنتے وقت گاندھی نے عوام کو آگاہ کر دیا تھا کہ لگان دینے سے انکار کی صورت میں فصلوں کی نیلامی، آراضیات کی ضبطی، مویشیوں کو بھگا لے جانے کا امکان ہے اور ممکن ہے کہ باردولی کا نشان بھی باقی نہ رہ جائے۔

گاندھی جو قدم اٹھانے والے تھے اس کے بارے میں انھوں نے اپنے دلائل کے ساتھ وائسرائے کو لکھ بھیجا۔ انھوں نے وائسرائے پر زور دیا کہ مئی 1921 کے گاندھی ریڈنگ مذاکرات میں جو سمجھوتہ مضمر تھا اس کا احترام کریں کیوں کہ اسی بنا پر علی برادران نے اپنی اُن تقریروں میں

اظہارِ افسوس کیا تھا جن کے بارے میں ان پر الزام تھا کہ انھوں نے عوام کو تشدد پر ابھارا ہے۔ وہ سمجھوتہ یہ تھا کہ حکومت غیر متشددانہ ایجی ٹیشن میں مزاحمت نہ کرے گی۔ انھوں نے حکومت کو یہ آگاہی دی کہ اگر حکومت نے سات دن کے اندر ایک اعلانیے کے ذریعے عدم تعاون کے تمام قیدیوں کو رہا نہیں کیا۔ پریس سے پابندیاں نہیں ہٹائیں جرمانے اور ضبطیاں واپس نہیں کیں تو حکومت کے خلاف قومی غیر متشددانہ بغاوت کے آغاز کے طور پر باردولی میں عوامی سِول نافرمانی شروع کر دی جائے گی۔

حکومت نے مہاتما کے الٹی میٹم کا بلا تاخیر جواب دیا کہ اب ملک کے سامنے سیاسی پیش قدمی کے اِس یا اُس پروگرام کا سوال نہیں رہ گیا ہے بلکہ ایک طرف لاقانونیت اور اس کے تمام عواقب اور دوسری طرف ان اصولوں کے قیام کا سوال درپیش ہے جن میں تمام مہذب حکومتوں کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔

اب کانگریس اور حکومت آمنے سامنے کی ٹکرّ کے لیے آمادہ ہو چکی تھیں۔

باب 27

رجعت قہقری

وائسرائے کے نام ''کھلی چٹھی'' یکم فروری 1922 کو لکھی گئی تھی۔ اسے وائسرائے نے الٹی میٹم سمجھ لیا لیکن گاندھی کی نظروں میں یہ ستیاگرہی کا حقِ شفع جیسا فرض تھا۔ تین دنوں کے بعد یو پی کے ضلع گورکھپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں چوری چورا میں پولیس اور ایک جلوس کے درمیان ٹکراؤ ہو گیا۔ واقعات بالکل صاف اور واضح تھے۔ ایک پولیس تھانے کے سامنے سے جلوس کا بڑا حصہ گزر چکا تھا کہ بعض کانسٹبلوں نے پیچھے رہ جانے والوں پر فقرے چست کیے اور انھوں نے جوابی حملہ کیا۔ کانسٹبلوں نے گولی چلا دی اور جب ان کی گولی بارود ختم ہو گئی تو انھوں نے اپنے آپ کو تھانے کے اندر بند کر لیا۔ اس وقت جلوس کا بڑا حصہ جو آگے جا چکا تھا پیچھے پلٹا اور اس نے غصے سے اندھے ہو کر پولیس تھانے کو آگ لگا دی۔ بے چارے پولیس والے جلتے ہوئے تھانے سے باہر بھاگے تو ان کی تکا بوٹی کر دی گئی۔ ان بائیس جان گنوانے والوں میں پولیس سب انسپکٹر کا نوجوان بیٹا بھی تھا۔

یہ شرمناک حرکت گاندھی کے لیے ایک ناگہانی حادثہ بن گئی۔ انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ملک کی فضا اتنی برانگیختہ ہو چکی ہے کہ عوامی تحریک چلائی نہیں جا سکتی۔ اس لیے انھوں نے سِول نافرمانی کا وہ اعلان واپس لے لیا جو ابھی ایک ہفتہ پہلے باردولی کے بارے میں کیا گیا تھا۔

کانگریس کی مجلس منتظمہ کے جوارا کین جیل کے باہر تھے ان سے مشورہ کیا گیا۔ 24 فروری کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس دہلی میں طلب ہوا اور گاندھی کی تحریک پر ایک رزولیوشن کے ذریعے چوری چورا کے واقعات پر اظہار افسوس کیا گیا، سِول نافرمانی کو ملتوی کر دیا گیا۔ اور کانگریس نے صرف ایسی کارروائیوں کی اجازت دی جن میں قید کر لیے جانے کا امکان نہ ہو تحریک کے ''جارحانہ'' حصوں کو ملتوی کرنے کے بعد تعمیری پروگرام پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔

عوامی سِول نافرمانی کے ملتوی کر دیئے جانے پر گاندھی کے قریب ترین ساتھی بھی ہکا بکا رہ گئے۔ کئی برس بعد سبھاش چندر بوس نے اِن لفظوں میں اس واقعے کی یاد دلائی۔ ''میں اُس وقت دیش بندھو (سی آر داس) کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ بار بار گاندھی کے کام بگاڑنے پر وہ رنج اور غصے میں آپے سے باہر ہو جاتے تھے[1] موتی لال نہرو اور لاجپت رائے نے جیل سے لکھا کہ اس اکیلے واقعے کو بنیاد بنا کر تحریک کو بند نہ کریں۔ گاندھی کو یہ محسوس ہوا کہ جن لوگوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی (مجلس منتظمہ) اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں ان کی تجویز پر صاد کیا تھا، انھیں واقعی اس پر اعتقاد نہیں تھا۔ بلکہ ان کے خیال سے انھوں نے مان لیا تھا۔ بہت سے پُر جوش پیروؤں کو بھی شک وشبہ نے آ گھیرا اور ان کے دلوں میں ذاتی مخنصرات اور لیڈر کی وفاداری کے مابین کشمکش سی رونما ہو گئی۔ چوری چورا کے حادثے کے بعد باردولی کی تحریک سِول نافرمانی کو تمام کر دینے کی کوئی معقول وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کیا حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ پیشہ ور بھڑکانے والوں کے ذریعے ایسے حادثات کا سوانگ رچا کر، وہ غیر متشددانہ بغاوت کو ناکام بنا دے اور اس طرح ستیا گرہی جدوجہد کو ایک پرہیز گارانہ فعل عبث میں تبدیل کر دے؟ کانگریس ایک سیاسی ادارہ تھی یا کسی مہاتما کے اندرونی تضادات کی جانچ کا میدان؟ کیا قوم کی قربانیاں بے سود تھیں اور کیا عدم تعاون کرنے والوں کو غیر معین مدت کے لیے جیلوں میں سڑنا تھا؟ اور کیا جارحانہ پروگرام کی منسوخی حکومت کو یہ دعوت دینے کے مترادف نہ تھی کہ وہ اس پسپائی کو مکمل شکست کا روپ دے دیے؟

گاندھی کے غصے اور حیرت سے بھرے ہوئے پیرو اس طرح کے سوالات کی بوچھار کرتے

---

(1) بوس سبھاش چندر، ہندوستانی جدوجہد، کلکتہ، 1949، ص:108

تھے۔ ان کے تقریباً سبھی ناقد یہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ چوری چورا الٹا گیئر لگانے کا سبب تھا یا یہ ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا؟ جس وقت سے گاندھی نے راولٹ بل کی کھلم کھلا مخالفت شروع کی تھی اور سیاسی اور سماجی ناانصافیوں کے ازالے کے لیے ملک کے سامنے ستیاگرہ کو پیش کیا تھا اسی وقت وہ عدم تشدد کی اہمیت پر بے حد زور دیتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی تقریروں اور تحریروں میں یہ موضوع تکرار کے ساتھ آتا رہا۔ اس کے باوجود جب کہ احمد آباد، ویرام گام اور امرتسر کے 1919 کے واقعات نے دکھا دیا۔ جم غفیر کے جوش وخروش کے اُبال کو کلیتًا روکا نہیں جا سکتا تھا۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ مقامی حکام اپنے اشتعال انگیز اقدامات سے اِس (تشدد) کو ہوا دینے لگیں۔ انھوں نے بمبئی میں 18/اپریل 1919 کو اعلان کیا کہ ''مجھے افسوس ہے کہ عوامی تحریکوں کا آغاز کرتے وقت میں نے شر کی قوتوں کا اندازہ بہت کم لگایا تھا۔'' ملک میں ظاہری سطح کے نیچے تشدد کا جو دھارا بہہ رہا تھا وہ اس سے بخوبی واقف تھے۔ تحریک خلافت کی سربراہی قبول کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ تشدد کے نیچے بہنے والے دھارے کا رخ عدم تشدد کی طرف موڑ سکیں گے۔ خطرات کا پورا احساس رکھنے کی وجہ سے انھوں نے اپنی تحریک کو تدریجی اور ملک کی فضا سے ہم آہنگ بنانے کے لیے غیر معمولی احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں۔ عدمِ تعاون کے پروگرام کی ابتدا افراد کی جانب سے خطابات اور اعزازی مناسب کی واپسی سے ہوئی اور اس کا خاتمہ ٹیکسوں کی ادائیگی روکنے اور قانون شکنی کرنے پر ہونے والا تھا۔ ان دونوں سروں کے درمیان کئی اقدامات اور بھی تھے جن کا مقصد قوم پروری پر زور دینا اور عوام میں نظم وضبط پیدا کر کے ان کو عوامی تحریک کے لیے آمادہ کرنا تھا۔ اچھوتوں کی حالت کو بہتر بنانا، قومی اسکولوں کا قیام، عدالتوں کے باہر ثالثی فیصلوں کے ذریعے جھگڑے چکانا، والنٹیئر کور کی تیاری، شراب کی دکانوں پر پکٹنگ، بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ اور کھادی کا فروغ، عوام کی تنظیم کے عملی طریقے تھے۔ گاندھی کا پروگرام تدریجی عدم تعاون پر مبنی تھا۔ اس کے مطابق، جوابی حملہ کیے بغیر ظلم کی مقاومت کی عوامی صلاحیت کا اندازہ کرتے ہوئے اقتدار کی حکم عدولی کے کام کو بڑھانا تھا۔

بیرونی حکومت کے خلاف قوم پرور طاقتوں کی تنظیم کرتے وقت گاندھی نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ ہندوستانی سماج کے پوشیدہ زخموں پر نشتر نہ لگایا جائے۔ انھوں نے کسانوں کو

مشورہ دیا کہ اگر چہ حکومت کی مالگذاری ملتوی کر دی جائے گی لیکن وہ زمینداروں کو لگان برابر دیتے رہیں گے۔ انھوں نے مزدوروں کو صلاح دی کہ ہڑتالوں میں شریک ہونے کے لیے وہ مل مالکوں سے چھٹی مانگیں۔ انھوں نے لکھا کہ ''جب تک مزدور ملک کی سیاست کو سمجھ نہیں جاتے ان سے سیاست کا کام لینا بہت ہی خطرناک ہے۔'' انھوں نے والینٹروں کی تنظیم پر کافی وقت صرف کیا اور اچھی طرح سوچ بچار کیا۔ ''ینگ انڈیا'' میں انھوں نے بھیڑ بھاڑ پر قابو پانے اور پبلک جلسوں کو چلانے کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھا۔ انھیں سرکاری تشدد کا خوف نہیں تھا، کیوں کہ اس سے دل مضبوط ہوتے تھے اور عدم تعاون کرنے والوں کی صفوں میں اضافہ ہوتا تھا۔ لیکن وہ عوام کے تشدد سے بہت ڈرتے تھے کیوں کہ اس سے تحریک افراتفری میں بدل کر ختم ہو سکتی تھی اور اس سے حکومت کا کہیں زیادہ سخت تشدد حرکت میں آ سکتا تھا۔

ملک کے کسی حصے میں بھی تشدد کا کوئی بھی واقعہ گاندھی کی نظروں سے بچ نہیں پاتا تھا۔ مالیگاؤں کے فسادات کو جس میں پولیس والے جم غفیر کے تشدد کا نشانہ بنے اور مالا بار حادثے کو جس میں موپلوں کے ہاتھوں ہندو ستائے گئے، گاندھی نے فوری اور غیر مشروط لفظوں میں بُرا بھلا کہا۔ نومبر 1921 میں جب پرنس آف ویلز بمبئی آئے تو گاندھی وہیں موجود تھے۔ اسی وقت ایک فساد رونما ہو پڑا جس میں 58 افراد ہلاک اور 321 زخمی ہوئے۔ انھوں نے بمبئی کے عوام کے نام ایک پیغام میں کہا کہ عدم تعاون کرنے والوں کا عدم تشدد تعاون کرنے والوں کے تشدد سے بھی برا نکلا کیوں زبان سے عدم تشدد کا نام لے کر ہم نے ان لوگوں کو دھمکانا چاہا جو ہم سے خلاف رائے رکھتے ہیں...... پچھلے دنوں میں میں نے جس سوراج کا مشاہدہ کیا ہے، اس کی بدبو میرے نتھنوں میں بھر گئی ہے۔''

ایک عینی شاہد نے ان فسادات کی تکلیف دہ صورت حال کی قلمی تصویر کھینچی ہے۔ ''اس طرح بے انتہا مایوسی کی فضا میں گھر کر، رنج و غم کے ایسے الفاظ زبان پر لاتے اور خود اپنے کو اس طرح سخت سست کہتے کہ پتھر کا دل رکھنے والے انسانوں کا کلیجہ بھی پگھل جاتا۔ افسوس اور پشیمانی کے بوجھ تلے دبے ہوئے وہ بار بار یہ یاد کرتے کہ انھوں نے کتنی امیدوں سے یہ تحریک چلائی تھی۔ ناروا داری کا جذبہ بے روک ٹوک بڑھ گیا اور بمبئی میں عظیم آتش فشانی پر منتہی ہوا۔ روز اول ہی ان

میں یہ دور اندیشی کیوں نہ آئی کہ عدم رواداری اور تشدد کی ہر نمائش کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔''(1)

سی۔ایف۔اینڈریوز نے، جو فسادات بمبئی کے بعد جنوبی افریقہ سے واپسی پر گاندھی سے ملے تھے، گاندھی کو اس حال میں پایا جیسے ''وہ شخص جو ابھی ابھی موت کے سایوں کی وادی سے گزرنے کے بعد نحیف ونزار ہو۔'' انڈریوز نے یہ محسوس کیا کہ جیسے جیسے حکومت کا تشدد بڑھتا جاتا تھا، تحریک کی روح میں بھی تشدد کا جذبہ داخل ہوتا جارہا تھا۔ ہندستان کے عظیم الشان عوام کو اپنی طاقت کا احساس ہو گیا تھا لیکن احساس کو قابو میں رکھنے کے لیے ان کی تربیت کا کام باقی تھا۔ بدیشی کپڑوں کے سرراہ جلائے جانے میں جو ''ہلکی سی نسلی تشویق'' شامل تھی اس پر اینڈریوز نے اعتراض کیا۔ وہ 14-1913 میں جنوبی افریقہ میں ستیا گرہ کو بروئے کار دیکھ چکے تھے۔ جب انھوں نے 1921 کی تحریک ہندوستان میں دیکھی تو انھوں نے محسوس کیا کہ ''یہ بالکل ہی نئی چیز ہے اور روحانی کم ہے۔''

بمبئی کا فساد (نومبر 1921) گاندھی کو ایسا لال سگنل نظر آیا جس کو دیکھ کر عوامی سوِل نافرمانی کی تحریک کا منسوخ کر دینا ضروری ہوا۔ کانگریس کی مجلس منتظمہ کے رفیقوں کو نہ تو گاندھی کی احتیاط سمجھ میں آتی تھی اور نہ اِن کے شبہات کی گونج دوسروں کے دلوں میں سنائی دیتی تھی۔ 1921 کے خاتمے کے مہینوں میں عوامی اندولن کو جاری رکھنے کے لیے کانگریس تنظیم کے اندر دباؤ بڑھتا رہا۔ حکومت اور کانگریس کے مابین مصالحت کی جس کوشش کا مدن موہن مالویہ نے آغاز کیا تھا اس کی ناکامی کانگریسی رضا کاروں کی بڑے پیمانے پر گرفتاری کھلے عام جلسوں پر پابندی، عدم تعاون کے نمایاں لیڈروں کی گرفتاری، ان سب نے مل کر سیاسی ٹمپریچر (درجہ حرارت) چڑھا دیا تھا۔ فروری 1922 میں گاندھی نے لارڈ ریڈنگ کو جوالٹی میٹم بھیجا وہ کانگریس اور خلافت کے لیڈروں کی اکثریت کی نگاہ میں ایسا اقدام تھا جو بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ ان میں بہت سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ کافی دور تک اور کافی تیز نہیں بڑھ رہے ہیں وہ چاہتے تھے کہ حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں ایک ساتھ عوامی سوِل نافرمانی شروع

(1) کرشن داس: مہاتما گاندھی کے ساتھ سات مہینے (انگریزی): احمد آباد، 1948ء جلد 1، ص: 410

کر دی جائے۔

دلّی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقد 3 نومبر 1921 میں سِول نافرمانی پر جو مباحثہ ہوا اس کے ایک اہم ریکارڈ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی کے بعض سینئر رفیق ان کی حکمت عملی کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھے۔ کرشن داس کے لفظوں میں ''مسٹر کیلکر اور مسٹر وٹھل بھائی پٹیل دونوں ہی مہاتما کی سِول نافرمانی شروع کرنے کی تجویز کے تو موافق تھے لیکن وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ اس اقدام میں شمولیت کا استحقاق حاصل کرنے کے لیے ہمارے عوام کی کوئی مخصوص ابتدائی تربیت ضروری ہے۔'' مہاتما جی نے یہ اصول بنایا تھا کہ جو شخص بھی سِول نافرمانی میں حصہ لینا چاہے اُس کو دستی کرگھا چلانا آنا چاہیے۔ جب یہ دفعہ پڑھ کر سنائی گئی اور پنڈت موتی لال نہرو کھل کھلا کر ہنس پڑے......تو مسٹر کیلکر اور مسٹر پٹیل نے زور زور سے اور خفا ہو کر احتجاج کیا۔''(1)

اس پس منظر میں دیکھیے تو چوری چورا کا واقعہ ہندوستانی برصغیر کے ایک دور افتادہ گوشے میں واقع ایک گمنام گاؤں کا اتفاقی حادثہ نہیں رہ گیا تھا۔ جب کہ گاندھی نے جواہر لال نہرو کو 19 رفروری 1922 کے خط میں لکھا۔ یہ (اونٹ کی پیٹھ پر) ''آخری تنکا تھا۔(2) انھوں نے جواہر لال کو یاد دلایا کہ انھیں مختلف جگہوں سے یہ خبریں مل رہی ہیں کہ تحریک کے عام سپاہی قابو سے باہر ہوئے جا رہے ہیں اور ان کی بے نظمی بڑھتی جا رہی ہے۔ اور میں تمھیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر اسے ملتوی نہ کر دیا ہوتا تو ہم ایک غیر متشددانہ نہیں بلکہ تشدد پسند تحریک کی قیادت کرتے نظر آتے۔'' جواہر لال کو یہ خبر جیل میں ملی تھی اور وہ اسے سن کر سخت متحیر اور رنجیدہ ہوئے تھے لیکن اپنی آپ بیتی میں تحریک سِول نافرمانی کے التوا کے موافق اور مخالفت دلائل پر غور و بحث کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ''فیصلہ درست تھا اور جو گھن لگنا شروع ہو گیا تھا وہ انھیں (گاندھی کو) روکنا ہی تھا اور از سرِ نو عمارت کھڑی کرنا تھی۔''

اُس تناظر میں جو اس وقت ہم سمجھ سکتے ہیں گاندھی کو اپنے 1922 کے سخت فیصلے پر کبھی

---

(1) کرشن داس: مہاتما گاندھی کے ساتھ سات مہینے: ص: 71-269

(2) انگریزی مثل۔ مفہوم یہ ہے کہ جب اونٹ کی پیٹھ پر مسلسل بوجھ لادا جائے تو آخری تنکے کا بوجھ بھی اس کی پیٹھ توڑ سکتا ہے۔

افسوس نہیں ہوا۔ بیس برس بعد ''ہریجن'' (12/اپریل 1942) میں انھوں نے 22-1920 کے عدم تعاون اندولن کی حد بندیوں پر بحث کی۔ اور انسان ''جو سب سے زیادہ مجنونانہ خطرہ'' مول لے سکتا ہے اس خطرے مول لینے کے اسباب بتائے۔ ''جنوبی افریقہ میں بھی میں نے ستیا گرہ کو تجربے کے طور پر اختیار کیا تھا۔ یہ اس لیے کامیاب ہوا تھا کہ ستیا گرہی چھوٹی تعداد میں اور ایک گھٹے ہوئے علاقے میں تھے اور اس لیے ان کو قابو میں رکھنا آسان تھا۔ یہاں ہم کو لاتعداد انسانوں سے سروکار تھا جو بہت وسیع ملک میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ان کو قابو میں رکھا جاسکا اور نہ ان کی تربیت ہوسکی۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے جس طرح لبیک کہی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ ان کا ردعمل اس سے بہتر ہوسکتا تھا اور نتائج بھی بہتر حاصل ہو سکتے تھے۔ لیکن جو نتائج حاصل ہوئے ہیں ان کو دیکھ کر مجھ کو مایوسی نہیں ہوئی ہے۔ اگر میں نے ایسے لوگوں کے ساتھ کام کرنا شروع کیا ہوتا جن کو عدم تشدد پر اعتقاد ہوتا، تو میرا خاتمہ میری ہی ذات پر ہو گیا ہوتا۔ چوں کہ میں نامکمل انسان ہوں، اس لیے میں نے نامکمل مردوں اور عورتوں کے ساتھ مل کر کام شروع کیا اور ایک ایسے سمندر میں کشتی ڈال دی جس کی راہ پیمائی نہیں ہوئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اگرچہ ناؤ منزلِ مقصود کو نہیں پہنچی لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ یہ بڑی حد تک طوفان کو جھیل سکی۔''

گاندھی نے دیکھا کہ ان کے بہت سے رفقائے کار اور عدم تعاون کرنے والوں کا کثیر مجمع غصے کی آگ میں جل رہا ہے اور حکومت پر ''بھرپور وار'' کرنا چاہتا ہے، اگرچہ یہ وار غیر متشددانہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اس ستیا گرہ کی تکنیک کا دراصل نامکمل ادراک تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ مخالف کے ضمیر میں خلش ہو، اس کا دل پگھلے اور اس کی آنکھیں کھل جائیں۔ اہنسائی جنگ کی تکنیک دوسرے طریقے کی جنگ سے اس لیے مختلف ہے کہ موخرالذکر جنگ میں مقصد حاصل کرنے کے لیے کسی بھی ذریعے کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جنگ اور سیاست کے بارے میں عام نظریہ ہے کہ ان میں ہر بات جائز ہے۔ دشمن کو ہرانے کے لیے سرغنوں کو چاہیے جتنی جگہ بھی ہو سکے بھاری سے بھاری دباؤ ڈالیں۔ ستیا گرہ پر ایسی حکمت عملی اطلاق نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس میں جذبات کی برانگیختگی کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ گاندھی نے سول نافرمانی کی تعریف کی تھی اور ستم سہنے کی خاموش تیاری''، جس کے اثرات حیرت خیز ہوں مگر غیر محسوس اور شریفانہ طور پر ہوں۔''

رومن رولاں نے لکھا کہ ''کسی قوم کی تمام طاقتوں کو ایک نقطہ پر جمع کر دینا اور ایک پہلے سے طے شدہ تحریک کے روبرو پوری قوم کو دم بخود کھڑا کر دینا، آخری حکم دینے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھانا اور آخری لمحے پر اپنا ہاتھ گرا دینا اور ٹھیک اُس وقت جب کہ ساری مشینری حرکت میں آ چکی ہو، تین بار ٹھہرو، کی صدا لگا دینا خطرناک ہے۔ خطرہ یہ ہوتا ہے کہ بریک بیکار ہو جائیں اور محرک جذبے مفلوج ہو جائیں''[1] اگر ہم رولاں کا استعارہ آگے بڑھائیں، تو گاندھی پوری مشینری کو ایک دم سے ٹھپ نہیں کر رہے تھے بلکہ قبل از وقت پہلا گیئر لگانے کے بعد فوراً ہی تیسرا گیئر لگانے لگے تھے۔ ''جارحانہ پروگرام'' کی معطّلی کا اثر تعمیری پروگرام پر، جو عدم تعاون کی تحریک کا مثبت پہلو تھا، نہیں پڑا تھا۔ اعتراض کرنے والے گاندھی کے اس یقین میں شریک نہیں تھے کہ آخری مجبورانہ اقدام یعنی سوِل نافرمانی کے بھی عدم تشدد کی تحریک مؤثر ہو سکتی تھی۔

کانگریسی اور خلافتی لوگ ہی چوری چورا کے بعد گاندھی کے اقدام کو سمجھنے میں معذور نہیں تھے۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے بھی بہت خوش ہو کر اپنے بیٹے سے رازدارانہ طور پر کہا تھا کہ گاندھی ''ایک سیاست داں کی حیثیت سے اپنے کو گرفتاری سے ایک مہینے یا چھ ہفتے پہلے کے غیر معمولی مظاہروں سے آخری کھائی تک ڈھکیل لائے تھے۔''[2]، بعض برطانوی مشاہدین کا خیال تھا کہ چوری چورا اس تحریک کو ختم کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ جس پر تھکن کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اعلا سرکاری طبقے گاندھی کی گرفتاری کے عواقب پر کس طرح بحث و مباحثہ کر رہے تھے اور 1921 کے آخری مہینوں میں معاملات ٹکراؤ کے نقطے پر آ پہنچے تھے۔ فروری 1922 میں سکریٹری آف اسٹیٹ نے وائسرائے کو تار دیا کہ گرفتاری میں تاخیر سے وہ الجھن میں پڑ گئے ہیں۔ یکم فروری 1921 کو لکھی گئی گاندھی کی کھلی چٹھی کے بعد جس میں باردولی میں نافرمانی کی تحریک چلانے کو کہا گیا تھا۔ گرفتاری زیادہ دنوں تک روکی نہیں جا سکتی تھی لیکن عوامی سوِل نافرمانی کی منسوخی اور کانگریس کی صفوں میں افراتفری کے بعد بظاہر گاندھی کی گرفتاری کے امکانات کم ہو گئے تھے۔ لیکن لارڈ ریڈنگ نے اس کے بعد بھی حکم دینے سے پہلے اپنی کاؤنسل اور

---

(1) رومن رولاں: مہاتما گاندھی، لندن، 1945، ص: 152

(2) ریڈنگ، مارکوئی آف روفس آئزک: ریڈنگ کا پہلا مارکوئی، جلد 2، ص: 249

بمبئی اور مدراس کے گورنروں سے مشورہ کرنے میں کچھ اور ہفتے لگا دیے۔

گاندھی نے ''ینگ انڈیا'' (9/ مارچ 1922) میں لکھا کہ ''میرے لیے یہ فخر یا خوشی کا نہیں بلکہ تحقیر کی بات ہے کہ حکومت مجھے گرفتار کرنے میں عام تشدد پھیل جانے کے خوف سے جھجکتی ہے مہاتما نے اپنے پیرووں کو ہدایت کی کہ ان کی گرفتاری کے بعد مکمل ڈسپلن کا مظاہرہ کریں۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ لارڈ ریڈنگ بڑے سکون کے ساتھ اپنے بیٹے کو ایک خط میں یہ لکھنے کے قابل ہو سکے کہ گاندھی کی گرفتاری پر انھیں کسی مشکل کا سامنا کرنا نہیں پڑا اور ''ایک کتا بھی نہیں بھونکا۔''

10/ مارچ کی شام کو گاندھی گرفتار کر لیے گئے۔ انھوں نے آشرم والوں کو الوداع کہا۔ ایک سچے ویشنو کی طرح اپنا محبوب گانا سنا[1]، جو کار باہر انتظار کر رہی تھی اُس میں بیٹھے اور جیل لے جائے گئے۔ سی۔ان بروم فیلڈ، دسٹرکٹ و سشن جج، احمد آباد کی عدالت میں مقدمہ چلا۔ استغاثہ کی طرف سے ''ینگ انڈیا'' میں شایع ہونے والے تین مضامین پر مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔ یہ مضامین تھے ''وفاداری میں دست اندازی''، ''معمہ اور اس کا حل'' اور ''ایال ہلانا۔'' دوسرے ملزم ''ینگ انڈیا'' کے پبلشر شنکر لال بینکر تھے۔ سر جے، ٹی، اسٹرینگ مین، ایڈوکیٹ جنرل نے استغاثے کی طرف مقدمے کی پیروی کی۔ ملزم کے کٹہرے کی طرف عزت سے سر کو جنبش دی۔ گاندھی نے اقرار جرم کر کے ان کا کام ہلکا کر دیا۔ ایک بیان میں شوکت جذبات اور بلاغت کے اعتبار سے جواب نہ تھا، انھوں نے اس امر کی وضاحت کی تھی کہ وہ ایک پکے وفادار سے باغی کیسے بن گئے۔

''میری پبلک زندگی کا آغاز افریقہ میں طوفانی موسم میں ہوا۔ برطانوی اقتدار سے میری پہلی مڈبھیڑ وہاں خوش کن حالات میں نہیں ہوئی۔ مجھ پر وہاں یہ بھید کھلا کہ ایک ہندوستانی اور ایک انسان کی حیثیت سے میرا کوئی اختیار نہیں ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہندوستانی ہونے کی وجہ سے میرے انسانی حقوق بھی نہیں رہ گئے ہیں۔ لیکن میں حواس باختہ نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ جو برتاؤ ہو رہا ہے وہ ایک ایسے نظام کا جو بنیادی طور پر اور علی العموم اچھا ہے،

---

(1) ویشنو جن تو تینے کہیے۔

بدگوشت ہے۔ میں نے حکومت کے ساتھ رضا کارانہ اور تہ دل سے تعاون کیا جہاں مجھے اُس کی غلطی نظر آئی میں نے پوری طرح تنقید کی لیکن کبھی اس کی بربادی کی خواہش نہیں کی............

''پہلا دھچکا راوَلٹ ایکٹ سے لگا............پھر پنجاب کے لرزہ براندام کرنے والے واقعات ہوئے۔ مجھ پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ ترکی اور مقامات مقدسہ کی سالمیت باقی رکھنے کے لیے مسلمانوں سے کیا گیا وزیراعظم کا وعدہ وفا کیا جانے والا نہیں تھا۔ 1919 کی امرتسر کانگریس میں دوستوں کی تنبیہہ اور آگاہوں اور مستقبل کے بارے میں فال بد کے باوجود میں تعاون کے لیے جنگ کرتا رہا اور مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی حمایت کرتا رہا۔

''میں بادلِ ناخواستہ اس نتیجے پر پہنچا کہ برطانوی تعلقات نے ہندوستان کو سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے اتنا مجبور محض بنادیا ہے جتنا وہ کبھی نہیں تھا......وہ اتنا مفلس ہو چکا ہے کہ قحطوں کا مقابلہ کرنے کی اس میں طاقت نہیں رہ گئی ہے......انھیں اس کا احساس نہیں ہے کہ برطانوی ہند میں ازروئے قانون جو حکومت ہے کا کام عوام کا استحصال ہے۔ برہنہ آنکھوں کے سامنے دیہاتوں میں جو ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آتے ہیں ان کو کوئی پرفریب لفاظی اور اعدادوشمار کے داؤں پیچ چھپا نہیں سکتے اور یہ شہادت جھٹلائی نہیں جاسکتی۔ اگر آسمانوں پر کوئی خدا ہے تو مجھے کوئی شبہ نہیں کہ انگلستان کو اور ہندوستان میں رہنے والے شہریوں کو انسانیت کے خلاف ہونے والے اس جرم کی جوابدہی کرنا ہوگی............سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ انگریز اور ملک کے انتظامیہ میں ان کے ہندوستانی ساتھی یہ جانتے بھی نہیں کہ وہ اس جرم کا ارتکاب کررہے ہیں جس کو بیان کرنے کی میں نے کوشش کی ہے......(ان میں سے اکثر) ایمانداری سے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ دنیا میں قائم کیے گئے بہترین نظام کے تحت حکومت چلارہے ہیں اور ہندوستان برابر ترقی کیے جارہا ہے چاہے اس کی رفتار سست ہی کیوں نہ ہو۔''

جو تشدد آمیز واقعات رونما ہوئے تھے اُس کی ذمہ داری انھوں نے تسلیم کی اور کہا کہ جو بڑی سے بڑی سزا ہوسکتی ہو وہ انھیں دی جائے۔

''بمبئی مدراس اور چوری چورا کے واقعات کے سلسلے میں ایڈوکیٹ جنرل نے میرے کاندھوں پر جتنے الزامات لادنے کی کوشش کی ہے میں ان سب کی تائید کرتا ہوں۔ ان باتوں پر گہرائی میں غور

کرنے کے بعد اور کئی کئی راتیں ان کے بارے میں سوچ سوچ کر گزارنے اور اپنے دل کو ٹٹولنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ میں چوری چورا کے شیطانی جرائم یا بمبئی کے مجنونانہ قتل وغارت سے اپنے کو ناوابستہ بتا سکوں۔ وہ یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت سے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جس کو مناسب تعلیم ملی ہو اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جسے اس دنیا کا مناسب تجربہ ہو، مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میرے ہر ایک کام سے کیا نتائج مرتب ہوں گے۔ مجھے یہ سب معلوم تھا مجھے معلوم تھا کہ میں آگ سے کھیل رہا ہوں۔ میں نے یہ خطرہ مول لیا اور اگر مجھے چھوڑ دیا گیا تو میں پھر بھی وہی کروں گا۔ میں تشدد سے بچنا چاہتا تھا۔ عدم تشدد میرے معتقدات کا اولین اصول ہے۔ یہ میرے معتقدات کا سب سے آخری اصول بھی ہے۔ لیکن مجھے دو میں سے ایک چیز لینا ہی تھی۔ یا تو میں اُس نظام کا اتباع قبول کر لیتا جو میرے خیال میں میرے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکا ہے یا میں اپنے عوام کے غصے کے ابل پڑنے کا خطرہ اس وقت مول لیتا جب وہ میرے ہونٹوں سے حق بات سنتے اور سمجھتے۔ میں جانتا ہوں کہ بعض اوقات میرے عوام پاگل ہو گئے تھے۔ مجھے اس کا دلی قلق ہے اور اس لیے میں آج یہاں حاضر ہوتا ہوں کہ معمولی سزا نہیں بلکہ بڑی سے بڑی سزا بھگتوں۔ میں رحم کی درخواست نہیں کر رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس سے جرم کی اہمیت گھٹ سکتی ہو۔

''مسٹر جج! آپ کے سامنے صرف یہی راستہ رہ گیا ہے کہ...... یا تو آپ اپنے منصب سے استعفا دے دیں اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جس نظام اور قانون کے چلائے جانے میں آپ مدد کر رہے ہیں وہ عوام کے لیے اچھا ہے تو آپ مجھے کڑی سے کڑی سزا دیں۔

جج بروم فیلڈ نے یہ تسلیم کیا کہ آج تک ان کی عدالت میں جن لوگوں پر مقدمہ چلا ہے۔ یا آئندہ چلنے کا امکان ہے گاندھی ان کو دیکھتے ہوئے ایک دوسرے ہی قسم کے آدمی تھے۔

''قانون افراد کی عزت کرنا نہیں جانتا پھر بھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آپ اپنے کروڑوں ہم وطنوں کی نگاہ میں ایک عظیم وطن پرست اور عظیم لیڈر ہیں۔ وہ لوگ بھی جو سیاست میں آپ سے اختلاف رکھتے ہیں، اتنا مانتے ہیں کہ آپ بلند اصولوں کے انسان ہیں بلکہ سنت سادھوؤں کی سی زندگی گزارتے ہیں مجھے آپ سے صرف ایک ہی نوعیت پر بحث کرنا ہے......

یہ میرا فرض ہے کہ میں آپ کو ایسے انسان کی حیثیت سے پرکھوں جو قوانین کا تابع ہے اور جو اپنے ہی افراد کے بموجب، قانون شکنی کر چکا ہے...... میں اسے بھول نہیں سکتا کہ آپ نے مسلسل تشدد کے خلاف پرچار کیا ہے اور میں یہ ماننے کو آمادہ ہوں کہ آپ نے کئی موقعوں پر تشدد کو روکنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے لیکن یہ بات میری مہم کی گرفت میں نہیں آتی کہ اپنی سیاسی تعلیمات کی نوعیت کو نظر میں رکھتے ہوئے اور اِن تعلیمات کے جو لوگ مخاطب تھے ان کی فطرت کو دھیان میں رکھتے ہوئے آپ کس طرح لگاتار یہ یقین رکھتے چلے گئے کہ ان کا لازمی نتیجہ تشدد نہ ہوگا۔''

گاندھی کو چھ سال کی سزا دی گئی۔ ایک مشاہد نے اِسے نوٹ کیا کہ سومنٹ کے دوران مقدمہ میں وہ نہ صرف یہ کہ متین وسنجیدہ رہے، بلکہ یوں خوش تھے جیسے کوئی جشن ہو جہاں تک سزا کا تعلق ہے، انھوں نے جج سے کہا،''میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ہلکی سے ہلکی سزا ہے جو کوئی جج مجھے دے سکتا تھا اور جہاں تک عدالتی کارروائی کا تعلق ہے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ اس سے زیادہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا نہیں جا سکتا تھا۔''

جب جج عدالت کو چھوڑ کر چلا گیا تو پولیس افسران یہ دیکھ کر شش و پنج میں پڑ گئے کہ سارے مجمع نے ایک خاندانی مجمع کی شکل اختیار کر لی۔ گاندھی بیچ میں بیٹھ گئے اور انھوں نے ہر ایک سے ایک یا دو لفظ کہے۔ انھوں نے ایک پانچ برس کے بچے سے اُس کے بدیسی لباس کے بارے میں مذاق کیا، دل بڑھانے والی باتیں کیں۔ ہاتھ ملائے اور تب اس موٹر گاڑی میں بیٹھ گئے جو انھیں سابرمتی جیل تک لے گئی ان کا وداعی پیغام یہ تھا کہ ملک اسی طرح پُرامن رہے جیسے اُن کی گرفتاری اور مقدمے کی کارروائی کے دوران ایک ہفتے تک رہ چکا ہے۔ دو دن کے بعد ان کو اور شنکر لال بینکر کو ایک اسپشل ٹرین کے ذریعے کرکی بھیجا گیا جو پونہ کے نواح میں واقع ہے اور وہاں سے انھیں برودا جیل لے جایا گیا۔

جیل جانا عدم تعاون کا جزو تھا۔ اپنی تقریروں اور تحریروں میں گاندھی نے اکثر و بیشتر تحریک کے لیے اس کی اہمیت پر اظہار خیال کیا تھا۔ انھوں نے ایک بار لکھا تھا کہ''جیل کی دیواروں کے اندر ہی یا کبھی کبھی تختۂ دار پر حریت اور آزادی سے عشق کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ اٹھارہ مہینوں میں ہزاروں عدم تعاون کرنے والے جیلوں میں بھرے جا چکے تھے۔ گاندھی کی نظروں میں مثالی عدم تعاون کرنے والا وہ تھا جو اپنے کو خود سے گرفتاری کے لیے پیش کرے، اس لیے کہ حکومت

پریشان ہو جائے بلکہ اس لیے کہ ایک منصفانہ مقصد کے لیے اس کی قربانیوں سے حکومت کا دل پسیج جائے۔ گرفتاری کے لیے پیش ہوتے وقت ''بدتہذیبی سے نہیں تندمزاجی سے نہیں، تمتماتے چہرے سے نہیں اور کسی حالت میں بھی تشدد سے نہیں بلکہ پُرامن طور پر، خاموشی سے، خوش اخلاقی سے، منکسر مزاجی سے اور دعا گو ہو کر بہادری کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔'' عدم تعاون کرنے والے کو جیل کو ڈسپلن کا خیال رکھنا چاہیے۔ اسے مخصوص مراعات نہ طلب کرنا چاہیے نہ قبول کرنا۔ جیل کی زندگی کی تکلیفوں کو خوشی خوشی قبول کرنا چاہیے کیوں کہ ''اس طرح کے منکسرانہ اطوار جن کا سرچشمہ طاقت اور علم ہو، آخر کار ظلم اور ظالم کو ہوا میں تحلیل کر دیتے ہیں۔ رضا کارانہ طور سے ستم برداشت کرنا بے انصافیوں اور بداعمالیوں کے ازالے کے لیے اچوک علاج ہے۔''

برودا جیل خانے کے بعد ان سے کہا گیا کہ نہ تو وہ چرخہ چلا سکتے ہیں اور نہ باہر سو سکتے ہیں۔ بہرحال، بعد میں یہ پابندیاں ہٹالی گئیں۔ بڑی مشکل سے حکام بالا کو اس پر رضا مند کیا گیا کہ وہ اپنے پاس کچھ مذہبی کتابیں، ایک ڈکشنری اور ایک اردو کی درسی کتاب رکھ سکتے ہیں انھیں تکیہ نہیں دیا گیا لیکن انھوں نے فاضل کپڑوں اور کتابوں سے ایک تکیہ بنالیا۔ انھیں اپنی ڈبل روٹی کاٹنے کے لیے ایک جیبی چاقو تک کی اجازت نہیں دی گئی اور جب اجازت ملی بھی تو اس شرط پر کہ وہ استعمال کے بعد چاقو ایک جیل کے افسر کے پاس رکھوا دیا کریں۔ ان کے ساتھی قیدی بنیکر کو ایک دوسری کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا اور دوسرے قیدیوں کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ گاندھی سے مل سکیں۔ ایک افریقی قیدی خادم کی حیثیت سے ان کے متعلق کر دیا گیا۔ چوں کہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ اپنا مطلب اشاروں میں ادا کرتے تھے۔ بہرحال، گاندھی انسانی قلب کی زبان سمجھ لیتے تھے۔ ایک دن اس افریقی کے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ گاندھی نے اس کے زخم کو دھویا، زہر کو چوس کر باہر نکالا اور جب تک وہ اچھا نہ ہو گیا اس کا علاج کرتے رہے۔ اس مہربانی نے اس کا دل جیت لیا اور تب وہ چرخا چلانے میں گاندھی کا اچھا شاگرد بن گیا۔

جب دیوداس اور راج گوپال اچاری برودا جیل میں گاندھی سے ملے تو انھوں نے ان دونوں کو یہ ہدایت کی کہ ان کی جیل کی زندگی کے بارے میں پریس میں کوئی چرچا نہ کیا جائے۔ انھیں یہ عائد کردہ تنہائی پسند آئی۔ ہندوستان میں پچھلے سات برس کی لگاتار جدوجہد میں وہ جس

خاموشی اور آرام سے نا آشنا ہو گئے تھے وہ انھیں یہاں مل گئی انھوں نے روزانہ صبح وشام کی پرارتھنا اور چرخہ کاتنے کا معمول جاری رکھا۔ ان کا وہ ادبی اور مذہبی مطالعہ، جسے وہ دوسری مشغولیتوں کے ہنگامے میں بھول بیٹھے تھے پھر سے شروع ہوا۔ انھوں نے اس دوران میں ڈیڑھ سو سے کم کتابیں نہ پڑھی ہوں گی۔ ان میں شامل تھیں۔ ہنری جیمس کی

(مذہبی تجربات کے اقسام) بک کی

(تاریخ تمدن) ولس کی (تاریخ کا خاکہ)، برنارڈ شا کی

(بشر اور فوق بشر)، گیٹے کی ''فاوسٹ'' کپلنگ کی ''بیرک روم بیلڈ'' (............) اس میں شک نہیں کہ جیل میں وقتاً فوقتاً پیدا کی جانے والی خلشوں کے باوجود ٹیگور کے لفظوں میں قید کی زندگی ان کے لیے سکونی علاج ثابت ہوئی۔

جنوبی افریقہ کے قید خانوں میں گاندھی جیل کی زندگی کا مزا چکھ چکے تھے اور زندان کو وہ مزاحیہ طور پر ''شہنشاہ معظم کا ہوٹل'' کہا کرتے تھے۔ جنوبی افریقہ کی جیلوں میں ان کے ساتھ جو بے ادبانہ اور اکثر سخت برتاؤ کیا جاتا تھا، اِسے نسلی عصبیت پر مبنی کہا جا سکتا تھا لیکن اس کا سبب سمجھنا مشکل ہے کہ برودا جیل کی پہلی یاترا میں ان کے ساتھ اس پاس اور لحاظ کا ثبوت کیوں نہیں دیا گیا جو بعد کی قید کی سزاؤں میں عام طور سے برتا گیا۔

سیاسی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں لارڈ ریڈنگ کا خیال تھا کہ ''قید کو سرکاری خرچ پر آرام کی جگہ [1]'' نہ بننا چاہیے۔ عدم تعاون کی تحریک کے مصنف کے ساتھ کیے جانے والا برتاؤ ممکن ہے اسی خیال کی عملی شکل ہو۔ اس کا ایک آسان تر سبب یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ حکومت اور حکامِ جیل بھی قیدی گاندھی کے طور طریقوں سے مانوس نہیں ہوئے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب 1924 میں ان پر اَپنڈی سائی ٹِس [2] کا حملہ ہوا تو اس کے علاج کے لیے فوری اور خاطر خواہ اقدام کیے گئے۔

---

(1) ریڈنگ، مارکوی آف: روفس آئزک: پہلا مارکوئی آف ریڈنگ، ج:2،ص:236

(2) ایک بہت چھوٹی آنت کا درد شدید۔ یہ آنت پیٹ کے داہنی زیریں حصے میں پائی جاتی ہے اور ڈاکٹر عام طور پر اس کا علاج آپریشن بتاتا ہے۔

تیسری فصل

جنگ اور امن

باب28

کاؤنسل کا محاذ

عدم تعاون کے اندولن میں ''جارحانہ'' پروگرام کی منسوخی کے بعد چاہے گاندھی کے نقطۂ نظر سے اس کا کچھ ہی جواز کیوں نہ رہا ہو، کانگریس کی عام صفوں میں بڑی پریشان خیالی آ گئی تھی۔ لیڈر شپ بھی دو ٹکڑیوں میں بٹ گئی تھی۔ بعض کانگریسی لیڈر جن میں سی آر داس، موتی لال نہرو اور وی جے پٹیل شامل تھے۔ کبھی بھی اس کے حق میں نہیں تھے کہ نئی قانون ساز مجلسوں کا جو 1919 کے انڈین رفارمس ایکٹ کے ماتحت قائم ہوئی تھیں بائیکاٹ کیا جائے۔ پیدائشی مقنن اور خطیب ہونے کی وجہ سے یہ لوگ قانون ساز مجالس ہی میں کھل سکتے تھے۔ 1920 میں مہاتما کے کہنے پر یہ لوگ بائیکاٹ پر راضی ہو گئے تھے۔ اب جب کہ عوامی سول نافرمانی کا فوری امکان نظر نہیں آ رہا تھا تو ان لوگوں نے محسوس کیا کہ حکومت سے مقاومت کو جاری رکھنے کا صرف یہی راستہ ہے کہ مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز میں داخل ہوا جائے۔ نئے آئین کو چلانے کے لیے نہیں بلکہ اس کی محدود اور غیر ذمہ دار نوعیت کا پول کھولنے کے لیے۔

''اصلاح شدہ آئین'' کے ماتحت، حکومت ہند مرکزی مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ نہیں تھی۔ ایوان بالا۔ یعنی کاؤنسل آف اسٹیٹ میں سرکاری اور نامزد ممبروں کی اکثریت تھی۔ ایوانِ زیریں یعنی مرکزی قانون ساز اسمبلی میں تقریباً ایک تہائی ممبر برطانوی افسر تھے یا ان کے

نامزد کیے ہوئے ہندوستانی بجٹ کے مشکل سے ساتویں حصے پر مرکزی قانون ساز اسمبلی میں ووٹ لیا جاسکتا تھا۔ اگر قانون ساز اسمبلی کسی قانون یا ضابطے کو نامنظور کردے تو گورنر جنرل کو اختیار تھا کہ وہ اپنی طرف سے اس ضابطے کی تصدیق کرسکے۔

صوبوں میں ایک دوغلا نظام بروئے کار تھا۔ اسے ''دوعملی'' کہتے تھے۔ اس کے ماتحت بعض محکمے تو وزیروں کے سپرد تھے جو قانون ساز کے سامنے جواب دہ تھے۔ لیکن دوسرے محکمے جن میں مالیات امن وامان وغیرہ شامل تھے، براہ راست افسروں کے ماتحت تھے جو صرف گورنر کے سامنے جوابدہ تھے اور گورنروں کو ویٹو (استرداد) کا حق تھا۔

وہ کانگریسی لیڈر جو کاؤنسلوں میں داخلے کے حق میں تھے انھیں بعد میں سوراجی (سوراجسٹ) کہا جانے لگا تھا۔ یہ سوراجی بھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ قانون ساز اسمبلیوں کی افادیت محدود ہے۔ ان کے خیال میں مجالس قانون ساز ایک طرح کی نقابیں تھیں جو برطانوی افسر شاہی (بیوروکریسی) نے دنیا کو دھوکا دینے کے لیے اپنے چہرے پر ڈال لی تھیں۔ اب یہ کانگریس والوں کا کام تھا کہ وہ اِن نقابوں کو چاک کردیں، قانون ساز اسمبلیوں سے عوام کو حقیقی طاقت نہیں ملنے والی تھی لیکن سیاسی جنگ میں اِن کو حربے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اگر کانگریس والے مجلس قانون ساز میں اتنی طاقت یکجا کرسکیں کہ سرکاری بلوں کو مسترد کردیں اور سپلائی سے انکار کردیں تو حکومت کو یا تو اختیارات خصوصی استعمال کرنا ہوں گے یا مجلس قانون ساز کے فیصلے کے سامنے جھکنا ہوگا۔ ایسی صورت حال کا بہر صورت یہ نتیجہ ہوگا کہ دنیا پر یہ بات آشکارا ہوجائے گی کہ جس آئین کے ماتحت ملک پر حکومت کی جارہی ہے اس میں آخری اقتدار ایک ایسی انتظامیہ کے ہاتھ میں ہے جسے ہٹایا نہیں جاسکتا۔ بعض سوار.جی اُن حکمت عملیوں سے بہت متاثر تھے جو پارنل اور اس کی پارٹی والے، آئرش ہوم رول اندولن کے سلسلے میں برطانوی ہاؤس آف کامنس (دارالعلوم) میں اختیار کئے ہوئے تھے[1]، ''مسلسل مستقل اور ثابت قدم رکاوٹ'' سے یہ کام لیا جانا تھا کہ کاؤنسلوں کو حکومت کے ہاتھوں کا کھلونا بنانے کی بجائے اُس کے پہلو کا کانٹا بنادیا جائے۔

مارچ 1922 میں گاندھی کی گرفتاری کے فوراً بعد، اُن کے پیروں میں شدید اختلاف کے

(1) پٹیل، جی، آئی وٹھل بھائی پٹیل، ج:2،ص:540

آثار نمودار ہو گئے۔ مہاراشٹر اور بنگال میں کئی نمایاں لیڈروں نے کاؤنسلوں کے بائیکاٹ کے خاتمے کی موافقت کا اعلان کر دیا بنگال صوبائی کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مسز سی آر داس نے قومی جدوجہد کو کاؤنسلوں کے اندر لے جانے کی وکالت کی۔ جون 1922 میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا اور وہاں اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی کہ ملک کا دورہ کر کے یہ معلوم کرے کہ لوگ کس حد تک سول نافرمانی کے لیے تیار ہیں۔ سول نافرمانی تحقیقاتی کمیٹی نے یہ رپورٹ دی کہ ملک بڑے پیمانے پر سول نافرمانی کے لیے تیار نہیں ہیں۔لیکن ہر صوبائی کمیٹی کو یہ حق دیا گیا کہ وہ بطور خود خاص قوانین کی خلاف ورزی کرنے یا نفرت انگیز ٹیکسوں کی عدم ادائیگی کی مہم چلائے۔ کاؤنسلوں کے بائیکاٹ کے سوال پر ممبران کمیٹی میں شدید اختلاف رائے تھا۔ وی جے پٹیل، حکیم اجمل خاں، اور موتی لال نہرو بائیکاٹ اٹھائے جانے کے حق میں تھے مگر ڈاکٹر انصاری اور راج گوپال اچاری اس پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی کے خلاف تھے جو گاندھی نے اپنی گرفتاری کے پہلے مرتب کیا تھا۔

سی آر داس جو علی پور جیل ہی میں کاؤنسلوں میں داخلے کی تحریک چلانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اپنی رہائی کے بعد دل وجان سے اس تحریک میں پھاند پڑے۔ دسمبر 1922 کے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں یہ تجویز رکھی کہ یا تو کاؤنسلوں میں ایسی ترمیم کی جائے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے حصول میں مفید ہوں اور یا انھیں بالکل ہی ختم کر دیا جائے۔ وہ کاؤنسلوں میں داخلے کو، تحریک عدم تعاون کے متناسب نہیں تصور کرتے تھے بلکہ اُن کے خیال میں اب بائیکاٹ کاؤنسل چیمبروں تک لے جایا جا رہا تھا، جو کہ سرکاری قلعۂ محفوظ کا دِل تھا۔ گاندھی کے وفادار پیرووں کو یہ استدلال پسند نہیں آیا کیوں کہ وہ کاؤنسلوں کے داخلے کو حکمت عملی کی تبدیلی نہیں بلکہ عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کے اصول کی خلاف ورزی سمجھتے تھے۔ اِن میں سے ایک نے یہ بات کہہ بھی ڈالی۔ ہماری تحریک، پاکیزگی کی تحریک ہے اور اس لیے ڈپلومیسی سے بالا ہے۔ کاؤنسلوں میں اس غرض سے داخل ہونا کہ انھیں ناکام بنا دیا جائے نہ صرف یہ کہ ڈپلومیسی ہے بلکہ دورنگی موقع شناسی ہے۔ جس سے ہر عدم تعاون کرنے والے کو نفرت کرنا چاہیے۔[1]

---

(1) پٹیل، جی، آئی وٹھل بھائی پٹیل، ج:2،ص:117

وی ، جے ، پٹیل نے یہ اعلان کیا تھا کہ قانون ساز اسمبلیوں میں داخلہ ایسا ہے جیسے دشمن
کے قلعے میں چوری چھپے اپنے کو پہنچا دینا تا کہ قلعہ جیت لیا جائے ۔ ان کے بھائی ولبھ بھائی پٹیل
نے جواب دیا کہ دشمن کا قلعہ قانون ساز اسمبلیوں میں واقع نہیں ہے اور جب تک یہ کسی اور جگہ
رہے گا حکومت مجالس قانون ساز کے بغیر بھی سو برس تک چلتی رہ سکتی ہے ۔

ولبھ بھائی پٹیل ، راج گو پال اچاری اور ان کے دوسرے ہم خیال جو عدم تعاون پروگرام
میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں چاہتے تھے انھیں "نو چنیجر" (مخالف تبدیلی) کہا جانے لگا ۔ ان
میں سے زیادہ کے یہاں اپنے زندانی لیڈر سے وفاداری کا جذبہ تھا ۔ موتی لال نہرو ، سری نواس
اینگر اور وی جے پٹیل کی حمایت حاصل ہو جانے کے بعد بھی سی آر داس گیا کانگریس میں اکثریت
کی تائید حاصل نہ کر پائے ۔ کاؤنسلوں کے بائیکاٹ کی پالیسی برقرار رہی ۔ اس اجلاس کے فوراً بعد
داس نے کانگریس سے استعفا دے دیا اور سوراج پارٹی قائم کی ۔ وہ خود اس کے لیڈر اور موتی لال
نہرو سکریٹری ہو گئے ۔ اب کانگریس کے دو گروہوں کی مخالفت کھل کر سامنے آ گئی ۔

آنے والے چند مہینوں میں کانگریس کی سیاست بہت ہی سیّال حالت میں رہی ۔
سوراجیوں اور نو چینجروں (تبدیلی کے مخالفین) جو رسہ کشی ہو رہی تھی اُس میں ورکنگ کمیٹی اور آل
انڈیا کانگریس کمیٹی سے بہت سے استعفے ہوئے ۔ لوگوں کی نیتوں پر حملے کیے گئے ''پوائنٹ آف
ارڈ'' اٹھائے گئے ۔ اور کانگریس کے آئین کی بال کی کھال نکالی گئی ۔ گیا کانگریس نے کاؤنسلوں
میں داخلے کو مسترد کر دیا تھا اور اس خوش فہمی می ں بھی رہی کہ اپریل 1923 تک سول نافرمانی کا
پھر سے آغاز کر دیا جائے گا ۔ دونوں گروہوں کے درمیان یہ شریفانہ سمجھوتا ہو گیا کہ ایسے وقت جب
کہ سول نافرمانی کی تیاریاں ہو رہی ہیں دونوں گروہ کاؤنسلوں میں داخلے کے سوال پر خاموشی
اختیار کیے رہیں ۔ بہر حال جو تیاریاں ہو رہی تھیں اُن کا استقبال بڑی گرمجوشی سے نہیں ہو رہا تھا ۔
پچاس ہزار رضا کاروں کی حد مقرر کی گئی تھی لیکن مشکل سے آٹھ ہزار افراد نے نام لکھوائے تھے ۔
وقتی طور سے سوراج پارٹی ہی کا پروگرام زیادہ مؤثر نظر آ رہا تھا ۔ سوراجیوں اور تبدیلی کے مخالفین
میں مصالحت کی کوششیں شروع ہوئیں ۔ ستمبر 1923 میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس دلّی میں
طلب کیا گیا تا کہ اس کا قطعی فیصلہ کیا جائے کہ نومبر 1923 میں جو الکشن ہونے والے تھے اُن

کے سلسلے میں کانگریس کا رویہ کیا ہو۔ مولانا محمد علی اُسی زمانے میں جیل سے رہا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی پوری قوت سے سوراجیوں کی حمایت کی۔ انھوں نے مہاتما کے اس پیغام کا حوالہ دے کر کانگریس اجلاس میں ہلچل مچادی کہ ملک کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق کانگریس عدم تعاون میں ترمیم کرسکتی ہے۔ (یہ پیغام انھیں کسی روحانی ترکیب سے یا ممکن ہے کہ اشراق کے ذریعہ ملا ہو) تبدیلی کے مخالف (نوچینجروں) کاؤنسل کے داخلے کے سوال پر غیر جانبدار ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوراجیوں نے کانگریس سے الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت حاصل کرلی۔ سوراجیوں کو الکشن لڑنے کے لیے مشکل سے دو مہینے باقی رہ گئے تھے لیکن وہ مرکزی لیجسلیٹو کاؤنسل میں نشستوں کا ایک مستقل بلاک حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں بھی معتد بہ تعداد نشستوں کی مل گئی۔ سی پی کی مجلس قانون ساز میں تو انھوں نے اکثریت بھی حاصل کرلی۔ موتی لال نہرو مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی میں سوراج پارٹی کے لیڈر ہوگئے اور داس نے بنگال لیجسلیٹو اسمبلی کی لیڈرشپ قبول کرلی۔

اسی دوران میں گاندھی 11 جنوری 1924 کو اپنڈی سائٹس کے ایک شدید حملے کے بعد پونہ کے سیسون اسپتال میں آپریشن کے لیے داخل ہوگئے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ اگر وہ آپریشن کی میز پر مرگئے تو عوامی غم وغصہ کا زبردست دھما کہ ہوسکتا ہے۔ آپریشن کے چند منٹ پہلے اور اپنے کچھ دوستوں کی موجودگی میں (ان میں سری نواس شاستری شامل تھے) انھوں نے ایک چھوٹا سا بیان املا کرایا اور اس پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ اس بیان میں انھوں نے کرنل میڈک اور اُن دوسرے ڈاکٹروں کے جن کے وہ زیر علاج تھے، خوش اخلاقانہ براؤ کی تعریف کی۔ شاستری نے کچھ دنوں بعد اس کے بارے میں لکھا کہ ایسے موقع پر جب کہ زندگی اور موت کا سوال درپیش تھا، میں تو گاندھی کی اس عالی دماغی، قوت عفو، دوسروں سے غیر معمولی طور پر خوش اخلاقی کا برتاؤ اور انسانی فطرت سے بھی بالاتر محبت دیکھ کر محو حیرت رہ گیا۔ 12 جنوری کو دس بجے صبح کو گاندھی کو آپریشن کی میز پر لٹایا گیا۔ جب بجلی فیل ہوگئی تو سرجن میڈک نے اپنا بجلی کا ٹارچ نکالا لیکن ابھی آدھا ہی آپریشن ہو پایا تھا کہ وہ بھی فیل ہوگیا۔ لیکن آپریشن کامیاب رہا۔ اور دوسرے دن صبح کو کستور بائی کو سابرمتی آشرم میں تار سے یہ اطلاع دی گئی کہ ''شدید اپن ڈی سائی ٹس کی وجہ سے کل

رات کومسٹر گاندھی کا آپریشن ہوا۔ رات اچھی خاصی گزری۔ آج صبح حالت قابل اطمینان ہے۔''

سارے ہندوستان میں گاندھی کی بیماری کی خبر سے گہری تشویش کا عالم رہا۔ مرکزی لیجسلیٹو کا اسمبلی اور بمبئی لیجسلیٹو کاؤنسل میں گاندھی کی فوری رہائی کا مطالبہ کرنے والے رزولیوشن پاس کیے گئے۔ گورنر بمبئی سر لیسلی ولسن غیر مشروط رہائی کے خلاف تھا۔ لیکن وائسرائے نے اس کو محسوس کیا کہ گاندھی سے یہ شرط منوانے کے لیے کہ وہ خلاف کارروائیوں میں حصہ نہ لیں گے، سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وائسرائے اور گورنر دونوں ہی کا یہ خیال تھا کہ سوراجیوں اور تبدیلی مخالفین کے اختلافات مہینوں تک گاندھی کو بُری طرح الجھائے رکھیں گے اور ان کے لیے یہ مشکل ہوجائے گا وہ حکومت کو پریشان کرنے کی بات سوچ سکیں۔ 5رفروری 1924 کو کرنل میڈک گاندھی کے بستر علالت کے قریب آئے اور انھیں یہ اطلاع دی کہ وہ اب آزاد ہیں۔

بیماری کی بنا پر قبل از وقت رہائی سے گاندھی کو خوشی نہیں ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ قیدی کی بیماری اُس کی رہائی کا معقول سبب نہیں ہوسکتی۔ مبارک باد کے جو سیکڑوں تار آئے انھیں دیکھ کر گاندھی نے کہا کہ ''اُن سے اُن امیدوں کا پتہ چلتا ہے جو لوگ مجھ سے رکھتے ہیں اور یہ دیکھ کر میں لڑکھڑا جاتا ہوں بہر کیف اُن کی وہ خواہش تو پوری نہیں ہوسکی کہ ''سوراج پارلیمنٹ'' اُن کی رہائی کا حکم سنائے گی۔

لارڈ ریڈنگ کا یہ خیال کہ رہائی کے بعد گاندھی کی طاقتیں کانگریس کے اندرونی اختلافات کی طرف مرکوز ہوجائیں گی، بہت زیادہ غلط نہیں تھا۔ سوراجیوں نے الکشن لڑا تھا اور انھیں قانون ساز کونسلوں میں اچھی طرح پیر جمانے کو مل گیا تھا۔ سی آر داس اور موتی لال نہرو اُن سے جوہو میں ملنے گئے۔ جوہو بمبئی کے پاس، سمندر کے کنارے ایک آرام گاہ ہے۔ گاندھی وہیں مکمل صحت یابی کے لیے مقیم تھے اُن سے طویل گفتگو ہوئی لیکن وہ گاندھی کو قائل نہ کرسکے۔ دسمبر 1919 میں امرتسر کانگریس میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات پر عمل درآمد کے حق میں گاندھی نے اپنا پورا زور صرف کردیا تھا۔ لیکن اگلے چند مہینوں میں، ہندوستان کے اندر اور باہر جو واقعات رونما ہوئے اُن کی وجہ سے برطانوی حکومت پر سے گاندھی کا اعتماد ہٹ گیا۔ انھیں یہ بھی بھروسا نہ رہا کہ آئینی طریقوں سے قومی آزادی حاصل کرنے کا امکان ہے۔ اس کے علاوہ 1920 میں کانگریس اور

خلافت نے عدم تعاون کا جو پروگرام قبول کیا تھا وہ 1924 میں بھی نافذ تھا اور کاؤنسلوں کا بائی کاٹ اس پروگرام کا ایک اٹوٹ حصہ تھا۔ گاندھی کی دلیل یہ تھی کہ پانچوں، (یعنی کاؤنسل عدالت، اسکول، ملازمت اور بدیسی کپڑے) بائیکاٹ پر اگر پورا پورا عمل درآمد ہو جائے تو ہندوستان بیرونی حکومت سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔'' اندر سے رکاوٹ ڈالنا جس کی سوراجی تبلیغ کر رہے تھے۔ گاندھی کو صاف تضاد معلوم ہو رہا تھا۔ یا تو کوئی شخص حکومت سے تعاون کر سکتا تھا یا عدم تعاون جھوٹے جھنڈے اڑا کر جہاز چلانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ گاندھی نے متنبہ کیا کہ کاؤنسلوں سے مسالہ تو مل سکتا ہے لیکن روٹی نہیں مل سکتی تھی۔ اگرچہ گاندھی اس کے قائل نہیں تھے کہ کاؤنسلوں میں داخلے کا فیصلہ عقل مندانہ ہے۔ لیکن انھوں نے سوراجیوں کی راہ میں حائل نہ ہونے کا فیصلہ کیا اور تبدیلی کے مخالفین کو یہ صلاح دی کہ وہ کونسل کے کاموں کے مسئلے میں غیر جانبدار رہیں۔

نہرو اور داس گاندھی کے پاس اس لیے گئے تھے کہ انھیں قائل کریں اور سوراج پارٹی کے لیے اُن کی پروزن حمایت حاصل کریں۔ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ بہر حال اگلے چند مہینوں کے واقعات نے اس بات کے لیے فضا تیار کر دی کہ سوراج پارٹی سیاسی اسٹیج پر چھا جائے گا۔ گاندھی نے یہ محسوس کیا کہ اُن کی غیر حاضری میں سیاسی آب وہوا بدل چکی ہے۔ عدم تعاون کرنے والے'' حکومت سے کہیں زیادہ آپس ہی میں ایک دوسرے سے عدم تعاون کر رہے تھے۔'' ہندو مسلم اتحاد کی دھجیاں اُڑ چکی تھیں۔ دانش ور طبقے کو تعمیری پروگرام بظاہر پسند نہیں آ رہا تھا۔ چوں کہ اس پروگرام میں کھادی کی حیثیت مرکزی تھی، گاندھی نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی (جون 1924) کے جلسے میں کانگریس کے آئین میں یہ ترمیم پیش کی کہ کانگریس کے ہر رکن کے لیے ایک مقررہ مقدار میں سوت کا تنا لازمی ہوگا۔ سوراجیوں نے اس'' کھادی والے حق رائے دہندگی'' کی مخالفت کی اور میٹنگ سے واک آؤٹ کر کے باہر نکل آئے۔ دوسرے دن، گوپی ناتھ سہا کی ایک تجویز کے دوران گاندھی نے اپنے کانوں سے سنا کہ سی آر داس اُس نوجوان نراجی (انارکسٹ) کے جذبۂ ایثار کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ رائے شماری میں گاندھی کو آٹھ ووٹوں کی مختصر اکثریت حاصل تو ہو گئی لیکن انھوں نے دیکھ لیا کہ حاضرین جلسہ اور اُن کے بزرگ رفقائے کار، سبھی کو عدم تشدد پر صرف سطحی اعتماد تھا۔ انھوں نے اپنے اس فوری جذبے پر تو قابو پا لیا کہ جلسے

سے بھاگ نکلیں لیکن انھیں کانگریس سے علاحدہ ہوجانے، اپنے دائرۂ عمل کو تعمیری پروگرام تک محدود کرلینے اور سیاسی اسٹیج سے بالکل ہی ہٹ جانے کا خیال ضرور آیا۔ انھیں کانگریس کو اپنے ابتدائی عدم تعاون کے پروگرام کے مطابق (جس میں عوامی سول نافرمانی اب شامل نہ تھی) اپنے ساتھ لے چلنے کی رہی سہی امید بھی پاش پاش ہوگئی۔ اس لیے اب انھوں نے مخالف گرہوں کے مابین اتحاد کے ''کم سے کم مشترک پیمانے'' کی تلاش شروع کردی۔

ستمبر 1924 کے ایک خط میں انھوں نے جمنا لال بجاج کو لکھا کہ: ''آپس کی ریشہ دوانیاں اس حد تک بڑھ چکی ہیں کہ ہمیں فی الوقت بڑے پیمانے کی ستیہ گرہ کا خیال ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو ہمارا سارا کیا کرایا بگڑ جائے گا۔ کوئی بات بھی ٹھیک طور سے سمجھی نہیں جارہی ہے۔ ہر چیز کو غلط طور سے پیش کیا جارہا ہے۔ چاروں طرف بے اعتمادی کا ماحول ہے۔ موجودہ حالات میں اب ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہیں اور دوسروں کے افعال کے خاموش تماشائی بنے رہیں۔(1)

وہ کانگریس میں پھوٹ کو روکنے کے لیے بے چین تھے۔ 1907 کی سورت والی پھوٹ سے جو نقصان ہوا تھا، وہ اُس سے واقف تھے۔ انھوں نے سوراجیوں کو ایک ایسی پیش کش کی جو اُن کے اپنے ماننے والوں کو ہتھیار ڈالنے کے مرادف نظر آئی بنگال کے سفر کے بعد، جہاں صوبائی حکومت نے سوراج پارٹی کے اراکین کو تشدد کا الزام لگا کے جیلوں میں بھرنے کی ایک مہم چلا رکھی تھی، گاندھی نے موتی لال نہرو اور سی آر داس کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں انھوں نے یہ سفارش کی کہ بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کے علاوہ، عدم تعاون کا سارا پروگرام معطل کردیا جائے، اور سوراج پارٹی کانگریس کا ایک ناقابل تقسیم حصہ بن جائے لیکن اسے اپنے لیے الگ سے چندہ اکٹھا کرنے کا حق باقی ہے اسی نئی پالیسی میں سوراجیوں کی واقعی جیت ہوئی تھی۔

دسمبر 1924 کی بلگام کانگریس میں گاندھی۔نہرو، داس معاہدے کی تصدیق کردی گئی۔ اجلاس شروع ہونے سے ذرا پہلے، گاندھی نے (جو اجلاس کی صدارت کررہے تھے) دونوں گروہوں کے لیڈروں کے درمیان مفاہمت کی غیر رسمی گفتگو کی تاکہ کانگریس کے اجلاس میں کھلم

(1) کاکا، کالیکر (ایڈیٹر) ایک گاندھی وادی سرمایہ دار کے نام: ص: 57

کھلا مخالفتیں نہ ہوں۔انھوں نے سوراجیوں کی دل جوئی کے لیے ایک اقدام یہ بھی کیا کہ اپنی ورکنگ کمیٹی میں راج گوپال اچاریہ، ولبھ بھائی پٹیل، اور بینکر جیسے ''تبدیلی کے مخالفوں'' کو شامل نہیں کیا۔اب وہ سوراجیوں کو صرف برداشت بھی نہیں کررہے تھے بلکہ اُن کو تقویت بھی پہنچا رہے تھے۔بعض مبصرین کو جن میں اُن کے وفادار ''تبدیلی کے مخالفین شامل تھے، ان اقدامات سے ایسا لگا کہ وہ سوراجیوں کے آگے بہت زیادہ جھک گئے ہیں۔وائسرائے نے ولایت کو اطلاع دی کہ ''گاندھی اب داس اور نہرو کے دم چھلے بن گئے ہیں، اگر چہ یہ لوگ اب بھی گاندھی اور اُن کے رفقاء کو یہ باور کرانے کی حد سے زیادہ کوشش کررہے ہیں کہ وہ اگر واحد سردار نہیں تو سرداروں میں سے ایک ہیں۔''[1]

جون 1925 میں سی، آر، داس کا انتقال ہوگیا۔تقریباً اسی زمانے میں لارڈ برکن ہیڈ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا، نے ایک تقریر کی جس میں حسب دستور سابق کانگریس کو دھمکی بھی دی گئی تھی۔گاندھی نے لکھا کہ یہ تقریر ہندوستانیوں کے لیے ایک نوٹس ہے کہ وہ اپنے گھر کا کاروبار درست کرلیں۔انھوں نے سوراجیوں کو اور زیادہ مراعات دے کر کانگریس کے اتحاد کی جانب ایک قدم اور بڑھایا۔وہ کتائی سے حق رائے۔دہندگی کی شرط کو ہٹا دینے پر راضی ہوگئے۔

رہائی کے ایک سال کے اندر ہی گاندھی اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ عوامی پیمانے پر غیر متشددانہ عدم تعاون کی تحریک چلانے کی تیاری کے طور پر تعمیری پروگرام چلانا ناقابل عمل ہے انھوں نے یہ محسوس کیا کہ 1931 میں جو بھیڑ اُن کے جھنڈے تلے اکٹھا ہوگئی تھی اس کی اکثریت اس دل لبھانے والی امید پر جمع ہوئی تھی کہ سوراج سال بھر میں مل جائے گا اور انھوں نے 1924-25 میں جو پروگرام پیش کیا تھا اور جو ہندو مسلم اتحاد، بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ اور چھوت چھات کے خاتمے پر مشتمل تھا اس میں ایک جنگ جویانہ پروگرام کی آتش بازیاں کہاں تھیں؟انھوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ تحریک کے سیاسی، پہلو میں کچھ تبدیلی لائی جائے۔''آخر جو لوگ پرانے فیشن کی پرعمل سیاسی زندگی بسر کرتے کرتے چلے آئے ہیں اُن سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ نچلے بیٹھے رہیں گے، دراں جائے کہ میری طرح کے خواب دیکھنے والے چرخے جیسے

(1) ریڈنگ، مارکوئی آف: روفس آئزک: پہلا مارکوئی آف ریڈنگ: ج:2: ص:304

بےضرر کھلونے کی بنیاد پر ایک بےحد فعال پروگرام تیار کرنے کی آس لگائیں گے۔''[1]

بہرحال، یہ دریافت انھوں نے 1925 میں نہیں کی تھی۔ 1921 میں ولبھ بھائی پٹیل کے نام ایک خط میں گاندھی نے پٹیل کے بڑے بھائی وی جے پٹیل (جو 1925 میں سوراج پارٹی کی صف اوّل میں تھے) کی سیاسی ساخت کا مختصر الفاظ میں یہ دوراندیشانہ اندازہ لگایا تھا: ''اُن کا دائرہ کار بنیادی طور پر کاؤنسلیں ہیں۔ وہ عوام کے درمیان رہ کر اطمینان سے کام نہیں کر سکتے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ملک کی خدمت کرنا نہیں چاہتے بلکہ انھوں نے قانون ساز مجالس میں کام کرنے کے لیے اپنے ذہن کی تربیت کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اِن دو دائرہ ہائے کار میں کام کرنے کے لیے دو مختلف قسم کی صلاحیتیں درکار ہیں۔''[2]

---

(1) تیندولکر: مہاتما، ج:2، ص:266

(2) پٹیل، منی بین (ایڈیٹر) سردار پٹیل کے نام خطوط، احمد آباد 1952، ص:4

باب29

فرقہ وارانہ فسادات

قید سے رہا ہونے کے بعد، اگر ایک طرف گاندھی کو یہ مایوسی ہوئی کہ کاؤنسلوں کے داخلے کے سوال پر کانگریس کی صفوں میں پھوٹ پڑ گئی ہے تو دوسری طرف ایک اور بلکہ اس سے بھی بڑی مایوسی ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات سے ہوئی۔

تحریک عدم تعاون کے دورِ عروج کے ہندو مسلم اتحاد کی اب صرف یاد باقی رہ گئی تھی۔ اعتماد کی جگہ بے اعتمادی نے لے لی تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ، جو وقتاً فوقتاً کئی کئی شہروں کی شکلیں بگاڑ رہے تھے، اب سیاست میں اور اخبارات میں بڑی تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ کئی ہندو لیڈر، جیسے لاجپت رائے، مدن موہن مالویہ، اور شردھانند یہ محسوس کر رہے تھے کہ عدم تعاون اور خلافت تحریکوں کے گٹھ جوڑ سے مسلم عوام میں ایک خطرناک بیداری پیدا ہو گئی ہے، اور اب ہندوؤں کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ مسلم فرقہ پرستی کے مقابلے میں خود اختیاری طور پر کچھ اقدامات کریں۔ اُن کی نظر میں مسلم فرقہ پرستی زیادہ خطرناک تھی کیوں کہ اِسے حکومت برطانیہ کی پشت پناہی حاصل تھی۔ بہت سے مسلم سیاست داں جو تحریک خلافت میں پیش پیش تھے وہ بھی اب اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنے لگے تھے اور انھیں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ بہت جلد بازی میں کانگریس سے مل کر ایک ایسے نئے نظام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں جس میں مسلم فرقے کی

پوزیشن کے بہت زیادہ محفوظ ہونے کا امکان نہیں تھا۔

باہمی شک وشبہ اور خوف کی فضا میں، ہر واقعے کو توڑ امروڑا جا رہا تھا اور ایک فرقے کا ہر اقدام دوسرے فرقے کی نگاہوں میں مشکوک ہو رہا تھا۔ 1921 کے موپلا فسادات کی یاد جس میں ملابار کے مسلمانوں نے اپنے ہندو پڑوسیوں کو اپنے کٹر پن کا نشانہ بنایا تھا، ہندوؤں کو تکلیف پہنچا رہی تھی۔ غیر مسلموں کو ہندو دھرم میں شامل کرنے کے لیے شدھی تحریک اور ہندوؤں میں اتحاد لانے کے سنگھٹن تحریک کا جواب مسلمانوں کی طرف سے تبلیغ اور ''تنظیم'' کی تحریکوں کی شکل میں دیا گیا۔

ہندومت میں تبدیلی مذہب کا جو نیا موڑ آیا تھا اس سے مسلم دانش ور طبقہ آزردہ خاطر ہوا لیکن یہ بات کتنی متناقض تھی کہ انھیں غیر مسلموں کے مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کرنے میں کوئی غلط بات نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن جس ماحول پر دھندلی یادوں اور مبہم شکوک کے بادل چھائے ہوں، اُس میں منطق کی گنجائش ہی کہاں ہے، وہی مسلمان جنھوں نے 22-1920 کے سازگار ماحول میں، اپنے ہندو پڑسیوں کا لحاظ کر کے رضا کارانہ طور پر گاؤ کشی ترک کر دی تھی، اب اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ وہ علی الاعلان یہ مذہبی فریضہ ادا کریں گے۔ اس کے مقابلے میں ہندو اتنے ہی اشتعال انگیز طریقے پر مسجدوں کے سامنے باجہ بجا کر مذہبی جلوس نکالنے پر اصرار کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ، ایک یا دوسرے فرقے کے حق میں سرکاری سرپرستی کے سلسلے میں کی جانے والی طرفداریوں کے سلسلے میں جھگڑوں کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا۔ پنجاب میں ہندو اور سکھ لیڈر ایک مسلمان وزیر فضل حسین پر جو بعد میں وائسرائے کی اکزیکیٹو کاؤنسل کے ممبر ہو گئے، یہ الزام لگا رہے تھے کہ اقلیتوں کو صوبائی انتظامیہ میں جو امتیازی حیثیت حاصل ہے اُس سے ہٹانے کی ایک گہری سازش کر رہے ہیں لیکن بہت سے دوسرے مسلم سیاست دانوں کی طرح، فضل حسین کا یہ خیال تھا کہ اپنے ہم قوموں کو ہندوؤں کے برابر لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے ساتھ خصوصی سلوک کر کے ان کی نمائندگی بڑھا دی جائے۔

ایسے لوگ تعداد میں تھوڑے نہیں تھے جو اس نئے تناؤ کا سبب تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت سے اس کے ساز باز کو سمجھتے تھے اور وہ گاندھی پر یہ الزام لگاتے تھے کہ انھوں نے عوام کو

چٹکیوں میں اڑ نا چاہا اور انھیں مستقل طور پر برانگیختہ کر دیا ہے۔ گاندھی نے لکھا کہ ''عوام کی بیداری تربیت کا ضروری جز و تھا، میں ایسا کام کبھی نہ کروں گا کہ وہ پھر سو جائیں'' بہر کیف وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ اس بیداری کے دھارے کا رُخ تعمیری نہروں کی طرف موڑ دیا جائے دونوں فرقے جس ذہنی دلدل میں پھسل کر پہنچ گئے ہیں انھیں وہاں سے افہام وتفہیم کے ذریعہ باہر نکالنا ہے اپنے ہفتہ وار جرائد کے صفحات پر انھوں نے فرقہ وارانہ تباہ کاری کی اپنی طرف سے تشخیص کی۔ اس موضوع کے لیے انھوں نے ''ینگ انڈیا'' ایک پورا شمارہ مخصوص کر دیا۔ انھوں نے یہ دلیل دی کہ اگر ملک نے ان کے طریق کار کو سمجھ لیا ہوتا تو ہندو مسلم تناؤ نے وہ شکل کبھی اختیار نہ کی ہوتی جو ہوگئی۔ عدم تشدد کا نظریہ سیاسی آزادی ہی کے لیے کلیدی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ فرقوں کے درمیان امن کی کنجی بھی یہی ہے۔ ایک مہذب معاشرہ جو انفرادی جھگڑے چکانے کے لیے تشدد کو خیر باد کہہ چکا ہو وہ گروہوں کے باہمی اختلافات کو دور کرنے کے لیے بھی تشدد سے پرہیز کر سکتا ہے۔ باہمی رواداری اور مصالحت نجی ثالثی اور آخری صورت میں عدالتی اپیل سے آپسی اختلاف رائے دور کیا جا سکتا ہے، سروں کو پھوڑ کر دلوں کو جوڑا نہیں جا سکتا۔ گاندھی کی نظر میں دونوں فرقوں کے درمیان اختلاف کے جو نقطے تھے وہ سچے مذہب کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتے تھے۔ کیا یہ مذہب ہے کہ ہندو پجاریوں کا ایک گروہ شور وشغب کرتا ہوا مسجد کے سامنے سے ٹھیک اس وقت جلوس بنا کر نکلے جب کہ مسلمان لوگ دعا میں سربسجود ہوں؟ کیا یہ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ اپنے ہندو پڑوسیوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے لیے گایوں کے مذبح کی طرف ہنکا کر لے جائیں؟ اور ایسی جبری تبدیلی مذہب کا فائدہ ہی کیا ہے کہ نئے مذہب کا قبول کرنا اخلاقی یا روحانی ارتقاع کے لیے نہ ہو بلکہ ''ایک ڈبہ چھوڑ کے دوسرے ڈبے میں جانے کے لیے ہو'' ہونٹوں پر کچھ اور ہو اور دل میں کچھ اور؟ جہاں تک ملازمتوں کے مقابلے کا سوال ہے، ملازمتوں کی تعداد بہر حال محدود ہوتی ہے۔ گاندھی اس کے لیے تیار تھے کہ جو فرقے یا قومیں نسبتاً اتنی پچھڑی ہوئی ہوں کہ اعلیٰ ملازمتوں کے لیے کامیاب ہونا ان کے لیے مشکل ہو، ان کو خصوصی تعلیمی سہولتیں دی جائیں لیکن صلاحیت کی بجائے مذہب کو ملازمت کا معیار بنانا انتظامیے کی جڑ کاٹنے کے مرادف ہوگا۔

گاندھی کو امید تھی کہ اگر اختلافات کے اسباب تلاش کیے جائیں اور فرقوں کی عقل سلیم

سے اپیل کی جائے تو معقولیت پسندی عود کر آئے گی۔ لیکن فرقہ وارانہ کھنچاؤ میں کسی طرح کی کمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سانبھر، امیٹھی اور گلبرگہ میں فسادات ہو گئے۔ ستمبر 1924 میں کوہاٹ میں ہونے والا فساد خاص طور سے سنگین تھا۔ 100 ہندو مارے گئے اور تقریباً سب ہندو شہر سے نکل گئے۔ اس قتل عام کا ان پر بہت اثر ہوا، خاص کر اس لیے کہ تحریک عدم تعاون کے ذریعے وہ جو بیداری لائے تھے وہ تخریبی راہوں پر جا پڑی تھی۔

''کیا میں عوام کی بے پناہ طاقت کو بروئے کار لانے میں آلۂ کار نہیں رہا ہوں؟ اگر یہ طاقت اپنی ہی بربادی کا سبب بن رہی ہے تو مجھے اس کا علاج بھی نکالنا پڑے گا...... کیا میں نے غلطی کی ہے؟ کیا میں بے صبر رہا ہوں؟ کیا میں نے شر سے مصالحت کر لی ہے؟ ممکن ہے کہ میں نے یہ سب کیا ہو یا ان میں سے کچھ بھی نہ کیا ہو...... اب تو میں وہی جانتا ہوں جو اپنی آنکھوں کے آگے دیکھ رہا ہوں۔ اگر عوام سچی اہنسا اور سچائی پر عمل کر رہے ہوتے تو یہ خون کی ہولی جو آج کھیلی جا رہی ہے، کبھی کھیلی نہ جا سکتی۔''

اس ذاتی کرب کے عالم میں گاندھی نے اکیس دن کے برت سے ایک راہ نکالی اس برت کا مقصد جو مولانا محمد علی جوہر کے گھر میں دلّی میں رکھا گیا تھا صفائے نفس تھا تم جس قدر اپنے جسم کو زیر کرو گے، اُسی تناسب سے روحانی طاقت بڑھے گی، اس کا یہ بھی مقصد تھا کہ عوام میں ردِّ عمل پیدا کرنے کی صلاحیت پھر سے ابھاری جائے۔ ''جو ہندو اور مسلمان مجھ سے پیار کا دم بھرتے ہیں اُن کے لیے یہ ایک چیتاونی اور انتباہ ہے۔ اگر انھوں نے مجھ سے سچ مچ پیار کیا ہے اور اگر میں اُن کے پیار کا مستحق رہا تو وہ بھی میرے ساتھ مل کر کفارہ کے طور پر یہ عقوبت نفس برداشت کریں گے............ ایک دوسرے کے مذہب کو بُرا بھلا کہنا بے سوچے سمجھے بیانات دینا، جھوٹ بولنا، بےقصور انسانوں کے سر پھوڑنا، مسجدوں اور مندروں کی بے حرمتی کرنا، خدا کا انکار کرنا ہے۔ دنیا دیکھ رہی ہے، کچھ لوگ خوش ہو کر اور کچھ افسوس کے ساتھ یہ تماشا دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے درمیان کیا چپقلش مچی ہوئی ہے۔[1]

ملک میں اس برت کا فوری ردعمل ہوا۔ دلی میں ایک اتحاد (یونٹی) کانفرنس بلائی گئی اور

(1) تیندولکر: مہاتما، ج:2، ص:198

برت شروع ہونے کے ایک ہفتے کے اندر اندر اس کا اجلاس ہوا۔ تین سو مندوبین میں میٹر پولیٹن آف انڈیا، ڈاکٹر اسٹکاٹ، اینی بیسنٹ، علی برادران، سوامی شردھانند اور مدن موہن مالویہ شامل تھے۔ کانفرنس نے مذہب اور ضمیر کی آزادی پر اپنا اعتقاد ظاہر کیا، لیکن جبر اور تشدد کی مذمت کی۔ اس میں بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے اور باہمی شکوک کو رفع کرنے کے لیے کئی رزولیشن پاس کیے گئے۔ 28 اکتوبر 1924 کی صبح کو اکیس دن کا برت پورا کر کے گاندھی نے تمام فرقوں کے لیڈروں کی موجودگی میں فاقہ شکنی کی۔ قرآن مجید کی آیتوں کی تلاوت کے ملن میں، اُپنشد کے اشلوک اور عیسائی دعاؤں کی دھنیں گھل مل رہی تھیں، اس وقت کے بارے میں سی، آف، اینڈ روز نے لکھا ''دل کھنچ کر ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔''

لیکن یہ فضائے اتحاد و اتفاق زیادہ دنوں تک باقی رہنے والی نہ تھی۔ کچھ ہی مہینوں کے اندر گاندھی کو اعتراف کرنا پڑا کہ تلخ تجربوں نے انھیں یہ بتایا کہ جو لوگ اتحاد کا نام لیتے ہیں تو ان کا مطلب ہوتا ہے افتراق۔ دونوں فرقوں کے لیڈر روٹی مچھلی کے لیے نہیں لڑ رہے تھے'' بلکہ کہاوتی کتے کی طرح ہڈی کے لیے بھی نہیں، اس کی پرچھائیں کے لیے لڑ رہے تھے۔ جنوری 1927 میں انھوں نے بنگال میں کلکتے کے ایک جلسے میں کہا کہ ہندو مسلم مسئلہ انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر خدا کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔

مذہبی رواداری کے لیے انھوں نے جو اپیل کی تھی اور جس میں ان کے اکیس دن کے برت نے ڈرامائی رنگ بھر دیا تھا، وہ سنی ان سنی کر دی گئی۔ اُن کی عقوبت نفس کا متخاصم گروہوں پر ایک سریع الزوال اثر پڑا اور بس۔ ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے۔ فضل حسین نے سایمن کمیشن کو بتایا کہ 1922 اور 1927 کے مابین 4750 فسادات پنجاب میں ہوئے ان میں صرف چودہ فرقہ وارانہ تھے اور یہ بھی آٹھ شہروں میں محدود تھے۔[1] اگرچہ یہ چند بڑے شہروں ہی تک محدود رہے تھے لیکن انھوں نے ساری سیاسی فضا خراب کر دی اور قوم پرست طاقتوں کو اس سے بڑا دھکا پہنچا۔ یہ شبہ بھی کیا جاتا تھا کہ مقامی افسران ٹھیک وقت پر زور مناسب قوت کا استعمال نہیں کرتے تھے کہ جن سے شر انگیزی کو بروقت دبایا جا سکے۔

(1) حسین عظیم، فضل حسین، ص: 178

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سیاسی عوامل کی بنا پر فرقہ وارانہ تناؤ بڑھ گیا تھا۔ 22-1920 کے کانگریس۔ خلافت اتحاد نے فرقہ پرور لیڈروں کو پس پشت ڈال دیا تھا جب کہ ہم پہلے دیکھ آئے ہیں، اس دور میں حکومت کو سب سے بڑی پریشانی اس بات سے تھی کہ ہندو اور مسلم لیڈروں میں اتفاق رائے ہو گیا ہے۔[1]

دونوں فرقوں کے درمیان جس پھوٹ کا حکومت مدت سے بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہی تھی وہ 1922 میں عوامی سول نافرمانی کے معطل کیے جانے کے بعد رونما ہوئی جارحانہ پروگرام سے دستبرداری کی وجہ سے کانگریس والوں کو بڑا صدمہ پہنچا لیکن اس سے زیادہ صدمہ خلافت تحریک والوں کو پہنچا۔ کانگریس والے تو سوراج کے لیے مہینوں بلکہ برسوں تک انتظار کر سکتے تھے۔ خلافت کے معاملے میں دیر کی گنجائش نہیں تھی۔ آخر کار خلافت کا خاتمہ خود ترکوں کے ہاتھوں ہو گیا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے سلطان خلیفہ کو تخت سے اتار کر ملک بدر کر دیا اور ترکی کے ''جمہوریہ'' ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب خلافت تحریک کا سبب اصلی ہی باقی نہ رہا اور تحریک ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔ اس کے کارکن اور ہمدرد، مختل اور بے پروگرام کے، منتشر اور شکستہ لنگر ہو گئے سبھاش چندر بوس نے اپنی کتاب ''انڈین اسٹرگل'' میں لگتی ہوئی تنقید کی ہے کہ اگر خلافت کی تنظیم الگ رہ کر کام نہ کرتی ہوتی تو اس کے اراکین مسلم فرقہ پرست جماعتوں کی طرف بہک کر نہ جا پاتے لیکن یہ بھی سوال اٹھتا ہے کہ اگر خلافت تنظیم نہ ہوتی تو کیا 22-1920 میں اتنے مسلمان قومی تحریک میں شامل ہو پاتے اور پھر اس انجام کی خبر نہ تو گاندھی کو تھی اور نہ خود خلافت تحریک کے قائدین کو۔

گاندھی کی گرفتاری کے بعد ملک میں جو خلا پیدا ہو گیا اور کانگریس لیڈروں میں جو اختلافات رونما ہوئے اُس سے ان طاقتوں کو ابھرنے کا موقع مل گیا جو 21-1920 میں عوامی دباؤ میں آ کر دب گئی تھیں۔ قانون ساز اسمبلیوں میں متقابل فرقہ وارانہ دعوے داروں کی ایسی پالیاں بن گئیں جہاں سیاسی مرغ لڑا کرتے تھے۔ برطانیہ کے لیے یہ جھگڑے ناخوشگوار نہیں تھے۔ لارڈ بارکن ہیڈ نے، لارڈ ریڈنگ کو لکھا کہ ''جیسے جیسے یہ واضح ہوتا جائے گا کہ یہ اختلاف گہرے ہیں اور ان کا اثر

(1) چھبیسواں باب

آبادی کے بہت وسیع اور نا قابل فہم حلقوں پر پڑ رہا ہے۔ ویسے ہی ویسے یہ بات صاف ثابت ہوتی جائے گی کہ ہم اور صرف ہم ان اختلافات کو دور کرنے کا رول ادا کر سکتے ہیں۔[1]

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں فرقہ وارانہ سوال، دونوں فرقوں کے پیشہ ور طبقوں میں سیاسی طاقت سے حاصل ہونے والے فوائد کی تقسیم کے لیے جد و جہد کا سوال بن چکا تھا۔ حکومت سیاسی ہندوستان کو جو چند ٹکڑے دے رہی تھی۔ اُسی کے لیے یہ دوڑ دھوپ تھی گاندھی نے بلگام کانگریس کے خطبہ صدارت میں (1924) یہ مشورہ دیا تھا کہ اکثریتوں کو ایثار کی مثال قائم کرنا چاہیے۔ ''انھوں نے بعد میں سادہ چک'' کی جو پیش کش کی، مسلمانوں نے اس کا مذاق اڑایا اور ہندوؤں کو بری لگی۔ لیکن قانون ساز اسمبلیوں میں نشستوں اور سرکاری ملازمتوں کے لیے جو چھینا جھپٹی مچی ہوئی تھی، اس پر گاندھی کے انداز نظر کا یہ پیش کش لب لباب تھی۔ ہندوؤں نے تو مہاتما پر یہ الزام لگایا کہ وہ ہندوؤں کے مفاد کو اس لین دین میں نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یکے بعد دیگرے کئی اتحادی کانفرنسوں اور آل پارٹیز کانفرنسوں میں جو گفت وشنید لگاتار چلتی رہی اس میں ہندو مسلمانوں سے اس طرح معاملت کر رہے تھے جیسے برطانوی حکومت نیشنلسٹ ہندوستان سے کرتی چلی آ رہی تھی۔ انھوں نے رعایتیں دیں لیکن زیادہ تر ایسا ہوا کہ یہ رعایتیں بہت تھوڑی تھیں اور بہت دیر سے دی گئی تھیں۔

اگرچہ ''ینگ انڈیا'' کے صفحات پر 1925 کے بعد سے گاندھی ہندو مسلم سوال پر وقتاً فوقتاً لکھتے ہی رہتے تھے لیکن وہ اس کے حل سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے انھوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ شہری دانش ور طبقہ دو متخاصم گروہوں میں بٹ چکا ہے۔ اِن پر اُن کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ ''ان کا طریق کار میرا طریق کار نہیں ہے۔ میں بالکل نچلی سطح سے اوپر کی طرف آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

---

(1) برکنی ہیڈ دی لاسٹ فیز (The Last Phan) جلد:2،ص:56-255

باب 30

نچلی سطح سے بالائی سطح کی جانب

اس کے بعد تین برس تک گاندھی سیاسی منظر سے کنارہ کش رہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ سیاسی مناقشات سے کنارہ کش ہو گئے تھے تا کہ وہ اپنا وقت نچلی سطح سے بالائی سطح کی جانب جاتے ہوئے قومی تعمیر کے کم دلچسپ مگر زیادہ اہم کام میں لگا سکیں۔

انھوں نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک دورے کیے اور بیل گاڑی سے لے کر ریلوے ٹرینوں تک حمل ونقل کے سبھی ذرائع استعمال کیے۔ وہ جھاڑیوں، جنگلی پودوں گیلی مٹی اور پانی کے درمیان سے ہو کر گزرے اور ہندوستان کے دیہاتی حصوں میں دور، دور تک گھستے چلے گئے۔ ہر جگہ ان کا اسی شان سے استقبال ہوا جو ہندوستان میں سادھوؤں اور سنتوں کے لیے مخصوص ہے۔ ان ہزاروں لوگوں کی نظر میں، جو اُن کے دیہاتی جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور جن میں اکثر کو عصری تہذیب بلکہ ہندوستانی سیاست کے بارے میں گویا کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ گاندھی کی حیثیت ایک اوتار یعنی ایشور کے دنیاوی روپ کی تھی۔ خود انھیں دیوتا بنائے جانے سے نفرت تھی اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ اس عقیدت کو زیادہ اثباتی اور تعمیری شکل دے دیں۔ وہ لوگوں کو یہ ترغیب دیتے تھے کہ وہ صدیوں پرانی برائیاں جیسے بچپن کی شادی اور چھوت چھات کو تج دیں اور چرخا چلائیں۔ 1925 میں ان کے بے حد خیر خواہ بنگالی دوستوں نے یہ محسوس کیا کہ ان

دوروں سے گاندھی کو بہت تکان ہورہی ہے۔ اس لیے انھوں نے ایک فرسٹ کلاس سیلون کا انتظام کردیا۔اس پر گاندھی نے یہ رائے ظاہر کی کہ ''اگر مجھے اس طرح روئی میں لپیٹ کر رکھا گیا تو میرے دوروں کا زیادہ فائدہ نہ ہو سکے گا۔ یا تو مجھے اپنے لاکھوں غریب بھائیوں کی طرح رہنا اور سفر کرنا ہوگا یا مفاد عامہ کی خاطر سفر کرنا ہی ترک کرنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وائسرائے شملہ کی نارسا پہاڑیوں سے ہندوستان کے کروڑوں افراد کے دلوں میں جتنی کچھ حکومت کر سکتے ہیں۔'' میں دہرے بلکہ تہرے فرسٹ کلاس میں سفر کر کے اپنے پیغام کو کروڑوں انسانوں تک اتنا نہیں پہنچا سکتا ہوں جب صحت کی بنا پر انھیں سکنڈ کلاس میں سفر کرنا پڑا تو انھیں بالکل اچھا نہیں لگا۔اُن کا ضمیر تبھی جا کر مطمئن ہوا جب وہ دوبارہ تیسرے درجے میں سفر کرنے کے قابل ہو گئے۔

جب انھیں تیسرے درجے کا ایک پورا کمپارٹمنٹ سفر کے لیے ملا (اور ایسا اکثر ہوتا تھا) تو انھوں نے اِسے ایک طرح کا جعل بتایا۔ بہرحال، یہ سفر خود ان کے لیے ریلوے حکام کے لیے اور دورے کا انتظام کرنے والوں کے لیے ایک مسئلہ بن گئے۔بعض اوقات لوگوں کا جوش وخروش بے قابو ہو جایا کرتا تھا مثلاً مدراس پریسڈنسی میں گڑیا تھان میں جس مقام پر وہ ٹھہرے ہوئے تھے اس پر لوگوں نے دھاوا بول دیا۔ ہوا اور روشنی کا راستہ روک لیا اور ان کے لیے کام یا آرام ناممکن کر دیا۔ آخر کار انھیں ایک کار میں پناہ لینا پڑی اور یہ کار گاؤں سے کچھ دور اس لیے لے جا کر کھڑی کر دی گئی تا کہ انھیں اُن کے پرستاروں کے ناخوش گوار التفات سے بچایا جا سکے۔

بیسویں صدی کی دوسرے دہائی کے آخر میں برطانوی مبصرین کی یہ عام روش ہو گئی تھی کہ وہ گاندھی کو ''از کار رفتہ طاقت'' کہہ کر یاد کرتے اور ہندوستانی سیاست دان سابرمتی کے سنت کو سیاست سے سبکدوش ہونے کا مشورہ دیتے۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ گاندھی کو اس وقت کی سیاست، مرکزی اور صوبائی قانون ساز مجالس میں کی جانے والی تقریروں اور پریس میں فرقہ وارانہ بحث وجدال سے کوئی دل چسپی نہیں رہ گئی تھی۔ ان کے خیال میں سیاسی آزادی کا انحصار ملک کے سماجی اور اقتصادی احیا پر تھا اور یہ احیا اہل وطن کی کوششوں ہی سے وجود میں آ سکتا تھا۔ انھوں نے لکھا بھی تھا کہ ''سیاسی آزادی کا مفہوم یہ ہے عوامی بیداری کی سطح بڑھے۔ یہ قومی فعالیت کے ہر شعبے کو متاثر کیے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔''

اس زمانے کی اُن کی تحریروں اور تقریروں میں دو موضوعات بار بار آتے تھے۔ چرخا اور چھوت چھات کا خاتمہ۔ چرخا (بلکہ زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ اس کی پیداوار کھادی) عدم تعاون کے پروگرام کا حصہ بھی تھا۔لیکن اس سیاسی جمود کے زمانے میں گاندھی نے اسے مسلک بنالیا تھا۔ وہ ''رشتۂ قسمت'' کی باتیں کرنے لگے انھوں نے کانگریس ادارے کے لیے ''کھادی حق رائے دہندگی'' کی تجویز رکھی اور ''سوت کرنسی'' کا منصوبہ بنایا۔مغربی تعلیم یافتہ ہندوستانی حد یہ ہے کہ جو شیلے کانگریسی بھی متحیر تھے کہ کھادی کے مسلک کو حد سے زیادہ اہمیت کیوں دی جارہی ہے جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، اس کے نزدیک سول نافرمانی کا خطرہ ختم ہوجانے کے بعد کھادی پر اتنا زور دیا جانا ٹوپی میں شہد کی مکھی سے زیادہ پریشان کن نہ تھا۔ 1930 میں کھادی سیاسی اندولن کا ایک عملی حصہ بن گئی اس کے بعد حکومت نے کھادی کی اہمیت کو محسوس کیا اس وقت بھی اس کو سیاسی تحریک کے ایک ہتھیار ہی کی نوعیت سے دیکھا اور سمجھا۔

یہ بات تعجب کی نہیں ہے کہ گاندھی کا چرخے سے ایسا جذباتی لگاؤ دیکھ کر اہل برطانیہ بھی چکر میں تھے مغربی تعلیم اور شہری پرورش پائے ہوئے ہندوستانی بھی یہ دونوں، ہندوستانی دیہاتی کی ناقابل یقین غربت کو پوری طرح سمجھ نہیں پارہے تھے۔ایک تو اس لیے کہ ان میں جاننے کا جذبہ ہی نہیں تھا اور دوسرا اس لیے کہ اُسے علم نہیں تھا چوں کہ گاندھی دل سے مذہبی انسان تھے، اس لیے انھوں نے لکھا کہ ''فاقہ کش مردوں اور عورتوں کے نزدیک ایشور اور آزادی، بس چند حروف ہیں جنھیں باہم جوڑ دیا گیا ہے مگر جن سے ذرا بھی معنی نہیں نکلتے۔ان بدقسمت لوگوں کا نجات دہندہ تو وہ ہوگا جو ان کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا لا سکے۔'' بے زمین کھیتی ہر مزدور تو غریبی میں لت پت تھے ہی، لیکن لاکھوں کسان ایسے تھے جو سال میں تقریباً چھ مہینے مجبوراً کم روزگاری کے عالم میں بسر کرتے تھے۔گاندھی کا استدلال یہ تھا کہ ان کی آمدنی کی قابل رحم کمی کو گھریلو صنعتوں کا سہارا دے کر مفید طور پر بڑھایا جاسکتا ہے اور ہاتھ کی کتائی سے زیادہ سہل اور فطری صنعت کوئی اور ہو نہیں سکتی جس طرح لوگ اپنے گھروں میں کھانا پکاتے ہیں اسی طرح کتائی اور کپڑے کی بنائی کرسکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ چرخے سے کسان کی بے حد معمولی آمدنی میں بہت ہی مختصر اضافہ ہوسکتا ہے لیکن گاندھی نے اگست 1925 میں کلکتہ روٹری کلب کے ایک جلسے میں وضاحت کی کہ ہندوستان کی

آزادی کا وہ دسواں حصہ جو صرف ایک وقت کھانا کھا کر زندہ رہتا تھا اور جو اوسطاً تین روپے مہینے سے زیادہ نہیں کما پاتا تھا، وہ تو چرخے سے حاصل ہونے والی پانچ چھ روپے مہینے کی آمدنی کو بھی بڑی دولت سمجھے گا۔ جب ٹیگور نے یہ خوف ظاہر کیا کہ چرخے پر اتنا اصرار کرنے سے ''ملک میں موت کی سی یکسانیت'' آجائے گی، تو گاندھی نے جواب دیا:

''میں یہ نہیں چاہتا کہ شاعر اپنی موسیقی، کسان اپنا ہل، وکیل اپنے مقدمے اور ڈاکٹر اپنا نشتر چھوڑ دے۔ انھیں قربانی کے طور پر دن میں صرف تیس منٹ چرخا چلانا چاہیے۔ میں نے تو صرف ان بھوکوں مرنے والے مردوں اور عورتوں سے، جو کوئی کام نہ پانے کی وجہ سے بیکار بیٹھے ہیں، یہ کہا ہے کہ وہ کتائی کر کے روزی کمائیں اور نیم گرسنہ کسانوں سے یہ کہا ہے کہ وہ اپنے فاضل وقت میں کتائی کر کے اپنے ذرائع آمدنی میں اضافہ کریں۔''

ان محنتوں میں کسان، مزدور اور دیہاتی بیوہ کے لیے چرخے کی ایک اقتصادی اہمیت تھی لیکن شہریوں کے لیے اس کی اپیل اخلاقی یا (جیسا کہ گاندھی کہہ سکتے تھے) روحانی ہوتی ہندوستان کے شہر دیہاتوں کا استحصال کر کے ہی ترقی کر رہے تھے۔ لیکن اب اس کا موقع تھا کہ وہ دیہاتی گھروں کے ہاتھ کے بنے اور کتے ہوئے کپڑے خرید کر اپنے پیچھے گناہوں کا کفارہ ادا کریں اور اسی طرح دیہاتوں اور شہروں کے مابین ایک اقتصادی اور جذباتی رشتہ قائم کریں۔

گاندھی کی قائم کی ہوئی (کل ہند بنکر ایسوسی ایشن) آل انڈیا اسپنرس ایسوسی ایشن نے کھادی کی پیداوار کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ 1926 کے خاتمے تک 952، 42 کتائی کرنے والے 3،407 کپڑا بننے والے 110 دھنیے جو 1500 گاؤں کے 150 پیداواری مرکزوں پر کام کر رہے تھے، اس ایسوسی ایشن کے رجسٹروں میں نام درج کرا چکے تھے۔ اور ان کام کرنے والوں میں نو لاکھ روپے تقسیم کیے جا چکے تھے۔ اگر چہ ابھی دیہی ہندوستان کے حاشیے کا کنارہ بھی چھوا نہیں جا سکتا تھا لیکن یہ کارکردگی قابل ستائش تھی۔

ہندوستانی اقتصادیات میں گاندھی وادی اسکیم میں چرخا دیہی ترقی کے لیے مرکزی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اسی محور پر ملیریا دشمن مہم، صفائی کی بہتری، گاؤں کے جھگڑوں کا فیصلہ، مویشیوں کی بقا اور نسل کشی اور گاؤں کی حیاتِ نو کے لیے اور بھی سیکڑوں مفید کارروائیاں گردش کرنے والی

تھیں۔ چرخے کی اقتصادیات ان محنتوں میں، نئے گاؤں کی معیشت کی اقتصادیات بن گئی تھی۔ شروع شروع میں اس کی تبلیغ دیہاتوں کی دیرینہ بیماری یعنی کم روزگاری کے علاج کے طور پر کی گئی تھی۔لیکن چرخا گھریلو صنعت کے ایک سادہ اوزار سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ چرخے کو عوام میں مقبول بنانے کی کوشش میں گاندھی نے اس کے گرد ایک رومانی ہالہ بنا دیا۔انھوں نے اسے اقتصادی خرابیوں کے ازالے کے واحد علاج کے طور پر ہی نہیں بلکہ قومی اتحاد اور آزادی کے حصول کے ذریعے کے طور پر بھی پیش کیا۔ یہ بیرونی حکومت کی نافرمانی کی ایک علامت بن گیا جواہر لال نہرو نے بڑے خوبصورت انداز میں اسے آزادی کی وردی سے تعبیر کیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ چرخا صنعتی نظام اور مادیت کے خلاف گاندھی کے احتجاج کی علامت تھا۔لیکن ان کے لیے اس کی اتنی اہمیت اس لیے بھی تھی کہ یہ ملک کے سب سے کمزور اور نادار لوگوں سے ان کی گہری وابستگی کا ذریعہ بن گیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ''میں جتنا زیادہ دیہاتوں میں گھستا جاتا ہوں، ملنے والے دیہاتیوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مجھ کو اتنی ہی زیادہ چوٹ لگتی ہے۔ بیلوں کے پہلو بہ پہلو مزدوروں کی حیثیت سے محنت کرنے کے سوا کوئی اور کام نہ ہونے کی وجہ سے یہ بھی بیلوں جیسے ہو گئے ہیں۔'' ہلوں کے پیچھے چلنے والے یہ انسانی ڈھانچے دن رات اُن کا ذہنی تعاقب کرتے رہے جب ان سے کسی نے یہ کہا کہ نشہ بندی کے لیے ملک صبر سے انتظار کر سکتا ہے تو انھوں نے کہا کہ ''شرابی کی بیوی سے صبر کرنے کو کہو تو دیکھو کہ وہ تمھارے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ میں تو ہزاروں شرابیوں کی بیوی بن گیا ہوں اور میں صبر نہیں کر سکتا۔'' وہ ہزاروں شرابیوں کی ہی بیوی نہیں تھے بلکہ کروڑوں نیم گرسنہ ہندوستانی دیہاتیوں کی بیوی بھی تھے۔ وہ اپنی خیال انگیز ہمدردی کی بدولت دوسروں کے خیالات وجذبات کے اندر جھانک سکتے تھے۔ ہندوستان کے دیہاتوں کی غربت وفلاکت کا احساس لوہے کی طرح ان کی روح میں پیوست ہو گیا تھا۔ ''جیسے ہی کوئی مجھ سے (چرخے کے بارے میں) سوال کرتا ہے، میرے اندر ایک آتش فشاں اُبل پڑتا ہے'' اگر اُن کے الفاظ سے ان کا اندرونی کرب چھلک پڑتا تھا۔انھوں نے جل پائی گوڑی میں ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ہندوستان مر رہا ہے......اگر تم ہندوستان کو بچانا چاہتے ہو تو میں جو چھوٹا سا کام بتاتا ہوں اسے کر کے تم بچا سکتے ہو میں چاہتا ہوں کہ تم چرخے کو اپناؤ یا تباہ

ہوجاؤ۔ انھوں نے چٹگام کے طلبہ کے ایک نفیس مزاج مجمع سے کہا کہ ''ہندوستان کی غربت زدگی چٹگام کے سب سے زیادہ کھردرے کھدر سے بھی زیادہ کھردری ہے۔''

1925 میں گاندھی نے وسیع پیمانے پر دورے کیے۔ ان کے دورے کے نقشے میں کاٹھیاواڑ، وسطیٰ ہند، بنگال، ملابار اور ٹراونکور شامل تھے۔ ٹرانکور میں انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس ستیہ گرہ کا منظر دیکھا جو مندروں کو جانے والی سڑکوں پر نام نہاد اچھوتوں کے چلنے کی ممانعت کے خلاف کی جارہی تھی۔ انھوں نے اس کٹر تعصب کے خلاف اس جدو جہد کو اپنا تعاون دیا۔ اس سفر کے دوران انھوں نے جو تقریریں کیں ان میں چھوت چھات پر خاص طور سے وار کیا۔ سوراشٹر کے ایک جلسے میں انھوں نے یہ دیکھا کہ اچھوتوں کے لیے ایک کونے میں الگ گھیرا بنادیا گیا ہے۔ انھوں نے کٹر پنتھیوں کا سارا کھیل بگاڑ دیا اور جہاں اچھوت تھے اسی کونے میں جاکر وہیں سے تقریر شروع کردی۔ انھوں نے یہ ظاہر کردیا کہ آئندہ سے کٹر پنتھیوں کے لیے جلسوں میں الگ گھیرے بنادیے جایا کریں (اور مذاق میں یہ مثال دی کہ اسی طرح جیسے یورپینوں اور اینگلوانڈینوں کے لیے الگ کمپارٹمنٹ ریزرو کردیے جاتے ہیں۔)

1926 خاموشی کا سال تھا۔ گاندھی نے یہ سال سابرمتی آشرم میں گزارا۔ وہاں کے حالات کی طرف وہ اس وقت سے جب کہ وہ دس برس پہلے قائم کیا گیا تھا، دھیان نہیں دے سکتے تھے۔ نومبر 1925 سے انھوں نے ہر ہفتے اپنی ''آپ بیتی'' یا سچائی کے متعلق میرے تجربات کی کہانی[1] شائع کرانا شروع کی۔ انھوں نے کتاب گجراتی میں لکھی تھی اور مہادیو ڈیسائی نے اس کا انگریزی ترجمہ تیار کیا تھا۔ پیارے لال، میرا بین اور سری نواس ساشتری معاون تھے۔ اس سال کا ''ینگ انڈیا'' گاندھی کے ذہن کا اشاریہ تھا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی حالات حاضرہ کے مقابلے میں کھادی، برت، صحت اور اہنسا کے مسائل میں وہ ذہنی طور پر زیادہ الجھے ہوئے تھے۔ نظریہ عدم تشدد (اہنسا) کے بارے میں دو اختلافی مباحث اٹھے جن کا مرکز خود گاندھی تھے۔ جب ایک کپڑا مل کے لکھ پتی امبالال سارابائی نے دو آوارہ کتوں کو پکڑوا کر مروا ڈالا

(1) اس کا اردو ترجمہ ''تلاش حق'' کے نام سے ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم نے کیا تھا اور مکتبہ جامعہ سے شائع ہوچکا ہے۔ مترجم

تو گاندھی پر یہ اعتراض کیا گیا کہ انھوں نے اس سے اتفاق رائے کیوں کیا۔ اُن پر اس وقت بھی سخت اعتراضات ہوئے جب انھوں نے ایسے بچھڑے کو جو ناقابل علاج مرض کے باعث ناقابل برداشت درد میں مبتلا تھا، مروا ڈالا۔ انھوں نے لکھا ''ہمارے اہنسا کے عقیدت مندوں کی مشکل یہ ہے کہ انھوں نے اہنسا کو اندھی پوجا کا موضوع بنالیا ہے اور وہ ''نہ مارنے کو اہنسا سمجھ بیٹھے ہیں۔''

1926 کے آخر میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی غرض سے گوہاٹی گئے۔ اس کے کچھ ہی پہلے ایک مسلمان متشدد نے سوامی شردھا نند کو قتل کر دیا تھا۔ گوہاٹی میں مجتمع لیڈروں کو گاندھی نے بتایا کہ اس قتل کی ذمہ داری حملہ آور پر نہیں بلکہ اُن لوگوں پر ہے جو ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔

1927 کے شروع میں انھوں نے اپنا دورہ شروع کیا۔ وہ بنگال، اس کے بعد بہار اور پھر بمبئی گئے وہاں سے مارچ کے آخر میں وہ کرناٹک کے دورے پر چلے گئے۔ چار مہینے تک وہ لگا تار دورے ہی کرتے رہے بعض اوقات دن میں چھ چھ اور ہفتے میں تیس تیس جلسوں میں تقریریں کرتے تھے۔ وہ تھک کے چور ہو گئے تھے۔ ان کا سر چکرانے لگا تھا، ان کی بصارت دھندلی پڑنے لگی تھی لیکن وہ پروگرام کے ماتحت چلتے ہی گئے جلسوں کو خطاب کرتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ خاتمے کی منزل آہی گئی۔ 27، مارچ 1927 کو میرا بین کے نام بھیجے گئے تار میں مہادیو ڈیسائی نے لکھا تھا کہ ''باپو پر سکتے کا دورہ پڑتے پڑتے رہ گیا۔ ہائی بلیڈ پریشر اب بھی ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ایسا کثرت کار اور اعصابی تھکن کی وجہ سے ہوا ہے اور انھوں نے مشورہ دیا ہے کہ مکمل آرام کریں اور سب پروگرام کم سے کم گرمیوں کے مہینے میں یک قلم منسوخ کر دیے جائیں۔ 28 کو بلگام کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔''

ان کا دل تو چاہتا تھا کہ سابرمتی جائیں لیکن ڈاکٹروں نے زیادہ سرد مقام پر جانے کا مشورہ دیا۔ وہ میسور چلے گئے جہاں کی آب و ہوا اور آرام کی بدولت خلاف امید زیادہ تیزی سے صحت کی بازیابی میں کامیاب ہو سکے۔ مئی 1927 میں دورانِ خون گھٹ کر نارمل ہو گیا۔ وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ انھوں نے اپنی سیر اور مضمون نویسی شروع کر دی اور اپنے مختلف خط لکھنے والوں کو ''پریم پتر'' بھیجنے لگے۔ اب انھوں نے جہاں سے دورے کو چھوڑا تھا وہیں سے پھر

سفر شروع ہوگیا۔ ان کے موضوعات وہی تھے۔ کھادی کی تبلیغ، چھوت چھات کا خاتمہ اور فرقہ وارانہ اتحاد کا استحکام انھوں نے کھادی کی ترقی کے لیے فنڈ جمع کیا۔ جب بوڑھے اپنی کانپتی انگلیوں سے وہ گانٹھیں کھولتے جن میں انھوں نے اپنے پیسے جمع کرر کھے تھے تو انھیں بہت اچھا لگتا۔ انھیں اس پر فخر تھا کہ جہاں مدن موہن مالویہ کو والیان ریاست سے بڑے بڑے عطیات حاصل کرنے میں مہارت تھی، وہاں گاندھی غریبوں سے زیادہ غریب لوگوں کے لیے جیبیں خالی کراسکتے تھے۔ ایک گاؤں میں گاندھی نے صرف ایک جملے کی تقریر کی: ''اپنی جیبیں غریبوں کے لیے خالی کرو۔'' دوسرے گاؤں میں انھوں نے کھادی کی ایک دکان کھولی، لیکن تقریر کرنے کے بعد نہیں بلکہ دکان میں گز، قینچی اور نقدی رسید بھی لے کر کپڑا انچ کر اور رسیدوں پر دستخط کر کے۔ وہ اس طرح ایک گھنٹے تک کھادی بیچتے رہے اور انھوں نے ہر منٹ میں دس روپے کا مال بیچا۔ اس کے بعد دوسرے گاؤں کے لیے کار سے روانہ ہوگئے۔

اپنے دوروں سے انھوں نے عوام کو دیرینہ بے عملی خوف اور ضعیف الاعتقادی سے چھٹکارا دلانے کا کام لیا۔ انھیں چاندی اور سونے کے کاسکٹوں میں جو استقبالیہ ایڈریس دیے جاتے، ان پر وہ ناراضگی کا اظہار کرتے اور کہتے کہ کوئی چیز اور ''سستی'' مقامی اور فنکارانہ ہونی چاہیے وہ ایسے کاسکٹوں کو نیلام کردیا کرتے اور جو رقم ملتی اُسے کھادی فنڈ میں جمع کردیتے۔ انھوں نے ایک گاؤں والوں کو تنبیہہ کی کہ وہ ان کے لیے ہاروں کی خریداری پر روپیہ کیوں ضائع کرتے ہیں ''ان ہاروں سے جو کچھ بچے اس میں سے ہر ایک روپے سے سولہ عورتوں کو ایک وقت کی خوراک مل سکتی ہے۔'' جنوبی ہند میں انھوں نے کھلے لفظوں میں ''دیوداسی'' کی شرانگیز روایت کی مذمت کی۔ میسور کی میونسپلٹی نے تین لاکھ کے خرچ سے پانی کی سپلائی اور چھ مہینے کے اندر شہر میں بجلی لگوانے کی اسکیم بنائی تھی۔ گاندھی نے اُس پر مبارک باد دی لیکن اس سوال کے ساتھ کہ ''کیا آپ شہر کے بچوں کو سستے اور صاف دودھ کے مہیا کرنے کا بھی وعدہ کرسکتے ہیں؟'' انھوں نے یہ بھی کہا کہ ''آپ جب تک ہاتھوں میں جھاڑو اور بالٹی لے کر اٹھ نہ کھڑے ہوں گے اپنے قصبوں اور شہروں کو صاف نہیں کرسکتے۔''

باب 31

بڑھتا جوش وخروش

ہندوستان سے غیر حاضر رہ کر یورپ میں بیس مہینے گزارنے کے بعد دسمبر 1927 میں جواہر لال نہرو ہندوستان واپس آئے تو انھیں سیاسی ماحول میں تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''1926 کے آغاز میں بھی ہندوستان خاموش اور مجہول تھا۔ اور غالبًا 22-1919 کی جدوجہد کے بعد پوری طرح سنبھلا نہیں تھا۔ 1928 میں یہ تر وتازہ فعال اور دبی ہوئی قوت سے بھرا ہوا تھا[1] سماج کے کئی طبقوں، خاص کر صنعتی مزدوروں، کسانوں اور متوسط طبقے کے نوجوانوں میں ناراضگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ٹریڈ یونینوں کی طاقت بڑھتی جارہی تھی اور مزدور بے چین تھے۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس ایک جنگجو اور طبقاتی طور پر حساس جماعت بن گئی تھی اور اس جماعت کے کاموں میں دلچسپی لینے والوں میں جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس شامل تھے۔ دوسری دہائی کے آخر میں کئی ہڑتالیں ہوئیں۔ ان میں وہ ہڑتالیں نمایاں تھیں جن سے بمبئی کی ٹکسٹائل صنعت اور بنگال کی جوٹ صنعت اور جمشید پور کے لوہے اور فولاد کے کارخانے متأثر ہوئے۔ مزدوروں کی تحریک سیاسی تحریک سے براہ راست رابطہ نہیں رکھتی لیکن یہ تو تھا ہی کہ موجودہ صورت حالات کے خلاف تھی۔

---

(1) نہرو: آپ بیتی (Aatography) ص:170

سیاسی تشدد کے ان اِکّا دُکّا واقعات سے قطع نظر جن سے حکومت پریشان ہوگئی تھی، ملک بھر میں یوتھ نوجوان لیگیں قائم ہوگئی تھیں۔ کئی یوتھ کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور ان میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی مشکلات کے انقلابی حل پیش کیے گئے۔

اگرچہ زرعی بے چینی کئی صوبوں میں کروٹیں لینے لگی تھی لیکن گجرات اور بمبئی پریسڈنسی میں تو یہ اُبل ہی پڑی۔ 1922 کی ابتدا میں گاندھی نے باردولی تعلقے کو عدم ادائیگی ٹیکس کی تحریک کا ہراولی کردار ادا کرنے کے لیے اس لیے منتخب کیا تھا کہ یہ عدم تعاون کا نقطۂ عروج بنے چوری چورا کے واقعے نے باردولی کو اس افتخار سے محروم رکھا لیکن چھ برس بعد بمبئی حکومت کے محکمۂ مال نے باردولی کو پھر صف اول میں لا کھڑا کیا۔ میعادی بندوبست کا وقت آ گیا تھا اور مالگذاری کے تعین کا کام حکومت نے سورت کے کلکٹر جیکر کے سپرد کیا تھا۔ انھوں نے ہڑتال کے بعد تیس فی صدی اضافے کی سفارش کی۔ بندوبست کمشنر (سٹلمنٹ کمشنر) نے جیکر رپورٹ کی قائم کردہ بنیادوں پر اعتراض کیا لیکن حکومت بمبئی نے بیس فی صد اضافے کی منظوری دے دی۔ باردولی کے کسانوں نے بمبئی کی قانون ساز کاؤنسل میں اپنے نمائندوں کے ذریعے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ جب درخواستوں سے فریادرسی نہ ہوئی تو انھوں نے ولبھ بھائی پٹیل سے درخواست کی کہ وہ ان کے معاملے کو ہاتھ میں لیں۔ ولبھ بھائی پٹیل نے جو پہلے بہت خوش حال وکیل تھے عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہونے کے لیے پریکٹس ترک کر دی تھی۔ احمد آباد میونسپلٹی کے چیئر مین کی حیثیت سے ان کی شخصیت اور ابھر آئی تھی۔ لیکن ان کی تنظیمی صلاحیتوں کو باردولی میں پھلنے پھولنے کا پورا موقع ملا۔ انھوں نے سارے معاملے کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد گاندھی کو بتایا کہ کسانوں کی شکایتیں بجا تھیں۔ مہاتما گاندھی نے کہا: ''آگے بڑھو! اور فتح گجرات کی ہو۔''

اس طرح اُس حیرت انگیز اور جیسا کہ شروع شروع میں معلوم ہو رہا تھا۔ نابرابر جنگ کا آغاز ہوا جو باردولی کے کسانوں اور حکومت بمبئی کے مابین چھڑ گئی تھی۔ حکومت نے پٹیل کی یہ اپیل ٹھکرا دی کہ تشخیص مالگذاری پر نظر ثانی کی جائے اور اس نے یہ اعلان کیا کہ ''بیرونی'' عناصر کی بات پر کان دھرنے سے کسانوں کو جو نقصان ہوگا اس کی ذمہ داری حکومت پر نہ ہوگی۔ سردار پٹیل کو جو گجرات کے لیڈر تھے۔ برطانوی افسروں کا باردولی تعلقہ میں ''بیرونی'' قرار دینا غیر ارادی ستم

ظریقی تھی۔ کسانوں نے اس کا جواب اس عہد سے دیا کہ وہ ''من مانے'' غیر منصفانہ اور ظالمانہ نئی تشخیص کے حساب سے اس وقت تک مالگذاری ادا نہ کریں گے جب تک کہ حکومت پرانی شرح پر واپس نہیں جاتی یا از سرِ نو تشخیص نہیں کراتی۔ ولبھ بھائی پٹیل کا کام آسان نہیں تھا۔ باردولی کے کسان نرم رو سمجھے جاتے تھے کہا جاتا ہے کہ ان کے کتے بھی اجنبیوں کو دیکھ کر نہیں بھونکتے تھے۔[1] ان میں خاصی تعداد خوش حال کسانوں اور امیر سوداگروں کی ایسی تھی جنھوں نے باہر جا کر خوب دولت جمع کی تھی اور اس لیے سرکاری دباؤ کا آسان نشانہ تھے باردولی کے لوگوں کو ستیہ گرہی طریق کار سمجھانے کی مہم پر ولبھ بھائی نکل پڑے۔ انھوں نے لوگوں کو للکارا کہ حکومت کے خلاف لڑائی لڑنے میں وہ پوری بربادی کے لیے تیار ہو جائیں۔ انھوں نے بڑی گرم جوشی سے لبیک کہی۔ اُن کے بچے بھی گانے لگے: ''بہادر سپاہیو جاگو: طبل جنگ بج رہا ہے بہادرو جاگو! بزدلو بھاگو!''

حکومت نے کسانوں کی مقاومت کو توڑنا چاہا۔ مقررہ مالگذاری ادا کر دینے والوں کو رعایتوں کی پیش کش کی۔ اس نے زیادہ امیر یا زیادہ کمزور کسانوں کو اپنی طرف ملانے کی کوشش کی۔ اس نے فصلیں کوڑیوں کے مول بکوا دیں اور ٹیکس کے بدلے زمین، گھر کا سامان اور مویشی سب ضبط کر لیے۔ چوں کہ دکانوں میں کوئی ضبط شدہ جائداد کو خریدنے یا سامان لے جانے کے لیے تیار نہیں ہوا اس لیے یہ گندا کام کرانے کے لیے پٹھان باہر سے بلائے گئے۔ کسانوں نے اپنے کمزور بھائیوں اور جابر حکام کے خلاف بائیکاٹ کا ہتھیار استعمال کیا اور اس حربے کا اس طرح استعمال کیا کہ اس کے کاٹے کا منتر نہ ملا۔

اتنے بڑے پیمانہ پر ستیہ گرہ کا جو تجربہ ہو رہا تھا اس میں گاندھی کو گہری دل چسپی تھی۔ اس کی تائید انھوں نے کھلم کھلا اور پرائیویٹ طور پر، ہر طرح کی لیکن ولبھ بھائی پٹیل نے اُن پر زور دیا کہ باردولی جانے کے لیے اپنی روانگی ملتوی کر دیں۔ خطرہ تھا کہ کہیں یہ لڑائی مقامی نہ رہ کر قومی مسئلہ نہ بن جائے۔ وی جے پٹیل نے لارڈ اِرون سے اپیل کی کہ وہ مداخلت کریں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں تحریک کے عواقب پر مباحثہ ہوا اور آزاد مبصرین نے، جن میں ہردے ناتھ کنزرو شامل تھے، حالات کے جائزے لیں تاکہ حقیقت حال معلوم ہو۔ بمبئی مقنّنہ کے کچھ ممبروں نے استعفیٰ

(1) نرہری پارکھ: سردار ولبھ بھائی پٹیل، جلد 1، ص: 313

دیدیے۔ ہندوستانی پریس نے جن میں برطانوی ملکیت کے ''اسٹیٹسمین'' اور ''پانیر'' شامل تھے تحقیقات کے مطالبے کی تائد کی۔ بادل ناخواستہ حکومت اس طوفان کے آگے جھکی اور اس پر رضا مند ہوئی کہ دو برطانوی افسروں پر مشتمل ایک کمیٹی تشخیص مالگذاری پر آزادانہ نظرثانی کرنے کی غرض سے مقرر کی جائے۔ کمیٹی نے یہ رپورٹ دی کہ مالگذاری میں بائیس فی صد اضافے کی جگہ جو حقیقتاً عائد کردیا گیا تھا، صرف پانچ فیصد اضافے کا جواز ہے۔ باردولی کے کسانوں نے ولبھ بھائی پٹیل کو ''سردار'' کا خطاب عطا کیا۔ ہندوستانی آزادی کے پرستاروں کے لیے برسوں کی بے عملی کے بعد ایک کامیاب جنگ، ولولہ انگیز تجربہ ثابت ہوئی اس سے اس چھپی ہوئی طاقت کا اندازہ ہوا جو اس انتظار میں تھی کہ اُسے قومی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔

اس دوران میں، ہندوستانی سیاست اس افسردگی سے چھٹکارا پانے لگی تھی جس میں وہ دوسری دہائی کے وسط سے پھنس گئی تھی۔ 1923 سے سوراج پارٹی اسٹیج پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ذمے ایسا ماحول پیدا کرنے کا کام لیا تھا جس میں نوکرشاہی سے مقاومت کی جائے اور آئین کو توڑا جائے۔ اس کی بنا موتی لال نہرو اور سی آر داس نے ڈالی تھی اور لاجپت رائے اور وی۔ جے پٹیل جیسی نمایاں شخصیتیں اس کے ارکین میں شامل تھیں۔ اس کی ابتدا اچھی ہوئی تھی۔ 1923 اور 1944 میں دو صوبوں میں اس پارٹی نے صوبائی حکومتوں کی دوعملی کو باکل ہی ناقابل عمل بنادیا تھا۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں فرقہ وارانہ حق رائے دہندگی اور سکاری اور نامزد ممبروں کے ٹھوس بلاک کے باوجود پارٹی نے حکومت کے وقار پر بھرپور ضرب لگائی تھی۔ اس نے بجٹ نامنظور کردیے تھے اور نیا آئین بنانے کے لیے گول میز کانفرنس منعقد کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ شروع شروع میں سوراج پارٹی کے بارے میں جو سرکاری ردّعمل تھا اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو وائسرائے نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لندن بھیجا تھا۔ اس وقت سوراج پارٹی والا جو چاہتا ہے کرالیتا ہے نہ کوئی اس کا مدمقابل ہے اور نہ کوئی اس پر حملہ کرتا ہے...... سوراجی کے مقابلے میں اعتدال پسند سست اور پژمردہ نظر آتے ہیں۔''(1)

سر مائیکل اوڈوائر، گورنر پنجاب کا خیال تھا کہ کھلم کھلا بغاوت کے مقابلے میں سوراجوں کی

(1) مارکوئی آف ریڈنگ از روفس آئی زیکس: جلد 2، ص: 282

اندرونی توڑ پھوڑ سے نپٹنا زیادہ مشکل تھا۔ وائسرائے ایکزیکوٹیو کاؤنسل کے ممبر مرکزی قانون ساز اسمبلی میں گروپ کے لیڈر سر میلکم ہیلی جب یو پی کے گورنر مقرر ہو کر جانے لگے تو ان کے اس جملے میں مزاح کے علاوہ کچھ اور بھی تھا کہ ''میں ایسی جگہ جانے میں مسرت محسوس کر رہا ہوں جہاں مجھے ''پنڈت اور پٹیل'' پریشان نہ کر سکیں گے۔''

سوراج پارٹی کی اعلا ڈسپلن زیادہ دنوں تک نہ چل پائی۔ قانون ساز مجلسوں میں مکمل اکثریت نہ ہونے کے باعث دوسری جماعتوں کا تعاون ضروری ہو گیا تھا۔ اور یہ تعاون بعض اوقات اصولوں کو بھاری قیمت پر بیچ کر خریدنا پڑتا تھا۔ حکومت سرکاری سرپرستی (مثلاً صوبائی وزارت یا جنیوا کے سفر) کے لقمے سامنے ڈال کر کمزور اراکین پارٹی کو للچا سکتی تھی۔ جو لوگ فرقہ وارانہ حق رائے دہندگی کی بنا پر منتخب ہوئے تھے۔ وہ فرقہ پرستی کی اس چھوت سے بچ نہ پاتے تھے جو سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ مسلم ممبران دھیرے دھیرے الگ ہو گئے اور مہاراشٹر کے سوراجیوں نے ''جوابی تعاون کا نعرہ بلند کیا۔ اور پارٹی کے ڈپٹی لیڈر، لاجپت رائے کے ٹوٹ جانے سے تو سب سے بڑی کاری ضرب لگی۔ 1926 کے عام انتخابات میں سوراجیوں کی طاقت مرکز اور صوبوں میں ہر جگہ کم ہو گئی۔ مدراس کو چھوڑ کر وہ ہر جگہ نشستیں ہار گئے۔ یو پی سے تنہا موتی لال نہرو سوراج پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر مرکزی اسمبلی گئے۔ نہرو نے اس پر یہ خیال ظاہر کیا کہ ''یہ قوم پرور طاقتوں اور نچلی سطح کی فرقہ پرستی کے مابین جنگ تھی اور اس میں آخر الذکر کی جیت ہوئی۔

اب مرکزی اسمبلی میں حکومت کو اپنی بات منوانا نسبتاً آسان ہو گیا۔ انتخاب عام سے پہلے مارچ 1926 میں موتی لال نہرو نے اعلان کیا تھا کہ ''ہمارے لیے اب یہ ڈھونگ والے ادارے کسی کام کے نہیں رہ گئے ہیں۔'' ان کے صاحبزادے نہرو نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ کس طرح روز بروز غلط فہمیوں سے آزاد ہوتے چلے گئے اور اس تکلیف دہ نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان میں اس وقت جو حالات تھے اُن کے پیش نظر آئینی طریقے بے اثر اور بے کار ہیں۔ کانگریس پارلیمانی بورڈ کے قسم کا کوئی ارادہ نہیں تھا جو کانگریسی قانون سازوں کو ڈسپلن کا پابند بنا سکتا یہ بڑا دل شکن کام تھا کہ سال بہ سال ایسی انتظامیہ سے بحثیں اور جھگڑے ہوتے رہیں جو ہٹائی نہ جا سکتی تھی کیوں کہ

اس کو مقنّنہ میں ایک ایسے سرکاری بلاک کی حمایت حاصل تھی جو فرقہ وارانہ حق رائے دہندگی سے منتخب ہوا تھا اور پھر ایسی پارٹی کی قیادت بھی کرنا پڑی جو بہت زیادہ ڈسپلن کی پابند نہ ہو اور جس کو ایسے گروہوں کے تعاون سے چلانا پڑ رہا ہو جن میں ہر ایک کا کوئی ذاتی یا فرقہ وارانہ مفاد وابستہ ہو۔ اس جملے میں ایک حد تک صداقت بھی تھی جو سردار پٹیل نے (1922 سے وہ ہر قسم کے سیاسی اصولوں میں تبدیلی کے مخالف رہے تھے) سوراجیوں پر چست کیا تھا کہ ''جو حکومت کو توڑنے پھوڑنے چلے تھے خود ٹوٹ پھوٹ گئے۔''[1]

اگر چہ بے اطمینانی کی کئی تہ نشین لہریں چل رہی تھیں، پھر بھی 1927 میں ہندوستانی سیاست بھی غیر متحرک سی نظر آ رہی تھی۔ لارڈ ریڈنگ نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ان کے جانشین کو اٹھارہ مہینوں کا آسان وقفہ مل جائے گا، لیکن یہ طوفان کے پہلے کی خاموشی ثابت ہوگی۔ پیش گوئی صحیح نکلی، لیکن طوفان خود برطانوی حکومت نے اٹھایا۔ 2 نومبر 1927 کو کئی ہندوستانی لیڈر جن میں گاندھی، موتی لال نہرو، انصاری اور جناح شامل تھے، دلی کے وائسریگل لاج (موجودہ راشٹر پتی بھون) میں بلائے گئے اور انھیں ایک دستاویز دی گئی جس میں ایک شاہی کمیشن کی تقرری کا اعلان تھا۔ اس ملاقات میں صرف یہی کام ہوا۔ گاندھی نے جو ایک ہزار میل دور سے آئے تھے، تعجب کا اظہار کیا کہ یہ اطلاع دینے کے لیے ایک پوسٹ کارڈ کیوں استعمال نہیں کیا گیا۔ ہندوستانی قائدین کو جو دستاویز ملی تھی اُسے خبر بھی نہیں کہا جا سکتا تھا، کیوں کہ اس کے مندرجات پریس میں پہلے ہی سے صحیح صحیح چھپ چکے تھے وائسرائے کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ''ہندوستانی قیادت نے اس سے پہلے کبھی ایسی ذلت محسوس نہیں کی تھی۔''[2]

ہندوستان پر ''انڈین ریفارمس ایکٹ 1919'' کے تحت حکومت کی جا رہی تھی۔ اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ دس برس کے بعد آئینی صورت حال کا پھر جائزہ لیا جائے گا۔ برطانوی کنزرویٹو (رجعت پسند پارٹی) کے نزدیک یہ دفعہ ایک حفاظتی دفعہ تھی، اور ہندوستانی قوم پرستوں کے لیے مزید پیش رفت کا وسیلہ تھی۔ 1927 میں معینہ مدت سے دو برس پہلے ہی شاہی کمیشن کے

(1) نرہری پارکھ، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ج:1، ص:381

(2) جانس، ایلن کیمپبل: وائی کاونٹ ہیلی فاکس:190

تقرر سے قیاس آرائیوں کا دروازہ کھل گیا۔ یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ انگلستان کی رجعت پسند حکومت، ہندوستانی مسئلے کو خود ہی طے کرنا چاہتی تھی اور اُس کو اس مزدور حکومت کے لیے جس کے بارے میں گمان تھا کہ شاید آنے والے عام انتخابات کے بعد برسر اقتدار آ جائیں، چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس خیال کو ''دی لاسٹ'' میں مندرج برکن ہیڈ کے اس جملے سے تقویت ملتی ہے کہ ''ہم اس کا ہلکے سے ہلکا خطرہ بھی مول لینے پر آمادہ نہیں تھے کہ ہم 1928 کے کمیشن کی نامزدگی اپنے بعد میں آنے والوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیں۔''

کمیشن کے تقرر میں جلدی کا ایک سبب اور بھی تھا۔ سوراج پارٹی صوبوں میں اور زیادہ خود مختاری اور مرکز میں ذمہ داری دیے جانے کے لیے برابر زور دے رہی تھی اور 1919 کے انڈین ریفارم ایکٹ کی چار دیواری میں گھر کر چھوٹی موٹی ترمیمات پر تیار نہیں تھی۔ اس لیے اس کا امکان ہے کہ لارڈ برکن ہیڈ اور رجعت پسند حکومت نے ہندوستان کی سیاسی رائے کی اس طرح اشک شوئی کرنا چاہی ہو اور کچھ دنوں کے لیے ایک سیاسی فورم مہیا کر دیا ہو، اس سلسلے میں اُس مشورے کو یاد کر لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو دسمبر 1925 میں لارڈ ریڈنگ نے لارڈ برکن ہیڈ کو دیا تھا کہ ''سازگار ماحول پیدا کرنے کے لیے'' اور سوراجیوں کی بندوقوں میں میخ لگا دینے کے لیے ایک کمیشن مقرر کر دیا جائے۔[1]

اس چال میں لارڈ برکن ہیڈ کی جو بھی نیت رہی ہو، یہ چال بالکل الٹی پڑی۔ چیئرمین، سر جان سائمن کے علاوہ کمیشن کے جتنے ممبر تھے، وہ ''دوسرے درجے کے لوگ'' تھے۔ کمیشن کے جونیئر ممبر (جیسا کہ وائی کاؤنٹ سائمن نے اپنی کتاب Prospect میں لکھا ہے) کلیمنٹ اَٹیلی مستقبل کے وزیر اعظم تھے، لیکن اس وقت وہ ہاؤس آف کامنس (دارالعلوم) میں پچھلی نشستوں کے بیٹھنے والوں میں تھے۔ ہندوستانی جذبات کو جس بات سے سب سے زیادہ ٹھیس لگی، وہ یہ تھی کہ اس ''کُل سفید کمیشن'' میں کوئی بھی ہندوستانی شامل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ دلیل کہ ایسے شاہی کمیشن میں، جو برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہو، باہر سے ممبر نہیں لیے جا سکتے تھے، چاہے صحیح آئینی طریق کار ہی کیوں نہ ہو، لیکن یہ پرلے سرے کی سیاسی غلطی تھی۔ ہندوستان میں لوگ یہ سمجھنے لگے کہ بدیسی

(1) مارکوئی آف ریڈنگ: رُوفس آئی زیکس، فرسٹ مارکوئی آف ریڈنگ، ج:2،ص:142

یہ تحقیقات کرنے آئے ہیں کہ ہندوستانی خودحکومت چلانے کے اہل ہیں یا نہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس نے یہ فیصلہ کیا کہ ''ہر منزل پر اور ہر شکل میں'' کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ اعتدال پسند اور مسلم سیاستدانوں نے بھی، جن کے تعاون کا برکن ہیڈ نے پہلے ہی سے یقین کر رکھا تھا، متفقہ طور پر کمیشن کی مذمت کی۔ اس طرح کمیشن کا بائیکاٹ اُن پارٹیوں کے لیے مشترکہ پلیٹ فارم بن گیا، جو دوسرے معاملات میں قطبین کی طرح الگ تھیں۔ وقتاً فوقتاً لارڈ برکن ہیڈ بھڑک اٹھتے تھے، کیوں کہ بظاہر انھیں اپنی چھاپ کے سیاسی مذاق سے قوم پروروں کو دق کرنے میں مزہ ملتا تھا۔ اس حرکت سے بھی اس متحدہ محاذ کے بنائے رکھنے میں مدد ملی۔ اسی دن جب کہ مرکزی قانون ساز اسمبلی سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے سلسلے میں لاجپت رائے کی مشہور تجویز پر بحث ہونے والی تھی، برکن ہیڈ نے یہ اعلان کیا کہ بائیکاٹ کی پالیسی سے پارلیمنٹ یہ سمجھ جائے گی کہ ہندوستان خودمختاری کی راہ سے بہت دور چلا گیا ہے! وائسرائے نے طوفانی سمندر کو تیل چھڑک کر قابو کرنا چاہا تھا۔ انھوں نے ''تاریخ کے فیصلے'' کے نام پر اپیل کی، اور جو لوگ مدد کرنے کی طاقت رکھتے تھے، ان کو رکاوٹ نہ ڈالنے کی دعوت دی۔ خفیہ طور پر انھوں نے مسلمانوں کو ''بائیکاٹ پارٹی'' سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن برکن ہیڈ کے تکبر نے جناح کو مخالف بنا دیا تھا اور بائیکاٹ کا ریزولیوشن مرکزی مجلس قانون ساز میں باسٹھ کے مقابلے میں اڑسٹھ کی اکثریت سے پاس ہو گیا۔

آخر پچھتا کے ہندوستانی رائے عامہ کو یہ مراعات دی گئی کہ مرکزی اور صوبائی قانون ساز اسمبلیوں سے کئی کمیٹیاں کمیشن کی مدد کرنے کے غرض سے بنائی گئیں۔ لیکن ان کمیٹیوں کی حیثیت صرف مشاورتی تھی، اور ہندوستانی قوم پروری کے مجروح افتخار کو اس سے تسکین نہیں ہوئی۔ جن جن شہروں میں ''سائمن سات'' (سات ممبر) گئے، ان میں سے بیشتر جگہوں پر اُن کا استقبال کال جھنڈیوں کے مظاہروں اور دوکانوں کی بند کھڑکیوں سے کیا گیا۔ پولیس نے مداخلت کر کے مظاہروں کو توڑ دیا لیکن لاہور میں ایک جگہ پنجاب کے ممتاز رہنما لاجپت رائے کو ایک نوجوان برطانوی افسر نے زدوکوب کیا۔ کچھ دنوں بعد اسی زدوکوب کے نتیجے میں لاجپت رائے بہت جلد اس دنیا سے چل بسے۔ اس سانحے سے غم و غصہ کی آگ اور بھڑکی اور بائیکاٹ نے زور پکڑ لیا۔ حکام کا طرزِ عمل بھی سخت ہو گیا، اور مظاہرین کی زدوکوب معمول بن گئی۔

سائمن کمیشن کے بائیکاٹ سے سیاسی پارہ چڑھ گیا تھا، اور اس نے اُن پارٹیوں کو آپس میں ملا دیا، جن میں بظاہر کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ برکن ہیڈ کے چیلنج سے ہندوستانی قائدین کو ایسی چوٹ پہنچی کہ وہ آئینی مسئلے کا متفقہ حل ڈھونڈنے لگے۔ برکن ہیڈ نے اعلان کیا کہ ''میں نے تین برس میں جب میں سکریٹری آف اسٹیٹ تھا، دوبار اپنے ہندوستانی معترضین کو یہ دعوت دی تھی کہ ایک آئین کے سلسلے میں خود اپنی تجویزیں سامنے رکھیں، تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ ان کے خیال میں آئینی اصلاحات کی شکل کیا ہونا چاہیے۔'' انھوں نے اتنا اور اضافہ کیا کہ ''وہ پیش کش اب بھی قائم ہے۔'' اس چیلنج کے جواب میں کئی آل پارٹیز کانفرنسیں ہوئیں، اور آئینی اسکیم کا ایک مسودہ تیار ہوا۔ یہ بعد میں ''نہرو رپورٹ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں ایک پارلیمانی طرز حکومت، مشترکہ انتخابات اور اقلیتوں کی حفاظت کا ایک پر پیچ فارمولہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ جب اگست 1928 میں آل پارٹیز کانفرنس کے آخری جلسے میں منظوری کے لیے پیش ہوا تو درجۂ نوآبادیات بنام ''مکمل آزادی'' کا تنازع پھر بھڑک اُٹھا۔ ''نہرو رپورٹ'' میں تجویزات کی بنیاد ''مقبوضاتی حیثیت'' پر رکھی گئی تھی، تاکہ کانگریسیوں، اعتدال پسندوں اور دوسرے سیاسی گرہوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے ہو سکے۔ کانگریس کے نوجوان دستے کو یہ پسند نہ تھا کہ ہندوستانی کو حدود و قیود میں جکڑا جائے۔ لیکن موتی لال نہرو کو اس پر اصرار تھا کہ ان کے نام کی رپورٹ پوری کی پوری منظور ہو۔ جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس نے کانگریس سے علاحدگی کی دھمکی دی، ان کے استعفے منظور نہیں کیے گئے، لیکن انھوں نے کانگریسیوں میں مکمل آزادی کا عقیدہ پھیلانے کے لیے ''انڈی پن ڈنٹ لیگ'' قائم کی۔ دسمبر 1928 میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہونے والا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس کے پرانے محافظوں اور نوجوان گروہوں کے مابین براہ راست ٹکراؤ ہو کر رہے گا۔

گاندھی نے آل پارٹیز کانفرنس میں یا نہرو رپورٹ کے مسودہ کی تیاری میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر رپورٹ کی سفارش کی کہ اس سے ''تمام معقول آرزوئیں'' پوری ہوتی ہیں۔ انھوں نے کانگریس کے 1926 کے اجلاس گوہاٹی اور 1927 کے اجلاس مدراس میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ اگر پنڈت موتی لال نہرو کا فوری دعوت نامہ نہ آتا تو شاید وہ دسمبر 1928 والے اجلاس کلکتہ میں بھی زیادہ دلچسپی نہ لیتے۔ پنڈت جی نے یہ پیش بینی کرتے ہوئے کہ کلکتہ میں

بحران پیدا ہوجائے گا، مہاتما سے کانگریس کے اجلاس میں شرکت پر اصرار کیا ’’آپ نے مجھے صدارتی کرسی پر بٹھایا اور میرے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ دیا ہے۔لیکن کم از کم میری مشکلات کا دور سے مشاہدہ تو نہ کیجئے۔‘‘

گاندھی نے ایک مصالحتی فارمولا تیار کر کے کلکتہ کانگریس میں پھوٹ نہ ہونے دی۔ کانگریس نے ایک رزولیوشن کے ذریعے اس شرط پر نہرو رپورٹ منظور کی کہ اگر 31 دسمبر 1929 تک حکومت یہ رپورٹ منظور نہیں کرتی، تو کانگریس مکمل آزادی کی مانگ کرے گی اور اگر ضرورت پڑی تو عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کے ذریعے حکومت سے جنگ کرے گی۔ اگر گاندھی کا بس چلتا تو وہ حکومت کو دو برس کا وقت دیتے کہ وہ اچھی طرح رائے قائم کرلے اور کانگریس بھی اپنے سب انتظامات مکمل کرلے۔ جو لوگ بڑی طرّاری سے آزادی کی باتیں کرتے تھے ان سے انھوں نے یہ کہا کہ ’’آپ اپنے ہونٹوں پر آزادی کا نام اُسی طرح لائیں جیسے مسلمان ’’اللہ‘‘ کا، اور ہندو ’’کرشن‘‘ یا ’’رام‘‘ کا ورد کرتا ہے۔‘‘ انھوں نے کانگریس کو متنبہ کیا کہ برطانوی حکومت اُس وقت تک نہ تو درجہ نوآبادیات دے گی، نہ آزادی، جب تک کہ قوم اپنے حقوق کا پُر زور دعویٰ نہیں کرتی اور اس کے لیے ضروری جواز پیدا نہیں کرتی۔ اگر کانگریس کو حکومت سے جنگ کرنا ہے، تو اسے پہلے آپس کے جھگڑے مٹانے ہوں گے۔ کانگریسی رجسٹر ایک فرضی تماشہ ہے، کانگریس کو ممبروں کے زندہ رجسٹر کی ضرورت ہے۔ اگر کانگریسی اس تجویز کو دل سے مانتے ہیں، جو انھوں نے پاس کی ہے، تو انھیں بہت جم کے کام کرنا ہے۔

کلکتہ کانگریس نے گاندھی کی سیاست میں واپسی کا راستہ کھول دیا۔ اگر برطانوی حکومت کانگریس کا مطالبہ منظور نہیں کرتی۔ اور ایسا ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ تو کانگریس کے سامنے اس کا یہ عہد تھا کہ عدم تعاون کی تحریک چلائی جائے گی۔ اور یہ سبھی پر روشن تھا کہ ایسی تحریک صرف گاندھی چلا سکتے تھے۔ مارچ 1922 میں انھیں چھ برس کی سزا ملی تھی اور جب صحت کی بناء پر انھیں 1924 میں قبل از وقت رہا کر دیا گیا تھا تو انھیں خوشی نہیں ہوئی تھی۔ مارچ 1928 تک وہ ’’اخلاقی طور پر‘‘ سزا کی میعاد سے اپنے کو آزاد نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن اب سیاسی اور ذاتی دونوں ہی وجود کے باعث لازم ہو گیا تھا کہ ان کی عملی سیاست سے کنارہ کشی ختم ہو۔

باب 32

مہلت کا سال

کانگریس کے کلکتہ والے اجلاس (دسمبر 1928) نے جواہر لال نہرو کے لفظوں میں برطانوی حکومت کو "ایک سال کی مہلت کی پیش کش کی تھی اور ایک شائستہ الٹی میٹم دیا تھا" اگر 1929 کے خاتمے تک نوآبادیاتی حیثیت کا حق تسلیم نہ کیا گیا تو کانگریس کو حکومت کے خلاف جنگ کرنا ہوگی۔ گاندھی 1929 میں یورپ جانے کے خیالی منصوبہ بنا رہے تھے لیکن کانگریس کے اجلاس میں سب سے اہم تجویز کو منظوری کی منزل تک پہنچانے کے بعد انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اب ہندوستان چھوڑنا بیوفائی کا مترادف ہوگا۔ ایک سال کا الٹی میٹم دے کر کانگریس نے مخالف کے میدان میں گیند پھینک دی تھی اور اب اگلا قدم حکومت کو اٹھانا تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ آزادی برطانیہ کے تحفے کے طور پر آسمان سے نہیں اترے گی۔ اسپیکر پٹیل نے ایک چائے پارٹی دی جس میں وائسرائے اور گاندھی دونوں مہمان تھے۔ جب اس سلسلے میں قیاس آرائیاں شروع ہوئیں تو گاندھی نے اس پر تبصرہ کیا کہ "ایک غیر رسمی پرائیوٹ پارٹی میں زیادہ برف نہیں پگھل سکتی۔ میرے خیال میں جب تک دونوں ہی تیار و آمادہ نہ ہوں اس (غیر رسمی یک جائی) سے کوئی حقیقی پیش رفت نہیں ہوسکتی نہ کسی عمل کا آغاز ہمیں معلوم ہے کہ ہم تیار نہیں ہیں۔ اور انگلستان ہندوستان کے عزائم کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھائے گا جب تک وہ ایسا کرنے پر مجبور نہ ہو جائے۔

جب وہ ''تیاری'' کی بات سوچ رہے تھے تو ان کے ذہن میں سیاسی چالیں نہیں تھیں۔ ستیہ گرہ کی حکمت عملی میں مہینوں اور سالوں پہلے منصوبے بنانا شامل نہیں تھا۔ لیکن اس دوران میں ملک کو اس کے (عواقب) کے بارے میں سمجھانا اور منظّم بنانا تھا گاندھی نے سارے ملک کا دورہ کیا اور عوام سے اپیل کی کہ وہ گھروں میں چرخہ کاتیں اور غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ کریں۔ انھوں نے ایک اسکیم تیار کی جس کے تحت کانگریسی اداروں کو کھادی بیچنے کے لیے والنٹیر وں کی بھرتی کرنا تھی اور گھر گھر جا کر بدیشی کپڑا جمع کرنا تھا۔ بدیشی کپڑا سرعام جلایا جانا تھا اور بدیشی کپڑوں کی دکانوں کی پکٹنگ ہونے والی تھی۔ مارچ 1929 کے آغاز میں وہ کلکتہ میں تھے جب بدیشی نفیس اشیاء کا اہرام تیار ہوا اور دھوم دھام سے نذر آتش کیا گیا بنگال صوبائی کانگریس کمیٹی کو یہ نوٹس ملا کہ پبلک مقامات کے قریب بدیشی کپڑے جلانا جرم ہے گاندھی کا ابھی تک قانون شکنی کا ارادہ نہیں تھا۔ انھوں نے کہا۔ ''مجھ میں ہر ایسے قانون کے توڑنے کی صلاحیت ہے جس سے میرے اخلاقی ادراک کو چوٹ لگتی ہے، لیکن میرے نزدیک ابھی وہ وقت آیا نہیں ہے۔'' بہرحال انھیں یہ بتا دیا گیا تھا کہ کلکتہ شردھا نند پارک جہاں جلسہ ہونے والا تھا رہگذر عام نہیں ہے۔ لیکن جیسے ہی آگ لگائی گئی انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ انھوں نے اس مچلکے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا جس کے ماتحت انھیں 5 مارچ کو چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضر ہونا تھا۔ بہرحال مقدمہ اس خیال سے ملتوی کر دیا گیا۔ وہ اپنا برما جانے کا پروگرام پورا کرسکیں (کیوں کہ) وہ برما چودہ برس بعد جا رہے تھے۔

تین ہفتے بعد جب وہ برما سے لوٹے تو وہ خود سے عدالتی کارروائی کے لیے حاضر ہو گئے اور ان پر ایک روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ کسی نے ان کے علم کے بغیر جرمانہ ادا کر دیا۔ اس عدالتی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ میں تیزی آگئی جس دن گاندھی کے مقدمے کی سماعت ہوئی ہے اس روز سارے ملک میں بدیشی کپڑوں پر آگ لگانے کا جشن منایا گیا۔

حکومت نے بڑھتی ہوئی بے چینی کے آثار دیکھے۔ کانگریس نے جوالٹی میٹم دیا تھا اور 1930 کی ابتدا پر ٹکراؤ کا جو امکان نظر آرہا تھا ان کے علاوہ بھی دیگر پریشان کن علامتیں نظر آرہی تھیں۔ صنعتوں کے مزدوروں کی بے اطمینانی حد تک پہنچ گئی تھی۔ جمشید پور اور بمبئی میں ہڑتالیں

ہو چکی تھیں اپریل 1929 میں جب اسپیکر پٹیل مرکزی مجلس قانون ساز میں، عوامی حفاظتی بل (جس کا مقصد انتہا پسندوں کی روک تھام کے لیے انتظامیہ کو زیادہ اختیارات دینا تھا) اپنی رولنگ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو تماشائیوں کی گیلری سے بم پھینکے گئے۔ دونو جوان بھگت سنگھ اور بی، کے دت گرفتار ہوئے۔ انھوں نے بعد میں یہ بیان دیا کہ ان کا مقصد کسی کو مارنا نہیں تھا بلکہ ''بہروں کو سنانے پر مجبور کرنا تھا۔ تشدد آمیز دست درازیاں ملک کے کئی حصوں میں ہوئیں اور نوجوانوں کے گروہوں کو گرفتار کر کے ان پر سیاسی تشدد کے الزام میں مقدمے چلائے گئے۔ ان مقدمات کو سازشی مقدمات کے سلسلے کا نام دیا گیا۔ یہ نیراجی جوان لوگ مقبول ہیرو بن گئے جوان کا طریق کار پر اظہار افسوس کرتے تھے وہ بھی ان کی نیتوں کی تعریف ضرور کرتے تھے۔ اس وقت عوام کے جذبات برانگیختگی کی انتہا کو پہنچ گئے۔ جب سیاسی قیدیوں کے ساتھ (ناروا) سلوک کے خلاف احتجاج کے طور پر ایسے کئی نوجوان قیدیوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ ان میں ایک قیدی جتن داس جیل ہی میں مر گیا اور ایک شہید کی حیثیت سے ان کا اعزاز کیا گیا۔

اس بڑھتے ہوئے تناؤ پر حکومت کا ردِعمل یہ ہوا کہ اس نے انتظامیہ کو اور زیادہ اختیارات سے لیس کر دیا۔ عوامی حفاظتی بل جسے اسپیکر پٹیل نے خلافِ قاعدہ قرار دے دیا تھا وہ وائسرائے کے خصوصی اختیارات کے ماتحت منظور کر دیا گیا۔ مارچ 1929 میں کئی ٹریڈ یونین لیڈروں پر جن میں سے کئی کمیونسٹ تھے کچھ تقریباً کمیونسٹ تھے اور کچھ ٹریڈ یونینسٹ تھے۔ وہ مشہور مقدمہ چلایا گیا جس کی ''میرٹھ سازش مقدمہ'' کے نام سے شہرت ہوئی گاندھی نے لکھا ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان مقدموں کے چلائے جانے کا مقصد کمیونزم کو مارنا نہیں بلکہ دلوں میں دہشت پیدا کرنا ہے۔'' انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ''حکومت حسب معمول اپنے ان سرخ ناخنوں کا مظاہرہ کر رہی ہے جسے وہ عام طور سے پنجوں میں چھپائے رکھتی ہے۔''

بہرصورت وائسرائے لارڈ اِرون کا ارادہ یہ نہیں تھا کہ صرف زور زبردستی کا طریقہ اپنایا جائے۔ انھوں نے لارڈ برکن ہیڈ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ کوئی ہندوستانی شاہی کمیشن میں شامل نہ کیا جائے، لیکن تجربے نے انھیں زیادہ عقلمند بنا دیا تھا۔ سر جان سائمن اور ان کے ساتھی ملک کے دورے کر رہے تھے اور شہادتیں جمع کرنے اور ان کی چھان پھٹک میں مصروف تھے۔ مئی 1930 سے

پہلے میشن کی رپورٹ شائع ہونے والی نہیں تھی لیکن لارڈ اِروِن اس کی سفارشات کے رجحانات سے واقف تھے اور وہ یہ محسوس کر سکتے تھے کہ اس سے ہندوستان کی رائے عامہ زیادہ مطمئن نہیں ہو سکے گی۔ 1929 کی گرمیوں میں وہ انگلستان گئے اور وہاں کے مدبرین سے مشورہ کیا۔ 1929 کی گرمیوں میں انھوں نے وی، جے پٹیل سے خط و کتابت کی اس سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ اروِن کا ذہن کس طرح کام کر رہا تھا۔ پٹیل نے یہ زور دے کر لکھا تھا کہ ''وہ کوئی ایسا فارمولا نکالیں جس سے کانگریسی لیڈر لندن میں ہونے والے گول میز کانفرنس میں شرکت کو اپنے وقت کا اچھا مصرف سمجھ سکیں۔'' وائسرائے نے لکھا کہ ''اس بات کے لیے آپ مجھ پر بھروسہ کریں کہ موجودہ مشکلات سے چھٹکارا پانے کی غرض سے کوئی نہ کوئی راہِ صلح تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ جہاں تک آپ کا تعلق ہے آپ بھی حتی الامکان اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر اس کی سعی کریں کہ یہاں اگر کچھ کیا جائے تو کانگریسی لیڈر اس میں دست تعاون بڑھائیں گے۔

انگلستان میں حکومت کے بدل جانے سے لارڈ اِروِن کے مشن میں آسانی ہوئی مزدور حکومت کے سکریٹری آف اسٹیٹ وِج وڈ بین کو اِروِن ہی کی طرح یہ تشویش تھی کہ سائمن کمیشن کی تقرری کے بعد ہندوستان کی رائے عامہ سے بیگانگی کا جو سلسلہ چل پڑا تھا اس کا رُخ پلٹا جائے۔ بن نے اِروِن کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ لندن میں ہندوستانی اور برطانوی نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے جس میں آئینی مسائل پر بحث و مباحثہ ہو۔ انھوں نے اروِن کے اس خیال سے بھی اتفاق کیا کہ انعقادِ کانفرنس کے اعلان کے ساتھ یہ اعلان بھی ہو کہ برطانوی پالیسی کی منزلِ مقصود اب بھی یہی ہے کہ ہندوستان کو نو آبادیاتی حیثیت (ڈومی مین اسٹےٹس) دیا جائے۔ لبرل پارٹی کی دو دیوقامت ہستیوں یعنی لائڈ جارج اور لارڈ ریڈنگ نے اِروِن کی کچھ زیادہ ہمت افزائی نہیں کی۔ مزدور حکومت اپنی اکثریت کے لیے لبرل پارٹی کی حمایت کی محتاج تھی۔ اس کے باوجود سکریٹری آف اسٹیٹ خطرہ مول لینے کو تیار ہو گئے۔

لارڈ اِروِن 20/ اکتوبر 1929 کو ہندوستان واپس آئے۔ 31 اکتوبر 1929 کو حکومت ہند نے ایک ''غیر معمولی گزٹ'' جاری کیا۔ اس میں ایک ایسی کانفرنس کا اعلان کیا گیا جس میں شہنشاہِ اعظم کی حکومت برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں سے ملنے والی تھیں۔ اس

کا مقصد یہ تھا کہ جو تجویز آخری شکل میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی جانے والی تھیں ان پر حتی الامکان زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے ہو سکے۔ آگے چل کر اس اعلان میں کہا گیا تھا کہ ''1919 کے قانون کے بارے میں برطانیہ عظمی اور ہندوستان دونوں جگہ برطانوی حکومت کے ارادوں کے بارے میں شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کے پیشِ نظر مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ میں صاف صاف لفظوں میں ظاہر کر دوں کہ حکومت کے خیال میں 1917 کے اعلان میں یہ مفہوم پوشیدہ ہے کہ ہندوستان کی ترقی کا بنیادی نقطہ نوآبادیاتی حیثیت (ڈومی نین اسٹےٹس) کا حصول ہے۔''

وائسرائے کا اعلان بڑی چالاکی سے مرتب کیا گیا تھا جس سے یا تو بہت کچھ مطلب نکل سکتا تھا یا کچھ بھی نہیں لیکن ہندوستان میں اکثر اس کا خوشگوار استقبال ہوا۔ لارڈ اِروِن کے سوانح نگار کے لفظوں میں اعتدال پسند لیڈروں کو یہ کانفرنس اُن لوگوں کو اپنی دانش مندانہ صلاحیتوں کے بھرپور اظہار کا بہترین مرقع نظر آئی اور یہ اس وقت اِروِن کے وفادار حلیف بن گئے۔ ان کانگریسی لیڈروں کو جو مطلع کا اس نگاہ سے مشاہدہ کر رہے تھے کہ کہیں سے خودمختاری کی جانب پیش رفت کا اشارہ ملے اور حکومت سے ٹکراؤ روکا جا سکے۔ اس اعلان میں ''دلی تبدیلی'' کی علامتیں نظر آئیں۔ گاندھی موتی لال نہرو، پٹیل، تیج بہادر سپرو، اینی بسنٹ، جواہر لال نہرو وغیرہ کے دستخطوں سے ایک مشترکہ منشور (مینی فسٹو) جاری کیا گیا جس میں اس اعلان کی خلوص پر مبنی ہونیکی تعریف کی گئی ہے اور کانفرنس کی کامیابی کے لیے ضروری شرطوں کی نشاندہی کی گئی۔ ان میں شامل تھیں صلح پسندانہ پالیسی، سیاسی قیدیوں کی رہائی اور گول میز کانفرنس میں انڈین نیشنل کانگریس کی نمائندگی کا غالب عنصر۔ اعلان میں ''ڈومی نین اسٹےٹس (نوآبادیاتی حیثیت) والے پیراگراف کا مینی فسٹو سے یہ مطلب نکالا گیا کہ کانفرنس یہ طے کرنے کے لیے بلائی نہیں جا رہی ہے کہ کب نوآبادیاتی درجہ دیا جائے بلکہ اس کا مقصد ہندوستان کے لیے ایک نوآبادیاتی آئین مرتب کرنا ہے۔

اس طرح لارڈ اِرون کے اعلان کا ہندوستان میں اچھا استقبال ہوا لیکن انگلستان میں اِروِن اور مزدور حکومت پر ایک طوفان امنڈ پڑا۔ برطانوی پریس اور پارلیمنٹ اس اعلان کا کافی عرصے تک پوسٹ مارٹم کرتے رہے۔ لارڈ ریڈنگ نے جن کی رائے ایک سابق وائسرائے کی حیثیت سے پُر وزن مانی جاتی تھی، کہا کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے کہ سائمن کمیشن کی شان اور

اقتدار کو گھٹا دیا جائے۔ لبرل پارٹی کے لیڈر لائڈ جارج نے وِج وڈ بین پر کیچڑ اچھالی اور انہیں موسیٰ کا جیبی ایڈیشن کہا قدامت پرست پارٹی کے لیڈر بالڈون نے وائسرائے کی پالیسی کی سچ مچ کوئی حمایت نہیں کی حالاں کہ ارون انھیں کے پٹھو مانے جاتے تھے۔ سر جان سائمن اور ان کے ساتھیوں نے یہ محسوس کیا مزدور حکومت نے ان کے ساتھ بھدا سلوک کیا گیا اور ان کی رائے تک نہیں پوچھی۔ گول میز کانفرنس کے اعلان کے بعد ان کی رپورٹ صرف علمی دلچسپی کی چیز ہو کر رہ جائے گی[1] مزدور حکومت کی دارالعوام میں کھلی اکثریت نہیں تھی اس سے وہ مدافعانہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور ہوئی۔ وِج وڈ بین نے یہ صفائی دی کہ یہ اعلان مانٹیگو کے اگست 1917 کے اعلان کا ''اعادہ'' اور تشریح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ اس اعلان سے برطانیہ کی ہندوستانی پالیسی میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

برطانوی پارلیمنٹ کے مباحثوں سے ہندوستانی نمائندوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ وائسرائے کے اعلان نے حکومت اور قوم پرستوں کے درمیان جو پل بنا دیا تھا وہ دھڑام سے گر پڑا۔ اس منشور پر دستخط کرنے کے لیے جن میں وائسرائے کے اعلان کا خیر مقدم کیا گیا تھا، جواہر لال نہرو کو بڑی مشکل سے رضا مند کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے بعد ان کے باپ کے دل میں بھی وہی شبہات پیدا ہو گئے جو جواہر لال کو تھے۔ چند ہفتوں کے بعد کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ اگر اس دوران میں حکومت سے مصالحت نہ ہوئی تو کانگریس پہلے ہی سے مکمل آزادی کا اعلان اور غیر متشدد بغاوت کرنے کے لیے قول دے چکی تھی۔

کانگریس اور حکومت کے مابین مصالحت کرانے کے آخری لمحوں میں پھر کوشش کی گئی۔ اس کے خاص محرک وی جے پٹیل اور تیج بہادر سپرو تھے۔ 13/نومبر 1929 کو پٹیل نے سپرو کو لکھا کہ ''ایک طرف وائسرائے اور دوسری طرف کانگریسی لیڈروں پر دباؤ ڈالنے کے لیے ہمیں کوشش کرتے رہنا چاہیے[2]'' وائسرائے اور کانگریسی لیڈروں کے مابین ایک ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ موتی لال نہرو مہینوں سے امید کے برعکس امید کرتے چلے آ رہے تھے کہ حکومت کی جانب سے کوئی

(1) سائمن واری کانٹ، ص: 151

(2) جی آئی پٹیل: وٹھل بھائی پٹیل، ج: 2 بمبئی 190ء ص: 1071

پرخلوص اقدام ہوگا لیکن اب طوفان کا انداز مایوسانہ تھا۔ 9 دسمبر کو انھوں نے وی جے پٹیل کو لکھا کہ ''کیا آپ کو امید ہے کہ جناح، سپرو، گاندھی، میں اور آپ جب وائسرائے سے ملیں گے تو ایک ہی طریقے پر سوچتے ہوں گے۔ مسٹر جناح کے دِل سِنی نقطۂ نگاہ کو دیکھتے ہوئے جو دلّی کانفرنس کے چودہ نکات پر اڑے ہوئے ہیں اور جنھیں نو آبادیاتی درجہ پر بھی اعتقاد نہیں ہے۔ بلکہ اپنے مطالبات میں ہی جو کچھ بھی ملے اسے لینے پر رضامند ہیں۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ گاندھی اور میں جو نو آبادیاتی حیثیت کو بھی ملک کے امن وامان کی خاطر مان لینے کو تیار ہیں، مسٹر جناح ہی کی طرح سوچتے ہیں۔ اس ملاقات سے مجھے کسی نتیجے کی امید نہیں ہے لیکن مجھے اپنا وعدہ وفا ہی کرنا ہے...... فی الحال تو ہر راہ لاہور ہی کو جاتی ہے۔''

23 دسمبر کو یہ ملاقات ہوئی۔ اسی صبح کو لارڈ ارون جنوبی ہند کے دورے سے واپس آئے تھے اور جیسے ہی وہ دارالسلطنت میں داخل ہوئے وائسرائے کی ریل گاڑی کے نیچے ایک بم پھٹا گاندھی نے وائسرائے کے اس کراماتی طور پر بچ جانے پر انھیں مبارک باد دی لیکن سیاسی سطح پر زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی۔ برطانوی پارلیمنٹ کے حالیہ بحث مباحثے سے وائسرائے مدھم پڑ چکے تھے اور وہ اس کی یقین دہانی نہ کر سکے کہ گول میز کانفرنس میں نو آبادیاتی درجہ پر مبنی اصلاحات کی اسکیم پر ضرور غور ہوگا۔

ملاقات یکا یک ختم ہوگئی۔ وی جے پٹیل جنھوں نے اس ملاقات کا انتظام کیا تھا اور سپرو اور جناح نے اس سے بڑی آس لگا رکھی تھی۔ انھیں گاندھی اور موتی لال نہرو کے طرزِ فکر میں ہفتے پہلے ہی مشترکہ منشور پر دستخط کرنے کے بعد ایک نئی سخت گیری دیکھ کر تعجب ہوا۔ وائسرائے کو ذاتی طور پر اپنے ساتھ کی گئی زیادتی کا احساس ہوا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ دسمبر کے آخری ہفتے میں مہاتما اور موتی لال نہرو کی مزاجی کیفیت ویسی نہیں رہ گئی تھی جیسی نومبر کے پہلے ہفتے میں تھی۔ اس کے واضح اسباب تھے لیکن اس وقت وی، جے پٹیل بھی ان کو مناسب نہیں سمجھ رہے تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے مباحثے سے کانگریسی لیڈروں کی آنکھیں کھل گئیں تھیں۔ حالات نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو اس پر مجبور کر دیا تھا کہ وائسرائے سے جس بات کو ہندوستان میں بڑھا چڑھا رہے تھے اسے وہ برطانیہ میں گھٹا کے دکھائیں ایسی صورت میں ہندوستانی لیڈروں پر الزام عائد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ

وہ حکومت کے اس اعلان کو اس کی ظاہری قیمت پر پرکھیں۔

اس ناکام ملاقات کے ایک ہفتے بعد انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہونے والا تھا۔ کلکتہ کانگریس نے دسمبر 1928 میں برطانوی حکومت کو جو سال بھر کی مہلت دی تھی وہ ختم ہو رہی تھی۔ کانگریس یہ عہد کر چکی تھی کہ اگر برطانیہ نوآبادیاتی درجہ منظور نہیں کرتا وہ مکمل آزادی کا اعلان کر دے گی۔ کانگریس لیڈروں نے وائسرائے سے یہ خواہش کی تھی کہ وہ اس سمت کی مبہم نشاندہی کی بجائے جدھر برطانوی پالیسی جانے والی تھی کچھ اور (واضح بات) کہیں تاکہ وہ اپنی پارٹی کو یہ یقین دلا سکیں کہ ہندوستان کا خود مختاری کی طرف کافی آگے بڑھنا یقینی ہے۔ لارڈ اِرون کا یہ کہنا کہ ٹھیک کہا جا سکتا ہے کہ منزل کا ادّعا لازمی طور پر منزل کے حصول سے مختلف ہوتا ہے،'' لیکن ایسے طریقے فکر سے آنے والے اجلاس میں گاندھی اور موتی لال نہرو کو یہ مدد نہیں مل سکتی کہ وہ پارٹی کے عام ممبروں کو اپنا ہم خیال بنا سکیں۔ یہ دلیل کہ اصل مسئلے پر پہلے سے اثر ڈالنا ممکن نہیں ہے یا یہ کہ اس سے برطانوی پارلیمنٹ کی آئینی ذمہ داری میں مداخلت ہوتی ان حضرات کو مطمئن نہ کر سکی۔ کیا مختلف مواقع پر برطانوی کابینہ نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ پارلیمنٹ کا فیصلہ بھائے گا اپنے کو مخصوص پالیسیوں کا پابند نہیں بنا لیا تھا؟ سیدھی بات یہ ہے کہ مزدور حکومت میں نہ تو ہمت رہ گئی تھی اور نہ غالباً اعتقاد کہ وہ سامراجی ڈھانچے کو توڑ کر ایک خود مختار مقبوضہ قائم کر دیں۔

وی جی پٹیل کے نام میں یہ خط لکھ کر کہ ''سب راہیں لاہور کو جاتی ہیں'' موتی لال نہرو کے 1929 کے خاتمے کی سیاسی صورت کو مناسب لفظی جامہ پہنا دیا تھا۔ لاہور کا اہم اجلاس ہونے جا رہا تھا جسے گاندھی چلا سکتے تھے۔ یہ تقریباً ظاہر تھا کہ مہاتما کو کانگریس کا صدر منتخب کر لیا جائے گا۔ لیکن انھوں نے یہ اعزاز قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ کانگریس کے روزمرّہ کے کاموں کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ اور بہرحال وہ کوئی عہدہ سنبھالے بغیر بھی پہلے کی طرح کانگریس کی خدمت کرتے رہیں گے۔ ان کے مشورے پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جواہر لال نہرو کو صدر منتخب کیا۔ اس طرح خود جواہر لال نہرو کے لفظوں میں، وہ اس بڑے منصب پر ''صدر دروازے سے نہیں بغلی دروازے سے بھی نہیں بلکہ فرشی دروازے سے داخل ہوئے۔

سیاسی اعتبار سے جواہر لال نہرو کا انتخاب مہاتما کا ماہرانہ وار تھا۔ سال ہی بھر پہلے کلکتہ کانگریس میں چڑ چڑے بڑھاپے اور نوجوانی کے درمیان ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ نوجوان پرانے محافظوں کے فرسودہ اور دقیانوسی خیالات کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ گاندھی نے بڑی ہوشیاری سے ایک سمجھوتہ کرا دیا ورنہ پھوٹ پڑ جاتی۔ کانگریس میں جو نئی امید اور طاقت نفوذ کر چکی تھی اس کے پیش نظر سربراہی کے لیے ایک نوجوان ہی کی ضرورت تھی بیالیس سالہ جواہر لال جن کی گاندھی نے تصویر کشی بلور کی طرح صاف............شک وشبہ سے بلند حق گو......بے مثال اور بے عیب کردار جیسے لفظوں میں کی تھی۔ مناسب وقت پر پہنچ کر مہاتما گاندھی کے سیاسی وارث بننے والے تھے۔ عمر میں بیس برسوں کے فرق اور مختلف ذہنی منظر کے باوجود جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتے تھے، دونوں میں بڑی گہری یگانگت تھی۔ 1927 کے آخر میں یورپ سے واپسی کے بعد جواہر لال کی بعض سرگرمیوں سے گاندھی جی خوش نہیں تھے۔ انھوں نے ان (جواہر) کو 1928 کے آغاز میں لکھا کہ تم بہت تیز جا رہے ہو اور سوچنے اور آب و ہوا سے مانوس ہونے میں تمھیں تھوڑا وقت لگانا چاہیے تھا۔'' کچھ دنوں بعد انھوں نے اقرار کیا کہ تم میں اور مجھ میں اتنے وسیع اور اتنے اساسی اختلافات ہیں کہ ہم دونوں کے مابین کوئی نقطۂ اتصال معلوم ہی نہیں ہوتا۔'' یہ ذہنی خلیج وقتاً فوقتاً چوڑی یا پتلی ہوتی رہی پٹ تو شاید کبھی نہیں لیکن اس سے ان کی جذباتی ہم آہنگی اور باہمی وفاداری پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

دسمبر 1929 میں واقعات کی پیش قدمی جاری رہی۔ جدوجہد کا وعدہ پیش نظر تھا اس لیے جواہر لال کے لیے فضا موافق مزاج تھی۔

باب33

سوِل نافرمانی

انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس پنجاب میں ٹھیک دس برس بعد ہو رہا تھا۔ امرتسر کانگریس 1919 میں ہوئی تھی۔ 1919 میں عدم تعاون کی تحریک اس کے پیچھے پیچھے آئی کیا تاریخ اپنے کو دہرانے جارہی تھی؟ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ لاہور کا اجلاس بڑا اہتم بالشان اجلاس ہونے جارہا تھا۔ کلکتہ کانگریس نے جو ''مہلت کا سال'' دیا تھا وہ ختم تھا۔ نوآبادیاتی حیثیت کا حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ کم سے کم قومی مطالبے کی پیش کش جو ''نہرو رپورٹ'' کے ذریعے کی گئی تھی اس کی میعاد ختم تھی۔ اب سے سوراج کا مفہوم ''مکمل آزادی'' ہوگا۔ 31 دسمبر 1929 کو آدھی رات کے وقت جب نیا سال شروع ہوا تو انڈین نیشنل کانگریس نے راوی کے کنارے آزادی کا جھنڈا لہرا دیا۔ کانگریس نے مرکزی اور صوبائی قانون ساز مجالس کے ممبروں سے کہا کہ وہ اپنی نشستوں سے استعفیٰ دے دیں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اس کا اختیار دیا کہ وہ سوِل نافرمانی کی مہم شروع کردے۔

اس کانگریس اجلاس کی اہمیت سے حکومت ناواقف نہیں تھی۔ لارڈ ارون کے سوانح نگار ایلن کیمپ بل جانسن کے قول کے مطابق وائسرائے نے اس اجلاس پر باضابطہ پابندی لگانے کے بارے میں غور کیا تھا۔ جنوری کے شروع میں حکومت پنجاب نے حکومت ہند کو لکھا تھا کہ اس کے قانونی مشیروں کی رائے میں جواہر لال نہرو اور سیف الدین کچلو پر ان تقریروں کی بنا پر مقدمہ

چلایا جانا چاہیے جوانہوں نے علیٰ الترتیب لاہور کانگریس کے نامزد صدر اور مجلس استقبالیہ کے چیر مین کی حیثیت سے کی تھیں۔ چونکہ واقعات بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے اس لیے مشورہ قبول نہیں کیا گیا۔

اجلاس لاہور کے فوراً بعد کانگریس کی پوزیشن کا جائزہ لیتے ہوئے وائسرائے نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لاہور کے حالیہ جلسے نے ملک کی صورت حال پر جو نمایاں اثر ڈالا تھا اس سے مطلع کرتے ہوئے لکھا کہ آثار ایسے ہیں کہ لاہور کانگریس ہی کانگریس کے ان دونوں بازووں کے مابین رسہ کشی کا منظر پھر دیکھنے میں آئے گا جو کلکتہ میں ایک سال پہلے ٹکرا چکے تھے اور بعد میں ان سے صلح ہو گئی تھی۔ لاہور میں اس ٹکراؤ سے اس طرح بچا گیا کہ گاندھی اور موتی لال نہرو نے کانگریس کے بائیں بازو کے سامنے جن میں انقلاب پسند اور کٹر پنتھی شامل تھے، ہتھیار ڈال دیے خیال تھا کہ اب یہی (بازو) کانگریس کی قوت متحرکہ ہوگی۔ اگرچہ قانون ساز مجالس کے بائیکاٹ کے فیصلے سے اب بھی پھوٹ پڑنے کا امکان تھا۔ لیکن وائسرائے کی رائے میں بحیثیت مجموعی کانگریس نے آزادی کا رزولیوشن پاس کر کے اس کا اعلان کر دیا تھا کہ وہ ایک ایسی جماعت ہے جو ایک ناجائز مقصد کو غیر قانونی اور غیر آئینی طریقوں سے حاصل کرنا چاہتی ہے'' وجؤڈ بین نے صورتِ حال کا اعتراف کرتے ہوئے کہ وائسرائے جو'' مضبوط انتظامی اقدام'' کریں گے اس میں ان کی حمایت کی جائے گی، چاہے بعض حلقوں میں اس پر اعتراض ہی کیوں نہ جائے۔ وہ ان اعتراضات سے نپٹنے کو تیار تھے لیکن اگر غیر معمولی اختیارات کا استعمال کرنا ہی پڑے تو ان (سکریٹری آف اسٹیٹ) سے پہلے مشورہ کر لیا جائے گا۔ بحرانی حالات میں وائسرائے اقدام کرنے کے بعد اطلاع دینے کے مجاز تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ لاہور اجلاس کے فیصلوں پر عمل پیرا ہونے میں، کانگریس گاندھی کے زیر قیادت کام کرے گی۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں پھر وہی کھلی بے باکی آ گئی جو دس برس پہلے نظر آئی تھی۔ انہوں نے لکھا کہ عوام کو یہ حق ہے کہ وہ بے انصاف حکومت میں تبدیلی کر دیں یا اسے بالکل ختم کر دیں۔ اگر عدم تشدد کا موحول بنا رہا تو انہوں نے سِول نافرمانی کی تحریک کی قیادت کا وعدہ کیا۔ عوامی تحریکوں میں خطرات مضمر تے ہیں وہ ان سے آگاہ تھے۔ لیکن

کانگریسیوں کو بھی چوری چورا کا سبق یاد تھا اس کے ساتھ گاندھی نے یہ بتا دیا تھا کہ تحریک شروع کر دینے کے بعد پسپائی آسان نہ ہوگی۔ اگر چہ اس کی پوری کوشش کی جائے کہ تشدد پر روک رہے لیکن جب تک ایک بھی ستیہ گرہی آزاد یا زندہ رہے گا سوِل نافرمانی جاری رہے گی۔ 22۔1920 میں گاندھی نے پھونک پھونک کر قدم رکھا تھا۔ ملک کو آمادہ کرنے میں کافی وقت صرف کیا تھا۔ عدم تعاون کے پروگرام کو تدریجی حصوں میں بانٹ دیا تھا اور عام سوِل نافرمانی شروع کرنے سے عام طور سے عدم آمادگی ظاہر کی تھی۔ 1930 میں انہوں نے زیادہ تیز اور مضبوطی سے قدم بڑھائے ایسا لگتا تھا جیسے ان کی پچھلی دہائی کی محنت ضائع نہیں ہوئی تھی اور جہاں سے انہوں نے 1922 میں چھوڑا تھا وہیں سے پھر رشتہ جوڑ رہے تھے۔ انہوں نے لکھا کہ 1920 کی پکار، تیاری تھی۔ 1930 کی پکار آخری ٹکرّ میں جٹ جانے کی للکار تھی۔

گاندھی لڑائی کے لیے اتاولے نہیں ہو رہے تھے۔ ستیہ گرہ میں لڑائی آخری قدم ہوتا ہے جو اس وقت اٹھایا جاتا ہے جب تمام ذرائع استعمال ہو چکیں۔ 30۔ جنوری 1930 کے ''ینگ انڈیا'' میں انہوں نے وائسرائے کو ایک ''گیارہ نکات'' میں لگان کی کمی، نمک ٹیکس کا خاتمہ، فوجی اور سوِل اخراجات کی کمی، سیاسی قیدیوں کی رہائی اور بدیسی کپڑے پر محصول عائد کرنا شامل تھے۔ حکام کی نظر میں یہ گیارہ نکات کسانوں، صنعتی مزدوروں پیشہ وروں اور تجارت پیشہ افراد کو پھنسانے کے لیے ایک بڑا جال تھا۔ گاندھی کے اپنے ساتھیوں کی نگاہ میں آزادی کے اعلان کے ایک ہی مہینے بعد، یہ تجویز رجعتِ قہقری تھی۔ گاندھی کو یہ خوب معلوم تھا کہ ان گیارہ نکات کو سامنے لانے سے سیاسی آزادی کا تصور نہیں ابھرے گا لیکن ان کی فہرست تیار کر کے وہ ایک ایسے قابل عمل امتحان کا بہانہ بنا رہے تھے جس سے حکومت کی جانب سے اختیارات چھوڑنے پر آمادگی پرکھی جا سکے۔ لیکن حکومت کے لیے یہ گیارہ نکات اتنے بلند آہنگ اور غیر حقیقت پسندانہ تھے کہ اس نے ان کا نوٹس بھی نہیں لیا۔

اب کانگریس اور حکومت کے مابین جنگ ناگزیر ہو گئی تھی۔ 1930 میں گاندھی نے ٹیگور کو بتایا کہ ''دن رات'' بڑی شوریدہ سری کے ساتھ سوچ رہا ہوں۔ انہوں نے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ 26 جنوری کو یوم آزادی منائے جانے کا اعلان کر دیا۔ اس دن ہندوستان کے

دیہاتوں اور قصبوں میں لاکھوں انسانوں نے یہ قسم کھائی '' حکومت برطانیہ کے آگے سر جھکانا خدا اور انسان کے خلاف ایک جرم ہے'' اور یہ وعدہ کیا کہ اگر کانگریس سوِل نافرمانی اور عدم ادائیگی ٹیکس کی تحریک چلائے گی تو وہ اس میں شامل ہوں گے۔ یوم آزادی سے ملک کے پوشیدہ جوش وخروش کا حال کھلا۔ گاندھی کو محسوس ہو گیا کہ ملک عوامی تحریک چلانے کو بالکل تیار ہے۔ انہوں نے تجویز رکھی کہ نمک کا قانون توڑ کر تحریک کا افتتاح کیا جائے۔ نمک ٹیکس کا بوجھ اگرچہ نسبتاً کم تھا لیکن اس کا اثر ملک کے غریب ترین طبقے پر پڑتا تھا۔ پھر بھی قومی آزادی کی جدوجہد کے منصوبے میں نمک کچھ ٹھیک سے چسپاں نہیں ہو رہا تھا۔ نمک صرف سمندری ساحلوں یا نمک کی کانوں میں بنایا جاتا تھا۔ اگر کسی طرح سے اس صنعت میں لگے ہوئے اور سیاسی طور سے پسماندہ مزدوروں کی ہڑتال کرا بھی دی جاتی تو کامیاب طور سے ستیہ گرہ تحریک چلانے کے امکانات کچھ بہت زیادہ روشن نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے شکوک گاندھی کے قریب ترین پیرووں کے دل ودماغ پر بھی مسلط تھے اگرچہ وہ گاندھی کی ہدایتوں کے مطابق کام کرتے جا رہے تھے۔

گاندھی نے اعلان کیا کہ وہ سوِل نافرمانی کا پہلا اقدام خود ستیہ گرہیوں کے ایک گروہ کی قیادت کرتے ہوئے سمندر کے کنارے جا کر اور نمک کا قانون توڑ کر کریں گے۔ انہوں نے ایک خط کے ذریعے وائسرائے کو اپنے منصوبے سے مطلع کیا۔ یہ خط برطانوی حکومت کے خلاف فردِ جُرم بھی تھا اور اس کی اپیل بھی کہ ہندوستان کو اس کا حق دیا جائے۔

'' پیارے دوست! سوِل نافرمانی کا آغاز کرنے اور اس خطرے کو مول لینے کے پہلے جس سے میں کئی برس سے خائف تھا، میں بخوشی آپ کو متوجہ کرانا اور اس مسئلے کا حل نکالنا چاہوں گا۔ میرا ذاتی عقیدہ بالکل واضح ہے۔ میں جان بوجھ کر کسی بھی جاندار کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ اپنے ہم جنس انسانوں کا تو ذکر ہی کیا۔ چاہے وہ میرے ساتھ یا میرے متعلقین کے ساتھ بڑی سے بڑی بے انصافی کیوں نہ کریں اس لیے اگرچہ میں برطانوی حکومت کو لعنت سمجھتا ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی انگریز کو یا ہندوستان میں واقع اس کے کسی جائز مفاد کو کوئی نقصان پہنچے۔

'' مجھے غلط نہ سمجھا جائے اگرچہ میں برطانوی حکومت کو ہندوستان کے لیے ایک لعنت سمجھتا ہوں لیکن عام انگریزوں کو میں روئے زمین کے دوسرے لوگوں سے ہرگز بُرا نہیں سمجھتا۔

مجھے یہ فخر ہے کہ کئی انگریز میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ برطانوی حکومت کی برائیوں کے بارے میں مجھے زیادہ باتیں ان بے باک اور باہمت انگریزوں کی تحریروں سے معلوم ہوئی ہیں جنہوں نے اس حکومت کے بارے میں ناخوشگوار حقائق بیان کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔

اپنے بہت سے ہم وطنوں کی طرح میں نے بھی یہ امید سینے سے لگا رکھی تھی کہ مجوزہ گول میز کانفرنس شاید ہندوستان کی آزادی کا کوئی حل نکال سکے..... لیکن جب آپ نے یہ صاف صاف کہہ دیا کہ آپ یا برطانوی کابینہ اس طرح کی کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکتی کہ مکمل ڈومی نین اسٹیٹس (نوآبادیاتی حیثیت) کی کسی اسکیم کی حمایت کرے گی، تو گول میز کانفرنس وہ حل مہیا نہیں کر سکتی تھی جس کے لیے باز بان ہندوستانی شعوری طور پر اور بے زبان کروڑوں انسان پیاسے ہیں۔

''......اگر ہندوستان کو ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے اور اگر فاقہ کشی کی بدولت آنے والی سست رفتار موت کو روکنا ہے تو فوری افاقے کے لیے کوئی نہ کوئی علاج تو کرنا ہی ہوگا۔ مجوزہ کانفرنس یقیناً اس کا علاج نہیں ہے۔ یہ دلائل سے بات منوانے کا معاملہ نہیں ہے، معاملے کا لب لباب یہ ہے کہ طاقتوں کو متوازن کیا جائے۔ بات مانی جائے یا نہ مانی جائے۔ برطانیہ عظمی اپنی برطانوی تجاوت اور مفادات کو پوری طاقت لگا کر بچائے گا۔ اس لیے لازماً ہندوستان کو ایسی (غیر متشدد) طاقت پیدا کرنا ہوگی کہ وہ خود کو موت کی ہم آغوشی سے بچا سکے......

میں جانتا ہوں کہ عدم تشدد کا آغاز کر کے، وہ خطرہ مول رہا ہوں جسے لوگ مجنونانہ کہہ سکتے ہیں لیکن حق کے فتوحات خطرات کے بغیر حاصل نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات یہ خطرے سنگین ترین نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس قوم کے عقیدے کی تبدیلی کے لیے جو کسی ایسی دوسری قوم کا شعوری یا غیر شعوری طور پر شکار کرتی چلی آئی ہے جو اس سے تعداد میں کہیں زیادہ ہے، کہیں زیادہ قدیم ہے اور اس سے کم تہذیب یافتہ نہیں ہے۔ کوئی بھی خطرہ مول لیا جا سکتا ہے۔

''میں نے تبدیلی عقیدہ کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ میرا مدعائے حقیقی اس کے سوا نہیں ہے کہ عدم تشدد کے ذریعے برطانوی عوام کا عقیدہ تبدیل کروں اور انھیں اس سچائی کے سمجھنے

پر مجبور کروں کہ انھوں نے ہندوستان کے ساتھ کیا کیا بے انصافیاں کی ہیں۔ میں آپ کے عوام کا نقصان نہیں چاہتا میں جس طرح اپنے عوام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں اسی طرح ان کی بھی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ میں نے ہمیشہ ان کی خدمت کی ہے۔ 1919ء تک تو میں ان کی خدمت آنکھیں بند کر کے کرتا رہا لیکن جب میری آنکھیں کھل گئیں اور میں نے عدم تعاون کی بات سوچی تب بھی میرا مقصد ان کی خدمت ہی تھا۔ میں نے ان کے خلاف وہی ہتھیار استعمال کیا جو میں پوری فروتنی سے اپنے خانوادے کے عزیز ترین اراکین کے خلاف کامیابی سے استعمال کرتا رہا ہوں۔ اگر مجھے آپ کے اور اپنے عوام سے یکساں محبت ہے تو یہ زیادہ دنوں تک چھپی نہیں رہ سکتی۔ وہ اس کا اس طرح اعتراف کریں گے جیسے میرے اپنے خاندان کے افراد نے کئی برس تک میرا امتحان لینے کے بعد اعتراف کیا۔ اگر لوگ میرے کام میں شریک ہوتے ہیں، جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ ہوں گے تو اگر برطانوی حکومت نے اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے، وہ (ہندی عوام) جتنی سختیاں برداشت کریں گے اس سے سخت پتھر کے دل بھی پگھل جائیں گے۔''

وائسرائے کا جواب مختصر تھا۔ اس میں اس پر اظہارِ افسوس کیا گیا تھا کہ ''گاندھی ایسا طریق کار اپنانے جا رہے ہیں جو واضح اور لازمی طور سے قانون شکنی اور امن عامہ کے لیے خطرہ ثابت ہوگا۔''

گاندھی نے ستیہ گرہیوں کے جس پہلے جتھے کی قیادت سنبھالی وہ احمد آباد سے سمندر کے کنارے واقع ڈانڈی جانے والا تھا۔ ستیہ گرہیوں کا انتخاب ان سابرمتی آشرم والوں میں سے کیا گیا جو اس وقت ایک آشرم واسی کے بقول جسمانی طاقت اور روحانی قوت کے انتہائی نقطۂ عروج کو پہنچے ہوئے تھے۔ سابرمتی اب وہی رول ادا کرنے جا رہا تھا جو جنوبی افریقہ میں فی نکس اور ٹالسٹائی آشرم نے ادا کیا تھا۔ یہ سیاسی سرگرمیوں کا محور اور آزادی کے ہراول دستے کی بھرتی کا محور بن گیا۔ سرگرمیوں میں کوئی چھپانے کی بات نہیں تھیں۔ رچرڈ گرگ نے یہ تحریری شہادت دی ہے کہ ایک برطانوی اخبار کے نمائندہ کو احمد آباد اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ وہ ''دشمن کے کیمپ'' میں جا کر وہاں کی کارروائیوں کی رپورٹ لکھے تو وہاں سے بھگائے جانے کے بجائے گاندھی کے اشارے پر اسے سابرمتی آشرم میں جگہ دی گئی۔ وہ مہمان کی طرح ٹھہرایا گیا اور اس کو پورا موقع دیا گیا کہ وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ سکے۔

11/مارچ کی پرارتھنا سبھا میں اتنا مجمع تھا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔گاندھی نے کہا''ہمارا دعویٰ مضبوط ہے، ہمارے ذرائع صالح ترین ہیں اور خدا ہمارے ساتھ ہے سوائے اس صورت کے کہ وہ سچ کا راستہ ترک کر دیں ستیہ گرہیوں کو شکست ہو ہی نہیں سکتی۔ میں اس جنگ کے لیے دعا کرتا ہوں جو کل شروع ہونے والی ہے۔''اس رات کو آشرم میں مہاتما واحد شخص تھے جو سو پائے۔ دوسرے دن ساڑھے چھ بجے سویرے ساحل سمندر پر واقع ڈانڈی کی طرف 241 میل لمبا مارچ شروع ہوا۔اناسی ستیہ گرہیوں میں علماء اخبارات کے مدیر ہریجن اور کپڑا بننے والے سب شامل تھے۔سب سے ضعیف 61 سال کا لیڈر تھا اور سب سے چھوٹا ایک سولہ سالہ کا لڑکا۔احمد آباد کے ہزاروں لوگ ان لوگوں کو مرحبا کہنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔سڑکوں پر ہری پتیاں بچھ گئی تھیں۔ رضا کاروں کے اس جتھے کے سب سے معمر رکن گاندھی اتنے تیز چلتے تھے کہ ان سے کم سن ارکان کو ان کے ساتھ ساتھ چلنا مشکل ہو رہا تھا۔اس ورزش سے ان کی طبیعت بشاش تھی۔ وہ حسب معمول چار بجے صبح کو سو کر اٹھتے۔صبح کی پرارتھنا کراتے، جن گاؤں سے گذرتے وہاں جلسوں کو خطاب کرتے۔سوت کاتنے کا روزانہ کوٹا پورا کرتے، اپنے جرائد کے لیے مضامین لکھتے اور اپنے مکتوب الیہم کو خطوط لکھتے انھوں نے اعلان کیا کہ جب تک نمک کا قانون مسترد نہیں کر دیا جاتا وہ سابرمتی آشرم کو واپس نہیں جائیں گے۔

اس دوران میں حکام اس تحریک کا تشویش اور استعجاب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ مشاہدہ کر رہے تھے۔ برطانیہ کا یہ ارادہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنی ہندوستانی سلطنت کا کاروبار ختم کر دیں۔ ہندوستان کے انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ ازل رسل نے کانگریس کے مکمل آزادی کے مطالبے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔''اسے ہندوستانیوں سے زیادہ بہتر کوئی نہیں جانتا کہ مکمل آزادی کی بات کرنا کتنی بڑی بے وقوفی ہے نوآبادیاتی درجہ اس وقت ممکن نہیں ہے اور کافی دنوں تک ممکن نہ ہوگا۔''

جب لارڈ اِروِن نے یہ کہا تھا کہ منزل مقصود کا ادّعا اور اس کا حصول ایک ہی چیز نہیں ہے تو انھوں نے بھی گویا یہی رائے دی تھی۔جس دن سے کانگریس کا اجلاس لاہور ختم ہوا اسی دن سے حکومت برابر اس بات پر غور کر رہی تھی کہ کانگریس کے بارے میں کیا رویہ اپنایا جائے۔جنوری کے

شروع میں حکومت پر صوبائی حکومتوں سے اس پیچیدہ صورتِ حال کی وضاحت کی۔ اگر وہ جلسے یا جلوسوں کی ممانعت کرتی ہے تو ممکن ہے کہ جسمانی ٹکراؤ کی نوبت آجائے اور اس سے عوام کے جذبات اور زیادہ تلخ و ترش ہو جائیں۔ اس کا بھی امکان تھا کہ ایسے ممانعتی احکام سے کانگریس کو منہ مانگی مراد، یعنی احکام کی خلاف ورزی کے مواقع مل جائیں۔ اس کے برعکس حکومت اگر کوئی کارروائی نہ کرے تو اس سے کانگریس کے وقار میں اضافہ ہوگا اور آئین دوست اور وفادار عناصر اور زیادہ ہمت ہار بیٹھیں گے۔ ان ضدین کے درمیان راستے کے طور پر، حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ کانگریس کی جانب سرکاری پالیسی میں کوئی ''ڈرامائی تبدیلی'' نہیں ہوگی نیز یہ کہ حکومت جو انسدادی کارروائی کرے وہ فوری ضروریات کی حد سے نہ بڑھنے پائے۔ یہی سوچا سمجھا اعتدال اس ضبط و احتیاط کا سبب تھا جس کا مظاہرہ حکومت نے 26؍جنوری 1930 کے تقریبات یومِ آزادی کے موقع پر اور نمک ستیہ گرہ کی ابتدائی منزلوں میں کیا۔

حکومت اور کانگریسی دانشور دونوں کے یہاں سب سے پہلا جذبہ جو ابھرا وہ یہ تھا کہ ''سیاسی انقلاب کی اس طفل مکتبی منزل'' کا تمسخر کیا جائے اور اس خیال کا مذاق اڑایا جائے کہ سمندر کے پانی کو کیتلی میں ابال کے شہنشاہِ وقت کو تخت سے اتارا جا سکتا ہے۔ حکومت کے ماہرین نے نمک قانون کی خلاف ورزی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ سنٹرل بورڈ آف ریونیو نمک ٹیکس کا کام دیکھتا تھا۔ اس بورڈ کے ممبر ٹاٹن ہم نے نمک قانون کی خلاف ورزی کو ''مسٹر گاندھی کا ایک طرح کا شیخ چلی جیسا منصوبہ قرار دیا۔ اوائل فروری میں دو اعلیٰ افسروں کی ایک کمیٹی نے یہ رپورٹ پیش کی عدم ادائیگی ٹیکس کی مہم چلانے کے لیے نمک کا میدان بہت امید افزا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ گھٹیا قسم کے نمک کی تھوڑی سی مقدار بعض علاقوں میں خال خال بنائی جائے گی اور مقامی طور پر استعمال کر لی جائے گی اس سے نہ تو سرکاری مالیات پر کوئی اثر پڑے گا اور نہ نمک کی قیمتوں پر۔

گاندھی کا راستہ جن ضلعوں سے ہو کر گذرتا تھا ان میں سے ایک یعنی کیرا کا کلکٹر گاندھی کے مارچ سے اتنا خائف تھا کہ اس نے حکومت بمبئی کو خط لکھا کہ ''اس مارچ پر پابندی لگا دی جائے۔'' حکومت بمبئی نے حکومت ہند کو لکھا کہ ''جب تک یہ مارچ پُر امن طریقے پر جاری رہتا ہے اس

وقت تک ایسا کوئی قانون نہیں جس کے تحت اس پر پابندی لگائی جا سکے۔ حکومت ہند نے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا کہ اگر گرفتاری کی منزل تب آئے گی جب معاملہ الفاظ کے دائرے سے نکل کر عمل کے دائرہ کار میں داخل ہو جائے گا۔ قانون تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۱۷ میں جب کے تحت گرفتاری کا مشورہ دیا گیا تھا، ضمانت دی جا سکتی تھی۔ اس لیے گاندھی ضمانت پر رہا ہونا چاہیں گے تو وہ گاندھی کو یاترا جاری رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ حکومت بمبئی اور حکومت ہند سے کوئی بھی اس امکان سے صرف نظر نہیں کر سکتی تھی کہ گاندھی کی یاترا ہی ٹائیں ٹائیں فش ہو جائے۔ اگر وہ نمکین مٹی جو گاندھی کے ساتھی سمندر سے اٹھالائیں گے ساحل پر آتے ہی ضبط کر لی جائے لیکن کوئی گرفتار نہ کیا جائے تو کیا گاندھی کا عمل مضحکہ خیز نظر نہ آئے گا؟ اس لیے حکومت ہند کو عقلمندی کی راہ یہی معلوم ہوئی کہ واقعات کا انتظار کیا جائے اور کارروائی تبھی کی جائے جب یاترا کے نتائج واضح ہو جائیں۔ جن جن ضلعوں سے گاندھی مارچ کرتے ہوئے گذرنے والے تھے وہاں کے مجسٹریٹوں کو یہ ہدایت کی گئی وہ نئی دلّی اور بمبئی دونوں کو تار کے ذریعے روزانہ رپورٹ ساتھ ساتھ بھیجتے رہیں تاکہ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کی پالیسی بنانے والے سیاسی صورتِ حال کی ضروریات کے مطابق سرکاری پالیسی میں ردّ و بدل کر سکیں۔

شروع شروع میں مقامی حکام میں یاترا کے اثرات کو کم کر کے دکھانے کا رجحان تھا اور یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ احمد آباد کے ضلع مجسٹریٹ نے پہلے تین دنوں کے بارے میں جو رپورٹ بھیجی اس میں لکھا تھا کہ اگرچہ گاندھی کے لیے لوگوں کے دلوں میں اتنا ہی تعظیم واحترام کے جذبات بیدار ہوتے ہیں لیکن احمد آباد کے سوا اور جگہوں میں مجمع نہیں ہوئے ایک گاؤں میں ان کا استقبال بے حد معمولی تھا۔ ستیہ گرہیوں کے استقبال کا انحصار گاؤں کے مکھیا کے اثر اور طرزِ خیال پر تھا۔ بمبئی حکومت نے یہ رپورٹ بھیجی کہ بھڑوچ ضلع کے لوگوں نے اس معاملہ میں واقعی دلچسپی کی بنا پر نہیں بلکہ عجوبے پن کی وجہ سے جلسوں میں شرکت کی اور یہ کہ مارچ کا اثر ناپائدار ہوگا۔ بعد میں سورت میں گاندھی کے قیام کے بارے میں رپورٹ بھیجتے ہوئے بمبئی حکومت نے اپنی رپورٹ میں بڑی مسرت سے لکھا تھا کہ مسلمان جن کی بڑی تعداد یہاں آباد تھی بالکل ہی غائب تھے۔

حکومت ہند نے بمبئی کی حکومت کو لکھا کہ ضلع کے حکام ان دیہاتوں کا دورہ کریں جہاں

جہاں سے گاندھی گذرے ہیں تاکہ نقصان کی تلافی ہو سکے اور وفاداروں کی ہمت بندھے۔ اگرچہ گاندھی کے مارچ سے تعرض نہ کرنے سے گجرات کی حکومت شش و پنج میں پڑی لیکن کل ہند نقطہ نظر سے گاندھی کو گرفتار نہ کرنا ہی مناسب تھا۔ پنجاب کے گورنر نے وائسرائے کو یقین دلایا کہ ان کے صوبے میں مارچ سے کوئی جوش و خروش نہیں پیدا ہوا۔ کانگریس پریس اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر پالا سا پڑ گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ اس میں شک نہیں گاندھی اپنے گرفتار کرانے کے لیے سخت بے چین ہیں۔ کیوں کہ ان کی گرفتاری سے عوام میں جوش و خروش پھیلنے کا امکان ہے صوبجات متحدہ کے گورنر نے بھی اسی طرح کا خیال ظاہر کیا، مارچ کے آخری ہفتے بلکہ وسط اپریل تک وائسرائے کی ایگزیکیوٹیو کاؤنسل اور ممبروں کی رائے یہی تھی کہ گاندھی کی گرفتاری میں تاخیر سے تحریک پریشانی میں پھنس گئی ہے اور ان کے تمام منصوبے الٹ پلٹ ہو گئے ہیں۔ 10 / اپریل تک یہ صورت تھی کہ بیگ نے وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری کو لکھا کہ ایگزیکیوٹیو کے ممبران کی یہ متفقہ رائے ہے کہ صورتِ حال اطمینان بخش اور ہمارے اندازے کے مطابق بنی رہی۔

مارچ کے آخری ہفتے میں حکومت ہند نے اس طرح کی تحریکوں سے نپٹنے کے پُرانے تجربوں پر مبنی احکامات مقامی (صوبائی) حکومتوں کو جاری کیے اور انھیں یہ مشورہ دیا وہ ایسی صورتوں سے احتراز کریں جن میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کرنا پڑیں یا کانگریس سے قوتِ برداشت کا مقابلہ کرنے لگیں۔ یہ بات قابل ترجیح ہوگی کہ صرف ایسے لیڈروں کو گرفتار کیا جائے جن کی گرفتاری سے تحریک کے نظم و نسق کے بگڑ جانے یا لوگوں کے ہمت ہارنے کا امکان ہو۔ اگر بڑی تعداد میں ستیہ گرہیوں کی گرفتاری ضروری ہی ہو جائے تو کم سے کم طاقت کا استعمال مناسب ہوگا۔ جو لوگ تشدد پر آمادہ نہ ہوں ان کے خلاف طاقت کے استعمال سے عام لوگوں کی ہمدردی باقی نہیں رہتی۔ مقامی حکومتوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ جیلوں کو کھچا کھچ بھرنے سے پرہیز کریں اور نوجوان بچوں اور عورتوں سے اچھا برتاؤ کریں یہ دانشمندانہ مشورہ تھا۔ لیکن بدقسمتی سے جیوں جیوں تحریک کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ حکام کا مزاج بھی بگڑتا گیا۔ سردار پٹیل پہلے ہی ۷/ مارچ کو مقامی حکام کے حکم سے گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے صوبائی حکومت سے بھی مشورہ نہیں

لیا تھا۔ اپریل کے شروع میں جواہر لال نہرو کو الہ آباد میں گرفتار کر لیا گیا۔ ڈانڈی سے جہاں انھوں نے پہلی بار نمک کے قوانین توڑے تھے، گاندھی نے یہ پیغام بھیجا کہ ''ستیہ گرہی کے ہاتھوں میں مٹھی بھر نمک گویا ہندوستان کی عزت نفس کی علامت بن گیا ہے، چاہے یہ مٹھی ٹوٹ جائے لیکن نمک کو ہاتھ سے جانے نہ دینا۔'' کم سے کم ساٹھ ہزار ہندوستانی جیل گئے۔ نمک کے قانون توڑنے کے سلسلے میں جن کو سزائیں ملیں ان میں راج گوپالا چاری، مدن موہن مالویہ، جے ام سین گپتا، جی جی کھیر، کے ام منشی، دیوداس گاندھی، مہادیو دیسائی، اور وٹھل بھائی پٹیل شامل تھے۔ خوش حال گھرانوں اور متوسط خاندانوں کی عورتوں نے شراب اور بدیسی کپڑوں کی دکانوں پر پکٹنگ کی۔

تشدد کے بھی اکّا دکّا واقعات ہوئے، مثلاً چٹا کانگ (چٹگاؤں) میں کچھ تشدد پسندوں نے اسلحہ خانے پر اسلحہ چھیننے کے لیے حملہ کر دیا۔ لیکن بحیثیت مجموعی ہندوستان غیر متشدد (پرامن) رہا۔ جن لوگوں نے نمک ستیہ گرہ کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا تھا کہ نمک اور سوراج میں کیا رابطہ؟ انھوں نے ہندوستانی عوام کو اجتماعی اقدام کے لیے منظّم کرنے کی گاندھی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ آخر کار حکومت نے بھی وہی کیا جس کے منصوبے وہ مدتوں سے بنا رہی تھی لیکن ڈرتی بھی تھی، اس نے گاندھی کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

5 مارچ 1930 کو 1827 کے بمبئی ا گولیشن کی دفعہ 20 کے تحت ڈانڈی کے قریب کرادی نامی گاؤں میں گرفتاری عمل میں آئی۔ یہ رگولیشن ریاستی محافظ خانے کے گرد آلود بستے سے نکال کر انھیں مقدمہ چلائے بغیر گرفتار کرنے کی غرض سے، حرکت میں لایا گیا۔ اپنی گرفتاری سے ذرا پہلے گاندھی نے ''پرامن بغاوت'' کا ایک زیادہ جارحانہ منصوبہ بنایا تھا اس کے تحت انھوں نے دھرسنا میں واقع نمک ڈپو پر دھاوا بول کے قبضہ کرنا تھا۔ دھاوے کی قیادت سابرمتی آشرم میں رہنے والے بوڑھے امام صاحب نے 21 رمئی کو کی۔ قائدین گرفتار کر لیے گئے اور عام شرکاء کو زدو کوب کیا گیا۔ ایک امریکن نامہ نگار وب ملز نے اس دھاوے کی تصویر کشی اپنے جریدہ ''نیوفری مین'' نے یوں کی ''اٹھارہ سال تک بائیس ملکوں میں رپورٹنگ کرتے ہوئے میں نے ایسے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مناظر نہیں دیکھے، جیسے کہ دھرسنا میں دیکھنے پڑے۔ بعض اوقات یہ مناظر ایسے اذیت رساں ہوتے تھے کہ میں اپنی نگاہیں پھیر لیتا تھا۔ رضا کاروں کا نظم وضبط حیرت انگیز

تھا۔ یہ ظاہر ہورہا تھا کہ گاندھی کا عقیدۂ اہنسا ان کے رگ و پے میں پیوست ہے۔''

اسی دوران میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے سِوِل نافرمانی کا دائرہ بڑھا کر اس میں (نمک ٹیکس کے علاوہ) جنگلات کے قوانین کا توڑا جانا، رعیت وادی علاقوں میں عدم ادائیگی لگان اور بدیشی کپڑوں، بینکوں، جہاز رانی بیمہ کمپنیوں کا بائیکاٹ بھی شامل کرلیا تھا۔

وائسرائے نے آرڈی ننسوں کا ایک پورا سلسلہ جاری کرکے انتظامیہ کو غیر معمولی طاقت تفویض کردی تاکہ وہ کانگریس کمیٹیاں ٹھیک سے کام نہیں کرپاتی تھیں۔ ان کی ذمہ داریاں ان لوگوں نے سنبھال لی تھیں جنھیں ڈکٹیٹر کہا جاتا تھا۔ اس خطاب سے سرکاری حلقوں میں بڑے عتاب کا اظہار ہوا تھا۔ سچ پوچھئے تو ان حضرات کا بس یہی اختیار تھا کہ خود کو قید خانے جانے کا حکم دے دیں۔ جیسے کوئی ڈکٹیٹر نامزد کیا جاتا وہ کسی استثنا کے بغیر فوراً گرفتار کرلیا جاتا اور جیل بھیج دیا جاتا۔

گاندھی کی گرفتاری سے حکومت سے مقاومت کم ہونے کی بجائے اور بڑھی۔ اگرچہ اس زمانے میں سرکاری پروپاگنڈا اس کی وقعت گھٹانے میں مصروف تھا، لیکن حکومت کو معلوم تھا کہ کانگریس کا عوام پر کتنا اثر بڑھ چکا ہے۔ بریلس فورڈ نے اپنی کتاب ''ربل انڈیا'' (باغی ہندوستان) میں اس کی شہادت دی ہے کہ ہندوستان کے متعدد حصوں، خاص کر بمبئی میں کانگریس کا زور تھا، سرکاری کاغذات میں بھی اس کی شہادت ملتی ہے۔ مثلاً ڈائرکٹر آف ان ٹے لی جنس بیورو (محکمۂ اطلاعات) نے اگست 1930 میں بمبئی سے دورے کی واپسی پر ہوم ممبر کو ایک رپورٹ بھیجی تھی، انھوں نے لکھا تھا کہ کانگریس کو شہر میں جس قسم کی امداد کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے مل جاتی ہے۔ اس کے والنٹیر وں اور پکٹنگ کرنے والوں کو لوگ مفت غذا فراہم کرتے ہیں۔ ہر طرح کی تجارت (کرنے والوں) پر اس کی گرفت مکمل تھی۔ بہت سے تاجر تحریک میں مسلسل وابستہ رہنے پر تیار ہیں۔ دراں حالے کہ انھیں بربادی گھور گھور کے دیکھ رہی ہے۔ مختصر یہ کہ کانگریس نے پوری طرح قابو پالیا ہے اور پیش قدمی اب اسی کے ہاتھ میں ہے۔

باب 34

عارضی صلح

مئی کے آغاز میں اپنی گرفتاری کے بعد، گاندھی نے پونا کی یرودا جیل میں آرام کیا جس کی انھیں عرصے سے ضرورت تھی۔ انھوں نے اس جیل کو ''یرودا مندر'' جیسے خوبصورت الفاظ کہہ کر یاد کیا۔ قید خانے میں انھوں نے پوجا، کتائی اور مطالعے کا معمول برقرار رکھا۔ سیاسی حالات اور جس تحریک کو چلا آئے تھے اس کی قسمت کے بارے میں انھوں نے فکر کرنا چھوڑ دیا۔ وہ جانتے تھے کہ انھوں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے اور اب عوام اپنا فرض پورا کریں گے۔

ان کی گرفتاری کے ایک ہفتے بعد، لارڈ اِروِن برطانوی وزیر اعظم اور ان کے مابین جو خط و کتابت ہوئی تھی وہ شایع کر دی اور ظاہر کیا کہ سِوِل نافرمانی کی تحریک سے ملک معظم کی حکومت کی لندن میں گول میز آئینی اصلاحات کی پالیسی اور لندن میں گول میز کانفرنس کرنے کے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ایلن کیمپ بل جان سن لکھتا ہے ''جن لوگوں پر اس کے احکام کی تعمیل کی ذمہ داری تھی وہ شہادت دیتے ہیں کہ ان کے مذہبی معتقدات سے ان کی بے امتناعی پالیسیوں کو مزید مدد ملتی تھی'' اس زمانے میں وایسرائے قوم پرستی کے خلاف شدید ترین ظالمانہ رویے کی رہنمائی کر رہے تھے لیکن انھیں یہ کردار پسند نہیں تھا۔ اپریل 1930 میں انھوں نے وی۔ جے پٹیل کو لکھا تھا کہ ''مجھ سے زیادہ کوئی اور اس کا دل سے خواہش مند نہ ہوگا کہ ہندوستان کے

معاملات کا جہاز بہت جلد پُرسکون سمندر کی سطح پر آ جائے'' جولائی 1930 میں مرکزی اسمبلی کے شملہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ غالباً اب بھی ''زیادہ دانشمندانہ مشوروں کی پذیرائی کے لیے وقت گیا نہیں ہے'' ڈیلی ہرالڈ'' کے نمایندے جارج سولوکو تب اور دو اعتدال پسند لیڈروں یعنی سپرو اور جیکر نے صلح کی جو کششیں کی تھیں، وایسرائے نے اس کی مخالفت نہیں کی۔

ہندوستان میں حالات نے جو موڑ لیا تھا جارج سولوکو اس سے تکلیف پہنچی تھی۔ اس کو موتی لعل نہرو کے یک انٹرویو سے ایسا اندازہ ہوا تھا کہ بعض مخصوص حالات میں کانگریس سول نافرمانی کو ختم کرنے پر تیار ہو سکتی ہے تھوڑے ہی دنوں میں موتی لال نہرو گرفتار کر لیے گئے اور انھیں نینی جیل میں رکھا گیا جہاں ان کے صاحبزادے پہلے سے پہنچ چکے تھے۔ یہاں سپرو اور جیکر نے باپ اور بیٹے سے صلح کے امکانات پر بات چیت کرنے لیے ملاقات کی۔ چونکہ ان لوگوں نے گاندھی سے مشورہ کے بغیر بات چیت کرنے سے انکار کر دیا اس لیے دونوں نہروؤں کے علاوہ ولبھ بھائی پٹیل، سروجنی نیڈو جے رام داس دولت رام اور سید محمود نے حصہ لیا۔ گفتگو سے پتہ چلا کہ کانگریس اور حکومت کے مابین کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ 15۔ اگست 1930 کو کانگریسی لیڈروں نے مصالحت کرانے والوں سے یہ وضاحت کی کہ صرف اچھے ارادوں کے اعلانات سے خواہ وہ نیک خواہشات پر مبنی ہوں، کانگریس کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کو خود اپنی قسمت کے فیصلے کا حق ملنا چاہیے۔ ایسی خود اختیاری حکومت جس میں مالیات اور اقتصادی پالیسی پر اختیار نہ ہو اور سلطنت سے علاحدگی کا حق تسلیم نہ کیا گیا ہو، اس قابل ہی کب ہے کہ اسے حاصل کیا جائے۔ کانگریس سول نافرمانی کو ختم کرنے کے لیے اس شرط پر آمادہ ہے کہ آئین سازی کے سلسلے میں کانگریس کے بنیادی تصورات کو تسلیم کیا جائے اور ظلم و تعدی کی پالیسی کے کفارے کے طور پر تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ ضبط شدہ جائدادیں واپس کی جائیں اور سول نافرمانی میں حصہ لینے کی پاداش میں جو حکام ملازمت سے برخاست کر دیئے گئے تھے انھیں نوکری پر واپس لیا جائے۔

صلح کی ان کوششوں پر کانگریس کے ردعمل سے وہ خلیج ابھر کر سامنے آ گئی جو کانگریس اور برٹش کے درمیان حائل تھی۔ برطانیہ میں ونسٹن چرچل ہندوستانی عوام کو ''وکیلوں'' سیاست

دانوں، جنونیوں اور لالچی تاجروں کی گروہی حکومت'' کے حوالے کیے جانے کے خلاف مسلسل جہاد کیے جا رہے تھے ان کا کہنا تھا کہ ''ہمیں یہ بات صاف طور سے واضح کر دینا چاہیے کہ ہم کافی طویل عرصے بلکہ غیر معین مدت تک ہندوستان کا حاکم بنے رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اگرچہ ہم وفادار ہندوستانیوں کے تعاون کا خیر مقدم کریں گے لیکن لاقانونیت اور غداری سے ہم کوئی علاقہ نہیں رکھیں گے'' لیبروں کی مدد سے ریمزے میکڈانلڑ کی مزدور حکومت چلتی رہی لیکن اگر اس کا ارادہ بھی ہوتا تو وہ اس حالت میں نہیں تھی کہ ہندوستان کو انقلابی نوعیت کی مراعات دے سکے۔ برطانوی پریس نے اپنے اوپر جو رضا کارانہ طور پر صحیح خبریں نہ چھاپنے کی پابندی رکھی تھی۔ اس کی بدولت برطانوی پبلک ہندوستان کی صحیح صورت حال سے تقریباً کلیتہً ناواقف تھی اور وہ گاندھی کے طریقوں اور ان کی نیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ بدیشی کپڑوں کے بائیکاٹ سے برطانوی کپڑوں کی ہندوستان میں درآمد گھٹ کر تہائی رہ گئی تھی اور تحریک کا یہی واحد پہلو تھا جس سے برطانوی کی رائے عامہ متاثر ہوئی۔ ہندوستان میں لارڈ ارون کے مشیروں کو یقین تھا کہ گاندھی کی بغاوت کو کچل ڈالیں گے اور اعتدال پسندوں اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر حکومت کا کام چلاتے رہیں گے۔ وایسرائے کی اگزیکیوٹیو کاؤنسل کی اکثریت اور تقریباً سبھی گورنروں اور سفیروں سِول افسروں کی یہی رائے تھی کہ کانگریس پر شکنجے اور کسے جائیں۔

اس عرصے میں آئینی کارواں آگے بڑھ چکا تھا۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ میں جو گرمیوں میں شائع ہندوستان کے آئینی مسائل کا بہت ہی تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا اور بڑی باریک بینی سے ان مشکلات کی فہرست تیار کی گئی تھی جن کے باعث پیش قدمی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی سفارشات اتنی معمولی تھیں کہ ہندوستان کے قدامت پسندوں میں بھی کوئی جذبہ خوشی پیدا نہیں ہوا۔ 1930 میں لندن میں پہلی گول میز کانفرس ہوئی۔ اس میں کانگریس کی نمائندگی نہیں تھی لیکن کچھ مندوبین جو اپنے ملک کو پریشانی کی حالت میں مبتلا چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ کچھ ٹھوس نتائج لے کر واپس آنا چاہتے تھے ان لوگوں نے کانگریس کی جانب صلح پسندانہ رویہ اپنانے کی اپیل کی۔ اپنی وداعی تقریر (19 جنوری 1931) میں میکڈانلڑ نے یہ امید ظاہر کی کہ اگلے اجلاس میں کانگریس بھی شرکت کرے گی۔ کچھ پہلے لارڈ ارون نے مرکزی قانون ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے حیرت

انگریز طور پر اس ''روحانی طاقت'' کی طرف جرأت سے کام لے کر اشارہ کیا تھا'' جو مسٹر گاندھی کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ جس ہندوستان سے انھیں پیار ہے اس کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی کو بھی بے حقیقت سمجھیں گے'' تقریباً اسی زمانے میں، وِج وڈ بین نے ارون کو لکھا کہ انھوں نے سپرو، جیکر، شاستری اور کابینہ کے کچھ وزیروں کو مدعو کیا تھا اور اس موقع پر اگرچہ ہندوستانی لیڈروں نے گول میز کانفرنس کے نتائج پر اظہار اطمینان کیا تھا لیکن اسی کے ساتھ اس بات پر زور دیا تھا کہ کوئی'' نتائج پر اظہار اطمینان کیا تھا لیکن اسی کے ساتھ اس بات پر زور دیا تھا کہ کوئی'' جاذب نظر اقدام'' کیا جائے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ کانگریس سے'' سپر اندا ختگی یا توبہ کی طرح کے کسی اقدام'' کی توقع ناممکن تھی۔ بن نے پوچھا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ وایسرائے کوئی ''عملی صورت'' نکال سکیں گے جس سے عام رہائی دیئے جانے کے بعد کانگریس سِول نافرمانی ترک کر کے گول میز کانفرس میں شرکت کے لیے تیار ہو سکے۔

اِروِن یہ پہلے ہی سے طے کر چکے تھے کہ الہ آباد میں ہونے والی کانگریس لیڈروں کی کانفرنس سے کوئی تعارض نہ کیا جائے۔ انھوں نے گاندھی اور کانگریس ورکنگ کے ممبروں کو یوم آزدی سے ذرا پہلے 25 جنوری 1931 کو رہا کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک مصالحانہ بیان بھی دیا۔ تقریباً فوراً ہی حکومت ہند نے خفیہ طور سے مقامی (صوبائی) حکومتوں سے اس بارے میں تبادلہ خیال کیا کہ کانگریس کے سلسلے میں اگلا قدم کس طرح اٹھایا جائے کہ'' ایک دوسرے کی مشکلات'' کو سمجھنے کی فضا پیدا ہو سکے۔ ایک طرف تنگ کرنے والی باتوں سے اور دوسری طرف'' نامناسب مطالبات'' سے احتراز کیا جائے۔ دلی کی اس صلح کے اشارے کا تقریباً سبھی مقامی (صوبائی) حکومت کی جانب سے شدید ردعمل ہوا۔ انھوں نے حکومت ہند کو یاد دلایا کہ حکومت برطانیہ نہیں بلکہ کانگریس ''مفتوح پارٹی کی حیثیت'' رکھتی ہے اور اگرچہ اقدام صلح برطانیہ اور امریکہ میں پبلسٹی کے نقطۂ نظر ٹھیک ہو لیکن ہندوستان میں اسے رجعت قہقری سمجھا جائے گا۔ دلی کے چیف کمشنر کے نقطوں میں عام آدمی یہی سمجھے گا کہ'' سرکار ہار گئی'' ہوم سکریٹری ایچ، ڈبلیو، ایمرسن اور ہوم ممبر، جیمس کرے رار سیاسی معاملوں میں وایسرائے کے سب سے بلند پایہ مشیروں میں تھے۔ دونوں نے وایسرائے کی توجہ خاص کر صوبائی حکومتوں کے خدشات کی جانب دلائی

اور کانگریس کو مزید مراعات دینے میں احتیاط برتنے کی صلاح دی۔ انھوں اس خطرے پر زور دیا کہ کہیں سرکاری مددگاروں۔ یعنی سرکاری ملازموں فوج، پولیس، اعتدال پسندوں اور مسلمانوں میں سراسمیگی نہ پھیل جائے اور وہ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ اب مستقبل کانگریس کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی بحث کا لب لباب یہ تھا کہ اگلے قدم کا فیصلہ اس سے نہ کیا جائے کہ اس کا کانگریس کیا اثر لے گی بلکہ اس سے زیادہ اس بات کا پیش نظر رکھ کر کیا جائے کہ حکومت کے دوستوں اور حمایتوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ایمرسن نے لکھا ہے'' اگر ایک قدم بھی غلط اٹھا تو اس کے نتائج بہت سنگین ہو سکتے ہیں''

جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوا، نئی دلی اور صوبائی دارالحکومت کے خاص مشیروں کے ناموافق ردعمل سے۔ وایسرائے نے ہمت نہیں ہاری لیکن اس خانگی اختلاف کے پیش نظر ان کے لیے یہ ناممکن ہو گیا کہ ہونے والے مذاکرات میں گاندھی کو ٹھوس مراعات دے سکیں۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی غیر مشروط رہائی سے کانگریس حکومت کے قریب نہیں آ پائی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبران جس وقت الہ آباد میں جمع ہوئے اس وقت موتی لا نہرو بستر مرگ پر تھے۔ کسی کو ایسا کوئی سبب نظر نہیں آیا کہ سِول نافرمانی واپس لے لی جائے۔ لیکن وہ لوگ اپنے اس فیصلے کا پریس میں اعلان کرنے سے اس لیے باز رہے کہ انھیں سپرو اور شاستری کا تار ملا۔ یہ لوگ وطن واپس آ رہے تھے اور گول میز کانفرنس کے مذاکرات کی بلاواسطہ رپورٹ کانگریس کو دینا چاہتے تھے۔ گاندھی کانفرنس کے اکتساب سے بالکل متاثر نہیں ہوئے تھے اور نہ حکومت سے مصالحت کے بارے میں پر امید تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے لارڈ ارون کو خط لکھا اور ملاقات کی خواہش کی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ایک ستیہ گرہی کی حیثیت سے یہ ان کا اخلاقی فرض تھا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو رہا کر کے وایسرائے نے جو مصالحتی اقدام کیا تھا اس کا جواب بھی دیں۔

17 فروری 1931 کو تیسرے پہر گاندھی ارون مذاکرات شروع ہوئے۔ ان میں آٹھ ملاقاتوں پر پھیلے ہوئے کل چوبیس گھنٹے صرف ہوئے۔ بیچ بیچ میں لمبے وقفے ہوتے تھے جن کے دوران امیدیں باری باری سے بندھتی اور ٹتی رہیں۔ لیکن آخر کار 4 مارچ کو ایک سمجھوتہ ہو گیا دلی معاہدہ (یا عرفِ عام میں گاندھی۔ ارون معاہدہ) کی رو سے کانگریس کو سول نافرمانی کو بند کرنا تھا۔

اس عام رہائی کے دائرے میں وہ سیاسی قیدی نہیں آئے تھے جو مقدمہ چلائے بغیر نظر بند تھے یا جن پر اعلانیہ یا خفیہ تشدّد کا الزام تھا۔ اس میں گڑھوالی فوجی بھی نہیں آئے تھے جنھوں نے پشاور کے ایک نہتھے ہجوم پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ سمجھوتے میں ان اراضیات کی واپسی بھی شامل نہ تھی جو کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کی جا چکی تھیں اور نہ ان لوگوں کی بحالی شامل تھی جو عدم تعاون کے تحریک کے زمانے میں اپنی نوکریاں کھو بیٹھے تھے۔ سمندر کے کنارے رہنے والے غریبوں کو نمک بنانے کی چھوٹی سی رعایت دی گئی تھی۔ اور بدیشی کپڑوں کی پکٹنگ کا حق تسلیم کیا گیا تھا۔ پولیس کے زیادتیوں کے جو الزام عائد کیے گئے تھے ان کی تحقیقات نہیں ہونے والی تھی یہ ایک بنیادی سوال تھا جس کے بارے میں کانگریس اور حکومت دونوں ہی بہت حساس تھیں اور اس سوال پر مفاہمت کی بات چیت تقریباً ختم ہو جانے والی تھی لیکن ارون نے گاندھی سے یہ کہا کہ اگرچہ انھیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ تحقیقات کی مانگ کریں لیکن گزشتہ را صلوٰات'' کہنا ہی دانش مندی ہے اور پرانی تلخیوں کو پھر سے تازہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اس پر گاندھی نے تحقیقات پر اصرار نہیں کیا۔ آئینی سوال پر معاہدۂ دہلی میں'' ہندوستان کے مفاد میں'' دفاع، امور خارجہ، اقلیتوں اور مالیات کے معاملے میں تحفظات کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اس دفعہ سے جواہر لا نہرو کو زبردست دھکا لگا اور کانگریس جس ''مکمل آزادی'' کا پیان کر چکی تھی اس سے یہ صاف طور سے مختلف تھا۔ معاہدے میں' نوآبادیاتی درجہ، کی بھی گارنٹی نہیں تھی۔ اگست 1930 میں سپرو اور جیکر نے جس مصالحت کی گفتگو کا آغاز کیا تھا، اس کے دوران کانگریس لیڈروں نے مصالحت کے لیے جو کم سے کم مانگ رکھی تھی اس معاہدے کے دفعات واضح طور پر اس سے کم تھے۔ سال بھر پہلے برطانوی حکومت کے خلوص کے امتحان کے لیے گاندھی نے جو گیارہ نکات تیار کیے تھے ان کا بھی یہاں کوئی حوالہ نہیں تھا۔ ناقد مبصرین اس پر حیرت کرتے تھے کہ اس دلی معاہدے میں آخر کیا ہے جو ملک کے اس ظلم و جور سے دوچار ہوئے بغیر دسمبر 1928 میں حکومت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا؟

ایلن کیمپ بل جانسن نے اس نتیجے پر پہنچنے میں غلطی نہیں کی تھی کہ دلی معاہدے گاندھی کو صرف کچھ اشک شوئی کے انعامات ملے تھے اور ارون نے بس اتنی سی ہار مانی تھی کہ وہ مصالحت کے لیے گفتگو کرنے پر راضی ہو گئے تھے۔

بعد میں قوم پرست مبصرین یہ دلیل پیش کرنے لگے کہ گاندھی۔ ارون معاہدہ برطانوی حکومت کی ایک گہری چال ہے اور کانگریس اپنی جدوجہد کوایسے وقت ختم کر کے جب عوامی جوش وخروش کا طوفان زوروں پر تھا، اس جال میں پھنس گئی اور گاندھی کو اس گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے رضامند کرلیا گیا تھا جس کی ناکامی یقینی تھی اور یہ اس لیے کیا گیا تھا کہ عالمی رائے عامہ (خاص کر امریکی رائے عامہ) پر یہ ثابت کیا جا سکے کہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری کے حصوں سے برطانوی عدم آمادگی نہیں بلکہ ہندوستان کا آپس کا اختلاف روکے ہوئے تھا۔قوم پرورانہ نقطۂ نگاہ سے یہ بات کتنی ہی قرین قیاس اور خوش آئندہ کیوں نہ لگی ہو لیکن اس کی تصدیق کے لیے کوئی ثبوت نہیں ملا۔ وایسرائے کی مجلس عاملہ میں فائنانس ممبر، جارج شوستر نے جنوری 1931 کے خاتمے پر کانگریس لیڈروں کی رہائی کے بعد ایک نوٹ اس شبہ کا اظہار کیا کہ تھوڑے سے وقفے کے لیے بھی سول نافرمانی کوموقوف کرنے کے بعد کانگریس کے لیے یہ پھر کبھی ممکن بھی نہ ہو سکے گا کہ وہ دوبارہ تحریک چلا سکے۔لیکن یہ رائے صرف اکیلے شوستر کی تھی کیونکہ مرکز اور صوبوں کے برطانوی ماہرین کی عام رائے یہ تھی کہ کانگریس اس عارضی صلح کو از سر نو منظم ہونے اور کھوئی ہوئی طاقت کو واپس لانے، سامان جنگ فراہم کرنے میں استعمال کرے گی اور گول میز کانفرنس سے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر باہر نکل آئے گی اور ایک ایسی بغاوت شروع کردے گی جس کا روکنا پہلے سے زیادہ مشکل ہو گیا کیونکہ اس عرصے میں حکومت کے دوست اور حلیف کانگریس سے کی جانے والی گفتگو سے مصالحت سے بددل اور پست ہمت ہو چکے ہوں گے۔

ان معنوں میں لارڈ ارون کو کانگریس سے عارضی صلح کرنے میں زبردست مخالفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں سکریٹری آف اسٹیٹ کی حمایت بہر صورت حاصل تھی لیکن گفتگو سے مصالحت کے آخری لمحوں میں برطانوی پریس اور پارلیمنٹ کے اعتراضات کے خوف سے وج وڈ بین بھی شک وشبہ کا اظہار کرنے لگے۔ گاندھی نے جس معاہدے پر دستخط کیے تھے اگر اس کو بعض صوبوں میں ان کے پیروؤں نے نہ مانا تو کیا ہوگا؟ سمجھوتے کی وضاحت پر نمبر پڑے ہوئے تھے، کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ حکومت اور کانگریس کے درمیان ایک معاہدہ تھا؟ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ تحفظات ''ہندوستان کے مفاد میں'' ہیں؟ کیا یہ کہنا زیادہ ایماندارانہ نہ ہوتا کہ

یہ ہندوستان اور برطانیہ دونوں ہی کے مفاد میں ہیں؟ کیا پکٹنگ اور پولیس کا جوذکر آیا ہے اسے دوسرے لفظوں میں ادانہیں کیا جا سکتا تھا؟ وایسرائے نے ٹیلگرام سے جواب دیا کہ سمجھوتے پر دستخط کیے جا چکے ہیں اور کئی بڑے سوال کو پھر سے اٹھانا، ناکامی کا خطرہ مول لینا ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض لفظی ترمیمیں جن پر بین اتنے جز بز تھے جب گاندھی کو بتایا گئیں تو انھوں نے انھیں غیر اہم قرار دیا اور کسی پس وپیش کے بغیر منظور کر لیا۔

لارڈ اروِن کا ہمدردانہ رویہ ہندوستانی قوم پروروں کے حق میں وقتاً فوقتاً کھٹکتا رہا۔ گاندھی اروِن معاہدے کے فوراً بعد وہ کافی بڑھ گیا تھا اور اس وقت نہایت کم درجے پر پہنچ گیا تھا جب سال بھر کے بعد اس معاہدے کے پُرزے اڑ گئے اور کانگریس مخالفت میں آ گئی اور خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ کانگریسیوں کا عام خیال یہ تھا کہ گاندھی اروِن معاہدہ ایک چالاکی کی چال تھی اور اروِن نے گاندھی کو وایسرائے ہاؤس میں سبز باغ دکھا دیا تھا۔ گاندھی کی قید کے ایک ساتھی نے جولائی 1932 میں گاندھی کو بی۔ جی ہارنی مین کا لکھا ہوا یہ اروِن کی سیرت کے متعلق بیان پڑھ کر سنایا کہ ''وہ ایک چلتا پھرتا موقع پرست ہے جو اپنے تضادات اور وصول اور پالیسی کی تبدیلیوں پر اخلاقی سلامت روی اور خلوص دعاوی کی ایک گہری منافقانہ تہ چڑھائے ہوئے ہے[1]'' گاندھی نے اس پر یہ خیال ظاہر کیا کہ اس میں وایسرائے کے ساتھ انصاف کم برتا گیا ہے۔ اگرچہ وایسرائے سلطنت برطانیہ کا وفادار ہے، لیکن وہ ہندوستان کا بھلا چاہتا ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ گاندھی کو لارڈ اروِن کے خلوص پر ایسا ہی یقین تھا کہ انھوں نے مصالحت کی گفتگو کے دوران تفصیلات میں کئی جگہ اروِن کی بات مان لی۔ انھیں اروِن میں روحانی طور پر یگانگت نظر آئی تھی۔ دونوں مصالحین کے سروجنی نیڈو نے ''مہاتما'' کا لقب دیا تھا یہ خطاب صرف وہاں تک چسپاں ہوتا تھا جہاں تک دونوں کی مذہبی ساختِ ذہنی کا تعلق تھا۔

جہاں تک گاندھی کا تعلق ہے ان کی نظر میں دہلی معاہدہ کانگریس حکومت تعلقات میں ایک نئے باب کے آغاز کی حیثیت رکھتا تھا۔ دہلی میں اپنے میزبان، ڈاکٹر انصاری[2] کے گھر سے انھوں

---

(1) مہادیو دیسائی۔ ڈائریز (19۔ جنوری 1932ء کی یادداشت)

(2) ڈاکٹر مختار انصاری۔

نے وایسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری کے نام 6۔مارچ 1931 کو لکھے گئے ایک خط میں تحریر کیا!

''میں آپ سے ایک عنایت کا ضرور طالب ہوں۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ یہ ورکنگ کمیٹی کی عزت کا سوال ہوگا کہ وہ کن شرائط کی سوفی صد تکمیل کرائے جن کے پورا کرنے کی ذمہ داری کانگریس پر عائد ہوتی ہے۔اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں آپ میری مدد کریں گے اگر آپ ہماری طرف سے کوئی بے قاعدگی دیکھیں تو آپ فوراً تار سے مجھے مطلع کریں.....

''میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ یہ سمجھوتا جس دوستی (کے حصول) کی ایک کوشش ہے وہ مستقل حقیقت بن جائے''

یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستانی قوم پرستی جس کی نمائندگی کانگریس کررہی تھی اس کی طرف لارڈ ارون یا لارڈ ہیلی فاکس (جس خطاب سے وہ بعد میں زیادہ متعارف ہوئے) کا طرزِ عمل مخالفت اور مصالحت کی شکلیں اختیار کرتا رہتا تھا۔انھوں نے سائمن کمیشن میں ایک ہندوستانی کی شمولیت سے اختلاف کیا تھا لیکن اکتوبر 1929 میں گول میز کانفرنس اور نوآبادیاتی درجہ کے اعلان کی تجویز کو منوانے کے لیے پورا زور لگا دیا تھا۔ انھوں نے کانگریس کے خلاف سخت ظلم وستم کی کارروائیوں کا انصرام بھی کیا تھا لیکن اس کے لیڈروں پر بھدے پن سے یا ناقابل تنسیخ طور پر دروازے بند بھی نہیں کیے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے انھوں نے گاندھی کے ساتھ ایک عارضی صلح نامے پر دستخط کیے۔آنے والے برسوں میں وہ اپنی تقریروں میں زیادہ تر کانگریس اور گاندھی کی تنقید ہی کیا کرتے تھے لیکن 1947 میں مسٹر اٹیلی کے 20۔فروری کے اس عہد آفریں اعلان کی دھجیاں اڑائی جارہی تھیں جس میں انھوں نے برطانیہ کے ہندوستان چھوڑنے کی تاریخ مقرر کردی تھی تو وہ لارڈ ہیلی فاکس ہی تھے جنھوں نے مزدور حکومت کی پالیسی کی حمایت کرکے، پلہ اس پالیسی کی طرف داری میں جھکا دیا۔

اس پر بحث ہوسکتی ہے کہ اپنے دورِ حکومت کے خاتمے پر مصالحت کی گفتگو شروع کرکے ارون اپنے سیاسی مستقبل کے لیے خطرہ مول لے رہے تھے۔اگرچہ ان کے مشیروں کو یقین تھا کہ ''آرڈی ننس کی حکومت'' کے کچھ (کڑوے) گھونٹ پلا کر کانگریس کو کچلا جاسکتا تھا۔لیکن ارون نے یہ سمجھ لیا تھا کہ خود جبر وتشدد کسی منزل تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ فرض کرکے

کام کررہے تھے اگر کانگریس کوایک بار برطانیہ کے خلوص کا یقین ہوجائے تو ممکن ہے کہ وہ (کانگریس) آئینی طریقوں کواپنالے اورایک نئے آئین کی تشکیل اوراس کے چلانے میں اپنا پرزورتعاون دے سکے۔

اس پالیسی کی کامیابی کے 31-1930 میں جوامکانات تھے اس سے بیحد کم امکانات 32-1931 میں رہ گئے تھے۔خود یہ بات کہ ارون بہت جلد ہندوستان سے جانے والے تھے، بدقسمتی کی بات تھی اس لیے اور بھی مرکز اورصوبوں کے سینیر حکام کانگریس سے صلح کے طریقوں سے خوش نہیں تھے۔اس کے علاوہ لاہور کانگریس کے بعد حکومت نے کانگریس کونظرانداز ہی کردیا تھا، گول میز کانفرنس کا حجم بڑھادیا تھااوراس میں ایسے عناصر بھردیئے تھے جن کے اورکانگریس کے مابین کوئی قدرمشترک نہیں تھی ایسی کانفرنس سے یہ توقع کب ہوسکتی تھی کہ وہ ہندوستان کے لیےکوئی ترقی پسندانہ آئین مرتب کرسکے گی۔یہ بات خودتعجب خیز ہے کہ حکومت کی جانب سے کسی واضح اقرار کے بغیر(جس پرگاندھی اورموتی لال نہرو 1929 میں اصرار کرچکے تھے) گاندھی کانفرنس میں شمولیت پرراضی ہوگئے۔لیکن معاہدے پردستخط کرنے کے حق میں دلیلیں معاہدے کے دفعات میں نہیں بلکہ ستیہ گرہ کی منطق میں ڈھونڈھنا چاہیے۔انڈین نیشنل کانگریس کےاجلاس کراچی میں ان کے ذہنی طریق کار کی ایک جھلک ملتی ہے۔

میں اکثر اس بات پرتعجب کرتا ہوں کہ ہم اس کانفرنس میں شریک ہوکر کیا کریں گے جہاں ہمیں معلوم ہے کہ جوکچھ ہم چاہ رہے ہیں اورکانفرنس میں اب تک جوکچھ پیش کش کی جاچکی ہے اس کے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔لیکن ایک ستیہ گرہی ہونے کے مصالح کودیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کرلیا۔ایسی منزل بھی آجاتی ہے جہاں ایک ستیاگرہی اپنے مخالف سے گفتگوئے مصالح کرنے سے انکارنہیں کرسکتا۔اس کا مقصد ہمیشہ یہ رہتا ہے کہ وہ اپنے مخالف کومحبت سے جیت لے۔ یہ منزل اس وقت آگئی جب وزیراعظم کے اعلان کے بعد(کانگریس کی) ورکنگ کمیٹی کورہا کردیا گیا۔ وایسرائے نے بھی ہم سے اپیل کی کہ ہم ہتھیار رکھ دیں اور یہ بتائیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔

یہ کہا گیا کہ ایسے وقت میں عارضی صلح کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔جبکہ کانگریس کم سے کم ایک

سال تک سِول نافرمانی کو جاری رکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی، اس بات کے جواب میں گاندھی نے یہ کہا کہ ''ویسے تو یہ بھی ممکن تھا کہ ہم بیس برس تک تحریک کو چلاتے اور ایک سچا ستیہ گرہی آخر تک لڑتا رہتا ہے، چاہے باقی لوگ اتنے تھک جائیں کہ جھک جائیں۔ لیکن عارضی صلح اس لیے نہیں ہوئی کہ ہم تھک گئے تھے بلکہ اس لیے ہوئی کہ اِس کا ہونا لازمی تھا۔ جو اس لیے لڑتا جائے کہ وہ ابھی لڑ سکتا ہے تو ستیہ گرہی نہیں ہے بلکہ مغرور انسان ہے اور خدا کے سامنے گناہ گار ہے''[(1)]

اس طرح گاندھی کے طرزِ فکر میں بظاہر جو تناقص نظر آتا ہے اس کی وضاحت ان کی اپنی تکنیک کی اصطلاحوں میں ہی ہو سکتی ہے۔ ستیہ گرہ کی تحریک کو عام طور سے ''جدوجہد'' بغاوت'' یا'' بے تشدد کی جنگ'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ لیکن ان الفاظ کے عمومی مفاہیم کی وجہ سے تحریک کے منفی پہلوؤں یعنی مخالفت اور تکرار، کو زیادہ اور غیر متوازن اہمیت حاصل ہوتی معلوم ہوئی۔ لیکن ستیہ گرہی کا مقصد مخالف کا جسمانی خاتمہ یا اس کی اخلاقی پسپائی نہیں ہے بلکہ خود مخالف کے ہاتھوں مصائب برداشت کر کے ایسے نفسیاتی عمل کی ابتدا کرنا ہے جس کے ذہنوں اور دلوں کا ملانا ممکن ہو سکے۔ ایسی جدوجہد میں مخالف سے سمجھوتا نہ تو الحاد ہے نہ بغاوت بلکہ ایک فطری اور ضروری قدم ہے اور اگر حالات کے موڑ سے یہ لگنے لگے کہ سمجھوتا قبل از وقت ہو گیا اور مخالف اپنے کیے پر پچھتا نہیں رہا ہے تو کوئی چیز ستیہ گرہی کو غیر متشدد جنگ کی طرف پلٹنے سے روک نہیں سکتی۔ یہ سچ ہے کہ اپنی مرضی سے قومی جذبات کو ابھار کر سب سے اونچے درجے تک پہنچایا نہیں جا سکتا ہے لیکن گاندھی کی نظر میں ایسی سیاسی آزادی کی بہت وقعت نہیں تھی جو جذبات کی کسی گزرتی ہوئی لہر کے بلند ہو جانے سے مل جائے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان جب بلاغ پر پہنچے گا تبھی آزاد ہو گا اور کوئی بھی طاقت اسے غلام بنا کر نہ رکھ سکے گا۔

جب دلی معاہدے کے چند دنوں بعد مارچ 1931 میں گاندھی کراچی اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تو بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی پر چڑھانے سے ساری فضا میں جوش بھرا ہوا تھا۔ گاندھی نے ایک تجویز کا مسودہ بنایا جسے جواہر لال نہرو نے پیش کیا۔ اس میں بھگت سنگھ کی بہادری اور قربانی کو سراہا گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حصولِ آزادی کے لیے سیاسی تشدد کو ذریعہ

(1) تیندولکر مہاتما، ج:3، ص:109

بنانے پر افسوس بھی ظاہر کیا گیا تھا۔ کچھ مہینوں کے بعد جب بنگال اور بمبئی میں دہشت پسندوں کی تشدد پسندانہ کارروائیوں کا اعادہ ہوا تو گاندھی نے اس تجویز پر افسوس کا اظہار کیا اور انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ''بھگت سنگھ کے مسلک کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی گئی۔ انھوں نے سیاسی نراجیوں سے اپیل کی کہ وہ تشدد کے طریقوں سے باز رہیں۔'' اگر کسی انگریز کارپرداز کو مارنا ہی ہو، تو اس کے بدلے میں مجھے کیوں نہ مار ڈالو۔''

کراچی کانگریس نے دلی معاہدہ منظور کر لیا لیکن اس کی ایسی تشریح کی جس سے یہ معاہدہ کی دفعات سے زیادہ کانگریس کے عزائم سے ہم آہنگ ہو گیا۔

اپریل میں گاندھی بمبئی میں تھے اور انھوں نے لارڈ ارون کو الوداع کہا۔ نئے وایسرائے، لارڈ ولنگڈن پہلے سے بمبئی پہنچ چکے تھے لیکن انھوں نے گاندھی کو کوئی بلاوا نہیں بھیجا۔

صوبوں کی راجدھانیوں اور دلی کے سر پھرے حکام کو جن کی نگاہوں میں دلی معاہدہ ایک کڑوی گولی تھا، اب ایک ہمدرد سربراہ مل گیا تھا۔ معاہدے پر دستخط کے چند ہی دنوں کے اندر ٹکراؤ ہونے لگا۔ کانگریس کو شکایتیں ملیں کہ باردولی اور بورساڈ میں تمام قیدیوں کو رہا نہیں کیا گیا نہ ضبط شدہ اراضیات ان کے مالکین کو واپس کی گئیں۔ نہ گاؤں کے حکام کو بحال کیا گیا۔ بنگال میں کھنچاؤ بڑھتا ہی رہا۔ وہاں بہر حال سمجھوتے کا اطلاق ان ہزاروں نوجوانوں کے معاملات پر نہیں ہوتا تھا جو مقدمہ چلائے بغیر نظر بند تھے۔ صوبجات متحدہ (یوپی) میں کسانوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے میں لال قمیص والوں پر جبر و تعدی میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی اور گاندھی تک کو اس صوبے میں جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔

''ینگ انڈیا'' کے 9۔ جولائی 1931 کے شمارے میں اداریہ نکلا جس میں معاہدے کی خلاف ورزیوں کی فہرست دی گئی تھی۔ اس کا چونکا دینے والا عنوان تھا ''کیا یہ عمارت گر رہی ہے؟'' 18۔ جولائی کو گاندھی وایسرائے سے شملہ میں ملے اور انھوں نے معاہدے عمل درآمد کے سلسلے میں کی جانے والی شکایتوں کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ 14۔ اگست کو انھوں نے وایسرائے کو لکھا!'' مجموعی طور پر تمام حالات سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کے نقطۂ ہائے نظر میں بنیادی اختلافات ہیں'' حکومت نے کانگریس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے دلی معاہدے کی روح کے برعکس

کارروائی کی ہے۔ گویا طرفین اس معاہدے کے شکست کیے جانے کے حدود تک پہنچ چکے تھے۔ مصالحت کی گفتگو پھر سے شروع ہوئی اور لیس پوت کے کسی طرح ایک سمجھوتا(دوسرا معاہدہ) کرلیا گیا۔ یہ طے ہوا کہ باردولی میں گاندھی ارون معاہدے پر عملدرآمد کے سلسلے میں کانگریس کو جو شکایتیں ہیں ان کی تحقیقات ایک کلکٹر کرے گا۔ جس کے واضح تحقیقات ہوں گے۔ یہ بھی قرار پایا کہ کانگریس گول میز کانفرنس میں شرکت کرے گی اور یہ کہ گاندھی اس کے واحد نمائندے ہوں گے۔

شملہ سے کالکا تک ایک مخصوص ٹرین کا انتظام کیا گیا اور دوسری ٹرینیں روک دی گئیں تا کہ گاندھی ٹھیک وقت سے بمبئی پہنچ کر 29 ۔اگست کو ایس ایس راجپوتانہ نامی جہاز سے بحری سفر شروع کرسکیں۔ مہادیو دیسائی پیارے لال، دیوداس اور میرا بین ان کے ساتھ گئیں۔ اسی جہاز پر ان کے ہمراہ سروجنی نائیڈو اور مدن موہن مالویہ بھی تھے۔ جب ان کا جہاز روانہ ہوا تو ان پر مایوسی کی کیفیت طاری تھی۔ جس میں بس تھوڑی سی امید کی آمیزش تھی۔ جب میں لندن کے امکانات پر غور کرتا ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ ہندوستان میں سب کچھ ٹھیک نہیں....تو میرے دل کو بے انتہا مایوسی سے بھر دینے میں کسی شے کی کمی نہیں رہ جائی۔ افق جتنا بھی تاریک ہوسکتا ہے، اتنا تاریک ہے۔ اس کا پورا امکان ہے کہ میں خالی ہاتھ واپس آؤں۔ لیکن چونکہ مجھے یہ یقین ہے کہ خدا نے ''دوسرے سمجھوتے'' کے ذریعے میرا لندن جانا ممکن بنایا ہے تو میں پرامید ہو کر اس سفر کا آغاز کررہا ہوں۔

باب 35

گول میز کانفرنس

مہاتما کے سکریٹری مہادیو دیسائی نے لکھا ہے کہ ''ایس ایس راجپوتانہ پر وہ غالباً بہترین کشتی بان[1] ثابت ہوئے۔ گاندھی جہاز کے دوسرے یعنی سب سے نچلے درجے میں سفر کررہے تھے وہ سارا دن اور ساری رات جہاز کے عرشے پر گزارتے۔ اپنے معمول سے سوتے اور جاگتے اور آشرم کا روزانہ کا معمول۔ پرارتھنا (دعا) چرخہ کاتنا اور مطالعہ یہاں بھی برتتے تھے وطن جانے والے انگریزوں کے چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں ان کی دوست بن گئیں۔ وہ ان کے چرخہ کا تنے کا تماشا دیکھتی رہتیں اور جب وہ ان کے کیبن میں جھانکتیں تو انھیں مٹھی بھر بھر کے کھجور اور انگور کھانے کو ملتے۔ عدن میں ہندوستانیوں نے انھیں ایڈریس پیش کیا۔ مصری وطن پرست کی بیوہ مادام راغلوں پاشا اور وفد پارٹی کے دوسرے قائدین نے انھیں نیک خواہشات کے پیغام بھیجے۔ مارسیلز میں فرانسیسی عالم کی بہن میدلین رولینڈ ان سے ملنے آئیں اور فرانسیسی طلبہ نے ان کا پرجوش استقبال کیا اور انھیں ''ہندوستان کا'' ''روحانی سفیر'' کہہ کر مخاطب کیا۔

۱۱ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو وہ لندن پہنچے۔ ماریل لسٹر نے انھیں کنگسلے ہال میں ٹھہرنے کی دعوت دی

(1) مسافر جسے متلی وغیرہ نہیں آتی۔

تھی۔ یہ ہال ایسٹ انڈ (مشرقی حصے) میں واقع ہے۔ گاندھی نے وہاں قیام کی دعوت قبول کرلی تاکہ وہاں وہ اسی طرح کے لوگوں کے ساتھ رہ سکیں جن کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کررکھی تھی، دوستوں کے سمجھانے پر کہ ان کے جائے قیام دوسرے مندوبین اور ساتھیوں کے لیے جو کانفرنس میں شریک ہورہے ہیں، باعث زحمت ہوگی۔ وہ اس بات پر راضی ہوگئے کہ 88 نائیٹس برج میں ایک دفتر کھول لیں لیکن ہر شام کو چاہے جتنی دیر ہوجائے وہ سونے کے لیے باؤ ہی میں واپس آتے تھے۔ بعض اوقات وہ کمیٹی کے جلسوں سے آدھی رات کے بعد واپس ہوتے تھے لیکن صبح کے پرارتھنا کے لیے ان کے کمرے کی روشنی چار بجے علی الصباح ضرور جل اٹھتی تھی۔ وہ ایسٹ انڈ کی معمولی سڑکوں پر صبح کے وقت ٹہلنے ضرور جاتے تھے اور باؤ کے ہمایوں سے ملنے جاتے تھے۔ یہاں بھی بچے ان کے دوست بن گئے تھے۔ وہ کہتے ''اصلی گول میز کا کام تو میں یہاں کرتا ہوں۔ انگلینڈ کے عوام کو جان پہچان رہا ہوں۔''

گول میز کانفرنس میں گاندھی کانگریس کے واحد نمائندے تھے چوں کہ گاندھی ارون معاہدے پر ٹھیک سے عمل نہیں ہورہا تھا اور ملک کے بعض حصوں میں صورت حال غیر یقینی سی تھی، انڈین نیشنل کانگریس کی مجلس عاملہ کو اس امر میں پس وپیش تھا کہ گول میز کانفرنس کے لیے دوسری چوٹی کے لیڈروں کو بھی یہاں سے انگلستان بھیج دے۔ لیکن تجویز یہ بات ذہنوں میں تھی کہ اگر گاندھی ہندوستان اور برطانیہ کے، مابین صلح کے بنیادی اصولوں پر کوئی سمجھوتہ کرانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو اپنے ساتھیوں بلکہ پوری کانگریس کمیٹی کو تفصیلات پر گفتگو کرنے میں اپنی مدد کے لیے لندن بلا سکتے تھے۔ بدقسمتی سے گول میز کانفرنس اس طرح کی مصالحت کے آس پاس بھی نہیں پہنچ پائی اور مہاتما گاندھی کو تن تنہا ان ہندوستانی اور برطانوی عناصر کے خلاف لڑنا پڑا جو آئین سازی میں ترقی کی راہ میں روڑا بنے ہوئے تھے۔ برطانوی پریس اور سیاست داں یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ گاندھی لاکھ نمایاں فرد سہی لیکن تھے وہ فرد واحد اور صرف ایک ہندوستانی مندوب اور جو متعدد چورنگی پارٹیاں کانفرنس میں یکجا کی گئی تھیں ان میں کانگریس ایک ہی پارٹی تو تھی۔ (کانفرنس کے) سارے مندوب حکومت کے نامزد کیے ہوئے تھے۔ ان میں چند لائق افراد بھی تھے لیکن اکثریت ہندوستانی راجو مہاراجوں، بڑے زمینداروں، خطاب یافتہ افراد اور چھوٹے

بڑے مفاد پرستوں اور اقلیتی جماعتوں کے لیڈروں پر مشتمل تھی۔ بہت سے مندوب سیاسی جوڑ توڑ میں مہرے بننے، عہدوں کی دوڑ اور نوکریوں، قانون ساز مجلسوں اور سروسوں کے چکر میں ضرورت سے زیادہ بے چین تھے۔ آخر میں کانفرنس کا لے دے کے یہی ایک کام رہ گیا تھا۔

کیا بہ اعتبارِ عناصر تشکیلی اور کیا بہ اعتبار ضابطۂ کار، جن دونوں پر برطانوی حکومت کا کنٹرول تھا، کانفرنس کی قوتیں سیدھی سیڑی سے اتر کر ثانوی مسائل، بالخصوص فرقہ وارانہ سوال پر صرف ہونے لگیں۔ گاندھی نے اس چال کو خوب سمجھ لیا تھا انھوں نے پبلک میں بھی اور پرائیوٹ طور پر بھی کھری کھری سنائی۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا برطانوی حکومت نے ہندوستانی مندوبین کو چھ ہزار میل دور لندن میں کیا فقط اس لیے بلایا ہے کہ فرقہ وارانہ سوال حل کرے؟ انھوں نے کہا کہ ایسی صورت حال پیدا کی گئی ہے جس میں مختلف فرقے آئینی پیش رفت کے لیے شرطِ ماقبل کی حیثیت سے فرقہ وارانہ سوال پر غیر واجب زور دینے لگے ہیں۔ اس صورتِ حال میں وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح نئے آئین کی آڑ میں چھپ چھپا کے شکار تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ کانفرنس کے سامنے مسئلے کو معکوس شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس (کانفرنس) سے یہ کیک بانٹنے کو کہا جا رہا ہے جس کا سائز معلوم نہیں ہے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ''ہمیں یہ بتایا جائے کہ ہمیں کیا ملنے والا ہے تا کہ اس بنیاد پر میں اس بیچ میل گروہ میں بھی اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کروں اور میں ان سے یہ کہہ سکوں کہ وہ ایک قیمتی شے کے حصے بخرے کر رہے ہیں۔''

کانفرنس کے مندوب رفیق، جی، ڈی، برلا نے مہاتما کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی ابتدائی تقریر پہلے سے تیار کر لیں کیوں کہ یہ ایک تاریخی موقع ہے۔ جب وہ کار میں بیٹھ کر سینٹ جیمس پیلس کی طرف کانفرنس میں شرکت کرنے جا رہے تھے تو گاندھی نے برلا کو بتایا کہ انھیں تقریر لکھنے کا موقع نہیں مل پایا، بہر حال عین موقع پر اپنے خیالات کو سمیٹنے میں ایشور میری مدد کرے گا۔ آخر کار، ہمیں سیدھے سادے انسانوں کی طرح بات کرنا ہے۔ مجھے یہ تمنا نہیں ہے کہ میں غیر معمولی طور پر ذہین نظر آؤں۔ ایک سیدھے سادے دیہاتی کی طرح مجھے اتنا ہی تو کہنا ہے کہ ''ہم آزادی چاہتے ہیں[1]'' بہر حال اس فی البدیہہ تقریر میں جو انھوں نے ایک سادے دیہاتی کے جذبے سے کی تھی۔

(1) انسی ڈنٹس آف گاندھیز لائف۔ مرتبہ شکلا۔ ص 24

ہندوستان کی جانب سے حکومت خوداختیاری کی مانگ اور کانگریس کے نقطۂ نظر کی بڑی طباعی سے وضاحت تھی۔ گاندھی نے کہا کہ کانگریس ہندوستان میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ نمائندہ سیاسی ادارہ ہے۔ یہ تمام فرقوں کی اور سب سے بڑھ کر ہندوستان کے غریب، نیم گرسنہ اور گونگے کروڑوں لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ''اگر آپ ہندوستان کے قیدخانوں کا ریکارڈ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کانگریس مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی نمائندگی کرتی ہے۔'' جہاں تک اچھوتوں کا تعلق تھا، انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ خود اپنی ذات سے ان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر رائے شماری کرائی جائے تو انھیں سب سے زیادہ رائے ملے گی، انھوں نے کہا۔

انھوں نے ہندوستان اور انگلستان کے مابین ایک باعزت اور مساویانہ شراکت کی وکالت کی، ایسی شراکت جو طاقت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ، محبت کے ریشمی دھاگے میں، بندھی ہوگی۔ کانگریس نے فیڈریشن کے اصول کو مان لیا تھا یہ اصول بھی تسلیم کر لیا تھا کہ ''تحفظات'' ہوں گے لیکن تحفظات'' ایسے بنائے جائیں گے جو ہندوستان کے مفاد میں ہوں گے نہ ایسے کہ حکومت خود اختیاری مذاق بن کے رہ جائے جتنے تحفظات تجویز کیے گئے ہیں اگر وہ سب نئے آئین میں شامل کر لیے جائیں تو ہندوستان کو جو ذمہ دار حکومت ملے گی وہ اُس ذمہ دار حکومت سے بہتر نہ ہوگی جو قیدیوں کو اپنی کوٹھریوں میں حاصل ہوتی ہے۔ جب کوٹھریوں کے دروازے مقفل کر دیئے جاتے ہیں تو قیدیوں کو بھی تو مکمل آزادی مل جاتی ہے۔ انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ اہل برطانیہ میں تنظیمی صلاحیت زیادہ ہے لیکن ہندوستانی اپنے ملک کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ وہ یورپی تجارتی مفاد کے لیے خصوصی برتاؤ کے خلاف تھے لیکن انھوں نے یہ یقین دلایا کہ ان کی حق تلفی بھی نہیں ہوگی۔ انھوں نے بالغ حق رائے دہندگی، واحد چیمبر کی مقنّنہ (لے جس لیچر) اور بالواسطہ انتخاب کی وکالت کی۔ انھوں نے اس امکان کا بھی اظہار کیا کہ برطانوی فوجیں آزادی کے حصول کے کچھ دنوں بعد بھی ہندوستان میں موجود رہیں۔ انھوں نے اس کی وضاحت کی کہ یہ ذمہ داری برطانیہ کی ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو دفاع کے اسرار سے آشنا کرائیں۔ ''ہمارے پر تراش لینے کے بعد، اب یہ ان کا فرض ہے کہ ہمیں وہ پر دیں جن سے ہم اڑ سکیں۔''

کانفرنس نے اس ساری بے تکلف خطابت کا کوئی اثر نہیں لیا۔ برطانیہ میں مالی بحران تھا

اور وہاں کی حکومت بدل گئی تھی۔نئی حکومت میں قدامت پرست (کنزروے ٹیو) بھاری تعداد میں آ گئے۔ برطانوی عوام گھریلو مسائل میں الجھ گئے۔ ان کے نزدیک ہندوستانی آئین کی باریکیوں سے کہیں زیادہ ضروری اور فوری سوال مالی بحران کا تھا۔ ناگزیر مگر غیر محسوس طور پر، اہمیتوں پر زور کی نوعیت بھی بدل گئی۔ سر سمیوئل ہورنے، جو نئے سکریٹری آف اسٹیٹ تھے، گاندھی سے کہا کہ وہ ہندوستانیوں کو مکمل حکومت خوداختیاری کا اہل نہیں سمجھتے۔کنزرویٹو پریس بھی کھل کھیلا۔ ڈیلی میل نے اعلان کیا کہ ''ہندوستانیوں کے بغیر برطانوی دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔تجارتی اعتبار سے، اقتصادی اعتبار سے، سیاسی اور جغرافیائی اعتبار سے یہ ہماری سب سے زیادہ قابل قدر سامراجی پونجی ہے۔ بدترین قسم کی بغاوت جو کوئی برطانوی کو سکتا ہے یہ ہوگی کہ اس مقبوضے کو خطرے میں ڈالے۔''

اس دوران میں، گول میز کانفرنس کے مندوبین فرقہ وارانہ سوال پر سودے بازی میں مصروف تھے۔ انھیں ان جھگڑوں میں ہندوستانی مفاد پرستوں اور برطانیہ کے ''سخت جان'' (اٹل) عناصر سے شہ مل رہی تھی تاکہ یہ دکھایا جا سکے کہ ہندوستانی حکومت خوداختیاری کا راستہ برطانیہ کی عدم آمادگی نہیں بلکہ ہندوستانی عدم اتحاد روکے ہوئے ہے۔گاندھی مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے تمام جائز شبہات کو دور کرنے کے لیے ''سادہ چیک'' دینے کو تیار تھے، بشرط یہ کہ وہ آزادی کے قومی مطالبے پر زور دینے کے لیے آمادہ ہوں۔ ہندو مندوبین اس فیاضیانہ پیش کش کے لیے آمادہ نہیں تھے اور قوم پرور مسلمانوں کی کانفرنس میں کوئی نمائندگی نہیں تھی۔اینگلوانڈین، انڈین کوسچین اور اقوام مندرجۂ فہرست تھے اور مسلمانوں نے تب ایک ''اقلیتی معاہدہ'' کیا جس کی رو سے جداگانہ انتخابات کے ساتھ تمام اقلیتوں میں سے ہر ایک کے لیے آبادی کے لحاظ سے نمائندگی کا مطالبہ تھا۔ ایمزے میک ڈانلڈ نے اس معاہدے پر یہ تبصرہ کیا کہ یہ ہندوستان کے ساڑھے گیارہ کروڑ لوگوں یا تقریباً چھیالیس فیصد آبادی پر حاوی ہے۔اس کا گاندھی نے منہ توڑ جواب دیا۔مہاتما نے کہا کہ ''ان اعداد و شمار کی صحت کا جو مظاہرہ یہاں کیا گیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ ہندوستانی عورتوں نے مخصوص نمائندگی کو کلیتہً مسترد کر دیا ہے۔ اور چوں کہ ہندوستان کی آدھی آبادی عورتوں پر مشتمل ہے اس لیے چھیالیس فیصد کسی قدر گھٹ جائے گا!'' اقلیتی معاہدہ،

کانگریس کی حمایت کے بغیر بے جان نومولود تھا لیکن اس سے دنیا بھر میں اعلان ہوگیا اور شاید یہی مقصد تھا۔ کہ ہندوستانی پارٹیاں نا قابل مصالحت حد تک متبائن ہیں اور آئندہ پیش رفت کو ممکن بنانے کے لیے برطانوی حکومت کو خود فرقہ وارانہ مسئلے کا حل اوپر سے عائد کرنا پڑے گا۔

گاندھی کو ان دنوں اہانت کے کئی تلخ بیانو سے تلچھٹ تک پینا پڑی۔ نہ ختم ہونے والی سودے بازیاں، ثانوی مسائل پر اختلافات، چال بازیاں، پس پشت گروہ بندیاں۔ ان سب کو دیکھ کر وہ بددل اور متنفر ہوگئے۔ انھیں اس کا تو پہلے سے اندازہ تھا کہ فرقہ وارانہ سوال پر مشکلات پیدا ہوں گی دراصل انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ انھیں لندن تبھی جانا چاہیے جب ہندوستان میں فرقہ وارانہ مفاہمت ہوجائے۔ ان کے ساتھیوں نے ان کی بات نہ مانی لیکن وہ ان مظاہرات کے لیے تیار نہیں تھے جن کا انھیں لندن میں مشاہدہ کرنا پڑا۔ بعض مندوبین کا عدم خلوص بالکل عیاں تھا، باقی لوگ بظاہر یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ مرکزی سوال آئین سازی کا تھا نہ کہ آزادی ملنے کے پہلے آزادی کے مالِ غنیمت کی چھینا جھپٹی کا انگلستان میں آنے کے بعد پندرہ دن کے اندر ہی انھوں نے اقرار کیا کہ وہ خود کو کانفرنس میں تنہا محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے سر سیمول ہور سے دل کھول کر بات کی لیکن باہمی اختلاف رائے ہی پر تان ٹوٹی۔ گاندھی نے محسوس کیا کہ انھوں نے ان طاقتوں کا اندازہ بہت کم کیا تھا جو ان کے اور کانگریس کے خلاف صف آرا تھیں۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ کانفرنس دھیرے دھیرے خاتمے کو پہنچ رہی ہے تو انھیں سکون سا ہوا۔ برطانوی وزیراعظم، ریمزے میک ڈانلڈ نے اپنی اختتامی تقریر میں یہ وعدہ کیا کہ وہ فرقہ وارانہ سوال کا ایک حل عائد کریں گے اور ایک کمیٹی ہندوستان جانے، اور مزید جانچ کرنے کے لیے مقرر کریں گے تاکہ ایک ''ہمہ گیر قانون'' بن سکے۔

اس زمانے میں ہندوستان سے مضطرب کرنے والی خبریں آنے لگی تھیں۔ ''صلح'' پر عملدر آمد روز بروز غیر اطمینان بخش ہوتا جارہا تھا۔ بنگال کے لیے ایک نیا آرڈی نینس جاری کردیا گیا تھا اور کانگریسی کارکنوں کو صوبۂ شمال مغرب (سرحد) اور صوبجات متحدہ (یوپی) میں گرفتار کرلیا تھا۔ ان کے ہندوستانی رفقا کو یہ صاف نظر آرہا تھا کہ مہاتما کا سیاسی مشن، ناکام ہوگیا۔ سی۔ ایف اینڈ ریوز کی نظر میں یہ ایک ''شاندار ناکامی'' تھی لیکن بہت سے مبصرین کو اس میں کوئی شاندار بات

نظر نہیں آتی تھی۔ وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور تھے کہ قوم پرور عناصر کے خلاف جو طاقتیں صف آرا تھیں مہاتما نے ان کا غلط اندازہ لگایا تھا اور ان کو فروتر سمجھا تھا۔ وی۔ جے پٹیل نے گاندھی۔ ارون معاہدے کو پہلے ہی شک وشبہ کی نظر سے دیکھا تھا۔ وہ کانفرنس کے زمانے میں لندن میں موجود تھے۔ انھوں نے مہاتما سے اصرار کیا کہ وہ لیگ آف نیشنس (مجلس اقوام) سے اپیل کریں اور کانفرنس سے کوئی توقع نہ رکھیں۔ ایک زیرک سیاست داں کی حیثیت سے انھیں یہ سوچ سوچ کر غصہ آرہا تھا کہ مہاتما اپنے مخالفین کے خلاف حکمت عملی سے فائدہ اٹھانے اور عالمی رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے جارحانہ پروپا گنڈا کرنے کی کوشش بھی نہ کریں گے۔

لندن کے ایسٹ انڈ میں، لندن کے درمیان، بچوں کے چاچا گاندھی بے حد ہر دل عزیز ہو گئے تھے۔ وہ ان کے معصومانہ اور بعض اوقات دوررس سوالات کا جواب دیتے، اپنے بچپن کے قصے سناتے اور ان کو سمجھاتے کہ انھوں نے ایسٹ انڈ میں رہنا کیوں پسند کیا اور اتنا کم لباس کیوں پہنتے ہیں۔ وہ ان کو برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کا مشورہ دیتے۔ اس مشورے کا ایک دلچسپ رد عمل بھی سنیے۔ ایک چار سال کی بچی کے باپ نے مہاتما سے کہا کہ مجھے آپ سے کچھ جھگڑا کرنا ہے۔ گاندھی نے پوچھا ''وہ کیا؟'' ''حضت! میری ننھی جین روزانہ صبح کو میرے پاس آتی ہے، مجھے مارتی ہے اور جگا دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ''اچھا اب آپ مجھے نہ ماریئے گا کیوں کہ گاندھی نے ہم سے کہا ہے کہ کسی کو بدلے میں نہ ماریں۔'' ان کے یوم پیدائش 2 اکتوبر کو بچوں نے انھیں دو اونی کتے، تین گلاب رنگ کی موم بتیاں، ایک ٹین کی پلیٹ، ایک نیلی پنسل اور کچھ جیلی کی مٹھائیاں تحفے میں دیں۔ ان تحفوں کی انھوں نے بڑی بڑی قدر کی اور اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے۔ مہادیو دیسائی نے لکھا ہے کہ ''انگلستان میں ہزاروں بچوں نے گاندھی کو ساحلِ انگلستان چھوڑنے سے پہلے دیکھا ہوگا اور کون جانے یہی وہ نسل نہ ہو جس سے ہمیں حساب کتاب چکانا پڑے۔''

لنکا شائر کے روئی کے کاروباریوں نے گاندھی سے جس خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا وہ اس سفر کا سب سے زیادہ خوش گوار اور تعجب انگیز تجربہ تھا کیوں کہ کانگریس کی جانب سے برطانوی مالک کا بائیکاٹ کیے جانے کی سب سے زیادہ زد انھیں لوگوں پر پڑ رہی تھی۔ جو لوگ بے روزگار ہو گئے تھے ان کی پریشانیوں کی داستان انھوں نے بڑی توجہ سے سنی۔ ان میں بہت سے لوگوں کو

گاندھی کے چلائے ہوئے بائیکاٹ کا پس منظر سمجھ میں آنے لگا۔ جب انھوں نے ان کو بتایا کہ ''آپ کے یہاں تیس لاکھ بیکار ہیں اور ہمارے یہاں تیس کروڑ افراد آدھے سال بے روزگار رہتے ہیں۔آپ کو ستر شلنگ بے روزگاری کی امداد ملتی ہے اور ہمارے یہاں ماہوار آمدنی کا اوسط سات شلنگ چھ پنس ہے۔''

ان کے بعض انگریز دوستوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ایسٹ انڈ میں قیام کرکے وہ انگلستان کے ان وسطی اور اعلیٰ طبقات سے صرف نظر کر رہے تھے جو حقیقتاً ہندوستان کا مستقبل طے کرتے ہیں۔اس لیے انھوں نے اس کا انتظام کیا کہ گاندھی سیاست، مذہب، سائنس اور ادبیات کے بہترین برطانوی دماغوں سے مل سکیں۔ وہ برنارڈ شا سے ملے جن کو ان میں قرابت داری کی روح ملی۔انھوں نے کمیٹی کے کمروں میں ممبران پارلیمنٹ سے ملاقات کی انھوں نے چرچ کے عمائد اور اسقفوں سے ملاقات کی۔انھوں نے ایٹن کے طلبہ لندن اسکول آف اکنامکس کے طالب علموں کے سامنے تقریر کی۔اکسفورڈ میں انھیں ماسٹر ہیلی اوّل، ڈاکٹر لنڈ سے نے بلایا اور وہاں انھوں نے ڈاکٹر گل برٹ مرے، گل برٹ سالٹر، پروفیسر کوپ لینڈ، ایڈورڈ ٹامس وغیرہ سے ملاقات کی اور ہندوستانی طلبہ کے بلائے ہوئے جلسے میں تقریر کی۔ وہ لائڈ جارج سے ملنے گئے اور چارلی چیپلن، جنھوں نے گاندھی کو کبھی نہیں دیکھا تھا، ان سے ملنے کے لیے آئے۔

ان غیر رسمی ملاقاتوں کے نتائج کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔معزز مہمان کے لیے انگریزی خوش خلقی اکثر اس کی شخصیت کی واقعی اثر انگیزی پر پردہ ڈال دیتی تھی۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ کانگریس کے مقاصد اور عام برطانوی نقطۂ نظر کے درمیان ایسی خلیج حائل تھی جس پر پل بنانا تقریباً ناممکن تھا۔بس ایک بہت ہی مختصر سی اقلیت مہاتما کے ساتھ اس مقصد کے حصول میں متفق تھی کہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان برابر کی ساجھے داری ہو۔فوری طور سے وہ کسی کو قائل نہ کر سکے۔ برطانوی سیاست دانوں اور مفکروں کی اکثریت کے نزدیک وہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری کے مشکل راستے پر بہت دور تک اور ضرورت سے زیادہ تیز لے جانا چاہتے تھے اس کے باوجود جن لوگوں سے وہ ملے ان میں سے بعض کے ذہنوں پر ان کی بے تصنع منطق اور شفاف خلوص کا نہ مٹنے والا نشان باقی رہ گیا۔ جسے عام پریس انھیں دھوتی اور بکری کے دودھ والی شخصیت کی حیثیت سے

متعارف کرا کر محظوظ ہو رہا تھا لیکن ان (ملنے والوں) کے ذہنوں پر اس ہستی کا زیادہ واضح تصور وتاثر قائم ہوا۔ ان خیالات کو شیخ چلی کا منصوبہ سمجھا گیا ہو یا انقلابی، لیکن انھیں ''ابلہ فریبی'' کہ کرٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ لندن میں آمد کے موقع پر اخبار ''ٹرتھ'' نے انھیں الفاظ میں گاندھی کو خوش آمدید کہا تھا۔

اگرچہ سی، ایف، اینڈ ریوز جز وقتی مشاہد تھے۔ لیکن گاندھی کے دورے کے دوران گول میز کانفرنس کے باہر کی ملاقاتوں کی قدر و قیمت کا خلاصہ بیان کرتے وقت انھوں نے طویل المدتی اثرات کا اندازہ لگانے میں غالباً زیادہ غلطی نہیں کی۔'' ان کی بے مثال شخصیت نے بہترین انگریزوں کے دلوں کو موہ لیا اور اپنی تازگی خیالات کی وجہ سے انھوں نے اپنے ملاقاتیوں کو ایک ایسے نہج سے سوچنے پر مجبور کیا جسے انھوں نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ انھوں نے ہر امر میں گاندھی سے اتفاق تو نہیں کیا لیکن ان کو اس ہستی میں جو روح جلوہ گر تھی اس کی سب نے متفقہ طور پر عزت کی۔ انگلستان ایک چھوٹا سا ملک ہے اور اس طرح کے تاثرات بہت جلد دور دور تک پھیل جاتے ہیں۔ سنجیدہ ذہن کا کوئی مرد یا عورت اب اس عام خیال کا نہیں رہ گیا تھا کہ کچھ بھی ہو مہاتما گاندھی ''ناقابل برداشت کٹر پنتھی'' ہیں (1)

ہندوستان سے جو خبریں آ رہی تھی وہ ہرگز اطمینان بخش نہیں تھیں۔ ان کے انگلستان جانے سے فوراً پہلے جو صلح کانگریس اور حکومت کے درمیان کسی طرح جوڑی گانٹھی گئی تھی وہ تقریباً ٹوٹ چکی تھی۔ مہاتما وطن جانے کو بے چین تھے ان کے پاس اس مقصد کے جو دعوت نامے آئے کہ وہ یورپ میں اپنے سفر کو طول دیں اور امریکہ جائیں، وہ انھوں نے نامنظور کر دیئے۔ لیکن ہندوستان واپس جاتے ہوئے انھوں نے سوئٹزر لینڈ میں چند دن رومن روماں کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا۔

مہادیو دیسائی اور پیارے لال، (اپنے سکریٹریوں) میرا بین (مس سلیڈ) اور (اپنے بیٹے) دیوداس کے ساتھ وہ 6 دسمبر کو ولے نیو، پہنچے۔ اپنی کتاب ''مہاتما گاندھی'' میں جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں ہونے والی پہلی عدم تعاون تحریک کے فوراً بعد شائع ہوئی تھی

(1) چارلس فریز اینڈ ریو'' چتر ویدی'' بی اور ساٹکس، ام۔لندن 1949 ص:254

رولاں نے گاندھی جی کی زندگی اور پیغام کو قابل تعریف دقت نظر سے تشریح کی تھی اور یہ امید ظاہر کی تھی کہ تشدد سے مملو یورپ کو ان کا عدم تشدد اور قربانی کا پیغام شاید اب بھی خود کشی سے بچالے''ایک بات بالکل واضح ہے۔ یا تو گاندھی کی روح فتح مند ہوگی یا یہ ایک بار اور ظاہر ہوگی بالکل اسی طرح جیسے صدیوں پہلے مسیح اور بدھ ظاہر ہوئے تھے اور آخر کار یہ ایسے نیم دیوتا انسانی پیکر میں زندگی کے اس اصول کے کامل مجسمے کی صورت میں ظہور پذیر ہوگا جو ایک نئی انسانیت کو ایک نئی راہ پر لے جائے گا۔''

گاندھی اور رولاں روزانہ گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ رولاں کی بہن کے لفظوں میں وسیع میدان کا احاطہ کرتی ہوئی ان دونوں کی گفتگو کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

''میرے بھائی گاندھی کے سامنے یورپ کی افسوس ناک صورت حال بیان کرتے ہیں۔ آمروں کے ستائے ہوئے عوام کی تکالیف کا حل، پرولتاریت کا وہ ڈراما جو ایک بے نام اور بے رحم سرمایہ داری کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش میں (نمودار ہوا) اور آزادی اور انصاف کے حصول کے جائز مقصد کو سامنے رکھ کر وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس سے باہر نکلنے کا اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔ بغاوت اور خون خرابہ مغربی انسان اپنی تعلیم، اپنی روایت اور مزاج کسی اعتبار سے اہنسا کے مذہب کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔

''......گاندھی سنتے ہیں، سوچتے ہیں، وہ عدم تشدد میں اپنے غیر متزلزل عقیدے کو دہراتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ یہ جانتے ہیں کہ متشکک یورپ کو یقین دلانے کے لیے عدم تشدد میں ایک کامیاب تجربہ ضروری ہوگا۔ کیا یہ تجربہ ہندوستان فراہم کرے گا؟ ان کو یہی امید ہے۔''(1)

سوئٹزرلینڈ میں گاندھی کی آمد سے مقامی طور پر بڑا جوش وخروش پیدا ہوا۔ لیمن کے گوالوں کی سنڈیکیٹ نے گاندھی کے میزبان کو تار بھیجا کہ وہ ''ہندوستان کے بادشاہ'' کو دودھ سپلائی کرنا چاہیں گے۔ پیرس کے ایک جاپانی مصور اس لیے دوڑا ہوا آیا کہ وہ ہندوستانی لیڈر کے اسکیچ بنائے گا۔ ایک نوجوان موسیقار ان کی کھڑکی تلے وائلن بجاتا تھا۔ اٹلی کے آڑھتیوں نے ہندوستانی سنت سے اگلی لاٹری نکالنے کے لیے دس بابرکت نمبر بتانے کی خواہش کی۔ اسکول کے بچے ان

(1) شکلا (ایڈیٹر) گاندھی جی کے واقعاتِ زندگی (ان سی ڈِنٹس آف گاندھی جیز لائف) ص:294

کے لیے پھولوں کا تحفہ لاتے۔ وہ امن پسندوں کی پرائیویٹ نشستوں کو خطاب کرتے۔ لوزین اور جنیوا میں انھوں نے عام جلسوں کو خطاب کیا اور سوالوں کے جواب دیئے۔ اگر حملہ ہو تو سوئٹزرلینڈ کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا اسے اپنی فوج پر بھروسہ کرنا چاہیے؟ گاندھی جی جواب دیتے، ''فوج بے کار ہے۔ یہ کافی ہوگا کہ مرد، عورتیں اور بچے تمام شہری دشمن کے سامنے ایک دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں۔ طبقاتی جنگ کے سوال پر ان کا تبصرہ یہ تھا، ''مزدوروں کو اپنی طاقت کا علم نہیں ہے۔ اگر اسے علم ہوتا تو اس کے کھڑے ہوتے ہی سرمایہ داری کی دیوار ڈھ جاتی۔ کیوں کہ مزدور کی طاقت ہی دنیا کی واحد طاقت ہے۔'' عام جلسوں میں گاندھی سے کافی وق کرنے والے سوال کیے جاتے۔ لیکن یہ ہنسی اڑانے والے (جیسا کہ رومین رولاں نے بعد میں لکھا) ان زوردار حقائق کے سامنے چپ ہو جاتے اور ایک گھٹن سی محسوس کرنے لگتے اور غصے سے تھرتھراتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ مہاتما کی صاف صاف باتوں کو سن کر سوئیس شہریوں کے متوسط طبقہ کو دھچکا سا لگا۔ ان کی امن پسندی بہت زیادہ محاربانہ اور ان کے اقتصادی نظریات بہت زیادہ انقلابی نظر آئے۔ پریس کھلم کھلا مخالف ہو گیا۔ اور اگر وہ دوسرے ہی دن سوئٹزرلینڈ سے واپس نہ جا رہے ہوتے تو ان کے میزبانوں کو اندیشہ تھا کہ انھیں ناپسندیدہ فرد قرار دے کر ملک سے نکال دینے کا منصوبہ قطعی بن جائے گا۔

گاندھی جی نے واپسی میں ایک دن روم میں گزارنے کا ارادہ کیا تھا۔ رومین رولاں نے انھیں متنبہ کر دیا کہ وہ فسطائیوں کی شرارتوں سے چوکنے رہیں اور وہاں ایک ایسے دوست کے یہاں ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا تھا جن کی دیانت شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ روم میں وہ وے ٹی کن کے تصویر خانوں کو دیکھتے چل رہے سیس ٹین چے پل میں وہ مسحور ہو گئے۔ ''میں نے وہاں حضرت عیسیٰ کی ایک تصویر دیکھی۔ یہ حیرت انگیز تھی۔ میرے لیے اس سے دامن چھڑانا ناممکن ہو گیا۔ جب میں اس تصویر کو گھور رہا تھا تو میری آنکھو سے آنسو ابل پڑے۔'' پوپ نے انھیں شرف حضوری نہیں بخشا لیکن مسولینی نے بلا لیا۔ پانچ مہینے بعد یرودا میں جیل کے ایک افسر نے موخرالذکر کے بارے میں کہا کہ وہ ایک دلکش شخصیت تھی۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ ''ہاں لیکن وہ ایک جلاد لگ رہا تھا۔ جو حکومت سنگینوں پر قائم ہو وہ کتنے دن چل سکتی ہے؟''(1)

(1) ڈائریز آف مہادیو دیسائی (اندراج بابتہ 26 مئی 1932ء)

ایک اطالوی دخانی مسافر جہاز ''پاسنا'' پر برن ڈیزی کے لیے سوار ہونے کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ ''جرنل ڈی اٹالیا'' نے ان کی ایک اخباری ملاقات چھاپ دی جس میں ان سے یہ بیان منسوب کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان میں تحریک سول نافرمانی کا از سرِنو آغاز کرنے جا رہے ہیں۔ انھوں نے روم میں کوئی اخباری انٹرویو نہیں دیا تھا اس لیے انھوں نے لندن کو بحری تار روانہ کیا کہ یہ رپورٹ سراسر جعلی ہے۔ اس انکار کے باوجود، بہت سے برطانوی اخبارات اور سیاست داں یہ بکتے رہے کہ مسٹر گاندھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے کٹر پنتھی سیاست داں اور ہندوستان کے برطانوی ضابطہ پرست افسران'' کانگریس سے کوئی تعلق نہ رکھنے کی عرصہ دراز سے چلی آ رہی پالیسی کی طرف لوٹنے کے لیے جو بہانہ تلاش کر رہے تھے، وہ ''جرنل ڈی اٹالیا'' نے مہیا کر دیا۔ گاندھی۔ ارون معاہدہ تو اس پالیسی سے بس ایک عارضی انحراف تھا۔

باب36

مصالحت کا خاتمہ

28دسمبر 1931 کو گاندھی ساحل بمبئی پر اترے۔ایک ہفتے کے اندر وہ جیل پہنچ گئے اور سِول نافرمانی پھر سے شروع ہوگئی۔انڈین نیشنل کانگریس کوتقریباً غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور گاندھی۔ارون معاہدے کی دھجیاں اڑادی گئیں۔سیاسی منظر میں اس تیزی سے اور غیر متوقع موڑآ جانے کا سبب صرف اس معرکہ خیز ہفتے کے واقعات میں تلاش نہ کرنا چاہیے جو گاندھی کی واپسی اور دوبارہ گرفتاری پر پیش آئے بلکہ کانگریس اور حکومت کے درمیان مخالفت کی اس تہ نشین رَو میں ڈھونڈھنا چاہیے جسے گاندھی۔ارون معاہدہ ختم کرنے میں ناکام رہا۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک آزادی کی بنیادی مانگ کا تعلق ہے گاندھی۔ارون معاہدے میں کانگریس کو بہت ہی کم مراعات ملی تھیں۔اس کے باوجود گاندھی کا یہ خیال تھا کہ اس معاہدے نے شک وشبہ کی اس فصیل میں جو قوم پرور ہندوستانیوں اور برطانوی حکومت کے درمیان حائل تھی۔ چاہے وہ کتنی ہی پتلی کیوں نہ رہی ہو ایک دراڑ ڈال دی تھی۔لارڈ ارون اس بات سے مطمئن تھے کہ کم از کم وقتی طور سے کانگریس عدمِ تعاون کی راہ سے ذرا ہٹ کر ہندوستان کے لیے ایک نئے آئین کی گفت وشنید میں حصہ لینے کو تیار ہوگئی تھی۔بدقسمتی سے معاہدے پر دستخط ہونے کے فوراً بعد ہی لارڈ ارون اپنے عہدے سے الگ ہوگئے۔کانگریس سے ان کے مصالحانہ

رویہ اختیار کرنے پر اعتراض کرنے والے صرف برطانوی کٹر پنتھتوں کی صفوں ہی میں نہیں تھے بلکہ ان کے ہندوستانی رفقا اور سینئر افسروں کے درمیان بھی متشکک موجود تھے۔ معاہدے پر دستخط کی تاریخ 4 مارچ 1913 اور گاندھی کی انگلستان کے لیے روانگی کی تاریخ 29 اگست 1913 کے درمیانی وقفے میں ہندوستانی سیاست کو بحرانوں کے ایک سلسلے نے ہلا کر رکھ دیا اور کانگریس اور حکومت تقریباً ایک تصادم کے کنارے پہنچ گئے۔

16 جون 1931 ہی کو حکومت ہند نے تحریک سول نافرمانی کی تجدید سے نپٹنے کے لیے آرڈی نینس کا جو ہمہ گیر مسودہ تیار کیا تھا اس کو بھیجتے وقت سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند کی توجہ سیاسی صورت حالات میں ''عدم استقلال کے بعض عناصر'' کی طرف مبذول کرائی تھی۔ اس کو یہ خوف تو نہیں تھا کہ سول نافرمانی فوراً شروع کردی جائے گی کیوں کہ ان کے خیال میں متحارب کانگریس بھی ''تنظیم او راستحکام'' کے لیے معقول وقفہ'' چاہتے تھے۔ دراصل اسی سبب سے ''حکومت ہند کو الجھن تھی کیوں کہ اس میں شک نہیں کہ معاہدے کا ایک اثر تو یہ ہوا ہی تھا کہ کانگریس کا وقار بڑھ گیا تھا اور گورنمنٹ کا گھٹ گیا تھا۔ بڑی حد تک اقتصادی حالات کا سہارا پا کر کانگریس نے دیہی حلقوں میں اپنا اثر بڑھا لیا تھا اور یہ یقین کرنے کے اسباب موجود تھے کہ وہ اس سوچی سمجھی پالیسی پر چل رہی تھی کہ اگر سول نافرمانی چلانا ہی پڑ جائے تو دیہاتوں میں جنتا کی مدد حاصل کی جاسکے۔''

حکومت ہند نے آگے چل کر صوبائی حکومتوں کے ان خدشات کا ذکر کیا تھا کہ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ مصالحت کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے حکومت صورتِ حالات اس حد تک خراب ہونے دے کہ بے حد سنگین خطرہ لاحق ہو جائے۔'' اگست 1931 میں جب یہ بات حد یقین کو پہنچ گئی کہ کانگریس گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہوگی۔ تو صوبائی حکومتوں کو یہ مشورہ دیا گیا کہ سول نافرمانی کے پھر سے شروع ہونے کی صورت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کو ایک غیر قانونی ادارہ قرار دے دیا جائے۔ گاندھی اور غالباً دوسرے اہم لیڈر پہلے دس دنوں کے اندر گرفتار کر لیے جائیں گے اور ایک سلسلے سے کئی آرڈی نینس جاری کردیے جائیں گے۔

گاندھی جی کی لندن کو روانگی سے پہلے تو یہ محسوس ہوا کہ مطلع صاف اور تناؤ کم ہو گیا ہے۔ وہ

''دوسری مصالحت''، جس کی رو سے طویل اور نازک مرحلوں سے گزرتے ہوئے شملہ مذاکرات کے بعد اگست 1931 کے آخر میں ان کے لندن جانے کا راستہ ہموار ہوا تھا، صرف لیس پوت تھی اور ان مسائل کی کوئی ایک گتھی بھی نہ سلجھی تھی جن کے حل کے لیے (حالات کا) زبردست تقاضا تھا۔

1931 کے موسم گرما اور موسم خزاں میں ہندوستانی سیاست کے تین طوفانی مراکز تھے۔ بنگال، شمال، مغربی سرحدی صوبہ اور صوبہ جات متحدہ (یوپی) گاندھی اروِن معاہدہ سے بنگال کی تکلیفوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ عام سیاسی رہائی کے دائرے میں وہ ہزاروں نوجوان نہیں آئے جنھیں مقدمہ چلائے بغیر جیلوں میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یورپین سرکاری اور غیر سرکاری عناصر کے خلاف خفیہ دہشت پسندوں کی کارروائیوں نے کانگریس کے لیے مسئلے کو اور الجھا دیا تھا۔ ایک طرف اس کا سامنا انقلابیوں کی دہشت پسندی کے دیو سے تھا اور دوسری طرف حکومت کی جوابی دہشت پسندی کے بلاخیز گرداب سے تھا۔ موخر الذکر کے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ انقلابیوں اور کانگریس کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں دونوں ہی کے بیشتر ارکان کا تعلق ہندو متوسط طبقے سے تھا۔ اس لیے کانگریسی اکثر ایسے قوانین اور آرڈی نینسوں کی زد میں آجاتے تھے جو نراجیوں کے لیے وضع کیے جاتے تھے۔ جس زمانے میں گاندھی لندن میں تھے تو کم از کم تین موقعوں پر بنگال ابھر کر روشنی میں آیا پولیس نے ہجلی جیل میں سیاسی قیدیوں پر گولی چلائی اور (جیسا کہ بعد میں عدالتی تحقیقات سے ظاہر ہوا) کس قدر بے رحمی سے چلائی۔ چٹگام میں ایک فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں پراسرار طریقے پر یورپینوں اور اینگلو انڈینوں کے ملوث ہونے کا الزام تھا۔ ان سب میں بدترین اس سخت آرڈی نینس کا اجراء تھا جس کی رو سے بعض علاقوں کی ساری ہندو آبادی سے تقریباً دشمنوں جیسا سلوک کیا گیا تھا۔ بارہ سے بیس سال کے ہر ایک فرد کے لیے شناختی کارڈ لازمی قرار دے دیا گیا، لباس پر پابندی لگا دی گئی۔ اسکولوں پر پابندی لگا دی گئی یا انھیں بند کر دیا گیا۔ سائیکلوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔ کرفیو لگا دیا گیا اور چند افراد کے جرم کرنے پر سارے گاؤں یا قصبے پر اجتماعی جرمانے عائد کر دیئے گئے۔

دسمبر 1931 میں پارلیمنٹ کے مزدور حزبِ اختلاف کے لیڈر، جارج لینس بری نے سکریٹری آف اسٹیٹ سر سیموئل ہور کو لکھا ''میں نے سر تیج بہادر سپرو اور ان کے رفقاء سے ان کی

قیامِ انگلستان کے دوران ملاقات کی ۔ گاندھی اور ان کے دوستوں سے بھی۔ جاتے وقت ان میں سے ہر ایک نے یہ بات میرے ذہن نشین کرانا چاہی کہ ان لوگوں کے نزدیک یعنی ہندوستان کے ہر طبقۂ خیال سے متعلق افراد کے نزدیک۔ اتنا یقینی تھا کہ اگر بنگال آرڈیننس کو باقی رکھا جاتا تو حکومت کے لیے زبردست مشکلات کا ایک دور پیش آنے والا ہے، اور خیر ہندوستانیوں کے لیے تو زحمتوں اور مشکلوں کا سامنا ہے ہی۔'' جواب میں سر سیموئل کا لہجہ تو بہت ہی خوش اخلاقانہ تھا لیکن وہ بنگال کے لیے آرام سے گلوخلاصی کا کوئی وعدہ نہ کر سکے۔

شمال مغربی سرحدی صوبے کے مسائل بھی قریب قریب ایسے ہی لاینحل تھے۔ ہندوستانی برصغیر کے اس چاروں طرف سے بند علاقے میں مقامی حکام صرف ایسی مخالفت کے عادی تھے جو قبائلی منطق میں کبھی کبھی بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوا کرتی تھی اور جو اکثر طاقت کے مظاہرے سے دبا دی جاتی تھی۔ خان عبدالغفار خاں کی سرخ پوش تحریک اور کانگریس سے اس کے گہرے لگاؤ نے صوبے کی نیم فوجی انتظامیہ کے سامنے ایک مشکل مسئلہ لا کھڑا کیا تھا۔ جو لوگ یہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ پٹھانوں کے لیے بندوق چھونا ناممکن ہے۔ ان کے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا اگر عبدالغفار خاں پرامن قوم پرستی کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ مغربی و شمالی سرحدی صوبے کی حکومت بار بار وایسرائے کو ان خطرات سے آگاہ کیے جا رہی تھی جو خان عبدالغفار خاں کے گرفتار نہ کرنے سے لاحق ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف خان عبدالغفار خاں کو یہ یقین تھا کہ وہ مجرم کم اور مظلوم زیادہ تھے۔ جب گاندھی لندن میں تھے تو خان عبدالغفار خاں نے انھیں خط لکھا (16 نومبر 1931) اور اس میں ان سے یہ اصرار کیا کہ وہ اہل برطانیہ کو ان مظالم کی داستان ضرور سنائیں جو برطانیہ کے ہندوستانی ایجنٹ یہاں ایجاد کر رہے تھے۔'' حکومت نے خدائی خدمت گاروں (سرخ پوشوں) کے خلاف بدترین مظالم کا آغاز کر رکھا تھا۔ وہ ان کے دفاتر پر حملہ کر کے انھیں وہاں زدوکوب کرتے ہیں۔ خدائی خدمت گاروں کو جیلوں میں ٹھونسا جا رہا ہے، انھیں ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی اور اس سودے میں ان پر بید برسائے جاتے ہیں۔''

سرخ پوش (سرخ قمیص) لیڈر کی سیدھی سادی خطابت مقامی انتظامیہ کے لیے ناقابل برداشت ہوگئی اور بالآخر وایسرائے نے پشاور کے دباؤ کے آگے سر جھکا دیا اور گورنر کو یہ اجازت

دے دی کہ وہ عبدالغفار خاں کو گرفتار کرلے اور گاندھی کے ساحل بمبئی پر پہنچنے کے چار دن پہلے ہی ایمرجنسی اختیارات حاصل کرلے۔

طوفان کا تیسرا مرکز صوبہ جات متحدہ (یوپی) تھا۔ وہاں مسئلہ بنیادی طور پر اقتصادی تھا۔ قیمتوں کے ایک دم گر جانے سے کسانوں کو سخت ضرب لگی تھی۔ حکومت نے مال گذاری میں چھوٹ دے کر کچھ رعایت کی تھی لیکن زمینداروں نے لگان میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ زمیندار جماعتی طور پر برطانوی راج کے وفادار رہے تھے۔ اس لیے حکومت کوئی ایسا قدم اٹھانے میں پس وپیش کررہی تھی جس سے وہ ان زمینداروں کی ہمدردیاں کھو بیٹھے۔ گاندھی نے پہلے گورنر صوبہ سے نینی تال میں اور پھر وایسرائے سے شملہ میں گفت وشنید کے ذریعے یہ کوشش کی کہ یوپی کے مفلوک الحال کسانوں کو مزید مراعات مل جائیں لیکن وہ ناکام رہے۔ گاندھی کے لندن جانے کے بعد جواہر لال نہرو انھیں یہاں کے حالات سے مطلع کرتے رہے۔ نہرو کا خیال تھا کہ صوبائی حکومت ضلع حکام کو روکنے کی کوشش کررہی تھی لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہورہی تھی۔ کانگریس کے نقطۂ نظر سے مسئلے کا لب لباب یہ تھا کہ لگان اور مالگذاری کی عدم ادائیگی کی پاداش میں کسانوں کا اراضیوں سے اخراج روکا جائے۔ پچھلی فصل میں ان میں سے بہتوں نے اپنا سارا مختصر اثاثہ اور مویشی اس لیے بیچ ڈالے تھے کہ زمینداروں اور حکومت کا کل مطالبہ ادا کرسکیں۔ الہ آباد ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی نے جواہر لال نہرو کے زیر ہدایت ستیہ گرہ کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ نہرو کے لفظوں میں یہ ''عدم ادائیگی لگان'' کی تحریک نہیں بلکہ ''مناسب لگان'' کی تحریک تھی تاکہ غریب کسانوں کو لگان اور مالگذاری میں چھوٹ دلوائی جاسکے کہ قیمتوں کے گرنے سے ان کا جو نقصان ہوا ہے اس کی مناسب تلافی ہوسکے۔ انھوں نے گاندھی کو لندن کے پتے پر ایک لمبا خط بھیجا اور اس میں صوبجات متحدہ کے زرعی حالات میں بڑھتے ہوئے بحران کو مفصل طور سے بیان کیا تھا۔

گاندھی نے مختصر جواب دیا۔ ''تمہارا تارتم بے پس وپیش حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر ضروری اقدام کرو۔ یہاں سے کچھ امید نہ رکھو۔'' گاندھی کو یوپی کے کسانوں کی مشکلات کا علم تھا اور انھیں جواہر لال نہرو کی قوتِ فیصلہ پر اعتماد تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ معقول دلیل دے سکتے تھے کہ وہ بنیادی طور پر اقتصادی مسئلے کے حل کی خاطر ایک مقامی ستیہ گرہ تحریک کی اجازت دے رہے

تھے لیکن وائسرائے اور ان کے مشیروں کی نگاہ میں نہرو کے نام گاندھی کے تار سے اس شبہے کی تصدیق ہوگئی کہ گاندھی سے مصالحت ناممکن ہے۔ گول میز کانفرنس کے فرقہ وارانہ اور آئینی سوالوں پر اٹک جانے اور گاندھی کی کھلم کھلا ناامیدی کے بعد، ان لوگوں کو سِول نافرمانی نہ صرف ممکن بلکہ عین قرین قیاس معلوم ہونے لگی تھی۔

جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، حکومت نے کانگریس کے خلاف ایک جارحانہ پلان پہلے سے ہر طرح مکمل کرلیا تھا۔ حکومت ہند اور صوبائی حکومتیں مہینوں سے ان اختیارات خصوصی کی تفصیلات مرتب کررہی تھیں جن سے سول نافرمانی پھر سے شروع ہونے کی صورت میں انتظامیہ کے افسران کو مسلح کرنا تھا تاکہ کانگریس کو بے دست و پا کردینے والی ضرب لگائی جاسکے۔ آرڈی نینس کا مسودہ مرتب کرکے صوبائی حکومتوں کو بھیجا جاچکا تھا اور سول نافرمانی کا مجموعۂ ضوابط ترتیب پاچکا تھا۔ ابھی 6 نومبر 1931 کو گول میز کانفرنس ہو ہی رہی تھی کہ حکومت ہند کے محکمہ داخلہ نے صوبائی حکومتوں کو مطلع کیا کہ سکریٹری آف اسٹیٹ نے سِول نافرمانی کے سلسلے کے اقدامات کی عمومی منظوری دے دی ہے ''شرط یہ ہے کہ ان پر عمل درآمد کا فیصلہ خود شہنشاہ معظم کی حکومت اس وقت کرے گی جب اس کے پاس حکومت ہند سے یہ اطلاع پہنچ جائے کہ سول نافرمانی کے احیاء کی وجہ سے ایمرجنسی کے (غیرمعمولی) حالات پیدا ہوکر ایسے اقدام کا جواز مہیا ہوگیا ہے۔ حکومت کو یہ اندازہ ہے کہ اگر مقامی علاقوں سے بڑھے ہوئے پیمانے پر سِول نافرمانی کا از سرنو آغاز کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو وہ اس کی اطلاع شہنشاہ معظم کو فوراً پہنچا سکیں گے تاکہ وہ منظوری عطا کرسکے۔''

ابھی گاندھی سمندری سفر کرہی رہے تھے کہ 19 دسمبر 1931 کو حکومت ہند نے تمام صوبائی حکومتوں کو ایک کشتی چٹھی کے ذریعے آگاہ کیا کہ گاندھی جی کی واپسی کے فوراً بعد بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو اجلاس ہورہا ہے اس کے نتیجے میں کانگریس سے ٹکراؤ کا امکان ہے۔ جواز جنگ میں سِول نافرمانی تحریک کا عمومی احیاء اور یوپی میں عدم ادائیگی ٹیکس کی تحریک کی حمایت یا برطانوی اداروں اور مال کا بائیکاٹ شامل تھے۔ اگر کانگریس نے ان میں سے کسی ایک پالیسی کے حق میں ووٹ دیا تو اسے قائم شدہ اقتدار کے خلاف اعلان جنگ تصور کیا جائے گا۔

حکومت کی مزاجی کیفیت کا اندازہ اس خط سے کیا جاسکتا ہے جو حکومت بمبئی نے دلی کے

حکام بالا کے نام بھیجا تھا اور جس میں ان دشواریوں کا ذکر کیا تھا جو گاندھی کو بمبئی پریسڈنسی کے کسی جیل میں رکھنے سے پیدا ہوگی۔ ''اگر حکومت ہند اب بھی مسٹر گاندھی کو ہندوستان کے خاص براعظم ہی میں کسی مقام پر ہند اب بھی مسٹر گاندھی کو ہندوستان کے خاص براعظم ہی میں کسی مقام پر رکھنا ضروری سمجھتی ہے......تو کامپیٹو را ایک مناسب جگہ ہوسکتی ہے۔ مجھے بہرحال یہ کہنا ہے کہ گورنر اِن کاؤنسل چاہتے ہیں کہ مسٹر گاندھی کو انڈمان یا ہوسکے تو عدن بھیجنے پر اس پہلو پر غور کرلیا جائے کہ وہاں وہ سیاسی نفع اندوزی کی رسائی سے دور ہو جائیں گے اور وہاں مسٹر گاندھی کی نظر بندی سے حکومت کا اخلاقی دباؤ کہیں زیادہ مؤثر ہوگا اور سوِل نافرمانی کو کچل دینے کے حکومتی عزم اور طاقت کے مظاہرے کا بھی زیادہ فائدہ مند اثر مرتب ہوگا۔''

حکومت ہند کو یہ تجویز عملی نظر نہیں آئی لیکن یہ تو پہلے سے طے شدہ بات سمجھی جاتی تھی کہ گاندھی 1927 کے بمبئی رگولیشن نمبر 25 کے ماتحت گرفتار کرلیے جائیں گے۔ لارڈ ولنگڈن نے بظاہر یہ طے کر رکھا تھا کہ وہ اس طرح کا پس وپیش نہیں کریں گے جس کا مظاہرہ سول نافرمانی کے مصنف کو گرفتار کرنے کے سلسلے میں ان کے تین پیش رو لارڈ چیمسفورڈ، لارڈ ریڈنگ اور لارڈ اروِن کر چکے تھے۔ مرکزی اور صوبائی دفاتر میں بہت سے سینئر حکام کو یہ یقین تھا کہ اقتدار کی حکم عدولی کی جو تحریکیں گاندھی نے چلائی تھیں ان کو حکومت کے ابتدائی تذبذب اور نرمی سے فروغ ملا تھا اور یہ بھی کہ زیادہ مضبوط پالیسی سے اس شر کا شروع ہی میں قلع قمع ہوگیا ہوتا۔ ان میں بہتوں کے لیے گاندھی اروِن معاہدہ ایک کڑوی گولی تھی۔ اس معاہدے سے یہ بنیادی حقیقت تبدیل نہیں ہوئی تھی کہ کانگریس اس ہندوستانی سلطنت کو ختم کرنے کا عہد کر چکی ہے جس کی مذمت کرنے اور بچانے کی تاج (برطانیہ) کے ملازمین قسم کھا چکے ہیں۔ جو لوگ عدم تشدد کو صرف ایک نقاب سمجھ رہے تھے ان کی نظر میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ گاندھی کی قیادت میں کانگریس تشدد کے استعمال سے بالکل کنارہ کش تھی۔ جو افسر گاندھی کی نیت پر شک نہیں بھی کرتے تھے وہ اس بات پر شک کرتے تھے کہ ایک بار عوامی جذبات کو ابھار دینے کے بعد گاندھی میں یہ صلاحیت باقی رہ جائے گی کہ وہ اسے دبا بھی دیں۔

جب ہندوستان سے چار مہینے باہر رہنے کے بعد گاندھی 28/دسمبر 1931 کو ساحل بمبئی

پر اترے تو وہ پر امید تو نہیں رہ گئے تھے لیکن انھیں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ یہاں آ کر انھیں ایک پرلے درجے کے سیاسی بحران سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جواہر لال نہرو اور خان عبدالغفار خاں کی گرفتاری اور صوبہ جات متحدہ (یوپی) اور شمالی مغربی سرحدی صوبے میں آرڈی نینسوں کے نفاذ سے صورت حال نازک ہوگئی تھی۔ گاندھی نے بمبئی کے شہریوں کے ایک بڑے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ ''ہمارے عیسائی وایسرائے، لارڈ ولنگڈن نے ہمیں یہ (آرڈی نینس) کرسمس کے تحفے کے طور پر دیئے ہیں۔'' کانگریس ورکنگ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ حکومت نے آخری زور آزمائی کا فیصلہ کرلیا ہے اور حکومت کو ایک یہی جواب دیا جاسکتا ہے کہ سِول نافرمانی کی تحریک پھر سے چلائی جائے۔''

لیکن گاندھی حکومت کا نقطۂ نظر معلوم کرنے اور جب تک امید کی ایک بھی کرن باقی ہو پرامن حل تلاش کرنے کے لیے بے چین تھے۔ وہ روی میں ملک کو ایک دوسرے امتحان میں جھونکنا نہیں چاہتے تھے 29ردسمبر کو انھوں نے لارڈ ولنگڈن کو یہ تار بھیجا کہ ''میں جب ساحل پر اترا تو اس کے لیے بالکل آمادہ نہیں تھا کہ بنگال آرڈی نینس کے علاوہ سرحد اور یوپی میں بھی آرڈی نینس لگیں گے، سرحد میں گولیوں کا چلنا اور دونوں جگہ میرے عزیز دوستوں کی گرفتاریاں میرا انتظار کررہی ہوں گی۔ مجھے پتہ نہیں چل رہا ہے کہ میں ان کو اس بات کا اشارہ سمجھ لوں کہ ہمارے درمیان دوستانہ تعلقات ختم ہوگئے یا آپ اب بھی مجھ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ میں آپ سے مل کر یہ رہنمائی حاصل کروں کہ مجھے کانگریس کو مشورہ دینے کے لیے کیا راہ اپنانا ہے۔ تار سے جواب باعث عزت ہوگا۔''

دودنوں کے بعد وایسرائے کا جواب آ گیا۔ وہ یہ ماننے کو تیار تھے کہ یوپی اور سرحدی صوبے میں ان کے رفقائے کار نے جو غلط کام، کیے تھے اس کے لیے گاندھی ذمہ دار نہیں تھے اور وہ مہاتما کو انٹرویو دینے کے لیے اس شرط پر رضامند تھے کہ وہ یہ وعدہ کریں کہ گفتگو کے دوران وہ ان دونوں صوبوں کے واقعات کو زیر بحث نہ لائیں گے۔ یہ شرط لگانا حیرت ناک تھا کیوں کہ اگر انھیں خاص مسائل پر گفتگو کرنے سے روک دیا جائے جو حکومت اور کانگریس کے درمیان (مابہ النزاع) تھے تو پھر انٹرویو مانگنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی تھی۔ ولنگڈن بے انتہا بھولے

بھالے رہے ہوں گے اگر انھوں نے یہ سوچا ہوگا کہ وہ گاندھی اور جواہر لال نہرو اور خان عبدالغفار خاں کے مابین اختلاف پیدا کرسکیں گے۔ جواب میں گاندھی نے تصدیق کی ''جس زمانے میں میں ہندوستان سے باہر رہا اس دور میں میرے رفقائے کار نے جو کچھ کیا میں اس کی اخلاقی ذمہ داری کا منکر نہیں ہوسکوں گا اور چوں کہ کانگریس کی مجلس انتظامیہ کو کوئی مشورہ دینا اپنی معلومات مکمل کرنا ضروری تھا اسی لیے میں نے کھلے دل ودماغ سے اور نیک ترین ارادوں کے ساتھ ہزاکسیلنسی سے انٹرویو چاہا تھا......

گاندھی نے ایک بار اور وایسرائے سے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے اور ان سے گفتگو کے موضوع یا حدود کے بارے میں کوئی شرط لگائے بغیر ایک دوست کی حیثیت سے ملنے کی اپیل کی۔ انھوں نے یہ پیشکش کی کہ وہ ان دونوں صوبوں میں جا کر حالیہ واقعات کے بارے میں سرکاری اور عوامی دونوں ہی روایات کا جائزہ لیں گے اور (اگر تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ کانگریس نے غلطی کی ہے تو) اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کو صحیح راہ دکھائیں گے۔ یہ سچ ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی پہلے ہی سے سول نافرمانی کے منصوبے کا ایک خاکہ تیار کر چکی تھی لیکن اس وقت تک اس پر عمل نہیں کیا جانے والا تھا جب تک گاندھی وایسرائے سے صلح قائم رکھنے کے تمام امکانات کی تلاش ختم نہ کرلیں۔ وایسرائے پر مہاتما کے دوسرے تار کا ردعمل شدید ہوا۔ انھوں نے گاندھی پر ستیہ گرہ کی دھمکیاں دینے کا الزام لگایا اور انھیں متنبہ کیا کہ ''کانگریس نے جو اقدام کرنے کے ارادے کا اعلان کیا ہے اس کے جو بھی عواقب ہوں گے ان کی ذمہ داری ان پر اور کانگریس پر ہوگی۔''

اس وقت سیاسی حلقوں میں ان تاروں کی آمد ورفت سے خاصا جوش وخروش پیدا ہوگیا تھا۔ سیاست داں اور کالم نویس اس موضوع پر زوردار بحثیں کر رہے تھے کہ اگر لارڈ ولنگڈن گاندھی سے ملاقات پر راضی ہوگئے ہوتے تو ٹکراؤ روکا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ ٹکراؤ ملاقات کے انکار پر نہیں ہوا۔ اس کے اسباب بہت گہرے تھے اور ان کی بنیاد کانگریس اور حکومت کے مابین خود ان کے خلقی اختلافات تھے۔

یہ تاثر ناگزیز ہے کہ دسمبر 1931 تک بہت سے برطانوی افسر یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ کانگریس سے مصالحت کر کے غلطی کی گئی۔ آئی سی۔ ایس (انڈین سول سروس) کا ایک سابق

رکن اس دور میں ضلعوں کی سطح پر کام کرنے والے برطانوی افسران کی ذہنیت کی ہمیں ایک جھلک یوں دکھاتا ہے۔ ''بعض پہلوؤں کے اور سروس کے بہت سے ممبروں کے نزدیک یقینی طور پر وہ زمانہ جب جنگ چھڑی رہی تھی اس زمانے سے بہتر تھا جو کانگریس لیڈروں کی رہائی کے بعد شروع ہوا۔ ضلع افسروں کو خواہی نخواہی ان لوگوں کو دوست بنانا پڑا جن سے وہ لڑتا چلا آرہا تھا۔''[1]

مصالحت کے دوران انتظامیہ کے افسروں کو برابر یہ محسوس ہوتا رہا کہ دم مارنے کی مہلت مل گئی ہے، کانگریس اس کا فائدہ اٹھا کر اپنی پوزیشن مضبوط کررہی ہے اور دوسری ''بغاوت'' کی تیاری میں لگ گئی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان دس مہینوں میں نچلی سطح سے لے کر اوپر تک خدشات بلکہ بے جا دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی ضلع افسران صوبائی حکومتوں کو متنبہ کررہے تھے کہ بحران شدید ہوتا جارہا ہے اور یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ وقت پڑنے پر وہ کانگریس والوں کے خلاف جو کارروائیاں حسب ضرورت کریں گے اس میں انھیں (حکومت کو حمایت حاصل ہوگی۔ صوبائی حکومتیں حکومت ہند سے یہ یقین دہانی چاہتی تھیں کہ ''بگڑتی ہوئی صورت حال'' کا اگر وہ سختی سے مقابلہ کریں تو ان کی حمایت کی جائے گی۔ حکومت ہند نے ان خدشات کے بارے میں کسی حد تک شہنشاہ معظم کی حکومت کو آگاہ کیا اور ایک ایسے آرڈی نینس جاری کرنے کی اجازت مانگی۔ جس سے وہ اپنے کو ہر طرح کے ایمرجنسی اختیارات سے لیس کرسکیں۔ اور جب آخری لمحہ[2] آ پہنچے تو پوری طاقت سے اقدام کرسکیں۔

جب صوبائی اور مرکزی حکومتوں اور مقامی افسروں کی مزاجی کیفیت ایسی ہو تو شہنشاہ معظم کی حکومت ہی بحران سے بچالیتی تو بچالیتی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ سر سیمول نے گول میز کانفرنس کے دوران گاندھی کو اپنی حد سے زیادہ آزاد گفتاری سے متاثر کرنا چاہا تھا کہ کانگریس نے واقعات کی رفتار کو 'راست اقدام' کے ذریعے تیز کرنا چاہا تو حکومت اپنی پوری طاقت سے اسے کچل دے گی۔ گاندھی نے ان سے التجا کی تھی کہ وہ موقف پر پھر سے غور کرلیں: ''اگر آپ ایسا کرنے پر تل گئے تو آپ کی اور ہماری دونوں قوموں پر زبردست اور تکلیف رساں بوجھ پڑے گا......لیکن

(1) ڈ ڈروف، فلپ: دی گارجینس: ص: 242

(2) وہ لمحہ جب سے فوجی کارروائی کے لیے وقت شمار کیا جاتا ہے ''زیرو آور'' کہلاتا ہے۔ اس کا ترجمہ آخری لمحہ کیا گیا۔

سرسیمول آپ کا اس طرح کی بغاوت سے مطلب کیا ہے؟ اگر بغاوت مکمل طور پر پُرامن ہو تو وہ ایسی خوفناک چیز تو نہیں ہوتی۔''

سرسیمول کو یہ معلوم تھا کہ گاندھی گول میز کانفرنس کے نتائج سے کتنے غیر مطمئن تھے لیکن گاندھی نے انھیں یقین دلایا تھا کہ وہ ہندوستان پہنچ کر حکومت سے تعلقات ختم کرنے کی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھیں گے''جیورنل ڈی اٹالیا'' کے سینور گایڈا نے گاندھی کے نام سے جو جعلی انٹرویو روم سے نشر کیا تھا اس سے سرسیمول کو سخت حیرت ہوئی تھی اور ابھی گاندھی سمندر کا سفر ہی کر رہے تھے کہ انھوں نے گاندھی سے اس کی تردید مانگی اور ان سے مل بھی گئی۔ اگر سرسیمول کا بس چلتا تو وہ شاید گاندھی سے دوستی کو دشمنی پر ترجیح دیتے لیکن نہ تو ان میں اتنی قوت ارادی تھی اور نہ غالباً طاقت کہ ہندوستان کی سرکاری رائے کے مشترکہ وزن کا مقابلہ کرتے۔ وہ کانگریس کے خلاف جارحانہ اقدام کے منصوبے کی منظوری پہلے ہی دے چکے تھے اب انھوں نے وہ بٹن دبانے کی اجازت بھی دے دی جس کے دبتے ہی کانگریس کے خلاف بلز کریگ (طوفانی اور فیصلہ کن حملہ) شروع ہو جانے کو تھا۔

باب 37

مکمل جنگ

انگلستان سے واپسی کے فوراً بعد بمبئی میں ایک بڑے جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے گاندھی نے متنبہ کر دیا تھا کہ ''پچھلی جنگ میں عوام کو لاٹھیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر اس بار انھیں گولیاں کا سامنا کرنا ہوگا۔'' اگر چہ گاندھی کو معلوم نہ تھا کہ کانگریس کو کچل دینے کے لیے کتنے پکے اور مکمل انتظامات کر رکھے ہیں لیکن انھوں نے حکومت کے بدلے تیوروں کو محسوس کر لیا تھا۔ لارڈ ولنگڈن ایک دھن کے پکے اور غیر جذباتی حاکم کی حیثیت سے مشہور تھے اور اس بار بھی اس شہرت کو برقرار رکھنے کا پورا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ صوبوں کے گورنر اس ارادے میں ان کے شریک تھے کہ پریشان کرنے والوں کو ان کی اصلی حیثیت بتا دی جائے۔ کئی ایک تو اس کے لیے تیار بلکہ بے چین تھے کہ اس ادارے کو ایک سبق سکھا دیا جائے جو حکومت کے معمولی اقدامات کی وجہ سے پھول پھل رہا تھا۔ لارڈ ولنگڈن 1931 میں جیسے ہی ہندوستان پہنچے سر فریڈرک سائکس گورنر بمبئی نے ان سے شکایت کی کہ 1930 کی کانگریس تحریک کا مقابلہ کرنے میں حکومت کو بڑی معذوریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اپنے خط مورخہ 12/نومبر 1931 میں انھوں نے وائسرائے پر زور ڈالا کہ ''اگر سولِ نافرمانی از سرِ نو شروع کی جائے تو واقعتاً تیز رفتاری، منظّم اور

مضبوط طریقے پر اس سے نپٹا جائے۔'' انھوں نے مزید لکھا۔

'' آخری بات یہ کہ ہم اس وقت تک آہستگی سے چلنے میں حق بجانب ہوں گے جب تک تحریک زور نہیں پکڑ لیتی، بہر حال کانگریس سے لڑنے کے لیے ہمیں اپنے اسلحے خود چننا ہوں گے اور ہمیں اس غلطی سے بچنا چاہیے کہ ہم وہی بات کریں جس کے مخالف ہم سے امید باندھے بیٹھے ہیں بہتر یہ ہوگا کہ بمبئی کمشنر پولیس نے اس موضوع پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ نقل کروں: وہ لوگ کانگریس پر بھروسہ کیے بیٹے ہیں کہ برطانیہ کی روایتی انسانیت اور بین الاقوامی تنقید سے ان کا خوف ان لوگوں کو کسی واقعی سخت اقدام سے باز رکھے گا۔ اس طرح وہ ہمیں اس بات پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ہم اس بغاوت سے ان کے شرائط پر اور ان کے پسند کے طریقوں پر نبرد آزما ہوں...... ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم دوبارہ اس طرح کی جنگی مہم کا آغاز کریں اس طرح سے اذیت طول کھینچتی ہے اور یہ باعزت طریقہ بھی نہیں ہے۔ اس سے خوف کی بجائے جو ہر شائستہ حکومت کی بنیاد ہے۔ نفرت پیدا ہوتی ہے۔ میری رائے میں اس امر کا صاف صاف اظہار کر دینا چاہیے کہ حکومت سول نافرمانی کے احیا کے مقابلے کا اسی سختی سے ارادہ رکھتی ہے جس کی بغاوت متقاضی ہوتی ہے۔''

یہ سر فریڈ اک ہی کی حکومت تھی جس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ گرفتاری کے بعد گاندھی کو جزائر انڈمان (کالے پانی) یا عدن بھیج دیا جائے۔ انھیں حکومت نے سب سے پہلا سِول نافرمانی مینول مرتب کیا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ حکام کو سول نافرمانی تحریک کا کس طرح مقابلہ کرنا چاہیے۔ اس مینول کی تمہید میں رائے عامہ کے بارے میں ایک معنی خیز اشارہ تھا۔ 31-1930 کی تحریک کو پوری طرح چلنے کے پہلے ہی کچل دیا جائے جو انتہائی ضروری ہو اس سے زیادہ نہیں۔ امید یہ تھی کہ سماج کے سنجیدہ عناصر کو اسی طرح یہ شہ مل سکے گی کہ وہ تحریک کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں۔ لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی آئندہ سے تحریک کی احیا کی صورت میں ضلع افسروں کو یہ مان کر چلنا ہوگا کہ '' رائے عامہ کا ایک بڑا حصہ حکومت سے متنفر ہے اور سب سے پہلے اس پر توجہ دینا چاہیے کہ تحریک کو پوری طرح چلنے کے پہلے ہی کچل دیا جائے۔'' مینول کے بعض احکام سے حکومت کے مصمم رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً اس میں یہ تحریر تھا کہ سِول نافرمانی کے قیدیوں کو

علی العموم قید محض کی سزا نہ دے کر قید سخت کی سزا دی جائے گی۔ اس کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوگا بشرط یہ کہ ان کا تعلق اعلیٰ خاندان سے نہ ہو اور وہ صرف غیر متشددانہ جرم سے سزایاب ہوئی ہوں۔ ہر مقدمے میں جرمانے ضرور رہوں گے۔ صرف وہ معاملات مستثنیٰ ہوں گے جہاں وصولی مشکوک ہو۔ جنھوں نے بار دو گرانا فرمانی کا جرم کیا ہو ان کو زیادہ سے زیادہ سزا دی جائے گی۔ بچوں کے خلاف کوڑے مارنے کے قانون یا اصلاحی اسکول قانون کے ماتحت کارروائی کی جائے گی۔

اس طرح حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں نے کانگریس کو اقدام اور سزا کے مابین کوئی مہلت نہ دینے کا عزمِ مصمم کر لیا تھا۔ نافرمانی کا مقابلہ کرنے کے منصوبے سیکریٹریٹ کی بے حد خفیہ المار یوں کے خانوں سے نکال کر بجلی کی رفتار سے نافذ کر دیے گئے۔ 24/جنوری 1932 کو گاندھی اور ممبرانِ ورکنگ کمیٹی کی گرفتاری کے چند گھنٹوں کے اندر فرامین (آرڈی نین سوں) کا ایک سلسلہ جاری کر دیا گیا۔ نہ صرف ورکنگ کمیٹی بلکہ صوبائی کمیٹیاں اور مقامی کمیٹیاں غیر قانونی قرار دے دی گئیں۔ کئی جماعتیں مثلاً یوتھ لیگیں، نیشنل اسکول کانگریسی لائبریریاں اور اسپتال، جو کانگریس سے مربوط تھے یا ہمدردی رکھتے تھے انھیں بھی خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ کانگریس کے فنڈ ضبط کر لیے گئے، کانگریسی عمارتوں پر قبضہ کر لیا گیا اور تقریباً ہر ایسا اقدام کر لیا گیا جس سے کانگریس کے لیے کام کرنا ناممکن ہو جائے۔ اس بات کا اعتراف کہ یہ فرامین سخت وشدید تھے اور ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ کار کا احاطہ کرتے تھے خود سکریٹری آف اسٹیٹ کو مارچ 1932 میں ہاؤس آف کامنس کے سامنے کرنا پڑا۔

کانگریسی قیادت کی بالائی سطح کی علاحدہ کر کے اور اس کے فنڈ کو منجمد کر کے حکومت اس خیالِ خام میں تھی کہ کانگریس کی ہمتیں پست کر دے گی۔ فرمانوں کے ذریعے جو اختیارات حکومت نے حاصل کر لیے تھے اس میں یہ اجازت بھی شامل تھی کہ وہ کسی ایسے فنڈ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے یا اس پر پابندی لگا دے یا ضبط کر لے جس پر یہ شبہ ہو کہ وہ کسی غیر قانونی انجمن[1] کے مقاصد کے لیے رکھا ہوا ہے یا استعمال کیا جا رہا ہے۔ حکام کو یہ اختیار تھا کہ وہ حسابات کی جانچ پڑتال کریں، باز پرس کریں اور تلاشیوں کا حکم جاری کریں۔ ایسی انجمنیں بھی جن کا براہِ راست

(1) اسوسی ایشن کا ترجمہ دیا گیا ہے۔

تعلق کانگریس سے نہیں تھا مگر جن پر کانگریس سے ہمدردی رکھنے کا شک تھا مثلاً گجرات سبھا اور مدراس مہاجن سبھا ان کے فنڈ بھی منجمد کر دیے گئے۔ حکومت اس حد تک چلی گئی کہ اس نے اس امر میں سکریٹری آف اسٹیٹ کی مداخلت چاہی کہ کولمبیا گراموفون کمپنی گاندھی کے دوران قیام انگلستان کی ایک تقریر کے ریکارڈ پر آل انڈیا کتائی انجمن کو جو رائلٹی دیتی تھی اس کو بھی روک دے۔

ایک نئی جیل پالیسی دوہرے مقاصد کے ماتحت بنائی گئی۔ ایک تو یہ کہ کانگریسی خود کو جیل کے لیے پیش کرنے سے باز آئیں، اور دوسرے یہ کہ جیلوں پر دباؤ کم ہو۔ 21/جنوری 1932 کی ایک گشتی چٹھی میں حکومت ہند کے محکمہ داخلہ نے صوبائی حکومتوں کو یہ مشورہ دیا کہ قید کی سزا کے بدلے جرمانے عاید کیے جائیں اور سول نافرمانی کرنیوالے ایسے قیدی جو یہ وعدہ کریں کہ وہ تحریک میں اب حصہ نہ لیں گے ان کو (مقدمہ چلنے اور سزایابی کے پہلے ہی) چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح واضح طور پر جیل کے نظم و نسق میں سختی آ گئی۔ پہلی کانگریس تحریک (31-1930) کو عورتوں کی شمولیت سے بڑی تقویت ملی تھی۔ دوسری تحریک (34-1932) میں جیلوں میں جو سلوک کیا گیا وہ غالباً اس لیے کیا گیا تھا کہ عورتیں ڈر سے کنارہ کش ہو جائیں۔ میرا بین نے جو گاندھی کی پیرو اور برطانوی بحری بیڑے کے ایک امیر البحر (ایڈمرل) کی بیٹی تھیں، آرتھر روڈ جیل کے حالات کے بارے میں جو بیان دیا تھا وہ عورتوں کے قید خانے کے حالات پر شدید ترین فرد جرم تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ سیاسی زندانی عورتیں اپنے بچوں سے سلاخوں کے پیچھے رہ کر ہی ملاقات کر سکتی تھیں۔ جیل میں ان کی پڑوسنیں تین جرائم پیشہ تھیں۔ دو چور اور ایک طوائف۔ انھیں رات کو تالے لگا کر نہیں رکھا جاتا تھا۔ لیکن سیاسی قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔

حکومت کو صلح کے زمانے میں سب سے بڑی الجھنیں تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کانگریس کا اثر دیہاتوں میں پھیل رہا تھا۔ شہروں میں متوسط طبقے ہی کی قوم پروری کا مقابلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا لیکن یہ امکان کہ بددلی کسانوں تک پھیل جائے حکومت کے نزدیک اس سے بھی زیادہ پریشان کن خطرہ تھا۔ جس شہرت سے دیہی علاقوں میں ''عدم ادائیگی لگان'' کا مقابلہ کیا گیا اس کا سب سے زیادہ قابل فہم سبب یہی (خوف) ہو سکتا ہے۔ یہ تحریکیں صوبجات متحدہ (یوپی) کے الٰہ آباد اور رائے بریلی ضلعوں میں اور بمبئی، بہار، بنگال اور شمالی مغربی سرحدی صوبے کے کچھ

ضلعوں میں بہت نمایاں طور پر چلیں۔ انڈیا لیگ کے وفد نے 1932 میں ملک کا دورہ کیا تھا۔ اس نے شہادت دی ہے کہ یو پی کی صرف ایک تحصیل میں 209 سمن جاری کیے گئے۔ 298 قرقیاں ہوئیں اور 44 نیلام کیے گئے۔ بمبئی پریسیڈنسی میں سابرمتی میں واقع گاندھی آشرم کی کچھ جائداد منقولہ قرق کرلی گئی۔ وفد نے یہ دیکھا کہ راس نامی گاؤں میں ہتھیار بند پولیس کے سولہ کیمپوں نے پورے مزروعہ علاقے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور 2600 ایکٹر میں سے 500 ایکٹر ضبط کر کے بیچ ڈالے تھے اور 900 ایکٹر پر قبضہ کرلیا گیا تھا اور بیچے ہی جانے والے تھے۔ تعزیری پولیس سرکش دیہاتوں میں تعینات کردی گئی تھی اور اس پر ہونے والا خرچ وہاں کی آبادیوں سے وصول کیا جارہا تھا۔ جو لوگ ٹیکس ادا نہ کرتے ان کو ضبطی کی سزا دی جاتی اور ان کے مویشی اور آلاتِ زراعت اونے پونے بیچ دیے جاتے۔

گاندھی نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ اس کا امکان ہے کہ بمبئی سرکار ضبط شدہ زمینوں کو ناقابل تنسیخ طور پر فروخت کردے۔ یہ خبر پڑھ کر انھوں نے ایمرسن کو جو پہلے لارڈ اروِن کے پرائیوٹ سکریٹری اور اب ہوم ڈپارٹمنٹ میں سکریٹری تھے خط لکھا اور انھوں نے زمینوں کے ناقابل تنسیخ فروخت پر احتجاج کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں یہ چاہوں گا کہ سرکاری حکام یا کانگریسی تلخی کی جو وراثتیں چھوڑیں ان کو اگر کلیتاً ختم نہ کیا جاسکے تو گھٹا کے کم سے کم ضرور کردیا جائے۔ گاندھی کے اس خط کا کوئی جواب نہیں ملا۔ لیکن وائسرائے کاؤنسل کے ہوم ممبر نے اس فائل پر اپنے جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان سے سرکاری ذہنیت کی جھلک اچھی طرح سامنے آجاتی ہے۔ گجرات میں صورتِ حال کو معمول پر واپس لانے میں بعض اراضیات کی ناقابل تنسیخ فروخت کا اثر دوسری چیزوں سے کہیں زیادہ پڑا ہے اس سے عوام کو محسوس ہوگیا ہے کہ آخر کار یہ کانگریس نہیں بلکہ حکومت ہے جو صورتِ حال کو قابو میں لاتی ہے۔''

پریس کے ساتھ سرکاری برتاؤ بھی ایسی ہی سختی اور مضبوطی سے کیا گیا 1930 کی نمک ستیہ گرہ تحریک کو شروع شروع میں کامیابی حاصل ہوئی تھی اس کو جزوی طور پر سرکاری حلقوں نے پبلسٹی کا نتیجہ قرار دیا۔ 1932 میں کئی شدت پسند ضوابط کے ذریعے پریس کی آزادی کم کردی گئی۔ اخباری نامہ نگاروں پر مقدمہ چلانے کے علاوہ اخباروں کی ضمانتیں ضبط کرلی گئیں تاکہ ان کے قلم

پر روک لگائی جا سکے سوِل نافرمانی کے احیا کے چھ مہینے کے بعد 4رجولائی 1932 کوسکریٹری آف اسٹیٹ نے دارالعوام کو بتایا کہ پریس قوانین کے تحت 109 اخبارنویسوں اور 98 چھاپے خانوں کے خلاف کارروائی کی گئی۔ بمبئی کے ''فری پریس جنرل'' کی دس ہزار روپیوں کی ضمانت ضبط کرلی گئی اوراسے بیس ہزار روپیوں کی مزید ضمانت داخل کرنا پڑی۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ''ینگ انڈیا'' کی 1930 کی ایک اشاعت سے چھوت چھات پر ایک مضمون نقل کیا تھا۔ بنگال میں تو صوبائی قانون ساز کاونسل کی کارروائی بھی چھاپی نہیں جا سکتی تھی۔ اگر اس میں حکومت پر تنقید بھی شامل ہو تو وہ چھاپی نہیں جا سکتی تھی۔ کئی صوبائی حکومتوں نے گاندھی اور دوسرے لیڈروں کے فوٹو چھاپنے کو جرم قرار دیا تھا۔ حکومت مدراس تو اس حد تک چلی گئی تھی کہ اس نے بعض مجسٹریٹوں کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ کانگریسی لیڈروں کی تصویریں ضائع کر ڈالیں ایک طرف تو مالی تباہی اور نیست و نابود ہو جانے کا خطرہ تھا اور دوسری طرف ان شدید ضوابط کو غم اور غصے کے ساتھ قبول کر لینے کا راستہ تھا۔ ایسی صورت میں یہ بڑے تعجب کی بات نہیں ہے کہ زیادہ اخبارات نے محفوظ تر راستہ اختیار کیا۔

اس عرصے میں گاندھی کو یروَدا قید خانے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ حکومت بمبئی حکومت ہند کو نہ تو اس بات پر رضامند کرا پائی تھی کہ گاندھی کو سرزمین ہند سے دور بھیج دیا جائے اور نہ اس پر کہ کسی اور صوبے میں بھیج دیا جائے۔ ان کے دو اور قریب ترین شرکائے کار ولبھ بھائی پٹیل اور مہادیو دیسائی کو بھی ان کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ موخرالذکر کی ڈائریوں میں جیل میں گاندھی کی زندگی کی پوری اور جیتی جاگتی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ جس پیمانے پر ان کی تحریک کے خلاف سرکاری جارحیت جاری تھی اس کے بارے میں مہاتما کافی باخبر تھے۔ انھوں نے سر سیموئل ہورا کو لکھا کہ ''ظلم وتعدی ہر جائز حد کو پار کر چکا ہے'' بہرحال مصائب کا برداشت کرنا ستیہ گرہ کا ضروری جز و تھا تاکہ جن لوگوں نے ان مصائب کو دعوت دی تھی ان کی صفائے نفس ہو اور جنھوں نے یہ جبر عاید کیا ہے ان کا دِل بدلا جا سکے۔ اس وقت ملک جس امتحان سے گذر رہا تھا اگر وہ کافی آتش انگیز ثابت ہوا تو گاندھی کو امید تھی کہ اس آگ میں مادۂ فاسد جل جائے گا اگر عوام مقابلہ کرنے کے لیے عہد پر قائم رہے تو ظلم کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو انھیں کچل نہ پائے گا۔ اس عرصہ میں انگلستان میں

برطانوی ماہرین اور ہندوستانی مشاہدین جو آئین گڑھ رہے تھے اس سے گاندھی کو کوئی خاص توقع نہیں تھی۔حکومت بمبئی کے ہوم سکریٹری نے جو انھیں جیل میں دیکھنے آئے تھے ان سے کہا کہ آپ آج روٹی کا آدھا ٹکڑا ہی قبول کیوں نہیں کر لیتے؟ مہاتما نے جواب دیا کہ ''میں قبول کرلوں گا بشرطیکہ وہ روٹی ہو پتھر نہ ہو۔''

گاندھی جیل میں بھی اتنے ہی مشغول رہا کرتے تھے جتنے وہ باہر رہتے تھے۔پرارتھنا (دعا) اور چرخہ کاتنا روز کا معمول تھا۔وہ اپنے کپڑے خود دھوتے۔خطوط خود لکھتے اور املا کراتے۔ ایک دن تو انھوں نے انچاس خطوط لکھے۔ان میں زیادہ تر ان کے آشرمی خاندان والوں کے نام تھے۔انھوں نے مکتوب الیہم کو یہ ہدایت کی کہ جیل سے بھیجے ہوئے ان خطوں کی اشاعت نہ کرائیں کیوں کہ انھیں پرائیوٹ سمجھا جاتا تھا وہ بہت زیادہ مطالعہ کرتے تھے۔انھوں نے فلکیات پر بھی دلچسپی لینا شروع کی اور اکثر آسمان پر نگاہیں جمائے رہتے تاکہ پراسرار کائنات کی کچھ رمزیہ زبان کو پڑھ سکیں کچھ لمحے تفریح کے بھی ہوتے تھے خاص کر ان میں اور ولبھ بھائی پٹیل میں فقرے بازیاں ہوتیں۔اپنی چبھتی ہوئی ذہانت کی بدولت پٹیل ایک پرلطف ہم جلیس بن جاتے تھے۔زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ اس چھوٹے سے گروہ پر یرودا جیل میں ہلکی سیاہی سی چھا گئی۔ یہ برت (روزہ) کی سیاہی تھی۔گاندھی کے ذہن پر اس امکان کا بہت دنوں سے بوجھ پڑ رہا تھا کہ نئے آئین میں ہریجنوں کو جداگانہ حق رائے دہندگی دے دیا جائے گا۔11 مارچ 1932 کو انھوں نے وزیر ہند (سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا) کو ایک خط کے ذریعے یہ اطلاع دی کہ اگر ان کے خطرات صحیح ثابت ہوئے تو وہ مرن برت (تا مرگ فاقہ) رکھ لیں گے۔

اس دوران حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں نے سول نافرمانی کی تحریک کو کچل دینے کے لیے کئے گئے اقدامات کی کامیابی پر بجا طور پر مطمئن تھے کیوں کہ جیسا کہ بعد میں کہا بھی جانے لگا کانگریس کو ''بلز کریگ'' (اچانک اور کلی حملے) کے طور پر سارے لیڈروں اور تنظیموں اور وسائل سے محروم کر دگیا تھا۔ جنوری 1932 میں کانگریس پر تقریباً غنودگی کے عالم میں دھاوا بول دیا گیا تھا۔

صرف یوپی اور صوبہ سرحد میں صلح کی ساری درمیانی مدت میں ایک بحرانی کیفیت کا

احساس ہوتا رہا تھا۔ باقی ہر جگہ عام سطح کا کانگریسی یہ امید لگا بیٹھا تھا کہ سیاسی ایمرجنسی سے کسی نہ کسی طرح بچ نکلا جائے گا۔ مہاتما مصالحت کی کوئی صورت نکال لیں گے اور حکومت سے قطعی طور پر تعلقات ختم نہ ہوں گے جواہر لال نہرو نے اپنی خودنوشت سوانح عمری آٹو بایوگرافی میں لکھا ہے کہ ایسا لگتا تھا کہ کانگریسی بادلِ ناخواستہ لڑائی میں شریک ہوئے تھے۔ حکومت نے پوری غور وفکر سے مرتب کی ہوئی استبداد کی اسکیم ہی پر برق رفتاری سے کام نہیں کیا بلکہ نشر واشاعت کی راہیں مسدود کرنے میں بھی ویسی ہی تیزی دکھائی کیوں کہ نشر واشاعت ہی کے لیے عوامی اعتمادِ نفس قائم رہتا ہے اور قومی تحریک کو بڑھاوا دیتا ہے۔

اس ابتدائی ناموافق صورتِ حال کے باوجود 1932 میں تحریک کے ابتدائی نومہینوں میں سول نافرمانی کے 551ء 61 مقدموں میں سزائیں دی گئیں یہ تعداد 31-1930 کی تعداد سے تھوڑی زیادہ ہی تھی۔ جہاں تک سزایابی کا تعلق ہے، تحریک سب سے زیادہ مضبوط یوپی، بمبئی، بنگال اور بہار میں تھی۔ چھوٹے سے صوبہ سرحد میں 7000 افراد نے گرفتاریاں دیں۔ یہ تعداد بمبئی پریسیڈنسی کی تعداد کی بالکل نصف تھی۔ ابتدائی چار مہینوں تک تحریک قوت سے چلتی رہی۔ اس کے بعد سزایاب ہونے والوں کی تعداد گھٹنے لگی اور اکا دکا مواقع کو چھوڑ کر (مثلاً جب اپریل 1932 میں کانگریس نے پنڈت مالویہ کی صدارت میں سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی کوشش کی) سول مقاومت کرنے کا دھارا قطروں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

1932 کے ختم ہوتے ہوتے حکومت ہند اور صوبائی حکومتیں کانگریس کے خلاف ایسی کامیابی حاصل کرنے پر ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہی تھیں لیکن وہ اب بھی ان اختیارات خصوصی کو چھوڑ نہیں رہی تھیں جو انھوں نے شروع سال میں قربانیوں کے ذریعہ حاصل کر لیے تھے۔ کانگریس پارٹی کی عدم موجودگی میں صوبائی اسمبلیاں، خوشامدی ادارہ بن کر رہ گئی تھیں۔ ان کی مدد سے حکومت نے ایسے قوانین بنا لیے جن کا مقصد گویا فرمانوں یا (آرڈی نینسوں) پر آئینی مہر لگانا تھا۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں اوٹاوا معاہدے کی منظوری حکومت کی ایک اور فتح تھی کیوں کہ اس سے ایک طرف سامراجی تجارتی مفادات کو بڑھاوا ملا تھا اور دوسری طرف یہ اس کانگریس کے منھ پر ایک طمانچہ تھا۔ جس نے حکومت سے عدم تعاون کا نعرہ لگایا تھا۔

اس بار لڑائی میں برابر کی لڑائی نہیں چھوٹنے والی تھی اور لارڈ ولنگڈن نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ آنے والے برسوں میں گاندھی اور کانگریس سے مکمل سپراندختگی کے علاوہ کچھ اور قبول نہ کریں گے۔ انھوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ مہاتما کو سیاسی قرنطینے میں رکھ دیں گے 1932ء کے آخر میں جب تیج بہادر سپرو اور ام، آر جیکر لندن کے آئینی مذاکرات کے بعد واپس آرہے تھے تو سکریٹری آف اسٹیٹ نے وائسرائے کو مشورہ دیا کہ ان دونوں کو گاندھی سے جیل میں ملنے کی اجازت دے دی جائے۔ جنوری 1933ء کے ایک طویل تار میں وائسرائے نے اس مشورے کی مخالفت کی۔

''ہم (گورنر اور ایگزی کیوٹیو کاؤنسل) یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی ملاقات کا خاص مقصد یہ ہوگا کہ یہ جتادیا جائے کہ ہم نامعقولیت پسند نہیں ہیں اور ہم گاندھی اور کانگریس کو اس بات کا ہر موقع دینا چاہتے ہیں کہ وہ نئے آئین میں ہم سے تعاون کریں لیکن ہماری رائے میں ایسی ملاقات کے نتائج شش و پنج کی کیفیت پیدا کرسکتے ہیں اور موافق صورت حال کو برباد کرسکتے ہیں جو کچھ تو سال گذشتہ کی مستقل مزاج پالیسی کی بدولت پیدا ہوئی ہے اور کچھ گول میز کانفرنس کی کامیابی کی بدولت۔

''............1930 کے مقابلے میں آج کانگریس یقیناً کم موافق حالات سے دوچار ہے اور عوام پر اس کی گرفت باقی نہیں رہ گئی ہے اگر کانگریس اپنے پرانی حالت میں واپس آجاتی ہے یا مجوزہ ملاقات کی طرف کوئی ایسا قدم اٹھایا جاتا ہے جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ حکومت کانگریس کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اس کو اپنی طرف ملانا چاہتی ہے۔ تو اس سے ان معتدل عناصر کے درمیان بہت بددلی پھیلے گی جو موجودہ حالات پر امید ہے کہ پہلے انتخابات پر اثر انداز ہوسکیں گے اور نئے آئین کو مناسب نقطۂ آغاز مل سکے گا اس وقت بھی کم از کم دو صوبوں یعنی یو پی اور بہار واڑیسہ میں اس طرح کی پارٹیاں بن رہی ہیں لیکن ابھی مستحکم نہیں ہو پائی ہیں۔ اگر کانگریس کو پھر اس کی ساکھ مل جائے تو یہ نئی قائم شدہ پارٹیاں ناکام ہوجائیں گی، کانگریس کو پھر غلبہ حاصل ہوجائے گا اور اس حالت کو پہنچ جائے گی کہ گول میز کانفرنس میں آتنی محنت سے مکمل کیے ہوئے تحفظات کے اثر کو زائل کردے اور نئے آئین کو توڑ پھوڑ دے......''

سکریٹری آف اسٹیٹ کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی تھی کہ اپنے نقطۂ نظر کو وائسرائے پر اختلاف کی حدتک مسلط نہ کرے لیکن اسے وائسرائے کی بنائی ہوئی پالیسی کے آخری مقصد کے متعلق جو شبہات وخدشات تھے وہ انھیں چھپا بھی نہیں سکا۔ 12 جنوری 1933 کو سرسیمول نے ایک ذاتی خط میں شاندار نمائشی معافی اور خاص کر گاندھی کی رہائی میں مضمر خطرات کے بارے میں لارڈ ولنگڈن کے خیالات سے اتفاق کیا۔ ''لیکن اسی کے ساتھ'' انھوں نے اضافہ بھی کیا کہ ''ہم آپ سے فوری طور پر یہ پوچھنا چاہیں گے کہ آپ کی رائے میں آخرکار ہوے کیا جارہا ہے۔ صحیح ہو یا غلط ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کا ہرگز کوئی امکان نہیں ہے کہ گاندھی سول نافرمانی سے باضابطہ طریقے پر قدم پیچھے ہٹائیں گے۔ گول میز کانفرنس میں جس کسی نے بھی ان کے بارے میں مجھ سے گفتگو کی، اس بات کی تصدیق کی۔ اگر صورت یہ ہے تو کیا آپ ہمیشہ کے لیے انھیں جیل میں رکھنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ کی یہ رائے ہوئی تو ہمارے خیال میں یہاں (انگلستان میں) اس صورتِ حال کو آنے والے مہینوں اور برسوں تک برقرار رکھنا بے حد مشکل ہوجائے گا۔

وائسرائے اور اس کے مشیر ہندوستان کے سیاسی منظر کو گاندھی اور کانگریس کے بغیر دیکھنے کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح آمادہ تھے سول نافرمانی کچلی جاچکی تھی۔ کانگریس پست ہمتی اور اختلاف رائے کا شکار ہورہی تھی۔ ممکن ہے کہ زیادہ معتدل کانگریسی دوسرے گرہوں سے مل کر نئے آئین کو چلانے کے لیے نئی پارٹی بنالیں جو مضبوط تو ہو لیکن قانون ساز اسمبلیوں کے اندر مغلوب کر لینے کی حدتک طاقتور نہ ہو اور اس طرح حکومت کو کوئی پریشان کن زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ اور داہنے بازو کے ساتھ چھوڑ دینے سے کانگریس کے کمزور ہوجانے اور گاندھی کی عزت مجروح ہوجانے سے سول نافرمانی کے احیاء کا خطرہ کم سے کم ہوگیا تھا۔ 1933 میں وائسرائے اور اس کے مشیر ایک اطمینان بخش صورتِ حال کا تصور کرنے کے قابل ہوگئے تھے اور لارڈ ولنگڈن کو ایسا لگ رہا تھا کہ گاندھی کی جانب بے لچک رویہ استعمال کر کے وہ اس صورتِ حال کو ایک سیاسی حقیقت بنا سکتے ہیں۔

گاندھی کی شخصیت اور سیاست کے بارے میں وائسرائے کے خیالات میں وسیع النظری کا شائبہ نہیں تھا۔ یکم جولائی 1933 کو اس نے سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام ایک خط میں لکھا

کہ گاندھی کی قیادت پر دائیں اور بائیں دونوں ہی بازوؤں کی طرف یہ اعتراضات ہو رہے ہیں کہ چودہ برس تک مسلسل جدوجہد کے راستے پر چلاتے رہنے کے بعد کانگریس کو خطرناک طور پر ناکامی کے قریب لے آئے ہیں۔ کانگریسی حلقوں میں اس بارے میں شدید اختلافات ہے کہ کیا پالیسی اختیار کی جائے اور ایک عام مایوسی کی فضا ہے واحد ذات جو کانگریسیوں کو ملا کے لیے چل سکتی ہے وہ گاندھی کی ہے۔ وہ اسے صاف طور سے محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے اثر ونفوذ کا دار و مدار تقریباً تمام تر حکومت سے ان تعلقات پر ہے۔ اگر وہ تاثر پیدا کرسکیں کہ حکومت ان سے معاملت پر آمادہ ہے تو ان کا اثر فوراً سو گنا بڑھ جائے گا۔''

اس طرح کی عبارتیں پڑھ کر یہ شک ہونے لگتا ہے کہ وائسرائے کو گاندھی کی ذہنیت اور فلسفے کی کچھ ذرا بھی واقفیت تھی بھی یا نہیں۔ اٹھارہ برس پہلے گاندھی کی جنوبی افریقہ سے واپسی کے فوراً بعد لارڈ ولنگڈن نے بمبئی کے گورنر کی حیثیت سے ان سے ملاقات کے دوران کہا تھا کہ وہ جب بھی حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلانے کی بات سوچیں تو ان سے آکر مل لیں۔[1] 1910 میں تو ولنگڈن کی یہ رائے تھی کہ گاندھی کے پاس چھپانے کو کچھ نہیں تھا اور ان میں کھلے عام کام کرنے کی ہمت تھی۔ 1933 میں وائسرائے کی حیثیت سے ان کی رائے بالکل بدل گئی۔ اس سے پہلے والے پیرے میں جس خط کا اقتباس دیا گیا ہے۔ انھوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا ''شروع سے آخر تک یہ ضروری ہوگا کہ گاندھی جو ہیں۔ انھیں اسی روپ میں دیکھا جائے نہ کہ اس روپ میں جو وہ ظاہری طور پر دکھاتے ہیں۔ ہندوستان میں گاندھی سب سے زیادہ زیرک سیاست داں ہیں اور اس پارٹی کے مانے ہوئے لیڈر ہیں جس کا مقصد حصولِ آزادی ہے یا کم از کم ایسا آئین ہے جس میں کوئی موثر تحفظات نہ ہوں اور جو تمام حقیقی حالت کانگریس کے ہاتھوں میں دے دے کانگریس اپنی حکمت عملی بدل سکتی ہے لیکن اپنا مقصد نہیں بدل سکتی۔ چاہے کانگریس کی تدبیروں میں جو بھی موڑ اور پیچ آئے ان امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا۔

گاندھی کے متعلق یہ تصور کہ یہ کوئی میکاویلی سیاست داں تھے جن کے ہاتھوں میں کانگریس ایسا اوزار تھا جس کو وہ جس طرح چاہیں استعمال کریں اور وہ وائسرائے سے ایک ملاقات کسی طرح

(1) گاندھی، آٹوبایوگرافی، ص: 457

حاصل کر کے ہندوستان کی جاہل پبلک پر اپنا اثر بڑھانا چاہتے تھے۔مہاتما کے بارے میں بھی اور ان لاکھوں انسانوں کے بارے میں بھی جوان کے ادنیٰ سے ادنیٰ اشاروں کی تعمیل کرتے تھے نا قابل اعتبار حد تک غلط اندیشی پر مبنی تھا اپنی کتاب

(نو پُر آشوب سال) میں سر سیمول ہورنے (جو بعد میں لارڈ ٹمپل وڈ ہو گئے تھے) صحیح طور پر اظہارِ خیال کیا ہے کہ اگر میں اپنی طرف سے تنقید کرتا ہوں تو یہ کہوں گا کہ لارڈ ولنگڈن ارون کی طرح گاندھی کی شخصیت کو سمجھتے نہیں تھے اور اس وجہ سے ان کی قوتوں کا اندازہ کم لگا پاتے تھے۔ لارڈ ولنگڈن کے انتظامی امور کا سابقہ تجربہ وائسرائے بن جانے کے بعد ان کے قیمتی اثاثہ کم اور بوجھ زیادہ بن گیا تھا۔ان کی نگاہوں میں تھا ہندوستان کا مسئلہ بنیادی طور پر ایک انتظامی مسئلہ تا جو بروقت اور عاقلانہ استعمال جبر کا طالب تھا تا کہ شورش مچانے والوں کو دیا جا سکے۔ان میں یہ سمجھنے کی تقریباً صلاحیت ہی نہیں تھی کہ سیاسی آزادی کی تحریک کی جذباتی اور ذہنی جڑیں کتنی گہرائی تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔اس سے جوش وخروش پیدا ہوا وہ انھیں جاہلانہ کٹرپن کی ایک شکل نظر آیا۔ جب وہ ہندوستانی قوم پرستی کے منابع ہی کو نہیں سمجھ پائے تو گاندھی کو تو اور بھی نہیں سمجھے سول نافرمانی گاندھیائی ستیہ گرہ کی تکنیک کا ایک حصہ تھی۔اس کا مقصد تھا کہ سیاسی اور سماجی میدانوں میں عدم تشدد کی بنا پر عوام کی تنظیم کر کے تبدیلیاں لانا۔طریق کار یہ تھا کہ جوابی حملے کے بغیر مقاومت کرنا اور نفرت کے بغیر عدم تعاون۔گاندھی کی نگاہ میں تحریک کی غیر متشددانہ بنیاد سب سے زیادہ اہم تھی۔ولنگڈن کی نظروں میں گاندھی اور ان کے ساتھیوں کی واضح اخلاقی فوقیت تو کانٹے کی طرح کھٹکتی ہی تھی لیکن ایک غیر متشدد تحریک اور زیادہ خطرناک نظر آتی تھی کیوں کہ اس سے ساری لعنت ملامت کا نشانہ وہ بنتے تھے جن پر امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری تھی۔

5 ستمبر 1932 کو مرکزی قانون ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے وائسرائے نے اعلان کیا'' کانگریس لیڈروں کا اس عمل پر اعتقاد ہے جسے راست اقدام کہا جاتا ہے اور جو سیاسی مسائل میں طاقت کے استعمال کی ایک مثال ہے...... جور جحان موجودہ موقع پر کانگریس پالیسی کا محرک ہے اس کی بنیادی خصوصیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اگر یہ کہا جائے کہ عام طور سے استعمال کی جانے والی طاقت جسمانی طاقت نہیں ہے۔''

جن لوگوں نے اپنی ساری زندگیاں ہندوستان پر حکومت کرتے گذاری تھیں وہ عدم تشدد کی زبان کے پھیر میں نہیں پڑتے تھے، چاہے اس میں اخلاق اور مذہب کا کتنا ہی ذائقہ کیوں نہ ہو۔ انگریزوں کو ہندوستان میں اہنسا کے ذریعے اقتدار سے دستبردار ہونا پڑ رہا تھا۔ انھیں اچھا نہیں لگ رہا تھا جن کی پوزیشن چیلنج کی جارہی تھی۔ انصاف کی تو یہ ہے کہ ان میں سے اکثر یہ بات صدق دلی سے کہتے تھے کہ اپنے تمام نسل و زبان کے تفرقوں، اندرونی اختلافات اور بیرونی حملوں کی مدافعت سے معذوری کی موجودگی میں ہندوستان خودمختاری کا اہل ہی نہیں تھا۔

انگریزوں نے بدظنی کی جس دیوار کے پیچھے اپنے کو محصور کرلیا تھا اسے دیکھ کر گاندھی اکثر تقریباً مایوس ہونے لگتے تھے۔ جب وہ ان کے افعال پر تنقید کرتے تو انھیں فتنہ انگیز خطیب قرار دے کر ان کی برائی کی جاتی اور جب وہ ان کے دوست ہونے کا دعویٰ کرتے تو ان پر ریاکاری کا الزام لگایا جاتا۔ جب وہ ملاقات کی درخواست کرتے تو ان پر شبہ کیا جاتا کہ وہ حکومت کو حکمت عملی سے شکست دینا چاہتے ہیں۔ جب وہ کوئی تحریک چلاتے تو کہا جاتا کہ مصالحت دشمن ہیں۔ جب وہ اس تحریک کا دائرہ تنگ کرتے یا اسے واپس لیتے تو کہا جاتا کہ وہ اپنے پیرودں میں اعتبار کھو چکے ہیں۔

ستیہ گرہ کا، جس کی ایک شکل سِول نافرمانی تھی۔ مقصد ہی یہ تھا کہ بدظنی کی دیوار میں رخنے ڈال کر داخل ہوا جائے۔ جب دلیل ناکام ہوجاتی تو اپنے اوپر رضا کارانہ طور سے مخالفت کی عائد کردہ تکالیف کا بوجھ ڈال کر اس کے دل کو پگھلانا مخالفت پر حملے کا یہ طریقہ نہ تو ہمیشہ آسان ہوتا اور نہ اس سے نتائج جلد برآمد ہوتے۔ جب برطانیہ کا اخلاقی دفاع بالکل زد پر آجاتا تو برطانوی حکام اپنی پوزیشن کے چیلنج کا جواب مزید زیادتیوں اور مزید لاپروائی سے دیتے۔ لیکن سِول نافرمانی کی تحریکوں سے ہندوستانی قوم پروری کو کم از کم دو طرح سے فائدہ پہنچا۔ ان پر سے خوف کا جادو ٹل گیا جو ہندوستانی عوام کو تقریباً ڈیڑھ صدی سے چاروں طرف سے لپیٹے ہوئے تھا اور دوسرے یہ کہ کتنی ہی آہستگی سے سہی انھوں نے برطانوی سخت گیری کو تشکیک میں اور تشکیک کو تھکن میں تبدیل کر دیا۔ بہترین حالات میں بھی ایک برصغیر پر حکومت کرنا بہت سے سِول حکام کے لیے یوں بھی کافی مشکل کام تھا۔ آبادی کے پرشور طبقوں کی مستقل مخالفت کے مقابلے میں تو یہ کام آخر کار ناممکن ہوگیا 1932 کے دوران ہندوستان کے حالات کے بارے میں انڈیا لیگ کے وفد کی

رپورٹ کے دیباچے میں برٹ اینڈ رسل نے آئرلینڈ کی تلخ وراثت کی یاد دلائی۔آج کون ہے جو آئرلینڈ میں سیاہ اور کتھئی رنگ کے زمانے کے ظلم وستم کو صحیح بتائے گا۔کون ہے جو آج سے پچاس برس بعد ہندوستان میں ہونے والے حالیہ ظلم وتشدد کے حق میں کوئی اچھی بات کہہ سکے گا؟ کوئی بھی نہیں۔ یہ تو ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم بہت سی ایذا رسانیوں کا باعث بنیں اور غالباً بہت ہی اخلاقی گراوٹ کا سبب بھی لیکن یہ ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہندوستان کو طاقت کے بل پر ہمیشہ غلام بنائے رکھیں۔

لیکن ہم یہاں پیش بینی کرنے لگے۔ اگست 1932 تک لارڈ ولنگڈن اور ان کے مشیروں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ حکومت کی ہتھوڑے بازی سے سول نافرمانی کی تحریک مردہ ہو چکی ہے۔سزایاب ہونے والوں کی تعداد جو فروری 1932 میں گھٹ کر 3047 رہ گئی تھی تحریک بہت نشیب میں جا پہنچی تھی اور اس کے مصنف کے ہاتھوں اس کو ایک اور ددھچکا لگنے والا تھا۔اچھوتوں کو جداگانہ حق رائے دہندگی دیے جانے کے خلاف گاندھی کے برت کا اعلان رائے عامہ کے زوروں سے جھنجھوڑنے کے لیے تو تھا ہی لیکن اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ اس کو غیر سیاسی راہ کی طرف موڑا جائے۔

باب38

ہری جن

13/ستمبر 1932 کو ہندوستان بھر کے اخبارات میں یہ سنسنی خیز اعلان چھپا کہ گاندھی نے جواب بھی یرودا جیل میں قیدی تھے۔ نئے آئین میں اچھوتوں کو جداگانہ حق رائے دہندگی دیے جانے کے خلاف احتجاج کے طور پر 20 ستمبر سے مرن برت رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک طرف گاندھی اور دوسری طرف برطانوی وزراء کے مابین جاری خط وکتابت سے پتہ چلتا ہے کہ بحرانی فضا کئی مہینوں سے تیار ہو رہی ہے۔

مارچ 1932 میں یعنی قید ہونے کے دو مہینے کے بعد گاندھی نے فرقہ وارانہ حق رائے دہندگی (کمیونل اوارڈ) کے مسئلے پر سکریٹری اسٹیٹ کو خط لکھا۔ نئے آئین کے ماتحت اسی اوارڈ کے مطابق نمائندگی کی تعداد اور طریقے کی تعین کی گئی تھی۔ انھوں (گاندھی) نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ جداگانہ حق رائے دہندگی ہندو فرقے کو تقسیم کر دے گا اور پسماندہ اقوام (اچھوتوں) کو فائدہ بھی نہیں پہنچے گا۔ انھوں نے دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر اپنا قول یاد دلایا کہ پسماندہ اقوام کو جداگانہ حق رائے دہندگی دیا گیا تو وہ اپنی جان کی بازی لگا کر اس کی مخالفت کریں گے۔ انھوں نے سر سیموئل کو یقین دلایا کہ یہ بات وقتی جوش کے ماتحت یا زورِ خطابت میں نہیں کہی گئی تھی۔

17/اگست 1932 کو جب ''کمیونل اوارڈ'' شائع ہوا تو اس سے گاندھی کے ذہن کے

بدترین خطرات کی تصدیق ہوگئی۔ اگرچہ پسماندہ اقوام کو دہرے حقوق رائے دہندگی ملے تھے۔ ایک ان کی جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے لیے اور دوسرا عام (ہندو) حلقہ ہائے انتخاب کے لیے۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ان اقوام کے لیے جداگانہ انتخاب قائم کردیا گیا تھا۔گاندھی نے برطانوی وزیراعظم کو فوراً لکھا کہ وہ مستقل مرن برت رکھ رہے ہیں اور یہ تبھی ختم ہوگا جب برطانوی حکومت یا تو ازخود یا رائے عامہ کے دباؤ میں آکر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے گی اور پسماندہ اقوام سے جداگانہ حق رائے دہندگی کی اسکیم کو واپس لے لے گی۔اگر انھیں رہا کردیا جاتا تب بھی برت جاری رہنے والا تھا۔ تین ہفتوں کے بعد ریمزے میکڈانلڈ نے خط کی رسید سے ''بے حد تعجب'' اور ''ازحد پرخلوص افسوس'' کے ساتھ مطلع کیا۔انھوں نے یہ صفائی پیش کی کہ حکومت کے اوارڈ (فیصلہ) میں صرف اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ متخالف مانگوں کو منصفانہ طور پر تولا جائے اور مختلف قوموں کے مابین اتفاق رائے ہی سے اس کی جگہ دوسرا انتخابی نظام لایا جاسکتا ہے۔ برطانوی وزیراعظم نے صرف برت کے جواز ہی پر اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ گاندھی کی نیت پر بھی شبہ کیا تھا۔''جہاں تک میں آپ کے طرز فکر کو سمجھ پا رہا ہوں، آپ تا بہ مرگ فاقہ کرنے کا انتہاپسندانہ راستہ اس لیے نہیں اختیار کررہے ہیں کہ پسماندہ اقوام دوسرے ہندوؤں کے ساتھ مشترک حق رائے دہندگی مل جائے کیوں کہ یہ تو (آئین میں) پہلے سے دیا جاچکا ہے، اس لیے بھی نہیں (کررہے ہیں) کہ ہندوؤں کا اتحاد باقی رہے کیوں کہ اس کا بھی انتظام موجود ہے بلکہ صرف اس لیے (کررہے ہیں) کہ پسماندہ اقوام جو مسلمہ طور پر مہیب محرومیوں کا شکار ہیں وہ گنتی کے بھی ایسے چند نمائندے نہ چن پائیں جو ان کی طرف سے قانون ساز اسمبلیوں میں ان کے مستقبل پر نمایاں طور سے اثرانداز ہونے والی آواز اٹھاسکیں۔''

یہ زخم بے دردی سے لگایا گیا تھا لیکن اس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ برطانوی وزیراعظم اور ان کے مشیروں کو اس مسئلے پر گاندھی کے گہرے جذباتی اور مذہبی نقطہ کا صحیح ادراک ہی نہیں ہے۔سب سے پہلے تو انھیں یہ گمان گذرا کہ اس برت میں سیاسی مقصد کی بو آتی ہے اور گاندھی نے اس برت سے ایک کھیل رچا ہے۔تاکہ سول نافرمانی کی ناکامی سے ان کے وقار کو جو صدمہ پہنچا ہے اس کا ازالہ ہوجائے لیکن پسماندہ اقوام سے گاندھی کی دلچسپی نہ تو حالیہ تھی اور نہ عارضی۔اس کی جڑیں ان

کی انسانیت دوستی میں دور تک پیوست تھیں اور اس کا سلسلہ ان کے بچپن تک پہنچتا تھا چھوت چھات سے ان کا سامنا سب سے پہلے اپنے گھر میں ہوا تھا۔ ان کی محبوب ماں بہت مذہبی تھیں لیکن وہ ان تعصّبات سے پاک نہیں تھیں جو اس زمانے کے ویشنو ہندوؤں میں عام تھے۔ بچوں کو یہ حکم تھا کہ گھر کے بھنگی اوکا کو چھوکر دوسروں کو بھی ناپاک نہ کریں اور ساتھی اچھوت طالب علموں کے ساتھ نہ کھیلیں۔ گاندھی ایک مطیع بچے تھے لیکن ان پابندیوں پر وہ اس طرح کڑھتے کہ ظاہر ہو جاتا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں بھی انھیں چھوت چھاپ میں اور ان خوبصورت واقعات میں ایک تضاد نظر آتا تھا جس کا ذکر رامائن میں انھوں نے اس طرح سنا تھا کہ اس کتاب کے ہیرو رام کو ناؤ سے گنگا پار کرانے والا ''چھوٹی ذات'' کا مانجھی تھا۔ وہ جیسے جیسے بڑھتے گئے چھوٹے سے چھوٹے انسان کے لیے بھی بھائی چارے کا جذبہ بڑھتا گیا۔ جنوبی افریقہ میں ان کے رفقائے کار سبھی ذاتوں اور فرقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندوستان واپس آکر انھوں نے جو پہلا آشرم بنایا اس میں انھوں نے ایک اچھوت خاندان کو بھی بخوشی شامل کیا۔ اس سے احمد آباد کے ان امیر تاجروں کے جذبات مجروح ہوئے جو آشرم بنانے کے لیے مالی مدد دے رہے تھے۔ فنڈ کے قحط سے مجبور ہو کر انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے احمد آباد کی مزدور بستیوں میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن ایک گمنام معطی نے ایسا کرنے کی ضرورت نہ پڑنے دی۔ عدم تعاون کے پروگرام کے عملی پہلو میں چھوت چھات کا خاتمہ شامل تھا۔ دوسری دہائی کے اواخر میں انھوں نے ملک کے طول وعرض کے دورے کیے تھے۔ ان دوروں کی تقریروں میں چھوت چھات کا موضوع بار بار آتا تھا۔ گول میز کانفرنس کے مباحثوں میں یہ دیکھ کر انھیں دکھ ہوتا تھا کہ اچھوتوں کے نمائندے فرقہ پرستوں اور سیاسی رجعت پسندوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے جذبات کتنے شدید تھے اس کا اظہار ان کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے اقلیتی کمیٹی کے سامنے 11 نومبر 1931ء کو کی تھی میں خود یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں اپنی ذات میں اچھوتوں کی زبردست تعداد کی نمائندگی کرتا ہوں۔ یہاں میں صرف کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے گفتگو نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں اپنی طرف سے بھی بول رہا ہوں اور میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر اچھوتوں کی رائے شماری کی جائے تو مجھے ان کے ووٹ ملیں گے اور میں رائے شماری میں سرفہرست ہوں گا۔''

''ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے رجسٹر میں اور ہماری مردم شماری میں اچھوت ایک علاحدہ طبقے کی حیثیت سے درج کیے جائیں۔ سکھ ہمیشہ اس طرح رہ سکتے ہیں، مسلم رہ سکتے ہیں، یوروپین رہ سکتے ہیں۔ کیا اچھوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اچھوت رہ جائیں گے؟''

جہاں انگریز گاندھی کے جذبات کی گہرائی کا اندازہ لگا پانے میں ناکام رہے وہاں اس سے بھی زیادہ ناکامی انھیں ایک ایسے سوال پر برت رکھنے کی اخلاقیات کے سمجھنے میں ہوئی جسے وہ خالص سیاسی مسئلہ جان رہے تھے۔ انھیں برت کا مظہر ہلکا سا بھیس بدل کر دباؤ ڈالنے کا ایک طریقہ نظر آرہا تھا۔ گاندھی کے برتوں پر برطانوی ردِّعمل لُو[1] کا کارٹون تھا جس کا عنوان ''1933 کی پیشین گوئی'' تھا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ 10، ڈاؤننگ اسٹریٹ[2] کے اشارے پر لارڈ ولنگڈن اس لیے بھوک ہڑتال کرنے جارہے ہیں کہ ''مہاتما گاندھی کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کردیا جائے کہ نیا آئین اچھوت ہے۔'' سی، الف ایڈریوز سے زیادہ کوئی دوسرا انگریز گاندھی کو سمجھنے کے لیے آمادہ وتیار نہ ہوگا لیکن انھوں نے بھی ان (گاندھی) کو 12/مارچ 1933 کو برمنگھم سے لکھا کہ ''میں یہ سوچ نہیں پاتا کہ آپ اس بات کو محسوس کررہے ہوں گے یا نہیں کہ یہاں مرن برت کے خلاف اخلاقی اکراہ کا جذبہ کتنا شدید ہے۔ میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ایک عیسائی کی حیثیت سے مجھے ایسا کرنا چاہیے اور بڑی ہی مشکلوں سے میں کسی نہ کسی طرح اس کا جواز دے پاؤں گا۔'' بہرحال گاندھی کو اپنے ضمیر یا انھیں کے لفظوں میں اپنے مالک کے علاوہ کسی اور کے سامنے اس کا جواز پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ان کی تنظیم حیات میں برت کا ایک خاص مقام تھا۔ بعض اوقات اپنی روح کو اذیت سے نجات دینے کے لیے برت واحد ذریعہ تھا۔ دل کو اچھی طرح ٹٹولے بغیر برت رکھا نہیں جاسکتا تھا۔ اس وقت تک نہیں جب تک کہ ''خاموش مختصر آواز'' صاف اور بے مغالطہ لہجے میں بول نہ اٹھے لیکن کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ خود ان سے غلطی ہوگئی ہو؟ کہیں ان کا اپنا تفاخر تو اندرونی آواز بن کر سامنے نہیں آرہا تھا؟ گاندھی نے یہ انکار نہیں کیا کہ خود ان سے غلطی کا امکان ہے۔ لیکن انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ اگر خود اختیاری فاقہ کشی سے ان کی موت واقع ہوگئی اور

---

(1) Low (لُو) ایک مشہور انگریز کارٹونسٹ کا نام

(2) برطانوی وزیراعظم کی قیام گاہ

لوگ ان کے جھوٹے جادو کا شکار ہو گئے تھے تو ان کے لیے یہ موت اچھا چھٹکارا ثابت ہوگی۔

کیا برت دباؤ ڈالنے کا ایک طریقہ نہیں تھا؟ گاندھی کو یہ معلوم تھا کہ ان کے برت سے ایک اخلاقی دباؤ ضرور پڑتا تھا، لیکن یہ دباؤ ان لوگوں کے خلاف استعمال نہیں کیا جارہا تھا جن کا ان سے اختلاف تھا بلکہ یہ دباؤ ان پر پڑتا تھا جو ان سے پیار کرتے تھے اور اس ہیبت ناک ظلم کے خلاف ان کے دل میں جو درد و غم تھا اس کا ایک حصہ ان لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ انھیں یہ امید نہیں تھی کہ ان کے ناقدین کا ردّعمل بھی وہی ہوگا جو ان کے دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں کا۔ لیکن اگر ان کا خود سے صلیب پر چڑھنا دوسروں پر ان کے اخلاص کا مظاہرہ کر سکے تو آدھی جنگ سر ہو جائے گی۔ جو مسائل اس وقت دانوں پر لگے ہوئے تھے ان کو برت نے ایک ڈرامائی شکل دے دی تھی۔ بظاہر تو اس سے دب گئی تھی لیکن درحقیقت اس کا مقصد عقل کو جمود اور تنگ خیالی کے اس مرغے سے چھٹکارا دلانا تھا جس کی بدولت ایک بہت بڑی سماجی نابرابری کو صدیوں تک جاری رہنے کی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔

اس خبر نے کہ گاندھی برت رکھنے والے ہیں ہندوستان کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کے رکھ دیا۔ ان کی برت شروع کرنے کا دن یعنی 20 ستمبر ہندوستان بھر میں فاقہ و دعاؤں کی حیثیت سے منایا گیا۔ شانتی نکیتین میں، کالے لباس میں ملبوس رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک بڑے مجمع کو برت کی اہمیت کے موضوع پر خطاب کیا اور اس مدقوق پرانی خراب رسم کا فوری مقابلہ کرنے کی اہمیت پر توجہ دلائی۔ بیساختہ جذبات میں ابال آ گیا۔ پسماندہ اقوام کے لیے مندر کنویں اور عوامی جگہیں کھول دی گئیں۔ اونچی ذات کے ہندوؤں اور پسماندہ اقوام کے لیڈروں کی ایک کانفرنس بلائی گئی تاکہ برطانوی ایوارڈ کی ان دفعات کے متبادل انتخابی انتظامات سوچے جائیں جن کی بنا پر گاندھی کو سب سے بڑی قربانی دینا پڑ رہی تھی۔

اس دوران میں وقت تیزی سے بھاگا جارہا تھا۔ حکومت اس پر تیار تھی کہ گاندھی کو چند پابندیوں کے تحت پونا کے کسی پرائیوٹ رہائش گاہ میں منتقل کر دیا جائے لیکن گاندھی نے جیل میں ہی رہ کر برت رکھنے کو ترجیح دی۔ انھوں نے 20 ستمبر کو گرم پانی میں شہد اور لیموں کا شربت آخری غذا کے طور پر پیا۔ ایک گھنٹے بعد برت شروع ہو گیا۔ اسی شام کو انھوں نے اخباری نامہ

نگاروں کو بتایا کہ ان کے برت کی بنیاد ہے اپنے مقصد پر اعتماد۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ''میری فریاد اوپر اٹھ کر خدائے بزرگ و برتر کے تخت تک پہنچے گی۔'' دوسرے دن صبح کو انھیں قید خانے کے ایک الگ تھلگ احاطے میں لے جایا گیا۔ جہاں آم کے ایک چھتنار چھوٹے پیڑ کے نیچے انھوں نے دن گذارا۔ ولبھ بھائی پٹیل اور مہادیو ڈیسائی پہلے ہی سے ان کے ساتھ تھے۔ بعد میں سروجنی نائیڈو بھی جو عورتوں کی جیل میں تھیں، ان سے آملیں۔ کستور با کو سابرمتی سے بلا کر اپنے شوہر کے پاس پونا منتقل کر کے ایک دل جویانہ اقدام کیا گیا۔ کستور با سابرمتی میں اپنی مدتِ قید گذار رہی تھیں۔

ہندو لیڈروں کی کانفرنس بمبئی میں ہوئی۔ لیڈروں میں مدن موہن مالویہ تیج بہادر سپرو، ایم آر جیکر، راج گوپالا چاری، این سی کیلکر، راجندر پرشاد اور موشیے شامل تھے۔ یہ سب جلدی سے کوئی حل نکالنے کے لیے بے چین تھے۔ لیکن انھیں پسماندہ اقوام کے لیڈروں کو اور خاص کو امبیڈکر کو ساتھ لے کر چلنا تھا۔ امبیڈکر نہ صرف یہ کہ جداگانہ انتخاب کے ہٹ دھرم وکیل تھے بلکہ اپنی محوری حیثیت کا پورا احساس بھی رکھتے تھے۔ جو حل انھیں قبول نہ ہو سکتا اس کے حکومت کی طرف سے منظور کیے جانے کا امکان نہیں تھا گاندھی وہ آخری شخص ہوتے جو اس طرح کانفرنس کو مجبور ہو کر کوئی غلط فیصلہ لینے دیتے۔ انھوں نے اپنے بیٹے دیوداس کے ذریعے مجتمع لیڈروں کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ (دیوداس) ''اپنے باپ کے بیٹے ہونے کی حیثیت سے اپنے باپ کی زندگی سے ہاتھ دھونے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اس کے لیے تیار نہیں کہ مجنونانہ عجلت میں آ کر دبائے ہوئے طبقات کے حقوق پر کوئی ضرب پڑے کانفرنس نے کئی تجویزوں پر غور کیا۔ اس کے بعض اراکین مہاتما سے تبادلۂ خیال کے لیے پونا بھی گئے۔

برت کے دن گذرنے اور گفتگوئے مصالحت کا بوجھ بڑھنے کے ساتھ گاندھی کی طاقت تیزی سے گھٹتی گئی۔ امبیڈکر نے سختی سے مول تول کیا۔ فرقہ وارانہ ایوارڈ کے ذریعہ ان کے فرقے کو جو جداگانہ انتخاب کا حق ملا تھا وہ اسے تب تک چھوڑنے کو تیار نہ تھے جب تک کچھ ایسے فوائد حل نہ ہو جائیں جو پلہ برابر کر دیں۔ آخر کار ایک معاہدہ ہو گیا۔ یہ ''معاہدہ پونا'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ذریعے سے صوبائی اسمبلیوں میں پسماندہ اقوام کی نمائندگی دونی کر دی گئی۔ لیکن طریق انتخاب پر نظر ثانی ہو گئی۔ پسماندہ اقوام کے رائے دہندگان پہلے ایک ابتدائی انتخاب کر کے

ہر نشست کے لیے چار چار امیدواروں کے پینل منتخب کریں گے۔ یہ چاروں امیدوار پھر اونچی ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں کے مشترکہ انتخاب کا مقابلہ کریں گے۔ نشستوں کا تحفظ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ باہمی اتفاق سے ختم نہ کر دیا جائے۔ ابتدائی انتخاب کا طریقہ دس سال کے بعد ختم ہو جائے گا۔

یہ انتخاب رائے ہر وقت ہوں۔ ڈاکٹروں کے بورڈ نے گاندھی کو دیکھنے کا بعد اعلان کیا کہ ''ہماری یہ قطعی رائے ہے کہ ان کی حالت اب خطرناک حدود میں داخل ہونے جا رہی ہے۔ بہر حال گاندھی اس وقت تک برت توڑنے پر رضا مند نہ تھے۔ جب تک حکومت معاہدہ نامہ پر مہر تصدیق ثبت نہ کر دے وزیر اعظم میکڈانلڈ سرعت کے ساتھ نیکس سے لندن پہنچے۔ وہ نیکس میں اپنی چچی[1] کے جنازے میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ سر سیموئل ہور اور انتخابی کمیٹی کے چیرمین لارڈ لوتھین بھی آ ملے۔ برطانوی کابینہ نے پونا معاہدہ منظور کر لیا اور گاندھی نے برت توڑ دیا۔

ہندوستان نے ایک بار پھر اطمینان کی سانس لی۔ لیکن گاندھی کے نقطۂ نظر سے ان کی جان کا بچ جانا اس ابتلا کا سب سے کم اہم پہلو تھا جس میں انھوں نے خود کو برضا ورغبت ڈالا تھا۔ انھوں نے یہ بات واضح کر دی کہ اگر چھوت چھات میں اصلاح کا کام پوری تن دہی سے آگے بھی نہ ہوتا رہا اور یہ مقصد معقول مدت کے اندر حاصل نہ کیا گیا تو وہ پھر برت رکھیں گے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ''جہاں تک معاہدے کی پابندی کا تعلق ہے، میں اپنے ہری جن بھائیوں کو (جن کا یعنی اچھوتوں کا نام آج سے میں نے یہی رکھ دیا ہے) یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اس کے لیے میری جان کو یرغمال بنالیں۔[2]

پونا معاہدے کی بدولت پس ماندہ اقوام کے لیے ایک انتخابی اسکیم کی جگہ دوسری انتخابی اسکیم نے لے لی۔ اس میں تضاد یہ تھا کہ یہ انتخابی انتظامات جس نئے آئین کا جزو تھے خود وہ آئین۔

---

(1) انگریزی لفظ Aunt ہے اس کا ترجمہ پھوپھی، خالہ، ممانی سب ہو سکتا ہے اصل رشتہ مترجم کو معلوم نہیں لیکن چونکہ علی العموم چچی ہی مراد ہوتی ہے اس لیے وہی ترجمہ قیاسی کر دیا گیا ہے۔

(2) پیارے لال (رزمیہ برت)، ص:140

گاندھی اور کانگریس کو پسند نہیں تھا۔ معترضین نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا کہ تبدیل کردہ انتظامات کے اعتبار سے پس ماندہ اقوام کو صوبائی اسمبلیوں میں اور زیادہ نمائندگی مل جائے گی۔ برٹش ایوارڈ سے اکہتر نشستیں ملنا تھیں۔ پونا معاہدے میں ایک سواڑتالیس دے دی گئی تھیں۔ زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ پونا معاہدے کی مخالفت مغربی بنگال میں شروع ہوئی وہاں اونچی ذات ہندووں کی نمائندگی ایک طرف یورپینوں کے باعث کم ہوگئی تھی اور دوسری طرف پسماندہ اقوام اس وجہ سے گاندھی کو یہ آئینی حساب کتاب ناگوار طبع تھا وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اونچی ذات کے ہندو کمزور بھائیوں کے ساتھ جو تمام بے انصافیاں کرتے چلے آئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے اب جتنی بھی فیاضی کا برتاؤ کریں کم ہے۔ برت کا ایک اچھا نتیجہ تو بہر حال نکلا اس سے پسماندہ طبقوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا خاتمہ ہو گیا۔ ہندوستانی سیاست میں انتخابات کا یہ طریق کار افتراقی چکر کی طرح استعمال کیا جارہا تھا۔ یہ بڑی خفیہ چال سے چل رہا تھا اور اس کا پورا اثر تو اگلی دہائی ہی میں نظر آتا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ کم از کم قومی زندگی کا ایک شگاف بروقت بھر گیا۔

ضمناً ان آئینی انتظامات کا ساڑھے چار سال تک نفاذ نہ ہو سکا لیکن اس سے کہیں اہم تطہیر جذبات کا وہ ماحول تھا جس سے ہندو سماج اس دوران میں دوچار ہوا جیسا کہ گاندھی نے عہد کیا تھا۔ برت کا مقصد ہندو سماج کے ضمیر میں نشتر چبھو کے صحیح مذہبی اقدام پر رائل کرنا تھا۔ جداگانہ انتخابات کا خاتمہ چھوت چھات کے خاتمے کا صرف نقطۂ آغاز تھا۔

اس عرصے میں 29 ستمبر کو حکومت نے وہ خصوصی سہولتیں واپس لے لیں جو چھوت چھات کے خلاف کام کرنے کے لیے جیل میں ملاقاتوں اور خط کتابت کے لیے گاندھی کو دے رکھی تھیں، لیکن نومبر میں یہ سہولتیں پھر دے دی گئیں۔ کچھ تو اس لیے کہ حکومت کو یہ خوف تھا کہ کہیں دوبارہ برت نہ رکھ لیں اور کچھ اس وجہ سے کہ اسے یہ محسوس ہوا کہ گاندھی دل وجان سے اس کام میں لگے ہیں اور سماج سدھار کے کاموں پر توجہ سے یہ امکان تھا کہ سیاسی فضا میں دباؤ کچھ کم ہو۔

اس طرح تاریخ میں سماج سدھار کی سب سے بڑی مہم ایک سرکاری قیدی نے چلائی۔ گاندھی سے بڑھ کر اسے کون جانتا تھا کہ قدیم الایام سے جو ظلم چلا آرہا تھا اس کا راتوں رات خاتمہ نہیں ہوسکتا تھا اور برت سے جو نتائج برآمد ہونے تھے انھیں عملی اقدام کے ذریعے اور

پروپیگنڈے کے ذریعے آگے بڑھانا تھا۔ انھیں کا فیضان تھا کہ جی ڈی برلا کی صدارت میں اور کبھی نہ تھکنے والے اے وی ٹھکر کی معتمدی میں ایک کل ہند ادارہ قائم ہوگیا قید خانے کی کوٹھری سے گاندھی پریس کے لیے بیانات اور مکتوب الیہم کو خطوط کا ایک سلسلہ جاری کیے ہوئے تھے تاکہ عوام کو چھوت چھات کے نقصانات سے آگاہ کیا جاسکے۔ تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے انھوں نے ''ہریجن'' نامی ایک ہفتہ وار اخبار کے اجراء کا انتظام کیا۔ ''ہریجن'' کے معنی ہیں ''خدا کے بچے'' گاندھی نے یہ نام اچھوتوں کو دیا تھا۔ دنیا کے تمام مذاہب خدا کی اس صفت کا بیان کرتے ہیں کہ وہ ان کا دوست ہے جن کا کوئی اور دوست نہیں، وہ ان کا مددگار ہے جن کی مدد کرنے والا کوئی دوسرا نہیں اور وہ کمزوروں کا محافظ ہے۔ ہندوستان کے ان چار کروڑ یا اس سے بھی زیادہ ہندوؤں سے بڑھ کر کون بے یارومددگار اور کمزور ہوگا جنھیں اچھوتوں میں شمار کیا جاتا ہے؟

''ینگ انڈیا'' ہی کی طرح ''ہریجن'' کا بھی ایک بہت بڑا حصہ خود گاندھی لکھا کرتے تھے۔ ''ہریجن'' کے پہلے دو شمارے دہردون جیل میں دیکھ کر نہرو نے گاندھی کو لکھا کہ ''اس حد سے فزوں لطف اور کبھی ختم نہ ہونے والے صبر کا وہ پرانا چبھتا ہوا انداز جو مخالف کو بجھا دیتا ہے یا آپ کے بقول بے اثر کر دیتا ہے۔ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی مجھے غریب سناتنیوں پر رحم آتا ہے۔ اپنے تمام غصے، دشنام طرازی اور سخت جذباتی دعاؤں کے باوجود وہ اس طرح کے دقیقہ سنج اور لطیف حملے کے مقابلے میں کیا ٹھہر سکیں گے۔'' سناتنی (کٹرپنتھی ہندو) ہندوؤں کی مذہبی کتب پر بھروسہ کیے بیٹھے تھے۔ گاندھی کو اسی بات پر شبہ تھا کہ ان کتابوں میں چھوت چھات کا کوئی جواز پایا جاتا ہے۔ انھوں نے راج گوپالا چاری کو لکھا۔ ''...... ہمارا یہ نقطہ نظر نہیں ہے کہ شاستروں میں کہیں بھی چھوت چھات نہیں ہے۔ ان (کٹرپنتھیوں) کو یہ ثابت کرنا ہے کہ جس طرح کہ چھوت چھات آج کل برتی جارہی ہے اس کا جواز شاستروں میں موجود ہے۔ ایمان داری کے ساتھ یہ کام کرنا ناممکن ہے۔''

لیکن اگر کسی قدیمی مخطوطے میں اس طرح کے ظلم کا کوئی جواز مل بھی جاتا تو گاندھی اس کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوتے۔ انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ کوئی کتاب کتنی ہی متبرک کیوں نہ ہو ابدی حقیقت کو اپنی جلد میں مقید نہیں کرسکتی ان کی دلیل یہی تھی کہ ہر الہامی کتاب میں

کچھ مستقل عناصر ہوتے ہیں، کچھ ابدی حقائق بیان ہوتے ہیں لیکن اس میں ایسے بھی احکام ہوتے ہیں جن کا تعلق ہم عصر سماج سے ہوتا ہے۔ موخرالذکر سے اگر انسانی وقار کو دھکا لگتا ہے تو اس حصے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے ''ہری جن'' نے ہندوؤں کی دبی ہوئی برائیوں کا پردہ فاش کرنے میں پہل کی ''مدر انڈیا'' نامی کتاب کی مصنفہ مس مے اوبھی ہندوؤں کے یہاں اس سرچشمۂ بدی سے نقاب ہٹانے میں اتنی تن دہی سے کام نہیں کر سکتی تھیں۔ حالاں کہ ان کی یہ کتاب وہ تھی جسے گاندھی نے ایک مرتبہ ''گندے نالے کے انسپکٹر کا روزنامچہ'' سے اسے تشبیہ دی تھی۔ ''ہری جن'' میں ان اچھوتوں یعنی دوزخ کے باشندوں کی قلمی تصویریں بڑی چابک دستی سے پیش کی جاتی تھیں۔ ان کی محرومیوں کی فہرست تفصیل سے تیار ہوتی تھی۔ ملک کے بعض حصوں میں انھیں دیہات کے کنویں سے پانی لینا، پانی کے پائپ استعمال کرنا اسکولوں اور ڈاک خانوں میں جانا بھی منع تھا۔ چھتریاں نکال کر چلنے اور چپلیں پہننے پر بھی روک تھی۔ مرد گھٹنوں سے نیچے دھوتی نہیں پہن سکتے تھے اور عورتوں کو صاف کپڑے اور زیور پہننے کی ممانعت تھی۔ وہ گھوڑے یا سائکل کی سواری نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اونچی ذات کا کوئی ہندو ان کے گھر کے سامنے سے گذرتا تو انھیں احتراماً جھکنا پڑتا تھا۔ جنوبی ہند میں صرف اچھوت ہی نہیں بعض دیگر گروہوں کو یہ بھی سزا ملی تھی کہ وہ نظر کے سامنے بھی نہ آنے پائیں۔ ان میں سے بعض محرومیاں شاذ تھیں، ان میں سے کوئی بھی ہمہ گیر نہیں تھی۔ لیکن مجموعی طور پر ان سے ایک بدنام کر دینے والی فردِ جرم تیار ہوتی تھی۔

گاندھی ذہنوں کی تبدیلی پر یقین رکھتے تھے نہ کہ جبر پر، کیوں کہ اسی طرح آج کے مخالفین کو کل کے مصلحین میں بدلا جا سکتا تھا۔ وہ سماجی برائیوں سے نپٹنے کے لیے قانونی امداد کو ایک ضابطے کے طور پر پسند نہیں کرتے تھے اس لیے جب 1933 کے آغاز میں انھوں نے مندروں میں داخلے کے بلوں کے مرکزی مجلس قانون ساز میں پیش کیے جانے کی ہمت افزائی کی تو یہ کچھ بے محل سی بات لگی۔ وہ اب بھی قید میں تھے اور کانگریس ایک غیر قانونی جماعت تھی جس نے اپنے نمائندے مجالس قانون ساز سے واپس بلا لیے تھے۔ لیکن اس اصلاح میں وہ اس طرح ہمہ تن محو تھے اور وہ اس کی فوری ضرورت کے اس قدر حامل تھے کہ ایک ایسے مقصد کے لیے جو انسان دوستی پر مبنی اور سیاست سے بالاتر ہو وہ کسی بھی حلقے کی مدد لینے کے خلاف نہیں تھے اس کے علاوہ مندر

میں داخلے کے بلوں کا مقصد مندروں میں داخلے پر عمل درآمد کرانا نہیں تھا بلکہ وہ قانونی رکاوٹیں دور کرنا تھا جو ملک کے بعض حصوں میں برطانوی عدالتوں کے ایسے فیصلوں سے پیدا ہوگئی تھیں جن کی بنیاد منضبط تحریری قوانین پر نہیں بلکہ مذہبی رواج پر تھی۔ گاندھی نے جیکر کی طرح کے آئینی ماہرین کی رائے لی اور وائسرائے کو لکھا لیکن سرکاری طرز عمل اگر مثبت رکاوٹ کا نہیں تو بے تعلقی کا ضرور تھا۔ برطانوی راج کے خلاف بغاوت چلانے والے لیڈر کو خوش کرنے کے لیے حکومت ہند کٹر پنتھی ہندو رائے عامہ کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

جب گاندھی اس اصلاحی تحریک میں پھاند پڑے تب انھیں معلوم ہوا کہ یہ برائی جتنا وہ شروع میں سمجھتے تھے اس سے کہیں زیادہ پھیلی ہوئی تھی۔ مصلح کے لیے یہ زبردست مرحلہ تھا۔ زمانۂ قدیم سے چلی آنے والی اس برائی کا وہ کس طرح مقابلہ کریں؟ وہ اپنے رفقائے کار کو کیسے قائل کرائیں کہ وہ دل و جان سے یہ کام کرنا چاہتے تھے اور وہ اس عظیم مشن کے لیے اور زیادہ خلوص نیت اور طاقت عمل کس طرح پیدا کریں۔ ان کے اس ذہنی کرب کا خاتمہ ''اندر کی آواز'' نے 8 مئی 1933 سے اکیس دن کے برت کے اعلان سے کر دیا'' جب میں ایک رات پہلے سونے گیا تو مجھے ذرہ برابر بھی خیال نہ تھا کہ میں دوسرے دن صبح کو برت کا اعلان کر دوں گا۔ بارہ بجے رات کو کوئی چیز مجھے اچانک جگا دیتی ہے اور پھر کوئی آواز دل کے اندر کی یا باہر کی۔ میں بتا نہیں سکتا، مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہتی ہے۔ ''تمھیں برت رکھ لینا چاہیے'' میں پوچھتا ہوں، کتنے دنوں کا؟ وہ آواز پھر کہتی ہے ''اکیس دن کا'' میں پوچھتا ہوں یہ کب سے شروع ہونا چاہیے؟ آواز کہتی ہے ''کل ہی سے'' پھر میں فیصلہ کرنے کے بعد سو گیا۔

ان کے دوست اور معالج ان سے پوچھتے کہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر کیا وہ اس مقصد کو خطرے میں نہیں ڈال رہے تھے جو انھیں اتنا عزیز تھا۔ ان کا جواب ان کی خصلت کے عین مطابق تھا۔ اگر منشائے خداوندی یہ ہوگا کہ ان کے جسم سے اور خدمت لی جائے تو یہ برت بھی اسے تحلیل نہیں کر سکتا۔ اور اگر ہریجنوں کا مفاد خود خدا کا بھی ہو تو وہ ایسے مرد اور عورتیں پیدا کر دے گا جو اس اچھے کام کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔ برت کے پہلے دن یعنی 8 مئی 1933 کو وہ رہا کر دئے گئے اور انھیں پونا میں لیڈی تھیکرسی کے مکان پر ''نا کٹی'' لے جایا گیا جہاں انھوں نے اس

سخت آزمائش کے اکیس دن پورے کیے۔

گاندھی کی رہائی کے فوراً بعد اور انھیں کے ہدایت پر چھ ہفتوں کے لیے سِول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کر دیا گیا۔ جیوں ہی تھوڑی طاقت عود کر آئی، انھوں نے وائسرائے سے ملاقات کے لیے تار کے ذریعے درخواست کی تا کہ صلح کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ لارڈ ولنگڈن نے جواب دیتے ہوئے اس درخواست کو شائستگی سے ٹھکرا دیا۔ یکم اگست کو گاندھی پھر گرفتار کر کے یروَدا جیل بھیج دیے گئے۔ انھیں تین دن بعد رہا کر دیا گیا۔ لیکن پونا شہر کے حدود میں رہنے کی پابندی لگا دی گئی۔ انھوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی، گرفتار ہوئے اور سال بھر قید کی سزا پائی۔ جیل میں واپس آ کر انھوں نے 16 اگست کو اس سہولتوں سے محروم کر دیے جانے پر احتجاجاً برت رکھ لیا جو چھوت چھات کے خلاف مہم چلانے کے سلسلے میں انھیں پہلے دورانِ قید میں حاصل تھیں۔ ان کی حالت تیزی سے نازک ہونے لگی اور وہ رہا کر دیے گئے۔

اب وہ ایک عجیب وغریب مخمصے میں پڑ گئے تھے۔ اگر وہ پھر جیل جاتے تو اس کا امکان تھا کہ حکومت انھیں ہریجنوں کے لیے کام کرنے کی آسانیاں نہ دیتی۔ یہ ''چوہے بلی'' کا کھیل تھا اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا وہ اس کھیل میں پھنسیں گے۔ انھوں نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ ایک سال کی قید میں جو مدت باقی رہ گئی ہے اس کے دوران وہ سول نافرمانی نہ کریں گے۔

اپنی سیاسی کارروائیوں پر از خود عاید کردہ ایثار کی بدولت وہ اپنی تمام تر توتیں چھوت چھات کے خاتمے پر مرکوز کرنے لگے۔ ستمبر 1933 میں وہ واردھا چلے آئے اور انھوں نے سابرمتی آشرم کو ہریجن سیوک سنگھ کے نام تہہ کر دیا۔ 7 نومبر کو ہریجن مفاد کے فروغ کے لیے سارے ملک کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ اگلے نو مہینوں میں انھوں نے ساڑھے بارہ ہزار میل کی مسافت طے کی اور ملک کی بعض سب سے دور افتادہ جگہوں پر گئے۔ یہ وہ جگہیں تھیں جہاں قومی لیڈر کبھی گذرتے ہی نہیں تھے انھوں نے ذات والے ہندوؤں سے کہا کہ اپنے دلوں سے ہری جنوں کے خلاف تعصب نکال پھینکیں اور ہری جنوں پر زور ڈالا کہ وہ نشلی اشیاء کا استعمال اور شراب نوشی ترک کر دیں کیوں کہ اس سے ان کے ہندو سماج میں ضم ہونے میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ انھوں نے ہری جنوں کے مندر میں داخلے کی وکالت کی۔ مندر گنہ گاروں کے لیے ہیں سنتوں کے لیے نہیں ہیں

لیکن یہ فیصلہ کون کرے گا کہ بے گناہ انسان کہاں ہے؟ انھوں نے اس تو ہم کا مذاق اڑایا کہ کوئی پیدائشی طور پر گندا ہوسکتا ہے یا کسی انسان کے سایہ پڑنے یا چھوجانے سے کوئی دوسرا انسان نجس ہوجاتا ہے۔ نہانا اچھا ہے لیکن بھینسیں بھی روزانہ دیر تک نہاتی ہیں۔

انھوں نے ہری جن فنڈ کے لیے چندہ اکٹھا کرنے میں اپنے کو تھکا مارا۔ دس مہینے کے اندر انھوں نے آٹھ لاکھ روپے جمع کیے اگر وہ چاہتے تو یہ رقم کسی مہاراجہ یا کروڑ پتی سے عطیّے کے طور پر لے سکتے تھے۔ لیکن انھیں پیسوں سے اتنی غرض نہیں تھی جن لاکھوں مردوں عورتوں اور بچوں نے ان کے کاسۂ گدائی میں کچھ دیا وہ چھوت چھات کے خلاف جہاد میں ان کے رفیق سپاہی بن گئے۔ سیدھے سادے عوام کی تعلیم کے لیے وہ ہر موقع محل استعمال کر لیتے تھے۔ مالا بار کو انھوں نے ہندوستان کے چھوت چھات کے نقشے پر سیاہ ترین داغ کہا تھا۔ وہاں جب ایک لڑکی نے اپنے سونے کے زیور اتار کر ان کو ہری جن فنڈ کے لیے پیش کیے تو انھوں نے اس سے کہا کہ ''جو زیور تم نے ابھی الگ کر دیا ہے اس کے مقابلے میں تمھارا تیاگ زیادہ سچا اور کھرا زیور ہے۔'' عورتوں سے وہ یوں سودا کرتے ''ایک کنگن کے بدلے میں ایک آٹوگراف۔'' انھوں نے ایک تیلگو مجمع میں یہ پھبتی کسی کہ ''آندھرا والے کوئی اسکاٹس[1] میں نہیں ہیں'' تاکہ جو لوگ اپنی تھیلیوں کی ڈوریاں ڈھیلی کرنے پر تیار نہیں تھے وہ آمادہ ہوجائیں۔ ''میں ایک ہری جن مزدور ہوں اور میرا وقت قیمتی ہے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے ایک ایسے ہاتھ دیکھنے والے کو جھڑک دیا جو ان کے ہاتھ کی لکیریں پڑھنا چاہتا تھا ایک دیہاتی ڈاکٹر سے انھوں نے پوچھا کہ ''کیا چھوت چھات کے مرض کا بھی علاج ہے۔'' ایک دوسرے گاؤں میں ان کے بال بنانے کے لیے ایک نائن بلائی گئی۔ جب وہ مشاقانہ بال تراشنے لگی تو گاندھی نے دیکھا کہ وہ سونے چاندی کے زیوروں سے لدی ہے۔ انھوں نے پوچھا ''یہ منحوس چیزیں کیا ہیں؟ یہ تمھیں خوبصورت تو نہیں بناتے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بھدّے ہیں اور ان میں گرد جمتی رہتی ہے۔'' یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ عورت کو مایوسی ہوئی۔ اس نے جواب دیا ''میں تو خاص اس موقع کے لیے انھیں عاریتاً لائی تھی۔ میں اچھے زیوروں کے بغیر آپ کے سامنے نہیں آسکتی تھی۔'' جانے سے پہلے اس نے ساری مزدوری ہریجن فنڈ میں دے دی۔

---

(1) انگریز اسکاٹ لینڈ کے رہنے والوں (اسکاٹس میں) کو کنجوس کہتے ہیں۔

یہ ہری جن دورہ کسی حالت میں بھی فاتحانہ پیش رفت نہیں کہا جا سکتا۔گاندھی کی جنگ زمانۂ دراز سے چلے آنے والے ظلم اور مدت مدید سے مستقل بنیادوں پر قائم مفادات خصوصی سے تھی اور یہ اپنی بقا کے لیے کچھ بھی کرسکتے تھے۔سناتنی ان پر خطرناک بدعت کا الزام لگاتے تھے۔وہ کالی جھنڈیاں دکھاتے پھرتے تھے۔وہ ان کو تقریروں کے دوران ٹوک کر دق کرنا چاہتے اور ان کے جلسوں میں گڑبڑ کرانے کی کوشش کرتے یہ صرف ہلڑ بازی نہیں تھی بلکہ عدم تشدد کے پیغامبر کو لوگوں کی نظروں سے گرانے کی ایک سوچی سمجھی حکمت عملی تھی۔اگر ان کے پیرواسی ردیف وقافیہ میں جواب دیتے یا پولیس کی مدد طلب کرتے تو گاندھی کی الجھن مکمل ہوجاتی۔مئی 1934 جس وقت وہ اڑیسہ کے شہر پوری میں تھے تو اپنے سفر کا بقیہ حصہ پیدل چل کر طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ وہ نسبتاً کم گاؤں میں جاپائے لیکن انھیں احساس ہوا کہ اس طرح وہ دیہاتیوں کو بہتر سمجھ سکے۔اس کے علاوہ وہ اس ہڑبڑاہٹ اور زبردست شور سے بچ گئے جو ٹرین کے سفر کا جزوِ لازم ہیں۔اپنے مخالفوں کے سامنے اس طرح کھلے بندوں آکر وہ سمجھتے تھے کہ ان کے حربے بے کار کردیں گے۔

25/جون کو جب وہ پونا میونسپل ہال کی طرف جارہے تھے،ان کے ہمراہیوں پر ایک بم پھینکا گیا۔میونسپل کمیٹی کے چیف افسر سمیت سات افراد زخمی ہوئے لیکن گاندھی کو چوٹ نہیں لگی انھیں اس نامعلوم بم پھینکنے والے پر بڑا رحم آیا۔انھوں نے کہا''میرے پہلو میں شہادت کے لیے درد نہیں اٹھ رہا ہے لیکن اگر یہ میری راہ میں آہی جاتی ہے تو میں اس کا اپنے کو بخوبی مستحق سمجھوں گا کیوں کہ کروڑوں ہندوؤں کی طرح اپنے عقیدہ کی حفاظت میں یہ شہادت بھی میرے فرض کی ادائیگی ہوتی۔

مارچ 1934 میں انھوں نے اپنا ہری جن دورہ ملتوی کرکے بہار کا رخ کیا۔وہاں ایک بھیانک زلزلے نے تباہی مچادی تھی۔اگیتھا ہیریسن گاندھی کے ساتھ چل رہی تھی۔اس نے لکھا ہے کہ وہاں جو منظر اس نے دیکھے ہیں وہ 1923 کے جاپانی زلزلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہیب تھے۔زلزلے کے مصیبت زدوں کے لیے ان کی موجودگی نے تسکین وہ مرہم کا کام کیا جن سڑکوں پر ان کی کارگذرتی لوگ ہزاروں کی تعداد میں دورویہ کھڑے ہوجاتے اور ریلوے اسٹیشن ان لوگوں سے چھلکنے لگتے جدھر سے گاندھی کی ٹرین جاتی ان کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد ایسا معلوم

ہوتا کہ یہ لوگ وقتی طور سے اپنی مصیبت بھول گئے۔ وہ اپنے گاؤں میں بانس کی محرابیں بنا کر اور ان کو ہری پتیوں وغیرہ سے ڈھک کر ان کا استقبال کرتے۔ گاندھی انکو صبر سے مصیبت کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے۔ ''میں کوئی بھکاری نہیں دیکھنا چاہتا۔'' انھوں نے کہا۔ ''یہ بات نہایت افسوس ناک بات ہوگی کہ یہ زلزلہ ہمیں دریوزہ گر بنادے گا۔''

گاندھی نے اس زلزلے سے یہ سبق لیا کہ یہ چھوت چھات کے گناہ کی سزا ہے۔ ٹیگور نے اس توجیہہ کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ ایک طبعیاتی مظہر کی سائنسی توضیح تھی جس سے عدمِ تعقل کے عناصر کو بڑھاوا ملتا تھا۔ اگر مہاتما چھوت چھات کے گناہ کو زلزلے کا ذمہ دار ٹھہرا سکتے تھے تو ان کے مخالف اتنی ہی قوت سے یہ کیوں نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ زلزلہ اس بدعت پر خدائی عتاب تھا جس کا وہ پرچار کر رہے تھے۔

گاندھی اس پر متاسف نہیں تھے۔ ان کے خیال میں مادّے اور روح کے مابین ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتۂ وصل تھا۔ ان کی دلیل بشرطیکہ اسے دلیل کہا جا سکے، ایک خوش عقیدہ انسان کی دلیل تھی۔ ''میرے نزدیک زلزلہ خدا کی متلون مزاجی کا نتیجہ نہیں تھا اور نہ اندھی طاقتوں کے ملن کا نتیجہ۔ ہمیں نہ خدا کے قوانین کا علم ہے اور نہ اس کا علم کہ یہ کس طرح بروئے کار آتے ہیں۔ سب سے بلند قامت سائنس داں یا روحانی رہنما کا علم گرد کے ایک ذرّے کے مانند ہے۔ خدا میرے دنیاوی باپ کی طرح میرے لیے ایک شخصی ہستی نہیں بلکہ حرف بہ حرف اس کہیں زیادہ ہے۔ وہ میری زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں بھی مجھ پر حکمرانی کرتا ہے۔ وہ میری زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں بھی مجھ پر حکمرانی کرتا ہے میں اس پر حرف بہ حرف اعتقاد رکھتا ہوں کہ اس کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ملتا۔ میرا سانس لینا اس کی منشا پر موقوف ہے۔''

بہار کے دورے کے دوران کسی نے ان سے پوچھا۔'' کیا وہ خدا جس نے یہ زلزلہ بھیجا ہے بے رحم اور منتقم دیوتا ہے؟'' گاندھی نے جواب دیا۔ ''نہیں وہ ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے صرف اس کے طریقے ہمارے طریقوں سے مختلف ہیں۔''

ٹیگور کے احتجاج نے شہری تعلیم یافتہ شرفا کے دلوں میں پیدا ہونے والے شکوک کو زبان دے دی تھی۔ یہ لوگ گاندھی کی عزت تو کرتے تھے لیکن اکثر وہ ''اندر کی آواز'' اور روحانی مداخلت

کی طرف جو اشارے کرتے رہتے تھے اس سے یہ لوگ گھبرا اٹھتے تھے۔ مئی 1933 کو جب صفائے قلب کے لیے اکیس دن کا برت شروع ہونے والا تھا، جواہر لال نہرو نے گاندھی کو تار دیا تھا۔ ''میں ان معاملات کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ جن کو میں سمجھ نہیں پاتا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک ایسے اجنبی ملک میں کھو گیا ہوں جہاں صرف آپ ایک جانی پہچانی نشانی ہیں۔'' اپنی خلقی صاف گوئی کے ساتھ سری نواس شاستری نے 16/نومبر 1933 کو گاندھی سے ایک خط میں ردّ وقدح کی اندر کی آواز، خدا کی پکار اور اس قبیل کے فقرے آپ کی تحریروں میں سے کہیں زیادہ عمومیت سے استعمال ہونے لگے ہیں۔ آپ کی کیفیت ذہنی کے لیے یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے لیکن یہ وجد انگیز فقرے ماضی میں ضرورت سے زیادہ کام میں لائے گئے ہیں انکو جو استعمال کرتا ہے وہ ایک خطرہ بھی مول لیتا ہے۔ ایک پرانی کہاوت نے ہمیں متنبہ کیا ہے کہ ہم خدا کا نام نہ بے سبب لیں اور نہ باربار۔''

اپنے ہری جن دورے کے تأثرات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے گاندھی نے اگست 1934 میں اعلان کیا کہ ''چھوت چھات خاتمے کے قریب ہے۔'' انھوں نے ہندوؤں کے ضمیر کو ان مظالم کے خلاف بیدار کر دیا تھا جو وہ ہری جنوں پر کرتے چلے آئے تھے اور ہری جنوں میں ان کے حقوق کا احساس جگایا تھا لیکن کسی معنی میں بھی یہ لڑائی ختم نہیں ہوتی تھی۔ صرف کٹر پنتھی ہندو، سناتنی ہی نہیں تھے بلکہ امبیڈکر کی قیادت میں ہریجنوں کا بھی ایک طبقہ گاندھی کے خلوص نیت کی تردید کر رہا تھا۔ امبیڈکر لیڈروں کی اس کانفرنس کے ایک نمایاں فرد تھے جس نے ستمبر 1933 میں پونا معاہدہ کی تشکیل کی تھی لیکن زیادہ دن نہیں گذر پائے تھے کہ انھوں نے اس معاہدے کے بارے میں رائے بدل دی اور نئے آئینی رائے دہندگی کے انتظامات سے بھی کھلم کھلا روگردانی کرنے لگے۔ اور گاندھی کی چھوت چھات دشمن مہم کی بھی مخالفت کرنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ امبیڈکر کبھی اس ذلت کو نہ بھولے نہ معاف کیا جو اسکول میں انھیں کلاس کے باہر بٹھا کر ان پر روا رد کی گئی تھی۔ وہ گاندھی ہندو اور ہندومت پر بے دریغ حملے کرتے تھے۔ انھوں نے لکھا کہ اگر ہندو ایک رہنما چاہتے ہیں تو انھیں ہندومت کو چھوڑنا ہوگا۔[1] ان کی نظر میں چھوت چھات سماجی نہیں بلکہ سیاسی

---

1. مہادیو دیسائی کی ''ڈائریاں: جلد 1، اندراج مورخہ، 31/مارچ 1932

مسئلہ تھا۔ وہ اس حد تک چلے گئے کہ انھوں نے سیاسی آزادی کے خلاف بھی وکالت کی کیوں کہ انھیں خوف تھا کہ اس سے اونچی ذات کے ہندو اور زیادہ طاقتور اور اچھوت کمزور ہو جائیں گے امبیڈکر نے یہ دھمکی دی کہ ہریجن ہندومت کو ترک کر دیں گے۔ گاندھی نے جواب دیا کہ مذہب لین دین کا سودا نہیں ہے۔ یہ عجیب بات ہوگی کہ پانچ ہزار روحیں نیلام پر چڑھا دی جائیں۔

اگر چہ سناتنیوں کی مخالفت بڑی مشکل سے اور دھیرے دھیرے ختم ہو رہی تھی اور اگر چہ جنگجو ہری جن لیڈر اعتراض کرتے رہے تھے لیکن گاندھی ایک پرانے ناسور کو چیرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ''انقلاب ختم ہوا'' کے عنوان سے لکھے ہوئے ایک مضمون میں راج گوپال آچاری نے لکھا کہ چھوت چھات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے لیکن انقلاب واقعتاً ختم ہو چکا ہے اور صرف ملبے کو ہٹانے کا کام باقی رہ گیا ہے۔'' غالباً یہ پرامید فیصلہ تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ اصلاح پسندوں کی شروعات اچھی ہوگئی تھی۔ 39، 1937 میں کانگریسی حکومتوں نے ہری جنوں کی کچھ قانونی محرومیاں ختم کر دیں اور آزاد ہندوستان کے آئین میں چھوت چھات خود خلافِ قانون قرار پا گئی۔ ایک سماجی ظلم کو مٹانے کے لیے جس کی جڑیں دور تک چلی گئی تھیں، قانونی، سماجی اور اقتصادی ہر محاذ پر آنے والے برسہا برس تک جنگ کی ضرورت تھی۔

باب39

سیاست سے سبکدوشی

13/اکتوبر 1932 کو لارڈ ولنگڈن نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اٹھارہ مہینے پہلے صورت حال بالکل ابتر تھی۔ میں اس بات کی ضمانت لے سکتا ہوں کہ آج صورت حال پہلے کے مقابلے میں سو فیصد بہتر ہے بلکہ میں تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس کی ضمانت لینے کو تیار ہوں کہ ہندوستانی عوام پہلے سے سو فی صد زیادہ خوش ہیں۔ بظاہر وائسرائے کے پاس خود اپنی پیٹھ ٹھونکنے کے کافی اسباب موجود تھے۔ ابتدائی تب وتاب کے بعد سول نافرمانی کی تحریک مائل بہ زوال تھی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق سزایابیوں کی تعداد جنوری 1932 میں 14,803 تھی، فروری میں 17,818 مارچ میں 4,909 اور اپریل میں 5254 ستمبر میں مئی کے 3,818 سے گھٹ کر یہ تعداد صرف 2791 رہ گئی تھی۔ پسماندہ اقوام کو جداگانہ حق رائے دہندگی دیے جانے کے خلاف گاندھی کے برت نے لوگوں کی توجہ سیاسی مسائل سے سماجی مسائل کی طرف موڑ دی تھی، لیکن اس سے اُس کنارہ کشی کا بھی خاتمہ ہو گیا جس کی وجہ سے مہاتما ہندوستانی عوام سے دور ہو گئے تھے۔ آٹھ مہینوں تک ملاقاتوں اور خط و کتابت پر سخت پابندیاں لگا کر حکومت نے انھیں اپنے پیرووں سے بالکل ہی الگ تھلگ کر دیا تھا اور اسی کے ساتھ پورا تہیہ کر کے وہ سب اثرات ختم کر دینا چاہتے تھے جو وہ قائم کر چکے تھے۔ اخباروں کو ان کی نقل وحرکت کے بارے میں خبریں شائع

کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ بعض صوبوں میں ان کے فوٹو بھی نہ چھاپے جاسکتے تھے نہ لٹکائے جاسکتے تھے جیوں جیوں سول مقاومت کے سلسلے میں سزایابیوں کی تعداد گھٹنے لگی اور ایک غیر قانونی جماعت ہوجانے کے بعد کانگریس کم موثر طور پر کام کرنے لگی ویسے ویسے حکومت ہند کے خوش فہموں کو یہ بات اب ناممکن نہیں لگنے لگی کہ چند برسوں بلکہ چند مہینوں میں گاندھی کا نام ہندوستان کے سیاسی نقشے سے بالکل ہی مٹ جائے گا۔

ستمبر 1932 کے برت کے بعد، خاص کر ہندوعوام میں جو جذباتی اُبال آیا اس سے یہ ایک بار پھر واضح ہوگیا کہ گاندھی کی ذاتی توقیر اتنی زیادہ تھی کہ اُسے کوئی دنیاوی اقتدار نقصان پہنچانے کا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ حکومت کو مصلحت اسی میں معلوم ہوئی کہ اس معزز قیدی کو ملاقاتوں اور بیانوں کی آسانیوں سے محروم نہ کیا جائے ۔ وہ یہ ملامت سننے کو تیار نہیں تھی کہ اس نے ایسی مصالحت کا واحد راستہ روک دیا جو ان کی جان بچاسکتی تھی۔ برت کے ہیجانی ہفتے میں چھوت چھات کا مسئلہ سب پر بالا تھا ایسے وقت میں سیاسی سوالوں پر بحث ومباحثے کا نہ تو موقع تھا نہ ایسی شدید ضرورت۔ بہرصورت برت توڑنے کے بعد گاندھی نے ایک معنی خیز بیان دیا: ''حکومت اور گول میز کانفرنس کے اور کانگریس کے درمیان تعاون کی کسی بھی شایانِ شان تجویز کی تائید کرنے میں مجھ سے زیادہ کوئی اور خوش نہ ہوگا۔ میں صرف شایانِ شان کی صفت پر زور دوں گا۔ میرے متواتر اعلانات کے باوجود، عام طور سے یہ بات تسلیم نہیں کی جاتی کہ میں جبلی طور سے تعاون پسند ہوں۔''

''ننگے فقیر'' سے گفت وشنید نہ کرنے پر لارڈ ولنگڈن اَڑے ہوئے تھے۔ کانگریس کی پشت جھک ضرور گئی تھی لیکن ٹوٹی نہیں تھی۔ مکمل جنگ کے لیے مکمل فتح ضروری تھی۔ شوکت علی نے اپنے ''پرانے سردار'' کو تار دیا تھا لیکن نہ تو انھیں اور نہ سپرو اور جیکر کو گاندھی سے ملاقات کی اجازت ملی۔ اب گاندھی۔ اِروِن معاہدے کا اعادہ ہونے والا تھا۔ صلح کے امکانات کے بارے میں گاندھی کے اشارے ٹھکرا دیے گئے اور برت کے دوران چھوت چھات کے خلاف جیل کے اندر سے تحریک چلانے کی خاص سہولتیں واپس لے لی گئیں۔

گاندھی نے ان سہولتوں کے جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔ ابتدائی ہچکچاہٹ کے بعد حکومت راضی ہوگئی۔ یہ صرف برت کا خطرہ نہیں تھا جس کے پیش نظر حکومت جھک پڑی۔ 9/نومبر

1932 کو وائسرائے نے سکریٹری آف اسٹیٹ کوتار بھیجا تھا کہ ''یہ صاف طور سے معلوم ہورہا ہے کہ گاندھی اپنی تمام توجہ اور مساعی چھوت چھات کے سوال پر مرکوز رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور غالباً سوال نافرمانی کی سمت کوئی اقدام اب پس منظر میں چلا جائے گا۔ یہ نئی صورت حال ہمارے موافق ہے اور میں اِسے درہم برہم کرنے کے لیے یقیناً کچھ بھی نہیں کروں گا۔ شاید گاندھی بھی اسی کو ترجیح دیں گے کہ سول نافرمانی کے مسئلے کو فی الحال خوابیدہ رہنے دیا جائے۔ یہ بات کہ ہم چھوت چھات کے سوال پر بھرپور سہولتیں مہیا کررہے ہیں تو جہات کو دوسری سمت موڑ سکتی ہیں۔ اور آپ کے ذہن میں جس دباؤ کا خیال ہے وہ کم ہوسکتا ہے۔''

چھوت چھات کے خلاف تحریک میں گاندھی کس طرح جی جان سے لگ گئے تھے، اس کا اندازہ اس تین ہفتے کے ''صفائے قلب'' کے برت سے ہوتا ہے جس کا اعلان انھوں نے مئی 1933 میں کیا تھا۔ اس برت کی توجیہہ سے حکومت ہی نہیں ان کے دوست بھی چکرا گئے سی راج گوپالا چاری نے یرودا جیل کے ہم جلیس قیدی اور مجرم راز ولبھ بھائی پٹیل کوتار بھیجا کہ ''یہ امید رکھنا بے وقوفی ہے کہ باپو اس ابتلا سے زندہ بچ نکلیں گے اور یہ حادثہ ہریجنوں کو اور ملک کو بہت پیچھے ڈھکیل لے جائے گا۔'' ولبھ بھائی پٹیل نے جواب دیا کہ ''مجھے اتفاق ہے کہ یہ امید بے وقوفی پر مبنی ہوگی کہ وہ اس ابتلا کو زندہ جھیل لے جائیں گے، لیکن میرا تعلق بے وقوفوں کے گروہ سے نہیں ہے۔ کچھ بھی سہی لیکن یہ اس سے بڑی بے وقوفی ہوگی کہ انھیں ان کے ارادے کے بدلنے یا اس سے باز آنے پر مائل کرنے کی کوشش اس امید پر کی جائے کہ ہمیں اس میں کامیابی ہوگی۔''

آٹھ ماہ قبل برت شروع کرنے کے ایک ہفتے کے اندر گاندھی موت کے دروازے تک پہنچ گئے تھے، اس لیے حکومت نے کوئی خطرہ مول نہیں لیا اور برت کے پہلے ہی دن یعنی 8 رمئی کو انھیں رہا کردیا۔ اُسی دن انھوں نے سول نافرمانی پر ایک طویل بیان املا کرایا جس میں چھ ہفتوں کے لیے تحریک کے التوا کا مشورہ دیا۔ ''میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ سول نافرمانی کے بارے میں میرے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ بے شمار سول مقاومت کرنے والوں کی بہادری اور نفس کشی کے لیے میرے پاس تعریف کے سوا اور الفاظ نہیں ہیں لیکن اتنا کہنے کے بعد میں یہ کہنے پر بھی مجبور ہوں کہ جس رازدارانہ طریقے پر یہ تحریک چلی وہ اس کی کامیابی کے لیے قاتل ہے......

''اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ عوام کو خوف نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔فرامین (آرڈی ننسوں) نے ان کے ولولے پست کر دیے ہیں......

''اب میں حکومت سے ایک اپیل کرنا چاہتا ہوں۔اور وہ ملک میں حقیقی امن چاہتے ہیں تو انھیں اس التوا کا فائدہ اٹھانا چاہیے اور تمام سِول مقاومت کرنے والوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دینا چاہیے۔اگر حکومت کی جانب سے اس پر آمادگی ہو تو عبوری طریق کار کی شکل نکالی جا سکتی ہے۔''

گاندھی نے پونا میں ایک دوست کے گھر میں یہ دورِ ابتلا گزارا۔انھوں نے حکومت، اپنے ساتھیوں اور ڈاکٹروں کے خوف کو بے بنیاد ثابت کر دکھایا اور برت کو زندہ جھیل لے گئے۔ابھی وہ صحت یاب ہو ہی رہے تھے کہ جو نمایاں کانگریسی جیل کے باہر تھے وہ ان کے بستر استراحت کے گرداگرد سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے جمع ہو گئے۔گفتگو سے یہ مترشح ہوا کہ بہت سے کانگریسی یہ محسوس کر رہے تھے کہ سول نافرمانی کو واپس لینے کا وقت آ گیا ہے لیکن واپسی کی شرطوں اور طریقوں پر اختلاف رائے تھا۔بہر حال گاندھی کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ لارڈ ولنگڈن سے رابطہ قائم کریں اور صلح کے امکانات کی جستجو کریں۔ایک بار اور انھیں کورا جواب ملا۔وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری نے یہ جواب دیا کہ ''ملاقات کی خواہش کے بارے میں آپ کا تار ملا۔اس کے جواب میں وائسرائے نے مجھے یہ کہنے کا حکم دیا ہے کہ اگر حالات مختلف ہوتے تو وہ آپ سے بخوشی ملتے۔لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ سول نافرمانی کو شرطیں لگائے بغیر واپس لینے کے خلاف ہیں اور جو ملاقات آپ چاہ رہے ہیں اس کا مقصد اسی قسم کی گفتگو میں مصالحت کا آغاز کرنا ہے۔''

اس طرح ٹھکرائے جانے کے بعد، حالات کی رفتار تیز ہو گئی۔گاندھی نے سول نافرمانی کو پھر سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن اس کا دائرہ چنے ہوئے افراد تک محدود تھا۔انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اپنے احمد آباد کے آشرم سے گجرات کے راس نامی گاؤں کی طرف مارچ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔اس گانوں پر سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں بہت تباہی آئی تھی وہ پہلی اگست کو گرفتار کر کے پونا لے جائے گئے۔وہاں انھیں چھوڑ دیا گیا اور پونا شہر کی حدوں میں رہنے کا حکم

ہوا۔ انھوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی، دوبارہ گرفتار ہوئے، اور سال بھر کی سزائے قید پائی۔ جیل میں واپس آ کر انھوں نے 16 اگست کو اس بات پر برت شروع کر دیا کہ حکومت نے ایک سزایاب شخص کی حیثیت سے انھیں وہ سہولتیں دینے سے انکار کیا جو ہریجنوں کے کام کے لیے ایک نظر بند قیدی کی حیثیت سے یرودا جیل میں آخری بار حاصل تھیں۔ حکومت کو یہ منظور نہ تھا کہ اس پر حکم چلایا جائے۔ برت کے چھٹے دن انھیں اسپتال میں منتقل کیا گیا لیکن جب ان کی حالت نازک ہوئی تو انھیں رہا کر دیا گیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ایسی رہائی سے مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ یہ شرم کی بات ہے کہ میں اپنے ساتھیوں کو قید خانے لے گیا اور خود برت رکھ کے باہر آ گیا۔''

جب وہ روبہ صحت تھے تو بستر پر لیٹے لیٹے اپنے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔ اگر وہ پھر اپنے کو گرفتار کراتے ہیں تو حکومت انھیں پھر ہریجنوں کا کام کرنے کی سہولتیں دینے سے انکار کر سکتی ہے۔ وہ برت رکھ سکتے ہیں اور حکومت انھیں جیل میں مر جانے دینے کی بجائے پھر رہا کر سکتی ہے۔ اس شش و پنج کی حالت سے نجات پانے کے لیے انھوں نے یہ اعلان کیا کہ سال بھر کی سزا میں سے جتنی مدت بچ رہی ہے وہ اتنی مدت تک سول نافرمانی سے پرہیز کریں گے۔ اگرچہ جیل سے نکلنے کے بعد اگلے گیارہ مہینوں تک، وہ اپنی رضامندی سے، حکومت کی خلاف ورزی نہ کرنے کے لیے عہد بند تھے، لیکن سول نافرمانی کے مصنف کے لیے یہ صورت حال اگر عجیب نہیں تو متناقض ضرور تھی۔

یکے بعد دیگرے جس طرح حالات رونما ہوئے اس سے ممکن ہے کہ حکومت چکر میں پڑ گئی ہو، لیکن اس سے گاندھی کے کچھ بہت ہی قریبی ہم کاروں کو مایوسی ہوئی۔ ایسے مسئلے پر برت رکھ کے جوان میں سے بہتوں کو ایک ضمنی سوال نظر آ رہا تھا انھوں نے پہلے بھی ستمبر 1932 میں سول نافرمانی کو شدید ضرب لگائی تھی اور ابھی سیاسی جنگ جاری ہی تھی کہ انھوں نے ایک سماجی سوال پر دوسرا محاذ کھول دیا تھا۔ مئی 1933 میں ان کا اکیس دن کا برت سیاست سے بالکل بے تعلق تھا لیکن رہا ہوتے ہی انھوں نے عوامی سول نافرمانی ملتوی کر دی تھی اگرچہ التوا چھ ہی ہفتے کا تھا لیکن حکومت سے جوابی دل جویانہ عمل کی اپیل صلح کا سلسلہ جنبانی معلوم ہونے لگی تھی۔ دو مجاہد کانگریسی، سبھاش چندر بوس اور وی۔ جے پٹیل یورپ میں تھے۔ انھوں نے وہاں سے یہ اعلان کیا کہ گاندھی

ایک سیاسی قائد کی حیثیت سے ناکام ہوگئے ہیں اور اب ''نئے طریقے سے، نئے اصولوں پر کانگریس کی انقلابی تنظیم نو کا وقت آ گیا ہے اور اس کے لیے ایک نیا لیڈر بے حد ضروری ہے۔''
انفرادی حیثیت تک محدود علامتی سول نافرمانی کے احیا سے کوئی فرق ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اب تحریک عملی شکل سے زیادہ صرف نظریاتی شکل میں جاری تھی۔ اس لیے (گاندھی کی ذات کو چھوڑ کر) انفرادی سول نافرمانی کا بھی حتمی التوا، کسی کے لیے تعجب خیز امر نہیں تھا۔ لیکن جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ان تک یہ خبر جیل میں ''درد کے ایک گھونپتے ہوئے چھرے'' کی طرح پہنچی اور اطاعت کے وہ رشتے جوان کو گاندھی سے سالہا سال سے باندھے ہوئے تھے یکا یک ٹوٹ گئے لیکن آگے چل کر وقت دکھانے والا تھا کہ گاندھی اور نہرو کے مابین رشتے اس کی کشاکش کو برداشت کر لے جانے کے لیے بہت مضبوط تھے۔ تحریک کو ملتوی کرتے وقت گاندھی نے جو بیان دیا اس کا مسودہ علانیہ طور پر شدید احتساب نفس، تلاش قلب اور خدا کی حضوری'' کے بعد ہی مرتب ہوا تھا۔

''اس بیان کی تحریک ستیہ گرہ آشرم کے ساتھیوں اور رہنے والوں سے ایک نجی بات چیت ہوئی۔ خاص طور سے دوران گفتگو ایک مدتوں پرانے ساتھی کے بارے میں یہ افشائے راز اس کا سبب ہوا کہ انھیں جیل کا کام پورا کرنے میں تامل ہے اور وہ سپرد کیے ہوئے کام کے مقابلے میں ذاتی مطالعہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ بے شبہ یہ ستیہ گرہ کے اصولوں کے خلاف تھا۔ ان دوست کو میں پہلے سے بھی زیادہ چاہنے لگا ہوں۔ ان کی اس خامی سے زیادہ خود میری کوتاہی ابھر کر سامنے آئی۔ ان دوست نے کہا کہ اُن کا خیال تھا کہ میں ان کی اس کوتاہی سے واقف ہوں۔ میں اندھا ہوگیا تھا۔ لیڈر کا اندھا ہونا نا قابل معافی ہے۔ میں نے فوراً یہ محسوس کر لیا کہ فی الوقت مجھے عملی سول نافرمانی کا واحد نمائندہ رہنا چاہیے۔''

انھوں نے مزید یہ بھی کہا تھا کہ ستیہ گرہ ایک ''روحانی ہتھیار'' ہے۔ اب یہ صرف ایک ہی اہل شخصیت یعنی خود اُن کے ہاتھ میں رہے گا۔ اگر نہرو کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو یہ بیان ایک سیاسی تحریک کے لیڈر کا حیرت انگیز فعل تھا۔'' بہر صورت، سچی بات یہ تھی کہ عوامی سول نافرمانی کا التوا ناگزیر تھا۔ بلکہ اس کو بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ جب 1932 کے موسم خزاں میں چھوت

چھات کے سوال پر گاندھی کے برت نے اس طرف سے توجہ موڑ دی تو تحریک اسی وقت مدھم پڑ گئی تھی۔ ہریجنوں کے کام سے عمل کا ایک محفوظ راستہ کھل گیا تھا جس کو خوشی سے اختیار کرنے والے کانگریسی بہت تھے۔ مئی 1933 میں عارضی التوا نے سول نافرمانی کو تقریباً موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حکومت کے لیے انفرادی سول نافرمانی کا احیا معمولی تشویش سے شاید ہی زیادہ رہا۔ اس لیے اس وقت نمایاں کانگریسیوں نے جس غم وغصہ کا اظہار کیا اس کا باعث نہ تو التوا تھا نہ ملتوی کرنے کا وقت اور موقع۔ حکومت کے شدید تشدد کی وجہ سے ملک عارضی طور پر سن سا ہو گیا تھا۔ لیکن بہت سے کانگریسیوں کا خیال تھا کہ اگر ان کے لیڈر نے اخلاقیات سے زیادہ سیاسی مقتضیات کے پیش نظر حکمت عملی تیار کی ہوتی تو حکومت کو اس سے زیادہ پریشان کیا جا سکتا تھا۔ برطانیہ سے حکومت خوداختیاری چھیننے کے لیے کانگریسیوں نے عدم تشدد کی پالیسی کو مان لیا تھا، وہ جسمانی طاقت کے استعمال سے پرہیز کرنے پر رضامند ہو گئے تھے لیکن وہ ان لاتعداد پابندیوں پر پیچ وتاپ کھاتے تھے جن کا بوجھ مہاتما نے اپنے اوپر ڈال لیا تھا۔ مئی 1933 میں انھوں نے راز داری کو ستیہ گرہ کے خلاف بتا کر اس کی مذمت کی تھی۔ لیکن حکومت کی مشینری اتنی ظالمانہ تھی کہ راز دارانہ طور پر کام نہ کرنے کا متبادل صرف یہ تھا کہ کام ہی نہ کیا جائے۔

عام کارکن جلدی سے نتائج برآمد ہونے کے مشتاق تھے۔ 1920 کی عدم تعاون کی تحریک میں عوام کی جوش وخروش سے شرکت میں ''ایک سال کے اندر سوراج'' کے امکان کو بڑا دخل تھا۔ 1930 اور پھر 1932 میں لوگوں کو امید تھی کہ سول مقاومت مختصراً اور تیز رفتار ہوگی۔ سول نافرمانی کا عوامی تصور گاندھی کے تصور سے لازمی عناصر کے اعتبار سے بھی مختلف تھا۔ ان کے نزدیک سول نافرمانی ستیہ گرہ کا ایک حصہ تھی اور ستیہ گرہ ایک طرز زندگی تھا۔ جس کا اطلاق ذاتی، سماجی، سیاسی سبھی مسائل پر ہوتا تھا۔ اگرچہ انھوں نے ستیہ گرہ کو ایک سائنس کہا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ یہ ایک ''زیر تشکیل سائنس'' ہے اس کے کوئی بنے بنائے اصول نہیں تھے۔ ستیہ گرہی کو سچائی کی تلاش کرنا پڑتی تھی، اس سچائی پر قائم رہنا پڑتا تھا اور اگر ضرورت پڑے تو اس کے لیے تکلیف سہنا پڑتی تھی۔ سیاست میں اس پر عمل کرنے کے مختلف طریقے تھے، ایک دن کی علامتی ہڑتال کے احتجاج سے لے کر غیر منصفانہ قوانین کی عوامی نافرمانی تک سب اس میں شامل تھے۔

مؤخرالذکر شدید اقدام تھے۔ یہ اقدام گاندھی نے 1920، 1930، 1932 اور 1942 میں کیے لیکن ستیہ گرہ کی کتاب الادویہ میں اور بھی علاج تھے جووقت تو زیادہ لیتے لیکن موثر اتنے ہی تھے۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے علاجوں کا مجموعہ ''تعمیری پروگرام'' کے نام سے موسوم تھا۔ پروگرام چرخہ کاتنے، چھوت چھات مٹانے اور ہندو مسلم اتحاد پر مشتمل تھے۔ جب گاندھی نے عوامی سول نافرمانی کو ملتوی کردیا تو انھوں نے وسیع ترمعنی میں ستیہ گرہ کو ملتوی نہیں کیا تھا۔ لیکن دانشور طبقے کی نظر میں سول نافرمانی کے متبادل کی حیثیت سے تعمیری پروگرام یوں لگتا تھا جیسے اس کا سارا خون چوس لیا گیا ہو حیرت کی بات یہ تھی کہ حکومت کا بھی وہی خیال تھا جو بیشتر کانگریسیوں کا تھا۔ عوامی پیانے پر ٹیکسوں کی عدم ادائیگی کرکے قوانین کی نافرمانی ہی کو حکومت حقیقی چیلنج سمجھتی تھی، جب گاندھی نے سول نافرمانی ملتوی کردی اور اپنے تعمیری پروگرام پر ساری توجہ مبذول کردی تو گویا سیاسی بحران ختم ہوگیا۔

ایک انقلابی تحریک کو، چاہے وہ عدم تشدد پر مبنی کیوں نہ ہو، غیر معین مدت تک پورے زور وشور سے چلایا نہیں جاسکتا تھا۔ تقریباً اٹھہتّر ہزار کانگریسی جیل گئے۔ ہزاروں نے اپنی نجی قسمتیں بگاڑ لیں اور اس مقصد کے حصول میں اپنی صحت اور گھر برباد کرلیے۔ اگر آزادی کے لیے قوت ارادی اور زیادہ مضبوط ہوتی تو جیل جانے والوں کا سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہوتا اور شدید ترین ظلم بھی ستیہ گرہوں کے جیل جانے کو نہ روک پاتا۔ عجیب بات یہ تھی کہ گاندھی کو اس کا افسوس نہ تھا کہ اور زیادہ لوگ جیل کیوں نہیں گئے، تعداد کی ان کی نظروں میں وقعت نہ تھی۔ ان کو شکایت یہ تھی کہ اگرچہ لوگ بہ حیثیت مجموعی غیر متشدد رہے لیکن داخلی طور پر وہ انگریزوں سے نفرت کرنا ختم نہیں کرپائے تھے، جن لوگوں نے برطانوی حکومت کی مخالفت کی ان کا ایک معمولی حصہ بھی اپنے باطن کو نفرت سے پاک کرلیتا تو وہ اپنے حکومت کرنے والوں کا دل بدل سکے ہوتے ان کی تحریک سول نافرمانی شروع کرنے کے چار سال بعد، جو ہوا وہ یہ تھا کہ انگریزوں کے یہاں اور زیادہ تلخی آچکی تھی اور وہ کانگریس کی جانب سے مشکوک ہوگئے تھے۔ سیاسی دہشت پسندی اب بھی زندہ تھی۔ گاندھی اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کے عدم تشدد کے پیغام پر لوگ ایمان نہیں لائے تھے اور سول نافرمانی کے التوا اور اس کے متبادل تعمیری پروگرام کے ذریعے سے ملک کو ابھی اور منظّم کرنے کی ضرورت تھی۔

ایسے کانگریسی بھی تھے جن کا یہ پختہ خیال تھا کہ سول نافرمانی کی ناکامی کا اصلی سبب خود عدم تشدد کی صفاتی خرابی نہیں تھی بلکہ یہ حقیقت تھی کہ اگرچہ عوام اس میں بے پناہ جوش وخروش سے شامل ہوئے تھے لیکن سرکاری ظلم وتعدّی کی وجہ سے سول نافرمانی کرنے والوں کا بہاؤ ختم ہوگیا تھا۔ ان کانگریسیوں کے نزدیک (گاندھی کے) اس طرز استدلال کو زیادہ سے زیادہ ایک خوش گوار ابہام کہا جاسکتا تھا۔ ذی فہم کانگریسی یہ یقین رکھتے تھے کہ عوام کی قربانیاں ضائع نہیں ہوئی تھیں۔ گاندھی نام لکھی گئی ایک یادداشت مورخہ 5رجولائی 1933 میں ڈاکٹر انصاری نے اس سوال کا جواب دیا تھا کہ تحریک ناکام رہی تھی یا نہیں:

''21-1920 کے عدم تعاون کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ناکام رہا یہ کہاں تک ناکام رہا تھا، اس کا اندازہ تو اس وقت ہوا جب کسی تیاری کے بغیر 1930 میں ملک کو سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کرنے کی ایک بار اور دعوت دی گئی۔ عوام نے کانگریس کی اس آواز پر جس جوش وخروش سے لبیک کہا اُس سے عدم تعاون کی تحریک کی کامیابی کا اندازہ ہوا۔ اب یہ بات پھر کہی جارہی ہے کہ موجودہ تحریک سول نافرمانی ناکامیاب رہی لیکن کیا یہ واقعتاً ناکامیاب ہوگئی؟ کسی عوام تحریک کے آغاز میں ایک شاندار جذبہ نظر آتا ہے تقاضائے فطرت یہی ہے کہ اسے صرف ایک مختصر سے عرصے تک قائم رکھا جاسکتا ہے۔

''......تحریک کو اس وقت ترک کردینے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ طریق کار ہی ترک کردیا گیا......اس کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ کافی مدت تک جنگ جاری رکھنے کے بعد، اب ہم ستانے کی تیاریاں کریں گے۔''

اپریل 1934 میں دیے جانے والے گاندھی کے بیان کو جس امر نے ناگزیر بنادیا وہ وقفہ آرام کی ضرورت کا ملک میں پھیلا ہوا جذبہ تھا اور ملک کی نمائندگی کانگریس کررہی تھی۔ انفرادی سول نافرمانی کا رسمی التوا نہیں ہوا تھا لیکن عام خیال یہی تھا کہ تحریک ختم ہوچکی ہے۔ گاندھی نے سوال نافرمانی کرنے کا حق اپنے لیے محفوظ کررکھا تھا لیکن اس حقیقت کو فوری سیاسی امکان نہیں بلکہ صرف لفظی امتیاز سمجھا جارہا تھا۔ کانگریس لیڈروں سے تبادلۂ خیال کے بعد گاندھی کو یہ یقین ہوگیا کہ ملک تھک چکا ہے اور سول نافرمانی کو جاری رکھنے کی طرف فوری میلان نہیں ہے۔ دوسری

طرف کانگریسیوں کا ایک طبقہ سوراج پارٹی کے احیاء اور قانون ساز مجالس میں وہ بارہ داخل پر تُلا ہوا تھا۔

اس سے پہلے گاندھی کانگریسیوں کے قانون ساز مجالس میں داخلے کی مخالفت کر چکے تھے لیکن تجربے سے اُن پر یہ عیاں ہو گیا کہ ایک ایسی تعداد بھی ہے جن کا تعمیری پروگرام پر اعتقاد نہیں ہے۔ جب کوئی عوامی تحریک نہ چل رہی ہو۔ تو یہ حضرات کاؤنسلوں میں اظہار ذات مفید سمجھتے تھے۔ 25۔1924 کے دوران گاندھی نے کاؤنسل والے شاخ یعنی سوراجیوں کا خیال بدلنے کی کوشش کی تھی۔ 35۔1934 میں انھوں نے اس شاخ کے احیا کی ہمت افزائی کی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس پونا (مئی 1934) میں کاؤنسلوں میں داخلے کی تجویز کی تحریک خود گاندھی نے پیش کی۔ انھوں نے سوراجیوں کے نقطۂ نظر کی جس طرح فیاضانہ تعریف کی۔ اس کی بدولت کانگریس ان جھگڑوں سے بچ گئی جو 1924 میں اسے تقریباً افتراق کے کنارے گھسیٹ لائے تھے۔ اب اِسی سے 1937 میں کانگریس کی انتخابی کامیابی کی بنیاد پڑ گئی۔ ایک ایسے گروہ کو جس کے طرز فکر سے وہ خود متفق نہیں تھے کانگریس کے ادارے سے پورے مواقع فراہم کر کے گاندھی نے بڑی ہمت اور فراخ دلی کا ثبوت دیا۔

اس اقدام کی فراست پر شک کرنے والوں میں ولبھ بھائی پٹیل بھی تھے۔ پارلی مانی گروہ کی حمایت کی۔ گاندھی نے انھیں یہ وجہ بتائی!''سوراج پارٹی کے احیا کی ضرورت بری طرح محسوس ہو رہی تھی جس گروہ نے اتنے نشیب وفراز میں ساتھ دیا ہے اس کے لیے کانگریس میں گوشہ ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ اس گروہ کے احیا کی کوشش کر رہے ہیں ان میں کچھ افراد کے یہاں ناتجربہ کاری اور ذاتی مفاد کا بھی عنصر ہو، لیکن ہمیں حقائق کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ ہم اس گروہ کی اصلاح کر سکتے ہیں، اسے کنٹرول کر سکتے ہیں ہم نہ تو اس سے کچھ زیادہ کر سکتے ہیں نہ کچھ کم۔ میں نے سوراج پارٹی کو اس کے پیروں پر کھڑا کر دیا ہے انھیں الیکشن لڑنے اور مجالس قانون ساز میں واپس آنے کی خواہش تھی لیکن ان میں ایسا کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ (1)

6/جون 1934 کو حکومت ہند نے یہ اعلان کیا کہ چوں کہ سول نافرمانی کو رسمی طور سے

(1) سردار پٹیل کے نام خط مورخہ 23/اپریل 1934۔ مجموعہ مکاتب مرتبہ منی بین پٹیل، احمد آباد، 1952

ترک کردیا گیا ہے اور عملی پالیسی کے اعتبار سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اب یہ وجود میں نہیں ہے اس لیے وہ نوٹی فی کیشن (اعلان) جس کے ذریعہ سے کانگریس جماعت کے اجزائے ترکیبی کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا، واپس لیا جاتا ہے۔

اس اعلان سے یقیناً اس فاتحانہ احساس کی بو آئی ہے جو سول نافرمانی کے رضا کارانہ طور پر واپس لیے جانے پر حکومت ہند کے دل میں بیدار ہوا تھا۔تحریک کے التوا اور سوراج پارٹی کے احیا کا بہت سے کانگریسیوں کو صدمہ تھا۔ یہ اقدامات ان کی نظروں میں اپنی قربانیوں کا ذلیل انعام اور تقریباً شکست کا اعتراف معلوم ہوئے گاندھی اس احساس ناکامی کے جذبے سے آگاہ تھے اس کا سب سے تیز و تند اظہار غالباً جواہر لال نہرو نے اپنے خط میں کیا تھا۔انھوں نے اپنے خط میں اپنی ''روحانی جدائی'' کی بات کہی اور یہ شکایت کی کہ کانگریس کے معیار گرادیے گئے ہیں۔ گاندھی نے جواب دیا کہ معیار بدلے نہیں گئے ہیں: ''میں وہی ہوں جسے تم 1917 سے جانتے چلے آئے ہو۔مشترکہ منزل مقصود کے حصول کے لیے میرے دل میں وہی پُر جوش جذبہ آج بھی ہے جس سے تم آگاہ ہو۔انگریزی لغت کے اعتبار سے ''مکمل آزادی'' کے جو معانی ہیں انھیں معنوں ملک کے لیے مکمل آزادی چاہتا ہوں اور ہر اس تجویز سے جس سے تمھیں تکلیف پہنچی ہے انھیں معنوں کو پیش نظر رکھ کر تیار کی گئی ہے......لیکن مجھے یہ گمان ہے کہ میں ضرورتِ وقت جاننے کا گر جانتا ہوں اور یہ تجاویز وقت کے انھیں تقاضوں کا جواب ہیں۔''(1)

اگر قریب ترین رفقائے کار کو بھی اسی طرح کی صفائی دینا پڑ رہی تھی تو گاندھی کے بارے میں عام کانگریسیوں کی غلط فہمی پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ان کو اس کا یقین ہونے لگا کہ ان کے پیروان کے طریق کار اور خیالات سے تنگ آگئے ہیں وہ ان کی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن ظاہر یہ کرتے ہیں کہ انھوں نے وہ پالیسیاں قبول کر لی ہیں ان کو خیال ہوا کہ اُن کی شخصیت نامناسب طریقے سے کانگریس پر حاوی ہے اور اس کی جمہوری روح سے الجھ رہی ہے۔انھوں نے یہ محسوس کیا کہ خود اپنے لیے اور اپنے پیرووں کے لیے ان کا یہ فریضہ ہوجاتا ہے کہ وہ ان کی وفاداری پر ضرورت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔سول نافرمانی کا التوا اور سوراج پارٹی کا احیا، صرف

(2) مکتوب مورخہ 17/اگست 1934ء: اقتباس از ''مہاتما'' ج:3، مولفہ تیندولکر

یہی وہ مسئلے نہیں تھے۔ طرز فکر کے اور بھی اختلافات تھے جن سے حکومت کے خلاف عوامی تحریک کے دوران یا تو صرف نظر کر لیا گیا تھا یا عارضی طور سے متصادم نظریوں کے مابین پل بنا دیے گئے تھے۔ بہتوں کو اُن کا چرخے کو ''قوم کا دوسرا پھیپھڑا'' سمجھ کر زور دینا اور چھوت چھات کو دور کرنے کے لیے مذہبی اور روحانی طریقہ اختیار کرنا، بے جا معلوم ہونے لگا تھا خود ان کے دل میں نئی سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے شکوک تھے۔ اس پارٹی کو انھوں نے ''جلد باز لوگوں'' کی جماعت کا نام دیا تھا۔

بہر حال جس مسئلے پر وہ اپنے اور کانگریس کے دانش ور طبقے کے درمیان اختلافات کو بہت شدت سے محسوس کر رہے تھے، وہ عدم تشدد کا بنیادی مسئلہ تھا۔ پندرہ برس تک اس کی ترویج کرنے اور اس پر عمل کرنے کے بعد انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا کہ جن لوگوں کو ان کی پیروی کا دعوا تھا وہ بھی اس کو کتنا کم سمجھ پائے تھے۔ عوامی سول نافرمانی نے کانگریسیوں کے دل موہ لیے تھے لیکن یہ عدم تشدد کے طریق کار کا صرف ایک پہلو تھا تعمیری پروگرام اس کا دوسرا پہلو تھا اور اسی پر وہ اس وقت زور دے رہے تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ یہ پہلو بہت سے کانگریسیوں کو غیر سیاسی نظر آ رہا تھا۔

نقطہ ہائے نظر کا یہی اختلاف تھا جس نے گاندھی کو اکتوبر 1934 میں کانگریس سے کنارہ کش ہو جانے پر مجبور کر دیا انھوں نے ولبھ بھائی پٹیل کو لکھا کہ ''میں کانگریس سے غصے سے یا جھلاہٹ یا مایوسی کے عالم میں کنارہ کش نہیں ہو رہا ہوں۔'' وہ کانگریس کو اس کی آزادی کار واپس دے رہے تھے اور خود اپنے لیے آزادیِ کار دوبارہ حاصل کر رہے تھے۔ اس کے بعد، کم از کم آنے والے تین برسوں میں ان کی سب سے بڑی دل چسپی دیہی اقتصادیات بن گئی، سیاست نہیں۔

باب40

دیہی اقتصادیات

انڈین نیشنل کانگریس نے اکتوبر 1934 کے اجلاس بمبئی میں گاندھی کے اس ادارے سے کنارہ کشی کا باضابطہ نوٹس لیا۔ اس بات کی اجازت دی گئی کہ ان کی رہنمائی میں کل ہند دیہی صنعتی انجمن (آل انڈیا ولج انڈسٹریز ایسوسی ایشن) قائم کی جائے اس انجمن کا کام یہ تھا کہ کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں سے آزاد اور اس کے بالکل زیر اثر نہ رہ کر، دیہی صنعتوں کے احیا اور ہمت افزائی کے لیے کام کرے اور دیہاتوں کی اخلاقی اور مادّی ترقی کے لیے کوشاں ہو اس تجویز سے پتہ چلتا ہے کہ گاندھی خود اپنی اور کانگریس کی سرگرمیوں کو ایک نئے رُخ پر لے چل رہے تھے۔

گاندھی 1915 میں پبلک زندگی میں داخل ہوئے تھے اسی وقت سے وہ دیہاتوں کے ساتھ نئے برتاؤ کی وکالت کرتے چلے آرہے تھے۔ زمین پر بڑھتے ہوئے بوجھ اور امدادی صنعتوں کے فقدان کے باعث کسانوں میں بیکاری اور نیم بیکاری بڑھتی جارہی تھی اور ان کی عبرتناک غریبی دیکھ دیکھ کر گاندھی کا دل ہمیشہ کڑھتا رہا۔ چرخے کے استعمال کی وکالت کا محرک بھی یہی احساس تھا کہ اس تدبیر کو فوری عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ آل انڈیا اِس پنرس (کتائی کرنے والے) ایسوسی ایشن پر سیاسی ''تعطل'' کے زمانے میں گاندھی نے کافی وقت صرف کیا تھا۔ تیس سال میں اس کی سرگرمیاں 5300 گاؤں میں پھیل گئی تھیں اور اس سے دو لاکھ بیس ہزار کتائی

کرنے والوں، بیس ہزار بن کروں اور بیس ہزار ندافوں کو کام مل گیا تھا۔ (اس طرح) دو کروڑ روپیوں سے زیادہ کی رقم ہندوستانی گاؤں میں تقسیم کردی گئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ حکومت کی جانب سے کی جانے والی منصوبہ بندی کے موجودہ دور میں یہ اعداد وشمار بہت زیادہ شاندار معلوم نہ ہوں، لیکن اس دور کے بے حد نا مساعد حالات میں یہ اعداد ایک ادارے کے بہت ہی ٹھوس کام کا پتہ دیتے ہیں۔

گاندھی سے زیادہ اور کس کو یہ معلوم ہوگا کہ آل انڈیا اس پینرس ایسوسی ایشن نے دیہی غربت کے مسئلے کی صرف بالائی سطح کھرچ کر ہٹائی تھی، لیکن انھوں نے اب دیہی اقتصادیات کے مجموعی احیا کے بارے میں سوچنا شروع کردیا تھا۔ ان کے ہری جن دورے سے یہ بات ان پر بالکل عیاں ہوگئی تھی کہ دیہی صنعتوں کے زوال سے ہری جن غریبی کے گڑھے میں دھنستے چلے گئے تھے۔ اس طرح، چھوت چھات کی اصلاح کا مسئلہ اِن بدبختوں کی اقتصادی حالت کے سدھار سے وابستہ ہوگیا تھا۔ اسی لیے دیہی صنعتوں کے احیا کی ضرورت اور بھی شدید ہوگئی تھی۔ سودیشی طرز فکر، جس میں ہندوستان کی بنی ہوئی چیزوں کے استعمال پر زور دیا جاتا تھا، زبردست سیاسی جوش وخروش کے دور میں پورے ملک کو اپنی رو میں بہالے گیا تھا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اِسے ایک نیا موڑ ملا۔ گاندھی نے یہ دلیل پیش کی کہ یہ کافی نہیں ہے کہ کوئی چیز ہندوستان کی بنی ہوئی ہو۔ یہ امر بھی اتنا ہی اہم ہے کہ وہ چیز دیہات کی بنی بھی ہو۔ انھوں نے شہریوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے روزمرّہ کے استعمال کی ایسی ہر چیز کو جانچیں جو ہندوستان یا باہر کی بنی ہو اور دیہاتوں سے اس کا متبادل ڈھونڈیں برش کی جگہ جھاڑو سے کام لیں، اور ٹوتھ برش کی جگہ کیکر، کی شاخ کی مسواک، چکی کے پاش کیے ہوئے چاول کی جگہ ہاتھ سے کٹا ہو چاول، کارخانے کی شکر کی جگہ گڑ اور ملوں کے بنے ہوئے کاغذ کی جگہ ہاتھ کا بنا ہوا کاغذ استعمال کریں۔ ہوسکتا ہے کہ دیہی مصنوعات کے دام کچھ زیادہ ہوں لیکن ان کی مزدوری اور منافع ان لوگوں میں تقسیم ہوسکے گا جن کی ضرورت سب سے زیادہ شدید ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس تک دیہاتوں کی دولت اور مہارت شہروں میں کھنچ کھنچ کر جاتی رہی ہے۔ گاندھی نے لکھا: ''شہریوں کے لیے دیہات اچھوت بن گئے ہیں وہ ان کو جانتے نہیں، ان میں رہنا نہیں چاہتے اور اگر وہ دیہات پہنچ ہی جاتے ہیں تو وہاں

شہری زندگی کا ثنیٰ تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ تبھی قابل برداشت ہوسکتا ہے جب ہم ایسے شہر تعمیر کرسکیں جن میں تیس کروڑ انسانوں کی سمائی ہو۔"(1)

چوں کہ ہندوستان کی 85 فی صد آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے اس لیے اُن کی اقتصادی اور سماجی بہبودی بیرونی غلامی سے آزادی کی ضروری شرط ہے۔ انھوں نے شہریوں کے مفاد کے لیے دیہاتوں کے استحصال کو تشدد کا ہم جنس قرار دیا۔ شہروں اور دیہاتوں کے درمیان اقتصادی معیاروں اور سماجی سہولتوں کی جو خلیج حائل ہے اسے پٹنا چاہیے اس کام کے لیے بہتر طریقہ کار یہ ہے کہ شہری رضا کار دیہات دیہات پھیل جائیں اور مردہ اور دم توڑتی ہوئی دیہی صنعتوں کو پھر سے زندہ کرنے، اچھی غذا کی فراہمی اور تعلیم وصفائی کو بہتر بنانے میں مدد کریں عوامی خدمت کا جذبہ رکھنے والے مردوں اور عورتوں سے گاندھی کو یہ امید تھی کہ وہ دیہی پیانے پر اپنا پیٹ پالیں گے۔ اگر انھوں نے اپنے کام کی ایسی قیمت لگائی جو دیہاتی برداشت نہیں کرسکے تو دیہی صنعت دیوالیہ ہوجائے گی۔ رضا کارانہ خدمت ہی سے وہ مالی رکاوٹ دور ہوسکتی ہے جس کے سبب سے دیہی ترقی کے سرکاری پروگرام چیونٹی کی چال چلتے ہیں۔ 11 ستمبر 1937ء کے "ہری جن" میں مہادیو ڈیسائی نے ایک جاذب توجہ مثال دی۔ چندر ناتھ نے جسے اعلاتعلیم تو نہیں ملی تھی لیکن جس کے دل میں تعمیری کام کا جذبۂ بے تاب تھا، پندرہ ہزار دیہاتیوں کی رضا کارانہ خدمات حاصل کرلیں اور ان کی مدد سے تین میل لمبی نہر کھود ڈالی اور اتنی ہی لمبی سڑک ساتھ ساتھ بنالی۔ مہادیو ڈیسائی نے لکھا ہے کہ اس اسکیم پر سرکاری تخمینے کے مطابق پچاس ہزار روپے صرف ہونے والے تھے۔

گاندھی کی یہ عادت نہیں تھی کہ جس پر وہ عمل نہ کریں اس کی تلقین کریں، اس لیے انھوں نے دیہات میں جا بسنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے آبائی وطن گجرات میں جا سکتے تھے لیکن اس صوبے میں بہت سے عقیدت مند کام کرنے والے موجود تھے۔ لوگوں نے واردھا کے قریب منگل واڑی کا مشورہ دیا لیکن یہ گاؤں بڑا تھا اور اس میں ان دشواریوں کا سامنا ہوتا جو چھوٹے اور غیر ترقی یافتہ گاؤں میں کام کرنے والوں کو پیش آتی ہیں۔ آخر کار، انھوں نے سے گاؤں کو چنا۔ یہ بھی واردھا

(1) گاندھی، یم کے Cent Percent Swadesit (سوفی صد سود

کے قریب تھا لیکن یہاں کی آبادی صرف چھ سو تھی یہاں ایسی معمولی سہولتیں جیسے پکی سڑک، دوکان اور ڈاک گھر بھی نہیں تھا۔ یہاں اپنے دوست اور مرید، جمنا لال بجاج کے مملوکہ قطعہ آراضی پر انھوں نے ایک کمرے کی جھونپڑی بنائی۔ برسات کے دنوں میں جو لوگ ان سے ملنے آتے انھیں گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ سے گزرنا پڑتا۔ آب و ہوا نامہربان تھی۔ اس گاؤں کا ایک بھی باشندہ ایسا نہ تھا جو پیچش یا ملیریا کا شکار نہ ہوا ہو۔ گاندھی خود بڑے بیمار پڑ گئے لیکن انھوں نے طے کیا کہ وہ سیگانوں نہ چھوڑیں گے۔ وہ تنہا آئے تھے اور اپنی بیوی کو ساتھ آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ انھیں امید تھی کہ وہ گاؤں کی ترقی کے کاموں کے لیے ایک ٹیم گاؤں والوں ہی میں سے بنالیں گے لیکن وہ اپنے نئے اور پرانے چیلوں کو اپنے گرد جمع ہونے سے روک نہ پائے۔ جب ڈاکٹر جان مٹ نے 1937 میں ان سے ملاقات کی تو وہاں بس ایک گاندھی کی جھونپڑی تھی لیکن بہت جلد وہاں مٹی اور بانس کے بنے ہوئے گھروں کی ایک کالونی بن گئی۔ ان میں رہنے والوں میں پروفیسر بنسالی تھے جو جنگلوں میں برہنہ گھومتے اور صرف نیم کی پتوں پر گزر بسر کر رہے تھے، پولینڈ کے باشندے یارس فرائڈ من تھے جو گاندھی کے اس خیال کے معتقد ہو گئے تھے کہ عدم تشدد اور دستکاری پر مبنی تمدن ہونا چاہیے ایک سنسکرت عالم تھے جنھیں جذام کا مرض تھا اور جن کی جھونپڑی گاندھی کی جھونپڑی سے ملی ہوئی تھی تاکہ وہ ان کی دیکھ بھال کر سکیں، ایک جاپانی سادھو تھا جو (مہادیو ڈیسائی کے لفظوں میں) گھوڑے کی طرح کام کرتا تھا اور سنیاسی کی طرح رہتا تھا۔ پھر کیا تعجب ہے اگر سردار پٹیل سے گاؤں کو ''چڑیا گھر'' کہتے تھے۔ گاندھی نے اِسے ''معذوروں کی آرام گاہ'' کا نام دیا تھا۔

سیوا گرام (سے گاؤں کا بدلا ہوا نام) منصوبہ بند طریقے پر آشرم نہیں بنا تھا۔ گاندی نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا اور نہ اس پر کوئی رسمی ضوابط (ڈسپلن) عائد کیے تھے۔ یہ بے حد مختلف مزاجوں اور مختلف اہلیتوں کے مردوں اور عورتوں پر مشتمل ایک بیچ میل گروہ تھا جن کے دلوں میں گاندھی کی محبت اور عزت کے بھی مختلف مدارج تھے، لیکن گاؤں کی خدمت کا جذبہ ان سب کا مشترک مطمح نظر تھا۔ گاندھی کے لیے یہ گروہ ایک انسانی تجربہ گاہ تھا جس میں (مہادیو ڈیسائی کے لفظوں میں) انھیں ''گھریلو محاذ پر اہنسا کے عملی تجربے کرنے کے کافی مواقع فراہم ہو گئے تھے۔ اس کی عملی کامیابی کا از خود مطلب یہ نکلے گا کہ سیاسی میدان تک اس کو پھیلایا جائے۔ اسی سبب سے

ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ اپنی تجربہ گاہ میں واپس جا کر اور زیادہ آزادانہ طور سے امتحان نفس کر سکیں اور مزید تجربے کر سکیں۔ یہ سچ ہے کہ مشکل اوزاروں کی وجہ سے ان کا کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس طرح وہ بزرگ تر کام کے لیے اپنے کو اور زیادہ لائق و موزوں بنا دیتے ہیں۔"

زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ سیوا گرام دیہی خوش حالی کی گاندھیائی اسکیموں کا مرکز بن گیا۔ سماجی اور اقتصادی ترقی کے مختلف النوع کام چلانے کے لیے اس گاؤں کے اندر اور اردگرد کئی ادارے بن گئے۔ کل ہند دیہی صنعت (آل انڈیا وِلج انڈسٹریز) ایسوسی ایشن کا صدر مقام مگن وادی میں تھا۔ اس ادارے سے انھیں صنعتوں کو امداد اور فروغ مل سکتا تھا جو دیہاتوں میں آسانی سے چلائی جا سکتی تھی اور جن لوگوں کو گاؤں کے باہر کی امداد کی ضرورت نہیں تھی اور بہت تھوڑا سا سرمایہ درکار تھا۔ ایسوسی ایشن نے دیہاتوں میں کام کرنے والوں کے لیے ایک تربیتی اسکول قائم کیا اور "گرام اُدیوگ پتر کا" نام کا اپنا جریدہ بھی نکالا۔ اس کے علاوہ اور بھی ادارے تھے مثلاً گوسیوا سنگھ" جس کا کام گاؤں کی حالت بہتر بنانا اور اُن کی نسل کا سدھارنا تھا، یا ہندستانی تعلیم سنگھ جس کا مقصد گاندھی کے تعلیمی نظریات کا تجربہ کرنا تھا۔

ہندوستان کے سات لاکھ دیہاتوں کو غریبی مرض اور جہالت سے نجات دلانا زبردست کام تھا اور اس کے لیے متعدد جہتوں میں کوششوں کی حاجت تھی۔ دیہاتی صنعتوں کے فروغ سے روزگار پیدا کیا جا سکتا تھا اور دیہاتیوں کی قوت خرید میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ اس سے دیہاتوں کی کاہلی بھی دور کی جا سکتی تھی۔ گاندھی نے لکھا تھا کہ "اگر سے گاؤں کے چار سو بالغ افراد میرے بتائے ہوئے طریقے پر کام کریں تو میں اُنکی جیبوں میں دس ہزار روپے سالانہ بھر سکتا ہوں لیکن وہ ایسا کریں گے نہیں۔ اُن میں اتحاد باہمی کی کمی ہے۔ ان کو دانشمندانہ طریقے پر محنت کرنا نہیں آتا۔ وہ ہر نئی چیز کے سیکھنے سے انکار کرتے ہیں۔"

گاندھی یہ محسوس کرتے تھے اگر بے لوث کارکنوں کے گروہ دیہاتیوں کی صفوں میں گھل مل جائیں اور دیہی صنعتوں کے احیا، دیہی اسکولوں کے چلانے، صفائی کا بہتر انتظام کرنے اور متوازن خوراک کو مقبول بنانے میں دیہاتیوں کا ہاتھ بٹائیں تو ان دیہاتوں کو تربیت دے کر جمود

سے چھٹکارا دلایا جاسکتا تھا۔ گاؤں میں کام کرنے والے اور سامان سب کچھ موجود تھا، ضرورت بس یہ تھی کہ اِن کو گاؤں کی خدمت میں لگا دیا جائے۔

جب لارڈ پیرنگ ٹن ان سے ملنے گئے تو گاندھی نے ان کو کل ہند دیہی صنعتی ایسوسی ایشن کے مقصد کا لب لباب یہ بتایا کہ ''بے کار چیز کو دولت میں کیسے تبدیل کیا جائے۔'' گاندھی نے یہ وضاحت کی کہ ان کے پروگرام میں دیہی قرضوں کا بوجھ اس لیے شامل نہیں ہے کہ ''اس کے لیے سرکاری کوشش کی ضرورت ہوگی۔ میں فی الحال ایسی باتیں دریافت کررہا ہوں جنھیں عوام سرکاری امداد کے بغیر خود انجام دے سکتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ میں سرکاری امداد نہیں چاہتا، لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ مجھے میرے شرائط پر مل نہیں سکتی۔''

ان کاموں میں جو دیہاتی کر سکتے تھے لیکن کرتے نہیں تھے دیہات کو صاف ستھرا رکھنا تھا۔ گاندھی کے خیال میں اس کا سبب چھوت چھات کا جذبہ تھا یعنی یہ خوف کہ ''ہمیں اپنی ہی گندگی چھونا پڑے گی اور اس طرح اسے صاف کرنا پڑے گا۔'' وہ ہر ایک شخص کو اس پر آمادہ کرتے کہ وہ اپنا بھنگی خود بنے، سب مل کے ایسی تحریک چلائیں کہ دیہی تالاب کنویں اور سڑکیں صاف رہ سکیں اور اسی طرح لارڈ کرٹس کے اس طعن کا سبب دور کردیں کہ ''ہندوستانی گاؤں گوبر کے ڈھیر'' ہیں۔

مناسب غذا دوسرا موضوع تھا۔ جس پر گاندھی اکثر لکھتے اور بولتے رہتے تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے سے وہ کھانوں اور برتنوں کے بارے میں تجربے کرتے چلے آرہے تھے۔ انھوں نے جب سے یہ محسوس کیا اور دلی صدمے کے ساتھ محسوس کیا کہ غریبی کے علاوہ ہندوستانی عوام کی قلت تغذیہ کے لیے ان کی غذائی عادتیں ذمہ دار ہیں اس وقت سے ان کی نظروں میں اس مسئلے نے فوری اہمیت اختیار کرلی۔ وٹامنوں کی کمی ناقابل عفو تھی، کیوں کہ ہری پتیاں ہر طرف بکھری تھیں جو چاہے اٹھالے۔ انھوں نے ہندوستانی سائنس دانوں سے اپیل کی کہ وہ ہندوستانی حالات کے پس منظر میں ہندوستانی غذاؤں پر ریسرچ کریں۔ ''حیاتیات کے یہ تجربے کرنا آپ کا کام ہے سرسری طور سے یہ نہ کہیے کہ بنگالیوں کو روزانہ آدھے پونڈ چاول کی ضرورت ہے اور یہ آدھا پونڈ انھیں ہضم ہی کرنا ہوگا۔ ان کے لیے ایسی غذائیں تجویز کیجیے جو سائنسی طور پر صحیح ہو۔ ایک عام ہندوستانی جسم کے لیے نشاستے کی کتنی مقدار ضروری ہوگی۔ مجھے اس وقت تک اطمینان نہیں ہوگا

جب تک میں اپنے دیہاتی عوام کے لیے کچھ سبزیاں، کچھ گھی اور کچھ دودھ مہیا نہ کرسکوں۔ مجھے ایسے کیمیا دانوں (کیمسٹوں) کی ضرورت ہے جو خود بھوکے رہ کر اپنے غریب اہل ملک کے لیے معیاری غذا معلوم کریں۔ بدقسمتی سے ہمارے ڈاکٹروں نے اس سوال پر انسانی نقطۂ نظر، کم از کم غریب آدمی کے نقطۂ نظر سے غور ہی نہیں کیا ہے۔[1]

انھوں نے کھانا پکانے کے ایسے طریقوں پر جن سے غذاؤں کی طاقت بخش صلاحیت زائل نہیں ہوتی ایک عملی باورچی کی حیثیت سے لکھا اور کارخانے کے پیداواروں کے مقابلے میں ہاتھ سے پسے ہوئے آٹے اور ہاتھ سے کٹے ہوئے چاول کی افضلیت ثابت کی۔ انھوں نے وضاحت کی کہ ''کپڑے کی ملوں کے جلو میں بے روزگاری آئی، ملوں کے آٹے اور چاول کی بدولت عدم تغذیہ اور مرض آیا۔''

گاندھی یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ شہری دانش وروں کی مدد کے بغیر دیہی ہندوستان کی صورت بدلی نہیں جاسکتی۔ مالک کو دیہاتوں کے مسائل سے آگاہ کرانے کے خیال سے انھوں نے کانگریس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے سالانہ اجلاس دیہاتوں میں منعقد کیا کرے۔ فیض پور کانگریس پہلا اجلاس تھا جو گاؤں میں ہوا۔ گاندھی نے اس پر دھیان دلایا کہ یہ اجلاس اس بھاگ دوڑ اور دھکم پیل سے محفوظ رہا جو بڑے شہروں میں ناگزیر تھا۔ گاؤں جھاڑیوں نے کانٹے دار تاروں کا کام دیا اور دیہی صنعتوں کی نمائش سے لوگ محفوظ بھی ہوئے اور انھوں نے سیکھا بھی۔

وہ ہر مسئلے کو گاؤں کی ضرورتوں کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ تعلیم کا طریقہ ناکافی اور فضول خرچی پر مبنی ہے۔ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت ٹوٹی پھوٹی تعلیم سے بھی محروم رہتی ہے جو گاؤں کے پرائمری اسکولوں میں جاتے تھے وہ بھی وہاں جو کچھ سیکھتے تھے بہت جلد بھول جاتے تھے کیوں کہ اس تعلیم کا ان کی روزمرہ کی زندگیوں اور ماحول سے رابطہ نہیں تھا۔

ہائی اسکول کی سطح پر غیر ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم ہونے سے گاؤں کے کروڑوں بسنے والوں اور سماج کی اوپری سطح کے چند ہزار لوگوں کے درمیان دیوار کھڑی ہوجاتی تھی۔ گاندھی نے کانگریسی حکومت کے صوبوں کے وزرائے تعلیم اور (ملک کے) ماہرین تعلیم کا جلسہ طلب کیا تاکہ

(1) ''ہری جن'' 22/مارچ 1935ء

ایسا نظامِ تعلیم مرتب کیا جا سکے جو عوام کی ضرورتوں کے عین مطابق ہو۔ اس تبادلۂ خیال کے نتیجے میں ''بنیادی تعلیم'' کا جو طریقہ ابھر کر سامنے آیا اس پر بہت اختلاف رائے ہوا لیکن ان بندھے ٹکے خیالات کی اصلاح کی ایک صورت تو نکلی جن پر ملک کے شعبہ ہائے تعلیم کام کرتے چلے آئے تھے۔[1]

دیہاتوں میں کام کرنا پُر مشقت بھی تھا اور سست رفتار بھی۔ گاندھی کے لفظوں میں یہ ''پاؤں گھسیٹ کر چلنے والے کا کام'' تھا۔ اس سے اخبار میں شاہ سرخیاں نہیں چھپتی تھیں اور حکومت کے لیے کوئی الجھن بھی پیدا نہیں ہوتی تھی خود گاندھی کے بہت سے ساتھی یہ سمجھ نہیں پاتے تھے کہ اس بے ضرر سے کام سے ہندوستان کو اپنی اصلی منزل مقصود یعنی سیاسی آزادی کی طرف بڑھنے میں کیسے مدد مل سکتی تھی۔ گاندھی پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ اصلی سیاسی سوال سے کترا رہے ہیں۔ ان کا جواب یہ تھا کہ ''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ (دیہی ترقی کے) ان ضروری مسائل کے بارے میں غور و فکر کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی سیاسی اہمیت کیوں نہیں ہے اور یہ کہ حکومت کی مالی پالیسیوں کا جائزہ لینے میں کس طرح لازمی طور پر سیاسی پہلو نکلنے لگتا ہے۔ میں عوام سے جو کچھ کرنے کو کہتا ہوں وہ ایسی بات ہے جسے کروڑوں لوگ کر سکتے ہیں۔ جب کہ ہمارے حکمرانوں کی پالیسیوں کے جائزے کا کام ان کے کرنے کا ہے بھی نہیں جو چند لوگ یہ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہی یہ کام کرتے رہیں۔ لیکن اس وقت تک کہ یہ لیڈر بڑی بڑی تبدیلیاں نہ لا سکیں۔ میری طرح کے کروڑوں افراد ان صلاحیتوں کو اپنے مفاد میں بہتر طریقے پر کیوں استعمال نہ کریں جو خدا نے ہمیں عطا کی ہیں۔ وہ اپنے دروازے کیوں صاف نہ کریں اور اپنے اجسام کو زیادہ تنومند آلۂ کار کیوں نہ بنائیں؟[2]

آج اس پر سوچنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ گاندھی کے دیہی ترقی کے کام پر حکومت کا پہلا ردعمل یہ ہوا کہ اس نے اسے دیہاتی عوام کی مدد سے، غیر معمولی پیمانے پر سول نافرمانی کے احیا کا اچھی طرح سوچا سمجھا منصوبہ قرار دیا، بلکہ 1934 میں حکومت ہند نے صوبائی حکومتوں کو ایک

---

(1) بنیادی تعلیم کی تفصیلات کے لیے اس کے بعد والا باب ''کانفرنس برسر اقتدار'' ملاحظہ کیجیے

(2) ''ہری جن'' 11 / جنوری 1936

گشتی مراسلہ بھیجا جس میں صوبائی حکومتوں سے سنبھل جانے کو کہا گیا اور انھیں مشورہ دیا گیا کہ وہ اس کے خلاف دیہاتوں میں پروپیگنڈا کریں۔

گاندھی کے دیہی کام کی اس سے بھی سنگین تنقید یہ کی جاتی تھی کہ وہ سائنس اور صنعت سے منہ موڑ کر ایک ایسی دقیانوسی معیشت کی تبلیغ کر رہے ہیں جو غریبی کو پائندہ بنا دینے والی ہے۔ ''ہند سوراج'' میں گاندھی نے نہایت شدت سے مشین، مل اور صنعتی تہذیب کی تنقید کی تھی لیکن بعد کے چالیس برسوں میں انھوں نے مشین کے بارے میں اپنے خیالات کی مزید وضاحت کی اور ان کو اہنسا کے اپنے بنیادی فلسفے سے مربوط کیا۔ مشینی نظام پر ان کا خاص اعتراض یہ تھا کہ اس میں دولت کے چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جانے کا رجحان تھا۔ ایسے ملک میں جہاں کام کرنے والے ہاتھ بہت زیادہ ہوں اور کام بہت کم وہاں مشینیں صرف بے روزگاری اور غریبی پھیلا سکتی تھیں۔ انھوں نے 1921 میں لکھا تھا کہ ''میں سب سے زیادہ بڑی اور تکمیلی مشینوں کے استعمال کی بھی حمایت کروں گا بشرطیکہ اس سے ہندوستان کا افلاس اور اس سے پیدا ہونے والی بے کاری دور ہو جائے'' بہرصورت وہ ذہنی طور پر بڑے پیمانے کی پیداوار اور عوام کے لیے پیداوار کے درمیان امتیاز کرتے تھے۔ اوّل الذکر کے ذریعے نجی اور آزاد سرمایہ کاری کی بدولت امیر اور زیادہ امیر اور غریب اور زیادہ غریب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ فی نفسہ مشین کے خلاف نہیں تھے۔ ان کا محبوب چرخہ بھی مشین ہی تھا لیکن یہ ''وہ مشین تھی جو عوامی شکل اختیار کر چکی تھی۔'' وہ ایسے سیدھے سادے اوزار اور آلے پسند کرتے تھے جن سے ''لاکھوں جھونپڑیوں کا بوجھ ہلکا ہو سکے'' لیکن انسانی اعضا و جوارح شل نہ ہوں۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ ان میں سے بعض معمولی مشینوں جیسے کہ سلائی کی مشین کے بنانے کے لیے کارخانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے کہ ''میں اس حد تک سوشلسٹ ہوں کہ ایسے کارخانوں کو قومیا لینا چاہیے یا ان پر حکومت کا کنٹرول ہونا چاہیے۔ ان میں بہت ہی دل کش اور معیاری حالات کے اندر کام ہونا چاہیے۔ نفع خوری کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کے فائدے کے لیے اور کام کی محرک محبت ہو نہ کہ حرص۔''

مہادیو ڈیسائی نے گاندھی اور چارلی چیپ لین کے درمیان لندن میں 1931 کی ایک دل چسپ گفتگو بیان کی ہے۔ چیپ لین نے پوچھا، ''فرض کیجیے کہ آپ کو ہندوستان میں روس کی سی

آزادی مل جائے اور اپنے یہاں کے بے روزگاروں کے لیے دوسرا کام اور دولت کی مساویانہ تقسیم کا تیقن بھی مل جائے، تو آپ اس وقت مشینوں کو بُرا نہ کہیں گے؟ آپ کام کے گھنٹے کم کرنا چاہیں گے اور مزدوروں کے وقفۂ آرام بڑھانے کی حمایت کریں گے؟'' گاندھی نے جواب دیا ''یقیناً''[1] یہ سچ ہے کہ گاندھی کی صنعتی نظام کی مخالفت بڑی حد تک ان برائیوں پر مبنی تھی جو یہ نظام اپنے ساتھ لایا تھا۔ یعنی مزدوروں کو بے کار کردینا اور دولت کا مرکوز ہوجانا۔ لیکن ان کے ذہن میں اس بات کی بھی اتنی ہی اہمیت تھی کہ اس اقتصادی تنظیم کا سماجی ڈھانچے پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ہزاروں گاؤں میں پیداوار کا عدم تمرکز سیاسی طاقت کے عدم تمرکز سے جڑا ہوا تھا اور یہ گاندھی کے تصور کے غیر متشدد سماج کا بنیادی معیار تھا۔ چھوٹی چھوٹی مواضعاتی بستیوں (کمیونی ٹیز) ہی میں جو اپنی مقامی ضرورت کی اشیا پیدا کررہی ہوں اور کھلی ہوئی نابرابریوں سے پاک ہوں، حقیقی جمہوریت وجود میں آسکتی ہے جس کی بنیاد مادی تعلقات کی بجائے انسانی تعلقات پر ہو۔ مغرب میں صنعتی انقلاب کی وجہ سے ایک ہی ملک کے اندر چند افراد کی جانب سے بہتوں کا استحصال اور نوآبادیاتی طاقتوں کی طرف سے پچھڑی ہوئی اقوام کا استحصال تیزی سے بڑھا ہے۔ صنعتی اعتبار سے بہت زیادہ ترقی یافتہ سماج میں بظاہر اقتصادی اور سیاسی ڈھانچے روز افزوں طور پر اہرامی شکل اختیار کرتے گئے اور جنگی رجحان پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک بنتا گیا۔ غیر متشدد سماج کی تنظیم اس نہج پر ہو کہ اندرونی طور پر نابرابریاں اور تناؤ کم ہوں اور بیرونی طور پر حملہ کرنے کی تحریص گھٹے۔ ایسا سماج غیر متمرکز معیشت کی بنیاد ہی پر بن سکتا ہے۔ گاندھی نے لکھا کہ آپ کارخانہ کی تہذیب پر اہنسا کی عمارت کھڑی نہیں کرسکتے۔ اسے تو خود کفالتی گاؤں کی بنیاد پر بنانا ہوگا۔ اگر ہٹلر کے ذہن میں یہ بات آبھی جاتی تو وہ سات لاکھ غیر متشدد گاؤں کو روند نہیں سکتا تھا۔ اس سلسلۂ کار میں وہ خود غیر متشدد ہوجاتا۔ جس طرح پر میں سوچ رہا ہوں، دیہی معیشت میں استحصال کا کلیۃً خاتمہ ہوگا کیوں کہ استحصال ہی تشدد کی جڑ ہے اس لیے اہنسا پر ایمان لانے سے پہلے آپ کو دیہی ذہنیت پیدا کرنا ہوگی۔''

گاندھی کے ذہن میں ایک معیاری ہندوستانی گاؤں کی جو تصویر تھی وہ ایک ایسی 'جمہوریۂ' تھی، جو اپنی ضروری احتیاجوں کے لیے اپنے ہمسایوں کی محتاج نہ ہو لیکن دوسرے طریقوں سے

---

(1) The Nation Voice (قوم کی آواز) مرتبہ سی راج گوپالا چاری و جے۔سی کمارپا، ص:129)

ایک دوسرے کی باہمی احتیاج رکھتی ہو، اپنا اناج اور روئی اور (اگر فاضل زمین موجود ہو تو) پیسہ کمانے والی فصلیں اُ گا کے اس کے زیادہ سے زیادہ کام اتحاد باہمی کی بنیاد پر ہوں، اس کا اپنا تھیٹر، اسکول اور پبلک ہال ہو، ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہو۔ منتخب کی ہوئی پنچایت جھگڑوں کا فیصلہ کرے۔ ایک رجسٹر تیار کر کے باری باری سے اپنی گارڈ پولیس کا کام کریں۔

انفرادی آزادی پر مبنی 'کامل' جمہوریت کا یہ تصور خیالی کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے لیکن گاندھی کی نگاہوں میں غیر متشدد سوسائٹی صرف یہی شکل اختیار کر سکتی تھی۔ انھیں اس کی پروا نہیں تھی کہ ان کے خیالات پر کیا لیبل چپکایا جاتا ہے۔ ہندوستانی سوشلسٹ، جو 1935 تک کانگریس کا ایک مضبوط بازو بن چکے تھے، اُن کی بعض وقت تنقید کیا کرتے تھے۔ گاندھی کا یہ دعوا تھا کہ ہندوستانی سوشلسٹوں نے جب سے اس نظریہ کو اپنایا اس کے بہت پہلے سے وہ سوشلسٹ تھے۔ انھوں نے لکھا، ''لیکن میری سوشلزم فطری طور سے مجھے ملی تھی اور کتابوں سے مقتبس نہیں تھی۔ اس کا منبع عدم تشدد پر میرا کبھی نہ ڈگمگانے والا اعتماد تھا جو شخص عملی طور پر غیر متشدد ہو یہ نہیں کر سکتا کہ کہیں سماجی بے انصافی ہوتے دیکھے اور اس کے خلاف آواز نہ اٹھائے۔

وہ یہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ طبقاتی جنگ یا تشدد ناگزیر ہے انھیں یقین تھا کہ اہنسا کی جو تکنیک انھوں نے اپنائی ہے وہ سماجی نابرابری کا بھی اسی طرح خاتمہ کر سکتی ہے جیسے غیر ملکی حکومت کا۔ طاقت کے استعمال سے پرہیز کرنے سے ان کی سوشلزم متبرک از کار رفتگی نہیں بن جاتی بلکہ اپنی انسانیت نوازی اور بظاہر نرم طریقوں کے باوجود اس میں انقلابی امکانات ہیں۔ سوشلسٹوں اور سرمایہ داروں کے برعکس وہ املاک کو شر سمجھتے تھے۔ املاک وجائداد کی ملکیت کے بارے میں ہوئے مباحث کو وہ غیر حقیقی جانتے تھے کیوں کہ وہ لاکھوں افراد جو بمشکل گزر اوقات کر پاتے تھے بلکہ شاید اس سطح زندگی کے بھی نیچے تھے، ان کے لیے یہ مباحث بے معنی تھے۔ ہندوستانی عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''انھیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ لاکھوں مردوں کے پاس کوئی جائداد نہیں ہے جو وہ آنے والی نسلوں کے لیے بطور ورثہ چھوڑیں۔ ہمیں ان سے یہ سیکھنا چاہیے کہ تھوڑے سے لوگوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ ان کے پاس کوئی موروثی جائداد ہی نہ ہو۔ ہر شخص کے لیے جو حقیقی املاک مساوی حیثیت سے متروکے کے طور پر چھوڑ سکتے ہیں وہ

اپنا ذاتی کردار اور تعلیمی سہولتیں ہیں۔''

اگر وہ املاک کے ادارے کو برداشت کرتے تھے تو وہ اس لیے نہیں تھا کہ انھیں اس سے محبت تھی یا وہ اسے انسانی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ اسے اہنسا کے ذریعے ختم کرنا چاہتے تھے۔ گاندھی جائداد کی ملکیت نہ تو فرد کو منتقل کرنا چاہتے تھے نہ ریاست کو بلکہ خدا کو۔ جن لوگوں کے قبضے میں جائداد تھی انھیں اپنے کو صرف متولی سمجھنا چاہیے لیکن وہ خود اس کے بنیادی یا تنہا حقدار نہیں تھے۔ کسی کو اپنی ضرورت سے زیادہ اپنے پاس رکھنے کا حق نہیں تھا۔ ہر شخص کو اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرنا چاہیے اور اپنی واقعی ضرورتوں کے مطابق حصہ پانا چاہیے۔ ممکن ہے کہ تولیت کے اس نظریے کو راجاؤں، زمینداروں اور بڑے تاجروں کی امتیازی حیثیت کے جواز کی کوشش سمجھا جائے۔ دراصل، یہ ایک انقلابی نظریہ تھا، جو امیروں (املاک رکھنے والوں) سے غریبوں (املاک سے محروم افراد) کے حق میں رضا کارانہ قربانی کا طالب تھا۔

گاندھی کے تصور کا مثالی زمیندار ''فوراً'' وہ بوجھ کم کرے گا جو اس وقت رعیّت اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ رعیّت کو ضروریات زندگی فراہم کرنے کے لیے خود اپنے کو غریب بنالے گا۔ وہ اپنی زیرنگرانی رعیت کی اقتصادی حالت کا جائزہ لے گا وہ ایسے اسکول قائم کرے گا جس میں اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ رعایا کے بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہو، وہ گاؤں کے کنویں اور تالاب صاف کرائے گا۔ وہ رعیت کو اپنی سڑک اور اپنے پاخانے صاف کرانا اس طرح سکھائے گا کہ پہلے اپنے یہاں یہ ضروری کام وہ خود انجام دے گا۔ وہ رعایا کے استعمال کے لیے اپنے باغات کسی بندش کے بغیر کھول دے گا۔ وہ بہت سی غیر ضروری عمارتیں جو وہ اس وقت عیش وعشرت کے لیے وقف کیے ہوئے ہے ان میں سے اکثر کو وہ اسپتال، اسکول وغیرہ میں تبدیل کردے گا۔[(1)]''

سوال یہ تھا کہ صاحبان املاک کو اس پر کیسے آمادہ کیا جائے گا کہ وہ اپنی حرص کو پورے معاشرے کی بھلائی کا تابع بنادے؟ پہلا قدم تو یہ تھا کہ امیروں کو سمجھایا جائے اگر دلیل سے کام نہ چلے تو غیر متشدد عدم تعاون کا سہارا لیا جائے جس طرح کوئی حکومت بہت دنوں تک عوام کے رضا مندانہ یا جبری تعاون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اسی طرح اگر لوگ مجبوراً یا دانستہ طور پر اس استحصال

(1) ینگ انڈیا: 5 دسمبر 1929ء

کے آگے جھک نہ جائیں تو استحصال بھی ناممکن ہو جائے گا۔

گاندھی واضح حقائق سے گھبرا کر بے لچک نظریوں کے دامن میں پناہ نہیں لیتے تھے۔ ان کے نظریات کا ارتقا ان کے گرد وپیش کے سماجی اور اقتصادی حالات کے ردعمل کے طور پر ہوا تھا۔ ان پر ایک بار ہندوستانی سوشلسٹوں نے تنقید بھی کی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کے خیالات گاندھی کے پروگراموں میں موجود ہیں، اگر چہ ان کا بھیس ایسا ہے کہ فوری طور پر پہچان مشکل ہے۔ گاندھی نظریہ ساز نہیں بلکہ ایک عملی انسان تھے اور عملی مسائل سے سروکار رکھتے تھے۔ قبل آزادی کے ہندوستان میں انھیں حکومتوں کی مدد کے بغیر کام کرنا پڑتا تھا بلکہ اکثر اوقات مخالفتوں کا بھی سامنا ہوتا تھا۔ غربت، مرض، جہالت اور جمود کے مسائل اس مستقبل بعید پر ٹالے نہیں جاسکتے تھے جب عہد سعادت[1] آئے گا۔

یہ پیش منظر کا سوال تھا۔ جن لوگوں نے ہندوستان کے بارے میں ان اقتصادی نظریات کے تحت سوچنا شروع کیا تھا جو انھوں نے یونیورسٹی میں پڑھے تھے یا سیاسی جماعتوں کے سیمناروں میں حاصل کیے تھے، وہ ہندوستان کے مسائل کو ہمیشہ ٹھیک طور سے تول نہیں پاتے تھے۔ کینس (Kegnes) نے 1911 میں ''اکنامک ٹرازیشن اِن انڈیا'' (ہندوستان میں اقتصادی تغیرات) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: ''سر تھیوڈور ماریسن (مصنف کتاب) بہت ہی سرسری طور پر مغرب سے مشرق کی طرف دلیلیں بہائے جاتے ہیں لیکن وہ ان بیحد تہ نشین عناصر پر پورا پورا دھیان نہیں دیتے جن پر اس ملک کے ذرائع کے سب سے زیادہ فائدہ مند پہلو کا دارومدار ہے..... عوام کی آنکھوں میں بمبئی اور کلکتہ کے کارخانے بہت زیادہ ابھرا بھر کے آتے ہیں۔''

کینس نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کارخانوں سے ہندوستان کی عام خوش حالی پہ مشکل ہی سے اثر پڑتا ہے کیوں کہ عام حالت نئے ہندوستان کے ذہن اور سرمایے کو اس کے کھیتوں اور دیہاتوں میں لگا کر ہی بہتر بنائی جاسکتی تھی۔ گاندھی کے ذہن کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ اس غریبی کو دور کیا جائے جو دیہاتوں کو کچلے ڈال رہی تھی۔ وہ اس خیال سے متنفر تھے کہ چند بڑے شہروں کی خوشحالی بڑھانے

---

(1) مسیحی عقیدے کے مطابق حضرت مسیح کی حکومت کے قیام کا زمانہ۔ ہند میں اسی سے ملتا جلتا ست یگ کا تصور ہے۔

کے لیے دیہاتوں کو مزید غربت کا شکار بنایا جائے۔ چند بڑی بڑی جناتی مشینوں کے پہیے چلانے سے وہ یہ کہیں بہتر سمجھتے تھے کہ دیہاتوں میں لاکھوں جھونپڑے سرگرمیوں سے گونج رہے ہوں تا کہ وہ اپنی ضروریات پوری کرسکیں اور پھر اپنا حال شہروں کو بھی بھیج سکیں۔ اگر سوئزرلینڈ اور جاپان میں کام اور مزدوری ہزاروں جھونپڑیوں تک لے جائی جاسکتی ہے تو ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟

ہندوستان کے حالات کا ایک پہلو دوسرے ملکوں سے مختلف تھا۔ یہاں ایک بیرونی حکومت کے پاس نہ تو کوئی ایسا محرک جذبہ تھا نہ تنظیم جو ملک کی معیشت میں انقلابی تبدیلیاں لا سکے۔ جب گاندھی نے اپنے کو سیاسیات سے اس لیے علاحدہ کرلیا کہ وہ دیہاتوں میں کام کرسکیں تو حکومت کو ان پر یہ شبہ ہوا کہ وہ نہایت زیرکی سے اور منصوبہ بند طریقے پر دیہاتی عوام کو ملک گیر سیاسی نافرمانی کی تحریک کے لیے آمادہ کررہے ہیں۔

ڈھائی برس کے بعد پہیے کا چکر پورا ہوجانے والا تھا اور یکم اپریل 1937 کو نئے آئین کے بروئے کار لائے جانے کا پلان بن گیا تھا۔ گاندھی کی نگاہوں کے سامنے یہ آئین کسی طرح جوڑ گانٹھ کر تیار کیا گیا تھا اور ان کی رائے اس کے بارے میں بہت اچھی نہیں تھی لیکن جیسے جیسے انتخابات کی تاریخیں قریب آتی گئیں وہ یہ سوچنے لگے کہ کیا یہ آئین اپنی خامیوں کے باوجود عوام کی تقدیر سنوارنے کے کام بھی آسکتا تھا۔

باب 41

کانگریس برسرِحکومت

1937 میں صوبوں میں نئے آئین کے نفاذ کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کے لیے گاندھی کی رہنمائی سے متاثر ہو کر تعمیری کام کرنے کا پورا میدان سامنے آ گیا۔

نئے آئین کو برطانوی پارلی منٹ نے 1935 میں قانونی شکل دی تھی۔ یہ 1937 میں نافذ ہوا۔ اس میں ہندوستان کے لیے تدریجی خود اختیاری حکومت کی پالیسی اپنائی گئی تھی۔ 1919 کے ''انڈین ریفارم ایکٹ'' میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ دس سال بعد سیاسی حالات کا ازسرنو جائزہ لیا جائے گا۔ اگرچہ اس معینہ مدت کے دو برس پہلے ہی گفت وشنید کا آغاز ہو گیا تھا۔ اور 1927 میں سائمن کمیشن بٹھایا گیا تھا۔ لیکن اصلاحات کا اگلا قدم درحقیقت ایک دہائی گزرنے کے بعد اٹھایا گیا۔ دس سال تک ہندوستانی سیاست قومی بے چینی سے تہ وبالا ہوتی رہی۔ اس عرصے میں بڑے پیمانے کی دو سول نافرمانی کی تحریکیں چلیں اور کئی سرکاری کانفرنسوں اور کمیشنوں نے آئین کی تفصیلات بڑی محنت سے تیار کیں۔

برطانیہ میں ''ہندوستان کا سوال'' ایک خوفناک سیاسی اختلاف کی صورت اختیار کر گیا۔ ہندوستانی حکومت خود اختیاری کی مخالفت کے سربراہ ونسٹن چرچل تھے۔ انھوں نے اسے سلطنت برطانیہ سے بے وفائی بلکہ خود ہندوستانی عوام سے ناوفاداری قرار دیا۔ ان کے خیال میں ہندی

عوام کا مستقبل ہندوستانی سیاست دانوں سے زیادہ برطانوی حکومت کے ہاتھوں میں محفوظ تھا۔ انھوں نے گاندھی سے گفت شنید کرنے پر لارڈارون کے خلاف نفرتیں کی بوچھار کی۔ وہ لارولنگڈن کی ''مضبوط ہاتھ'' والی پالیسی سے بہت خوش تھے، بلکہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے اندرسامراجی اقتدار میں کسی قسم کی ڈھیل دینے سے حکومت انکار کرکے قوم پروروں پر حاصل کی ہوئی ''فتح'' کو مستحکم کردے۔ برطانوی کابینہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند، سرسیموئل ہورنے پارلیمنٹ میں اس آئینی بل کو مختلف منازل سے گزارا۔ انھیں چرچل کی مخالفت کے وار سہنا پڑے۔ انھوں نے اس مخالفت کے منابع کا تجزیہ یوں کیا ہے! سلطنت ہندوستان کے چاروں طرف جوشاندار یادوں کا گھیرا تھا، (اس نے) ان (چرچل) کی نگاہیں ان تبدیلیوں کی طرف سے بالکل ہی خیرہ کردی تھیں جو کلائیو، ولنگٹن، لارنس اور کپلنگ کے دور کے بعد سے وجود میں آچکی تھیں وہ ہندوستان جس کے فورتھ حصار (فوجی دستے میں) میں انھوں نے ملازمت کی تھی، وہ پولو، خزیرکشی اورمہتوانہ سرحدی مہم جوئیوں، آزادانہ قبول کی جانے والی پدرانہ حکومت اور عظیم سفید فام ملکہ کا ہندستان تھا جس کی ایک پراسرار دیوی کی طرح عزت تھی۔''(1)

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا ہندوستان وہی ہندوستان نہیں تھا جو انیسویں صدی کی نویں دہائی میں تھی۔ اس کا سبب صرف یہی نہیں تھا کہ وقت بدل گیا تھا بلکہ دراصل ہندوستانی سیاست پر گاندھی کی شخصیت کی چھاپ تھی۔ یہ ایک ایسی بات تھی جسے تاریخ کا سارا تصور رکھنے کے باوجود چرچل سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اس کے اسباب کی تلاش میں دور جانا نہیں پڑے گا۔ فوجی حکمت عملی کے ماہر اور سیاست داں چرچل کو گاندھی کی مذہبی ذہنی ساخت اور سچائی اوراہنسا کی نظریات لاکھ ریاکارانہ بکواس نظر آتے ہوں لیکن جب گاندھی ہندوستان پر برطانوی حکومت کے اخلاقی حق کو چیلنج کرتے تھے تو چرچل کی دکھتی رگ پکڑ لیتے تھے۔

پریس اور پارلیمنٹ میں مخالفت کے ٹھوس بلاک کے مقابلے میں انگلستان کے برطانوی حکومت کے ترجمانوں کو نئے آئین کے انھیں پہلوؤں کی حمایت کرنا پڑتی تھی جو ہندوستانی رائے عامہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناقابل قبول تھے۔ یہ وہ ''تحفظات'' تھے جو وائسرائے اور

(1) ٹمپل وڈ (سرسیموئل ہور) Nine trribled years (نو پرآفات سال) ص:98

گورنروں کے ہاتھوں میں اس لیے دے دیئے گئے تھے کہ ہندوستانی جمہوریت پگلا نہ جائے!
برطانیہ جس گومگو کی کش مکش میں مبتلا تھا اس کا خلاصہ ''مین چسٹر گارجین'' کے اس تبصرے میں ملتا ہے
کہ صورت حال ایسی ہے کہ نہ تو برطانیہ حکومت ہی کرسکتا ہے اور نہ ہندوستان کو چھوڑ کر جا ہی سکتا
ہے، اس لیے ضرورت یہ ہے کہ ''ایسا آئین بنایا جائے جو ہندوستان میں تو حکومت خود اختیاری کی
طرح معلوم ہو اور وسٹ منسٹر میں برطانوی راج۔''

اپنی آخری شکل میں، نیا آئین عوام کے منتخب نمائندوں کو تفویض کیے جانے والے
اختیارات کے اعتبار سے بھی اتنا ہی مؤثر تھا جتنا سلب کیے جانے والے اختیارات کے اعتبار
سے۔ اس کی مثال یوں تھی جیسے کوئی موٹر نچلے گیر میں اور بریک لگا کر چلا گیا ہو۔ ہندوستانی
فیڈریشن، جب بھی وجود میں آتا، تو اس میں صوبے بھی شامل ہونے والے تھے اور ہندوستانی
ریاستیں بھی، فیڈرل مجلس قانون ساز میں ہندوستانی ریاستوں کو تقریباً تہائی نشستیں دے دی گئی
تھیں۔ وہاں انتخابی اداروں کو عدم موجودگی میں امکان یہی تھا کہ ان ریاستوں کے نمائندے
راجاؤں مہاراجوں کے نامزد کردہ ہوں گے موخرالذکر (راجے مہاراجے) اپنے وجود ہی کے لیے
برطانوی حکومت کے تابع تھے۔ اس لیے ہندوستانی قوم پرستوں نے اس آئین کو تقریباً ہمت شکن
پایا۔ فیڈرل مجلس قانون ساز کے اختیارات محدود کردیے گئے تھے۔ بجٹ کا معتدبہ حصہ مثلاً جس کا
تعلق فوج، ملازمتوں اور شرح سود وغیرہ سے تھا اس کے دائرۂ اختیار سے باہر قرار پائے۔ صوبوں
میں منتخب شدہ مجالس قانون ساز ذمہ دار وزراء کو وسیع تر میدانِ اختیارات ملا تھا لیکن وہاں بھی مالی
اور دوسری مسائل میں ان کے اختیارات محدود کردیے گئے تھے۔ اور گورنروں کو اختیارات اعلیٰ
دیا گیا تھا اور حق امتناع کے استعمال کا مجاز بنادیا گیا تھا۔

ان حد بندیوں کو دیکھ کر جواہر لال نہرو نے 1935 کے انڈین ریفارمس ایکٹ (قانون
اصلاحات ہند) کو ''غلامی کا محضر'' قرار دیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس لکھنؤ میں انھوں نے
اعلان کیا کہ نیا آئین اختیارات کے بغیر ذمہ داریاں دیتا ہے۔ بہرحال کانگریس نے یہ فیصلہ کیا
کہ اس نئے آئین کے ماتحت الیکشن لڑے جائیں کانگریس کے الیکشن منشور (مینی فسٹو) میں نئے
آئین کو کلیۃً مسترد کردیا گیا اور اس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس کی جگہ ہندوستان کی آزادی کی بنیاد

پر ایک نیا آئین، آئین ساز اسمبلی کے ذریعہ مرتب کیا جائے۔ منشور میں آگے چل کر کہا گیا تھا کہ ''کانگریس یہ محسوس کرتی ہے کہ آزادی مجالس قانون کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتی اور نہ ان کے ذریعے غریبی اور بے روزگاری کے مسائل کا مؤثر حل تلاش کیا جاسکتا ہے'' بہرحال الیکشن لڑنے کا فیصلہ کچھ تو اس لیے کیا گیا کہ یہ بات بعید از قیاس سمجھی گئی کہ وطن دشمن عناصر کے لیے صاف میدان چھوڑ دیا جائے اور کچھ اس لیے کہ خود کانگریس کے اندر ایک بازو ایسا تھا جس کو نئے آئین کے محدود دائرۂ کار کے اندر بھی صوبوں میں تعمیری کام کے امکانات نظر آرہے تھے۔

فروری 1937 میں عام انتخابات کے نتائج معلوم ہوئے۔ یوپی، بہار، اڑیسہ، سی پی اور مدراس میں کانگریس کو واضح اکثریت مل گئی بمبئی میں اس کو تقریباً آدھی نشستیں ملیں اور اتحادی گروہوں سے مل کر وہاں بھی حکومت بن سکتی تھی۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے اور آسام میں کانگریس سب سے بڑی جماعت تھی۔

کانگریس کے منشور میں یہ بات صاف طور سے نہیں بتائی گئی تھی کہ اگر کانگریس کو صوبائی مجالس قانون ساز میں اکثریت مل گئی تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں اختلاف آرا شدید تھا۔ جو وزارتیں بنانے کے مخالف تھے وہ یہ محسوس کررہے تھے کہ اس آئین سے کچھ بھی نہیں حاصل ہونے کا، اور عوام کو کوئی آرام پہنچائے بغیر، سماجی مشین چلانے کے سلسلے میں کانگریس کو تمام نفرین خلق برداشت کرنا ہوگی۔ (بدترین امر یہ ہوگا کہ) کانگریس اور اعتدال پسندوں کے راستے پر چل پڑے گی اور ایک جنگ جو ادارہ نہ رہ کر عوام سے رابطہ باقی نہ رکھ سکے گی درآں حال یہ کہ وہی تو اس کی طاقت کا حقیقی سرچشمہ ہیں۔ جو لوگ صوبوں میں حکومت کی ذمہ داریاں قبول کرنے کے حق میں تھے انھیں نئے آئین کے محدود ہونے کا احساس تھا لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ تھے کہ اس سے حکومت یا اس کی تابع پارٹیوں کو کوئی فائدہ پہنچے۔ ان میں سے بہتوں کو یہ یقین بھی تھا کہ نئے آئین کو خدمت خلق کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دو متضاد نقطہ ہائے نظر کے درمیان مصالحت کے طور پر مارچ 1937 میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے کانگریسی ممبروں کے کنونشن میں یہ طے کیا گیا کہ کانگریس اسی شکل میں وزارتیں بنائے گی جب صوبائی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر کو یہ اطمینان ہوجائے اور وہ کھلم کھلا یہ بیان دے سکے کہ گورنر مداخلت کے اختیارات خصوصی

استعمال نہیں کرے گا اور ''آئینی کارروائیوں کے سلسلے میں'' وزیروں کی رائے مسترد نہیں کرے گا۔

جب سے الیکشن کے نتائج معلوم ہوئے، حکومت ہند برابر کانگریس کے رجحانات کا بے چینی سے مطالعہ کر رہی تھی۔ وائسرائے کے ایما پر 17/ مارچ 1937 کو ہوم سکریٹری بجی فلڈ میکس وِل نے کانگریس کے خیالات کے بارے میں ایک تبصرہ مرتب کیا۔ اس سے اس فیصلہ کن سوال کے بارے میں سرکاری نقطۂ نگاہ پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اپنے ابتدائی پیراگرافوں میں میکس وِل نے الیکشن میں کانگریسی کامیابی کو دبا کر پیش کیا۔ ''یہ بیان کہ انتخابات کے نتائج سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رائے دہندوں نے نئے ایکٹ کے بارے میں کانگریسی پالیسی اور پروگرام پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ بہ یک نظر احمقانہ معلوم ہوتا ہے۔ دس ہزار رائے دینے والوں میں شاید ایک شخص نے بھی کبھی نئے ایکٹ کو پڑھا نہ ہوگا۔ اور کانگریس رزولیوشن سے ظاہر ہوتا ہے اس کے لیڈر بھی اس کے دفعات کو نہیں سمجھتے۔''

میکس وِل کی نظر میں وزارتیں قبول کرنے کا فیصلہ کانگریس کے دائیں بازو کے حق میں ایک رعایت تھی اور گورنر کے اختیارات کے بارے میں جو شرط لگائی گئی ہے وہ بائیں بازو کے لیے رعایت ہے۔ یہ بات کہ کھلے عام یقین دہانی گورنروں کو نہیں بلکہ صوبائی اسمبلیوں کی کانگریس پارٹیوں کے لیڈروں کو دینا ہوگی، اس بات کا اشارہ سمجھی گئی کہ کانگریس وزارتیں بنانے پر آمادہ ہے۔ پھر بھی، کانگریس کے اس فیصلے میں میکس وِل کو کئی پھندے نظر آئے اور ان کا خیال تھا کہ گاندھی نے نہایت چالاکی سے یہ پھندے لگا دیے ہیں۔ گاندھی کے بارے میں انھوں نے لکھا: ''اس صورت حال پر اپنا اثر ڈال کر اور دو متضاد رائیوں کے بیچ ایک درمیانی راہ نکال کر گاندھی نے غالباً کوئی ایسی بات رزولیوشن میں رکھ دی ہے جس سے نہرو کو رضا مند کیا جا سکے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ یقیناً اس عام خواہش سے بھی متاثر ہوئے ہیں کہ گفت وشنید کا ایک نقطہ پہلے سے بنالیں جہاں رہ کر یا تو اُن سے مستقبل میں گورنروں اور وزیروں کے مابین حکم بننے کو کہا جائے یا کم از کم یہ ظاہر ہو جائے کہ کسی حد تک حکومت کانگریسی تخیلات کے سامنے جھک گئی۔''

یہ شبہ کرنا کہ گاندھی سیاسی داؤ پیچ کے مقابلے میں چالیں چل رہے ہیں اُن کے ساتھ انصاف نہیں تھا۔ مزاجاً وہ پارلیمانی یا وزارتی کارہائے منصبی کے لیے موزوں نہیں تھے۔ مجالس

قانون ساز کے ذریعے آزادی حاصل کیے جانے پراُن کا یقین 1920 میں ہی غیر متزلزل طریقے پر اُٹھ گیا تھا۔ 1924 میں اپنی رہائی کے بعد سی آر داس اور موتی لال نہرو سے ان کا اختلاف ہوا کیوں کہ وہ کاؤنسلوں کا بائیکاٹ ختم کرنے کے حق میں تھے۔ دس برس بعد 1934 میں گاندھی نے کانگریس کے پارلیمانی بازو کی ہمت افزائی کی کیوں کہ وہ یہ محسوس کررہے تھے بعض کانگریسیوں کی صلاحیت کے اظہار کا بہترین وسیلہ مجالس قانون ساز کے اندر رہ کر کام کرنا تھا۔ مجالس قانون ساز اور وزارتوں کے قبول کرنے کے بارے میں گاندھی کا طرز فکر بالآخر فیصلہ کن ثابت ہونے والا تھا۔ 1937 میں وزارتوں کے قبول کرنے کے بارے میں اختلاف رائے نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا تھا۔ اس وقت انھوں نے لکھا: ''میں یہ آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجالس قانون ساز کا بائیکاٹ سچائی اور اہنسا کی طرح کوئی ابدی اصول نہیں ہے۔ اس بائیکاٹ کے سلسلے میں میری مخالفت کم ہوگئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنا پہلا خیال ترک کررہا ہوں۔ سوال حکمت عملی کا ہے اور میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ کسی خاص محل پر کس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔''(1)

وقت کی ضرورت تعمیری کام تھا۔ سول نافرمانی کے التوا کے بعد سے گاندھی برابر ایسے کاموں میں مشغول رہے جو اصلاح عام میں غیر سیاسی تھے لیکن اس کے باوجود وہ اہم کام تھے مثلاً دیہاتوں میں صاف پانی کی فراہمی، سستی اور صحت بخش غذا، ایک معقول نظامِ تعلیم، اور صحت مند اور خود کفیل معیشت۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ اپنی تمام خامیوں کے باوجود کیا یہ نیا آئین دیہاتوں کے فلاح و بہبود کے اِن منصوبوں کو آگے بڑھا سکے گا۔؟ آخر صوبوں میں کانگریسی وزارتیں دیہی صنعتوں کو فروغ دینے، نشہ بندی جاری کرنے، کسانوں کا بوجھ کم کرنے، گھر کے کتے ہوئے کپڑے کے استعمال کو فروغ دینے، تعلیم کو بڑھاوا دینے اور چھوت کا مقابلہ کرنے کا کام کیوں انجام نہیں دے سکتیں؟

غالبًا ایک اور خیال بھی اُن پر اثر انداز ہوا۔ پچھلی دو دہائی میں انھوں نے تین بڑی سول نافرمانیوں کی تحریکیں چلائیں۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ ان تحریکوں کے زیر اثر کس طرح سیاسی

(1) ہری جن: یکم مئی 1937ء

بیداری کا ارتعاش پیدا ہو گیا تھا، لیکن انھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اہنسا کی روح بہت آہستگی سے لوگوں کے دلوں میں پیوست ہو رہی تھی اور بعض اوقات اُن کے قریب ترین دوست بھی ستیہ گرہ کی عائد کردہ پابندیوں پر جز بز ہو جاتے تھے اور تشدد نہ صرف پوشیدہ دکھائی دے رہا تھا بلکہ سطح کو بالکل چھوڑ رہا تھا اور غیر متوقع طور پر اُبل پڑتا تھا۔ ستیہ گرہ تحریک شروع کرنے کے لیے جو ماحول ضروری ہے، وہ آسانی سے پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ملک میں بے اطمینانی بڑھتی جا رہی تھی۔ نئے آئین میں ہندوستان کی آزادی کا دور تک نشان نہیں تھا لیکن اس نے تین کروڑ رائے دہندوں کے حلقہ ہائے انتخاب قائم کر دیے تھے اور وہ کروڑوں افراد جنھیں ابھی حق رائے دہندگی ملنا تھا انھیں بھی صوبائی حکومتیں متاثر کر سکتی تھیں۔ گاندھی نے لکھا ہے کہ ''نئے آئین کو تلوار کی حکومت کی جگہ اکثریت کی حکومت کی سمت ایک قدم سمجھا جا سکتا تھا، چاہے یہ کوشش کتنی ہی کمزور اور محدود کیوں نہ ہو۔ انھوں نے یہ بات سمجھائی کہ ''اگر کانگریس نئے آئین کو اپنی منزلِ آزادی کے حصول کے لیے استعمال کرے تو یہ ایک خونی انقلاب اور عوامی سول نافرمانی تحریک سے بچ سکتی ہے۔''

اس طرح دیکھیے تو مارچ 1937 میں کانگریس کی جانب سے اس شرط پر وزارتیں قبول کرنے کی پیش کش کہ گورنر اس بات کا یقین دلا دیں کہ وہ روزمرہ کے کاموں میں مداخلت نہیں کریں گے۔ گاندھی کی اس خواہش پر مبنی تھی کہ نئے آئین سے کوئی عملی پہلو نکالا جائے اس پر نہ تھی کہ حکومت کے لیے کوئی جال بچھایا جائے۔ سرکاری ترجمانوں نے پہلے تو یہ لائن اختیار کی کہ اس طرح کی یقین دہانی یا ''شریفانہ مفاہمت'' آئین کی روح کے منافی ہوگی اور گورنروں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے قانون کے شرائط کے خلاف کوئی مجاہدہ کر لیں یا اُن کو کوئی ہدایتی فرامین جاری کیے جائیں۔ بہرصورت حکومت پر یہ تو ظاہر ہی ہو گیا کہ کانگریسیوں کا ایک طبقہ وزاتیں قبول کرنے کو بالکل آمادہ ہے اور کسی طرح کی یقین دہانی کے بغیر ان کے لیے وزارت سازی ممکن نہ ہو سکے گی۔ جو عارضی وزارتیں کانگریسی اکثریت کے صوبوں میں قائم کی گئی تھیں وہ مجالس قانون ساز کے پہلے ہی اجلاس میں مخالف ووٹ سے گر جائیں گی۔ حکومت کے سامنے یہ دوسرا راستہ تو ہمیشہ کھلا تھا کہ وہ آئین کو معرض التوا میں ڈال دے لیکن جس آئین پر برطانوی سیاست دانوں اور پارلیمنٹ نے اتنی محنت کی ہو اُس کے لیے یہ غلط ابتدا ہوگی۔

اگست 1936 میں لارڈ لن لتھ گو نے ایک ہندوستانی ملاقاتی سے کہا تھا کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ایک نشان (کاما) بھی بدل نہیں سکتے[1] ایک حد تک یہ صحیح تھا لیکن یہ ایسی حد بندی نہیں تھی جسے حادثۂ عظیم سمجھا جاتا۔ خود اہل برطانیہ پر جس آئین کی حکمرانی تھی اس کا سرچشمہ کوئی قانونی دستاویز نہیں تھا بلکہ روایات کا ایک سلسلہ تھا جو اُن کے آئین کو چلانے کے لیے ارتقائی منزلوں سے گزرا تھا۔ نئے آئین کے بارے میں گاندھی کا نقطۂ نظر نہ تو آئینی وکیل کا تھا اور نہ سیاسی حکمت عملی کی تشکیل کرنے والے کا۔ انھوں نے 4 ستمبر 1937 کے ''ہری جن'' میں لکھا تھا کہ: میں نے ایکٹ (گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ) کا اس وقت تک مطالعہ نہیں کیا تھا جب میں نے وزارتیں قبول کرنے کی رائے دی۔ اُس کے بعد میں پروفیسر کے ٹی شاہ کتاب (صوبائی خود مختاری) کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ مجھے ایکٹ میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی جو کانگریسی وزیروں کو میرے تجویز کردہ پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے روک سکے۔ خصوصی اختیارات اور تحفظات کی ضرورت اُسی وقت پڑ سکتی ہے جب ملک میں تشدد ہو یا اقلیتی اور اکثریتی فرقوں کے درمیان ٹکراؤ ہو، یہ بھی تشدد کا دوسرا نام ہوگا۔''

گورنروں کی یقین دہانی پر مباحثے کا خاتمہ وائسرائے کے ایک طویل بیان سے ہوا۔ اس کو اس انداز سے تحریر کیا گیا تھا کہ کانگریس کے خدشات دور بھی ہو جائیں اور آئینی طور پر کچھ ہاتھ سے دیا بھی نہ جائے۔ لارڈ لن لتھ گو نے یہ یقین دلایا کہ گورنر اس بات کی ہر طرح کوشش کریں گے کہ اختلافات پیدا کرنے والا اشتعال نہ ہو بلکہ اس سے ہر طرح بچا جائے۔ اس بیان سے قانونی حیثیت تو نہیں بدلی لیکن حکومت پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مجالس قانون ساز میں ٹھوس اکثریت کی حمایت حاصل ہونے کی وجہ سے کانگریسی وزراء گورنروں کی مداخلت کو آسانی سے نظر انداز نہیں کریں گے۔ اگرچہ وائسرائے کا بیان مبہم تھا لیکن اس کا لہجہ مصالحانہ تھا۔ اس لیے کانگریس نے وزارتیں بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

چھ صوبوں بمبئی، یو پی (صوبہ جات متحدہ) بہار، سی پی (صوبہ جات وسطی)، اڑیسہ اور مدراس میں کانگریسی وزارتوں کا قیام ایک نمایاں کارنامہ تھا۔ ان صوبوں میں ایک ایسی پارٹی نظم

(1) جی۔ڈی۔ برلا In the Shadow of the mahatma (مہاتما کے سایے میں) ص:207

ونسق چلانے پر رضا مند ہوگئی تھی جس کا اٹل مقصد یہ تھا کہ برطانوی سامراج کا خاتمہ کر دیا جائے۔ عام خوف کے برعکس یہ تجربہ اتنا شعلہ بار نہیں تھا۔ کانگریسی وزیروں کا سارا وقت بحران پیدا کرنے کے بہترین طریقے تلاش کرنے میں نہیں بلکہ کانگریس کے انتخابی منشور میں مندرج اقتصادی اور سماجی پروگرام پر عمل درآمد کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ گاندھی کی دلچسپی اس پروگرام میں تھی اور وہ کانگریسی وزیروں کا کام اسی معیار پر جانچتے تھے۔ انھوں نے اِن (وزیروں) کو یہ مشورہ دیا کہ جن عوام پر وہ حکومت کر رہے تھے انھیں کی غریبی کو پیش نظر رکھ کر وہ اپنی نجی زندگیوں کو سادگی اور کم خرچی کا نمونہ بنائیں۔ انھوں نے اُن پر یہ زور دیا کہ وہ ''محنت، لیاقت، ایمان داری، غیر خبیہ داری اور تفصیلات پر عبور حاصل کرنے کی بے پایاں صلاحیت کو اپنی عادت بنائیں۔

نشہ بندی اور تعلیم یہ دو ایسے کام تھے جو گاندھی کے نزدیک کانگریسی وزیروں کے قانون سازی کے پروگرام میں خاص طور سے اہم تھے۔ چوں کہ وہ بذات خود بالکل پرہیز گار تھے۔ اس لیے نشہ بندی کی وکالت خود اُن کی محتاط زندگی کا عکس تو تھی ہی لیکن اس پر ان نیم گرسنہ کسانوں اور صنعتی مزدوروں کی بہبودی کے خیال کا بھی اثر تھا جو اپنی بے حد معمولی آمدنیوں کا ایک حصہ شراب خواری پر اُڑا دیتے تھے۔ درآں حال یہ کہ یہی رقم اُن کے بچوں کے لیے دودھ خریدنے کے کام آسکتی تھی۔ جب بمبئی کی کانگریسی وزارت نے نشہ بندی جاری کی تو گاندھی نے اس کو ''ہری جن'' میں مبارک باد دی اور بمبئی کے ان ''فیشن پرست شہریوں'' سے اپیل کی جو یہ سمجھتے تھے کہ انھیں نشہ آور مشروبات کی اسی طرح ضرورت ہے جیسے پانی کی، کہ اگر وہ خود اپنے لیے نہیں تو اپنے غریب بھائیوں کے مفادات کے بارے میں سوچیں۔

تعلیم کے معاملے میں گاندھی کے خیالات اُن کے ذاتی تجربات پر مبنی تھے۔ جنوبی افریقہ کے فونکس اور ٹالسٹائے فارم میں وہ بچوں کے لیے اسکول چلا چکے تھے۔ ان کا یہ اعتقاد قوی ہوتا گیا کہ علمی درس وتدریس کی قیمت ضرورت سے زیادہ لگائی گئی ہے اور کردار سازی اور عملی مہارت وسلیقہ مندی کو مناسب جگہ نہیں دی گئی ہے۔ خود اپنے بچوں کے لیے انھوں نے معلوماتِ عامہ اور محنت کی عظمت کے سبق کو کافی سمجھا تھا اور ان کے احتجاج کے باوجود اُن کی باضابطہ علمی تربیت گویا نہیں ہوئی تھی۔ وہ دستکاری کو ہمیشہ ہاتھ اور ذہن دونوں کی تربیت کا ایک قیمتی ذریعہ سمجھتے تھے۔ پھر

بھی انھوں نے یہ محسوس کیا کہ بچے بہت جلد جسمانی کام سے تھک جاتے تھے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ''پیشہ ورانہ اور ادبی تربیت کے بجائے پیشہ ورانہ تعلیم کے ذریعے ادبی تربیت ضروری تھی۔ اس طرح پیشہ ورانہ تربیت خلاف مزاج کام نہ رہ جائے گا اور درسی تربیت میں نئی معنویت اور افادیت آجائے گی۔''

اکتوبر 1937 میں گاندھی نے اپنے خیالات ایک تعلیمی کانفرنس کے سامنے رکھے۔ یہ کانفرنس وردھا میں منعقد ہوئی اور اس میں کانگریسی وزیروں کے علاوہ کئی نمایاں ماہرین تعلیم نے شرکت کی۔ ان کی تجویز یہ تھی ہندوستانی دیہاتوں کے لیے بہترین تعلیم وہی ہوگی جو کسی بنیادی دستکاری کے ذریعے سے دی جائے۔ ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو۔ ابتدائی تعلیم کا ایک سات سالہ نصاب تیار کیا جائے۔ اور اسکولوں میں جو دستکاری کی چیزیں بنائی جائیں اُن کی فروخت سے تعلیم کو کم از کم جزوی طور پر خود کفیل بنایا جائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی سربراہی میں ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی نے ان خیالات کی بنیاد پر، ابتدائی تعلیم کی ایک اسکیم تیار کی، کمیٹی نے ایک ایسے نصاب تعلیم کے بیرونی خطوط تیار کیے جن کی بنیادوں پر، بچوں کو کسی صنعت یا دستکاری کی وساطت سے زندگی کے ٹھوس حقائق یا بچے کے سماجی اور طبیعاتی ماحول کے بارے میں تعلیم دی جاسکے کمیٹی نے قبل اسکول تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرنے کے باوجود اسے مالی اعتبار سے خارج از بحث قرار دیا۔ اسکول جانے کی عمر سات سال سے چودہ سال رکھی گئی۔ درسی تعلیم اتنی دی جانے والی تھی کہ (بچہ) پھر ناخواندگی کی طرف عود نہ کرجائے اور دستکاری یا صنعت جس کے ذریعے سے اُسے تعلیم دی گئی ہے ایسی ہو کہ اگر بچہ اسکول چھوڑنے کے بعد چاہے تو اُسے پیشے کی حیثیت سے اختیار کرسکے۔

''وردھا تعلیمی اسکیم'' (جو بعد میں ان تجاویز کا نام پڑ گیا) سے ہندوستانی تعلیم کے بند پانی میں لہریں اُٹھنے لگیں اور حکام اور ماہرین تعلیم نئے اور ترقی پسندانہ طریقوں پر سوچنے پر مجبور ہوئے۔ اسکیم کے ناقدین بھی تھے، کیا اس میں علمی تربیت کو جسمانی کام پر قربان نہیں کیا گیا تھا؟ کیا اسکول کے اساتذہ کا کام غلاموں کی نگرانی تھا؟ گاندھی نے وضاحت کی کہ اسکیم کا اصل مقصد دستکار پیدا کرنا نہیں تھا بلکہ دستکاری میں جو ذرائع خوابیدہ تھے اُن کو تعلیمی مقاصد کے لیے بروئے کار لانا تھا۔ یہ بھی مقصد نہیں تھا کہ اسکول میں بھدی چیزیں بڑے پیمانے پر پیدا کی جائیں۔ بہرحال، ایک حد تک اہلیت تو

ناگزیر تھی ہی۔ اور اگر دستکاری کی اشیاء کی فروخت سے اتنا مل جائے کہ اساتذہ کی تنخواہ پوری ہو جائے تو یہ کافی تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ایسے علم کے بدلے جو کتابی اور سیماب صفت ہونے کے لیے بدنام تھا اور جسے دیہاتی بچے اسکول چھوڑتے ہی بھول جاتے تھے جو اُن کی روزمرّہ کی زندگیوں میں کام نہیں آتی تھی، اُن کے ہاتھوں اور آنکھوں کے ذریعے ایک مربوط تربیت فراہم کی جائے۔

اگر گاندھی نے اپنی توجہ بچوں کی تعلیم تک محدود رکھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کی طرف سے بے پرواتھے۔ وہ اُن مشکلات کو بھولے نہیں تھے جو ہائی اسکول اور کالج کے دنوں میں انھیں انگریزی زبان کی من مانی قواعد وہجا کے سلسلے میں پیش آتی تھیں۔ کس طرح انھیں تین برس اسی کام میں لگ گئے کہ جو کچھ وہ پہلے گجراتی میں سیکھ چکے تھے اُسے وہ پھر سے انگریزی میں ہضم کریں۔ انگریزی زبان نے چھوٹی سی قصباتی تعلیم یافتہ اقلیت اور عام جنتا کے درمیان ایک ناقابلِ عبور رکاوٹ کھڑی کر دی تھی۔ گاندھی نے لکھا کہ ''ہائی اسکول انگریزوں کی ثقافتی فتح کے اسکول ہیں۔'' انھیں اس حقیقت سے انکار نہیں تھا کہ انگریزی کے پاس بہت بڑا ادبی خزانہ ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ ''(انگریزی) ادب کی امارت سے ہندوستانی قوم اسی طرح استفادہ نہیں کرسکتی جس طرح انگلستان کی معتدل آب وہوا اور مناظر سے ہندوستان کو اپنی ہی آب وہوا، مناظر اور ادبیات میں پھلنا پھولنا ہے چاہے وہ انگلستان کی آب وہوا، مناظر اور ادبیات سے فروتر ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم کو اور ہمارے بچوں کو اپنی وراثت کی تعمیر خود کرنا چاہیے۔ ہم بدیشی آذوقے پر پنپ نہیں سکتے۔''[1] اور یہ کیوں فرض کر لیا جاتا تھا کہ بے انگریزی جانے ہوئے ہماری رسائی ادب تک نہیں ہوسکتی؟ ہندوستانیوں کو ٹالسٹائے کے پڑھنے کے لیے روسی زبان نہیں پڑھنا پڑا، اور جاپانیوں نے شیکسپیئر پڑھنے کے لیے انگریزی نہیں سیکھی۔

اگرچہ گاندھی سے اس امر میں اختلاف ممکن ہے کہ بچے کی تعلیم میں دستکاری کی اہمیت کس حد تک ہونا چاہیے یا ''بنیادی تعلیم'' کے نصاب کی تفصیلات کیا ہوں۔ لیکن وہ ہندوستان کے نظامِ تعلیم کی تشکیل کا جو جذبہ رکھتے تھے۔ اس کی ضرورت مدتوں سے تھی۔ مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا، ہندوستانی اسکولوں میں رٹنے رٹانے کا جو رواج تھا اس کی جگہ تعلیم کو پیشہ ورانہ رخ دینا، اور

(1) ہری جن: 9/جولائی 1938ء

نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلیاں لانا جو بچے کے ماحول سے مناسبت رکھتے ہوں، فائدہ بخش اصلاحات تھیں۔اُن (گاندھی) کی پُرزوروکالت سے اِن میں جان پڑ گئی۔

کانگریسی وزیروں نے جن بہت سے شعبوں میں حالات کوسُدھارنے کی کوشش کی اُن میں تعلیم بھی تھی۔زمینداروں کے مقابلے میں کسانوں کے مفاد کے تحفظ اور دیہی قرضوں کا بوجھ کم کرنے کے سلسلے میں قابل ذکر زرعی اصلاحات عمل میں آئی ہیں۔ پروفیسر کوپ لینڈ لکھتے ہیں کہ'کانگریسی وزارتوں کے زرعی قوانین جو جرأتمندانہ طور پر سوچے گئے اور تیزی سے پاس کیے گئے، قابل ذکر کارنامے ہیں۔''[1] اُن کی وضاحت کے مطابق،اس سلسلے میں پُرانی سرکاری حکومتوں کے ہاتھ اس لیے بندھے ہوئے تھے کہ اُن کے مویدین کی بڑی تعداد زمیندار طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔

ایسی سیاسی جماعت کے لیے جو مدت مدید تک حزب مخالف کی حیثیت سے کام کرتی رہی ہے۔اقتدار کی مسندوں پر بیٹھنے کا تجربہ انوکھا اور پُراز مشکلات تھا۔کانگریس کے بائیں بازو نے، جووزارتیں بنانے کا مخالف تھا،اندرونی اختلافات اور کانگریسیوں کے اپنے اپنے حلوے مانڈے کی دوڑ میں پھنس جانے کے خطرات کا زوردار طریقے پر اظہار کیا تھا۔گاندھی کے یہاں ملازمتوں اور وزارتوں کی استدعاؤں کی باڑھ سی آ گئی۔انھوں نے اس رجحان پر تعجب اور اذیت ظاہر کی کیوں کہ ان کی نظر میں مجالس قانون ساز اور وزارتیں ملک کی خدمت کے مختلف ذرائع میں سے ایک اور محدود ذریعہ تھیں۔وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ کانگریسیوں کی اکثریت کا اصل کام تو سماجی اور اقتصادی بہبود کے مختلف میدانوں میں اور دیہاتوں میں تھا۔بڑی نظام[2] حصول طاقت کے لیے جدوجہد اور دباؤ کی سیاست، جنھیں سیاسی جمہوریت کا حصہ مانا جاتا ہے، اُن کی نگاہوں میں غیر صحت مند طریقہ ہائے کار تھے۔''ہری جن'' کے صفحات میں انھوں نے کانگریسی صفوں میں بدعنوانیوں پر شدید ترین نکتہ چینی کی۔کانگریس ورکنگ کمیٹی نے رزولیوشن پاس کرکے روزمرّہ کے انتظامی امور میں پارٹی کے اراکین کو مداخلت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔انھوں نے لکھا کہ''میں اس حد تک جانے کو تیار ہوں کہ کانگریس کو خوش اسلوبی سے دفنا دیا جائے لیکن اس کے لیے تیار نہیں

(1) کوپ لینڈ، رجی نلڈ، (بازگوئی) ص:109

(2) سیاسی جماعت کا اندرونی ذی اختیار گروہ

ہوں کہ یہ بدعنوانیاں جو پھیلی ہوئی ہیں انھیں روا رکھوں۔'' صرف ممبر بن جانے سے کیا ہوتا ہے۔ ایک کروڑ کانگریسی جن کے دلوں میں تشدد اور جھوٹ بھرا ہو وہ سیاسی آزادی نہیں دلا سکتے لیکن دس ہزار ایسے کانگریسی جن پر مشتبہ ساتھیوں کو ساتھ لے چلنے کا بوجھ نہ ہو، وہ یہ مقصد پورا کر سکتے ہیں۔ ایک تجربہ کار خادم اور جنرل کی حیثیت سے ''وزارتوں کے مالِ غنیمت'' کے لیے ہونے والی جدوجہد پر اور گروہ بندیوں کی حریفانہ کارروائیوں میں طاقت ضائع کرنے پر انھوں نے اظہار ناپسندیدگی کیا۔

کانگریس کی اعلیٰ ترین سطح کے لیڈروں پر مشتمل ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ کے قیام سے کسی حد تک بدنظمی کا سدباب تو ہوا لیکن اس کے باوجود ایسے بحران آتے رہے جن سے یہ خطرہ ہوا کہ صوبوں میں کانگریس پارٹیوں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ ایک بحران اس وقت ہوا جب وسطی صوبے (سی پی) کے وزیراعظم ڈاکٹر این۔ بی کھرے نے کانگریس ہائی کمان کی اجازت لیے بغیر کابینہ میں ردّ و بدل کر لی۔ اُن کو استعفیٰ دینا پڑا۔ کانگریس ہائی کمان کے ناقدین نے اس پر یہ الزام لگایا کہ وہ اُس دھاگے کو کاٹ رہی ہے جو صوبائی وزیروں کو مجالس قانون ساز کے ذریعے ووٹ دہندگان سے باندھے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر اس طرح کا مرکزی کنٹرول نہ ہوتا تو کانگریسی اکثریت کے صوبے بھی ویسے ہی عدم استقلال اور چال بازیوں کی زد میں ہوتے جو بعض غیر کانگریسی وزارتوں مثلاً سندھ اور آسام میں دیکھنے میں آ رہی تھیں۔ وزارتوں پر مرکزی کنٹرول رکھنے کے لیے کانگریسی لیڈروں کے پاس بہت معقول دلائل تھے کیوں کہ آزادی کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اہنسا پر مبنی جدوجہد کے لیے بھی تنظیم (ڈسپلن) کم ضروری نہیں تھی۔ اگر کانگریس وزارتیں اوپر کے کسی کنٹرول کی پابند نہ ہوتیں تو مستقل مفادات سے مصالحت کا خطرہ لاحق رہتا۔

کانگریس کے مخالف کانگریس ہائی کمان کی طرف سے کانگریسی وزارتوں کی اس راہ نمائی کو اقتدار پسندی پر محمول کرتے۔ گاندھی نے الزام کا جواب دیا: ''لوگ کہتے ہیں کہ یہ خالص اور سیدھی سادی فسطائیت ہے، لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ فسطائیت ننگی تلوار ہے۔ اس کا دور ہوتا تو ڈاکٹر کھرے کو سر سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ کانگریس تو فسطائیت سے بالکل ہی متضاد ہے کیوں کہ یہ صاف اور غیر ملوث اہنسا پر مبنی ہے۔ اس کی طاقت کا سرچشمہ زرہ بکتر سے لیس سیاہ قمیص والوں کا کنٹرول نہیں ہے۔''(1)

(1) ہری جن، 6/اگست 1938

گاندھی کے طرز خیال وعمل میں فسطائیت سے زیادہ بیگانہ کوئی اور چیز ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اُن کی ساری زندگی، ہر روپ میں، تشدد کے خلاف ایک جدوجہد رہی ہے۔ نفرت کو محبت سے اور وحشیانہ طاقت کو روح کی طاقت سے بدلنے میں انھوں نے اپنے اوپر، پھر چھوٹے چھوٹے گروہوں پر اور آخر کار قومی سطح پر کئی تجربے کیے۔ سارے برطانوی دور حکومت میں یہ دستور رہا تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کو دبانے کے لیے پولیس اور فوج بلائی جائے۔ لیکن جب کانگریسی وزارتوں نے بھی یہی کیا تو گاندھی اپنا تعجب اور اپنی دل شکنی کے احساس کو چھپا نہ سکے۔ وہ سترہ برس تک کانگریس کو اہنسا کی تعلیم دیتے رہے۔ زیادہ تر کانگریسیوں نے اسے پالیسی کے طور پر اپنا لیا تھا اور بعض نے تو اسے اپنا عقیدہ ہی بنا لیا تھا۔ اگر وہ کروڑوں افراد جو کانگریس کے اتباع کا دم بھرتے تھے، اس پیغام کو دل وجان سے اپنا چکے ہوتے تو فسادات ہوتے ہی کیوں؟ انھوں نے سوال کیا کہ کیا اتنے بھی کانگریسی نہیں ہیں جو ''امن بریگیڈ'' بنالیں اور کٹر پنتھی بھیڑ بھاڑ کے جنون کی آگ کو خاموش کرنے کی خاطر خود اپنی جانیں لڑادیں۔ یہ 'امن بریگیڈ' جس پر گاندھی نے تفصیل سے اظہار خیال کیا تھا، بن نہیں رہے تھے کیوں کہ اس کے لیے ڈسپلن اور قربانی کے جس جذبے کی ضرورت تھی وہ بے حد کم یاب تھا۔ اس کے علاوہ اب فرقہ وارانہ فسادات مقامی جھگڑوں کی بنا پر نہیں ہو رہے تھے بلکہ ایسی سیاسی فرقہ پرستی کی علامت بن گئے تھے جو اگلی دہائی میں پورے ملک کو اپنے لپیٹ میں لے لینے والی تھی۔ مسلم لیگ 1937 کے انتخابات کے نتائج سے مایوس ہو کر اور کانگریس کے اس فیصلے سے چوٹ کھا کر کہ وہ صوبوں میں ملی جلی وزارتیں نہیں بنائے گی، ان برسوں میں ملک گیر افتراقی مہم چلا رہی تھی، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین خلیج اور وسیع ہو۔ پھیلے ہوئے کھنچاؤ اور تناؤ کی فضا میں، کافی اشتعال کی وجہ سے یا اس کے بغیر ہی بار بار فسادات پھوٹ پڑے۔ کانگریس وزراء اپنے قانون ساز پروگراموں میں بہت زیادہ مشغول تھے، دفتر کی الجھنوں سے پریشان تھے۔ نہ تو ان کے پاس وقت تھا اور نہ غالباً اعتقاد کہ وہ ''امن بریگیڈ'' بنائیں۔ اس لیے انھیں پولیس اور فوج کا سہارا لینا پڑا تا کہ قانون شکنی کرنے والوں سے نپٹا جا سکے۔

جب کانگریسی وزارتوں نے عہدے سنبھالے تھے اُس وقت نہ تو کانگریسی قائدین اور نہ

حکومت کو کوئی اندازہ تھا کہ صوبوں میں یہ نئی ساجھے داری عملی طور پر کیسے کام کر سکے گی۔ جانبین میں سے کسی کے لیے بھی یہ آسان نہیں تھا کہ وہ ٹکراو کی طویل تاریخ کو پس پشت ڈال دے لیکن روزمرہ کے مسائل میں ساتھ کام کرنے سے بعض دیواریں گرتی نظر آرہی تھیں۔ مہادیو دیسائی (گاندھی کے سکریٹری) نے جی۔ڈی۔ برلا کو لکھا کہ ''سوچیے تو کہ اب احمد آباد کے کمشنر گیرٹ، وزیر مرار جی کے استقبال کو اسٹیشن تک جاتے ہیں اور ان کے ساتھ کافی دور تک تیسرے درجے میں سفر کرتے ہیں۔''[1] صوبوں میں جو آئی۔سی ایس افسران کام کر رہے ہیں اُن میں تقریباً آدھے یوروپین تھے۔ اگرچہ ان کی تنخواہیں صوبے کی مالیات سے چارج کی جاتی تھیں اور ان کی ملازمتیں آئین کی رو سے محفوظ تھیں اُن میں سے بہتوں نے اپنے کو صوبائی خودمختاری اور اپنے نئے حاکموں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی رفتارِ کار ہر طرف تیز ہوگئی تھی۔ صوبائی سکریٹریوں میں نئے وزرا سماجی اور اقتصادی اصلاح کے لیے نئے قوانین کا مسودہ غیر معمولی عجلت سے تیار کرنے پر اصرار کر رہے تھے۔ ضلعوں میں نیا جمہوری ڈھانچہ روز بروز ایگزی کیوٹیو افسران کا زیادہ سے زیادہ وقت مانگ رہا تھا۔ مقامی سیاستداں روزمرہ کے انتظامی امور میں کچھ دخل اندازی بھی کر رہے تھے۔ برطانوی افسران دوسری دہائی میں اپنے کو دوعملی سے ہم آہنگ بنا چکے تھے۔

تیسری دہائی میں انھوں نے صوبائی خودمختاری سے اپنے کو ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی ظاہر ہے کہ موخرالذکر صورت میں انھیں کھلم کھلا زیادہ کوشش کرنا پڑی۔ ضلعوں میں فیاض مطلق العنانوں کا دور جب وہ برطانوی راج سے وفاداری کے صلے میں خطابات، زمینیں اور ملازمتیں بانٹتے تھے، اب باقی نہیں رہ گیا تھا۔ جن لوگوں کی پرورش شہنشاہی روایات کی فضا میں ہوئی تھی ان کے لیے یہ سب تسلیم کر لینا آسان نہیں تھا۔ آئی۔سی۔ایس کے ایک پرانے رکن فلپ میسن کے الفاظ میں اس کا لب لباب یہ تھا کہ ''ایسی جگہ خدمت کرنا جہاں آپ حکومت کر چکے ہوں بہت مشکل ہے۔''[2]

جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ''دریافت ہند'' میں لکھا ہے کہ ''39-1937 کی جزوی جمہوریت ہمیشہ جدال کے دہانے پر کھڑی رہتی تھی۔'' یوپی اور بہار میں سیاسی قیدیوں کی رہائی کے

---

(1) برلا، جی، ڈی In the Shadow of the Mahatma (مہاتما گاندھی کے سایے میں) ص:243

(2) دوکراف، فلپ: The Guardian دی گارجینس، لندن۔1955، ص:244

مسئلے پر اور اڑیسہ میں ایک قائم مقام گورنر کے تقرر پر بحران ہوئے۔ ہندوستانی ریاستوں کی طرف حکومت کی پالیسی اور وفاق پر کانگریس کے علانیہ اختلاف کے مسائل پر تو ایک مستقل نیم بحرانی کیفیت رہتی ہی تھی۔ صوبوں میں عوامی حکومتوں اور مرکز میں ایک مکمل متحکمانہ حکومت کے مابین اندرونی تضاد اپنی جگہ پر تھا۔ اس تضاد سے عجیب وغریب بے ربطیاں پیدا ہوسکتی تھیں۔ مثلاً یوپی حکومت کو حکومت ہند کے محکمۂ داخلہ کی توجہ اس امر کی طرف دلانا پڑی کہ مرکزی خفیہ محکمہ جواہر لال نہرو کے خطوط سنسر کر رہا تھا درآں حال یہ کہ یوپی کے وزیر اعلیٰ اور اُن کے ساتھی ان کی بے حد عزت واحترام کرتے تھے۔ اس واقعی یا احتمالی ٹکراؤ کے باوجود بہ حیثیت مجموعی گورنروں اور کانگریسی وزیروں کے مابین تعلقات نے ایک اطمینان بخش سطح پر استقلال کی صورت اختیار کر لی تھی۔ گورنروں نے دیکھا کہ اُن کے وزراء پرخلوص لوگ تھے اور کبھی کبھی تو بے حد لائق بھی تھے۔ وزیروں نے گورنروں کو اکثر معاون و مددگار پایا۔ تعلقات باہمی صوبے صوبے میں مختلف تھے۔ اگر بہت زیادہ گرم جوشی شاذ تھی تو کھلا تصادم بھی عام طور پر نابود تھا۔ پروفیسر کوپ لینڈ نے صورت حال کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے کہ ''بہ حیثیت مجموعی وزارتوں کا ریکارڈ ایسا تھا جس پر کانگریس جائز طور سے فخر کر سکتی تھی۔ اس کے لیڈروں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ کام بھی اتنا ہی اچھا کر سکتی ہیں جتنی باتیں اور نظم ونسق کے ساتھ ساتھ تحریک بھی چلا سکتے ہیں۔''

جواہر لال نہرو کے لفظوں میں ''ہندوستانی قوم پروری اور ایک غیر ملکی سامراجیت کے درمیان حتمی صلح تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پھر بھی 1939 کے موسم بہار میں حکومت اور کانگریس کے درمیان اَن بن ناگزیر نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ 20/جون 1939 کو جواہر لال نہرو نے غیر سرکاری قومی پلاننگ (منصوبہ بندی) کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے وائسرائے نے اکزیکیوٹیو کاونسل کے ممبر سر جگ دیش پرشاد کو لکھا کہ حکومت ہند قومی منصوبہ بندی کمیٹی کی مختلف سب کمیٹیوں کے لیے اعداد وشمار جمع کرنے میں مدد کرے۔ جولائی 1939 میں حکومت ہند نے اپنے اقتصادی امور کے مشیر ڈاکٹر گریگوری کو قومی منصوبہ بندی کمٹی کے جلسوں میں شرکت کے لیے نامزد کیا اور اس شرط کے ساتھ مطلوبہ معلومات فراہم کرنے پر رضا مندی ظاہر کی کہ یہ معلومات مفاد عامہ کے مطابق فراہم کی جاسکتی ہوں۔

مرورِ ایام کے ساتھ کانگریس اور حکومت کے مابین رخنہ اندازی کا امکان ہوسکتا تھا، لیکن اِسے اگر روکا نہیں تو ملتوی کیا جاسکتا تھا (کیوں کہ) کانگریس سماجی اور اقتصادی اصلاح کا شدید جذبہ رکھتی تھی اور حکومت شدید بین الاقوامی عدم استحکام کے دور میں صوبوں کے مستحکم نظم ونسق کو درہم برہم نہ کرنے کے لیے خود بھی دل سے کوشاں تھی۔

جنگ چھڑ جانے سے بحران تیزی سے آگیا اور کانگریس اور حکومت کے مابین ساجھے داری کا مختصر دور یکا یک ختم ہو گیا۔ اس منزل پر فرقہ وارانہ مسئلے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کیوں کہ جنگ اور بعد جنگ کے دور میں یہ سوال ایک معنی میں ہندوستانی سیاست پر حاوی ہو جانے والا بلکہ اس کی صورت مسخ کر دینے والا تھا۔

باب 42

پاکستان کا نقطۂ آغاز

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اس کے حل سے تقریباً مایوس ہو کر ہندو مسلم سوال کا نام ''وہ ابدی مسئلہ'' پڑ گیا تھا۔ سول نافرمانی تحریک سے فرقہ وارانہ اختلاف رائے دب گیا تھا لیکن گول میز کانفرنس نے اسے پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں صوبوں میں نئے آئین کے آغاز کے بعد فرقہ وارانہ اختلافات نئی بلندیوں کو چھونے، ہندوستانی سیاست کو نیا موڑ دینے، ہندوستانی قوم پروروں کی نصف صدی سے زیادہ کی محنت برباد کرنے، گاندھی کے محبوب خوابوں شکست کرنے اور ان کی زندگی کے آخری برسوں میں انہی پر ان کے اعتقاد کو سخت ترین آزمائش میں مبتلا کرنے لگے۔

ہندوستان کے لیے ہندو مسلم سوال نیا نہیں تھا۔ مسلمان پوری آبادی کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ تھے۔ ہندوؤں سے ان کا مذہبی اعتقادات، رواج، قوانین اور رسوم کے معاملے میں اختلاف تھا، لیکن دونوں فرقے ان اختلافات کو تسلیم اور قبول کرتے تھے، ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی حکمت میں کسی جھکی یا کٹر پنتھی حکم راں کے ہاتھوں غیر مسلموں کو نقصان بھی پہنچا ہو لیکن بہ حیثیت مجموعی عوام نے جیو اور جینے دو کی روح کے مطابق زندگی بسر کرنا سیکھ لیا تھا۔ ایک مشترکہ زبان، لباس اور ملک

کے مختلف حصوں میں یکساں رسوم نے باہمی میل جول کے عمل کو آگے بڑھانے میں مدد کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں فرقوں کی ثقافتی اور سماجی زندگی فرقہ وارانہ خطوط پر نہیں۔ منطقائی خطوط پر مختلف ہو گئی تھی۔ ایک بنگالی ہندو، پنجابی ہندو کے مقابلے میں بنگالی مسلمان سے قریب تر تھا اور گجراتی مسلمان، مدراسی مسلمان کے مقابلے گجراتی ہندو سے زیادہ یکسانیت رکھتا تھا۔

ہندوستان پر برطانوی فتح نے دونوں فرقوں کو ایک سطح، مشترک غلامی کی طرح پر لا کھڑا کیا تھا لیکن فتح کا عمل سمندری ساحلوں سے اندر کی طرف چلا تھا اس لیے مغربی ہندوستان کے مسلمان اکثریتی علاقے سب کے آخر میں متاثر ہوئے۔ تاریخ کے اس حادثے نے ہندوؤں کو مغربی تعلیم حاصل کرنے، جدید تجارت میں حصہ لینے اور اس طرح ایک ایسے ہندو متوسط طبقے کو ابھرنے کا موقع پہلے سے فراہم کر دیا جو سرکاری ملازمت، پیشوں اور تجارت سے آزوقہ حاصل کرتا تھا۔ بد قسمتی سے ۱۸۶۷ء کی بغاوت نے جسے بعض برطانوی مبصرین مسلم بغاوت قرار دینے کا رجحان رکھتے ہیں مسلمان متوسط طبقے کا فروغ روک دیا۔ مسلم فقہا نے مغربی تعلیم کے خلاف زور لگا کے سرکاری ملازمتوں کے لیے مسلمان نوجوانوں میں ایسے مقابلے کی صلاحیت کم کر دی۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں مسلم فرقے کی طرف حکومت کا نقطۂ نظر بدلنے لگا۔ متوسط طبقے کی جانب سے حکومت میں شرکت کا مطالبہ انڈیا نیشنل کانگریس کے ذریعے سے کیا جانے لگا اور یہ طبقہ اس وقت لامحالہ ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ اس مطالبے کے بعد حکومت کی پالیسی کی تشکیل جدید ہونے لگی۔ اس وقت سے مسلمان احتمالی باغی نہیں بلکہ امکانی حلیف کی حیثیت سے دیکھے جانے لگے۔ اس تشکیل جدید میں جس مسلم لیڈر نے سب سے اہم کردار ادا کیا وہ سید احمد خاں تھے۔ انہوں نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہ سن ستاون کا غدر، مسلمانوں کی بغاوت تھی ان مسلمان امراء کی خدمات کا ذکر کیا جنہوں نے حکومت برطانیہ کا وفاداری اور استواری سے ساتھ دیا تھا۔ انہوں نے علی گڑھ کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی اور مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے استفادے کی ترغیب دی۔ ایسے بھی موقع آئے جب انھوں نے حکومت کی نکتہ چینی کی لیکن ان کی تنقیدیں محتاط تھیں اور ناقد کی وفاداری شبہ سے بالاتر تھی۔ ان کے خدمات کا حکومت نے معقول صلہ بھی دیا۔ سید احمد خاں امپیریل لیجسلیچر کاؤنسل اور پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد

ہوئے اور انھیں 'سر' کا خطاب ملا۔

سر سید احمد خاں کی توجہات کا خاص مرکز اپنے فرقے کو سماجی اور اقتصادی حیثیت سے اونچا اٹھانا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی مسلمان سیاست کے گرداب بلا میں جا پھنسیں۔ اس کا سبب صرف یہ نہیں تھا کہ وہ برطانوی خیر خواہی کی بقا کے خواہش مند تھے بلکہ انھیں یہ خوف تھا کہ جمہوری نظام میں مسلمان مستقل طور سے گھاٹے میں رہیں گے۔ انہوں نے مسلمانوں میں یہ تبلیغ کی کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس سے الگ رہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنا زبردست اثر مسلمانوں کو قومی تحریک سے الگ رکھنے کے لیے ٹھیک اس وقت استعمال کیا جب یہ تحریک ابھی شروع ہی ہوئی تھی۔ وہی یہ سوالیہ نشان سامنے لائے کہ مسلم فرقے کی آزاد ہندوستان میں کیا حیثیت ہوگی اور آنے والے ساتھ برسوں تک یہ نشان ہندوستانی سیاست پر چھایا رہا۔ اگر برطانوی مطلق العنانی کو ہٹا کر ہندوستانی جمہوریت لائی گئی تو کیا اس سے ہندوؤں کو جو تعداد میں کہیں زیادہ ہیں مستقل فوائد حاصل نہ ہو جائیں گے؟ کیا یہ پانسوں کا کھیل تھا۔ (سر سید احمد کے الفاظ میں) جس میں ایک کے پاس چار پانسے ہیں اور دوسر کے ہاتھ میں صرف ایک؟ کیا برطانوی حکومت کے ہٹ جانے سے مسلمانوں کا کوئی فائدہ ہونے والا تھا؟

دوسرے نمایاں مسلم ماہر تعلیم اور سیاست داں، نواب وقار الملک، نے انتخابی اداروں کے قیام کی مخالفت کرتے ہوئے، اپنے ہم مذہبوں کے لیے یہ قطعی نتیجہ اخذ کرلیا۔ ''ہم تعداد کے اعتبار سے دوسرے فرقے کا صرف پانچواں حصہ ہیں اگر کسی وقت ہندوستان میں انگریزی حکومت کا وجود ختم ہو جاتا ہے تو ہمیں ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا۔۔۔ اگر اس سے بچنے کی کوئی ترکیب ہے تو یہی کہ برطانوی راج جاری رہے اور ہمارے مفادات کا تحفظ اس طرح ہوسکتا ہے کہ برطانوی حکومت باقی رہے۔''(1)

قوم پروروں کے لیے اس سوال کا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت تو بہتر ہوگی نہ بدتر۔ یہ فرض کر لینے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ آزاد ہندوستان میں سیاسی پارٹیاں فرقہ وارانہ تعلقات کی بنا پر کام کریں گی اور سماجی اور اقتصادی سوالات مذہبی اختلافات سے اوپر نہ اٹھ پائیں

(1) البیرونی، اے، ایچ Makers of Pakistan (بانیان پاکستان) ص109۔

گے۔ جمہوری نظام میں سب کو مذہبی آزادی، ثقافتی خودمختاری اور مواقع کی مساوات کی پوری گارنٹی دی جاسکتی ہے۔ بدقسمتی سے، اس طرز فکر کو وہ لوگ سمجھ نہیں پارہے تھے جو مستقبل کے ہندوستان کا تصور پستی وزبوں حالی کے علاوہ اور کسی شکل میں کر ہی نہیں سکتے تھے۔

ملک میں قوم پرورانہ جذبات کا جوش وخروش دیکھ کر جب انتخابی اصول کا تسلیم کیا جانا ناگریز معلوم ہونے لگا تو 1909 میں آغا خاں کی قیادت میں مسلمان قائدین کا ایک وفد وایسرائے کے پاس گیا اور ان سے یہ عرض داشت کی کہ مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کے نمائندے صرف مسلمان ووٹوں سے چن کر آئیں۔ یہ کہنا مشکل ہے (جب کہ مولانا محمد علی نے ایک بار تشریح کی تھی) کہ یہ وفد ''حسب الحکم وجود میں لایا گیا''لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرک بولڈ نے یہ ملاقات طے کرانے میں عملی مدد کی اور عام طور سے ایسے موقعوں پر جیسا ہوتا رہتا ہے اس کے برعکس لارڈ منٹو ایک اہم آئینی مسئلے پر یقین دہانیوں کے لیے کچھ زیادہ ہی آمادہ وتیار تھے۔

جداگانہ انتخاب کی منظوری، فتنہ انگیزیوں کا سبب بن سکتی تھی۔ یہ بات خود لارڈ چیمسفورڈ اور ایڈون مان ٹے گو نے تسلیم کی ہے یہ دونوں اس متحدہ رپورٹ کے مصنف تھے جس کی بنیاد پر گورنمنٹ آف انڈیا (ریفارمس) ایکٹ 1919 کی تشکیل ہوئی۔''عقائد اور طبقات کی بنا پر تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ ایسے سیاسی کیمپ بنا دیے جائیں جو ایک کے خلاف منظم ہوں اور اس سے لوگوں کو یہ تعلیم ملتی ہے کہ وہ شہریوں کی بجائے جانب داروں کی طرف سے سوچیں۔ یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ یہ نظام آگے چل کر کبھی قومی نمائندگی میں تبدیل ہو سکے گا۔ برطانوی حکومت پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ لوگوں میں اس لیے تفریق ڈالتی ہے کہ ان پر حکومت کر سکے۔ لیکن اگر لوگوں کو اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کی راہ پر لگاتے وقت ہی، یہ بے ضرورت انھیں تقسیم بھی کر دے تو اس کے لیے ریاکاری یا تنگ نظری کے الزام کا جواب دینا مشکل ہوگا۔

یہ صرف سنجوگ نہیں تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ جو آخر کا مسلم علیٰحدگی پسندگی کی ترجمان بن گئی۔ ۱۹۶۰ء میں قائم ہوئی اور اس کے بانیوں میں آغا خاں اور وایسرائے کے پاس جانے والے وفد کے نمایاں افراد تھے۔ اس طرح جداگانہ انتخابات مسلم فرقے کو قومی زندگی کے عام دھارے سے الگ

تھلگ کرنے میں اورزیادہ معاون بنے۔

1919-18 کی عالمی جنگ کے فوراً پہلے یہ علیٰحدگی عارضی طور سے منقطع ہوئی۔بدقسمتی سے اس میں قومی جذبے کا اتنا دخل نہیں تھا جتنا ترکی اور مشرقی وسطیٰ کی دوسری ریاستوں کی مشکلات کا جس نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے جذبے کو ابھارا۔اس کے نتیجے میں جو اتحاد ہوا وہ 1916 کے کانگریس۔لیکن معاہدے کی شکل میں رونما ہوا۔بعد میں گاندھی کی قیادت میں عدم تعاون کی تحریک کی صورت میں اس نے ٹھوس شکل اختیار کی۔متحدہ قیادت سے بھی معیاروں کا اختلاف دور نہ ہوسکا۔جہاں ہندو زیادہ تر سیاسی پیرائے میں ہندوستان کی خوداختیاری حکومت کے حصول کے لیے سوچتے تھے۔خلافت والے زیادہ ترکی کی قسمت کے بارے میں سوچتے تھے۔مسلم قائدین برطانوی حکومت کو برا بھلا کہتے تھے لیکن اس ملامت کی بنیاد علما کے فتاویٰ پر ہوتی تھی۔مذہبی جذبات کو اپیل کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔اس کا استعمال دوسرے فرقوں کے خلاف بھی ہوسکتا تھا۔اس کے علاوہ یہ جذبہ ایک رومانی تصور سے جڑا ہوا تھا جس کو خود ترکوں نے بہت بدنام کرکے خاتمہ کردیا۔اس طرح مسلمانوں کو قومی تحریک میں سرگرمی سے لانے کا واحد اور اہم اور کامیاب تجربہ مسلمان متوسط طبقے کی نفسیاتی علیٰحدگی پسندی کا خاتمہ کرنے میں ناکام رہا بلکہ ان میں یہ رجحان اور قوی ہوگیا کہ وہ سیاسی مسائل کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھیں۔

جب 1924 میں گاندھی جیل سے باہر آئے تو انھیں یہ دیکھ کر دھچکا سا لگا کہ ہندو مسلم اتحاد کا تانا بانا جو انھوں نے اتنی محنت سے تیار کیا تھا ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔فرقہ وارانہ مناقشات میں غیر معمولی تلخی آ چکی تھی۔گاندھی کی 23-1919 کی تحریکوں میں نچلا متوسط طبقہ سیاسی گرداب میں نہ نکلا تھا اور انیسوسوبیس کے آس پاس والے قائدان نئے سامعین کو بہکا رہے تھے۔یہ معلوم ہو رہا تھا کہ مناقشات خلوتوں سے سڑکوں پر آ گئے ہیں۔سیاست کو اس طرح عامیانہ بنانے میں پریس کا ایک حصہ، خاص کر ہندوستانی زبانوں کا پریس، نہایت شرمناک رول ادا کر رہا تھا۔اسی زمانے میں گاندھی نے اخبار نویس کو ''چلتا پھرتا طاعون'' کہا تھا کیوں کہ یہ ''جھوٹ اور تہمت تراشی کے وبائی امراض پھیلاتے ہیں۔''

گاندھی نے اس پاگل پن کی کھل کر برائی اور انسانی شائستگی اور رواداری کی اپیل کی، برت

رکھا، دعائیں مانگیں، لیکن یہ سب بے سود رہا۔ ان کی آواز جو ایک زمانے میں اتنی طاقت ور تھی، طرفین کے متعصبین کے فرقہ وارانہ طعن و تشنیع کے شور وغل میں دب کر رہ گئی۔ یہ دونوں ان پر اپنے مخالفین کی جانبداری کا الزام لگاتے تھے۔

انیس سو بیس کے آس پاس محبوب ترین حل یہ سمجھا جاتا تھا کہ آل انڈیا پارٹیز کانفرنس کر کے فرقہ وارانہ معاہدہ کر لیا جائے۔ 1916 کے معاہدۂ لکھنؤ کی نظیر بھی موجود تھی۔ دلیل یہ تھی کہ اگر لیڈروں کے درمیان ایک بار فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہو جائے تو اس کا اثر عوام تک نفوذ کرے گا۔ اتحادی کانفرنسوں اور آل پارٹیز کانفرنسوں کا جو سلسلہ اس کے بعد قائم ہوا اس میں بے روح یکسانیت اور نقالوں کے تماشے کی جھلک تھی۔ بہت سی سیاسی جماعتوں اور مذہبی اداروں کے لیڈر جمع ہوتے اور خیر خواہی کی دھواں دھار جذباتی تقریریں ہوتیں۔ جب وہ ملازمتوں اور مجلس قانون ساز میں نشستوں کی تقسیم کرنے بیٹھتے تو گویا سوراج کی مال غنیمت کی تقسیم کرانا مشکل ہوتا۔ ایسے مباحثوں کے بعد جن میں روشنی سے زیادہ گرمی ملتی۔ یہ حضرات باہمی طعن و تشنیع کی آتش بازیاں چھوڑتے ہوئے تتر بتر ہو جاتے۔ یہ بات ہی نا قابل تصور تھی کہ ایسے مختلف الخیال گروہ کسی بات پر بھی راضی ہو سکیں گے لیکن مباحثوں کے گرداگرد ایک بنیادی عدم واقعیت (کی فضا) ہوتی۔ وہ ساری طاقت اور سرپرستانہ امداد جس کو بانٹنے کے لیے یہ لوگ بیٹھتے تھے وہ واقعۃً برطانوی حکومت کے اختیار میں تھی۔ گاندھی کو یہ پست نظری کی سیاست ناپسند تھی۔ لیکن وہ ہندوؤں کی فیاضی سے مسلمانوں کے خوف کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے ہندو سیاستداں خاص کر پنجاب اور بنگال کے، فیاضی کے اتنے ہی نااہل تھے جتنے کہ مسلمان سیاست داں اعتماد کے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو جو کچھ مستقبل کے خوف کے پیش نظر بیمے کے طور پر دینا تجویز کیا جا رہا تھا وہ ہندوؤں کی نگاہ میں پچّر کا نوکیلا سرا تھا۔

اتحادی کانفرنسوں ہی کا نمونہ گول میز کانفرنس کے دوسری اجلاس میں دہرایا گیا جس میں گاندھی شریک ہوئے تھے۔ لیکن حکومت نے لندن میں مندوبین نے جو بھان متی کا کنبہ جوڑا تھا وہ کسی حل پر متفق نہ ہو سکا۔ چونکہ آئین سازی عدم موافقت سے ٹکرا کر چور چور ہو جانے والی تھی اس لیے حکومت نے خود ایک حل عائد کرنے کا فیصلہ کیا۔ برطانوی وزیر اعظم نے یہ طے کرنے کے لیے مجالس قانون ساز میں نمائندگی کا طریقہ اور تعداد کیا ہو، ایک کمیونل اوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) جاری کیا اور اسی اوارڈ

کی بنیاد پر نیا آئین اپریل ۱۹۳۷ء کو نافذ ہوگیا۔ اوارڈ میں مسلم ترجمانوں کی خاص مانگیں مان لی گئی تھیں۔ انڈیا نیشنل کانگریس کے لیے فرقہ وارانہ حق رائے دہندگی (جداگانہ انتخابات) کو مستقلاً مسلط کر دینا کراہت آمیز تھا لیکن کانگریس نے طے کیا کہ جب تک کوئی بہتر حل نہیں نکل آتا جو تمام فرقوں کو قبول ہو، اس وقت تک کے لیے اسے نامنظور نہ کیا جائے۔ کمیونل اوارڈ ''بستہ بند حل'' ( ) کی حیثیت سے جو بھی خامیاں رہی ہوں لیکن شاید یہ امید رہی ہو کہ اس سے فرقہ وارانہ اختلاف ختم ہو جائیگا اور عوام کی طاقت تعمیری کاموں پر صرف ہونے کے لیے آزادنہ اختلاف ختم ہو جائے گا اور عوام کی طاقت تعمیری کاموں پر صرف ہونے کے لیے آزاد ہو جائے گی۔

واقعات نے ظاہر کیا کہ آنے والے دس برسوں میں فرقہ وارنہ اختلاف گھٹنے کے بجائے ایک طوفان کی طرح پھیلے اس نے بہت سے وہ نشان راہ بھی مٹا دیے جن کی نگاہیں عادی تھیں۔ اس دس برس کی تاریخ مسٹر ایم اے جناح (محمد علی جنا) کی سیاست اور شخصیت کے ذکر کے بغیر سمجھی نہیں جاسکتی۔ یہ بات تو غالباً فطری تھی کہ برطانوی حکومت کے آخری سالوں میں فرقہ وارانہ اختلافات نئی بلندیاں چھولیں گے۔ سیاسی اصلاح میں یہ جنگ وراثت تھی لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ اگر جناح کی شخصیت اس پر اثر انداز نہ ہوتی تو فرقہ وارانہ مسئلہ ہندوستانی سیاست پر اس طرح حاوی ہوسکتا۔

جناح گاندھی سے عمر میں چھ برس چھوٹے تھے۔ انھوں نے بھی انگلستان میں قانون کی تعلیم پائی تھی لیکن گاندھی کے برعکس، قانونی مطالعات کے علاوہ ان کی دلچسپی سیاست میں تھی مذہب میں نہیں۔ جناح نے اپنی جوانی میں دادا بھائی نوروجی کا اثر قبول کیا تھا۔ وہ گوکھلے کے دوست تھے اور انھوں نے بمبئی میں وکالت اور سیاست کا آغاز کیا۔ اپنی عمر کی چوتھی دہائی میں وہ سیاستدانوں کی صف اول میں آ چکے تھے اور 1916 کے لکھنؤ معاہدے کی تشکیل میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ یہ معاہدہ کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک پلیٹ فارم پر لے آیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا جاتا تھا۔ انہوں نے 1916 میں کہا تھا کہ ''ایک نئی روح جاگ اٹھی ہے'' اور یہ اضافہ کیا تھا کہ ''ایک حقیقی نئے ہندوستانی کے ابھرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی باتیں چھوڑ دینی ہوں گی۔ ہندوستان ابھی غیر منفک ملک ہے۔ اسے چھڑانے و آزاد کرانے کے لیے تمام ہندوستانیوں کو نہ

(1) خودنوشت سوانح عمری: ص100، 104

صرف اپنی سب اچھی چیزیں قربان کرنی ہوں گی بلکہ وہ بری باتیں بھی چھوڑنی پڑیں گی جن سے وہ اندھوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔یعنی ان کی نفرتیں،ان کی تفریقیں،ایسی باتوں پرفخر جن پرشرم آنا چاہیے،ان کے جھگڑے ان کی غلط فہمیاں۔''[1]

امپیریل لیجسلیٹو کانفرنس کے اندر ہو یا اس کے باہر، بیشتر سیاسی مسائل پر ان کے نقطۂ نظر میں قوم پروری کی طرح جھلکتی تھی۔وہ ہوم رول تحریک میں شامل ہوئے اور جرمنی کے خلاف جنگ میں حکومت برطانیہ کی صرف اس شرط پر حمایت کرنے کو تیار ہوئے کہ پہلے ہندوستانی خودمختار حکومت کی مانگ مان لی جائے۔1919 میں جناح نے راولٹ بل کی علامت کی اور اسی بل کی وجہ سے گاندھی ایک وفادار سے ایک باغی بن گئے۔انھوں نے (جناح) نے پنجاب میں حکومت کی پالیسی اور ترکی کی طرف اس کے روپے کی تنقید کی لیکن وہ گاندھی کی تحریک میں شامل نہیں ہوئے بلکہ جیسے ہی گاندھی انڈین نیشنل کانگریس کی رایوں پر غالب آنے لگے، جناح نے کانگریس چھوڑ دی۔بہت سے دوسرے معقول لیڈروں کی طرح جناح کو یہ پسند ہوتا کہ کانگریس بہتر تعلیم یافتہ (اور خوش پوشاک) ہندوستانی دانشور حضرات خدا کی ایک غیر سرکاری پارلیمنٹ بنی رہتی جس میں یہ لوگ حالات حاضرہ پر خالص شاہی انگریزی میں بحث ومباحثہ کرتے اور ہندوستانی پریس اور برطانوی حکومت کی اطلاع کے لیے رزولیوشن پاس کرتے۔ایک بار (دسمبر 1918) میں جناح نے خدمات سے سبکدوش ہونے والے گورنر لارڈ ولنگڈن کے اعزاز میں ایک عام جلسے کے انعقاد کو روکنے کے لیے ایک مظاہرے کی قیادت کی تھی۔لیکن جس بلند،تقریباً ہمالیائی،وجاہت سے اس زمانے میں جناح کو سیاسی کھیل کھیلنا پسند آتا تھا،اس سے ہٹی ہوئی یہ واحد لغزش تھی۔جب گاندھی نے اپنی تحریک کا دائرہ بڑھا کر اس میں قصبوں اور دیہاتوں کے کروڑوں افراد کو شامل کرنا چاہا تو جناح نے محسوس کیا کہ تباہی کی جانب مارچ شروع ہو چکا ہے۔انھوں نے لکھا کہ ''میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ اس کے عواقب کیا ہونے والے ہیں''۔

گاندھی کی سیاست ہی جناح کو ناگوار طبع نہیں تھی بلکہ گاندھی کے ذہن کی مذہبی ساخت،ان کی تجزیہ نفس کی عادت،سچائی اور اہنسا جیسے تجریدی تصورات پر ان کا زور دینا،ان کا جانا بوجھا

(1) بولی تھو،ہیڑا جناح،65

انکسار، ان کی رضا کارانہ غربت، یہ سب جناح کی ذہنی ساخت کے لیے بیگانہ تھے اور سیاسی اعتبار سے بے محل یا بالکل ہی ریا کاری معلوم ہوتے تھے۔ ایسے اشارے بھی ملتے ہیں کہ جناح کے دل میں یہ شکایت بھی تھی کہ گاندھی نے انھیں نامناسب طور سے سیاسی اسٹیج کی صف اول سے کنارے ہٹا دیا تھا۔ لوئی فشر نے لکھا ہے کہ جناح نے ان سے یہ کہا تھا کہ ''نہرو ہوم رول سوسائٹی میں میرے ماتحت کام کرتے تھے۔ معاہدۂ لکھنؤ کے وقت گاندھی میرے ماحت کام کرتے تھے۔'' اس میں کلام نہیں کہ 1916 میں وہ سیاسی طاقت کی حیثیت سے ختم ہو چکے تھے۔ بہت سے دوسرے لیڈروں کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوا تھا۔ جن ہندوستانیوں نے اب تک سیاست کا اثر قبول ہی نہیں کیا تھا ان کو گاندھی کی شخصیت اور تصورات نے جس شدت احساس کے ساتھ متاثر کیا۔ وہی اس تبدیلی ماحول کا سبب تھا۔

1920 کے آس پاس جناح مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک آزاد گروہ کی قیادت کر رہے تھے جو کانگریس اور حکومت کے مابین توازن قائم رکھتا تھا۔ یہ کردار وہ استادانہ مہارت سے ادا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے کو حکومت یا کانگریس سے وابستہ نہیں کیا اور اگرچہ وہ فرقہ وارانہ اتحاد کی وکالت کرتے تھے لیکن تعاون کے لیے وہ برابر قیمت بڑھاتے رہے۔ نہرو رپورٹ میں فرقہ وارانہ مسئلے کا جو حل پیش کیا گیا تھا وہ بڑی حد تک جناح کی مخالفت کی وجہ سے 1928 میں موت کی نیند سو گیا۔ تیسری دہائی کی ابتداء میں گاندھی کی سول نافرمانی کی تحریکوں سے اسی طرح کبھی خوش نہیں ہوئے جیسے دس برس پہلے عدم تعاون کی تحریک سے۔ گول میز کانفرنس میں وہ اپنا تنہا چلاتے رہے سیموئل ہور کے لفظوں میں وہ کسی کے ساتھ بھی مل کر کام کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کانفرنس کے بعد انھوں نے ہندوستانی سیاست کو تقریباً خیر باد کہہ دیا اور انگلستان میں رہنے لگے لیکن جیسے ہی نئے آئین کے تحت عوامی انتخابات کا زمانہ آیا وہ ہندوستان واپس آ گئے اور یہاں انھوں نے الیکشن میں مسلم لیگ کی قیادت کی۔ لیگ کو پانچ فیصد سے زیادہ مسلم ووٹ نہیں ملے لیکن اس تباہ کن شکست کے پانچ برس کے اندر اندر جناح نے ایسی مشاقی سے اپنے لیے ایک حیثیت بنا لی کہ ان پر یہ الزام لگایا جانے لگا کہ وہ ہندوستان کی آئینی ترقی پر ویٹو (حق نامنظوری) کا استعمال کر رہے ہیں۔

ابھی ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ گاندھی کا آشیرواد پا کر کانگریس نے 1937 کے موسم گرما میں

ان صوبوں میں وزارتیں بنالی تھیں جہاں اس کے ماننے والوں کی مجالس قانون ساز میں اکثریت تھی۔ کانگریس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ملی جلی وزارتیں نہیں بنائے گی۔ اس کے پاس معقول اکثریتیں تھیں اور وزارتوں میں بنے رہنے کے لیے اس کو کسی دوسری جماعت کی امداد کی ضرورت نہیں تھی۔ کانگریسی لیڈروں کو یہ بھی خطرہ تھا کہ مخلوط کابینے میں شاید مصالحتوں اور جھگڑوں کا سامنا ہو اور اس سے کانگریس کمزور ہوجائے۔ کیوں کہ کانگریس کو ابھی ملک کے لیے آزادی کی لڑائی جیتنی تھی۔ ان قابل لحاظ امور کے مقابلے میں یہ حقیقت بھی تھی کہ چار سو پچاس مسلم نشستوں میں سے کانگریس نے صرف اٹھاون نشستوں کے لیے امیدوار کھڑے کئے تھے ان میں سے بھی چھبیس ہی جیتے تھے۔ کانگریس نے وزارتوں میں مسلم ممبران مجالس قانون ساز کو شامل کیا، لیکن ان سے پہلے کانگریس کے عہد نامے پر دستخط کرائے۔[1] یہ فیصلہ گاندھی کے مشورے کے خلاف کیا گیا تھا اس کا جو بھی جواز رہا ہو لیکن اس سے مسلم لیگ کے لیڈر، خاص کر مسٹر جناح بہت رنجیدہ ہوئے۔ جداگانہ انتخابات جس پر وہ اتنے دنوں تک بھروسہ کئے بیٹھے تھے، اس کا صرف ایک نتیجہ نکلا کہ مسلمان کانگریس کے باہر رہے مگر اس سے مسلمانوں کو سیاسی طاقت میں موثر حصہ نہیں مل پایا۔

1937 سے جناح کی تحریروں اور تقریروں میں ایک نئی اشتعال انگیزی داخل ہوجاتی ہے۔ ایک نئی امید شکنی انھیں حکمت عملی کے ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی طرف لے جاتی ہے یہاں تک کہ وہ پاتال تک پہنچ جاتے ہیں۔ مسلم لیگ کے نمائندوں کے بغیر کانگریس وزارتوں کے قیام سے وہ قریب ترین کھونٹی مل گئی تھی جس پر مسلمانوں کے تمام واقعی اور تخیلی شکایات لٹکائے جاسکتے تھے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ''سچ بات یہ ہے کہ کانگریس برطانوی سنگینوں کے سائے میں ہندوستان پر اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔'' انہوں نے الزام لگایا کہ کانگریس مسلم لیگ کا محاصرہ کررہی ہے اور اس کے اتحاد کو توڑنا چاہتی ہے۔ کانگریس نے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لیے جو تجویز رکھی تھی اور جس کو گاندھی کی حمایت حاصل تھی، اس کا مذاق اڑاتے ہوئے انھوں

---

(1) جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ عام ممبران سے مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ جو کانگریسی وزراء تھے ان سے کانگریس کے عہد نامے پر دستخط کرانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ یہ سوال ان مسلم ممبران سے کیا گیا تھا جو کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہوکر نہیں آئے تھے۔ ان کے وزارت میں شامل کیے جانے کی یہ شرط تھی کہ وہ عہد نامے پر دستخط کریں مثلاً یو پی میں چودھری خلیق الزماں وغیرہ کا مسئلہ تھا۔ مترجم۔

نے کہا کہ ''یہ طفلانہ بات ہے کہ برطانوی حکومت سے کہا جائے پہلے تو وہ دوسرے ملک کے لیے مجالس آئین ساز بلائے اور بعد میں یہ عزت وافتخار حاصل کرے کہ ہندوستان کی اس اعلیٰ ترین مجلس کے بنائے ہوئے آئین کو برطانوی پارلیمنٹ کے رجسٹر قوانین میں درج کرے۔''(1)
گاندھی کو جناح نے اپنے نشانہ کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ وہ ''کانگریس کے واحد ڈکٹیٹر اور ترجمان'' تھے۔ روشنی ''ابھی تک سے گاؤں کے علاقے کے اندر طلوع نہیں ہوئی۔'' گاندھی کی کوشش یہ تھی کہ ''مسلمانوں کو غلام اور حلقہ بگوش بنا کر ہندو راج کے ماتحت لے آئیں۔ اور مسلمانوں کو ختم کردیں۔''

جناح مسلم سیاست دانوں سے سرسری سا برتاؤ کرتے تھے۔ متبعین اور مخالفین پر دھونس جمانا صرف مزاجی طرفگی نہیں تھی۔ ایک طرح کا غرور ہمیشہ ان کی خصلت میں داخل تھا اور ہمیں اس کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ ان کی امید کی شکستوں کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا تھا بہرصورت اس تاثر کو روکنا مشکل ہے کہ دھونس جمانے کی یہ کوشش بڑی حد تک ارادی تھی۔ یہ ایک نئی تکنیک تھی اور اس پر پروپیگنڈے کے ان طریقوں کا اثر تھا جو ہم عصر یوروپ میں ظاہری کامیابی کے ساتھ برتے جارہے تھے۔

ستمبر 1938 میں آزاد دنیا میونخ معاہدے کے فوراً بعد دوہری کشاکش میں مبتلا تھی۔ ایک طرف یہ اطمینان تھا کہ جنگ روک دی گئی اور دوسری طرف یہ احساس غم کہ اس کے لیے چیکوسلوا کیا کی جمہوریت کی قربانی دینی پڑی۔ جناح نے اس وقت کراچی میں عجیب وغریب تقریر کی۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی سوڈے ٹن جرمنوں سے تشبیہ دی۔ اہل برطانیہ کے مقابلے میں وہی لوگ کامیاب ہوسکتے ہیں جن کے پاس طاقت وقوت ہے اور جوان پر دھونس جمانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ میں ان (انگریزوں) کی توجہ اور یہاں کانگریسی ہائی کمان کی بھی۔ منعطف کرانا چاہوں گا اور ان سے کہوں گا کہ وہ دیکھیں، سبق لیں اور ذہن ودماغ میں تازہ اتھل پتھل اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے واقعات کو اچھی طرح ہضم کرلیں۔ چونکہ سوڈے ٹن جرمنوں کو

---

(1) احمد جمیل الدین RECENSSPEECHS KADWRIHNGS OF MR. JANAH مسٹر جناح کی تازہ تقریریں اور تحریریں، لاہور ۱۹۴۶ء، ص ۱۲۶۔

چیکوسلواکیا کی اکثریت کی ایڑیوں تلے روندا گیا۔انھوں نے ان پر ظلم کیے،ان کو دبایا۔ان سے برابرتاؤ کیا اور دو دہائیوں تک ان کے حقوق اور مفادات سے بری طرح اغماض کیا گیا۔اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ چیکوسلواکیا کی جمہوریہ کے ٹکڑے ہوگئے اور اب ایک نیا نقشہ بنانا پڑے گا۔[1] چیکوسلواکیا کے ایسے پر نازی جرمنی کے باہر کسی کا بھی فیصلہ سنانا عجیب وغریب تھا۔چاہے جناح کے مخالفین نے ''دیکھا،سبق لیا اور ذہن ودماغ میں ہضم کیا ہو یا نہ کیا ہو،لیکن خود جناح نے ضرور کیا۔انھوں نے دیکھا تھا کہ اندرونِ ملک نازی پروپیگنڈے سے کس طرح عوامی جذبات برانگیختہ ہوئے اور بیرونِ ملک مخالفت ختم ہوتی چلی گئی۔

کانگریس کے خلاف جناح کی مہم کی رفتار برابر تیز ہوتی گئی۔1939 کے موسم سرما میں انھوں نے اعلان کیا کہ نئے آئین کا صوبائی جز مسلم حقوق کے تحفظ میں کلیتہ ناکام رہا ہے۔چند دنوں بعد انھوں نے ''ایسے وسیع وعریض ملک میں جس میں مختلف قومیں ہوں،جمہوری نظام حکومت کی موزونیت'' پر شک وشبہ ظاہر کرنا شروع کیا۔انھوں نے گورنروں اور وائسرائے پر یہ الزام لگایا کہ جن صوبوں میں کانگریسی حکومتیں تھیں وہاں انھوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنے اختیارات خصوصی کا استعمال نہیں کیا جب نومبر 1939 میں کانگریس حکومت نے اس امر پر احتجاج کرتے ہوئے استعفے دے دیے کہ ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف جنگ میں جھونک دیا گیا تو جناح نے اعلان کیا کہ جن ڈھائی برسوں میں کانگریس برسر اقتدار رہی تھی ان کے ''ظلم وجبر،ناانصافی'' سے رہائی پانے پر ''یوم نجات'' منایا جائے۔یہ الزام لگایا گیا کہ اس دور میں مسلمانوں کی رائے عامہ کہ تحقیر کی گئی،مسلمانوں کا کلچر برباد کیا گیا،مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی زندگی پر حملے کیے گئے اور مسلمانوں کے اقتصادی اور سیاسی حقوق کچلے گئے۔

مسلمانوں پر وہ کون سے مظالم توڑے گئے تھے جن کے بارے میں کانگریسی وزارتوں پر سازش کا الزام تھا؟ مسلم لیگ نے 39-1938 میں دو رپورٹیں (پیرپور کمیٹی رپورٹ اور شریف رپورٹ) شائع کی تھیں جن میں کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں کی شکایتیں گنائی تھیں۔ان الزامات میں زیادہ تر وہ متفرق واقعات تھے جو گاؤں قصبوں میں رونما ہوئے اور جن میں مسلمانوں

(1) ہکٹر بولیتھو نے اپنی کتاب JINNAH (جناح) سے مقتبس ،ص 118

نے ، یاممکن ہے کہ ہندوؤں نے بھی نقصان اٹھایا ہو۔ایسے واقعات تمام صوبوں میں ہوتے رہتے تھےاوران کی ذمہ داری ہمیشہ کسی چھوٹے سے سرکاری عامل پر ہوتی جو بے پروائی یا طاقت کے غلط استعمال کا مجرم ہوتا۔بعض شکایات اور بھی زیادہ عمومی نوعیت کی تھیں ۔مثلاً قومی ترانے کا گایا جانا اورسرکاری عمارتوں پرقومی جھنڈے کا لہرانا۔ایک الزام یہ بھی تھا کہ گاندھی کی ضرورت سے زیادہ عزت کی جاتی ہےاوران کے یوم ولادت کوتعطیل دی جاتی ہے۔گاندھی نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ ''میرے جنم دن پر چھٹی دینا ایک قابل دخل اندازی پولیس جرم قرار پانا چاہیے'' جہاں تک قومی ترانے اور قومی جھنڈی کا سوال تھا انھوں نے (ہری جن، کے صفحات میں) یہ مشورہ دیا کہ مسلمانوں کے احساسات کی عزت کرنا چاہیےاورایک مسلمان کوبھی اعتراض ہوتو نہ قومی ترانا گایا جائے گا نہ جھنڈا لہرایا جائے۔وردھا تعلیمی اسکیم کے بارے میں اس شکایت کے کوئی معنی نہیں تھے کہ اس میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں ہے کیوں کہ اس کے نصاب تعلیم میں کسی فرقے کی تعلیم کا بندوبست نہیں تھا۔

آئین کے ماتحت ،اقلیتوں کے تحفظ کے سلسلے میں گورنروں کی خصوصی ذمہ داریاں تھیں ۔ان میں ایک،سرہےری ہیگ (گورنرصوبہ جات متحدہ یوپی) نے ریٹائر ہونے کے بعد لکھا''فرقہ وارانہ سوالات سے نپٹنے کے لیے میری رائے میں وزیروں نے عام طور سے غیر جانب داری اوراس جذبے سے کام کیا کہ وہ وہی بات کریں جومناسب وجائز ہو۔سچ تو یہ ہے کہ ان کے دور کے خاتمے سے ذرا پہلے ہندومہاسبھا نے اس پر سختی سے اعتراض کیا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ انصاف نہیں کررہے ہیں۔حالانکہ ان کے اس الزام کا کوئی جواز نہیں تھا۔''[1]

1940 کے شروع میں کانگریس کے صدرڈاکٹر راجندر پرشاد نے جناح کو یہ تجویز لکھ کر بھیجی کہ کانگریسی وزراء کے خلاف جوالزامات ہیں ان کی تحقیقات فیڈرل کورٹ کے ایک جج سے کرائی جائے۔جناح نے یہ تجویز نامنظور کردی اورایک شاہی کمیشن کی مانگ کی ۔جنگ کے زمانے میں اور ایسے اختلافی مسئلہ پر شاہی کمیشن کے مقرر کیے جانے کا امکان نہیں تھا،لیکن ایسا معلوم ہورہا تھا کہ جناح جب تک ان سے ممکن ہواس اختلافی سوال کوزندہ رکھنا چاہتے تھے۔اس پروپیگنڈے کا نشانہ

(1) ایشیاٹک ریویو، جولائی 1940

کانگریس یا برطانوی حکومت نہیں بلکہ خود ان کا فرقہ تھا۔ ہم عصر محاورے میں یہ کہنا چاہیے کہ یہ ''گھریلو استعمال کے لیے'' تھا۔ کوئی بات جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین خلیج کو وسیع کرے اور جس سے یہ ظاہر ہو کہ دونوں فرقوں کے درمیان اختلاف ختم ہونے والے نہیں ہیں اس سے ان کے اس نظریے کی تائید ہوتی تھی کہ ہندوستان کے لیے جمہوری نظام ناممکن عمل ہے۔

جناح نے اپنے دوقومی نظریے کی تعمیر شروع کردی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات صرف مذہب تک محدود نہیں تھے بلکہ ان کی سماجی، ثقافتی اور اقتصادی ز.دگی کے پورے دائرے کو حاوی تھے۔ مارچ 1940 میں آل انڈیا مسلم لیگ نے دوقومی نظریے سرکاری طور پر اختیار کرلیا۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے لیے کوئی بھی آئینی پلان اس وقت تک نہ تو قابل عمل ہوگا اور نہ مسلمانوں کو تسلیم جب تک کہ شمال مغرب اور مشرق میں مسلم اکثریت کے صوبوں کی حدبندی کرکے اس کی بنا پر آزاد ریاستیں نہ بنادی جائیں۔ وہ پاکستان، جسے گول میز کانفرنس کے موقع پر مسلم ترجمانوں نے ''طالب علموں کی تجویز'' کہہ کر ٹال دیا تھا وہ اب مسلم لیگ کی منزل مقصود بن چکا تھا۔

دوقومی نظریے اور پاکستان کے مطالبے پر گاندھی کا اولین ردعمل بوالعجبی بلکہ بے یقینی کا تھا۔ کیا مذہب کا یہ کام تھا کہ لوگوں کو جدا کرے یا یہ کہ انھیں ملائے؟ انھوں نے دوقومی نظریے کو نا درست قرار دیا۔ ان کے لغت میں اس سے زیادہ سخت لفظ اس کے لیے نہیں تھا۔ انھوں نے قومیت کے خصوصیات سے بحث کی۔ مذہب کے بدلنے سے قومیت نہیں بدل جاتی۔ مذہبی تقسیمیں ثقافتی اختلافات کے ہم زبان وہم مکان ہیں ہوتیں۔ انھوں نے لکھا کہ ایک بنگالی مسلمان ''وہی زبان بولتا ہے جو بنگالی ہندو بولتا ہے، وہی کھانا کھاتا ہے اور انھیں دلچسپیوں میں حصہ لیتا ہے جن میں اس کا ہندو پڑوسی۔ وہ لباس میں بھی یکساں ہیں۔ ان (جناح) کا ناک کسی ہندو کا بھی ہوسکتا تھا۔ جب میں ان سے پہلی بار ملا تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔''

ہندوستان کو تقسیم کرنا وہ سارا کام ہی بگاڑ دینا تھا جو ہندوؤں اور مسلمانوں نے صدیوں میں کیا تھا۔ گاندھی کی روح اس خیال ہی سے بغاوت کرتی تھی کہ ہندو دھرم اور اسلام دو متصادم کلچرل اور تعلیمات کی نمائندگی کرتے تھے اور آٹھ کروڑ مسلمانوں اور ان کے ہندو ہم سایوں کے درمیان کچھ

بھی مشترک نہیں تھا۔اور اگر مذہبی اور تہذیبی اختلافات ہوں بھی ،تو ایسے معاملات میں جیسے مالیات،صنعت ،صفائی اور عدالت میں مفادات کاٹکراؤ کہاں آتا ہے؟اختلافات اگر ہو بھی سکتے ہیں تو مذہبی رواج اور رسوم میں،لیکن ان سے سیکولر ریاست کوکوئی سروکار ہونا ہی نہ چاہیے۔

''ہندوستان کوٹکڑے کرنے کے پہلے میرے ٹکڑے کر ڈالو'' یہ تھی گاندھی کی مجروح روح کی پکار لیکن پاکستان کے بارے میں ان کے جذبات کتنے ہی شدید کیوں نہ رہے ہوں،وہ اپنے خیال کوکسی فرد واحد پر ٹھونسنے والے کب تھے؟انھوں نے 16/اپریل 1940 کے''ہری جن''میں اعتراف کیا کہ''میں جانتا ہوں کہ اہنسا پر مبنی ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے جس سے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو مالبقی ہندوستان کی خواہشات کے اتباع پر مجبور کیا جا سکے،چاہے یہ مابقی لوگ کتنی ہی طاقت ور اکثریت کی نمائندگی کیوں نہ کرتے ہوں۔مسلمانوں کو ہی حق خود اختیاری ملنا چاہیے جو مابقی ہندوستان کو حاصل ہے۔ہم اس وقت ایک مشترک خاندان ہیں۔کوئی رکن خاندا تقسیم کا مطالبہ کر سکتا ہے۔''

اہنسا پر اعتقاد رکھنے والے انسان کا نقطۂ نظر یہی ہو سکتا تھا،اگر چہ ممکن ہے کہ اس سے جناح کو یہ شہہ ملی ہو کہ اگر مسلم لیگ اپنے مطالبے پر اڑی رہی اور مسلم رائے عامہ اس کے ساتھ ہوگئی تو پاکستان ایک حقیقت بن جائے گا۔تقریباً آخری مرحلے تک جناح نے نہ تو پاکستان کے حدود اربعہ کی توضیح کی اور نہ اس تجویز کے بیرونی خطوط مکمل کئے۔اس طرح ان کے پیروؤں میں سے ہر شخص پاکستان کو اپنے تصور کی عینک سے دیکھتا رہا۔کٹر عقیدے والے ایسی ریاست کا خواب دیکھا کئے جس میں قدیم اسلام کی پاکیزگی جلوہ گر ہوگی۔یہ ایک جامع نظام ہوگا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرا سکے گا۔جو لوگ سیکولر نقطۂ نگاہ رکھتے تھے انھیں امید تھی کہ وہ اپنی''ریاست سے ٹھوس فوائد حاصل کر سکیں گے۔''

اگر چہ ہندوستانی قوم پروروں کے لیے یہ ایک بلائے ناگہانی معلوم ہوتا تھا لیکن پاکستان کا تصور مسلم فرقے خاص کر مستوط طبقے میں تیزی سے پھیل گیا۔اس صورت حال کے کئی اسباب تھے۔مسلم متوسط طبقہ،تاریخی اسباب کی بنا پر سرکاری ملازمتوں صنعت اور تجارت کے ثمرے حاصل کرنے کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا تھا۔اس کو مسلم ریاست کے تصور میں دلکشی نظر آئی۔مقابلے والے

سماج جو کوئی بھی کامیابی کا قریبی راستہ بتا دیتا اسے لوگ خوش آمدید کہتے۔ بنگال اور پنجاب کے زمینداروں کو ان 'ترقی پسند سیاست دانوں' سے چھٹکارے کی امید نظر آئی جو زمینداری کے خاتمے کی خطرناک بات کرتے تھے۔ مسلم عمال اس لیے خوش تھے کہ اس نئی ریاست میں ان کے لیے نئی راہیں کھل جائیں گی اور ہندو افسران اعلیٰ ان کے سروں پر منڈلائے نہ ہوں گے مسلمان تجار اور صنعت کار خوش حالی کے کاروبار کے لیے آزاد میدان کا تصور کرنے لگے جہاں ہندو مقابلہ کرنے کے لیے ورنہ آئیں گے۔

ممکن ہے کہ پاکستان کے ان مادی فوائد کا اس کی وکالت کرنے والوں کو ہمیشہ باقاعدہ احسان نہ رہا ہو لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان تجاویز کی دلکشی ان کی نظروں میں ان فوائد سے بڑھ گئی۔ سرسید احمد خاں کے زمانے سے، مسلمان فرقے کو اس کا کوئی نہ کوئی نمایاں لیڈر اس بات پر آمادہ کرتا رہا کہ وہ برطانیہ مخالف تحریکوں سے الگ رہیں۔ جو لوگ یہ رائے دے رہے تھے اور جو ان پر عمل پیرا ہوتے تھے دونوں ہی کے دل میں اس کے بارے میں احساس تھا۔ پاکستان کے تصور نے پہلی بار مسلم متوسط طبقے کے مذہبی جذبات کو بھی مطمئن کیا اور سیاسی جبلت کو بھی۔ ہندوستان میں اقتدار اعلیٰ کی حامل ایک ریاست کا قیام مسلم حکومت کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتا تھا اور یہ امکان اتنا دل فریب تھا کہ عوام کی توجہ کا مرکوز نہ ہونا ناممکن تھا۔ مسلم دانشور کو ایک ایسے پروگرام سے نئی شگفتگی محسوس ہوتی تھی جس میں اسے انگریز اور ہندو دونوں ہی سے آزادی مل جائے گی اس تحریک کی بدولت ان کے فرقے کا ٹکراؤ اکثریتی فرقے سے ہوتا تھا۔ انگریزیوں سے نہیں، اور یہ بات اس تحریک کو کم مشکل بناتی تھی۔

ایسا لگتا تھا کہ پاکستان نے مسلمانوں کی ایک نفسیاتی ضرورت پوری کر دی ہے۔ 1946 میں ڈبلو۔سی، اسمتھ نے وضاحت کی۔

''اس وقت مسلم لیگ ایک بڑھتی ہوئی قوم پروری کا آلہ کار بن رہی تھی، کیوں کہ اس کے مرکزی نقطے پر ایسے تجارتی مفادات کا ٹھوس طبقہ تھا جو طاقت حاصل کرنے پر تلا ہوا تھا انھیں بیدار ہوتے ہوئے کسانوں کی بھی حمایت حاصل ہونے لگی تھی اور اس کے گرداگرد قوم پروری کا تمام ساز و سامان مہیا ہو گیا تھا۔ شاعری اور نوجوانوں کی نشاۃ ثانیہ کی معیار پسندی اور کھلے دل کی جاں نثاری۔''(1)

(1) اسمتھ، ڈبلیو ڈی گینٹ دل MODERN INDIAN IN INDIA ہندوستان میں اسلام جدید، ص 275۔

عالمی جنگ کے چھڑ جانے سے بھی تفریق پسندی کے پروپیگنڈے کو تقویت ملی۔ کانگریس وزارتوں کے مستعفی ہو جانے سے لیگ کو سیاسی اسٹیج پر قابض ہو جانے کا موقع ملا۔ اگر کانگریس وزارتیں برسر اقتدار رہتیں تو ان کے خلاف مظالم کی جو کہانیاں دہرائی جاتی تھیں وہ ضرور چیلنج کی جاتیں۔ جو صورت حال تھی اس میں گورنروں سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ جو لوگ ان کے مخالف ہو گئے تھے، انھیں کو وہ بے گناہی کا سرٹی ممکٹ دے دیں گے۔ جنگ بجئے خود ایک ایسا سبب تھی کہ مسلم لیگ کو ناراض نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وایسرائے اور ان کے مشیر ایسی کوئی بات بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جو جناح کو بری لگے۔ پاکستان کے مطالبے سے غالباً برطانوی حکومت کو بھی اتنا ہی تعجب ہوا جتنا کانگریس کو۔ شروع شروع میں، برطانیہ کی نگاہوں میں اس کی یہ اہمیت تھی کہ اس سے ان کا یہ نظریہ صحیح ثابت ہوا کہ ہندوستان کی آئینی ترقی برطانوی پس وپیش کی وجہ سے نہیں رکی ہوئی تھی بلکہ ہندوستانی نا اتفاقی کی وجہ سے اگست 1940 میں اعلان ہوا کہ 'اس سے انکار ناممکن ہے کہ وہ (برطانوی حکومت) ہندوستان کی فلاح و بہبود اور امن کی موجودہ ذمہ داریاں کسی ایسے نظام حکومت کے سپرد نہیں کرسکتی جس کے اختیارات سے ہندوستان کی قومی زندگی کے بڑے اور طاقت ور عناصر محروم ہوں۔'' یہ اعلان پہلا کھلا ہوا اقرار تھا کہ برطانوی حکومت، ایسے شدید حل پر بھی غور کرنے کو تیار تھی جو جناح نے پیش کیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا پاکستان رزولیوشن مارچ 1940 ہی میں پاس کیا گیا تھا۔ اگر جنگ نہ ہوئی تو یہ امر مشکوک ہے کہ بالواسطہ طریقے سے بھی اس قدر جلد اور علی الاعلان پاکستان کی تجویز پر موافقت کی مہر لگادی جاتی۔ بہر حال جنگ واقعات کی رفتار کا کچھ اس طرح فیصلہ کر رہی تھی کہ نہ تو برطانوی حکومت اور ہندوستانی لیڈر اس کی اچھی طرح پیش بینی کر سکتے تھے اور نہ اس پر کنٹرول رکھ سکتے تھے۔

باب43

راج کوٹ

گاندھی کی نظروں میں خطرے کا ایک نشان تو بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ جذبات تھے اور دیسی ریاستوں میں بڑھتی ہوئی بے چینی دوسرا نشان۔

ریاستوں کا مسئلہ پے چیدہ تھا۔کل 563 ریاستیں تھیں۔ان میں سے کچھ تو اتنی بڑی اور گنجان آبادی کی تھیں جیسے برطانوی، ہند کے بڑے صوبے اور بہت سی ایسی تھیں جنھیں معمولی تعلق داروں سے ممیّز کرنا مشکل تھا۔ چیمبر آف پرسنز[1] میں 1919ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت صرف 109 ریاستوں کو براہ راست نمائندگی ملی تھی، 127 ریاستوں کو بارہ نشستیں دی گئی تھیں، اور 326 ریاستوں کو کسی نمائندگی کا اہل ہی نہیں سمجھا گیا تھا۔ رقبے، وسائل اور نظم ونسق کی سطح میں ایک دوسرے سے بے حد مختلف ان ریاستوں کی اکثریت کا سیاسی وجود ہندوستان کی برطانوی فتح کے دوران تسلیم کیا گیا تھا ان ریاستوں کے حکمرانوں اور حکومت کے باہمی تعلقات صلح ناموں اور سندوں کی بنیاد پر قائم تھے۔ یہ سندیں اور صلحانے ایسٹ انڈیا کمپنی سے اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں کیے گئے تھے۔ دراصل والیان ریاست اقتدار اعلا (اسی نام سے بعد میں برطانوی حکومت کو یاد کیا جانے لگا تھا) کی مداخلت اور نگرانی کے پابند وتابع تھے۔ یہ والیان

(1) ایوان والیان ریاست

ریاست بیرونی طاقتوں سے براہ راست روابط قائم نہیں کر سکتے تھے اندرونی نظم ونسق میں انھیں وسیع تر آزادی حاصل تھی لیکن اگر برطانوی ریزیڈنٹ چاہتا تو وہ ہمیشہ اپنی بات منوا سکتا تھا۔

(1857 کی) بغاوت کو دبانے میں ان ریاستوں کا جو رول رہا اس کی وجہ سے انھیں سلطنت (برطانیہ) کا بیش بہا پشت پناہ سمجھا جاتا تھا۔ پروفیسر رش برک ولیمس کے الفاظ میں یہ ریاستیں اختلافی سرزمین پر دوستانہ قلعوں کا ایک جال بنائے ہوئے تھی ں جب تک کوئی والی ریاست برطانوی راج کا وفادار رہتا یا کوئی شدید ظلم یا شرمناک کانہ کر بیٹھتا، علی العموم اس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا۔ اقتدار اعلا اِن ریاستوں کی حکومتوں کی حفاظت کا جو انتظام کرتا تھا۔ اس کی بدولت والیان ریاست اپنے کو محفوظ محسوس کرتے تھے لیکن سیاسی، سماجی اور اقتصادی اعتبار سے یہ ریاستیں پچھڑی رہ جاتی تھیں۔

گاندھی کو ریاستوں کے اندرونی حالت براہ راست معلوم تھا۔ پور بندر اور راج کوٹ ریاستوں میں ان کے والد اور دادا وزیر رہ چکے تھے۔ نوجوان وکیل کی حیثیت سے ان کو ان ریاستوں کا ماحول گھٹا گھٹا سا نظر آنے لگا۔ ان کا جاگیردارانہ ڈھانچہ، اٹھارھویں صدی میں کتنا ہی فطری کیوں نہ رہا ہو لیکن بیسویں صدی میں بے وقت کی شہنائی تھا۔ چھوٹی ریاستوں میں اچھی حکومت کا ڈھانچہ بھی نہیں تھا۔ بڑی ریاستوں میں بلکہ ان ریاستوں میں بھی جن کا نظم ونسق بہتر تھا، انتظام حکومت بے حد مطلق العنانی پر مبنی تھا۔ حکمراں کو اپنی رعایا کی جان ومال پر لامحدود اختیارات تھے۔ ریاست کے خزانے اور صرف خاص کی رقم میں کوئی امتیاز ہی نہیں تھا۔ جہاں ایک طرف عوام ضروری سہولتوں کو ترستے تھے۔ وہاں دوسری طرف کوئی حکمراں ذاتی عیاشی پر ریاست کی مالیات بے دھڑک خرچ کرسکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر، ان ریاستوں میں نہ تو قانون کا راج تھا، نہ تقریر اور جماعت سازی کی آزادی جو کہ سول آزادی کے عناصر ترکیبی ہیں۔ وہاں صحیح معنوں میں کوئی نمائندہ ادارے نہیں تھے۔ بڑی ریاستوں میں مجالس قانون ساز تھیں لیکن ان میں سے اکثر والی ریاست کے نامزد کردہ اراکین سے بھری تھیں اور ان کو کوئی اختیار نہیں تھا۔ پروفیسر کوپ لینڈ نے ان مجالس کا نقشہ اس طرح کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ ''یہ دربار تھے نئے ملبوسات میں۔''

مانٹیگو چیمس فورڈ رپورٹ میں متنبہ کیا گیا تھا کہ ''امیدیں اور حوصلے'' سرحدوں کو پار کر سکتے ہیں، جیسے سڑک پار سے چنگاریاں، دیسی ریاستوں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ مابقی ہندوستان میں ہونے والے واقعات سے بالکل ہی غیر متاثر رہیں۔ 1920 کے بعد سے جب کانگریس نے گاندھی کی قیادت میں عدم تعاون کی تحریکیں چلائیں، جن صوبوں پر براہ راست برطانوی حکومت تھی وہاں زبردست بیداری کی لہر دوڑ چکی تھی۔ گاندھی نے ان تجاویز کی مزاحمت کی تھی کہ دیسی ریاستوں کے عوام کو بھی ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں شامل کیا جائے اگر ریاستی عوام کا خود مختاری کے ادارے قائم کرنے کا حق تسلیم کیا گیا تھا اور والیان ریاست سے زوردار طریقے پر کہا گیا تھا کہ عوام کے بارے میں اپنا فرض نبھائیں لیکن عوام سے صرف یہ امید کی گئی تھی وہ اپنے حقوق کے لیے ریاست سے باہر کی سیاسی پارٹیوں کی مدد کے بغیر جنگ کریں گے۔

جولائی 1938 میں گاندھی نے اس پالیسی کا پھر جائزہ لیا اور اس کو ' جراثیم سے پاک طریقہ قرار دیا''، جس میں طبیب تمام فطری توانائیوں کو حرکت میں لا کر اور ان کے بروئے کار آنے کے لیے کھلا میدان چھوڑ کر زہر کو اس کا موقع دیتا ہے کہ وہ باہر نکل جائے۔ اپنے عدم مداخت کو رزولیوشن سے کانگریس نے ریاستی عوام کو، طاقتوں کو کھل کر سامنے آنے کا موقع دیا ہے دسورے لفظوں میں فطری توانائیوں یعنی ان طاقتوں کو جو خود عاوم کے اندر موجود ہوتی ہیں، متحرک کر دیا ہے۔

اس حزم وضبط کے اور بھی اسباب تھے۔ برطانوی ہند میں بھی گاندھی کو سول نافرمانی کی ـتحریکوں کا چلانا خاصا مشکل نظر آیا تھا۔ انیسویں صدی کی دوسری یا تیسری دہائی میں اس کی دیسی ریاستوں تک توسیع سے یہ کام اور بھی سنگین ہو جاتا۔ ریاستی عوام کو اظہار رائے کا شاذ ہی کوئی موقع ملتا رہا ہوگا اور اگر انھیں بھی عدم تشدد کی تحریک کے دھارے کے دائرے میں لایا جاتا تو ان کو قابو میں رکھنا مطلق العنان حکومتوں کے اختیارات کو چیلنج کر کے ان کے ظلم کی مدافعت کی تربیت دینا مشکل ہو جاتا۔

1937 کے بعد سے دو اسباب ایسے ہوئے جن سے دیسی ریاستوں میں حالات کی رفتار تیز ہو گئی۔ صوبوں میں عوامی وزارتوں کے بن جانے سے امیدیں بڑھ گئیں اور عوام کی انفعالی قناعت عملی بے چینی میں تبدیل ہونے لگی۔ آل انڈیا فیڈریشن کا جو تصور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ

1935 میں دیا گیا تھا اس کے وجود میں آنے کے امکان کا ردعمل بھی والیان ریاست اورعوام پر مختلف صورتوں میں ہوا اور اس سے بھی ٹکراؤ نزدیک آ گیا۔ گول میز کانفرنس میں والیان ریاست آل انڈیا فیڈریشن (کل ہند وفاق) پر راضی ہو گئے تھے لیکن جب ان پر یہ ظاہر ہوا کہ فیڈریشن میں شامل ہونے والی اکائیوں کے لیے کچھ اختیارات وحقوق سے دست بردار ہونا مانی ہوئی بات تھی تو وفاقی ڈھانچے میں شمولیت کے سلسلے میں ان کا جوش ٹھنڈا پڑنے لگا۔ ہندوستانی قوم پروروں کے نقطۂ نظر سے وفاقی عمل حل میں یہ خطرہ نظر آتا تھا کہ اس سے والیان ریاست کے ہاتھوں میں بہت سی طاقت چلی جائے گی۔

مستقبل کے ہندوستان میں ریاستوں کے لیے معقول جگہ بنانے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہ خود جمہوریت کو اپنا لیں۔ اس طرح ریاستوں میں ذمہ دار حکومتوں کا قیام وہاں کے عوام ہی کے نقطۂ نظر سے اہم نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی آزادی اور اتحاد کے وسیع تر خیال سے بھی اہم تھا۔

اس پس منظر میں یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ 39-1938 سے کئی ریاستوں میں شہری آزادی اور جمہوری اداروں کے قیام کے لیے سورشیں شروع ہو گئیں۔ حیدرآباد، ٹراونکور، جے پور، ریاستہائے اڑیسہ مقامی تحریکوں سے زیروزبر ہو رہی تھیں، لیکن سب سے تیز روشنی راج کوٹ پر مرکوز ہونے والی تھی، یہ مغربی ہندوستان کی ایک چھوٹی سی قلمرد تھی، جہاں گاندھی کی مداخلت نے ایک چھوٹے سے مسئلے کو قومی مسئلہ بنا دیا اور اس سے نہ صرف ہندوستانی ریاستوں کا سوال بلکہ عدم تشدد پر مبنی عمل کی گاندھیائی تکنیک پوری طرح ابھر کر سامنے آ گئی۔

راج کوٹ گاندھی کا دوسرا گھر تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم راجکوٹ میں ہوئی تھی جہاں ان کے باپ دیوان (وزیراعظم) تھے۔ ان کی بیوی کستوربا کی پرورش بھی وہیں ہوئی تھی۔ راجکوٹ کے عوام ذمہ دار حکومت کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اور گاندھی کے دوست اور ساتھی ولبھ بھائی پٹیل نے اس تحریک میں حصہ بھی لیا تھا۔ دسمبر 1938 میں پٹیل اور راج کوٹ کے ٹھاکر (دوالی ریاست) کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس میں موخر الذکر تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی اور راجکوٹ کے لیے سیاسی اصلاحات کے لیے ایک دس رکنی (جن میں سے سات رکنی پٹیل کے نامزد کردہ ہوں گے) کمیٹی کے قیام پر راضی ہو گئے تھے۔ ٹھاکر نے بعد میں اس معاہدے سے

روگردانی اختیار کی۔ مبینہ طور پر اس روگردانی میں سر پیٹرک کیڈل (ٹھاکر کی کاؤنسل کے صدر) اور پولیٹکل ایجنٹ، مسٹر گبسن کا ہاتھ تھا۔ گاندھی نے 'راج کوٹ'' کے والی ریاست اور وہاں کے رعایا کے مابین کیے گئے سنجیدہ معاہدے اس بے دردی سے توڑ دیے جانے'' کی مذمت کرتے ہوئے ان افسروں کی نکتہ چینی کی اور عوام سے اپیل کی کہ وہ ''ٹھاکر صاحب کو آزاد کرائیں''۔ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوا کہ دربار ویراوالا ایک ایسا وزیر تھا جس کو ہندوستانی ریاستوں کی چالاکیوں اور سازشوں کے بارے میں کچھ اور جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی رہنمائی میں ٹھاکر کو اپنی ظالمانہ پالیسیوں کے لیے کسی اور حلقے سے شہ ملنے کی حاجت ہی نہیں تھی۔

گاندھی کی نگاہ میں مسئلہ زیر بحث یہ نہیں تھا کہ راج کوٹ میں کتنی آئینی اصلاحات ہوئی ہیں بلکہ یہ تھا کہ وہاں کے والی ریاست نے اپنی رعایا سے عہد شکنی کی تھی۔ اگر سنجیدگی سے کیے گئے معاہدے اس طرح توڑے جائیں گے تو ہندوستانی ریاستوں میں مطلق العنانی پرامن طریقے پر کیوں کر جمہوری نظام کی شکل اختیار کرے گی؟ اپنی صحت کی نادرستی کے باوجود، وہ راج کوٹ کے لیے اس مقصد سے روانہ ہوئے کہ ٹھاکر کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنا باعزت وعدہ توڑنے سے باز رہیں۔ ان کی بیوی ان کے پہلے گئیں۔ بات بدل دینے والے والی ریاست اور گرفت میں آنے والی بات نہ کرنے والے وزیر سے کبھی ختم نہ ہونے والی گفت وشنید کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور عاجز آ کر گاندھی نے برت رکھ لیا۔ ہندوستان کے ایک دور دراز گوشے میں جو معمولی اختلاف رائے شروع ہوا تھا اس نے بڑھ کر ایک اعلیٰ درجے کے سیاسی بحران کی شکل اختیار کر لی۔

گاندھی نے اقتدار اعلیٰ سے صحیح نقطۂ نظر اپنانے کو کہا اور اس کے جواب میں وایسرائے نے چیف جسٹس آف انڈیا سر مارس گایر، سے معاہدے کے شرائط پر محاکمہ کرنے کو کہا سر مارس نے عوام کی تعبیر وتشریح کے حق میں فیصلہ دیا اور راج کوٹ میں سیاسی اصلاحات تیار کرنے کے لیے جو کمیٹی بننے والی تھی اس کی اکثریت کو نامزد کرنے کا پٹیل کا حق تسلیم کیا۔

گاندھی نے اپنی برت توڑ دیا اور معلوم ہو رہا تھا کہ جھگڑا وہیں پر بخیر وخوبی ختم ہو گیا۔ بہرحال انھوں نے ٹھاکر اور ان کی وزیر کی اختراعی صلاحیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا۔ اصلاحی کمیٹی کے اعضائے ترکیبی کے سوال پر لامتناہی مناظرہ چل پڑا۔ ویراوالا ہر طرح کی واقعی اور خیالی

مشکلیں کھڑی کرتے رہے وہ راج کوٹ کی مسلم اور بھایات اقلیتوں کو ابھارتے رہے کہ اپنے مطالبات پر زور دیں۔ جب ان الجھنوں کا سامنا ہوا تو گاندھی یہ سوچنے لگے کہ انھوں نے اپنے مخالفین کو موافق بنانے میں کسی طرح کی کوئی کامیابی حاصل بھی کی ہے یا نہیں۔ وہ راج کوٹ امن کے مشن پر آئے تھے، لیکن وہ صرف ٹھاکر اور ان کے وزیر کی تلخی میں اضافہ کرنے کا باعث ہوئے۔ دروں بینی سے ان پر یہ راز کھلا کہ وائسرائے سے اپیل کر کے انھوں نے بنیادی اور بڑی غلطی کی تھی۔ ان کی برت کا مقصد یہ تھا کہ وہ ٹھاکر کے دل کو متاثر کریں۔ اگر وہ اپنے برت پر قائم رہتے تو یا تو وہ غلط رو والی ریاست کو اپنے اپنے موافق بنانے میں کامیاب ہو جاتے یا پھر اسی کوشش میں ختم ہو جاتے۔ وائسرائے کے ذریعے اقتدار اعلیٰ کی مداخلت سے ان کے برت کی روحانی قدر و قیمت میں فرق آ گیا اور ان معنوں میں یہ عدم تشدد کے اس بلند معیار کے حساب سے ایک لغزش تھی جو ان کے پیش نظر تھا۔

اپنے اندر اس خاموش عدالتی تحقیقات کے نتیجے میں گاندھی نے کچھ ایسے فیصلے کیے جس سے ان کے ساتھی حیرت میں پڑ گئے۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ان فوائد سے دست بردار ہو جائیں گے جو اصلاحی جماعت کو چیف جسٹس آف انڈیا کے فیصلہ کے ماتحت حاصل ہوئے تھے۔ لارڈ لن تھ گو اور سر مارس گایر کو اس سے جو زحمت ہوئی تھی اس کے لیے انھوں نے ان دونوں سے معافی مانگی اور راج کوٹ کے ٹھاکر صاحب اور وزیر سے استدعا کہ وہ وہ راج کوٹ کے عوام کو بہتر سے بہتر جو کچھ دے سکتے ہوں دے دیں۔

ان فیصلوں پر احتجاج کا ایک طوفان اٹھا۔ کیا سیاسی تحریکیں اس طرح چلائی جاتی ہیں؟ کیا راج کوٹ کے 75 ہزار باشندوں کے حق میں گاندھی کو ایسی من مانی کرنے کا کوئی حق تھا؟ کیا ریاست میں اصلاحات کی پارٹی اپنے محنت و مشقت سے حاصل کیے ہوئے سیاسی فوائد سے اس لیے ہاتھ دھو بیٹھے کہ مہاتما خود ساختہ اخلاقی ستون کی بلندی سے لڑا کھڑا گئے تھے؟ ان اعتراضات کا گاندھی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اگر انھیں کوئی تحریک چلانا اس کی رہبری کرنا ہے تو وہ اس پر مجبور ہیں کہ ایسی ستیہ گرہ کی منطق کے مطابق چلیں جس میں کم مدت یا طویل المدت فائدے سے زیادہ سچائی اہم ہو۔ ستیہ گرہی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے مخالف کو محبت سے جیت لے۔ گاندھی نے اس

کا اقرار کیا کہ بحث ومباحثے کی گرمی میں ان کے اوران کے ساتھیوں کے دلوں میں ٹھا کراوران کے وزیر کے بارے میں برے خیالات پیدا ہوگئے تھے۔وہ اپنے مخالفین کے مقابلے میں اس لیے آگے نہیں بڑھ پائے کہ وہ ستیہ گرہ کے اعلیٰ اصولوں سے ہٹ گئے تھے۔اُن کو راج کوٹ کے ایک اندھے گویے کی یاد آئی جس کو راج کوٹ کی گلیوں میں انھوں نے اپنے بچپن میں سنا تھا۔انھوں نے کہا کہ ''ہر انسانی دل میں تار ہوتے ہیں۔اگر ہمیں ٹھیک تار کو چھونا آجائے تو ہم اس سے موسیقی پیدا کر سکتے ہیں۔''

جب ایک بچے نے دق کرنے والے انداز میں ٹوکا کہ ''دربار ویراوالا میں ہے کیا کہ آپ اس سے کچھ نکالیں گے؟'' تو گاندھی نے جواب دیا ''تم میں کیا ہے؟ اگر تم میں کچھ اچھائیاں ہیں تو دربار ویراوالا بھی ہیں۔اور اگر میں تمھیں اپنے بچے کی طرح گلے لگا سکتا ہوں تو دربار ویراوالا کو ایک رکن خاندان کی طرح کیوں گلے نہیں لگا سکتا؟''۔

گاندھی نے اس واقعے پر یہ فیصلہ سنایا کہ میں راج کوٹ میں اپنے ہی ترازو پر تولا گیا اور کم پایا گیا''۔اس واقعے کی اہمیت ہی نہیں تھی کہ یہ مہاتما کے روحانی بحران کا مظہر تھی بلکہ یہ بھی تھی کہ اس سے ریاستوں میں آتش گیر صورت حال کا بھی پتہ چلا۔اس میں ان کا کوئی ذاتی قصور تو نہیں تھا لیکن دیسی ریاستوں کے عوام میں عدم تشدد پر مبنی سیاسی تحریکیں چلانے کے لیے نہ تو ضروری نظم وضبط تھا اور نہ تنظیمی صلاحیت، اور چونکہ سیاسی تحریک والیان ریاست اوران کے شہروں کے حصار بند اقتدار کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا اوراس لیے بعض والیان ریاست اوران کے مشیروں کا سارا خبث باطن باہر آجاتا تھا اس لیے وہ اندولن کو اچھے برے ہر طریقے کچل دینا چاہتے تھے۔ صرف پولیٹکل ڈپارٹمنٹ (حکومت ہند کا سیاسی محکمہ) والیان ریاست کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن وہ اگر عوامی تحریکوں کا مخالف نہیں تھا تو ان سے بے اعتنائی ضرور برتتا تھا۔ حقیقی خطرہ یہ تھا کہ والیان ریاست کی دہشت انگیز کارروائیوں سے کہیں عوام میں جوابی دہشت انگیزی کا جذبہ بیدار نہ ہوجائے اوراس طرح گاندھی کی یہی امیدیں پاش پاش ہوجائیں کہ مطلق العنانی کو جمہوریت میں تبدیل کرنے کا عمل پرامن ہو سکے گا۔

گاندھی نے ریاستی عوام سے اپیل کی کہ عجلت کرنے میں آہستگی برتیں۔انھیں عوامی حکومت

کے قیام کے لیے ابھی تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔انھوں نے وضاحت کی کہ ''وہ ذمہ دار حکومت جو عوام کی طاقت اور ارادے کی پشت پناہی کے بغیر بطور تحفہ حاصل ہو وہ صرف کاغذی ذمہ داری ہوگی اور اس کی قیمت اس کاغذ جتنی بھی نہ ہوگی جس پر یہ شائع ہوگی۔اگر یہ حقیقت ہے کہ ریاستوں میں فوری طور سے خود اختیاری حکومت کے لیے ماحول ساز گار نہیں ہے اور عوام اس کی قیمت ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے لیے ان کی مناسب تربیت ہونی چاہیے۔اس کا امکان نہیں ہے کہ میں کہیں بھی سرسری طور سے اور مستقبل قریب میں عام ستیہ گرہ کا مشورہ دوں۔عوام میں نہ تو اس کے لیے معقول تربیت ہے اور نہ تنظیم۔

انھوں نے ریاستی عوام کو رائے دہی کہ وہ اپنی تحریک کو ایسے کم سے کم مطالبوں تک محدود رکھیں جن کو تسلیم کرنے کی والیان ریاست سے امید کی جا سکتی ہو۔آزادی تقریر و جماعت سازی واخبارات پر امن پروپیگنڈا اور ایک آزاد عدلیہ کی وساطت سے سب کی قانونی مساوات۔

راج کوٹ گاندھی کے لیے ایک بیش بہا تجربہ گاہ ثابت ہوئی۔انھوں نے ہونے والے ستیہ گرہوں کے لیے اپنے مطالبات سخت تر کر دیے۔ان کو خیال اور عمل دونوں ہی میں کلیۃً غیر متشدد ہونا تھا۔اگر ایسے سخت معیار کی بدولت ان کے پیرووں کی تعداد مٹھی بھر بھی رہ جاتی تو انھیں پروا نہیں تھی۔

چوتھی فصل

آخری دور

باب44

اہنسا کا امتحان

1938 میں یوروپ پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔18-1914 کی عالمی جنگ ''جنگ کوختم کرنے والی جنگ'' ثابت نہیں ہوئی۔صلح نامے امن سے جتنے مسائل طے ہوئے تھے اس سے زیادہ ابھرآئے۔(لیگ آف نیشن) مجلس اقوام کے ذریعے سے''اجتماعی تحفظ'' کے نظام سے جوامیدیں وابستہ کی گئی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔لیگ میں ممالک متحدہ امریکا کی غیرحاضری روس کا اخراج،اوراس کے اراکین کا اپنے قومی مفادات کو بین الاقوامی مفادات کا تابع بنانے میں پس وپیش،کئی سنگ رہ تھے۔جاپان کی جانب سے قومی سطح پرعدول حکمی سے لیگ کی بے بسی کھل کرسامنے آگئی۔اٹلی (اطالیہ) کا حبشہ (ابی سینیا) پرحملہ غیر جنگی منقطے پر قبضہ،آسٹریا پر جرمنی کا تسلط اوراسپین کی سول جنگ میں بیرونی مداخلت سے یہ ظاہر ہوگیا کہ بین الاقوامی معاملات میں جنگل کا قانون نافذ کیا جارہا تھا۔سیاسی جمہوریت اورشخصی آزادی کا بھاؤ گرگیا تھا۔مطلق العنان حکومتیں جنھوں نے داخلی طور سے تمام مخالفتوں کوکچل کررکھ دیا تھااوراپنے وسائل کو جنگ کے لیے جبری طور پر استعمال کررہی تھیں،اب اپنی سرحد پارمہم جوئیوں کی تمام تیاریوں میں مصروف تھیں۔یوروپ کے چھوٹے چھوٹے ملک روزانہ خوف کی فضا میں سانس لے رہے تھے۔انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ اگلا وارکہاں اورکس وقت ہوجائے گا۔معلوم ہورہا تھا کہ مہذّب دنیا کوخوف کی ایک

چادر نے ڈھانک لیا ہے۔ لوگ یہ سوچنے لگے تھے کہ کیا ایک نیا دورِ تاریکی شروع ہو رہا تھا۔

قوم پرور ہندوستان پر ان واقعات کا کیا ردِ عمل ہوا؟ جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ بین الاقوامیت آزاد ملک میں فروغ پاتی ہے کیوں کہ ''محکومی کی حالت مملکت کے اندر ایسے سرطانی نمو کی حیثیت رکھتی ہے جو صرف کسی عضو کے صحت مند بننے میں مانع نہیں ہوتی بلکہ ذہن کو برابر پریشان کرتی رہتی ہے۔ اور ہر خیال و عمل پر اثر انداز ہوتی ہے۔'' ہندوستانی قوم پروری کو جس کی نمائندگی انڈین نیشنل کانگریس کرتی ہے، اس کا احساس نہرو ہی نے دلایا کہ دنیا کے اسٹیج پر کیا ہو رہا ہے۔ خود نہرو نے مطالعے اور سفر و سیاحت کے ذریعے عالمی حالات سے اپنے کو باخبر رکھا تھا۔ مصالحت کوشی، کے اس دور کی مصنوعی حکمت عملی پر نہرو کا ردِ عمل سخت ہوا تھا اور وہ ان امیدوں کو موہوم سمجھتے تھے کہ آمروں کو مراعات دے دے کر خریدا جا سکتا ہے۔ انھیں کی تحریک پر انڈیا نیشنل کانگریس نے جاپان، جرمنی اور اٹلی کے ہر جارحانہ اقدام کے خلاف آواز بلند کی تھی اور ان ملکوں کے اندر سِول آزادیوں کے خاتمے، دانش اور ضمیر کی آواز دبانے، مذہبی اور نسلی اقلیتوں پر مظالم کرنے، سیاسی مخالفتوں کا قلع قمع کرنے اور کمزور ہمسایوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے جارحانہ طاقت کا بے جھجک مظاہرہ کرنے کی مذمت کی تھی۔

1931 میں جب گاندھی انگلستان گئے تھے تو ''اسٹار'' میں ایک کارٹون چھپا تھا جس میں گاندھی اپنی لنگوٹی پہنے مسولنی، ہٹلر، ڈی ویلرا اور اسٹالن کی بغل میں کھڑے تھے اور موخّر الذکر علی الترتیب کالی، بھوری ہری اور سرخ قمیصوں میں ملبوس تھے۔ عنوان تھا: ''وہ کوئی بھڑکیلی قمیص نہیں پہنے ہے۔'' یہ صرف لفظاً ہی صحیح نہیں تھا بلکہ استعاراتی اعتبار سے بھی سچ تھا۔ عدم تشدد کے قائل انسان کے لیے، جس کو انسانی برادری پر اعتقاد ہو، تو میں اچھی، بری، حلیف اور مخالف خانوں میں رکھی نہیں جا سکتیں۔ اس کا یہ مقصد نہیں تھا کہ گاندھی ان ملکوں میں جو تشدد کا وار کرتے تھے اور ان ملکوں میں جو اس سے خائف تھے، کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ بین الاقوامی معاملات میں نہرو کا مشورہ حاصل کرنے کے بعد یہ بالکل فطری تھا کہ گاندھی کی ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو جارحیت کا شکار ہوئے تھے۔ لیکن خود گاندھی کی زندگی ہنسا (تشدد) کی طاقتوں کے خلاف ایک مسلسل جدو جہد میں گزری تھی۔ تیس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے وہ ایک ایسی

تکنیک کی ارتقائی تشکیل میں مصروف تھے جو ہنسا سے صرف نظر کر کے بھی انفرادی اور جماعتی مسائل کو کامیابی سے حل کر سکتے۔

کئی برس کی مدت میں اہنسا اور ستیہ گرہ کے بارے میں گاندھی کے خیالات بلوغ کو پہنچے تھے۔ جنگ بوئر اور پہلی عالمی جنگ میں انھوں نے برطانوی ہندی فوج کے لیے ایک ایمبولنس یونٹ تیار کرائی تھی اور رنگروٹ بھرتی کرائے تھے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خود انھوں نے کبھی بندوق کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جب کہ انھوں نے خود بعد میں اعتراف کیا: ''اگر صرف اہنسا کے ترازو میں تولا جائے تو میرے عمل کا کوئی دفاع نہیں ہے۔ ان لوگوں میں جو تباہ کن ہتھیار خود استعمال کرتے ہیں اور ان میں جو ریڈ کراس (صلیب احمر کا کام کرتے ہیں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ دونوں ہی جنگ میں حصہ لیتے ہیں اور اس کے مفاد کو آگے بڑھاتے ہیں دونوں ہی جنگ کے جرم کے مجرم ہیں۔ لیکن اتنے سالوں تک اپنے دل کو ٹٹولتے رہنے کے بعد بھی یہ محسوس کرتا ہوں میں جن حالات میں گھبرایا ہوا تھا اس میں وہی راہ اختیار کرنے پر مجبور تھا۔''[1]

وہ ہندستانی جن کی قیادت جنگ بوئر کے محاذ جن گاندھی نے کی تھی یا جنھیں 1918 میں انھوں نے برطانوی ہندی فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی تھی، وہ لوگ اہنسا پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ ان کو جو چیز از خود جنگ میں شامل ہونے سے روکے ہوئے تھی وہ تشدد سے نفرت نہیں بلکہ اس کی طرف بے توجہی کا رجحان یا بزدلی تھی۔ چونکہ ان دونوں گاندھی کا اعتقاد یہ تھا کہ سلطنت برطانیہ ایک رحم دل ادارہ ہے اس لیے ہندوستانیوں کے کچھ حقوق بھی ہیں اور کچھ ذمہ داریاں بھی۔ انھیں میں ایک فرض یہ بھی تھا کہ سلطنت کے دفاع میں حصہ لیں۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے مابین جو دو دہائیوں کا فصل تھا اس میں سلطنت برطانیہ پر گاندھی کا اعتماد اتنا متزلزل ہو چکا تھا کہ پھر کبھی پلٹ کر آنے والا نہیں تھا۔ مزید غور و فکر اور تجربے سے ان کا اعتقاد خود اہنسا اور ہندوستانی عوام پر بہت بڑھ گیا اور اس کا سہرا تین بڑی بڑی ستیہ گرہی تحریکوں اور ملک بھر کے وسیع دوروں کے سر تھا۔ وہ اب عدم تشدد کے نظریے سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ سیاسی آزادی کی جدوجہد میں انھوں نے عدم تشدد پر اتنا زور دیا تھا کہ بعض

(1) ینگ انڈیا: 13 ستمبر 1928

اوقات ایسا لگتا کہ گاندھی کے نزدیک منزل مقصود سے زیادہ ذریعہ اہم تھا۔نومبر 1931 میں تو وہ یہاں تک کہنے لگے تھے کہ ''میں دنیا کے سامنے ان گنت مرتبہ یہ دہراؤں گا کہ میں اپنے ملک کی آزادی عدم تشدد کی قیمت پر خریدنا چاہوں گا۔عدم تشدد سے میرا رابطہ اس حد تک مطلق (اٹوٹ) ہے کہ میں اپنی پوزیشن چھوڑنے کے مقابلے میں خودکشی کو کہیں بہتر سمجھوں گا۔وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان عدم تشدد کا ایک کامیاب مظاہرہ کردے اور مابقی دنیا کے لیے ایک مثال بن جائے۔

جوں جوں جنگ کا خطرہ بڑھتا گیا اور تشدد کی طاقتیں زور پکڑتی گئیں۔گاندھی نے عدمِ تشدد کے موثر ہونے پر اپنے اعتقاد کا پھر سے اعادہ کیا۔پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ تاریخ عالم کے ان بحرانی لمحات میں ان کے پاس ہندوستان کے لیے اور ہندوستانی کے پاس بوکھلائی ہوئی انسانیت کے لیے ایک پیغام ہے۔''ہری جن'' کے صفحات کے ذریعے انھوں نے فوجی جارحیت اور سیاسی مظالم کے بارے میں اپنے غیر متشددانہ طرز فکر کی وضاحت کی۔انھوں نے کمزور حکومتوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے دفاع کا انتظام زیادہ مسلح حکومتوں سے حفاظت طلب کر کے یا خود اپنی جنگجو یانہ صلاحیتوں کو بڑھا کر نہیں بلکہ جارح کا غیر متشدد طور پر مقابلہ کر کے کریں۔غیر متشدد حبشہ کو نہ تو ہتھیاروں کی ضرورت ہے اور نہ مجلس اقوام سے امداد کی۔اگر حبشہ کا ہر مرد، عورت اور بچہ اطالیوں سے تعاون کرنے سے انکار کردے، تو ارادی یا جبری طور سے اطالیوں کو انھیں فتح تک پہنچنے کے لیے لاشوں سے گزرنا پڑے گا اور وہ ایک بے انسانوں کے ملک پر قابض ہو جائیں گے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ گاندھی انسانی تحمل اور قوت برداشت پر حد سے زیادہ اعتماد کررہے تھے۔اس کے لیے عظیم ترین ہمت کی ضرورت تھی کہ ملک کا ملک آخری مرد، عورت اور بچے تک دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دینے پر جان کی قربانی دینے کو ترجیح دیں۔ان معنوں میں گاندھی کا اہنسا پر مبنی عدم تعاون کوئی نرم نظریہ نہیں تھا جس کے دامن میں ایک خوفناک صورت حالات سے بہ آسانی پناہ لی جاسکے۔اور نہ یہ آزروں کو وہی چیز چاندی کی تھالی میں سجا کر بطور تحفہ پیش کرنے کے مرادف تھا جو وہ بزور بازو چھیننے کی سازش کررہے تھے جو لوگ غیر متشدد نافرمانی کرنا چاہتے تھے انھیں عظیم ترین قربانی کے لیے آمادہ رہنا چاہیے تھا۔

ایک جاپانی امداد باہمی کے اداروں کے ماہر ڈاکٹر کگاوا سے، جو اپنے کو امن پسند کہتے

تھے۔گاندھی نے یہ کہا کہ اگر وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ چین کے خلاف جنگ غیر منصفانہ ہے تو وہ اپنی مخالفت کا اعلان کریں اوراس کے عواقب کا سامنا کریں" میں اپنے بدعتی عقائد کا اعلان کروں گا اور گولیوں کا نشانہ بنوں گا۔ میں امداد باہمی کے اداروں اوراس سلسلے میں آپ کے سارے کام کو ترازو کے ایک پلے میں رکھوں گا اور آپ کی قوم کی عزت کو دوسرے پلے میں۔اگر آپ کو یہ محسوس ہورہا ہو کہ وہ عزت بیچی جارہی ہے تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ جاپان کے خلاف اپنے خیالات کو ظاہر کردیں ایسا کرکے آپ اپنی موت سے جاپان کو زندگی دلا دیں گے یہ معلوم نہیں کہ کگاوا پر امشورے کا کیا اثر ہوا۔ ہر شخص کے سر پر سقراط کا تاج ٹھیک اترتا بھی نہیں۔افسوسناک حقیقت یہ تھی کہ جنگ میں تو لاکھوں کو مرنے مارنے پر آمادہ کیا جاسکتا تھا لیکن چندسو امن پسند بھی امن پر اپنے عقیدے کے لیے جان دینے کو تیار نہیں تھے۔

اگر دنیا کے عوام اور حکومتیں گاندھی کی تکنیک کو تسلیم نہیں کر رہے تھے تو اس سے خود ان (گاندھی) کی نظروں میں اس تکنیک کی قوت کم نہیں ہوتی تھی۔ان کے معترضین میں سے شاذ ہی کوئی اس تکنیک کے غوامض وامکانات کو سمجھ پایا۔بدقسمتی سے لفظ (عدم تشدد) گاندھی کے خیالات کا انگریزی میں ناقص ترجمہ تھا۔جنوری 1939 میں ان سے بعض ملنے والوں نے سوال کیا کہ کیا عدم تشدد میں کوئی مثبت صفت بھی ہے تو گاندھی نے وضاحت کی کہ "اگر میں نے لفظ "محبت" استعمال کیا ہوتا تو آپ نے یہ سوال نہ پوچھا تو حالانکہ عدم تشدد بنیادی طور پر محبت ہی ہے۔لیکن غالباً میرے مفہوم کو لفظ محبت پوری طرح ادا نہیں کر پاتا۔قریب تر لفظ "خیر" ہوگا۔ہم دوستوں سے برابر والوں کی طرح محبت کرتے ہیں لیکن ایک بے رحم آمر ہمارے دلوں میں جو رد عمل پیدا کرتا ہے وہ یا تو رعب کا ہوتا ہے یا رحم کا یہ اس پر منحصر ہے کہ اس کی طرف ہمارا رد عملمتشدّ دانہ ہے یا غیر متشددانہ۔"

جو لوگ غیر متشددانہ نافرمانی کرتے ہیں یا تشدد کے جواب میں تشدد کرنے سے انکار کرتے ہیں، وہ مخالف کے لیے مسئلہ بن جاتے ہیں۔ پہلے تو ممکن ہے کہ وہ اس نافرمانی کو بزدلی پر محمول کرے لیکن زیادہ دن نہیں گزرنے پائے گے کہ اسے یہ معلوم ہونے لگے گا کہ اسے ایسے نئے میدان میں لڑنا پڑ رہا ہے جو اس کا منتخب کیا ہوا نہیں ہے کامیاب غیر متشدد نافرمانی پر جارح کا رد عمل

تدریجاً تعجب، تمسخر، غصے اور آخر کار ذہنی شک اور تبدیلی خیال کا ہوگا۔ غیر متشدد تحریک میں نہ کوئی فاتح ہوتا ہے نہ مفتوح۔ مقصد یہ نہیں ہوتا کہ مخالف کو ذلیل کیا جائے بلک یہ ہوتا ہے کہ اس کا خیال اور نقطۂ نظر بدلا جائے۔ خاتمے پر غصے، نفرت اور انتقام کا جذبہ نہیں رہ جاتا کہ مزید ٹکراؤ پیدا ہو۔ اگر اس زاویے سے دیکھا جائے تو جھگڑوں کو ختم کرنے اور ہم آہنگی کے لیے تطبیق کو ناگزیر بنانے کے لیے ایک متحرک وفعال عالمی نظام میں جنگ کے مقابلے میں سیہ گرہ کہیں بہتر متبادل ہے۔

1938-39 کے واقعات نے یورپ کے بہت سے امن پسندوں کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ''آراین پاتھ'' میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں جی۔ ڈی اچ۔ کول نے اپنی روح کے کرب کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ ''تقریباً دو سال پہلے، میرا عقیدہ تھا کہ میں ہر رحالت میں جنگ اور موت کا کاروبار کرنے والے تشدد کا مخالف ہوں۔ لیکن آج جنگ سے اب بھی نفرت کرتے ہوئے ان ہولناکیوں کو روکنے کے لیے جنگ کا خطرہ بھی مول لے لوں گا۔ جنگ کا خطرہ لینے پر بھی میرے ہستی کا دوسرا حصہ جھجک کے پیچھے ہٹ آتا ہے۔ کیوں کہ میرے لیے کسی انسان کے مارے جانے کا تصور ہی ہولناک ہے۔ ذاتی طور پر مارنے سے پہلے میں مرجانے پر آمادہ ہو جاؤں گا۔ لیکن کیا یہ میرا فرض نہیں ہوسکتا کہ مرجانے کی بجائے ماردوں؟۔''

نئی نئی ہولناکیاں انسانوں کے پیچھے درندوں کی طرح چھوڑ دی گئی تھیں۔ تباہی کے انجن کی رفتہ رفتہ تکمیل کی جارہی تھی۔ ہوائی جہازوں کے حملے کا دائرۂ کار بڑھا دیا گیا تھا۔ پھر بھی یہ جنگی ہتھیار کتنے ہی خوفناک کیوں نہ ہوں، ان کے چلانے کو ایک انسانی ہاتھ تو درکار ہی تھا اور ایک انسانی ذہن ہی اس ہاتھ کی نقل وحرکت کا تعین کررہا تھا۔ جولوگ جنگ کی سازشیں کررہے تھے ان کا ایک خاص مقصد تھا۔ وہ یہ کہ جن علاقوں کو فتح کریں وہاں کے انسانوں کا اور ذرائع کا استحصال کریں جارح کی کوشش یہ ہوتی کہ اتنے بڑے پیمانے پر تشدد کیا جائے کہ مخالف کا ضمیر جھک جائے۔ ''لیکن گاندھی نے لکھا کہ ''فرض کیجئے کہ کوئی قوم یہ تہیہ کر لیتی ہے کہ وہ جارح کی خواہش پر کوئی کام نہیں کریں گے اور نہ جارح کے طریقے پر جوابی حملہ ہی کریں گے تو خود جارح کے لیے اس کا تشدد کام کا نہ رہ جائے گا۔ اگر دنیا کے تمام چوہے کانفرنس کر کے یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ بلی سے ڈریں گے گے نہیں بلکہ دوڑ کے اس کے منہ میں چلے جائیں گے تو چوہے زندہ رہ جائیں گے۔''

گاندھی تشدد کی دیوتائیت سے جس کی نمائندگی نازی اور فسطائی حکومتیں کر رہی تھیں، واقف تھے لیکن وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ ہٹلر اور مسولینی بالکل ہی ناقابل اصلاح ہیں۔ عدم تشدد کی تکنیک کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ انسانی فطرت ایک ہے اور آخر کا محبت کا اثر قبول کرنے پر مجبور۔ گاندھی نے لکھا ''اگر دشمن کو یہ محسوس ہو جائے کہ اپنی زندگی بچانے کے لیے بھی آپ کے ذہن میں دور دور تک یہ خیال نہیں ہے کہ آپ اپنا ہاتھ اٹھائیں گے تو اس کے دل میں آپ کو مارنے کا جوش باقی نہ رہے گا۔ ہر شکاری کو یہ تجربہ ہو چکا ہے۔ کسی نے یہ بھی نہیں سنا کہ کوئی گایوں کا شکار کرتا ہے۔

جب 1938 میں چیکوسلوا کیہ کو ڈرا دھمکا کے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا تو گاندھی نے بد قسمت چیکوں کے لیے اپنے اہنسا کے طریقے کی تبلیغ کی۔ ''اس سے بڑی بہادری ہو نہیں سکتی کہ کسی دنیاوی طاقت کے سامنے چاہے وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، گھٹنے ٹیکنے سے سختی سے انکار کیا جائے اور یہ نفس میں کسی تلخی کے احساس کے بغیر ہو اور یہ بھی پورا اعتماد ہو کہ صرف روح باقی رہنے والی ہے اور کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔''

جن لوگوں کی نگاہ میں اس قسم کی جواں مردی ناممکن تھی، ان کو گاندھی کا یہ جواب تھا کہ وہ انسانی روح کی قوت کا اندازہ کم لگاتے ہیں۔ بہر حال ممکن اور ناممکن کا درمیانی خط محدود منجمد نہیں تھا۔ وہ اپنے اسکول کے دنوں سے ایک مثال بہت دیا کرتے تھے ''جب تک میری اقلیدسی فہم کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں، تو اقلیدس (جیومیٹری) کے باہر اصول موضوعہ کے پڑھتے اور یاد کرتے وقت میرا ذہن تیر تار رہتا تھا۔ جب آنکھیں کھل گئیں تو مجھے اقلیدس سب سے آسان علم معلوم ہونے لگا ایسا ہی بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھا ہوا حال عدم تشدد کا ہے۔ یہ تجربے اور اعتقاد کا سوال ہے ایک نقطہ بھر آگے دلیل کا نہیں ہے۔''

اس کے علاوہ وہ عدم تشدد جارحیت کا مقابلہ کرنے ہی کا ایک طریقہ نہیں تھا، یہ ایک طرز حیات بھی تھا۔ نازی اور فسطائی فوجی نظام کی قوت محرکہ کے پیش نظر یہ جذبہ تھا کہ نئی سلطنتیں تراشے اور اس کے پس پشت یہ بے رحمانہ مقابلہ آرائی تھی کہ خام مال کے لیے نئے ذرائع اور نئے بازاروں پر قبضہ جمائے اس طرح دیکھیے تو جنگوں کی جڑیں انسانوں کی حد سے زیادہ ہوس میں اور

ایک ایسی کم بصر قبیلہ پرستی میں پیوست تھیں جس نے قوم پروری کو انسان دوستی سے بلند تر مقام دے کر راج سنگھاسن پر بٹھا دیا تھا۔

ستمبر 1938 کے ''آراین پاتھ'' میں شائع شدہ ایک مضمون میں جان مڈلٹن مری نے گاندھی کو موجودہ دنیا کا سب سے بڑا عیسائی مبلغ بتاتے ہوئے لکھا تھا: 'یقیناً مجھے مغربی تہذیب کی بقا کی اس کے علاوہ کوئی اور امید نہیں دکھائی دیتی کہ عیسوی محبت کی دور دور پھیلی ہوئی تیز آگ پھر سے روشن کر دی جائے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس بس ایک ہی اور راہ رہ جاتی ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر قتل عام ہو کہ اس کے تصور سے جی تھرا جائے۔

صورت حال یہ تھی کہ عیسوی محبت کا یہ شعلہ بھڑ کنے نہیں پایا۔ تمام روشنیاں ایک ایک کر کے ختم ہو گئیں اور ستمبر 1939 میں جنگ چھڑ گئی۔

باب45

ہندوستان اور جنگ

3ستمبر 1939 کو ''گزٹ آف انڈیا' میں یہ وحشت انگیز اعلان شائع ہوا:''میں، وکٹر الگزینڈر جان، مارکوئی آف لن لتھ گو، گورنر جنرل ہندوستان اور بہ لحاظ منصب امیر البحر، اس اطلاع کی صحت سے جو مجھے ملی ہے مطمئن ہوکر، یہ اعلان کرتا ہوں کہ ملک معظم اور جرمنی کے درمیان جنگ چھڑ گئی ہے۔''

جواہر لال نہرو نے (Discovery of India) ''دی یافت ہند'' میں لکھا ہے کہ ایک شخص اور وہ بھی غیر ملکی چالیس کروڑ انسانوں کو، اُن سے ذرا بھی رجوع کیے بغیر جنگ میں جھونک دیتا ہے۔ چونکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے وفاقی حصے پر ابھی تک عمل درآمد نہیں ہوا تھا اور ہندوستان پر حکومت کی آخری ذمہ داری برطانوی پارلیمنٹ پر تھے، لارڈ بن لتھ گو کا اعلان خالص آئینی نظر سے نا قابل اعتراض تھا لیکن حکمت عملی کے اعتبار سے سے یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، کناڈا اور جنوبی کی نو آبادیوں کی طرح ہندوستان میں مرکز پر ذمہ دار حکومت کی مشینری موجود نہ تھی لیکن وایسرائے کے لیے اس امر میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ وہ صوبائی حکومتوں اور مرکزی مجالس قانون ساز کی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں سے مشورہ کر لیتے۔ پہلے ہی موسم گرما میں۔ ہندوستانیوں کو (حفظ ما تقدم کے طور پر) ملایا اور مشرق بعید میں بھیجے جانے کے

خلاف احتجاجاً مرکزی قانون ساز اسمبلی کے اس اجلاس سے کانگریس پارٹی کنارہ کش ہوچکی تھی جس میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ پاس کر کے جنگ چلانے کے لیے انتظامیہ کو دورس اختیارات دے دیے گئے تھے۔ شبہات اور عدم اعتماد کی وہ کڑیاں ڈھال لی گئی تھی جن سے پورے دورانِ جنگ میں کانگریس اور حکومت کے تعلقات کشیدہ ہوجانے والے تھے۔

اس امر کا واقع ہونا اس لحاظ سے اور بھی افسوسناک تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کی ہمدردیاں اتحادیوں کے ساتھ بے انتہا تھیں۔ کانگریس کی 'خارجہ پالیسی' کی تشکیل نہرو کے ہاتھوں میں تھی اور آمرانہ نظام حکومت سے ان کی مخالفت کسی طرح کی مصالحت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ 1938 کی گرمیوں میں میونخ کے بحران سے معاً پہلے والے زمانے میں نہرو لندن میں تھے اور انھوں نے ''مین چسٹر گارجین'' میں ایک خط شائع کرایا تھا جس میں انھوں نے شر کو کسی طرح خوش کرنے کی پالیسی پر سخت اعتراض کیا تھا۔ میونخ پر خود گاندھی کا ردعمل ان کی مخصوص حسیت کا نمائندہ تھا: ''کیا یہ منظّم تشدد کی جیت ہے؟ کیا ہر ہٹلر نے تشدد کو منظّم کرنے کی کوئی نئی تکنیک ایجاد کر لی ہے جس میں خون بہائے بغیر اس کا مقصد حاصل ہوجائے؟''

انڈین نیشنل کانگریس آمرانہ جارحیت کا شکار ہونے والوں سے مسلسل اور تواتر کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتی رہی، اگرچہ اس کے بعض طاقتور اراکین، مثلاً سبھاش چندر بوس کو اس پر شبہ تھا کہ حبشہ، چیکوسلواکیہ اور چین کی خاطر، جن کی قسمتیں ویسے بھی مہر بند ہوچکی ہیں، ہم ایسے طاقتور اقوام مثلاً جرمنی، اٹلی اور جاپان کو مخالف بنالیں۔

اس طرح دیکھیے تو اتحادیوں کے حق میں ہمدردی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا جسے برطانوی حکومت اپنا سکتی تھی۔ وائسرائے نے ہندوستانی قائدین کی رائے لیے بغیر ہندوستان کے برسر جنگ ہونے کا اعلان کر کے ان کا اعتماد کھودیا تھا لیکن انھوں نے بہت جلد اپنی اس فرد گزاشت کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے تارے گاندھی کو ملاقات کی دعوت دی۔ گاندھی پہلی ٹرین سے شملہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ انھوں نے لن لتھ گو کو بتایا کہ ان کی ہمدردیاں انگلستان اور فرانس کے ساتھ ہیں۔ اہنسا پر اعتقاد رکھنے والے انسان کی حیثیت سے وہ اتحادیوں کے مقاصد کے لیے جو کچھ پیش کر سکتے تھے وہ اپنی اخلاقی امداد تھی۔ جب وہ جنگ پر بحث کررہے تھے تو وہ ایوان عام

اور ویسٹ منسٹر ایبی کی ممکنہ بربادی کا تصور کر کے رو پڑے۔ محسوس ہو رہا تھا کہ تشدد فاتحانہ انداز سے مارچ کر رہا تھا۔

جنگ کے ابتدائی اثرات سے اُن کا دل بوجھل ہو گیا: ''میں مایوس سا ہو گیا ہو، اپنے دل کے تہ خانوں میں مستقل طور پر خدا سے تکرار کرتا رہتا ہوں کہ ایسی باتوں کے جاری رہنے کی اجازت کیوں دیتا ہے؟ میری اہنسا بالکل ہی بے دست و پا نظر آتی ہے۔ لیکن اس روز روز کی تکرار کے خاتمے پر جواب یہ ملتا ہے کہ نہ تو خدا بے دست و پا ہے اور نہ آہنسا۔ بے دست و پائی خود انسان کے دل میں ہے۔'' اُن کو تشدد کا تشدد سے مقابلہ کرنا بے سود نظر آنے لگا۔ اُن کا طریق کار متعین ہو گیا: ''چاہے میں ورکنگ کمیٹی کے یا (اگر میں حاضر شکنی کے بغیر یہ فقرہ استعمال کر سکوں) حکومت کے رہنما کی حیثیت سے کوئی کام کروں گا تو میری رہنمائی کا ارادہ مقصد یہی ہو گا کہ ان دونوں کو یا ان میں سے ایک کو عدم تشدد کی راہ پر لے چلوں، خواہ میرا یہ اقدام کتنا ہی غیر محسوس کیوں نہ ہو۔''(1)

اس طرح، جنگ کی ابتدائی منزلوں ہی میں خود گاندھی کا موقف امن پسندی کے ساحل پر لنگر ڈال چکا تھا۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ بہت کم کانگریسیوں کو یہ تجویز عملی معلوم ہو گی کہ ہندوستان بیرونی جارحیت کا دفاع عدم تشدد سے کرے۔ لیکن ان کے نزدیک اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ عدم تشدد سے اُس وقت میں دست بردار نہیں ہو سکتے تھے جب اس کو سخت ترین امتحان کا سامنا تھا: ''میرا موقف صرف میری ذات تک محدود ہے۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ میرے سونے راستے پر کوئی رفیق سفر کہاں ملتا ہے؟...... چاہے ایک ملے یا بہت سے میں یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوں کہ ہندوستان کے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے بھی تشدد سے قطع تعلق کر لے۔''(2)

بسمارک نے ایک بار سیاست کی یہ تشریح کی تھی کہ یہ ممکنات کا فن ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو اس موقع پر گاندھی کا نقطۂ نظر ایک سیاستداں کا نہیں بلکہ ایک پیغام بر کا تھا۔ اُن کے عقیدے کی شدت بعض اوقات نصب العین اور حقیقت کے درمیان فرق کو دھندلا دیتی تھی۔ ایک عالمی جنگ کے

---

(1) ''ہری جن'' 30 ستمبر 1939

(2) ''ہری جن'' 16 اکتوبر 1939

دوران، جب ممالک جنگی حکمت عملی کے ماہرین کے منصوبوں میں کٹھ پتلیاں بنے ہوئے تھے اُس وقت انھوں نے اس کو پھر دُہرایا کہ ہندوستان کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ اس تجویز میں اُن بدطینت، جوع الارض میں مبتلا اور طاقت کے پیچھے دیوانے حکومتی نظاموں سے گویا نگاہیں موڑ لی گئی تھیں جو دنیا بھر پر اپنا ہی قبضہ جمانے کے مقصد کے حصول کے لیے کسی امر سے بھی باز آنے والے نہیں تھے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندوستان کے عوام مضبوطی سے ''نہیں'' کہنا سیکھ جائیں تو غیر ملکی فوجیں اس سرزمین پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرسکیں گی۔ ہندوستان کی معیشت کی تشکیل نو اس نہج پر ہوگی کہ سیاسی جارحیت کرنے والے کے لیے کوئی کشش باقی نہ رہے گی۔ لیکن ہندوستانی معیشت کی تشکیل نو کا وقت کہاں تھا اور وہ عوام جو (خود گاندھی کے معیاروں سے) اتنی بھی سچی اہنسا کا جذبہ پیدا نہ کرسکے تھے کہ برطانوی حکومت کو نکال باہر کریں، اُن میں اتنی غیر متشدد طاقت کہاں سے یکا یک نمودار ہوسکتی تھی کہ وہ مسلح حملے پسپا کرسکیں؟ راج کوٹ کے واقعے کے دوران، ابھی چند ہی مہینے پہلے مہاتما نے یہ تسلیم کیا تھا کہ وسیع پیمانے پر غیر متشدد تحریک چلانے کے لیے حالات موافق نہیں تھے اور عوام میں معقول تربیت اور نظم وضبط نہیں تھا۔ اگر ایک چھوٹی سی ریاست میں سول آزادی کے حصول کی خاطر خود اپنی رہنمائی میں غیر متشدد تحریک چلانے میں مشکلات کا سامنا تھا تو غیر متشددانہ تکنیک کا غیر ملکی جارحیت کے مقابلے میں استعمال کیسے ممکن ہوسکے گا، یہ بات واضح طور سے غیر یقینی تھی۔

انڈین نیشنل کانفرنس امن پرستوں کی جماعت نہیں تھی۔ اس نے جنگ آزادی میں عدم تشدد کو قبول کرلیا تھا، لیکن اس کو عقیدہ نہیں بنایا تھا کہ ہر زمانے میں اور ہر حالت میں اس پر عمل پیرا رہے گی۔ ممتاز کانگریسی، جن میں موتی لال نہرو شامل تھے، برطانوی ہند کی فوج کے افسروں کے مستقل عملے ہندوستانیوں کی شمولیت سے دل چسپی لے رہے تھے اور اُن میں سے کسی کے تصور میں شاید ہی یہ بات رہی ہو کہ آزاد ہندوستان میں فوج یا پولیس کی ضرورت نہ ہوگی۔ زیادہ تر کانگریسی جنگ کو عدم تشدد کے نہیں بلکہ ہندوستان کی حکومت خود اختیاری کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ پہلی عالمی جنگ میں تلک، اینی بسینٹ اور دوسرے پُر جوش قوم پروروں نے جنگی کوششوں میں دل کھول کر شامل ہونے کی یہ شرط رکھی تھی کہ پہلے سیاسی آزادی دی جائے۔ ایک

چوتھائی صدی بعد، جب کہ ملک زیادہ بیدار ہو چکا تھا،قوم پروروں سے یہ امید ہی نہ رکھنا چاہیے تھی کہ اُن کا مطالبہ اس سے کچھ کم ہوگا۔ ہندوستانیوں کے لیے ایسے وقت میں چیکوسلواکیہ اور پولینڈ میں آزادی اور جمہوریت کے جھنڈے کو بلند رکھنے کے لیے جنگ کرنا جب کہ خود اُن کا ملک غلامی میں جکڑا ہو، کھلا ہوا تضاد ہوتا۔ اتحادیوں کے مقصد سے جو لوگ دلی ہمدردی رکھتے تھے اُن کے پیش نظر ایک اور خیال بھی تھا۔ اب جنگیں دور دراز کے جنگی میدانوں میں دو پیشہ ور فوجوں کے مابین زور آزمائیاں نہیں رہ گئی تھیں بلکہ اب قوم کی قوم کو کارکنوں اور یا سپاہیوں کی آمادۂ کار کرنا ہوتا تھا۔ جب تک برطانیہ ہندوستان کو ایک مشترک مفاد کے لیے برابر کا حصہ دار بنا کر اس ملک کی طاقتوں کو آزاد نہیں کر دیتا، اُس وقت تک اس عالمی جدوجہد میں ہندوستان کے لیے پوری طرح شامل ہونا ممکن نہیں تھا۔

14 رستمبر 1939 کے رزولیوشن میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اُن لوگوں سے اظہار ہمدردی کیا جو نازی جارحیت کا مقابلہ کر رہے تھے اور نازیت کے خلاف جنگ میں اپنی عملی امداد کی پیش کش کر رہے تھے۔ لیکن یہ عملی امداد ''برابر والوں کے مابین، باہمی رضامندی سے ایسے مقصد کے لیے'' ہوگی ''جسے طرفین مستحق امداد سمجھیں۔'' کمیٹی نے برطانوی حکومت کو دعوت دی کہ وہ غیر مبہم الفاظ میں جمہوریت اور سامراج کے بارے میں اپنے مقاصد جنگ کا اعلان کرے اور خاص طور سے یہ بتائے کہ اِن مقاصد کو ہندوستان میں کس طرح بروئے کار لایا جائے گا۔ کسی اعلان کی اصل کسوٹی یہ ہے کہ حال پر اس کا نفاذ کیسے ہوگا کیوں کہ یہ حال ہی ہے جس کے ماتحت آج جس طرح عمل کیا جائے گا اسی پر مستقبل کی تشکیل ہوگی۔

اس طرح کانگریس نے برطانیہ کے سامنے دو سوال رکھے: یہ واضح کیا جائے کہ اس نظام کی شکل کیا ہوگی جس کے لیے جنگ لڑی جارہی ہے اور جس جمہوریت اور آزادی کے لیے ہندوستان سے لڑنے کو کہا جارہا تھا اس کا کچھ مزہ پہلے سے بھی چکھنے کو دے۔ برطانوی سیاستداں کو ان سوالات میں غیر عملی انتہا پسندی اور بدطینت موقع پرستی کی بو محسوس ہوئی۔ جنگ کے زمانے میں کس طرح دور رس آئینی تبدیلیوں کی کوشش کی جاسکتی تھی؟ کیا یہ عاقلانہ یا عملی بات تھی کہ ہندوستان کے آئینی مستقبل کے مسئلے کو از سرِ نو چھیڑ کر ایک خوفناک بحث ومباحثے اور خطرناک بے

چینی کے دروازے ملک میں کھول دیے جائیں؟ برطانوی حکومت یا پارلیمنٹ کو اتنا وقت کہاں مل سکتا تھا کہ وہ اس طرح کے تھکا دینے والے طریق کار کو اپناتیں جو 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے پاس ہونے کے پہلے انھیں درپیش ہوا تھا؟ کانگریس کے مطالبات کو مسلم لیگ کے دعاوی سے منطبق کیسے کیا جاتا جب کہ موخرالذکر کانگریس کے بنیادی مقدمے ہی پر چوں چرا کررہی تھی؟ 1939 میں کانگریس کے موقف پر یہ اور اسی قسم کے دوسرے اعتراضات غالبًا برطانوی ردّعمل کو متاثر کررہے تھے۔ برطانوی نقطۂ نظر سے، کانگریس کے مطالبے کو تسلیم کرلینے میں واقعی مشکلیں تھیں لیکن اگر جنگ کے شروع کے چند ہفتوں میں تھوڑی سی مآل اندیشی اور تھوڑی سی ہمت سے کام لیا گیا ہوتا تو شاید عدم اعتماد کا وہ سلسلہ پلٹا جاسکتا تھا جس نے آگے بڑھ کر سمجھوتے کو ناممکن بنادیا۔

بہرحال، نہ تو نیول چیمبرلین کی سربراہی میں برطانوی کابینہ اور نہ لارڈ لن لتھ گو کی قیادت میں حکومت ہند دور اندیشانہ پالیسی بنانے کی اہلیت رکھتی تھی۔ 40-1939 میں اُن کے ذہن اُس جگہ سے ایک گز بھی آگے نہیں بڑھے تھے جہاں وہ 1937 میں، بلکہ یوں کہیے کہ 1935 میں تھے۔ جیسا کہ ایک برطانوی اخبارنویس نے کہا ہے۔

''ہم امید کرتے ہیں کہ فتح یابی کی صورت میں ہم اہل آسٹریلیا کو آزادی دلائیں گے۔ ہمارے ذہنوں میں کبھی یہ بات آئے گی ہی نہیں کہ اُن کا آئین ہم دسٹ منسٹر یا پیرس میں تیار کریں گے...... لیکن ہندوستان کے معاملے میں یہ بات ایک اٹل اصول کی طرح ہمارے حکمرانوں کے اذہان میں جم کے رہ گئی ہے کہ خدائے انگریز ہی اُس گھر کا نقشہ ترتیب دے گا۔ جس میں ہندوستانیوں کو رہنا ہے۔ ہمارے سِول حکام مسودہ تیار کریں گے۔ ہماری پارلیمنٹ بل کی ایک ایک دفعہ پر مباحثہ کرے گی۔ اُن سفیدفاموں کے ووٹر جو کلیفم اور کارڈف کے سامنے جوابدہ ہیں۔ یہ فیصلہ کریں گے کہ ہندوستان میں دو ایوان ہوں گے یا ایک اور حق رائے دہندگی وسیع ہوگا یا ملکیت پر مبنی۔''(1)

مدتوں انتظار کے بعد 17/اکتوبر 1939 کو وایسرائے نے جو بیان دیا بھی تو اُس میں

(1) بریلس فورڈ، بحوالہ ''ہری جن'' مورخہ 16/مارچ 1940

مقاصد جنگ کی اُس سے زیادہ وضاحت سے انکار کردیا جو برطانوی وزیراعظم پہلے ہی کر چکے تھے۔ یعنی یہ کہ نوآبادیاتی درجہ ہی برطانوی پالیسی کی منزل مقصود ہے۔ جنگ کے خاتمے پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 پر نظر ثانی ہوسکتی ہے اور جنگ کو چلانے کے سلسلے میں ہندوستانی رائے عامہ کی شمولیت ایک مشاورتی کاونسل کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ اِن مراعات سے ہندوستان میں خوش اور اُمنگ پیدا کرنے کا امکان ناممکن تھا۔ وایسرائے نے اقلیتوں کی جانچو اشارہ کیااور جس میں انھوں نے والیان ریاست اور یورپیوں کو بھی شامل کرلیا تھا، اُس سے کانگریسیوں کا پیمانۂ ضبط لبریز ہوگیااور گاندھی نے ایک چبھتا ہوا تبصرہ کیا: ''برطانوی حکومت نے فرقہ وارانہ سوال ہندوستانیوں کے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے اٹھایا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس موقع پر بھی گانگریس اور لیگ کو باہم لڑانے کا کھیل جاری ہے۔ مجھے امید تھی کہ یورپ جس عظیم بحران سے دوچار ہے اُس کے پیش نظر انگریزی سیاستدانوں کی آنکھیں کچھ اور کھلی ہوں گی۔''(1)

مسلم لیگ نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اس کا فیصلہ مسلمان ہی کریں گے کہ ہندوستان کے آنے والے آئین میں اُن کی پوزیشن کیا ہوگی اور مسلم لیگ کو مسلمان قوم کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لینا چاہیے جنگ سے مسلم لیگ کی سودے بازی کی طاقت میں اضافہ ہوگیا تھا اور جناح اس صورت حال کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے۔ نومبر 1939 ایک طرف وائسرائے اور دوسری طرف کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے مابین کئی کانفرنسیں ہوئیں لیکن سیاسی تعطل کا خاتمہ نہ ہوسکا۔

جب 1940 کے موسم گرما میں نازی فوجوں نے مغربی یورپ کو تاخت وتاراج کردیا تو اس تعطل کو ختم کرنے کی نئی تحریک ملی۔ یہ دیکھ کر کہ جزیرۂ برطانیہ زبردشت مشکلات کے مقابلے میں تن تنہا جنگ کررہا ہے، ہندوستان میں ہمہ گیر ہمدردی کی لہرسی دوڑ گئی۔ یہ بات بھی بالکل ظاہر تھی کہ اگر برطانیہ جرمن حملے کے طوفان کو روکنے میں ناکام رہتا تو کوئی اور شئے ہٹلر کو بحیرۂ روم پر اقتدار جما کر ہندوستان میں مارچ کرتے ہوئے چلے آنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ اس منڈلاتے ہوئے خطرے کا تقاضا تھا کہ نئی راہ نکالی جائے۔ اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے یہ اعلان کیا کہ اگر

(1) ''ہری جن'' مورخہ 11 نومبر 1939

برطانوی حکومت جنگ کے بعد ہندوستان کی آزادی کا غیر مبہم اعلان کردے تو کانگریس ملک کے موثر دفاع کے لیے ایک عارضی قومی حکومت میں فوراً شامل ہو جائے گی۔ بعض کانگریسی لیڈروں نے اس پیش کش کو پسپائی سے تعبیر کیا۔ اس میں جواہر لال نہرو بھی شامل تھے۔ لے دے کے اس کا بس ایک جواز جرمن فوجیت کے خطرے سے پیدا شدہ نازک صورت حال تھی۔

حکومت برطانیہ کو یہ پیش کش کرنے میں کانگریس دل سے شریک تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سلسلے میں وہ گاندھی تک کا ساتھ چھوڑنے پر رضا مند ہوگئی۔ ہم ابھی یہ دیکھ چکے ہیں کہ نازیت جس تشدد اور فوج آرائی کی نمائندگی کرتی تھی اس سے نفرت کے باوجود، اور اتحادیوں سے ہمدردی رکھنے کے باوجود، گاندھی کا عقیدہ یہ تھا کہ تشدد کو صرف عدم تشدد کے ذریعے بے اثر بنایا جا سکتا تھا۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ کانگریس یہ اعلان کرے کہ وہ مسلح جارحیت کا مقابلہ بھی غیر متشدد مقاومت سے کرے گی۔ بیشتر کانگریسی اس مشورے کے قابل عمل ہونے پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ بہر حال، جب تک کانگریس نے حکومت سے تعاون کرنے کا فیصلہ کیا ہی نہیں تھا یہ سوال نہیں اٹھتا تھا کہ یہ تعاون کیا اخلاقی یا مادی شکل اختیار کرے گا۔ جب کانگریس نے جنگ کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے عارضی حکومت میں شمولیت کی پیش کش کر ہی دی تو گاندھی نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایسی پالیسی سے کوئی علاقہ نہیں رکھ سکتے تھے جس پر اُن کا اعتقاد نہ ہو۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے معیاروں کے اس اختلاف کو تسلیم کیا جس سے گاندھی کو کانگریس سے رشتہ توڑنا پڑا: ''کانگریس ورکنگ کمیٹی اس خیال پر قائم رہتے ہوئے کہ کانگریس کو حصول آزادی کے لیے عدم تشدد کے اصول پر بدستور اور سختی سے قائم رہنا چاہیے۔ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وہ گاندھی کے ساتھ آخری حد تک نہیں جا سکتی لیکن وہ یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ خود وہ آزاد ہیں کہ اپنے عظیم مقصد کے لیے کوششیں کرتے رہیں۔

باب46

اختلافات میں توسیع

1940 کے اس اندیشہ ناک موسم گرما میں کانگریسی لیڈر یہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ وہ حکومت سے تعاون کی شرطیں ہر ممکن حد تک ہلکی کر چکے تھے۔ انھوں نے تو یہ بھی گوارا کر لیا تھا کہ گاندھی کے قیادت سے محروم ہو جائیں۔ انھیں امید تھی کہ اس کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانب سے کوئی جرأت مندانہ اور خیال افروز پیش رفت ہوگی۔ ''ایک دل خوش کن نفسیاتی جھٹکا'' جس سے ماضی کے شبہات دہل جائیں گے اور عوام میں نیا جوش و خروش پیدا ہو جائے گا۔

ملک معظم کی حکومت کی جانب سے وائسرائے نے 8 راگست کو جو اعلان کیا اس میں ایسی پیش رفت کی بے سود تلاش ہوتی رہی۔ یہ بات تو مان لی گئی تھی کہ آئینی اسکیم کی تشکیل کی ابتدائی ذمہ داری ہندوستان کے عوام کی ہوگی لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی جڑی ہوئی تھی ایسے زمانہ میں اس تشکیل کے کام کو ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا، جب برطانیہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مشغول ہو اس میں حسب معمول ان ذمہ داریوں کا تذکرہ تھا جو ہندوستان سے مدتوں وابستہ رہنے کی وجہ سے برطانیہ پر عائد ہوتے تھے اور جن سے وہ دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ اس میں یہ معنی خیز بیان بھی تھا کہ حکومت برطانیہ ''ہندوستانی عوام کے امن و ترقی سے متعلق اپنی موجودہ ذمہ داریاں کسی ایسے نظام حکومت کو منتقل کرنے کا تصور نہیں کر سکتی جس کا حاکمانہ اختیار تسلیم کرنے سے

ہندوستان کی قومی زندگی کے بڑے اور طاقتور عناصر کو براہ راست انکار ہو اور وہ ایسے کام میں بھی شریک نہیں ہوسکتی جس میں یہ عناصر جبری طور پر اس طرح کی حکومت میں شامل کیے جائیں۔''
اس طرح کی بات کے کہنے کی ضرورت ہی کیا تھا؟ کوئی بھی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ وہ ملک کی قومی زندگی کے برے اور طاقتور عناصر کو مجبور کرے گی چاہے اس قسم کے فقروں کے مصنفین کے دل میں یہ بات رہی ہو یا نہ رہی ہو، لیکن ایسے فقیروں کے استعمال کا مقصد یہی ہوسکتا تھا کہ مسلم لیگ کے بے لچک رویے کی ہمت افزائی ہو اور کانگریس۔لیگ مصالحت اور مشکل ہو جائے۔لطف یہ تھا کہ حکومت اسی مصالحت کو ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں قابل لحاظ اختیارات دینے کی شرط لازم سمجھے ہوئے تھی۔

فوری طور سے ہونے والی آئینی تبدیلیوں میں وائسرائے کاؤنسل میں توسیع کر کے کچھ ''نمائندہ ہندوستانیوں'' کا شامل کیا جانا اور ایک ایسی ''جنگی مشاورتی کاؤنسل'' کا قیام شامل تھا جس میں صوبوں اور ریاستوں اور بحیثیت مجموعی ''ہندوستان کی قومی زندگی'' کے دوسرے مفادات کی نمائندگی ہو۔

کانگریسی لیڈروں کا ردّعمل مکمل مایوسی کا تھا۔ جنگ کے خاتمہ پر آزادی کا وعدہ بہت مبہم تھا۔ بظاہر ''آئین ساز اسمبلی'' کی اصطلاح کے استعمال سے عمداً گریز کیا گیا تھا کیا مستقبل کا آئین ساز ادارہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس کی تاریخ دہرائے گا؟ جواہر لال نہرو نے ''جدا جدا راستے'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ ''(جنگ کے بعد) ہمیں جواہرات سے لدے مہاراجاؤں، پٹکے بندھے ہوئے رئیسوں، یورپی صنعت کاروں، فرقہ پرست زعما، بڑے بڑے زمینداروں اور تعلقہ داروں، ہندوستانی صنعت کاروں امپیریل سروس کے نمائندوں اور معدودے چند عوامی انسانوں کو عالی مرتبت صحبت ملے گی۔(ارادہ تو یہی ہے اب اگر قسمت کچھ اور فیصلہ کردے تو اور بات ہے!) یہ سب غالباً وائسرائے کی صدارت میں باہم مل بیٹھیں گے اور ہندوستان کا آئین بنائیں گے! ہندوستان اس طرح اپنے حق خودمختاری کا استعمال کرے گا۔''

جہاں تک والیان ریاست، اقلیتوں، دفاع اور سکریٹری آف اسٹیٹ کی ملازمتوں کی

حیثیت کا تعلق ہے۔ اس مجلس کے فیصلے برطانیہ کی ''خصوصی ذمہ داریوں'' کے تابع ہوں گے۔ مستقبل قریب میں ملک کو ایسی قومی حکومت ملنے نہیں جا رہی تھی جس کے پاس واقعی اقتدار ہو بلکہ وائسرائے کی اگزیکیوٹیو کاؤنسل کا ایک ایسا اضافہ شدہ ایڈیشن ملنے والا تھا۔ جس میں زیادہ تر وہ ہندوستانی ہوں گے جو اپنے سوا کسی اور کی نمائندگی نہ کرتے ہوں گے اور زیادہ امکان یہ تھا کہ اپنی طاقتیں ایک دوسرے کے اثر کے توڑ میں صرف کر رہے ہوں گے۔

برطانوی حکومت اپنے خیال میں 1940 کے موسم گرماں میں ہندوستان کے لیے زیادہ سے زیادہ ''اگست کی پیش کش'' تک جا سکتی تھی اور کانگریس کم سے کم جو قبول کر سکتی تھی یہ اس سے بھی کم تھا۔ کانگریس کو اس بات سے بڑی چوٹ لگی کہ ایسے عظیم بحران کے زمانے میں بھی تعاون کی اپیل پر حکومت لبیک کہنے سے گریزاں رہی۔ مایوسی اس لیے اور بھی زیادہ ہوئی کہ ان میں بہت سے لوگ حکومت اور ملک کو درپیش ایمرجنسی میں تعاون کرنے پر واقعتاً آمادہ تھے۔ جس مضمون کا ابھی حوالہ دیا گیا ہے اس میں نہرو نے لکھا تھا کہ ''مجھے خبر ملی ہے کہ برطانوی حکومت کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ ہم اس کے احکام کے آگے چپ چاپ سر تسلیم خم کر دیں گے، کیوں کہ ہم نے اب تک خموشی اختیار کر رکھی تھی۔ آج کی بمباری جہازوں، ٹینکوں اور مسلح فوجوں کی دنیا میں، ہم کتنے کمزور ہیں۔ ہماری فکر کیوں کیجیے۔ لیکن غالباً آج کی ہتھیاروں سے لیس دنیا میں بھی ایک ایسی چیز ہے جسے انسان کی روح اور قوم کی روح کہتے ہیں جو نہ تو خوار ہے اور نہ کمزور اور جس سے خطرہ مول لیے بغیر نگاہیں موڑی نہیں جا سکتیں۔''

اس بات کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے مرحلے پر جب برطانیہ کو بقائے وجود کی جنگ میں زبردست دشواریوں کا سامنا تھا۔ برطانوی حکومت کا مفاد ہندوستانی لیڈروں کو جال میں پھنسانے کی تدبیر کرنے سے وابستہ کیوں کر ہو سکتا تھا۔ برطانوی حکومت کانگریسی لیڈروں کا تعاون حاصل کرنے کی آرزومند تھی، لیکن وہ محسوس کرتی تھی کہ ''اگست کی پیش کش'' وہ آخری حد ہے جہاں تک (یہ خیال خویش) جنگی کوششوں کو نقصان پہنچائے اور مسلم لیگ کو ناراض کیے بغیر وہ جا سکتی تھی۔ سرکاری حلقوں کا خیال تھا کہ حکومت کو جنگی ضرورتوں کے لیے تمام روپیہ پیسہ، آدمی اور سامان برابر ملتا ہی جا رہا ہے۔ کانگریس کی حکومت میں شرکت ایک بوجھ بن سکتی تھی۔ جناح نے بھی قومی

حکومت کے مطالبے کی تنقید کی تھی۔ اس لیے بعد کے واقعات کی روشنی میں یہ کہنا مشکل ہے کہ کانگریس اور لیگ کی مشترکہ حکومت اس وقت بن بھی سکتی تھی یا نہیں اور بن بھی جاتی تو خرخشے کے بغیر چل بھی سکتی تھی یا نہیں۔ 8/اگست 1940 کو یعنی ٹھیک اسی دن جب کہ سیاسی تعطل کو ختم کرنے کے لیے تجویزات کا اعلان ہوا، وائسرائے نے گورنروں کو جو خفیہ خط بھیجا اسی سے پتہ چلتا ہے کہ خود حکومت کو ''اگست کی پیش کش'' کے بارے میں کچھ زیادہ خوش فہمی نہیں تھی:

''محکمہ داخلہ نے ابھی ابھی تمام صوبائی حکومتوں کے چیف سکریٹریوں کو ایک خط کے ساتھ انقلابی تحریک آرڈی ننس Revolutionary Movement Ordinance کی ایک نقل بھیجی ہے......آپ کی حکومت نے غالباً یہ بات محسوس کی ہوگی کہ خط کا لہجہ بہت ہی عمومی ہے اوراس میں شروع سے آخر تک انقلابی تحریک کا ذکر ہے لیکن نہ تو اس تحریک کی نوعیت کی تعین کی گئی ہے۔ اور نہ اس پارٹی یا پارٹیوں کی جو اس کے چلانے کی ذمہ دار ہوسکتی ہیں۔

''جب کہ پہلے پیراگراف میں اشارہ ہے، ایسا عمداً کیا گیا ہے۔ شروع میں ارادہ یہ تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس اوراس کی طرف سے چلائی جانے والی سول نافرمانی تحریک کا صاف طور سے نام لیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے افسران حسب ضرورت بین السطور کو پڑھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ کریں گے، کیوں کہ اب بھی یقینی طور پر کانگریس ہی سے ٹکراؤ کی صورت حال پیش نظر ہے۔ لیکن دو ایسے خاص امور ہیں جن کے سلسلے میں سرکاری خط پر کچھ اضافہ ضروری ہے میں نے اسی طریقۂ کار کو اپنایا ہے۔ اس کے بعد یہاں جو کچھ لکھ رہا ہوں، میں چاہوں گا کہ آپ وہ باتیں چیف سکریٹریوں کو زبانی بتا دیں۔

''سب سے پہلے آپ کو یاد دلاؤں کہ پچھلی تحریک سول نافرمانی کے موقع پر پوری کانگریس کو غیر قانونی ادارہ نہیں قرار دیا گیا تھا۔ اور (اب بھی) یہی رائے ہوگی کہ قانونی فوجداری ترمیمی ایکٹ کے ماتحت جو اعلانیہ جاری کیا جائے اس کو ہر صوبے میں کانگریس ورکنگ کمیٹی اور صوبائی اور مقامی کمیٹیوں تک ہی محدود رکھنا کافی ہوگا۔ بہر حال پوری کانگریس کے خلاف اقدام کرنے میں بھی یہ خوبی ہے کہ یہ آسان ہے اس کے علاوہ میں شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ حالات میں کانگریس کے کسی حلقے کی طرف سے اعلان جنگ کا اگر کوئی جواب ممکن ہے تو یہی ہوگا کہ ہم

بالاعلان یہ قطعی ارادہ کرلیں کہ اس ادارے کو بحیثیت مجموعی کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اور آپ کی حکومت اس رائے سے متفق ہوں گے۔

''دوسرا مرحلہ گاندھی کی گرفتاری اور گرفتاری کے بعد ان سے سلوک کے سوال کا ہے جو صورت حال مدنظر ہے اُس میں گاندھی کو کسی ایسی کارروائی سے مستثنا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے جو دوسرے لیڈروں کے خلاف کی جائے گی لیکن ان کی خاص پوزیشن اور اس کے قبل جو صورت پیش آچکی ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ تقریباً یقینی طور سے بہتر ہوگا کہ انھیں پونا میں انھیں انتظامات کے ساتھ نظر بند کیا جائے جو پچھلے موقع پر کیے گئے تھے۔ وہ کہاں گرفتار رہوں گے، کس خاص قانون کے ماتحت نظر بند کیے جائیں گے اور اس طرح کی دوسری تفصیلیں طے کرنے کی فی الحال ضرورت نہیں ہے۔''

''جنگ'' چھڑ جانے کی صورت میں کانگریس کا قلع قمع کرنے کا منصوبہ بنانے میں لارڈ لِن لتھ گو نے گویا اپنے پیش رو کی کتاب کا ایک ورق نکال لیا تھا۔ صوبائی حکومتوں کو آرڈی ننس کا جو مسودہ بھیجا گیا تھا، وہ ایک جامع و مانع دستاویز تھی۔ اس میں عوامی زندگی کا ہر پہلو سمیٹ لیا گیا تھا اور انتظامیہ کو لامحدود اختیارات دے دیے گئے تھے مسودے کے ساتھ جو خط بھیجا گیا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کے خلاف ہر تحریک کا دو مرحلوں میں مقابلہ کرنا تھا۔ ''تیاری کی منزل'' میں چاہے حکومت کے مخالفین نے اعلان جنگ نہ بھی کیا ہو، وہ اپنے کو عمل کے لیے منظّم کر رہے ہوں گے۔ اس مرحلے پر تھوڑے تحمل کی اجازت ہے لیکن یہاں بھی وہ ساعت آسکتی ہے کہ ''کھلم کھلا اعلان جنگ کا انتظار کیے بغیر حکومت کو یہی قرین مصلحت معلوم ہو کہ عوام کے درمیان بد دلی پھیلنے کو روکنے کی خاطر خود ہی جارحانہ قدم اٹھا لیا جائے ......اس معاملے میں (اور ان تمام معاملوں میں بھی جو قطعی طور پر بے دلی پھیلانے والے ہوں) تمام (صوبائی) حکومتوں کی پوزیشن اب پہلے کے مقابلے می ں زیادہ مضبوط ہے، کیوں کہ اب ڈیفینس آف انڈیا رولز (ضوابط برائے دفاع ہند) موجود ہیں۔ ان کے ماتحت تمام حفاظتی کارروائیوں کے اختیارات حاصل ہیں۔ ان میں حفاظتی نظر بندی خاص طور سے شامل ہے۔''

جب ارباب اقتدار کے احکام کی خلاف ورزی کی تحریک واقعتاً شروع ہو جائے تو اس کو ایسا

''جنگجویانہ اقدام سمجھنا ہوگا جس کا مقصد بادشاہ کے دشمنوں کی امداد ہو۔'' گزشتہ تجربات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس طرح کی تحریکیں منظم کرنے والوں کو اوّلین فرصت میں پہل کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دینے میں کیا فائدے ہیں اور حکومت ہند کا یہ ارادہ ہے کہ جیسے ہی ایسی تحریک قابل شناخت شکل اختیار کرے، حکومت کے تمام ذرائع کو کام میں لا کر شروع ہی میں اُسے کچل دینا چاہیے اور اس کا موقعہ ہی نہ آنے دیا جائے کہ تحریک کی رفتار میں کوئی تیزی آ سکے۔''

آرڈی ننس کے ذریعے صوبائی حکومتوں کو مشتبہ لوگوں کی گرفتاری اور نظر بندی، یا ان پر پابندیاں لگانے، اشخاص اور مقامات کی تلاشی، دولت، عمارت، دستاویزات اور جائداد منقولہ کی ضبطی مطبوعات، ڈرامے کی نمائش، فلم، عام افادیت کے اداروں، ڈاک اور تار، ٹیلیفون، وائرلیس اور براڈ کاسٹنگ پر کنٹرول، کرفیو کے نفاذ، مزید پولیس کی تعیناتی، اجتماعی جرمانوں کی سزا، رضا کار جماعتوں کے خلاف کارروائی کرنے اور اسی قبیل کے اور بھی اختیارات دے دیے گئے تھے۔ اس فرمان (آرڈی ننس) کے تحت جو جرم قابل سزا قرار پائے تھے ان میں افواہوں کا پھیلانا ضبط شدہ دستاویزوں کے اندرجات کی نشر و اشاعت، نقلی جنازے نکالنا، خاص خاص مال یا اشیا کا بائیکاٹ کرنا شامل تھے۔ صوبائی حکومتوں کو جو خط بھیجا گیا تھا اس میں لیڈروں کی حفاظتی نظر بندی کی جانب ایک معنی خیز اشارہ بھی تھا: ''جیسے ہی عملی مرحلے کا آغاز ہو، ہمارا منشا یہ ہے کہ ایسے تمام افراد فوراً گرفتار کر لیے جائیں جو تحریک کو منظم کرنے اور چلانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ یہ ضروری ہوگا کہ یہ اقدام فوری اور مکمل طور پر کیا جائے تا کہ آغاز ہی سے تحریک درہم و برہم ہو جائے۔''

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ صوبائی حکومتوں کو اس ہمہ گیر فرمان کا مسودہ 2 اگست کو بھیجا گیا تھا یعنی آئینی تعطل کے حل کی جو تجاویز وائسرائے پیش کرنے والے تھے اس کے اعلان کو ایک ہفتے سے بھی کم مدت باقی رہ گئی تھی اور گورنروں کے نام وائسرائے کا ذاتی خط تو ٹھیک اسی دن جاری کیا گیا جس دن ''اگست کی پیش کش'' عوام کے سامنے لائی گئی۔

اگر حکومت کو یہ امید تھی کہ گاندھی اس وقت کانگریس کو عوامی تحریک کی جانب لے چلیں گے تو وہ انتہائی غلط اندازہ لگانے کی مجرم تھی۔ گاندھی کی سچ مچ یہ تمنا تھی کہ دوران جنگ حکموت کو پریشان

کن صورت حال میں مبتلا نہ کیا جائے اور کانگریس کے لیڈر اتحادیوں کے مقاصد کے انجام سے کچھ ایسے فکر مند تھے کہ اس منزل پر عوامی تحریک ان کے مدنظر ہی نہیں تھی۔ اس کے باوجود ''اگست کی پیش کش'' میں حکومت کے جس رجحان کا مظاہرہ ہو رہا تھا اس سے اتنی زبردست بددلی پھیلی گئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح کے عملی اقدام کا جذبہ ابھر کر سامنے آ گیا تھا۔

جواہر لال نہرو کے جس مضمون کے اقتباسات اس کے پہلے پیش کیے گئے ہیں وہ زبان حال سے اور بہترین انداز میں اس بددلی کا اظہار کر رہا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ''برطانوی حکومت کے اعلان سے وہ نازک سا رشتہ بھی ٹوٹ گیا جو ہمارے ذہنوں کے مابین قائم تھا۔'' آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلاس ستمبر 1940 میں بمبئی میں ہوا اور اس میں حکومت کی تجاویز کو کلی طور پر نامنظور کر دیا گیا۔ اب جنگی کوششوں کو بڑھاوا دینے میں حکومت کے تعاون کا مسئلہ باقی ہی نہیں رہ گیا تھا اس لیے یہ بحث بھی بے معنی ہو گئی کہ ایسا تعاون عدم تشدد پر مبنی ہو گا یا تشدد پر۔ اب اس کا کوئی محل نہیں رہ گیا تھا کہ گاندھی اور کانگریس دو الگ الگ راہوں پر چلیں۔ اس لیے کانگریس نے ان سے استدعا کی کہ وہ پھر سے قیادت سنبھال لیں۔ کانگریس حکومت کی پالیسی کے خلاف احتجاج کرنا چاہتی تھی اور اس سلسلے میں وہ گاندھی سے رہنمائی کی طالب تھی۔

جس بات پر حکومت اور کانگریس کے درمیان خلیج وسیع ہو گئی تھی وہ ایک سیاسی سوال تھا۔ یعنی مستقبل میں ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے برطانوی حکومت کا مؤثر یقین دہانی سے انکار روزانہ حال میں اس کے ارادوں کے عملی ثبوت کی فراہمی۔ لیکن گاندھی نے اپنی احتجاجی مہم کی بنیاد سیاسی سطح پر نہیں بلکہ امن پسندی کی سطح پر رکھی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر برطانیہ ہندوستانی عوام کو آزادی کی گارنٹی نہیں دے سکتا تھا تو وہ آزادی کا حق تو دے سکتا تھا اور اس میں یہ حق بھی شامل ہے کہ ہندوستان کے عالمی جنگ بلکہ کسی بھی جنگ میں شمولیت کے خلاف تبلیغ کی جا سکے۔

ان کے بعض ساتھی بالخصوص بائیں بازو کے کانگریسی یہ دباؤ ڈال رہے تھے کہ عوامی تحریک چلائی جائے لیکن گاندھی نے اس کو نہیں مانا انھوں نے یہ طے کیا کہ سول نافرمانی منتخب افراد تک محدود رہے گی۔ انھوں نے ستیہ گرہوں کو جو ہدایتیں دیں اور جس کی ایک نقل انھوں نے خوش دلی سے وائسرائے کو بھی بھیج دی، ان میں عوامی جوش و خروش پیدا کرنے اور حکام کو کسی طرح پریشان

کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے پیروؤں پر جو پابندیاں عائد کی تھیں وہ حیرت خیز ہیں۔ گاندھی نے ستیہ گرہوں کی فہرست کو خود دیکھ کر منظوری دینے پر اصرار کیا اور ستیہ گرہوں کے لیے یہ لازم قرار دیا کہ وہ ستیہ گرہ کرنے کی تاریخ اور وقت کی اطلاع پہلے سے ضلع مجسٹریٹ کو دے دیں، شہروں میں پبلک جلسوں کی ہمت افزائی نہیں کرنا تھی۔ ستیہ گرہیوں کو مندرجہ ذیل نعرہ دہرانا تھا:

''برطانیہ کی جنگی کوششوں میں آدمی اور پیسے سے مدد کرنا غلط ہے۔ بس یہی کوشش قابل قدر ہوسکتی ہے کہ ہر طرح کی جنگ کی اہنسا کے طریقے پر مقاومت کی جائے۔''

انھوں نے یہ بھی ہدایت کی کہ ستیہ گرہ انفرادی طور پر کی جائے، اجتماعی طور پر نہیں۔ کسی قسم کے مظاہروں کی بھی ممانعت تھی، تعمیری کاموں میں مصروف کانگریسی اداروں کو بھی ستیہ گرہ میں شرکت کی اجازت نہیں تھی۔ کانگریسیوں کو یہ بات ''قول وعمل'' سے واضح کرنا ہوگی کہ نہ وہ فسطائیوں کے ساتھ ہیں اور نہ نازیوں کے ساتھ، بلکہ وہ ہر طرح کی جنگ کے خلاف ہیں اور کم سے کم برطانوی سامراج کی طرف سے جو لڑائی چلائی جارہی ہے اس کے خلاف تو ضرور ہی ہیں۔'' گاندھی نے یہ وضاحت کی کہ اگر کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا جاتا ہے، تب بھی کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ ''جب تک میں آزاد ہوں میں تحریک چلاتا رہوں گا۔ میری گرفتاری کی صورت میں تحریک خودکار ہوجائے گی بشرط یہ کہ عوام کے دلوں میں اہنسا کا جذبہ ہو، کانگریسیوں کو پرامن اور غیر متزلزل رہنا چاہیے۔ ہر مرد اور عورت از خود پیش قدمی کرے گا۔ اگر وہ سول نافرمانی میں حصہ لینا چاہے گا تو راستہ صاف ہے۔ اگر وہ حصہ نہ لے پائے گا تو وہ عملی پروگرام میں سے کوئی ایک کام اس کے متبادل کے طور پر اختیار کرسکتا ہے۔''

انفرادی سول نافرمانی کا پورا تصور یہ تھا کہ ایک ''علامتی احتجاج'' کا مقصد حاصل ہوجائے اور حکومت کو کوئی شدید قسم کی پریشانی نہ ہو۔ گاندھی نے متنبہ کردیا تھا کہ طالب علموں، کسانوں اور مل مزدوروں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ یہ قریب قریب واضح تھا کہ گاندھی نے اس تحریک کو ملک کی محصور ومقید محرومیوں میں دل کا غبار دور کرنے کا ایک ذریعہ بنایا تھا۔ انھوں نے تعمیری پروگرام کی اہمیت کا پھر اعادہ کیا اور اس پروگرام میں بنیادی تعلیم، چرخہ کاتنا، کپڑے بننا، ہندو مسلم اتحاد، نشہ بندی، دیہی صنائع، تعلیم بالغان، عورتوں کی فلاح و بہبود، اقتصادی نابرابری میں

تخفیف جیسے کام شامل تھے۔ان کو یہ پروگرام سوشل نافرمانی ہی کی طرح اہم معلوم ہوتا تھا۔ان کا کہنا تو یہ تھا کہ تعمیری پروگرام کے بغیر سول نافرمانی کی طرف قدم بڑھانا ایسا تھا جیسے مفلوج ہاتھ چمچہ اٹھانے کی کوشش کرے انھوں نے اس کی وضاحت یوں کی ''جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بڑی اصلاحوں کا وقت سوراج حاصل ہونے کے بعد آئے گا وہ غیر متشدد سوراج کے ابتدائی طریق کار کے بارے میں اپنے کو دھوکے میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ یہ کسی دن صبح کو آسمان سے یکا یک نہیں ٹپکے گا بلکہ اپنی ہی اجتماعی کوششوں سے ایک ایک اینٹ کر کے یہ دیوار کھڑی ہوگی۔''

سیاسی نقطۂ نظر سے، جنگ کے زمانے میں انفرادی سول نافرمانی اور اس کا متبادل تعمیری پروگرام ایسا عجیب وغریب طریق احتجاج تھا جو کمی خون کا شکار کہا جا سکتا ہے۔17 اکتوبر 1940 کو وردھا کے قریب پونار نامی گاؤں میں اچاریہ ونوبا بھاوے کی جنگ کے خلاف تقریر سے تحریک کا آغاز ہوا اور انھیں چار دن کے بعد گرفتار کر لیا گیا۔ونوبا بھاوے کے بعد جواہر لال نہرو کو چنا گیا تھا اور انھوں نے 7/نومبر کو تحریک میں حصہ لیا لیکن انھیں ایک ہفتہ پہلے ہی جب وہ الہ آباد جا رہے تھے، گرفتار کر لیا گیا تھا اور چار برس قید کی سزا دی گئی تھی۔وسط نومبر میں تحریک کا دوسرا دور شروع ہوا جسے گاندھی نے ''نمائندہ ستیہ گرہ'' کا نام دیا۔ستیہ گرہیوں کا انتخاب گروہوں سے کیا گیا تھا، مثلاً کانگریس ورکنگ کمیٹی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے اراکین۔

سال کے ختم ہوتے ہوئے چار سو کانگریسی قانون ساز، جن میں انتیس سابق وزرا شامل تھے، جیل جا چکے تھے جنوری 1941 میں اندولن کا تیسرا دور شروع ہوا۔اس کی بنیاد ستیہ گرہوں کی ان فہرستوں پر تھی جو گاندھی کی منظوری سے مقامی کانگریس کمیٹیوں نے تیار کی تھیں۔اپریل 1941 سے تحریک کے چوتھے دور میں عام کانگریسیوں کی بھرتی شروع ہوئی۔سرکاری کاغذات کے حساب سے 15/مئی 1941 تک 25،69 افراد کو انفرادی سول نافرمانی کے جرم میں سزائیں دی گئیں۔گاندھی نے علامتی تحریک کو جس طرح چلایا تھا اس طریق کار کی وجہ سے بہت کم جوش وخروش کا اظہار کیا گیا۔وہ اس کو بڑھا کر عوامی تحریک کا روپ دینے پر تیار نہیں تھے۔''عوامی اقدام کے لیے نہ تو جواز ہے اور نہ ماحول۔اس کا کھلا ہوا مقصد پریشان کرنا ہوگا اور یہ اہنسا سے

غدّاری ہوگی۔سب سے بڑھ کے یہ کہ اس سے آزادی حاصل ہونے والی نہیں ہے۔فرقہ وارانہ اتحاد کے بغیر عوامی اقدام خانہ جنگی کو دعوت دینا ہے۔اگر خانہ جنگی ہی ہماری قسمت میں لکھی ہے تو وہ آکر رہے گی لیکن اگر میں کانگریس کا ذہن پڑھ سکتا ہوں، تو کبھی کانگریس کی خواہش یا دعوت پر ایسا نہیں ہوسکتا۔''

جب روزنامہ ''ہندو'' نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ تحریک کا جنگی کوششوں پر کوئی بھی اثر نہیں پڑا تو گاندھی نے یہی جواب دیا کہ جنگی کوششوں میں رکاوٹ ڈالنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ مسٹر ایمرے سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند نے کہا کہ یہ تحریک ''اتنی ہی افسوسناک ہے جتنی کہ غیر منطقی'' اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ''یہ (تحریک) بے دلی سے اور بہت زیادہ دلچسپی پیدا کیے بغیر چل رہی ہے۔'' حکومت ہند نے صوبائی حکومتوں کو 29 جنوری 1941 کو جو خط لکھا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انفرادی سول نافرمانی تحریک پر خود سے عائد کیے ہوئے ضبط وتحمل سے حکومت کو خوش گوار تعجب ہوا تھا۔گاندھی کے دیدہ دانستہ اعتدال کی بدولت ان متشددانہ اقدامات کی ضرورت ہی نہیں پڑھی جن کا 'ایمرجنسی' میں استعمال ہونا تھا۔حکومت کو یہ اعتماد تھا کہ نپے تلے تشدد آمیز اقدامات سے انفرادی سول نافرمانی کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔''موجودہ پالیسی از سرنو اس طرح سے دہرائی جاسکتی ہے کہ جو لوگ عملاً قانون شکنی کرتے ہیں ان کے خلاف معمولاً حرف بحرف قانونی کارروائی کی جائے گی لیکن سنسنی خیز انتقامی کارروائی نہیں ہوگی......دوسرے لفظوں میں، مقصد یہ ہونا چاہیے کہ عوام کا درجۂ حرارت کم سے کم رہے اور (لوگوں پر یہ تاثر قائم ہو کہ حکومت ایسے حالات میں جب کہ اس کے لیے کوئی اور چارۂ کار باقی نہیں رہ گیا ہے، صرف اپنا فرض ادا کر رہی ہے اس لیے صوبائی حکومتوں کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ ستیہ گرہیوں کو نرم سزائیں دیں، اس امید پر کہ تحریک میں عوامی دلچسپی کم ہوجائے گی اشتعال انگیزی اور جوش دلانے والے اقدام سے پرہیز کریں۔

حکومت بمبئی نے حکومت ہند کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ پیش قدمی کرکے ''تحریک کو اس نالے سے باہر نکال لے جو یہ (تحریک) اپنے لیے کھودتی چلی جارہی ہے۔''

''مثلاً اگر وہ سارے چنے ہوئے ستیہ گرہی جنھیں صرف علامتی تقریر کرنے کے جرم میں

سزائے قید یا نظر بندی ملی ہے ان کو رہا کر دیا جائے اور اسی کے ساتھ محتاط طریقے پر لکھا ہوا ایک اعتقاد جاری کیا جائے اس اعتقاد میں یہ وضاحت کی جائے کہ تحریک کے علامتی کردار کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت جیل سے علامتی اور مشروط رہائی کر رہی ہے، تو اس کا اثر عوام بلکہ خود کانگریس پر اچھا خاصا ہو سکتا ہے لیکن کامیابی کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ایسا اقدام اس وقت کیا جائے جب تحریک کا زور کم ہو رہا ہو۔ اگر صورت حال مختلف ہو تو اس کا امکان ہے کہ ایسے غلط طور سے کم زوری کا نتیجہ سمجھ لیا جائے۔''

حکومت نے اس سے انکار نہیں کیا کہ اس تجویز سے ''مسٹر گاندھی کا حساب کتاب بھی بگڑ سکتا ہے''، لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کا موقع مستقبل میں تب آئے گا جب ''وسیع تر سیاسی میدان میں کوئی اہم اور جدید اقدام بھی اس کے ساتھ ساتھ کیا جائے۔''

یہ موقع اس وقت آ گیا جب 1941 کے خاتمے پر جنگ کی صورت حال تشویشناک ہونے لگی۔ پرل ہار بر پر جاپانی حملے کے تین دن پیشتر حکومت ہند نے ان لفظوں میں اعلان کیا۔ ''اس اعتماد کے ساتھ کہ ہندوستان کی ساری ذمہ دار رائے عامہ فتح حاصل ہونے تک جنگی کوششوں میں مدد کرنے پر پوری طرح سے آمادہ ہے۔ انفرادی سول نافرمانی کے سلسلے میں سبھی سزا یافتہ قیدیوں کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔''

باب 47

کرپس مشن

جاپان کے شامل ہوجانے سے جنگ گویا ہندوستان کے دروازوں تک آ پہنچی۔ امریکی بحری بیڑا مجروح ہوچکا تھا اس لیے مغربی بحرالکاہل میں جاپانی بڑی سرعت سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ 15 فروری 1942 کو سنگاپور ہاتھ سے جاتا رہا خلیج بنگال جاپانی بیڑے کی زد میں آ گئی بیڑے کی زد میں آ گئی۔ سمندر پر برطانیہ کی حکمرانی ختم ہوچکی تھی۔ ملایا اور برما پر قبضہ جما لینے کے بعد، جنوبی اور مشرقی ہند کے گھیرے میں لے لیے جانے کا خطرہ تھا۔ جس تیزی سے جاپانی بڑھ رہے تھے اس سے یہی ثابت نہیں ہورہا تھا کہ جاپانی تعداد اور حکمت عملی میں بڑھے ہوئے ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر ہورہا تھا کہ جن ملکوں پر حملہ ہورہا تھا وہاں جذبۂ مقاومت مفقود تھا۔

ہندوستان میں جاپان کے موافق جذبہ بہت کم تھا۔ سبھاش چندر بوس کے نشریات سے متاثر ہوکر ایک چھوٹی سی اقلیت ہندوستان کے لیے آزادی کے حصول کی خاطر غیر ملکی امداد سے متنفر نہیں تھی لیکن ہندوستانی دانشوروں کی بہت بڑی اکثریت نازیوں، فسطائیوں اور جاپانیوں کی مخالف تھی۔

گاندھی نے اس جاپانی نعرے کی مذمت کی کہ ''ایشیا ایشیا والوں کے لیے'' ہے چین سے اظہار ہمدردی کے طور پر جاپانی مال کے بائیکاٹ کی حمایت بھی کی۔ چین کے حق میں نہرو کی

ہمدردی مشہور ہی تھی۔ اس لیے یہ خطرہ اتنا نہیں تھا کہ ہندوستانی حلقے جاپانیوں کے ساتھ عملی گٹھ جوڑ میں حصہ لیں گے جتنا یہ خطرہ تھا کہ عوام میں شکست خوردگی اور بے عملی اس حد تک نہ بڑھ جائے کہ اگر جاپانی کسی طرح ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کے قابل ہو جائیں تو انھیں اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کا موقع مل جائے اور شروع کی ایک دو لڑائیوں میں کامیابی بھی حاصل ہو جائے۔ اب کانگریس کے اس مطالبے کو تازہ اہمیت حاصل ہو گئی کہ محوری طاقتوں[1] Axis Powers سے بھرپور مقاومت کی غرض سے یہ جوکھم مول لینے کے لیے عوام کے سامنے کوئی امید افزا شرط تو ہو۔

انفرادی سول نافرمانی کے سلسلے کے قیدیوں کو رہا کر کے وائسرائے 1941 کے دسمبر کے آغاز میں جو پیش قدمی کی تھی اس کا ابتدائی ردعمل گاندھی پر کسی طرح کی گرم جوشی کا نہیں تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اس پیش قدمی سے ان کے ''دل میں کسی تعریفی یا ہمدردانہ تار'' کی جھنکار سنائی نہیں دی۔ 23/دسمبر 1941 کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس باردولی میں ہوا۔ اس نے یہ تسلیم کیا کہ جنگ کی صورت حال نازک ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا بھی اظہار کیا کہ ''سارے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف مخالفت اور بے اعتمادی کا ماحول ہ اور بہت لمبے چوڑے وعدے بھی اس ماحول کو بدل نہیں سکتے اور نہ غلام ہندوستان، ایسے خودسر سامراج کو رضاکارانہ طور سے اور بخوشی امداد دے سکتا ہے جو فسطائیت کے متحکمانہ رویے سے ملتا جلتا ہو۔'' کمیٹی نے ستمبر 1940 میں علامتی سول مقاومت کے جس پروگرام کے چلانے کی اجازت دی تھی اس پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا۔

بہرصورت حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ کانگریس اور حکومت دونوں کے اندازے سے بھی زیادہ تیزی سے 42-1941 کے جاڑوں میں اتحادیوں کے نقطۂ نظر سے جنگ کی صورتحال اتنی ہی نازک ہو گئی تھی جتنی سقوط فرانس کے بعد 1940 میں تھی۔ ایک بار پھر کانگریسیوں کا ایک حلقہ جس کی قیادت راج گوپالا چاری کر رہے تھے، اس بات کی حمایت کرنے لگا تھا کہ جاپانیوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کے خیال سے برطانوی حکومت سے فوری مصالحت کر لی جائے اکثر کانگریسی لیڈر اس کے لیے آمادہ تھے کہ اگر حکومت بھی متبادل اقدام کرنے کو تیار

(1) جرمنی، اطالیہ، جاپان کا محور تھا

ہوتو کانگریس جاپانی خطرے کا مقابلہ کرنے میں اپنا زور لگا دے گی۔ باردولی کے مذاکرات میں گاندھی نے اس بات کو نوٹ کیا کہ جنگ کے چلانے میں جو شے انھیں حکومت کے ساتھ تعاون سے روکے ہوئے تھے وہ اہنسا نہیں بلکہ تعاون کے لیے مناسب شرائط کا نہ ہونا تھا۔ گاندھی نے صدر کانگریس مولانا آزاد کو لکھا کہ ''مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بیشتر ممبرانِ (کانگریس ورکنگ کمیٹی) میری تشریح سے اختلاف رکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ (جنگ کی) مخالفت اہنسا کی بنا پر ہو۔ اس وقت گاندھی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے درمیان اختلافات کے ابھر کر سامنے آنے کا یہ ایک معقول سبب تھا۔ جنگ کے نشیب وفراز کی بدولت خطرہ، خطرناک حد تک، ہندوستان کے قریب آ پہنچا تھا اور یہ سوال کہ حملے کا مسلح طور سے مقابلہ کیا جائے یا غیر متشدد مقاومت سے، ایک جیتا جاگتا سوال بن گیا تھا۔ 1940 کے وسط گرما کی طرح 42-1941 کے وسط سرما میں گاندھی نے ایک بار پھر دیکھا کہ عدم تشدد کی تکنیک کی اخلاقی فوقیت کو تسلیم کرنے کے باوجود، کانگریسی لیڈروں کی اکثریت کے دلوں میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ اس حربے کو بیرونی جارحیت کے مقابلے میں استعمال کریں۔

اس دوران میں، برطانوی حکومت بھی جنگی صورت حال سے متأثر ہو رہی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں وزیر اعظم چرچل کے خیالات پر پہلے ہی بحث ہو چکی ہے۔(1) 1941 میں بھی ان کے وہی خیالات تھے جو 1931 میں تھے۔ جب دسمبر 1941 میں چرچل واشنگٹن گئے تو صدر روز ولٹ نے ان سے ہندوستانی مسئلے کا ذکر کیا۔ چرچل نے لکھا ہے کہ ''میرا ردعمل اتنا شدید اور تفصیلی تھا کہ انھوں نے پھر یہ سوال کبھی زبانی نہیں اٹھا۔'' یہ صرف امریکن دباؤ ہی نہیں تھا بلکہ جاپانی پیش رفت کی رفتار بھی تھی جس نے چرچل کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ہندوستان کے سیاسی تعطل کو توڑنے کی راہیں ڈھونڈھیں۔ سقوط سنگاپور کے دس دن بعد 20 فروری کو انھوں نے جنگی کابینہ کی ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل اس مقصد سے کی کہ وہ ہندوستانی مسئلے کا بخوبی مطالعہ کر کے کوئی حل تجویز کرے۔ اس مطالعاتی گروہ کے اراکین میں سائی من اور ایٹلی (قانونی اسٹےٹوٹری) کمیشن کے ممبر رہ چکے تھے جیمس گرگ اور جان اینڈرسن ہندوستان میں اعلا عہدوں پر متعین

(1) چونتیسواں باب

رہ چکے تھے۔ اِسٹے فورڈ کرپس ہندوستانی قیادت اور سیاست سے بخوبی واقف تھے اور ایمری ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ تھے۔ 11/مارچ کو چرچل دارالعوام کو یہ بتانے کے قابل ہو پائے کہ جنگی کابینہ نے ہندوتانی مسئلے پر ایک متفقہ فیصلہ کرلیا ہے اور دارالعوام کے لیڈر اسٹے فورڈ کرپس ان تجاویز پر ہندوستانی لیڈروں سے تبادلۂ خیال کے لیے ہندوستان جا رہے ہیں۔

ایسے فیصلہ کن مشن کے لیے اسٹے فورڈ کرپس سے بہتر شخصیت کا انتخاب نہیں ہوسکتا تھا۔ ہندوستانی آزادی کے مقصد سے ان کی ہمدردی کا حال سب کو معلوم تھا اور وہ ہندوستانی رائے عامہ کے صف اول کے لیڈروں سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے۔ اس لیے جب وہ 22 مارچ کو نئی دہلی پہنچے تو ان کے پرامید ہونے کے معقول وجوہ موجود تھے۔ اس مسودۂ اعلان میں' جو کرپس اپنے ساتھ لائے تھے اور جس پر انھوں نے نمایاں ہندوستانی حکام اور لیڈروں سے تبادلۂ خیال کیا تھا۔ ہندوستان کے سیاسی سوال کے حل سے متعلق برطانوی حکومت کی تجویزیں درج تھیں۔ جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد صوبائی مجالس قانون ساز کے انتخابات کرانے تھے اور ان مجالس کے ایوان زیریں کے ممبروں کو ایک آین ساز اسمبلی کا انتخاب کرنا تھا۔ اس اسمبلی کے لیے ہندوستانی ریاستوں کو نمائندے نامزد کرنے کی دعوت دی جانے والی تھی۔ اس اسمبلی کا کام ہندوستانی یونین' کا ایک آئین تیار کرنا تھا۔ یہ ایسی مکمل ڈومی نین (نوآبادیاتی حکومت) ہوتی'' جس کی حیثیت ہر اعتبار سے برطانوی دولت مشترکہ کی دوسری نوآبادیاتی حکومت) ہوتی'' جس کی حیثیت ہر اعتبار سے برطانوی دولت مشترکہ کی دوسری نوآبادیاتی حکومتوں کی سی ہوتی'' برطانوی حکومت نے اس شرط کے ساتھ اس آئین پر عمل درآمد کرانے کی ذمہ داری لی تھی کہ............''برطانوی ہند کے کسی صوبے کو یہ حق ہوگا کہ اگر وہ اس نئے آئین کے قبول کرنے پر تیار نہ ہو تو اپنی موجودہ آئین حیثیت کو برقرار رکھ سکے اور یہ انتظام رکھا جائے کہ اگر بعد میں وہ شامل ہونا چاہے تو ہو سکے۔''

''(یونین میں) شامل نہ ہونے والے ان صوبوں کو اگر ان کی خواہش ہوگی تو ملک معظم کی حکومت ایک ایسا نیا آئین دینے پر رضا مند ہوگی جس میں انھیں بھی وہی ساری حیثیت حاصل ہوگی جو انڈین یونین کو حاصل ہے اور جس کی تقریباً اسی طریقے کے مطابق طے کیا جائے گا جو یہاں (اعلان میں) درج ہے۔''

آئین ساز ادارے اور برطانوی حکومت کے مابین ایک صلح نامہ گفت وشنید سے طے ہونا تھا جس میں دوسری باتوں کے ساتھ نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ دیسی ریاستوں کے بارے میں یہ تحریر کیا گیا تھا کہ کوئی دیسی ریاست آئین کا اتباع کرنا پسند کرے یا نہ کرے، نئی صورت حالات میں حسب ضرورت یہ لازمی ہوگا کہ ان سے صلح ناموں کے تحت کیے گئے انتظامات پر گفت وشنید کے ذریعے نظر ثانی کی جائے۔''

مسٹر اٹیلی نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ ''مسودۂ اعلان'' ایک جرأت مندانہ منصوبہ تھا اور حکومت کے ان اراکین کے رجحان کا صحیح طور پر آئینہ دار تھا جو ہندوستانیوں کی حکومت خود اختیاری کو بہت زیادہ قابل عمل نہیں سمجھتے تھے، اور خاص کر وزیر اعظم جن کے خیالات بہت ہی سخت تھے۔'' اپنے 30 مارچ 1942 کے بیان میں کرپس نے اعلان کیا کہ ''برطانوی حکومت شک وشبہ سے بالاتر طریقے پر اعلان کرنا چاہتی ہے کہ ہماری اور برطانوی حکومت ہندوستانی خواہشات وعزائم کو پورا کرنے کی سمت ایک بھرپور اقدام کرنے جارہی تھی۔

برطانوی لیڈروں کے اس بھرپور اعتماد کے مقابلے میں ہندوستانی لیڈروں نے اس منصوبے کو نہایت شکوک سے دیکھا۔ گاندھی نے (جنھیں کرپس نے تار دے کر وردھا سے بلایا تھا) منصوبہ دیکھنے کے بعد کرپس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ پہلے جہاز سے گھر واپس جائیں۔ جواہر لال نے جب ان تجاویز کو پہلی بار پڑھا تو انھیں شدید افسردگی'' کا احساس ہوا۔ وہ ان کو جتنا ہی زیادہ پڑھتے اور ان پر غور کرتے گئے انھیں اتنی ہی زیادہ بددلی ہوتی گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلی بار برطانوی حکومت کی جانب سے ہندوستان کا حق خود اداریت قطعی طور پر تسلیم کیا گیا تھا اور اس حق کو استعمال کرنے کے لیے وقت اور طریق کار کی صاف صاف وضاحت کردی گئی تھی لیکن صوبوں اور دیسی ریاستوں کو یونین میں شامل نہ ہونے کا حق دینے سے یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ ملک بیسیوں ''آزاد ریاستوں'' کی ایک ایسی بساط میں تبدیل ہوجائے گا جس سے ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی شخصیت ہی تباہ ہوکر رہ جائے گی۔ صوبوں کو شامل نہ ہونے کا حق بظاہر اس لیے دیا گیا تھا کہ مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان کسی حد تک تسلیم کرلیا جائے۔ کرپس نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا کہ ''اگر آپ ایسے لوگوں کو آمادہ کرنا چاہتے ہیں جو ایک ہی کمرے میں داخل ہونے کی

مخالفت کا رجحان رکھتے ہیں تو ان سے یہ کہنا عقل مندی پر مبنی نظر نہیں آتا کہ کمرے میں ایک بار داخل ہونے کے بعد وہ پھر باہر نکل نہیں سکتے۔'' کانگریسی لیڈروں کو یہ محسوس ہوا کہ لن لتھ گو، کی پیش کش (1940) کے مقابلے میں کرپس کی پیش کش (1943) جناح کو اپنی علاحدگی پسندی کی لائن پر قائم رکھنے میں ایک قدم اور آگے بڑھ گئی تھی۔ 1940 میں پاکستان ایک وہمی ڈھانچہ تھا لیکن 1942 میں یہ ایک سیاسی امکان بن گیا تھا۔

مشرق و مغرب میں مسلم اکثریت کے صوبوں کا یونین میں عدم شمول ویسے ہی خطرے کا بگل معلوم ہو رہا تھا۔ اب دیسی ریاستوں کو ایسے ہی حقوق کی تفویض سے کانگریسی لیڈر مبہوت ہو کر رہ گئے۔ یہ والیان ریاست جن کے قوق اور جن کا وجود ہی پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے رحم و کرم پر منحصر تھا، بیک جنبش قلم آزاد فرماں روا بن جائیں گے اور نئی انڈین یونین ان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ان سے گفت وشنود پر مجبور ہو گی؟ ہندوستان کا آئینی سوال پہلے ہی سے دو نا قابل مفاہمت عناصر یعنی مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان مفاہمت پیدا کرانے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر اس میں والیان ریاست بھی شامل کیے جاتے ہیں تو یہ مسئلہ نا قابل حل ہو جائے گا۔ یہ حقیقت پانچ سال اور گزر گئے تب جا کر برطانوی حکومت تسلیم کر پائی اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ آزاد اور جمہوری ہندوستان کے بنیادی ڈھانچے کی شکل بگاڑے بغیر والیان ریاست کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے کہ آئندہ سیاسی نظام میں اپنی جگہ خود بنائیں۔

ان حالات میں کانگریس لیڈر ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا وہ حل تسلیم نہ کر سکے جو کرپس اپنے ساتھ لائے تھے۔ بہر حال جنگی حالات تیزی سے بگڑتے جا رہے تھے۔ جن تین ہفتوں میں کرپس کا ہندوستان میں قیام رہا۔ جاپانیوں نے کئی فتوحات حاصل کر لیں۔ پہلی اپریل کو ٹونگو خالی کر دیا گیا اور تیسری اپریل کو پروم 5 اپریل کو کولمبو پر بمباری ہوئی اور اس کے دوسرے دن وزا گا پٹم اور کوکا نا ڈا پر اگر چہ کرپس نے اپنی تجویزیں ایک ''مجموعی معاملہ فہمی''(Packagedeal) کے طور پر پیش کی تھیں اور اگر چہ طویل المدت تجویزیں بھی منصوبے کا ''جرأت مندانہ'' جز و تھیں، لیکن کانگریسی لیڈروں نے یہ سجھاؤ سامنے رکھا کہ طویل المدت تجویزوں کو فی الحال بالائے طاق رکھ دیا جائے اور ہندوستان کے دفاع کے لیے کچھ فوری انتظامات سے باہمی مفاہمت کی راہیں تلاش

کرلی جائیں۔کانگریسی لیڈروں اور کرپس اور وائسرائے کے درمیان اس بارے میں متعدد بار تبادلۂ خیال ہوا کہ وائسرائے کاؤنسل کے ہندوستانی ممبر وفاع کا دائرۂ کار کیا ہو۔3اپریل کو کرپس فوجی ہیڈکوارٹر پر جنرل ویول، کمانڈر ان چیف سے ملے اور یہ اعلان کیا کہ انھوں نے سفر انگلستان ملتوی کردیا ہے۔انھوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ غالبًا اگلے ہفتے میں کوئی مفید کام انجام دے سکوں گا۔میرے خیال میں عمومی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اختلافی نکات کم ہوتے تنگ دائرے میں محدود ہوگئے ہیں اور اجتماعی خیرخواہی کے جذبے سے ہم اِن مشکلات کا حل نکالنے کے قابل ہوسکیں گے۔'' دوسرے دن کرپس نے نہرو اور کانگریس صدر آزاد کی جنرل ویول سے ملاقات کرائی اور اس کے بعد وہ ان لوگوں سے رخصت ہوئے کہ یہ لوگ دوران جنگ میں وائسرائے کاؤنسل کے ہندوستانی ممبر برائے دفعا کو دیے جانے والے قلم دان کے دائرۂ کار کے بارے میں باہمی گفتگو کرسکیں۔کانگریس لیڈروں نے یہ ضرورت تسلیم کی کہ جنگی کوششوں کا تکنیکی امور سے متعلق کنٹرول برطانوی کمانڈر ان چیف کے ہاتھوں میں رہے لیکن ان کا یہ کہنا تھا کہ زمانۂ جنگ کے دفاع کا اثر قومی زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا تھا اور اس کو ہندوستانی ممبر برائے دفاع کے حدود اختیار سے بالکل ہی باہر رکھنے سے درمیانی مدت کی عوامی حکومت کا یہ مقصد ہی فوت ہوجائے گا کہ جنگ مؤثر طور پر چلائی جائے۔

ان مذاکرات میں صدر روزولٹ کے ذاتی سفیر کرنل لوئی جانسن نے بھی حصہ لیا تھا۔ یہ مذاکرے صرف اس لیے بے نتیجہ ختم نہیں ہوئے کہ ہندوستانی ممبر دفاع اور برطانوی کمان دار اعلا کے فرائض کی حد بندی نہیں ہوسکی بلکہ اس سے وسیع تر مسئلے پر بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ مسئلہ یہ تھا کہ بہ حیثیت مجموعی درمیانی مدت کی حکومت کی نوعیت اور ذمہ داریاں کیا ہوں گی؟

کرپس جو''مسودۂ اعلان'' لائے تھے اس کی دفعہ، ای، میں دوران جنگ کی درمیانی حکومت کا ذکر یہ تھا: ''جس نازک دور سے ہندوستان اب گزر رہا ہے اس سے لے کر جب تک ایک نیا آئین تیار نہ ہوجائے۔جنگی کوششوں کے سلسلے میں دفاع ہند کی سمت مقرر کرنے اور اس پر کنٹرول رکھنے کی ذمہ داری بوجھ ناگزیر طور پر ملک معظم کی حکومت کو برداشت کرنا ہوگا۔لیکن ہندوستان کے فوجی، اخلاقی اور مادّی وسائل کو پوری طرح منظّم کرنے کی ذمہ داری ہندوستانی عوام

کے تعاون کے ساتھ حکومت ہند پر ہوگی۔''

کرپس نے انگلستان میں واپس جا کر یہ دعویٰ کیا کہ وہ جن جن لوگوں سے بھی ملے ان کو ابتدا ہی سے یہ بتاتے چلے کہ جب تک جنگ کے خاتمے کے بعد مجلس آئین ساز کی کوششوں کے نتیجے میں نیا آئین نافذ نہ ہوجائے اس وقت تک بہت ہی معمولی رد وبدل کے علاوہ کسی قسم کی آئینی تبدیلیاں کرنا ممکن نہ ہوگا۔ کرپس کے بقول انھوں نے یہ بالکل واضح کر دیا تھا کہ وائسرائے نسل کے ممبران سے کیا سلوک کیا جاتا ہے اور کاؤنسل کی کارروائی کس طرح چلائی جاتی ہے یہ ایسے مسئلے ہیں جن کا فیصلہ وائسرائے ہی کو کرنا ہے کیوں کہ حکومت ہند کا چلانا اسی کا کام ہے۔ نہ کہ ان (کرپس) کا وہ تو جنگی کابینے کے ایک رکن کی حیثیت سے ہندوستان کے دورے پر آئے ہیں۔

ممکن ہے کہ شروع ہی سے کرپس کا یہ مطمح نظر رہا ہو لیکن کانگریسی لیڈروں کا تاثر بہر حال اس سے مختلف ہی تھا۔ مذاکرات کے دوران انھوں نے ایسے الفاظ استعمال کیے تھے جیسے ''قومی حکومت'' اور ''کابینہ'' جس سے کانگریسی لیڈروں کو یہ امید بندھی تھی کہ اگر قانوناً نہیں تو روایتاً ایک کابینے کی طرح پورے اختیارات کے ساتھ کام کرنا ہوگا اور وائسرائے آئینی سربراہ رہے گا۔ ممکن ہے کہ اس غلط فہمی کی بنیاد ان مزعومات پر رہی ہو جو ''مسودۂ اعلان'' سے مترشح نہیں ہوتے تھے۔ جیسا کہ نہرو نے بعد میں لکھا کہ ممکن ہے کہ ان (کانگریسی لیڈروں) کی خواہش مصالحت سے اس طرح کی رجائیت کو غذا ملی ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ کرپس نے محاذ بدل لیا ہو۔ رابرٹ ای شروڈ نے اپنی کتاب ''ابرٹ اور ہاپ کنس'' میں چرچل کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''کرپس نے نہرو کے سامنے ایک نئی ہی تجویز پیش کر دی جس کے لیے گورنر جنرل سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔'' اسی نئی تجویز کی بدولت ایک قومی حکومت کے قیام کے بارے میں برطانوی حکومت اور کانگریس کے درمیان اختلافات کم ہو گئے تھے ہاپکنس کے بیان کے مطابق وائسرائے نے چرچل کو تار بھیجا اور چرچل نے کرپس کی اس بات پر سرزنش کی کہ انھوں نے اپنے موقف مقررہ سے بڑھ کر کام کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرپس کو مذاکرات ختم کر کے وطن واپس جانا پڑا۔

ہندوستانی اخبار ''نیشنل ہیرالڈ'' (مورخہ 24/اپریل 1942) نے یہ تبصرہ کیا کہ ''کرپس مشن امریکن دباؤ کا نتیجہ تھا۔ یہ دنیا کی رائے عامہ کو بہکانے کے لیے ایک سوانگ رچا گیا تھا اور

مقصد یہ تھا کہ پہلے سے تیار کردہ ناکامی کو ہندوستانی عوام کے سر تھوپا جائے‘‘ یہ تبصرہ کرپس مشن کی ناکامی پر ہندوستانی بے دلی کا مظہر ضرور تھا۔ لیکن اور اس پر برطانوی حکومت کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا تھا، کیوں کہ پہلی بار حکومت نے ہندوستان کی حکومت خود اختیاری کا حق غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کیا تھا اور اس امر کا ایسی حکومت کی طرف سے ظہور پذیر ہونا جس کی سربراہی وہ وزیراعظم کر رہا ہو جس کا ہندوستانی قوم پرستی پر عدم اعتماد کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ یقیناً آگے کی جانب بڑھا ہوا قدم تھا۔ بدقسمتی سے آئینی تجاویز دونا قابل مفاہمت مقصد کی ناہموار راہ کی درمیانی قیام گاہ تھی ایک طرف آزاد اور جمہوری ہندوستان کی تشکیل تھی اور دوسری طرف مسلم علاحدگی پسندی اور دیسی والیان ریاست کے مفادات خصوصی کے تحفظ کی خاطر ہندوستان کے بے شمار حصے بخرے کر دینا۔ جناح کے نظریات اور حکمت عملی کی بدولت کا سیاسی مسئلہ اس قدر الجھ گیا تھا کہ لندن میں بیٹھی ہوئی جنگی کابینہ کی ایک سب کمیٹی جلدی سے ٹھونک ٹھاک کے کوئی فارمولا تیار کر کے اسے حل نہیں کر سکتی تھی۔ اس پر یہ شکل مستزاد تھی کہ تجاویز میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی اور اس سے ’’لو یا چھوڑ دو‘‘ کی سی شرط وابستہ تھی۔ اس لیے اس کی کامیابی کے امکانات اور بھی کم ہو گئے تھے۔

بہرکیف جنگی صورت حال اتنی نازک تھی کہ طویل المدت آئینی تجاویز پر سخت اعتراضات کے باوجود قوم پرور ہندوستان اس الجھے ہوئے مسئلے کو کچھ عرصے کے لیے کولڈ اسٹوریج میں رکھنے کو تیار تھا اور اس پر آمادہ تھا کہ جاپانی خطرے کے مقابلے میں ملک کو منظّم کرنے کے فوری کام پر ساری توجہ مرکوز کر دے۔ بدقسمتی سے وہی نازک جنگی صورت حال جس سے کرپس مشن کے بھیجے جانے کی تحریک ہوئی تھی وہی اس کی شکست وریخت کی بھی ذمہ دار ہوئی۔ جو کانگریسی لیڈر، گاندھی سے ہندوستان کے مسلح وفاع کے مسئلے پر الگ ہو گئے تھے۔ وہی جاپانیوں سے آخری فیصلہ کن جنگ، نئی فوجیں، ملیشیا اور ہوم گارڈ بڑھانے کی بات کر رہے تھے۔ صدر کانگریس نے کرپس کے نام اپنے آخری خط میں لکھا تھا ’’کسی نے یہ تجویز نہیں رکھی ہے کہ کمانڈر اعلا کے معمولی اختیارات پر کوئی پابندی عائد کی جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اس سے بہت آگے گئے تھے اور اس پر آمادہ تھے کہ وزیر جنگ کی حیثیت سے ان کو مزید اختیارات دے دیے جائیں۔ لیکن یہ واضح ہے کہ دفاع کا برطانوی تصور ہمارے تصور سے بہت مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کا

کردار قومی بنادیا جائے اور ہندوستان کے ہر مرد اور عورت سے اس میں شامل ہونے کو کہا جائے۔ حکومت ہند اس بات کا احساس نہیں رکھتی تھی کہ جنگ صرف عوامی بنیادوں پر لڑی جاسکتی ہے۔''

روز ولٹ کرپس کے مذاکرات کی رفتار کا بے چینی سے مشاہدہ کر رہے تھے اور انھیں اپنے دلّی میں مقیم ذاتی سفیر سے براہ راست معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔

انھوں نے ہاپ کنس کے ذریعے چرچل کو یہ پیغام بھیجا کہ امریکن پبلک یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اگر برطانوی حکومت اس پر آمادہ ہے کہ وہ ہندوستان کے مختلف اجزائے ترکیبی کو جنگ کے بعد مملکت برطانیہ سے علاحدہ ہو جانے کی اجازت دے دے گی تو وہ کیوں ہندوستانیوں کو یہ حق دینے پر تیار نہیں ہوتی کہ جنگ کے دوران بھی وہ تقریباً حکومت خود مختاری کے فیوض سے مستفیض ہو سکیں۔ روز ولٹ نے یہ مشورہ دیا تھا کہ اس بات کی ایک اور کوشش کی جائے کہ بنیادی طور پر ایک ایسی قومی حکومت بنے جو ہماری اپنی حکومت سے ملتی جلتی ہو۔ چرچل لکھتا ہے کہ ''میں شکر گزار ہوں کہ حالات نے ایسے پاگل پن کے عمل کو ناممکن بنا دیا۔'' کرپس پہلے ہی ہندوستان چھوڑ کر جا چکے تھے۔

صدر کانگریس نے کرپس کو لکھا تھا کہ ''ہم اور سارے ہندوستانیوں کے دلوں میں سب سے پہلا خیال ہندوستان کی حفاظت و دفاع کا ہے۔'' عجیب و غریب بات یہ تھی کہ جس خیال سے کانگریسی لیڈر قومی حکومت کا نعرہ لگا رہے تھے اسی خیال سے برطانوی حکومت اس پر اڑی تھی کہ جنگ کے زمانے میں ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کو معتد بہ طاقت منتقل نہ کی جائے۔

حکومت ہند اور صوبوں کے بہت سے سینئر افسر (فلپ وڈرف کے لفظوں میں[1]) یہ محسوس کر رہے تھے کہ ''جنگی خدمات میں کانگریس کے تعاون سے ایک بھی گولہ، بوٹ کا ایک بھی جوڑا اور ایک بھی انگروٹ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ جنوری 1942 کے آغاز ہی میں چرچل نے لکھ دیا تھا کہ یہ خیال کہ وہ (برطانوی حکومت) اس موقعہ پر کانگریس کو چارج دے کر ہندوستان سے کچھ اور حاصل کر سکتی ہے، بے بنیاد ہے انھوں نے مزید لکھا کہ دفاعی مشینری میں مخالف عناصر کو داخل کر کے قوت عمل کو مفلوج بنا دینا ہے۔'' مارچ 1942 میں برطانوی وزیر اعظم ہندوستانی سیاسی

---

(1) وڈرف، فلپ: دی گارجینس، ص: 305

مسئلے کے طویل المدت حل کے لیے ہی کرپس تجاویز ماننے پر آمادہ کیا جا سکا۔ لیکن ان کے کانگریس سے بے اعتمادی (اور کانگریس کی ان سے بے اعتمادی) بدستور جاری رہی صدر روز ولٹ کی آخری لمحے کی اس اپیل کو کہ کانگریس سے مصالحت کی کرپس ایک اور کوشش کرلیں، مسترد کرتے ہوئے چرچل نے لکھا کہ اگر اس نازک موقع پر ہر چیز کی پھر کایا پلٹ ہوتی ہے تو وہ ہندوستان کے دفاع کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔''

انگلستان واپس جا کر کرپس نے اپنی ناکامی کا الزام گاندھی پر لگایا۔ وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ انھوں نے یہ بھی اشارہ کیا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کرپس کی تجاویز کو منظور کرنے کا رزولیوشن پاس کر دیا تھا لیکن گاندھی کی مداخلت پر یہ رزولیوشن پلٹ گیا۔ گاندھی دلّی آنے میں ہچکچا رہے تھے۔ انھوں نے کرپس کے اصرار ہی پر ان سے ملنا منظور کیا تھا۔ انھوں نے اپنے شبہات چھپائے نہیں تھے لیکن وہ مذاکرات کے ابتدائی مرحلوں ہی میں دلّی سے چلے گئے تھے۔ آخری فیصلے ورکنگ کمیٹی نے کیے۔ اس کے ممبر گاندھی کی ناپسندیدگی سے واقف تھے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کمیٹی جو فیصلہ بھی کر دے گی گاندھی ان کی راہ کی رکاوٹ نہ بنیں گے۔

کہا جاتا تھا کہ گاندھی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ کرپس کی تجاویز ایک ٹوٹتے ہوئے بینک کا آگے کی تاریخ کا چک ہیں۔ گاندھی نے ایک دوست سے کہا کہ ''بے شک میں نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی۔ لیکن یہ اعتراض کہ یہ ایک اگلی تاریخ کا (پوسٹ ڈے ٹڈ) چک ہے، بالکل صحیح ہے۔'' سارا طریق فکر، حال کی غلطیوں کی تلافی میں ہچکچاہٹ اور مستقبل پر زور دینے سے وہ بددل ہو چکے تھے۔ کسی پالیسی کو جانچنے کا ان کا اپنا طریقہ یہ تھا کہ زمانۂ حال میں ان کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟ اگر برطانیہ سچ مچ ہندوستان کی آزادی کا حق تسلیم کر لیتا یا (گاندھی کے لفظوں میں) اگر اس کا دل بدل گیا ہوتا تو اس کا اثر صرف سرکاری دستاویزوں میں نہیں بلکہ روزانہ کے نظم ونسق میں نظر آنا چاہیے تھا۔ انھیں ایسا کوئی اثر نظر نہیں آتا تھا۔

باب48

ہندوستان چھوڑ دو

کرپس مشن میں گاندھی نے گویا دلچسپی لی ہی نہیں تھی لیکن اس کی ناکامی سے انھیں بہت مایوسی ہوئی۔ انھیں اس بات سے ٹھیس لگی کہ سٹے فوز ڈ کرپس جیسا ہندوستان کا دوست بھی کانگریسی نقطۂ نظر کو غلط سمجھا یا اُس سے غلط نتائج نکالے۔ یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ لڑائی کے دوران کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ حکومت جنگ کی نازک صورت حال میں تمام تر الجھی ہوئی تھی۔ ہندوستانی فوج میں مسلسل توسیع کی جارہی تھی اور امریکا اور برطانیہ فوجی سامانوں اور فوجیوں میں برابر اضافہ کرتے چلے جاتے تھے۔

جاپان نے چین میں اور جرمنی نے روس میں بہت بھاری قیمت چکا کے یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ ایک وسیع برصغیر کے اندرونی حصے میں دفاع کیا کچھ کرسکتا ہے۔ ہندوستان بھی ایک وسیع ملک تھا اور اس پر قبضہ جمانا آسان نہیں تھا لیکن روس اور چین کے برعکس یہاں قومی جوش حرکت میں نہیں آسکا تھا۔ عوام اور حکومت کے درمیان مقاصد کی ہم آہنگی نہیں تھی۔ برطانیہ پر عدم اعتماد مرض کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اڑیسہ کے ساحلی اضلاع حملے کے خطرے سے دوچار تھے۔ گاندھی کی پیرو میرا بین (مس سلیڈ) نے یہ محسوس کیا کہ لوگ کچھ بھی صاف طور سے سمجھ نہیں پارہے تھے۔ البتہ خوف اور حکومت پر بے اعتمادی کا جذبہ ہر ایک پر حاوی تھا۔ ملایا اور برما کے مہاجرین اپنے

ساتھ نسلی امتیازات کی جو کہانیاں لائے تھے انھیں سن سن کر اور بنگال میں ''جھلستی زمین'' کا وہ پہلا تجربہ دیکھ کر جس میں دریائی رسل ورسائل کے لیے بے حد ضروری ہزاروں چھوٹی چھوٹی کشتیاں جلا دی گئی تھیں، ملک بھر میں رائے عامہ بددل ہو چکی تھی۔

جنگ کی بدولت ایک چھوٹی سی اقلیت روزگار کے نئے نئے ذرائع اور ٹھیکوں سے پھل پھول رہی تھی اور حکومت کا رابطہ بس اسی سے تھا۔ لیکن گاندھی کی انگلیاں عوام کی نبض پر تھیں۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ خطرے کی اس نازک گھڑی میں لوگ مضبوطی کے ساتھ حکومت کی حکم عدولی کرنے کی بات نہیں سوچ رہے تھے بلکہ ان پر گھبراہٹ مایوسی اور بے بسی کا عالم طاری ہے۔ ہندوستان کو ملایا اور برما جیسی صورت حال سے بچانے کے لیے فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ گاندھی کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ ملک کے دفاع کے لیے اہل ملک تبھی دلی لگن سے کام کر سکیں گے جب حکومت برطانیہ ہندوستان کی آزادی کا فوری اعلان کر دے۔ انھیں یہ احساس تھا کہ ان کا یہ خیال ایک بم چھوڑ دے گا: ''میں جانتا ہوں کہ اس خیال کی اعجوبگی سے، خاص کر اس موقع پر، بہت سے لوگوں کو ایک دھچکا سا لگے گا۔ میرے نفس کی راست بازی کا یہ تقاضا ہے کہ یہ خطرہ مول لے کر بھی کہ لوگ مجھے پاگل نہ سمجھ بیٹھیں، مجھے سچ بات کہنا ہی چاہیے۔ میں اسے جنگ کے لیے اپنی طرف سے ٹھوس امداد اور اس خطرے سے ہندوستان کی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔

لارڈ ہارڈنگ 16-1910 کے دوران ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ وہ اپنی یادداشتوں میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک بار گوکھلے سے پوچھا کہ ''اگر میں آپ سے کہوں کہ تمام برطانوی افسران اور فوجیں ایک مہینے کے اندر اندر واپس ہو جائیں گی تو آپ کو کیسا لگے گا؟'' گوکھلے نے جواب دیا کہ ''مجھے یہ خبر سن کر بڑی مسرت ہوگی۔ لیکن ابھی آپ عدن تک ہی پہنچے ہوں گے کہ ہم آپ کو یہ تار بھیجیں گے کہ واپس آجایئے۔'' گوکھلے اور ہارڈنگ کے زمانے کے مقابلے میں اب رائے عامہ بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ تاہم عالم گیر جنگ کے دوران برطانیہ کی مکمل واپسی کا مشورہ یقیناً تعجب خیز تھا۔ گاندھی نے ہر انگریز سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ جسمانی طور سے ہندوستان سے واپس چلا جائے بلکہ یہ کہا تھا کہ سیاسی طاقت انگریزوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے ان لوگوں کے لیے جو یہ کہتے تھے کہ یہ موقع ایسے اقدام کے لیے

مناسب نہیں ہے، ان کا جواب یہ تھا کہ: (ہندوستانی آزادی کے حق کو) تسلیم کرنے کی نفسیاتی ساعت یہی ہے کیوں کہ تبھی اور صرف تبھی جاپانی جارحیت کا اس طرح ڈٹ کے مقابلہ ہو سکے گا کہ اس میں تاب مقاومت نہ رہ جائے۔''

بیس سال سے بھی زیادہ عرصے سے گاندھی یہ دلیل پیش کرتے چلے آرہے تھے۔ کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندوستان کا آزاد ہونا ناممکن ہے لیکن انھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ فرقہ واریت اور بھی زیادہ سر اٹھاتی چلی جا رہی ہے اور اب وہ چاروناچار اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ آزادی کے ماحول ہی میں ان دونوں فرقوں کے مطالبات پر سمجھوتہ ہوسکتا ہے۔ اس طرح ''ہندوستان چھوڑ دو'' کا گاندھیائی حل دونوں ہی طرح کے خطرات کے لیے تھا، جاپانی حملہ اور اندرونی نفاق جن کا 1942 کے موسم گرما میں ہندوستان کو سامنا تھا، یہ الزام کہ یہ حل شکست خوردگی پر مبنی اور جاپان کے ابھرتے ہوئے سورج کو خراج عقیدت تھا، ان کے خیال کی مکمل غلط فہمی پر مبنی تھا۔ فروری 1942 میں جب جاپانی بہت سرعت کے ساتھ مشرق بعید میں بڑھتے چلے جا رہے تھے تو انھوں نے علی الاعلان اس خطرے کو بعید از حقیقت بتایا تھا کہ برطانیہ دھڑام سے گر پڑے گا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ برطانیہ کو کئی جنگوں میں پسپائی ہوئی ہے لیکن وہ زندہ بچ نکلنے کا اور پسپائیوں کو کامیابی کا زینہ بنانے کا گر جانتا ہے۔ انھوں نے غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ مالکوں کی تبدیلی کے خلاف ہیں۔ ''میری یہ خواہش ہرگز نہیں ہے کہ برطانوی حکمرانی کا کسی دوسری حکمرانی سے تبادلہ کرلوں۔ جس دشمن کو میں جانتا ہی نہیں اس سے وہ دشمن بہتر ہے جسے میں جانتا ہوں۔ محوری طاقتوں کے اقرار دوستی کو میں نے ذرہ برابر اہمیت نہیں دی اور نہ اسے باوزن جانا اگر وہ ہندوستان آئیں گی تو ہمیں آزاد کرانے کے لیے نہیں بلکہ مال غنیمت میں حصہ بٹانے کے لیے آئیں گی۔''

میرا بین اسی مقصد سے اڑیسہ گئی تھیں کہ وہاں کے عوام کو اس بات کے لیے تیار کریں کہ اگر جاپانی کسی طرح مشرقی ساحل پر اترنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ جاپانیوں کا اہنسا کے اصول سے مقابلہ کریں۔ ان کے نام 31 مئی 1942 کے ایک خط میں گاندھی نے لکھا کہ ''اس بات کو یاد رکھیے کہ ہمارا مطمح نظر یہ ہے کہ جاپانی فوج سے مکمل عدامِ تعاون کیا جائے۔ اس لیے ہم کسی بھی

طرح ان کی مدد نہ کریں اور نہ ہم ان سے کوئی معاملت کر کے ان سے فائدہ اٹھائیں......لیکن اگر لوگوں میں موت کی حد تک جاپانیوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہو اور یہ جرأت وصلاحیت بھی نہ ہو کہ ان مقامات کو خالی کر سکیں جہاں جاپانیوں نے حملہ کیا ہے تو پھر جو کچھ بھی ان سے ممکن ہے وہ کریں۔لیکن یہ کسی صورت میں بھی نہیں کرنا ہے کہ وہ جاپانیوں کے سامنے بخشی سپر انداختہ ہو کر محکومی قبول کر لیں۔ یہ ایک بزدلانہ فعل ہوگا اور آزادی کے پرستار عوام کے شایان شان نہ ہوگا۔ انھیں ایک آگ سے بھاگ کر دوسری آگ میں جو شاید زیادہ خطرناک بھی ہو،گرنا نہیں چاہیے۔''

اگر محوری طاقتوں سے واقعی یا احتمالی ساز باز رکھنے والے ہندوستان میں کہیں رہے بھی ہوں تو بھی یہ واضح ہے کہ گاندھی ان میں نہیں تھے۔بعض غیر ملکی نامہ نگاروں نے ایک بار انھیں اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ برطانوی فوجوں کی اچانک واپسی کا لازمی نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان پر جاپانی حملہ کا خطرہ اور بڑھ جائے اور چین کے دفاع میں بے حد وحساب کم زوری آ جائے۔انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ ''وہ جاپانیوں کو روکنے کے لیے کسی ایسے غیر متشدد عمل کی گارنٹی نہیں دے سکتے جس میں غلطی کا امکان ہی نہ ہو۔'' بعد میں جواہر لال نہرو سے تبادلۂ خیالات ہوا اور اس کی روشنی میں گاندھی اس امر پر مجبور ہوئے کہ برطانوی طاقت سے علاحدگی کے بارے میں خود اپنے خیالات کی مزید تشریح وتوضیح کریں تا کہ ان خیالات کو بین الاقوامی حقائق کے فریم میں ٹھیک سے لگایا جا سکے۔انھوں نے یہ منظور کر لیا کہ جب تک جنگ چل رہی ہے اس وقت تک اتحادی فوجیں سرزمین ہند پر رہیں اور ہندوستان کی قومی حکومت کے اوّلین کاموں میں سے ایک کام یہ بھی ہو کہ محوری طاقتوں کے خلاف وہ اقوام متحدہ سے ایک دفاعی صلح نامہ مرتب کر لے۔ یہ اس موقف سے نمایاں انحراف تھا جس پر گاندھی ستمبر 1939 سے برابر قائم تھے۔

جنگ کی ابتدا ہی سے گاندھی اپنے اہل وطن سے یہ کہتے چلے آرہے تھے کہ وہ حملہ آور فوج کا بھی اہنسا کے ذریعے مقابلہ کرنے کا طریقہ اپنائیں۔ان کی خواہش تھی کہ طریق کار انڈین نیشنل کانگریس نے آزادی کے لیے جدوجہد میں اختیار کیا تھا وہ اسی پر ملک کے دفاعی معاملات میں بھی قائم رہے۔اس مسئلے پر دو مرتبہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی اکثریت کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو چکے تھے۔دوسری عالمی جنگ میں کانگریس کے دل وجان سے شامل ہونے پر ان کا راضی ہو جانا،ایک

ایسا قدم تھا جو ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ جان سے بھی زیادہ عزیز اصولوں سے اس انحراف پر وہ کسی نہ کسی طرح صرف اس لیے راضی ہو گئے کہ جنگ نے بھی مخدوش موڑ لے لیا تھا اور ان کے دل میں ہندوستان کی آزادی کا جذبہ بھی شدید تھا۔

14/جولائی 1942 کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے واردھا میں جلسہ طلب کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ''ہندوستان میں برطانوی راج کا خاتمہ فوراً ہونا چاہیے۔'' کمیٹی نے یہ وضاحت کی کہ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد برطانیہ کے خلاف بڑی تیزی سے اور وسیع پیمانے پر نفرت اور زیادہ پھیل گئی ہے اور جاپانی مسلح کامیابی پر اطمینانی کیفیت بڑھ رہی ہے۔ ہندوستان کو ''ایک مشترک مہم میں بہ خوشی شامل ہونے والے شرکاء'' بنانے کے لیے کمیٹی یہ ضروری سمجھتی تھی کہ ہندوستانی ''آزادی کی چمک خود بھی تو دیکھ سکیں۔

اگر اس اپیل کا کوئی ردّعمل نہ ہو کہ برطانوی حکومت فوراً ختم کر دی جائے تو کمیٹی نے ایک ایسی تحریک سول نافرمانی کی پیش گوئی کی جو لازمی طور سے مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہوگی'' اس معرکہ آرا سوال پر آخری فیصلہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی پر چھوڑ دیا گیا اور اس کمیٹی کا اجلاس 7 اگست کو بمبئی میں طلب کیا گیا۔

اس کے بعد کے تین ہفتے بڑی سرگرمیوں اور کھنچاؤ اور تناؤ کے تھے کہ دم پھولنے لگے۔ ''ہندوستان چھوڑ دو'' تجویز نے عام کانگریسی کارکنوں کے دل موہ لیے تھے۔ اس پر اعتراض کرنے والے بھی موجود تھے۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خاں کو خطرہ تھا کہ اس تجویز سے ہڑبونگ مچ جائے گی۔ جناح نے الزام لگایا کہ ''یہ اس بات کی کوشش ہے کہ برطانوی حکومت کو زِچ کر کے کانگریس راج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جائے۔'' برطانوی لیبر پارٹی کی قومی مجلس انتظامیہ نے یہ اعلان کیا کہ مجوزہ تحریک سے تمام آزادی پسند اقوام کی قسمتیں خطرے میں پڑ جائیں گی اور ہندوستانی آزادی کی ساری امیدوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ سی راج گوپالا چاری نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ''دوسری حکومت قائم کیے بغیر، (موجودہ) حکومت کو ہٹا دینے کا مفہوم یہ ہوگا کہ خود ریاست اور سماج کو ہی ختم کر دیا جائے۔''

گاندھی نے اس اعتراض کا جواب ''ہری جن'' میں مضامین اور اخباری نمائندوں کو دیے

گئے انٹرویو کی شکل میں دیا۔ انھوں نے برطانیہ سے جو یہ استدعا کی تھی کہ وہ ہندوستان کو اپنی قسمت پر ''خدا پر یا موجودہ دور کی زبان میں، نراجیت پر'' چھوڑ دے تو اس کا یہ مطلب یہ نہیں تھا کہ اگر ان کی تجویز قبول کر لی جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ نراج ہوگا۔ اس کے برعکس انھیں اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا کہ حقیقی ذمہ داری کا سامنا کرنے کے بعد، ہندوستانی پارٹیاں کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ضرور کر لیں گی اور ملک کو بحران سے بچا لے جائیں گی۔ اس طرح برطانوی واپسی، جاپان کے مقابلے میں دفاعی قوتوں کو کمزور کرنے کی بجائے، اور مضبوط بنائیں گی۔ برطانیہ کی طرف نفرت کو خیر سگالی کے جذبات کا روپ دینے میں (جو قوت صرف ہوگی) وہ ''سارے نگی جہازوں اور ہوائی جہازوں سے قیمت میں کم تر نہیں ہے۔'' یہ تھا گاندھی کا استدلال اور یہ بھی کہ فوری طور سے ہندوستانی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ ''درجۂ اول کی اہمیت کا حامل جنگی اقدام'' ہوگا۔''

''ہندوستان چھوڑ دو'' والی تجویز آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اجلاس بمبئی میں پاس کر دی۔ جو مندوبین جمع تھے انھیں خطاب کرتے ہوئے آدھی رات کو گاندھی نے کہا کہ ''واقعی جنگ کا آغاز اس وقت نہیں ہو رہا ہے۔ آپ نے بعض اختیارات مجھے سونپ دیے ہیں۔ میرا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ ہز ایکسی لینسی وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے یہ گزارش کروں کہ وہ کانگریس کا مطالبہ مان لیں۔ اس میں دو تین ہفتے لگ سکتے ہیں۔ اس درمیان میں آپ کو کیا کرنا ہے؟ چرخہ موجود ہی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں گا لیکن آپ کو اس سے زیادہ بھی کچھ کرنا ہے۔ آج اس لمحے سے آپ میں سے ہر شخص اپنے کو آزاد مرد یا عورت تصور کرے گا اور عمل بھی اس طرح کرے گا جیسے کہ وہ آزاد ہو اور سامراج کی ایڑی تلے دبا ہوا نہ ہو۔''

9/اگست 1942 کو صبح ہوتے ہوتے بستر پر لیٹے ہوئے گاندھی نے اپنے سکریٹری سے کہا کہ ''میری شب گزشتہ کی تقریر کے بعد وہ لوگ مجھے گرفتار نہیں کریں گے'' لیکن حکومت بہت پہلے اپنا فیصلہ کر چکی تھی۔ ہم یہ پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ اب سے ایک دن کم دو سال قبل وائسرائے نے گورنروں کو جو تجویز بھیجی تھی اسی میں حکومت کے اس قطعی فیصلے کا ذکر تھا کہ اگر کانگریس نے حکومت کو کھلا ہوا چیلنج دینے کی جرأت کی تو اسے کچل دیا جائے گا۔ آرڈی ننس جس میں انتظامیہ کو کھلی چھوٹ کے اختیارات عطا کر دیے گئے تھے، پہلے ہی سے تیار تھا اور اسے صرف سکریٹریٹ کی خفیہ الماریوں

کے خانوں سے نکال لینا تھا۔ اب تک ان اختیارات کے استعمال نہ کیے جانے کا سبب گاندھی کے اعتدال کے ساتھ چلائی ہوئی 41-1940 کی انفرادی تحریکِ سول نافرمانی تھی۔

حکومت ہند سخت اقدام میں مضمر خطرات سے واقف تھی اور اس کا پتہ اس خط سے چلتا ہے جو اس نے جنوری 1941 میں صوبائی حکومتوں کو لکھا تھا۔ اس خط میں انفرادی سول نافرمانی کی تحریک کا جائزہ لیا گیا تھا۔ صرف ایک صوبے (صوبائی حکومت) نے اس پر زور دیا تھا کہ تحریک کو روکنے کا واحد ذریعہ یہ ہوگا کہ گاندھی کو فوراً گرفتار کرلیا جائے۔ دوسروں نے یہ تسلیم تو کیا تھا کہ گاندھی کو آزاد چھوڑے رکھنا اور جو ان کے احکام بجالاتے ہیں ان کو گرفتار کرنا، غیر منطقی فعل ہے، لیکن بظاہر ان کی رائے یہ تھی کہ اس موقع پر ان کی گرفتاری تحریک کو روکنے کے بجائے، زیادہ امکان یہ ہے کہ تحریک میں اور بھی جان ڈال دے گی اور عوامی جوش وخروش کا وہ ماحول پیدا ہوجائے گا جس میں عوامی تحریک نپٹنے کی امید کرسکتی ہے............عام رائے یہ بھی ہے کہ مسٹر گاندھی کو زمانۂ قید میں برت رکھنے سے روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے۔''

اگست 1942 میں حکومت ہند نے یہ سارا الحاظ پاس ہوا میں اڑا دیا۔ اس کی مزاجی کیفیت بھی کانگریس ہی کی طرف بہت زچ ہوجانے کی تھی۔ اپنے نقطۂ نظر سے لارڈ لن لتھ گو تین سال کے طویل عرصے تک صبر کیے رہے۔ 1941 میں انھوں نے جیلوں سے عام رہائی کا اعلان کر کے کانگریس کے لیے ایک دل جویانہ اقدام کیا تھا لیکن وہ کانگریس کا تعاون حاصل کرنے میں ناکام رہے ''ہندوستان چھوڑ دو'' تجویز نے سیاست کا پارہ اوپر ہی چڑھا دیا تھا۔ اگر سول نافرمانی کی تحریک واقعتاً چلادی جاتی تو شہری نظم ونسق مفلوج ہوکر رہ جاتا اور جنگی کوششوں کو شدید خطرہ لاحق ہوجاتا۔ سخت احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لیے وائسرائے کو برطانوی کابینہ کی پوری تائید حاصل تھی۔ لندن میں یہ جذبہ پایا جاتا تھا کہ جائز ہندوستانی عزائم کو پورا کرنے کے لیے حکومت جتنی دور جاسکتی تھی وہ کرپس مشن کے سلسلے میں جاچکی تھی: اور اس نازک مرحلے پر کانگریس کے ایسے ہر اقدام کو جس سے جنگ کے چلانے میں رکاوٹ پڑے، بہت سختی سے دبایا جانا چاہیے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کانگریس کے خلاف بھرپور حملے کی آخری منظوری وزیراعظم چرچل نے نہیں دی جو اُس وقت قاہرہ میں تھے بلکہ مسٹر ایٹلی نے دی۔ اس مسئلے پر لیبر پارٹی اور قدرت

پسند پارٹی کے درمیان مکمل اتحادِ خیال تھا۔ یہی نہیں بلکہ برطانوی حکومت یہ سمجھے ہوئے تھی کہ جنگ کے نام پر وہ ممالک متحدہ امریکا کی حکومت اور اپنے ملک کی رائے عامہ کو بھی اپنے ساتھ لے کر چل سکے گی۔

9/اگست 1942 کو صبح سویرے گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور دوسرے کانگریسی لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ ان گرفتاریوں کی خبر پر متشددانہ ردّعمل ہوا کئی صوبوں میں خاص کر بہار، یوپی، بنگال اور بمبئی میں عوام کے غم وغصہ نے سارے بند توڑ دیے اور دھارے کا رخ برطانوی راج کی علامتوں اور اوزاروں کی جانب موڑ دیا۔ ڈاک خانے، تھانے، عدالتیں جلائی گئیں۔ ریل کی پٹریوں عمارتوں اور ریل کے ڈبوں کو نقصان پہنچایا گیا، ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کے تار کاٹ ڈالے گئے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے اپنی آخری تقریر میں گاندھی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جو تحریک چلانے والے ہیں۔ اس کی بنیاد عدم تشدد پر ہوگی لیکن ایک طرف سرکاری ہتھوڑوں کی چوٹیں تھیں اور دوسری جانب عوام کے غم وغصہ کی لہر، ان دونوں کے درمیان گاندھی کا یہ مشورہ ان سنا کر دیا گیا۔ اگرچہ کئی برطانوی افسروں اور غیر سرکاری عناصر نے 1857 کی طرف اشارے کیے ہیں لیکن 1942 میں ہونے والے بلوؤں کا تشدد اتنا ہی خودرو تھا جتنا خودکشی کے مترادف۔ حکومت نے پوری قوت سے جوابی حملہ کیا۔ ہجوم کو گولیاں چلا کے بلکہ ہوا سے مشین گن کا نشانہ بنا کے منتشر کیا گیا۔

چرچل نے دارالعوام (ہاؤس آف کامنس) کو یہ بتایا کہ ''کانگریس پارٹی نے عدم تشدد کی پالیسی کو (جو مسٹر گاندھی مدتوں سے نظریاتی طور پر ذہن نشین کراتے رہے ہیں) کئی حیثیتوں سے ترک کر دیا ہے اور کھل کر ایک انقلابی تحریک کے بھیس میں سامنے آ گئی ہے'' ہندوستان کے اندر اور باہر سرکاری پروپیگنڈہ اس تشدد کے بارے میں لوگوں کو یہ باور کراتا رہا کہ کانگریسی لیڈروں نے بہت ہی منظّم طور سے ایک سازش رچی تھی۔ آغا خاں پیلیس کو عارضی طور سے ایک جیل کی شکل دے دی گئی تھی۔ وہاں اسیری کے ایک ہفتے کے اندر ہی اندر گاندھی نے وائسرائے کو لکھ کر شکایت کی، کہ واقعات کی ترتیب کے سرکاری بیان میں بُری طرح ''حقائق کو ذبح'' کیا گیا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ انھیں گرفتار نہ کر لیا جاتا تو وہ حکومت سے مصالحت کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھتے۔ نہ تو

خود انھوں نے اور نہ ان کے کسی ساتھی نے کسی منزل پر بھی تحریک چلانے میں تشدد کا تصور کیا تھا۔ انھوں نے حکومت پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ایک سرے سے تمام لیڈروں کو گرفتار کر کے بحران کے وقوع پذیر ہونے میں از خود تعجیل کر دی۔ وائسرائے نے اس تحلیل کی کسی قدر درشتی کے ساتھ تردید کی اور کانگریس تحریک کو اور اس کے ذمہ دار اور بااختیار دیے گئے، ترجمان کی حیثیت سے گاندھی کو جو کچھ بھی ہوا تھا اس کے لیے مورد الزام ٹھہرایا۔ لارڈلن لتھ گو نے لکھا کہ اس کا ثبوت موجود ہے کہ آپ اور آپ کے رفقا کو یہ امید تھی کہ اس پالیسی کا انجام تشدد ہوگا اور یہ بھی کہ آپ اس (تشدد) سے درگذر کرنے کو تیار تھے۔ نیز یہ کہ جو تشدد واقع ہوا وہ اس منظم منصوبے کا ایک جزو تھا جو کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری کے پہلے ہی تیار کرلیا گیا تھا۔''

گاندھی آل انڈیا کانفریس کمیٹی کے سامنے اپنا تفصیلی منصوبہ رکھنے نہ پائے تھے کہ ان کو گرفتار کرلیا گیا تھا لیکن انھوں نے 7 اگست کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے تبادلۂ خیال کرنے کے نقطۂ نظر سے اس صورت حال میں عام لوگوں کی رہنمائی کے لیے ایک ''مسودۂ ہدایات'' مرتب کیا تھا جب حکومت سے گفت وشنید ناکام ہو جاتی اس تحریک شروع کرنا پڑتی اس میں ایک دن کی تجارتی ہڑتال (تمام کاروبار بند کر دینا) اس دن چوبیس گھنٹے کا برت رکھنا اور پرارتھنا اور عبادت بھی شامل تھی جلسے گاؤں تھا۔ جو لوگ سرکاری دفتروں، سرکاری کارخانوں، ریلوں، ڈاک خانوں وغیرہ میں ملازم تھے انھیں ہڑتال میں حصہ نہیں لینا تھا۔ کیوں کہ ''ہمارا مقصد یہ واضح کر دینا تھا کہ ہم لوگ نہ تو جاپانی، نازی اور فسطائی حملوں کو گوارا کریں گے اور نہ برٹش راج کو۔'' جو کانگریسی مرکزی یا صوبائی اسمبلیوں یا میونسپلٹیوں اور ایسے ہی دوسرے عوامی اداروں کے رکن ہوں انھیں ممبری سے استعفا دے دینا تھا اور سولہ سال سے زیادہ عمر کے طالب علموں کو اسکول چھوڑ دینا تھا۔ نمک قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نمک بنایا جانا تھا اور مال گذاری اور لگان دینے سے انکار کر دینا تھا۔ اس جدوجہد کی نوعیت کے بارے میں ایک بامعنی اشارہ بھی تھا:

''حرف آخر! کسی کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جن کا نام کانگریسی رجسٹروں پر ہے، وہی کانگریسی ہیں۔ ہر وہ شخص جو پورے ہندوستان کے لیے آزادی چاہتا ہو اور سچائی اور دم تشدد کے ہتھیاروں پر اس جدوجہد کے مقاصد کے لیے عقیدہ رکھتا ہو، اسے اپنے کو کانگریسی سمجھنا چاہیے اور اسی کے

مطابق کام کرنا چاہیے۔ اگر کسی شخص میں فرقہ پرستی کا جذبہ ہے یا اس کے دل میں کسی دوسرے ہندوستانی یا کسی انگریز کے لیے نفرت اور بداندیشی ہو تو اس جدوجہد کے لیے اس کی بہترین امداد یہی ہوگی کہ وہ اس سے کنارہ کش رہے۔ (1)

گاندھی کو اس کا موقع نہ مل سکا کہ وہ ان ہدایات پر کانگریس ورکنگ کمیٹی سے تبادلۂ خیال کرتے لیکن ان میں اس بات کی ایک جھلک ضرور ملتی ہے کہ اس وقت ان کا ذہن کن خطرات پر سوچ رہا تھا۔ وہ اس کی پوری کوشش کر رہے تھے کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنے شوق فراواں اور دوران جنگ میں حکومت کو پریشان نہ کرنے کی خواہش کے درمیان ایک توازن قائم رکھیں۔ اگر وہ گرفتار نہ ہوتے تو ممکن ہے کہ ان پروگرام کی نوعیت دوسرے مقصد سے متاثر ہوتی۔ اتنا یقینی ہے کہ وہ اپنا اثر اس امر پر صرف کرتے کہ تشدد پھوٹ نہ پڑے۔ انھیں معلوم تھا کہ بے لگام ہجوموں کو کیسے قابو میں لایا جائے۔ جب اپیلوں سے کام نہ چلتا تو وہ برت رکھ کر عوام کو ہوش مندی کی راہ پر واپس لا سکتے تھے۔

''1942 کے فسادات کی ذمہ داری کے موضوع پر ایک طرف گاندھی (جواب بھی قیدی تھے) اور دوسری طرف وائسرائے اور ان کے مشیروں کے درمیان طویل اور کسی حد تک تند و درشت خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا۔ لارڈ لن لتھ گو (جنھیں گاندھی دوست سمجھتے تھے) گاندھی کی نیت پر بلکہ عدم تشدد پر ان کے اعتقاد تک پر شک کرنا گاندھی کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ انھوں نے اپنے اس دور کے لیے ایک ''مسکن مرہم'' اکیس دن کے برت میں تلاش کیا۔ یہ برت 10 فروری 1943 کو شروع ہوا۔ وہ برت جس سے حکومت اتنے دنوں سے گھبرا رہی تھی بالآخر سر پر آ ہی گیا، لیکن حکومت کے سخت برتاؤ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے وہ خطرہ مول لے لیا جو پہلے کبھی نہیں لیا تھا، یعنی قید خانے میں گاندھی کی موت کا خطرہ۔ ملک بھر میں ایک جذباتی ہل چل مچ گئی اور ڈاکٹروں کے (اعلانیے) روز بروز زیادہ تشویشناک ہوتے گئے۔ وائسرائے کی ایگزیکٹیو کاؤنسل کے تین ممبروں نے استعفیٰ دے دیے، مختلف پارٹیوں کے لیڈر اپنے اختلافات بھلا کر حکومت سے گاندھی کی رہائی کی اپیل کرنے لگے تا کہ گاندھی کی جان بچ

(1) حکومت سے گاندھی کی خط و کتابت 44-1942 آمد آباد، 1945 ص 357

جائے لیکن وائسرائے کوان کے وطنی حکام کی حمایت حاصل تھی اور اسی کے بل بوتے پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے انھوں نے برت کو ''سیاسی بلیک میل'' کہا اس طرح کی ملامت سے انھیں جو بھی تسکین ہوئی ہو، لیکن اس نے ہندوستان کی رائے عامہ کو ایک اور ڈنک مارا۔

اگرچہ برت سے گاندھی کے مخالفین کے دل فوراً نہیں پگھلے لیکن ہندوستانیوں کو یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ گاندھی کو خود تحریک چلانے کا موقع مل گیا ہوتا تو وہ ستیہ گرہ کو کن اصولوں پر چلاتے۔ جب تک گاندھی قید میں تھے۔ عوامی تشدد کے بارے میں کوئی رائے دینے سے سختی سے انکار کرتے رہے کیوں کہ ان کے سامنے صرف تصویر کا ایک ہی رخ تھا یعنی وہ جو سرکاری ذرائع نے پیش کیا تھا۔ انھوں نے تشدد کی برائی کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کیا تھا لیکن 1942 میں انھیں یہ شبہ تھا کہ حکومت جان بوجھ کر عوام کے غلط کاموں کو اچھال رہی ہے اور خود اپنے جبر واستحصال کو دبا رہی ہے تا کہ دنیا کی توجہ ہندوستانی آزادی کے اصل سوال سے ہٹائی جاسکے۔ 1944 کے موسم گرما میں اپنی رہائی کے بعد ہی گاندھی نے 1942 کے واقعات پر اپنی سوچی سمجھی رائے دی۔ انھوں نے کہا کہ لوگ حکومت کی چوٹیں کھانے کے بعد بے حس وحرکت نہیں پڑے رہتے اس کے حق میں تو کچھ نہ کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن انھیں یہ دیکھ کر بہت دکھ پہنچا کہ جو لوگ ان کی پیروی کے دعوے دار تھے وہ بھی اہنسا کے بنیادی اصول بھلا بیٹھے تھے۔

جب مدنا پور (بنگال) کے کانگریسیوں نے انھیں یہ داستان سنائی کہ 1942 میں لوگوں نے کس طرح تھانوں پر قبضہ کیا، عدالتوں کو جلایا اور رسل ورسائل کو مفلوج کر دیا تھا تو انھوں نے ان سے کہا کہ ''یہ تو غیر متشدد عمل کی تکنیک نہیں ہے لوگ یہ غلط سوچ بیٹھے ہیں کہ ایک جان لینے کے معاملے کو چھوڑ کر باقی سب کچھ اہنسا ہے۔ بعض اوقات مار ڈالنا تشدد کا صاف ترین طریقہ ہے۔ اگر تم کسی شر پسند کو بس مار ہی ڈالو تو جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے۔ معاملہ وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی کو پریشان کرنا اس سے بدتر ہے۔ یہ شر کو ختم نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس یہ شر کو ہمارے سروں پر لا دیتا ہے۔ حکام انتقام پر اتر آئے۔ غالباً تم یہ کہو گے کہ وہ بہر حال انتقام پر اتر آتے لیکن یہ ہماری خواہش یا مقصد نہ ہونا چاہیے۔ کسی پر گھبراہٹ طاری کرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگست 1942 میں حکام بدحواس ہو گئے ہم نے انھیں ایک بہانہ دے دیا۔'' مہاتما نے

مزید کہا کہ یہ ایک مغالطہ بھی ہے کہ شر پلوں اور سڑکوں میں بستا ہے اور انسانوں کے اندر نہیں۔ پلوں اور سڑکوں کی بربادی سے لوگوں کے دل نہیں بدلتے۔

وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ہوم ممبر سرکاری نلڈ میکس وِل کے یہ الزام کہ گاندھی نے بارود کی اس سرنگ کے سلسلے کو دیا سلائی دکھاوی جسے وہ اور ان کے ساتھی پہلے ہی سے بڑی ہوشمندی سے بچھا چکے تھے۔ اس میں ان کی غلطی نہیں تھی بلکہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ انھیں یہ سب کچھ قبل از وقت کرنا پڑ گیا۔ یہ الزام تراشی اس سرکاری فرد جرم کا ایک حصہ تھی جس کا مقصد گاندھی اور کانگریس کو جاپان نے خلاف اتحادیوں کی جنگ میں رخنہ اندازی سے ملوث کرنا تھا۔ کافی دنوں تک میدان اسی پروپیگنڈے کے ہاتھ رہا لیکن ہمیشہ نہ رہ سکا۔ فیلڈ مارشل اسمٹس نے نومبر 1942 کو لندن میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مہاتما گاندھی کو پانچواں کالم کہنا محض بکواس ہے۔ وہ ایک بڑے آدمی ہیں، دنیا کے بڑے آدمیوں میں سے ایک ہیں۔'' اخباروں میں ان کے فوٹو بلکہ ان کے نام تک کی اشاعت کی ممانعت کر کے سیاسی زندگی سے ان کا نام مٹا دینے کی کوششوں کا ناکام ہونا ہی مقدر تھا۔ وہ جس ہمت سے حکومت کے مقابلے میں جمے رہے، ان لمحات میں بھی جب ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے چاروں طرف تشدد کی جیت ہو رہی ہے وہ جس ناقابل تسخیر عقیدے کے ساتھ عدم تشدد کا پیغام دیتے رہے اور جس استقلال سے مکڑیوں کے اس جالے کو کاٹتے رہے جو سرکاری پروپیگنڈا کرنے والے 1942 کے واقعات کے گرد بنتے رہے تھے ان سب باتوں کی بدولت کروڑوں ہندوستانیوں کے دلوں میں ان کی عزت ومحبت اور بھی بڑھ گئی۔ وہ خون آلود مگر نہ جھکنے والی قوم پروری کی علامت بن گئے تھے۔

آج اس گہری جذباتیت کے نقوش کسی قدر دھندلے پڑ چکے ہیں جو 1942 کے واقعات نے ابھارے تھے اس لیے اب اس سال کے واقعات کو صحیح تناظر میں دیکھنا ممکن ہو سکے گا۔ اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ گاندھی کس طرح 1934 سے برابر لوگوں کو اہنسا کے طریقوں کی تعلیم دینے پر زور دیتے رہے اور یہ بھی یاد رکھیں کہ جنگ کے قبل کی بڑھتی ہوئی نظم شکنی اور تشدد کے رجحان پر وہ کتنے بے چین رہا کرتے تھے اور 41-1940 کی انگرادی تحریک سول نافرمانی کے چلانے میں وہ کس طرح جان بوجھ کر ضبط نفس سے کام لے رہے تھے تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اس دور

کے برق انداز ماحول میں ایسے امر کی اجازت کیوں کردے دی جسے خطرناک چھلانگ ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ان خطرات کا انھیں علم تھا جو عالمی جنگ کے دوران کسی عوامی تحریک کے چلانے میں مضمر ہوتے ہیں۔خاص کر ایسی حالت میں کہ جاپانی ہندوستان کے دروازے تک آ چکے ہوں۔ لیکن وہ عوام کے جمود اور اس امکان کو بھی سمجھ رہے تھے کہ لوگ جاپانی حملہ آوروں کے سامنے سپر انداختہ نہ ہو جائیں۔نفرت اور تشدد کے بغیر عوام کے دلوں میں قومی عزت کا جذبہ اس طرح جگانے کے لیے کہ وہ قطعی طور سے عمل پر آمادہ ہو جائیں، معجزہ درکار تھا اور کبھی کبھی معجزے ہو بھی جایا کرتے ہیں۔1930 میں چند مہینوں کے اندر گاندھی سیاسی ہندوستان میں نسلی نفرت یا تشدد کے بغیر ایک برقی لہر دوڑانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔لیکن بارہ برس بعد حالات تبدیل ہو چکے تھے۔عوام اور حکومت دونوں ہی ذہنی طور پر تناؤ اور کھنچاؤ کے لیے تیار تھے۔ایک طرف جنگ کی قسمت کی ترازو تھرتھرا رہی تھی اور حکومت واقعات کا انتظار کرنے پر مائل نہیں تھی اور دوسری طرف آبادی کے بہت بڑے حلقے میں بددلی ابل پڑی تھی۔1942 کے حالات 1930 کے مقابلے میں 1919 سے زیادہ مشابہ تھے۔1919 اور 1942 دونوں موقعوں پر گاندھی نے عوام کی ذہنیت کا صحیح اندازہ کر لیا تھا لیکن انھیں یہ امید تھی کہ ستیہ گرہ تحریک چلا کر وہ اس (کیفیت) کو تشدد اور نفرت کے جراثیم سے پاک کر سکیں گے۔لیکن کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری کے بعد عوامی دہشت پسندی اور حکومت کی جوابی دہشت پسندی کے سامنے ستیہ گرہ سے کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں تھا۔

گاندھی کو یہ امید کرنے کا کوئی حق نہیں تھا کہ حکومت ان کے قواعد کے مطابق اپنا کھیل کھیلے گی لیکن حکومت کو بھی یہ حق نہیں تھا کہ اس کی اختیار کردہ پالیسیوں کے ردعمل کے طور پر جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا الزام گاندھی کے سر تھوپے۔تجربہ کار برطانوی حکام کا عام نظریہ یہ تھا کہ گاندھی کی تحریکوں پر قابو پانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ شروع ہی میں بھرپور وار کر دیا جائے اور لارڈ لن لتھ گو نے اسی کے مطابق عمل کیا تھا۔یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ لارڈ ولنگڈن ایسی پالیسی کو غیر معمولی کامیابی سے اپنا چکے ہیں لیکن اس بار ایسی پالیسی کے ظاہری فوائد وقتی ثابت ہوئے۔ظلم اور تعدی اور اس کے جلو میں پیدا ہونے والی نفرت انھیں لوگوں پر پلٹ پڑی (جنھوں نے ایسی پالیسی چلائی تھی) 1932

میں لارڈ ولنگڈن نے بخیال خویش کانگریس کو کچل کے رکھ دیا تھا۔ پانچ سال بعد 1925 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت جو پہلے الکشن ہوئے، اس میں کانگریسی لہر سارے انتخابات پر چھا گئی 1942 میں لارڈلن لتھ گو نے اپنے خیال میں کانگریس پر فیصلہ کن فتح حاصل کی، 1947 میں برطانوی حکومت کا باضابطہ اور قطعی طور سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔ یہ بھی تاریخ کی ستم ظریفی تھی کہ لارڈ ولنگڈن اور لارڈلن لتھ گو جنھوں نے ہندوستان کی قومی تحریک کو شدید ترین ضرب پہنچائی۔ وہی ہندوستان میں سیاسی آزادی کی رفتار کو تیز تر کرنے کا ذریعہ بھی ثابت ہوئے۔

قوم پروانہ نقطۂ نگاہ سے 1942 کے واقعات ایک پریشان کن وراثت ثابت ہونے والے تھے، وسیع پیمانے پر یہ تقریباً پہلی شورش تھی جس میں غلط اندیش قوم پروری کے جذبے سے توڑ پھوڑ اور آتش زنی سے بھی گریز نہیں کیا گیا اس سے عوامی رویے کے معیار گر گئے اور جب 1946-47 میں فرقہ وارانہ جذبات نے قوم پروری کی جگہ لے لی اور عوام کے جذبات کا ابال کا سب سے اہم عنصر بن کر ایک خطرناک مثال قائم کردی۔

باب49

یہ ہار نہ تھی

آغا خاں پیلس میں قید ہونے کے ایک ہفتہ کے اندر ہی گاندھی اپنے پرائیویٹ سکریٹری مہادیو دیسائی کو کھو بیٹھے۔ لائق محنتی اور منکسر مزاج ہمیشہ مسکرانے والے ''اِم۔ڈی'' پچیس برس سے گاندھی کے کبھی جدا نہ ہونے والے مددگار رہتے۔ ''بیٹا، سکریٹری اور عاشق، ایک ہی ذات میں مجتمع''، ان الفاظ میں گاندھی نے ایک بار مہادیو کی تعریف کی تھی۔ وہ 1917 ہی میں گاندھی کے ساتھ ہو لیے تھے اس وقت وہ بمبئی یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لے کر نکلے تھے اور چند متفرق جگہوں پر بھی کام کر چکے تھے۔ اپنی خوش فہمی، بیدار ذہن اور استوار وفاداری کی بدولت مہادیو ایک لائق و نالائق سکریٹری بن گئے تھے لیکن گاندھی کے سکریٹری کو ایک منشی کے علاوہ بھی بہت کچھ ہونا لازمی تھا۔ پہلی تحریک عدم تعاون سے چند سال پہلے جب لوگ گاندھی کو اتنا زیادہ جانتے نہیں تھے، ملک گیر سیاحت میں مہادیو ڈیسائی اکثر تنہا ہمراہ ہوا کرتے تھے وہی گاندھی کا بستر لگاتے، ان کا کھانا پکاتے، ان کے کپڑے دھوتے اور سکریٹری کے دوسرے خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ جب گاندھی کی پبلک زندگی کے تقاضے بڑھنے لگے، تو مہادیو ڈیسائی کی ذمہ داریاں بھی بڑھیں۔ ان کا کام غیر معمولی حجم کی خط و کتابت کو الگ الگ کر کے ان پر کارروائی کرنا، مہمانوں کا استقبال اور ان کی دیکھ بھال کرنا، غیر ضروری ملاقاتیوں کو دور رکھنا، حساب کتاب رکھنا اور ریلوے گائڈوں

اور نقشوں کی مدد سے راہ سفر متعین کرنا تقریروں اور گفتگوؤں کا ریکارڈ رکھنا اور جرائد کی ادارت کرنا تھا۔ لکھنے کا بیشتر کام انھیں چلتی ہوئی ٹرین کے تیسرے درجے کے ڈبے میں بیٹھ کر کرنا پڑتا تھا اس لیے وہ اپنے ساتھ موم بتیاں لے کر چلتے کہ اگر ڈبے کی بجلی فیل ہو جائے تو پریس کو بھیجی جانے والی ''کاپی'' میں دیر نہ ہو۔

''ینگ انڈیا'' اور ''ہری جن'' کے پڑھنے والے انتہائی شوق سے ''ام۔ڈی'' کے ہفتہ وار اور معتد بہ نگارشات کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ ان کا اپنا ایک خاص طرز تھا۔ دیکھیے وہ ایک قدرتی طریق علاج کے ماہر، ڈاکٹر بوس کا تعارف کیسے کراتے ہیں: بے انتہا خوش گوار انسانوں میں سے ایک، جو گاندھی کو ہر روز اس بات کی فیس دیا کرتے تھے کہ وہ ان کا وقت صرف کرا کے ان کا علاج کرتے ہیں جس دن وہ ہم سے رخصت ہوئے انھوں نے ہمیں ایک نوٹ لکھ بھیجا۔ ''اس کرنسی نوٹ کو آپ کے پاس ہی جانا چاہیے اسے آپ کے پاس کل ہی چلا جانا چاہیے تھا، لیکن میرے پاس پڑا رہ گیا۔ میں اسے آپ کے پاس اس امید کے ساتھ بھیج رہا ہوں کہ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی ایک دن آ جاؤں گا۔'' مجھے تعجب نہ ہوگا اگر وہ اپنی بات کا پاس کرتے ہوئے کسی دن سیگاؤں آ ہی جائیں۔''

اب ذرا لیڈی ایمیلی کینٹیرڈ سے ایک انٹرویو کا حال سنیے انھوں نے گاندھی کو بتایا تھا کہ کس طرح دنیا کے ایک بہت ہی دور افتادہ حصے میں ایک غیر اہل کتاب جس نے کبھی انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا تھا، یہ دیکھ کر مسرت انگیز طور پر متعجب ہوا تھا کہ خود اس کی بولی میں بھی خدا کا پیغام موجود ہے۔ گاندھی نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ اس سے تو کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ لیڈی ایمیلی بھی ہنس پڑیں۔ اس سے انھیں ذرا الجھن نہیں ہوئی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ بطخ کے پروں پر پانی ڈالنے کے مرادف ہے۔ ایک مبلغ کی اوّلین صفت یہ ہے کہ وہ پروقار سنجیدگی کو برقرار رکھے۔ لیکن یہ لیبلوں کا جھگڑا کھڑا ہی کیوں ہوتا ہے؟ گاندھی نے مزید کہا، ''کیا چند لاکھ ہندوستانی اور جنوبی افریقہ کے بسنے والے بغیر عیسائی کہلائے ہوئے، حضرت عیسیٰ کے پیغام پر چل کر زندگی بسر نہیں کر سکتے؟'' جیسا کہ ایسی جنگوں میں ہوتا ہے، یہ جنگ برابر کی چھوٹی اور لیڈی ایمیلی بے حد حشاش وبشاش رخصت ہوئیں۔

گاندھی کے ہونٹوں سے شاید ہی کوئی لفظ ایسا نکلا ہو جو اس کبھی نہ تھکنے والے سکریٹری نے لکھ نہ لیا تھا۔ یہ نوٹ وہ اخباروں کے حاشیوں پر، کرنسی نوٹوں پر بلکہ اپنے ناخنوں پر بھی لکھ لیتے تھے اور پھر اپنے کسی مضمون میں یا اپنے جریدے، میں منتقل کر دیا کرتے تھے تاکہ عام لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ اپنے مالک کی سرگرمیوں اور ان کے ملفوظات کا سلسلہ وار ریکارڈ رکھنے کے معاملے میں مہادیوڈیسائی کا مقابلہ باسول سے کیا گیا ہے۔ پھر بھی گاندھی کے سکریٹری کے لیے مخلص روزنامچہ نویس سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہونا لازم تھا۔ اسے بھی اسی شدید ڈسپلن کا پابند ہونا پڑا تھا جس کو گاندھی خود اپنی ذات پر عائد کیے ہوئے تھے۔ مہادیوڈیسائی کے پاس جو کچھ بھی تھا۔ اپنی مسلسل محنت اپنی جفاکش علمیت اور اپنی دل آویز شخصیت انھوں نے صرف اس مدعائے دلی کے لیے وقف کر دیا تھا کہ اپنے مالک کے روزمرہ بوجھ کم کر سکیں وہ اکیلی جان سے مکمل سکریٹریٹ بنے ہوئے گاندھی کی ہدایات کی توضیح وتعمیل کرتے، سیکڑوں عوامی کارکنوں سے رابطہ قائم رکھتے اور مہاتما کو ہر اس تکلیف سے بچاتے رہتے جس سے بچنا ممکن تھا۔ اس عمل کے سلسلے میں انھوں نے بہت زیادہ محنت شاقہ برداشت کی۔ اگست 1942 میں ان کی اچانک موت کا صرف یہی سبب نہیں تھا کہ ''ہندوستان چھوڑ دو'' تجویز پاس ہونے سے قبل کے چند مہینوں سے ان پر شدید محنت کا بھاری بوجھ پڑ رہا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ انھیں یہ خوف کھائے جا رہا کہ مہاتما جیل میں مرن برت (فاقہ موت) رکھ لیں گے۔

آغا خاں پیلس پر غم کا ایک اور سایہ پڑا۔ کستوربا کی صحت کافی دنوں سے باعث پریشانی تھی۔ خاندانی ڈاکٹر گلڈر، ڈنشا اور سوشیلا نیّر اور بعد میں پنجاب کے وید شیو شرما کا علاج ہوتا رہا لیکن وہ روبہ صحت نہیں ہوئیں۔ 22 فروری 1944 کو شوہر کی گود میں ان کی وفات ہوئی کستوربا نے ان سے کہا کہ ''اب میں جا رہی ہوں، ہم نے بہت سی خوشیاں اور بہت سے غم ساتھ ساتھ دیکھے ہیں۔'' ان کی آخری وصیت یہ تھی انھیں اس ساڑی میں کفنایا جائے جس کا سوت شوہر کے ہاتھ کا کتا ہوا ہو۔

لارڈ ویول کے تعزیتی خط کے جواب میں گاندھی نے لکھا کہ ''ہم دونوں کا جوڑا غیر معمولی تھا۔'' ان کی باسٹھ سال کی متاہلانہ زندگی کا پورا دور مسلسل ترقی پذیری کا دور رہا تھا۔ دونوں کے

درمیان جوزبردست ذہنی فاصلہ حائل رہا،اس کے باوجود گاندھی نے یہ سیکھ لیا تھا کہ ان کی رائے کی عزت کریں اوران کوخود اپنے فیصلے کرنے دیں۔ جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ اندولن کے آخری دور میں انھوں نے جیل کی راہ اپنائی تھی۔ ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریکوں کے دوران انھوں نے قید خانے جانا پسند کیا تھا۔ راج کوٹ اندولن میں ستر سال کے سن میں انھوں نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا تھااوران کی آخری گرفتاری ان کی موت ہی پر ختم ہوئی۔

اس کے باوجود، ان کا اصلی کام سیاسی میدان میں نہیں تھا۔ ان کے شوہر کے چیلوں اور ساتھیوں کے بے حد وسیع حلقے میں انھیں ''با''یعنی ''ماں'' کہا جاتا تھا۔ یہ ان کا خاندان تھااور آشرم ان کا گھر۔ وہ اپنے شوہر کی جھونپڑی میں بیٹھ کران کے چوکے میں انھیں کھانا کھلاتے وقت پنکھا جھلتی رہتیں یا کھانے کے بعد جب وہ قیلولہ کرتے تو ان کے پاؤں دباتیں۔ وہ گجراتی میں لکھ پڑھ لیتی تھیں اور جنوبی افریقہ میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنا بھی آ گیا تھااوراس انگریزی کا استعمال وہ ماہرانہ نہیں بلکہ معصومانہ انداز میں کیا کرتی تھیں جب ایک یورپین سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان سے احتجاجاً کہا کہ گاندھی اپنی قلت غذا کے خود ذمہ دار ہیں تو وہ انگریزی میں بولیں کہ ''میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں۔ وہ ہمیشہ شرارت کرتے ہیں۔'' آغا خاں پیلس میں گاندھی نے ان کی تعلیم میں جو خلا رہ گئے تھے انھیں پُر کرنا شروع کر دیا تھا۔ لوگ یہ دیکھ کر مزا لیتے تھے کہ چوہتر سال کی عمر میں یہ خاتون اپنے کمرے میں ٹہل ٹہل کر جغرافیہ اور معلومات عامہ کی ابتدائی باتیں رٹا کرتی تھیں، لیکن سبق کا وقت آتا تو ان کی یادداشت آنکھ مچولی کھیلنے لگتی۔ وہ بتائیں کہ لاہور کلکتہ کا دارالسلطنت ہے۔

کستور با کو سب سے بڑی مایوسی اپنے سب سے بڑے لڑکے ہری لال سے ہوئی یہ بچہ ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اس نے اپنے والدین سے بغاوت کی تھی اور بے لنگر کا جہاز ہو گیا تھا۔ 1925 میں گاندھی کو لائل پور (پنجاب) سے خط ملا کہ ''آل انڈیا اسٹورس لمیٹڈ'' نامی کمپنی، جس کے ڈائرکٹروں میں ان کے یہ سب سے بڑے صاحبزادے شامل تھے ایک بوگس کمپنی ثابت ہوئی۔ مہاتما نے فوراً اپنے اس بدکردار بیٹے سے اپنی بے تعلقی کا کھلم کھلا اعلان کیا۔ ''میرے نزدیک ستیہ گرہ کا قانون، محبت کا قانون ایک ابدی اصول ہے۔ جو کچھ بھی خیر ہے میں اس سے

تعاون کرتا ہوں اور جو کچھ بھی شر ہے میں اس سے عدم تعاون کرنا چاہتا ہوں، چاہے اس کا تعلق میری بیوی سے ہو یا میرے بیٹے سے ہو یا خود میری ذات سے۔'' اس طرح کے بیٹے سے بھی قطع تعلق کر لینا ماں کے مقابلے میں باپ کے لیے نسبتاً آسان تھا۔ ایک بار جب ماں نے یہ سنا کہ ہری لال کو بر سر عام شراب کے نشے میں رہنے کے جرم میں سزا ملی ہے تو انھوں نے بیٹے کو خط لکھا کہ وہ ''ایک ایسی بوڑھی عورت کی خاطر'' اپنے اطوار سدھارے۔ ''جو اس صدمے کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔'' لیکن ہری لال نے اپنی حالت نہیں سدھاری، وہ ناقابل اصلاح ہو چکے تھے۔ ان (ماں) کی وفات سے ایک دن پہلے وہ ان کے پاس لائے گئے۔ بستر مرگ پر لیٹی ماں کے سرھانے وہ شراب پیے ہوئے پہنچے یہ منظر دیکھ کر وہ مضطرب ہو گئیں اور انھیں ماں کے سامنے سے بہت جلد ہٹا لیا گیا۔

اپنے محبوب سکریٹری اور بیوی کے انتقال کے بعد گاندھی کے ذہن میں آغا خاں پیلس کے ساتھ غمگین تصورات وابستہ ہو گئے تھے۔ انھیں اس احساس سے بھی اذیت ہوتی تھی کہ وقتی طور پر بنائی ہوئی اس جیل کے بہت بڑے اسٹاف اور فوجی محافظوں پر ملک کے کافی پیسے خرچ ہو رہے ہیں۔ ان کی جلد رہائی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے اور وہ ایک طویل المدت قید کے لیے ذہنی طور پر اپنے کو تیار کر چکے تھے لیکن 1944 کی ابتدا میں ان کی صحت کی جانب سے حکومت کو پریشانی ہونے لگی۔ ان کو ملیریا ہو گیا تھا اور تیز بخار رہا کرتا تھا۔ جنگ کا دھارا اب اتحادیوں کے موافق بہنے لگا تھا اور اب حکومت کی نگاہوں میں گاندھی کی رہائی کے خطرات جیل میں ان کی موت کے امکان کے خطرے کے مقابلے میں کم معلوم ہونے لگے تھے۔

(6 مئی 1944) اپنی رہائی سے گاندھی کو خوشی نہیں ہوئی بلکہ انھیں اس شرمندگی کا احساس ستانے لگا کہ وہ جیل میں بیمار ہی کیوں پڑے۔ وہ بمبئی کے پاس جوہو کی ایک صحت گاہ میں لے جائے گئے جو سمندر کے کنارے واقع تھی اب یہ پتہ چلا کہ وہ صرف ملیریا کے اثرات مابعد ہی کو نہیں جھیل رہے تھے بلکہ پیٹ میں بڑے کیڑے پڑ گئے تھے اور امیبا کی چھوت کی بیماری بھی لگ گئی تھی۔ اس کی وجہ سے جسم میں خون کی شدید کمی ہو گئی تھی۔ انھوں نے ''شافی مطلق'' خدا میں اعتماد میں کمی کو ان تمام بیماریوں کا سبب بتایا انھیں دواؤں سے جو الجھن ہوتی تھی اس کے باعث ان کا

علاج آسان نہیں تھا۔ پھر بھی، زیادہ ہفتے نہیں گزرے تھے کہ وہ ملک کو درپیش مسائل کے سلجھانے میں مصروف ہونے کے قابل ہوگئے۔

1944 کے موسم گرما تک ہندوستان 1942 کی ''بغاوت'' کے جھٹکے سے پوری طرح سنبھلا نہیں تھا۔ علانیہ سیاسی شورش دبادی گئی تھی اور پوشیدہ (انڈرگراؤنڈ) کارروائیاں بھی کم ہوگئی تھیں۔ عوامی محرومی اور بددلی اب بھی اظہار کی راہیں نکالنے کی کوشش کررہی تھی لیکن جاپان کی جانب سے وہ سنگین خطرہ قطعی طور سے کم ہوگیا تھا جس سے گاندھی کے ''ہندوستان چھوڑ دو'' والے مطالبے اور حکومت کے شدید ردّعمل دونوں ہی کو تحریک ملی تھی۔ 1944 میں اس عوامی سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا کوئی سبب باقی نہیں رہ گیا تھا جس کا انھوں نے منصوبہ بنایا تھا لیکن جسے وہ دو برس پہلے چلانے نہیں پائے تھے۔ اب پوشیدہ کارروائیوں کو جاری رکھنے کا بھی کوئی مطلب نہیں رہ گیا تھا کیوں کہ پوشیدگی اور اخفا ستیہ گرہ میں شجرممنوعہ تھے۔ پھر بھی 1944 کا ہندوستان خاموش ہونے سے کوسوں دور تھا۔ اب ملک کی اقتصادیات پر جنگ کا اثر محسوس ہونے لگا تھا۔ ملک کے کئی حصوں میں قحط یا قریب بہ قحط کے حالات تھے۔ سب سے بڑی سیاسی پارٹی قانون کی زد سے پرے تھی۔ کئی صوبوں میں آئین معرض التوا میں تھا، اور ایگزیکیٹو میں صرف وائسرائے کے نامزد ممبران مرکز میں رہ گئے تھے۔ ان حالات میں ایک نئی سیاسی حرکت کی ضرورت بالکل عیاں تھی۔

گاندھی اس سے واقف تھے کہ سرکاری حلقوں میں ان کی ساکھ بہت زیادہ نہیں تھی، ان کی اور کانگریس کی نیک نیتی پر شک کیا جارہا تھا۔ چرچل کی صدارت میں برطانوی کابینہ میں ترازو کا پلہ گاندھی کی مخالف سمت میں بہت زیادہ جھکا ہوا تھا۔ ان سب کے باوجود انھوں نے حکومت اور کانگریس کے درمیان سیاسی تعطل کو ختم کرنے کے لیے عملی اقدام میں پہل کی۔ 17 جون 1944 کو انھوں نے لارڈ ویول کو خط لکھا جس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ارکان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وائسرائے نے یہ درخواست مسترد کردی۔ انھیں گاندھی سے ملنے میں بھی کوئی فائدہ نظر نہیں آیا کیوں کہ ''دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں اساسی اختلاف'' تھے۔ ''نیوز کرانکل'' کے (نمائندے) اسٹوارٹ گلڈر سے ایک ملاقات کے دوران گاندھی نے مرکز میں قومی حکومت

بنانے کی تجویز رکھی اس حکومت کا انتخاب مرکزی قانون ساز اسمبلی کے منتخب ممبران کے ذریعے ہونا تھا۔ وائسرائے نے کہا کہ یہ تجویز ''ملک معظم کی حکومت کے نزدیک بالکل قابل قبول نہیں ہے۔''
لارڈ ویول فی الحقیقت لارڈلن لتھ گوکی اس پالیسی پر چل رہے تھے کہ جب تک کانگریس ''ہندوستان چھوڑ دو'' والا رزولیوشن واپس نہیں لے لیتی اوراس کے لیڈر ماضی کے لیے معذرت خواہ نہیں ہوتے اور مستقبل کے لیے گارنٹی نہیں دے دیتے تب تک کانگریس سے کوئی علاقہ نہ رکھا جائے گا۔

17 جولائی 1944 کو گاندھی نے چرچل کو ایک خط لکھا اوراس میں یہ اپیل کی کہ ''مجھ پر بھروسہ کیجیے اوراپنے اور میرے عوام کی خاطراوران کی وساطت سے دنیا بھر کے عوام کی خاطر، میری خدمات کا فائدہ اٹھایئے۔'' یہ اپیل غلط شخص سے غلط وقت پر کی گئی تھی۔ جب تک لڑائی جاری تھی اور جب تک برطانوی حکومت کی سربراہی چرچل کے سپرد تھی۔ کانگریس کے حق میں صلح جویانہ رویے کی امکانات واقعۃً بہت ہی کم تھے۔ مزید برآں حکومت کو ایسا لگ رہا تھا کہ گاندھی کے اقدامات صلح کا منبع سیاسی شکست کا احساس اور یہ خواہش ہے کہ کانگریس کو 1942 کی ''بغاوت'' کے ملبے سے باہر نکال کراس کو دوبارہ عزت دلائی جائے۔ یہ مفروضہ سیاست کے عام پیمانوں کے عین مطابق تھا۔ لیکن گاندھی کے دلائل مختلف تھے۔ وہ ستیہ گرہ کی منطق کی تاسّی کررہے تھے۔ اس منطق کے لحاظ سے مخالف سے باعزت صلح، چاہے جس وقت بھی کی جائے، خوش آئند ہوتی ہے اوراس میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لڑنے والوں میں کس کی طاقت یا کمزوری کس حد کی ہے۔ اگرچہ حکومت نے یہ بات سال بھر بعد تسلیم کی لیکن گاندھی شروع ہی سے یہ مانتے چلے آرہے تھے کہ جنگ نے جو اقتصادی مسائل کھڑے کردیے ہیں یا ان میں شدت پیدا کردی ہے ان کا حل صرف قومی حکومت ہی ڈھونڈھ سکتی ہے۔ 1931 میں انھوں نے حکومت سے اس وقت صلح منظور کرلی جب سول نافرمانی شباب پر تھی کیوں کہ انھیں لارڈ اروِن کے خلوص کا یقین تھا۔ 1944 میں انھوں نے اس وقت صلح چاہتی جب بظاہر کانگریس کی پوزیشن کمزور تھی۔

برطانوی سیاست دانوں کا یہ کہنا تھا کہ ہندوستانی مسئلے کا لب لباب یہ نہیں ہے کہ برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو اختیارات سونپنے کو آمادہ ہے یا نہیں بلکہ خود ہندوستانیوں کے درمیان

اتفاق رائے کا فقدان ہے۔ اگر اس طرح دیکھا جائے تو سیاسی تعطل اتنا برطانیہ اور ہندوستان کے مابین نہیں تھا جتنا انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مابین تھا۔ موخرالذکر نے 1940 سے پاکستان کو اپنا موقف بنالیا تھا۔ہم یہ پہلے ہی دیکھ آئے ہیں کہ گاندھی اس مطالبے کو نہ تو ہندوستان کے حق میں مفید سمجھتے تھے نہ خود مسلمانوں کے حق میں۔لیکن اسی کے پہلو اہنسا پر اعتقاد رکھنے کی وجہ سے اگر اس مطالبے کو مسلمانوں کے بہت بڑے حلقے کی تائید حاصل ہو تو وہ اسے سرسری طور سے مسترد بھی نہیں کر سکتے تھے۔ 1942 میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے حق خود ارادیت کا اصول تسلیم کرلیا تھا اور اس کا اعلان کر دیا تھا کہ کانگریس ملک کے کسی حصے کو اسی کی مرضی کے خلاف انڈین یونین میں رہنے کے لیے مجبور کرنے کا تصور نہیں کرسکتی۔ 1942 میں اپنی گرفتاری سے پہلے گاندھی نے یہ سجھاؤ رکھا تھا کہ اگر برطانوی حکومت مسلم لیگ سے قومی حکومت بنانے کو کہتی ہے تو کانگریس اس تجویز کو بخوشی استقبال کرے گی۔ جناح نے اس تجویز پر سنجیدگی س غور نہیں کیا۔ جناح کے ایک پبلک بیان کے جواب میں، گاندھی نے جیل سے انھیں ایک خط لکھا تھا جو حکومت نے روک لیا تھا۔ جناح نے اس پر تبصرہ کیا تھا کہ گاندھی انھیں حکومت سے الجھانا چاہتے ہیں۔مسلم لیگ کے قائد بہرصورت حکام وقت سے الجھنے کو تیار نہیں تھے۔اگست 1942 میں تمام کانگریس لیڈروں کے قید ہوجانے سے انھیں یہ خوش آئند موقع مل گیا کہ وہ سیاسی منظر پر چھاجائیں اور سرکاری حلقوں میں کانگریس سے جو برانگیختگی ہے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صوبوں میں اپنی پارٹی کو پوزیشن مستحکم کرلیں۔

جیل سے رہائی کے بعد کانگریس اور حکومت کے درمیان تعطل کو ختم کرنے میں ناکام ہوجانے پر گاندھی نے جناح سے باہمی رضامندی کی کوشش شروع کی۔ مہاتما دوقومی نظریے کے قائل نہیں تھے لیکن وہ اس نفسیات کے تسلیم کرنے کو تیار تھے جس سے مسلم دانشور اس نظریے کے طرف دار بن گئے تھے جس نبیاد پر انھوں نے جناح سے گفتگو سے مصالحت کرنا چاہی وہ ''راجا جی کا فارمولا'' تھا یہ فارمولا راج گوپالا چاری نے تیار کیا تھا وہ سابق وزیر اعلا مدراس اور کانگریس کے بے حد درّاک ذہن رکھنے والوں میں تھے۔ راج گوپالا چاری کی تجویز یہ تھی کہ اگر مسلم لیگ کانگریس کا قومی آزادی کا مطالبہ مان لے اور دوران جنگ میں ایک عارضی حکومت کے قیام پر

رضا مند ہوجائے تو کانگریس اس پر رضا مند ہوجائے گی کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلم اکثریت کے تمام ملحق اضلاع کی حد بندی کردی جائے اوران علاقوں کے تمام بالغ باشندوں کی رائے شماری کی بنیاد پر یہ طے کیا جائے کہ وہ آزادمتحدہ ہندوستان میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا علاحدہ ریاستوں کی حیثیت سے۔اوراگر آخر کار علاحدگی کی ہی تائید کی جاتی ہےتو دونوں ریاستیں دفاع، رسل ورسائل اور دوسرے لازمی امور کے بارے میں باہمی معاہدوں کے لیےکوئی شکل نکال لیں گی۔

راجا جی فارمولا ایک جرأت مندانہ اقدام تھا اور ایک اہم کانگریسی کی طرف سے پاکستان کا تصور پہلی بار تسلیم کیا گیا تھا۔ پاکستان کے تصور کوٹھوس لفظی پیکر دینے کی یہ سب سے پہلی سنجیدہ کوشش تھی،لیکن جناح نے اسے سرسری طور سے ناقابل اعتنا قرار دے دیا۔راج گوپالا چاری کی تجویز رد ہوجانے کے باوجود گاندھی نے جناح سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ 17رجولائی 1944 کوگاندھی نے ''برادرعزیز جناح'' کوخط لکھتے ہوئے یہ التجا کی کہ ''مجھے اسلام یا ہندی مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھئے۔ میں ہمیشہ آپ کااور ساری انسانیت کا خادم رہا ہوں۔ مجھے مایوس نہ کیجئے۔''

گاندھی، جناح گفتگو 9رستمبر 1944 کوشروع ہوئی اور 27 ستمبرکوختم ہوئی اس وقت اس گفتگو سے جوآس بندھ گئی تھی اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ دونوں لیڈروں کے مابین سمجھوتے کے واقعی امکانات تھے بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہورہا تھا کہ عوام سیاسی تعطل سے عاجز آچکے ہیں اور لیگ اور کانگریس کے مابین معاہدے کی خواہش عام ہے جب گاندھی پہلی ملاقات کرکے واپس آئے تو ان سے سوال کیا گیا کہ وہ جناح کے پاس سے کیا لائے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ''صرف پھول'' بعد کی ملاقاتوں سے بھی کوئی خاص قابل ذکر فائدے حاصل نہیں ہوئے۔سب سے پہلے تو جناح نے گاندھی کے حق نمائندگی کے بارے میں سوال اٹھایا۔ یہ سچ ہے کہ 1934 سے مہاتما کانگریس کے ممبر نہیں رہ گئے تھے،لیکن جناح کو یہ معلوم تھا کہ کانگریسی حلقۂ مشاورت میں گاندھی کی اہمیت رکنیت کے کارڈ یا کسی عہدے پر منحصر نہیں تھی۔مسلم لیگ لیڈر کا نقطۂ نگاہ اصول پرورانہ تھا۔وہ چاہتے تھے کہ گاندھی یہ تسلیم کرلیں کہ صرف مسلم لیگ کوتمام مسلمانان ہند

کی طرف سے بولنے کا اختیار تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے پاکستان کا نظریہ تسلیم کرلیا جائے۔ پھر وہ اس کے جغرافیائی حدود بتائیں یا اس کے تفصیلات پر گفتگو کریں گے۔ وہ یہ سننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کی رائے شماری میں وہ غیر مسلم بھی حصہ لے سکیں گے جن کی قسمتوں کا فیصلہ اس رائے شماری کے ذریعے ہونے والا تھا۔ ان علاقوں میں حق خود ارادیت صرف مسلمان ہی استعمال کر سکتے تھے۔

گاندھی نے یہ تجویز رکھی کہ حدود اربعہ کی نشان دہی اور رائے شماری کے اصول پہلے سے طے کر لیے جائیں اور واقعی تقسیم ضرورت پڑنے پر برطانیہ سے ہندوستان کے ہاتھوں میں اقتدار منتقل ہونے کے بعد ہو نہ کہ پہلے۔ انھیں امید تھی کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد، آزادی کی صحت مند فضا میں فرقے آپس میں تال میل قائم کرنا سیکھ جائیں گے اور ملک کو تقسیم کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔ گاندھی کی امید جناح کا خوف تھا۔ مسلم لیگ کوئی بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھی اور اس لیے اس نے تقسیم کو ہندوستان کی آزادی کی شرط اوّلین قرار دیا۔ جناح نے دونوں ریاستوں کے مابین دفاع، رسل ورسائل اور امور خارجہ سے متعلق صلح نامے کے انتظام کو بھی اس بنا پر مسترد کر دیا کہ اس سے دونوں ریاستوں کا اقتدار اعلا متاثر ہوگا۔ گاندھی کے لیے دو ریاستوں کا مذہبی علائق کی بنیادوں پر بنایا جانا اس لیے پریشان کن تھا کہ ''اس طرح دشمنی کے سوا ان میں کچھ بھی مشترک نہ رہے گا۔ کلچرل اور اقتصادی خودمختاری کی تلاش فطری تھی لیکن کچھ تحفظات اس لیے ضروری تھے کہ دونوں ملکوں کے درمیان فوجی مسابقت نہ شروع ہو جائے اور کہیں مسلح ٹکراؤ ہی نہ ہو جائے۔

اگر ایک طرف یہ مذاکرات گاندھی کے لیے ایک نئے سبق کی حیثیت رکھتے تھے۔ تو دوسری طرف جناح کی سیاسی طاقت میں اس سے اضافہ ہوا۔ یہ بات کہ گاندھی کو دروازہ کھٹکھٹانا پڑا، موخرالذکر کی عزت میں اضافے کا سبب بنی۔ چار برس تک مسلم لیگ کے قائد نے اس جگہ سے سر مو جنبش نہیں کی تھی جو انھوں نے مارچ 1940 میں اپنائی تھی۔ واقعات نے ثابت کر دیا کہ بات پر اڑے رہنے سے واقعی فائدے حاصل ہوئے۔ ''راجا جی فارمولا میں ہی ابتدا میں گفتگوئے مصالحت کی بنیاد بنا تھا اور اس میں وہ سب باتیں نہیں مانی گئی تھیں جن کا جناح نے مطالبہ کیا

تھا لیکن ان میں کم از کم ملک کی تقسیم کا امکان تو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یہ بات کہ مہاتما جو تقسیم ہند کو پہلے گناہ کہہ چکے تھے اب اس حد تک تو نرم پڑ چکے تھے کہ وہ حق خود ارادیت کے لیے استعمال ہونے والی مشینری کے بارے میں بات چیت کرنے لگے اور یہ بات جناح کی دستار میں ایک طرہ بنی۔ حصول پاکستان کے لیے طویل المدت حکمت عملی کے پس منظر میں گاندھی، جناح۔ مذاکرات ایک سنگ میل بن گئے اور لارڈ لن لتھ گو نے اگست 1940 میں اور کرپس مشن نے 1942 میں جو پیش کش کی تھی اس سے بھی آگے پیش رفت ہوئی۔

سیاسی تعطل کے توڑنے کی جو دو اور کوششیں اس کے بعد ہوئیں ان میں بھی دل چسپی خاص کر اس بنا پر ہے کہ وہ جناح کی حکومت عملی میں کس طرح معین ہوئیں 1945 میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی اور مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر نواب زادہ لیاقت علی خاں نے عارضی قومی حکومت کے قیام کی تجویز پر گفتگو کی۔ اس حکومت میں کانگریس اور مسلم لیگ کو برابر کا حصہ دار بننا تھا۔ بھولا بھائی ڈیسائی اس پر برہم ہو گئے کہ لیاقت علی خاں نے بعد میں اس سے انکار ہی کر دیا کہ ان کے درمیان کوئی بات طے پائی ہے۔ بہر حال کانگریس اور لیگ کی برابری کا تصور سیاسی مذاکرت میں دخیل ہو گیا اور لارڈ ویول نے شملہ میں جو کانفرنس جون۔ جولائی 1945 میں بلائی اس میں یہ تصور گویا سرکاری طور سے بھی تسلیم کیا جانے والا تھا۔ لارڈ ویول حال ہی میں انگلستان سے ایک تجویز کے لیے برطانوی کابینہ کی تائید حاصل کر لائے تھے۔ تجویز یہ تھی کہ ہندوستانی لیڈروں کے مشورے سے وائسرائے کی ایگزیکیوٹیو کی تنظیم جدید کی جائے۔ وائسرائے کی تجویز پر غور کرنے کے لیے کانگریسی لیڈروں (جو حال ہی میں جیل سے چھوٹے تھے) اور مسٹر جناح کی قیادت میں مسلم لیگ لیڈروں کی ایک کانفرنس شملہ میں منعقد ہوئی۔ گاندھی اس کانگریس کے مندوب نہیں تھے لیکن وائسرائے اور کانگریس کمیٹی دونوں نے ان سے مشورے کیے۔ لارڈ ویول کی تجویز یہ تھی کہ مسلمان اور ''اونچی ذات کے ہندوؤں'' کی ایگزیکیوٹیو کاؤنسل میں مساوی نمائندگی ہو لیکن کانفرنس ختم ہوتے ہوئے جناح مسلمانوں اور بقیہ تمام قومیتوں کے درمیانی مساوی نمائندگی مانگنے لگے۔ کانفرنس دراصل جناح کے اس اصرار پر منتشر ہو گئی کہ وائسرائے کی ایگزیکیوٹیو کاؤنسل میں مسلم نمائندے نامزد کرنے کا حق صرف مسلم

لیگ کو حاصل ہو۔ یہ ایسی بات تھی جو کانگریس اپنے قومی نقطۂ نگاہ اور تشکیل کو رد کیے بغیر قبول ہی نہیں کرسکتی تھی۔ اس سے لامحالہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس موقع پر جناح کو مصالحت میں دل چسپی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اس موقع پر مفاہمت مناسب تصور نہیں کرتے تھے۔ بہرصورت چوں کہ انھیں یہ امید تھی کہ حکومت سے بہتر شرائط پر مفاہمت ہوگی، اس لیے انھیں کانگریس سے سمجھوتہ کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔

جوں جوں لڑائی کا خاتمہ قریب آنے لگا۔ ہندوستان میں نئے اقدام کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ شملہ کانفرنس اسی ضرورت کے تسلیم کرنے کا نتیجہ تھی۔ یورپ میں جنگ مئی میں ختم ہوئی اور اگست میں جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔ برطانیہ میں جنگ کے بعد جو پہلا انتخاب ہوا اس میں لیبر پارٹی برسراقتدار آگئی۔ ہند کے لیے نئے سکریٹری آف اسٹیٹ (وزیر ہند) لارڈ پے تھک لارسن نے ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان مساوی شراکت داری کی بات کہی۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی اور صوبائی مجالس قانون ساز علی الترتیب 1934 اور 1937 سے انتخاب کی بغیر ہی چل رہی تھیں اور وائسرائے اس کا پہلے ہی سے اعلان کر چکے تھے کہ جتنی جلد ممکن ہوگا انتخاب کرائیں گے۔ ستمبر 1945 میں لندن کے سفر سے واپسی پر وائسرائے نے یہ اعلان کیا کہ کرپس پیش کش کے جذبے کے تحت حکومت آئین ساز جماعت کی تشکیل کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس اعلان کا کسی خاص گرمجوشی سے استقبال نہیں کیا گیا۔ لیبر حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان کے حالات کا جائزہ لینے ایک کل جماعتی برطانوی پارلیمانی وفد بھیجا جائے اور لوگوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ حکومت خود اختیاری اب ان کی دسترس میں ہے۔

باب 50

آزادی کی آمد

جب جنوری 1946 میں گاندھی آزمودہ کار لبرل لیڈر سری نواس شاستری کو دیکھنے گئے تو بات چیت برٹش پارلیمانی وفد کے گرد گردش کرتی رہی۔ یہ وفد اس وقت ہندوستان کا دورہ کر رہا تھا شاستری بستر مرگ پر تھے۔ انھوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم یہ جانتے ہیں کہ اس وفد کا بھی کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے۔ لیبر ہو یا کنزرویٹو (قدامت پسند) ہندوستان کے معاملے میں یہ سب ایک ہیں اور یکساں ہیں۔'' یہ رنج آمیز فیصلہ اس وقت کا ہے جب اقتدار جلد ہی منتقل ہونے والا تھا اور ایک ایسے شخص کا ہے جسے ہمیشہ برطانوی تعلقات کا دوست شمار کیا جاتا تھا۔ اس لیے اس کی اہمیت ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی راج کے نمائندوں نے ہندوستان سے جلد رخصت ہونے کی کسی کو بھنک بھی نہیں لگنے دی تھی۔

سطحی طور سے دیکھنے میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے وقت، ہندوستان میں برطانیہ کی پوزیشن اتنی مضبوط تھی کہ اس سے زیادہ مضبوطی ممکن نہیں تھی۔ ہندوستان کی سرزمین پر اس سے زیادہ برطانوی فوجی کبھی نہیں رہے۔ کانگریس کی جماعت خلاف قانون قرار دی جا چکی تھی اور گاندھی کو چھوڑ کر تقریباً سبھی قومی لیڈر جیل میں تھے۔ مسلم لیگ پاکستان کے حصول کی تحریک چلا رہی تھی لیکن اس کا ہدف کانگریس تھی حکومت برطانیہ نہیں چھ صوبوں میں آئینی حکومتیں معطل پڑی

تھیں، باقی پانچ صوبوں کی حکومتیں حکومت وقت سے کم وبیش دوستانہ تعلقات رکھے ہوئے تھیں۔ 1942 میں جو متشددانہ اقدامات کیے تھے اس کی بدولت ان برطانوی افسران کو ذرا سکون مل گیا تھا جو چھ برس سے لگاتار کام میں جٹے ہوئے تھے۔ سول افسران محنتی لوگ تھے جو اپنی ذہنی روشنی کے مطابق اپنا فرض ادا کرتے رہتے تھے لیکن گوکھلے کے الفاظ میں ''ان کی روشنیاں مدھم پڑ چکی ہیں اور کارگزاری کے لحاظ سے بھی، مجھے یقین ہے کہ موجودہ نظام میں ایک خاص حد سے زیادہ کارگزاری دکھائی بھی نہیں جاسکتی اور وہ معیار کی اس آخری حد تک پہنچ بھی چکے ہیں۔ یہ بات گوکھلے نے 1905 میں کہی تھی۔ بعد کے چالیس برسوں میں قومی بیداری اور اقتصادی تبدیلیوں کی قوت محرکہ نے ان حامیوں میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ 1945 میں ان ضابطہ پرست سول افسروں کو یہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ پرانا نظام جس سے وہ خوب واقف تھے، جو انھوں نے ہی بنایا تھا اور جس سے وہ محبت کرتے تھے وہ بڑی حد تک اور غالباً غیر مرئی طور پر مجروح ہو چکا تھا۔

(پرانے نظام میں) کٹاؤ کے اس عمل کو جنگ نے اور تیز کر دیا تھا اس کی وجہ سے چند لوگوں کو بے محنت پیسے مل گئے تھے لیکن لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہنوں میں یہ چڑھی ہوئی قیمتوں اور اشیا کی کمی سے وابستہ ہو کر رہ گیا تھا۔ بنگال کو ایک خوفناک قحط نے تباہ کر کے رکھ دیا تھا اور قحط میں انسان اور فطرت دونوں نے مل کے سازش کی تھی۔ نہ تو لوگ جانتے تھے اور نہ انھیں یہ جاننے کی پروا تھی کہ اس المیہ میں کہاں تک وزارتی بے توجہی اور بنگال کی رشوت ستانی کا ہاتھ تھا اور کہاں تک آئینی معقولیت یا بے عملی کا جس نے مرکزی حکومت کو بروقت مداخلت سے باز رکھا۔ غذا اور کپڑے کی کمی نے تقریباً سارے ملک میں وبائی شکل اختیار کر لی تھی اور اشیا پر کنٹرول اور راشن کی جو کوششیں کی گئی تھیں اس کے جلو میں رشوت ستانی کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ جنگ نے اخلاقی معیار گرا دیے تھے اس سے بہت سے دلوں میں یہ خواہش جاگ اٹھی تھی کہ ابھی تو زمانہ جنگ کی خوشحالی کی وقتی دھوپ نکلی ہے یہی موقع ہے کہ اپنے کھلیانوں کا غلا خوب سکھا لیں یا یوں کہیے کہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیں۔

بہر حال جنگ سے امن کا عبوری دور لامحالہ سست رفتار اور تکلیف دہ ثابت ہونے والا تھا۔ فوج ایک لاکھ اسی ہزار سے بڑھ کر بائیس لاکھ پچاس ہزار تک پہنچ چکی تھی اس کو خدمت سے سبکدوش کرنا زبردست کام تھا۔ اب ہندوستانی فوجی وہ ناتجربہ کار کسان نہیں رہ گیا تھا جسے بھرتی کا

افسر دیہات سے چن کے اٹھالایا تھا۔ اب وہ ملایا، برما، مشرق وسطیٰ اور اطالیہ کے محاذوں پر لڑائیاں لڑ چکا تھا اس نے سلطنتوں کو بگڑتے دیکھ لیا تھا اور اب وہ ٹیڑھے مڑھے سوال پوچھنے لگا تھا۔ جنگ نے جو دباؤ اور پریشانی کی صورتیں پیدا کر رکھی تھیں۔ اس سے حکومت بالکل ہی آنکھیں بند کیے ہوئے نہیں تھی۔ مرکزی اور صوبائی دفاتر میں کی بعد جنگ کے منصوبے بنائے جا چکے تھے لیکن ان منصوبوں سے ایک طرح کی عدم واقفیت کی بو آتی تھی۔ سول عمال اراضیات کے قوانین اور تعزیرات ہند کی اسرار و رموز سے تو خوب واقف تھے لیکن وہ ان پر حوصلہ خاکوں کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جو سیاست کا حال تھا وہی اقتصادیات کا بھی تھا سرکار اصل اصول یہ تھا کہ ہندوستان میں تیز رفتار تبدیلیاں نہ تو ممکن ہیں نہ مناسب اور بہر حال ان تبدیلیوں کا صرف یہی اثر نہیں ہوگا کہ اور ٹیکس بڑھیں بلکہ ان کی ضرب انھیں طبقوں کی پوزیشن پر پڑتی تھی جو برطانوی حکومت کے وفادار رہے تھے۔ یعنی رجواڑے زمیندار اور امیر صنعت کار۔

یہاں یہ ذکر بہر حال ضروری ہے کہ چاہے جتنی بھی دشواریاں رہی ہوں، ہندوستان میں بیشتر برطانوی افسروں کا اعتماد نفس اب بھی کافی بلند تھا۔ اور ان کا یہ عقیدہ ختم نہیں ہوا تھا کہ وہ ہندوستان پر برسوں حکومت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر جنگ کے خاتمے کے ایک ہی سال کے اندر ہندوستان کی آزادی کی جانب لمبے لمبے قدم اٹھا لینے کا سبب یہ نہ تھا کہ ''راج'' کے نمائندوں میں کوئی کمزوری آ گئی تھی بلکہ برطانیہ میں سیاسی فضا بدل چکی تھی۔ اور اٹلی کی حکومت یہ طے کر چکی تھی کہ وہ ہندوستانی قوم پرستی سے مصالحت کر لے گی۔

برطانوی مورخین کا رجحان یہ ہے کہ 1947 کے واقعات کو اُن کی پالیسی کے اس خاکے کا منطقی نقطۂ اختتام قرار دیں جو اگست 1917 کے اعلان میں بتایا گیا تھا۔ لارڈ چیمسفورڈ نے وائسرائے ہند کی حیثیت سے اس اعلان کے حق میں گفتگو کرتے وقت یہ اشارہ کیا تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی واضح طور سے ہو جانا چاہیے کہ یہ دور کی منزل ہے'' اس موقع پر گوکھلے سے ان کی بات چیت پر بھی مورلے کے تبصرے کی یاد آتی ہے: ''انھوں نے اپنی آخری امید اور حکومت عملی کو بالکل چھپایا نہیں۔ ہندوستان خود مختار نو آبادی کے درجے پر رہے گا۔ میں نے بھی اپنے اس یقین کو بالکل نہیں چھپایا کہ ابھی بہت دنوں تک ہماری زندگی میں جو تھوڑے دن باقی رہ گئے ہیں

اس کے کافی بعد تک یہ صرف ایک خواب رہے گا۔ ''لائڈ جارج اور مانٹے گو، میک ڈائلڈ اور بن، بالڈون اور ہور، چرچل اور ایمرے، سبھی کا ہندوستان کی آزادی کے بارے میں یہی فیصلہ معلوم ہوتا ہے کہ ''میری زندگی میں نہیں۔'' برطانیہ عظمیٰ پارلیمانی حکومت تک پہنچنے کے لیے آویزش وارتقا کی جن منزلوں سے گزرا تھا اس سے بھی برطانوی سیاست داں آگاہ تھے اور کناڈ اور آسٹریلیا کو سیاسی بلوغ تک پہنچنے میں جو وقت صرف ہوا اس سے بھی یہ بات انھیں بدیہی معلوم ہوتی تھی کہ ایک مشرقی ملک میں جہاں اتنے مذاہب اور کلچر ہوں اس عمل میں اور زیادہ دیر لگنا ہی چاہیے۔

1917 سے مختلف برطانوی حکومتوں کی ہندوستان کے بارے میں متواتر یہی پالیسی رہی کہ ''خود اختیاری حکومت درجہ بدرجہ'' ملے۔ پیش رفت کے اس طریقے میں خرابی یہ تھی کہ ہر قسط ملتے ملتے خارج از میعاد ہو جاتی تھی۔ 1919 کی اصلاحات سے ممکن ہے کہ سیاسی ہندوستان 1909 میں مطمئن ہو جاتا 1935 کے اصلاحات کا 1919 میں گرمجوشی سے استقبال ہوتا اور اگر 1940 میں کرپس مشن کی پیش کش کے مماثل کوئی چیز ملتی تو ہند، برطانوی تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا اور حکومت اور کانگریس کے مابین اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مغائرت بڑھنے کا جو سلسلہ چل پڑا تھا وہ شاید تھم جاتا۔

اس درجہ بدرجہ پیش قدمی پر 1920 میں گاندھی نے ایک مہلک ضرب لگائی تھی۔ ''ایک سال کے اندر سوراج'' کا ایک وعدہ جھوٹ موٹ نہیں کیا گیا تھا کیوں کہ ان کے خیال میں غلامی ایک ذہنی کیفیت تھی جس وقت کوئی قوم آزاد ہونے کا فیصلہ کر لیتی ہے اسیوقت سے وہ آزاد ہونے بھی لگتی ہے۔ ان کی غیر متشددانہ مقاومت کی تکنیک، یعنی ستیہ گرہ سے برطانیہ کے لیے ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اگر وہ اس سے صرف نظر کرتے تو اس میں تیز رفتاری آتی۔ اگر وہ حملہ کر دیتے تو اس سے ہند اور بیرون ہند ہر جگہ ہمدردی پیدا ہو جاتی ظلم وتعدی آخر کار صرف بے اثر ہی نہیں ہوتے بلکہ یہ انگلستان کے جمہوری ضمیر کے لیے بے حد ناپسندیدہ بھی ہوتے۔ برطانوی عوام ہندوستان کے معاملات میں بس کبھی کبھی دلچسپی لے لیا کرتے تھے۔ لیکن انھیں اپنی فراخ دلی کی روایات پر اتنا ناز تھا کہ وہ اس پر آمادہ نہ ہوتے کہ چالیس کروڑ انسانوں پر ان کی مرضی کے خلاف حکومت لادی جائے۔ چوں کہ یکے بعد دیگرے ہر ستیہ گرہی تحریک سے ہندوستان میں قوم پر

وروں کی قوت مخالفت واضح ہوتی چلی گئی، سرکاری بہانہ جویوں کی یہ بات کمزور پڑتی گئی کہ صرف ناراض لوگوں کی اقلیت راج کے خلاف ہے۔

دوسری عالمی جنگ ہی سے ہندوستان کے بارے میں برطانوی عوام کی رائے میں پختگی آئی۔ جنگ نے دنیا کا نقشہ اور طاقتوں کا توازن تو بدل ہی دیا اس نے انسانوں کے ذہن بھی بدل دیے بالاخر وہ دانش ورانہ سماجی ہیجان، جس کا اظہار 1945 میں لیبر پارٹی کی کامیابی کی صورت میں ہوا۔ روایتی پالیسیوں کی خوبیوں کے ازسرنو تجزیے کا باعث بنا۔ نظریاتی اعتبار سے لیبر پارٹی کی حکومت ایک نئی پالیسی کے لیے تیار تھی لیکن ہندوستانی صورت حال کے حقائق نے بھی اِسے اُسی سمت قدم بڑھانے پر مجبور کیا۔ نومبر، دسمبر 1945 میں ہندوستان میں جو حالات تھے ان پر 6/مارچ کو ایوان عام میں تقریر کرتے ہوئے لیبر کابینہ کے ایک رکن مسٹر الگز انڈر نے (جو انتقالِ اقتدار کے عمل سے قریبی تعلق رکھتے تھے) یہ رائے ظاہر کی کہ ''یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی حکام سچ مچ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جنگ کے بعد جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس کے نتیجے میں کسی وقت بھی انقلاب پھوٹ پڑنے کا امکان تھا۔''

1946 کے ابتدائی مہینوں نے اس اندازے کی صحت کی تصدیق کردی۔ عوامی مزاج کی جھنجھلاہٹ کا یہ عالم تھا کہ ذرا ذرا سے اشتعال پر اور بعض اوقات کیس اشتعال کے بغیر تشدد پھوٹ پڑتا تھا۔ فروری 1946ء میں انڈین نیشنل آرمی (آئی۔ان۔اے) کے ایک مسلمان افسر کے خلاف کورٹ مارشل کے فیصلے پر کلکتہ میں مسلمانوں نے مظاہرہ کیا جو عام لاقانونیت میں تبدیل ہوگیا۔ دکانیں لوٹ لی گئیں اور بسیں اور ٹریم کاریں جلادی گئیں۔ فضائیہ میں ڈسپلن شکنی کے واقعات ہوئے اور بمبئی میں ایک بڑی بحری شورش ہوئی۔ کئی صوبوں میں پولیس کی صفوں میں بے اطمینانی پھیل جانے کے آثار نظر آنے لگے۔ امن وقانون کے وہ اوزار، جن پر دراصل برطانوی حکومت کا دارومدار تھا وہ بودا سہارا ثابت ہونے لگے۔

اقتدار کی عزت اس طرح ختم ہونے کی صورت میں ضرورت اس بات کی تھی کہ نظم ونسق کو فوری طور سے مضبوط کیا جائے لیکن برطانوی نقطۂ نظر سے، جنگ کی وجہ سے ''اعلا افسروں'' کے اہلیتی خصوصیات میں کمی آ گئی تھی۔ حکومت کے کاموں میں بے انتہا اضافہ ہوگیا تھا لیکن دوران جنگ انڈین

سول سروس (آئی۔سی۔ایس) اور انڈین پولیس سروس (آئی پی ایس) میں بھرتی التوا میں ڈال دی گئی تھی۔ یہی نہیں کہ اب کلیدی جگہوں پر کام کرنے کے لیے پہلے سے کہیں کم یورپین افسران رہ گئے تھے بلکہ سینئر افسروں کے ریٹائر ہو جانے کے بعد ان کی صفیں اور بھی سکڑ جانے والی تھیں۔

یہ تو ہونا ہی تھا کہ انگریز وزرا جو تو جیہیں کریں گے ان میں نظم و نسق کی خرابی کا ذکر نمایاں طور پر ہوگا۔ لیکن اس پہلو پر زور دینے کا سبب اُن کی ایک تجربی فطرت ثانیہ ہے۔ وہ عادتاً نظریاتی سے زیادہ، مسئلے کے عملی حل کے لیے پہلو پر زیادہ توجہ دینے پر مجبور ہیں۔ لیکن اگر اسے صرف سیاسی ضرورت کا اعتراف سمجھ لیا جائے تو برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کو اقتدار منتقل کرنا تاریخ عالم کا امتیازی واقعہ نہ ہوگا۔ اسے صرف حالات کی مجبوری بھی نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ وزیر اعظم اٹلی نے جو پالیسی چلائی تھی اور جو 47-1946 میں اختتام کو پہنچی اس میں عینیت پسندی کا ایک عنصر بھی شامل ہو گیا تھا اور برطانوی حکومت جس حد تک اس عینیت پسندی اور اس خواہش سے متاثر ہوئی کہ ہند، برطانوی تعلقات میں ایک نیا باٹ کھلے، اس حد تک یہ گاندھی کی فتح تھی، کیوں کہ تقریباً تیس برس سے وہ یہ تبلیغ کرتے چلے آرہے تھے کہ دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات میں قلب ماہیت ہو۔ اس قلب ماہیت کے مبلغین میں کئی انگریز مرد اور عورتیں، ہیوم اور وڈر برن، سی ایف، اینڈ ریوز اور ہورلیس الگزینڈر، برملیفورڈ اور براک دے لاسکی اور کارل ہیتھ، ماریل لسٹر اور اگیتھا ہیریسن بھی شامل ہو گئے تھے۔ ہندوستانی موقوف کے بارے میں ان کی ہمدردی میں کبھی کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ اپنے زمانے میں تو یہ لوگ ایک مختصر سی اقلیت تھے جو بہت زیادہ ذی اثر نہیں تھی لیکن جب وقت آ پہنچا تو اِن کی رائیں ان کے ملک کی قومی پالیسیاں بن گئیں۔

برطانوی پالیسی میں تبدیلی کا جو بھی سبب رہا ہو، لیکن مارچ 1946 میں کابینی مشن کی آمد سے ہندوستان کو بڑی حد تک یہ باور ہو گیا کہ برطانوی حکومت واقعی کچھ کرنا چاہتی ہے۔ مشن کے تین کابینی وزیروں میں سر پیتھک لارنس اور سر اسٹے فورڈ کرپس سے گاندھی اچھی طرح واقف تھے۔ اپنے دوران قیام میں مشن ان سے رسمی طور سے بھی اور غیر رسمی طور سے بھی اکثر مشورت کرتا رہا۔ مشن نے 472 ''لیڈروں'' سے ملاقاتیں بھی کیں اگرچہ یہ بات شروع ہی سے واضح تھی کہ صرف کانگریس اور مسلم لیگ ہی وہ پارٹیاں تھیں جو اہمیت رکھتی تھیں اور بنیادی سوال یہی تھا کہ

ہندوستان متحد رہے گا یا تقسیم کر دیا جائے گا۔ کانگریس ملک کی تقسیم کے خلاف تھی لیکن ثقافتی، اقتصادی اور علاقائی خود مختاری دینے کے معاملے میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھی۔ شملہ میں کانفرنس ہوئی لیکن وہ کانگریس، لیگ اختلافات کے ختم کرنے میں ناکام رہی۔ اس مرحلے پر کابینی مشن نے 16 رمئی کے بیان میں ایک مصالحتی پلان پیش کیا۔ انھوں نے ہندوستان کے ایک تین زینوں کے آئینی ڈھانچے کا نقشہ مرتب کیا۔ سب سے اوپر انڈین یونین تھی جس میں برطانوی اور ہندوستانی ریاستیں دونوں ہی کو شامل ہونا تھا لیکن اس زینے پر صرف امور خارجہ، دفاع اور رسل ورسائل سے متعلق کام ہوگا۔ سب سے نچلے زینے پر صوبے اور ریاستیں ہوتیں جن کو باقی تمام اختیارات حاصل ہوتے۔ بیچ کے زینے پر (اگر صوبے چاہتے) صوبوں کے گروپ بنا لیے جاتے جو بعض مشترک موضوعات سے متعلق کام کرتے۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ آئین ساز اسمبلی (جس میں صوبائی اور ریاستی نمائندے شامل ہوں گے) ابتدائی اجلاس کے بعد تین حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ حصہ الف میں مدراس، بمبئی، یوپی (صوبہ جات متحدہ) بہار اور اڑیسہ شامل ہوں گے، حصہ ب میں پنجاب، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ اور حصہ ج میں بنگال اور آسام ہر حصے کو یہ طے کرنا تھا کہ اس میں جو صوبے شامل ہیں وہ مل کر گروپ بنائیں گے یا نہیں اور اگر بنائیں تو وہ کون کون سے موضوعات ہوں گے جو گروپ کے انتظامیہ یا مقنّنہ کے دائرۂ اختیار میں آئیں گے۔

کابینی مشن کی تجاویز کے بارے میں گاندھی کا پہلا ردِّعمل امید افزا تھا۔ انھوں نے 26 رمئی 1946 کے ''ہری جن'' میں لکھا کہ ''چار دن کی اچھی اور گہری جانچ پرکھ کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ موجودہ صورت حال میں حکومت برطانیہ جو بہتر سے بہتر دستاویزیں پیش کر سکتی تھی وہ یہی ہے۔'' بہر حال اس اسکیم کے کچھ پہلو ایسے بھی تھے جو ان کی نظر میں کھٹکتے تھے۔ (چوں کہ، تاج، کا اقتدار اعلا ختم ہو جانے والا تھا؟ اس لیے) 562 ریاستوں سے الگ معاملت کرنے کی دشواریاں کافی واضح تھیں۔ لیکن صوبوں کو گروپوں میں تقسیم کرنے سے متعلق جو دفعہ رکھی گئی تھی۔ وہ ان کو ناپسند تھی۔ یہ دفعہ کابینی مشن کے پلان میں مسلم لیگ کی رعایت سے رکھی گئی تھی۔ مرکزی حکومت کے اختیارات کو گھٹا کر تین بہت چھوٹے موضوعات[1] تک محدود کر دینا اور تمام بقیہ

(1) کسی موضوع یا مسائل سے متعلق اختیارات، مثلاً امور خارجہ سے متعلق تمام اختیارات کو ایک موضوع سمجھا جائے گا۔

اختیارات کا صوبوں کو تفویض کر دیا جانا، مستقبل کے یونین آف انڈیا کو کمزور کر دینا تھا۔ درمیانی زینوں کی حیثیت سے گروپوں کا قیام ایک اور انتشار افزا عنصر تھا لیکن اگر اس سے ملک کے اتحاد کی ضمانت ہوسکتی ہو تو یہ قیمت بھی ادا کر دینے کے قابل تھی۔ بدقسمتی سے مسلم لیگ نے کابینی مشن کے پلان کو تسلیم کرتے وقت اپنی اس امید کو پردۂ راز میں نہیں رکھا کہ وہ اسے پاکستان کا متبادل نہیں بلکہ پاکستان کی جانب بڑھتا ہوا قدم سمجھتی ہے۔

کابینی مشن کی روانگی کے بعد، بدلتی ہوئی اور کسی قدر الجھی ہوئی سیاسی صورت حال کو سمجھنے کے لیے انتقال اختیارات سے ذرا پہلے برطانوی اور دو بڑی سیاسی پارٹیوں کے طرز فکر کا خلاصہ بیان کر دینا مفید ہوگا۔ مسٹر اٹیلی کو یہ فکر تھی کہ انھوں نے جرأت مندی سے جو پیش قدمی کی تھی اس کو متحرک رکھیں۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ انتقال اختیارات نہ صرف یہ کہ جلد ہو بلکہ سہولت سے انجام پا جائے۔ برطانوی حکومت کے نقطۂ نگاہ سے ہندوستان کا آئینی مسئلہ ایک سیاسی مسئلہ تھا جو مصالحت سے اور لین دین کے جذبے سے حل ہوسکتا تھا۔ اس لیے وہ کسی خاص حل سے بندھے ہوئے نہیں تھے وہ ہر اس قابل عمل انتظام کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے جسے کانگریس اور لیگ دونوں ہی تسلیم کر لیں۔

گاندھی کا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ ان کے نزدیک انتقال اختیارات، مصلحت اندیشی یا قوت کی سیاست کا سوال نہیں تھا بلکہ ایسا مسئلہ تھا جس میں صرف منصفانہ اور اخلاقی حل کی گنجائش تھی اور جو اسی کا طالب تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اکثریتیں کافی آگے بڑھ کر اقلیتوں کی تشویشوں کو دور کریں لیکن وہ دباؤ میں آ کر اُس تقسیم کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے جو آگے چل کر ہندوستان کو اور خود دونوں فرقوں کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچاتی۔ برطانوی حکومت کی اس قابل فہم الجھن سے کہ وہ جناح کی ہمدردیاں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی، گاندھی ذہنی طور سے پریشانی میں پڑ گئے تھے۔ انھوں نے کانگریس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ کوئی ایسا انتظام جلد بازی میں قبول نہ کرے جس پر اطمینان سے سوچنے پر پچھتانا پڑے۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ کانگریسیوں کو ایک بار پھر سیر بیاباں کرنا ہوگی۔ کانگریسی قائدوں کو یہ مشورہ اچھا نہ لگا کیوں کہ وہ بھی (انگریزوں ہی کی طرح) صورت حال کو سیاسی ضرورتوں کے پیمانوں سے ناپنے کا رجحان رکھتے تھے انھیں یہ خطرہ تھا کہ اگر

دیر ہوئی یا گومگو کی حالت بنی رہی تو خانہ جنگی کی نوبت آسکتی ہے۔ کسی نہ کسی وجہ سے ان کی نظر میں خانہ جنگی کا خوف گاندھی سے زیادہ تھا۔ گاندھی کو یقین تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اگر چند دن خون خرابہ ہوا بھی تو اس کو دیکھ کر پارٹیاں سلامتی عقل وہوش کی راہ پھر اپنا لیں گی۔ لیکن چین اور اسپین کی حالیہ خانہ جنگیوں کی تاریخ سے اس جائیت کی تائید نہیں ہوتی تھی۔ لیبر حکومت کو بہر صورت اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ نہ تو پارلیمنٹ اور نہ برطانوی رائے عامہ کسی ایسے حل کی تصدیق کرے گی جس میں پُرامن انتقال اختیارات کی ضمانت نہ ہو۔

گاندھی کو یہ محسوس ہورہا تا کہ برطانوی حکومت کے اعلان کے باوجود ہندوستان میں بہت سے لوگ اس طرح سوچ رہے اور عمل کررہے تھے گویا انگریز واقعتاً جانے والے نہیں ہیں۔ کسی ایسے ہی ڈرامائی اقدام ہی سے (جیسے برطانوی فوجوں کی فوری واپسی یا ریاستوں میں ''تاج'' کی اقتدار اعلا سے دست برداری) مختلف سیاسی پارٹیوں کو جھٹکا لگ سکے گا اور تبھی وہ اُس بھول بھلیوں سے باہر نکل سکیں گے جس میں وہ مدتوں سے چکر کاٹ رہی ہیں۔ جیسے ہی یہ بات ان پر واضح ہوگئی کہ انگریزوں نے رخصت ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے، گاندھی کے ذہن کو بار بار یہ سوال پریشان کرنے لگا کہ صدیوں کی غلامی کے بعد ہندوستانی عوام پر آزادی کے جھٹکے کا کیا رَدِّعمل ہوگا۔ انھوں نے اپریل 1946 میں برطانوی اخبار نویس بریلس فورڈ کو بتایا کہ ''مجھے یقین ہے کہ اس بار برطانیہ واقعتاً دل سے کچھ چاہتے ہیں۔ لیکن یہ پیش کش اچانک سامنے آئی ہے۔ کیا ہندوستان کو ایک جھٹکے کے ساتھ آزادی دی جائے گی؟ میری حالت آج اس مسافر کی سی ہورہی ہے جو ایک طوفانی سمندر میں جہاز کے عرشے پر ایک ٹوکری میں بٹھا کر ہوا میں بلند کردیا گیا ہو اور جو اپنا پاؤں کہیں ٹکا نہ پارہا ہو۔''

اسٹیشنوں پر جو زبردست بھیڑ ان کے درشنوں کو آتی یا جہاں ان کی تقریر ہوتی، ان جلسوں میں انھیں سنتے جاتی۔ اس بھیڑ کو وہ بے تابی سے دیکھتے۔ ان میں سے کچھ تو نظم وضبط کے ساتھ رہتے تھے لیکن بقیہ لوگ بے نظمی کا مظاہرہ کرتے۔ وہ اس بے نظمی سے پریشان تھے۔ یہ کسی حد تک تو 1942 کا خمیازہ تھا اور کچھ بعد جنگ کی ناسازیوں کی علامت۔ انھوں نے فروری 1946 میں ''ہری جن'' کے ایک ایڈیٹوریل بعنوان ''نفرت کا دھارا کیسے موڑا جائے'' میں لکھا کہ ''فضا میں

نفرت پھیلی ہے اور ملک کے بے صبر عاق جہاں تک ہو سکے گا اس کا فائدہ اٹھائیں گے اور اگر ان سے ممکن ہوگا تو حصول آزادی کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے تشدد کا سہارا لیں گے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ بات کہیں بھی اور کسی وقت بھی غلط ہوگی...... اس کے نتیجے میں نفرت اور زیادہ ہوگی اور پھر طرفین سے جوابی نفرت اور انتقام کا بازار گرم ہو جائے گا...... اگر سچ پوچھیے اور سچ تو کہنا ہی پڑے گا۔ تو ہم نے عدم تشدد کے لیے بھی بے دلی سے کام کیا ہے بہت سے لوگ زبان سے تو اہنسا کا دم بھرتے رہے لیکن ان کے دلوں میں تشدد کا چور چھپا تھا۔''

گاندھی کی نظروں میں سب سے بڑا خطرہ نفرت اور تشدد کا تھا۔ ان کا اظہار برطانیہ بیزار جذبات کی صورت میں بھی ہو رہا تھا اور ان فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں بھی جو ایک بار پھر شہروں کی شکل بگاڑنے لگے تھے۔ فسادات کے لیے ہندو مسلمانوں کو اور مسلمان ہندوؤں کو ذمہ دار ٹھہراتے اور دونوں مل کر غنڈوں کو موردِ الزام قرار دیتے۔ گاندھی نے سوال کیا کہ ''یہ غنڈے کون ہیں؟'' اور خود جواب دیا ''اس مال کے بنانے والے ہم خود ہیں۔'' جب دانش ور زہر اگلتے ہیں اور جوش وخروش پیدا کرتے ہیں تو بدمعاشوں کو موقع مل جاتا ہے۔ انھوں نے صدی کی تیسری دہائی میں جو مشورہ دیا تھا اسے پھر دہرایا کہ ''امن بریگیڈ'' قائم کیے جائیں۔ ان میں ایسے لوگ شامل ہوں جنھوں نے اہنسا کی قسم کھائی ہو اور جو فسادیوں کو عقل اور سنجیدگی کی راہ دکھانی کے شریفانہ کام کے لیے جان تک کی بازی لگانے کو تیار ہوں۔ اس دوران میں وہ واحد امر جس کی ضرورت ہوگی یہ ہے کہ تقریر و تحریر میں ضبط سے کام لیا جائے تاکہ جو زبردست تبدیلیاں ہونے والی ہیں وہ پُرامن طریقے پر وجود میں آئیں۔

بدقسمتی سے وہی دلائل جو گاندھی اور کانگریس کو اس پر مجبور کر رہے تھے کہ سیاسی پارۂ حرارت کو نیچے لایا جائے، انھیں کی بنا پر جناح اور مسلم لیگ بالکل ہی دوسری سمت چل پڑے تھے۔ مؤخر الذکر کے لیے ''ابھی یا کبھی نہیں'' کا سوال تھا۔ کابینی مشن سے جو طویل مذاکرات ہوئے ان سے یہ بات عیاں تھی کہ صرف کانگریس ہی پاکستان کے خلاف نہیں تھی بلکہ لیبر حکومت بھی کوئی ایسا حل چاہتی تھی جس سے کانگریس اور لیگ دونوں کو ایک ہی آئین کے ڈھانچے کے اندر رکھا جا سکے۔ صرف خانہ جنگی یا خانہ جنگی کا خطرہ ہے گانگریس کے اعتراضات اور تقسیم کے متعلق

برطانوی حکومت کے شکوک کو کلیۃً مسترد کر سکتے تھے۔ کابینی مشن کا منصوبہ مصالحت کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس سے دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے قریب نہیں آئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کابینی مشن کے ممبروں کی انگلستان واپسی کے تین مہینوں کے اندر وہ سوال پھر اٹھ کھڑے ہوئے جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ کابینی مشن طے کر چکا ہے۔

وہ بنیادی سوال پر اختلافات بخار کی طرح بڑھ گئے۔ ایک سوال صوبوں کے گروپ بنانے کا تھا اور دوسرا عارضی حکومت کی تشکیل کا۔ 27 جولائی 1946 کو مسلم لیگ کاؤنسل کابینی مشن کا منصوبہ قبول کرنے کے وعدے سے ہٹ گئی اور آئین ساز اسمبلی کے بائیکاٹ اور پاکستان کے حصول کے لیے ''راست قدم'' کا فیصلہ کر بیٹھی۔ جناح نے اعلان کیا کہ مسلمانوں نے آئینی طریقوں کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''ہم نے ایک پستول بنالیا ہے اور اسے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ یہ تحریک متشددانہ ہوگی یا عدم تشدد پر مبنی، تو انھوں نے ''اخلاقیات پر گفتگو'' کرنے سے انکار کر دیا۔ لیگ میں ان کے بعض تائبین نے اس سے زیادہ صاف گوئی سے کام لیا، لیکن اگر پُرامن تحریک چلانے کا مقصد تھا تو غیظ وغضب کے الفاظ اور بےصبری کے ارشادات سے ''راست اقدام'' کی تیاری کیوں ہوتی۔

ایسے وقت میں جب کہ تناؤ بڑھ رہا تھا، مرکز میں ایک استوار اور طاقت ور حکومت ملک کی اولین ضرورت تھی کابینی مشن ایک عبوری دور کی قومی حکومت کے قیام میں ناکام رہا۔ جولائی میں وائسرائے لارڈ ویول نے ایک بار پھر پیش قدمی کی اور نہرو کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ نہرو نے جناح نے تعاون سے اکار کر دیا۔ انھوں نے اپنے الفاظ میں ''اونچی ذات کی فسطائی کانگریس اور اسی کے حاشیہ برداروں کی تلخی سے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ ہندوستان کے مسلمانوں اور دوسری اقلیتی قوموں پر برطانوی سنگینوں کی مدد سے چھا جانا اور حکم چلانا چاہتے ہیں۔''

ایسے وقت میں جب کہ غیر معمولی ضبط واحتیاط کی ضرورت تھی تا کہ ملک کو نازک صورتحال سے باہر نکالا جائے اس طرح کی تلخی ایک فالِ بد تھی۔ مسلم لیگ نے 16 / اگست کو ''یوم راست اقدام'' منایا۔ اس سے متشددانہ ردعمل کا ایک سلسلہ پھوٹ پڑا اور آنے والے بارہ مہینوں تک سارا ملک تہ وبالا ہوتا رہا۔

باب 51

شعلوں کا بجھانا

16 راگست 1946 کو مسلم لیگ نے ''یوم راست اقدام'' منایا۔ اُس دن کلکتہ میں جس شدت اور جس وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کا منظر دیکھنے میں آیا وہ لوگوں کی یاد میں پہلے کبھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ چار دن تک گنڈوں کے گروہ لاٹھیوں، بھالوں، ہنسیوں اور آتشیں اسلحوں سے لیس شہر بھر میں گھومتے، لوگوں کو لوٹتے اور جس کو اور جہاں پاتے قتل کرتے پھرے۔ اس کی تصویر کشی کے لیے روزنامہ ''اسٹیٹس مین'' نے ''عظیم کشت وخون'' کا گمبھیر عنوان چنا تھا۔ اس میں پانچ ہزار سے زیادہ افراد کی جانیں گئیں۔ پندرہ ہزار یا اس سے زیادہ زخمی ہونے والے اس پر مستزاد تھے۔

بنگال میں مسلم لیگ وزارت کی حکومت تھی، جس کی سربراہی ایچ ایس سہروردی (حسین شہید سہروردی) کرر ہے تھے۔ ''اسٹیٹس مین'' نے لکھا کہ گزشتہ حالات کو پیش نظر رکھیے تو ایسا لگتا ہے کہ فسادات سے قبل مسلم لیگ کے طرز عمل سے صرف سیاسی مخالفین ہی نہیں بلکہ عام لوگوں کے لیے یہ نتیجہ نکالنے کی راہ نکل آئی کہ اس (مسلم لیگ) کا ذہن اس بارے میں ڈانوڈول تھا کہ کسی طرح کا فساد اچھا ہوگا یا نہیں۔ صوبائی حکومت پر واقعتہً یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے اس بات کی روک تھام کا انتظام نہیں کیا کہ فسادات پھوٹ نہ پڑیں، دراں حالاں کہ ایسی پیش بینی کی جاسکتی تھی۔ یہ الزام بھی عاید کیا گیا کہ سہروردی نے جان بوجھ کر فسادات پھوٹ پڑنے کے بعد پولیس کو

بروقت اور غیر جانبدارانہ طور پر دخل اندازی سے روکا۔

اس وقت یہ کہا گیا تھا کہ فسادات کا مقصد پاکستان کے مسئلے پر مسلمانوں کے جذبات کی شدت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اگر یہی مقصد تھا تو یہ (اقدام) دودھاری تلوار ثابت ہوا۔ کلکتہ کے غیر مسلم ابتدائی دھچکے سے تو بوکھلا گئے لیکن پھر اپنی اکثریت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے وحشت انگیز جوابی حملہ کیا۔ باہر یہی اثر پڑا کہ مسلم لیگ کی وزارت کے باوجود کلکتہ کی زور آزمائی میں ہندوؤں کی جیت ہوئی۔ دو مہینے بعد، مسلم اکثریت کے ضلع نوا کھالی (مشرقی بنگال) میں انتقامی کارروائی ہوئی۔ وہاں رسل ورسائل کے محدود ہونے کا فائدہ اٹھا کر اور کٹر پنتھی مذہبی لیڈروں اور جاہ طلب سیاست دانوں کی شہ پا کر مقامی گنڈوں نے ہندوؤں کی املاک جلا دی، اُن کی فصلیں لوٹ لیں اور اُن کے مندروں کی بے حرمتی کی۔ ہندوؤں کی جبری تبدیلی مذہب اور عورتوں کا اغوا ایک برافروختہ کر دینے والی ایجاد تھی۔ بنگال نے دیہی ہندوستان کے حق میں وہی کیا جو کلکتہ نے شہری ہند کے لیے کیا تھا اس سے یہ معلوم ہوا کہ بظاہر سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کے نام پر کیا کیا انسانیت سوز حرکتیں کی جا سکتی ہیں۔

جب مشرقی بنگال سے خبریں آئیں تو گاندھی دلی میں تھے۔ عورتوں کے خلاف جرائم سے انھیں خاص طور پر چوٹ لگی۔ انھوں نے اپنے تمام پروگرام منسوخ کر دیے اور مشرقی بنگال جانے کا فیصلہ کیا۔ دوستوں نے کوشش کی کہ وہ باز آ جائیں، ان کی صحت ٹھیک نہیں تھی ایسے اہم سیاسی مسائل پیش آنے والے تھے جن کے بارے میں اُن کے مشورے کی ضرورت ہوتی انھوں نے کہا کہ ''میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہاں جا کر کیا کر سکوں گا۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ میں جب تک وہاں پہنچوں گا نہیں۔ مجھے سکون نہیں ملے گا۔

کلکتہ میں انھوں نے اگست کے فسادات کی لائی ہوئی بربادیاں دیکھیں اور انھوں نے اعتراض کیا کہ انسانوں کو حیوانوں سے بھی فروتر حیثیت کے اجتماعی پاگل پن میں مبتلا دیکھ کر میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ وہ برطانوی گورنر سے رسمی ملاقات کرنے گئے اور وزیر اعلا سہروردی سے اور اپنے رفیقوں اور بنگال کے ہندو اور مسلم لیڈروں سے ملے۔ انھوں نے یہ بات واضح کر دی کہ نہ تو وہ وکیل استغاثہ بن کر آئے ہیں اور نہ جج بن کر۔ انھیں اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ ایک یا دوسرے فرقے

یا فرد پر الزام چپکا دیا جائے بلکہ اس سے دل چسپی ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ جس سے دونوں فرقے پھر سے پر امن زندگی بسر کرنے لگیں شروع میں سہروردی خوش گوارانداز میں معاونت کرتے رہے۔ انھوں نے ایک وزیر اور دو پارلیمانی سکریٹریوں کو گاندھی کی ہم راہی میں بھیجا۔

مشرقی بنگال میں ماحول خوف، نفرت اور تشدد سے لبریز تھا۔ ایک بیان میں گاندھی نے یہ اعلان کیا کہ وہ مبالغوں اور غلط گوئیوں کے نرغے میں ہیں: ''میرے لیے سچائی کی دریافت مشکل ہے۔ آپس میں ایک خوفناک عدم اعتماد پایا جاتا ہے۔ پرانی سے پرانی دوستیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ سچائی اور اہنسا، جن کی میں قسم کھائے بیٹھا ہوں اور جنھوں نے میرے علم کے مطابق ساٹھ برس تک سہارا دیا ہے۔ آج مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں اب تک انھیں جن خوبیوں سے وابستہ سمجھتا رہا ہوں، اب وہ خوبیاں ان سے ظہور میں نہیں آ رہی ہیں۔ اُن کو بلکہ خود اپنے کو آزمانے کے لیے میں رام پور نامی گاؤں میں جا رہا ہوں۔

نواکھالی ضلع کے سری رام پور نامی گاؤں کے دوسو ہندو گھرانوں میں سے حالیہ فسادات کے بعد اب وہاں صرف تین گھر رہ گئے تھے۔ انھوں نے اپنے رفیقان سفر کو قریب کے گاؤں میں پھیلا دیا۔ پیارے لال، سوشیلا نیّر، آبھا، کانو گاندھی اور سوچیتا کرپلانی۔ ان میں سے ہر ایک، ایک گاؤں میں رہ پڑا۔ سری رام پور میں گاندھی کے ساتھ صرف ان کے اسٹینو گرافر پرسو رام، ان کے بنگالی ترجمان پروفیسر نرمل کمار بوس اور منو گاندھی رہ گئے۔ اگلے چھ ہفتوں تک ایک لکڑی کا تخت جس پر گدّا بچھا ہوا تھا، دن کو ان کا دفتر اور رات کو ان کا بستر خواب بنا رہا۔ وہ دن کو سولہ سولہ گھنٹے کام کرتے اور کبھی کبھی تو بیس بیس گھنٹے بھی لگ جاتے تھے۔ وہ بہت کم کھاتے اور بہت کم سوتے تھے۔ اپنا بستر خود لگاتے اور اپنے کپڑے خود سی پرو کے ٹھیک کرتے، اپنا کھانا خود پکاتے، اپنی زیر دست ڈاک کو خود دیکھتے، ملاقاتیوں کا استقبال کرتے اور مقامی مسلمانوں کے گھروں پر جا کے ان سے ملتے۔ لیگی پریس کئی برس تک انھیں ہندوستانی مسلمانوں کا ''دشمن نمبر ا'' کہہ کر ملعون کرتا رہا تھا۔ انھوں نے سری رام پور کے مسلمانوں کو اس کا موقع دیا کہ وہ خود سے فیصلہ کریں۔

بہر کیف دونوں فرقوں کے درمیان از سر نو اعتماد پیدا کرنے کی رفتار سست اور مشکلوں بھری تھی۔ گاندھی نے ہندوؤں کے اس مطالبے سے اتفاق نہیں کیا کہ مسلم علاقوں میں ہندو ''پاکٹ''

بنائے جائیں اور پولیس اور فوج کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اقلیت کے لیے صرف ایک محافظت ہے اور وہ وہی محافظت ہے جو ایک ہمسایہ دوسرے ہمسایے کو خود بخوشی فراہم کرے۔ اسی طرح انھوں نے بادی النظر میں صحیح دکھائی دینے والا مسلمان سیاست دانوں کا یہ بیان بھی قبول نہیں کیا کہ مشرقی بنگال کے فسادات کی تفصیلات ہندو پریس نے گڑھ لی ہیں تا کہ مسلم لیگ وزارت کو بدنام کیا جائے۔ ہزاروں لوگ صرف اس لیے بے گھر اور قلاش نہ بنیں گے کہ کلکتہ کے وزیروں سے بدلہ چکائیں۔ انھوں نے امن کے سوال کو سیاست کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کی سطح پر لا رکھا ان کی دلیل یہ تھی کہ آئندہ چاہے جو سیاسی نقشہ بھی بنے، لیکن اس پر تو تمام پارٹیوں کو متفق ہونا ہی چاہیے کہ مہذب زندگی کے معیاروں کو اٹھا کر دور نہ پھینک دیا جائے گا۔

مشرقی بنگال کے دیہاتوں پر گاندھی کی موجودگی نے ایک مسکن مرہم کا کام کیا۔ اس سے کھنچاؤ تناؤ میں کمی آئی، غم وغصہ فرو ہوا اور بگڑے ہوئے مزاج نرم پڑے۔ اُن کی کامیابی اور بھی قابل دید ہوتی اگر مسلم پریس لگاتار ان کے خلاف پروپیگنڈا نہ کرتا رہتا اور ان کے مشن پر ایک ''گہرے سیاسی کھیل'' کا شبہ نہ ظاہر کرتا رہتا۔ مقامی لیڈروں اور غالباً مسلم لیگ ہائی کمان کے دباؤ میں آ کر، وزیر اعلا سہروردی، گاندھی کے اس دورے کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے اس شور میں اپنی آواز بھی شامل کر دی کہ گاندھی بنگال چھوڑ دیں۔ اس گمراہ کن مخالفت سے گاندھی بددل نہیں ہوئے انھوں نے یہ دلیل دی کہ اگر وہ مسلم لیگ لیڈروں کا اعتماد حاصل نہیں کر سکے تو اس کے ذمہ دار وہ خود تھے۔ اُن پر تنقید نفس کی کیفیت طاری تھی، بلکہ تنقیص نفس کی۔ 2 جنوری 1947 کی ڈائری میں اُن کا ایک اندراج یہ تھا کہ ''میں دو بجے صبح سے جاگ رہا ہوں۔ مجھے صرف عنایت خداوندی کا سہارا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھ میں کہیں کوئی زبردست خامی ہے جو ان سب باتوں کی ذمہ داری ہے۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہے۔ خدا مجھے اس اندھیرے میں اپنی روشنی کب دکھائے گا۔؟[1]''

اُسی دن وہ سری رام پور چھوڑ کر گاؤں گاؤں کے دورے پر نکل پڑے۔ چاندی[2] پوری

---

(1) پیارے لال: مہاتما گاندھی، دی لاسٹ فیز، ج:1، ص:470

(2) مجھے یقین نہیں ہے کہ گاؤں کا نام چنڈی پور ہے یا چاندی پور۔ مترجم

گاؤں میں انھوں نے چپلیں اتار ڈالیں اور پرانے زمانے کے یاتریوں کی طرح ننگے پاؤں چلنے لگے۔ گاؤں کے راستوں میں پھسلن بھی تھی اور بعض اوقات کٹیلی جھاڑیاں اور شیشوں کے ٹکرے بھی بدنیتی سے ان پر ڈال دیے تھے۔ بانس کے کمزور پل سے بہت سنبھل سنبھل کے گزرنا پڑتا تھا۔ انھوں نے پھٹی دیواریں، جلی ہوئی چھتیں، خاکستر کے ڈھیر اور بچے کھچے ڈھانچے ملبوں میں دبے دیکھے۔ یہ سب مذہبی دیوانگی کی کارستانیاں تھیں۔ ٹیگور کا ایک گیت جس کو وہ بڑے شوق سے سنا کرتے تھے اُن کی روحانی کرب کی جھلک دکھاتا ہے:

اکیلے چل

اگر لوگ تیری آواز پر آواز نہ دیں تو بھی اکیلے چل

اگر لوگ ڈر رہے ہوں اور دیوار کی طرف منہ کیے جھکے جارہے ہوں

تو اے بدقسمت!

اپنا ذہن کھول لے اور اکیلے ہی بول۔

اگر لوگ منہ موڑ لیں اور صحرا کو پار کرتے وقت ساتھ چھوڑ دیں

تو اے بدقسمت!

کانٹوں کو تلووں سے کچلتا ہوا آگے بڑھ

اور خون سے کھنچی ہوئی راستے کی لکیر پر اکیلے ہی چل۔

اگر لوگ اس وقت روشنی نہ دکھائیں جب رات کو طوفان پریشان کیے ہوں تو اے بدقسمت!

درد کی بجلی کی چمک سے اپنے دل کی شمع جلا لے

اور اِسے تنہا جلنے دے۔

2/مارچ 1947 کو وہ بہار کے لیے روانہ ہوگئے۔ نواکھالی کے واقعات کے بدلے میں بہار کے ہندوؤں نے مسلم اقلیت پر لرزہ خیز انتقامی کارروائیاں کی تھیں۔ گاندھی نے بہار کے فسادات کا حال پہلی بار اس وقت سنا تھا جب وہ اکتوبر 1946 کے آخری ہفتے میں نواکھالی جارہے تھے۔ انھوں نے یہ واضح کردیا تھا کہ اگر امن وامان قائم نہ ہوا تو وہ مرن برت (فاقہ

تاموت) رکھ لیں گے۔ یہ دھمکی اور اسی کے ساتھ حکومت بہار کے سخت اقدامات اور جواہر لال نہرو کی آمد سے جلد امن وامان قائم کرنے میں مدد ملی بہر حال، جانوں کا اتلاف بڑے پیمانے پر ہوا تھا اور امداد اور پھر سے بسانے کا کام غیر معمولی نوعیت اختیار کر گیا تھا۔

بہار میں بھی گاندھی وہی باتیں دہرا رہے تھے جو وہ مشرقی بنگال میں کہا کرتے تھے۔ اکثریت اپنے کرتوتوں پر پچھتاوے کا اظہار اور ماضی کی تلافی کرے۔ اقلیت معاف کر دے اور نئے سرے سے زندگی شروع کرے۔'' جو کچھ ہوا تھا اس کے لیے وہ کوئی معذرت قبول کرنے کو تیار نہیں تھے اور ان لوگوں کی سرزنش کرتے تھے جو بہار کے حادثات کا جواز مشرقی بنگال کے فسادیوں کی بداعمالیوں میں ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ ہر فرد اور ہر فرقے کا فرض تھا کہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں خود شریفانہ برتاؤ کرے۔ انھوں نے مسلمان مظلوموں کی امداد کے لیے ہندوؤں سے چندا اکٹھا کیا اور بہار حکومت کو اس پر آمادہ کیا کہ جو مسلمان فسادات کی وجہ سے بے گھر ہو گئے ہیں انھیں پھر سے بسانے کی مبسوط اسکیم تیار کرے۔ بہار کے حالات روبہ اصلاح ہونے لگے۔ اس سے بھی زیادہ تیزی سے حالات بہتر ہو سکتے تھے لیکن 47-1946 کا فرقہ وارانہ تناؤ دراصل سیاسی صورت حال کا پرتو تھا اور اس صورت حال میں برابر تیزی اور کبھی کبھی شدت کے ساتھ ردوبدل ہو رہا تھا۔

جس زمانے میں گاندھی نے اپنے کو بہار اور مشرقی بنگال کے دیہاتوں میں گویا دفن کر لیا تھا اس زمانے میں سیاسی تناظر میں حیران کن تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ ہم یہ دیکھ آئے ہیں کہ کابینی مشن کا پلان، جسے بے انتہا صبر وسکون اور زیرکی سے تیار کیا گیا تھا، وہ مشن کے واپس ہوتے ہی ناکامی سے دوچار ہو گیا۔ مسلم لیگ اس پلان کی منظوری دے کر پلٹ گئی تھی اور پاکستان کے حصول کے لیے راست اقدام تحریک چلا دی۔ کلکتہ کے وحشیانہ قتل وخون سے مشرقی بنگال اور بہار میں رد عمل کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا بقیہ بیشتر صوبوں میں بھی چھوٹے چھوٹے فسادات ہوتے رہے۔ بڑھتی ہوئی لاقانونیت سے گھبرا کر، لارڈ ویو مسلم لیگ کو عارضی حکومت میں لے آئے لیکن اس اتحادی حکومت کے قیام نے۔ جس کو سات برس سے برابر ہندوستان کے تمام سیاسی امراض کا علاج سمجھا جاتا رہا تھا۔ سیاسی اختلافات کو مٹانے کی بجائے اور ہوا دی۔ 9 دسمبر کو آئین ساز اسمبلی

طلب کی گئی لیکن مسلم لیگ یہ اعلان کرچکی تھی کہ اس کے نمائندے اس میں شریک نہ ہوں گے۔ آئینی تعطل مکمل نظر آرہا تھا۔ ٹھیک اس وقت سیاسی پارٹیوں کو ایک مرکز پر لانے کی آخری کوشش کے طور پر برطانوی حکومت نے وائسرائے جواہر لال نہرو، محمد علی جناح، لیاقت علی خاں اور بلدیو سنگھ کو لندن آنے کی دعوت دی گفتگو بے نتیجہ ثابت ہوئی لیکن 6ر دسمبر 1946 کو برطانوی حکومت نے ایک بیان جاری کر کے کابینی مشن پلان میں صوبوں کی گروہ بندی سے متعلق معترضہ دفعات کی وضاحت کی۔ اگرچہ اس وضاحت سے مسلم لیگ کے اعتراضات کو بڑی حد تک دور کر دیا گیا تھا لیکن مسلم لیگ نے آئین ساز اسمبلی کا بائیکاٹ ختم نہیں کیا۔

1947 کا سال تاریک ترین امکانات لے کر سیاسی افق پر طلوع ہوا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ ہندوستان آہستہ آہستہ ایک بے اعلان اور الجھی الجھی سی خانہ جنگی کی طرف گھسٹتا جارہا ہے جس کے خطوطِ جنگ تقریباً ہر گاؤں اور ہر شہر سے ہو کر گزر رہے ہیں۔ مرکزی حکومت اوپر سے لے کر نیچے تک تقسیم ہو چکی تھی اور وہ صوبائی حکومتوں کے سامنے مل جل کر اور مضبوطی کے ساتھ کام کرنے کی کوئی مثال پیش کرنے کے لائق نہیں رہ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لارڈ ویول مختلف طرح کے دھاروں میں پھنس کر بازی ہار چکے ہیں جن کو نہ تو وہ قابو میں لا سکتے ہیں اور نہ اُن میں مصالحت کرا سکتے ہیں۔ انھوں نے تو یہ بھی تجویز کر دیا تھا کہ برطانوی فوجیں ہندوستانی صوبوں سے ایک ایک کر کے تخلیہ شروع کر دیں۔ افراتفری کی جانب اس بہاؤ کو روکنے کے لیے وزیراعظم اٹلی نے طے کیا کہ ضرورت ہے ایک نئی پالیسی کی اور اس پالیسی کو بروئے کار لانے کے لیے ایک نئے وائسرائے کی 20 فروری 1947 کو انھوں نے دارالعلوم میں یہ اعلان کیا کہ برطانوی حکومت جون 1948 تک ہندوستان چھوڑ دینے کا قطعی ارادہ کرچکی ہے اور اگر اُس تک ہندوستانی پارٹیاں ایک کل ہند آئین پر اتفاق نہیں کرتیں تو ''کسی نہ کسی طرح کی مرکزی حکومت کو برطانوی ہند میں یا بعض علاقوں میں موجودہ صوبائی حکومتوں کو یا ایسے دوسرے طریقوں سے جو سب سے زیادہ معقول اور ہندوستانی عوام کے بہترین مفاد میں ہوں گے'' اقتدار منتقل کر دیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی ہوا کہ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہوں گے۔

20ر فروری کے اعلان پر جواہر لال نہرو کا تبصرہ تھا کہ یہ ''جرأت مندانہ اور عقلمندانہ'' ہے۔

لیکن اس تاریخی اعلان کی اس جرأت مندانہ ہمہ گیری اور بے پناہ اعتقاد سے، جو اعلان کا محرک تھا، جناح اتنے متاثر نہیں ہوئے جتنے اس مذکورہ امکان سے کہ جون 1948 میں اختیارات ''موجودہ صوبائی حکومتوں کو'' تفویض کر دیے جائیں گے۔ بظاہر مسلم لیگ آئین ساز اسمبلی کے باہر رہ کر ایک کل ہند آئین کو ناممکن العمل بنا سکتی تھی اور مغرب اور مشرق کے ان صوبوں میں، جو وہ پاکستان کے لیے طلب کر رہی تھی، اختیارات حاصل کر سکتی تھی۔ ان صوبوں میں بنگال اور سندھ میں پہلے ہی سے مسلم لیگ کی وزارتیں تھیں اور بلوچستان مرکزی حکومت کے زیر انتظام تھا۔ آسام اور شمالی مغربی سرحدی صوبے میں کانگریسی وزارتیں تھیں اور پنجاب میں کانگریس اکالی یونینسٹ وفاقی حکومت تھی۔ مسلم لیگ کی فوری حکمت عملی یہ تھی کہ ان تین وزارتوں کو ہٹا کے مسلم لیگ کی حکومتیں قائم کرا لے ان تینوں صوبوں میں یا تو ''راست اقدام'' شروع کیا گیا یا پہلے سے زیادہ تیز کر دیا گیا۔ اس کے نتائج خاص کر پنجاب میں تباہ کن ثابت ہوئے۔ مغربی پنجاب میں ہندو اور سکھ اقلیتوں کو انھیں ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑا جو ہندو اقلیت کو مشرقی بنگال میں اور مسلم اقلیت کو بہار میں کرنا پڑا تھا۔ فوج کی مدد سے کسی نہ کسی طرح امن کی سی فضا قائم ہوئی لیکن تناؤ بدستور باقی رہا۔ صوبے کے دو شہر لاہور اور امرتسر تو ایک عجیب وغریب طرح کی گوریلا جنگ میں پھنس گئے جس میں بندوق بازی، چھرے بازی اور آتش زنی پولیس گشت اور کرفیو آرڈر کے باوجود جاری رہے۔

جب گاندھی کو پنجاب کے واقعات کی اطلاع ملی تو وہ بہار میں تھے، وہ اکتوبر 1946 سے لگاتار صوبے صوبے اس بے نتیجہ کوشش میں گھومتے رہے کہ تشدد کا طوفان کم ہو۔ ابھی ایک صوبے میں ان کا کام پورا نہ ہو پاتا کہ دوسرے صوبے میں آگ بھڑک اٹھتی۔ کچھ لوگ اپنے شانوں کو جنبش دیتے ہوئے یہ کہنے لگتے کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد صرف بدامنی پھیلنے کی امید رکھنا چاہیے۔ وہی تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دست وگریباں ہونے سے روکے ہوئے ہیں۔ چرچل نے ستمبر 1947 میں کہا کہ ''ہندوستان میں جو خون خرابہ ہو رہا ہے اسے دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ مردم خور درندوں کی سی شدت سے جو ہولناکیاں اور خونخواریاں جانبین سے ہو رہی ہیں ابھی تو ہم ان کی شروعات ہی دیکھ رہے ہیں۔ ایسا کام وہ قومیں کر رہی ہیں جن میں اعلا ترین کلچر کی صلاحیتیں موجود ہیں اور جو نسلوں سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو، عمومی امن

وامان سے، تاج برطانیہ اور پارلی منٹ کی وسیع النظر روادارانہ اور غیر جانبدار حکومت کے ماتحت رہتے چلے آئے ہیں۔''

گاندھی کے لیے 47-1946 کا تشدد سخت ذہنی دھچکا پہنچانے والا اور بدحواس کر دینے والا سانحہ تھا۔ وہ زندگی بھر اسی دن کے لیے کام کرتے چلے آ رہے تھے ان کے مابین اتنی بڑی دراز تھی کہ ان کے لیے گہری مایوسی کے جذبے کو چھپانا ناممکن ہو گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنے آپ ہی کو ملزم ٹھہرایا۔ کیا ان کی تکنیک میں کوئی خامی تھی؟ کیا وہ غور سے دیکھ نہیں رہے تھے یا بے پروا تھے یا ان کا رویہ بین بین کا تھا یا وہ بے صبر تھے؟ کیا وہ بروقت اس کا پتہ نہ لگا پائے تھے کہ اگرچہ عوام نے غیر ملکی حکومت کے خلاف جدوجہد کے دوران بہ حیثیت مجموعی کھلم کھلا تشدد سے احتراز کیا تھا لیکن ان کے دلوں میں اہل برطانیہ کے خلاف برے خیالات چھپے ہوئے تھے؟ کیا جو لوگ عدم تشدد کے زبانی دعوے کیا کرتے تھے ان کے دلوں کے اندر سلگتے ہوئے تشدد ہی کا ایک مظہر فرقہ وارانہ تشدد بھی تھا؟

گاندھی کے لیے یہ بات بالکل فطری تھی کہ اپنے فلسفے اور ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں خود اپنے عمل کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اس المیہ کی توجیہہ کی کوشش کریں۔ گزشتہ حالات کا جائزہ لینے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری اور اہنسا کی ناکامی کے سلسلے میں مبالغے سے کام لے رہے تھے۔ یہ حدود سے گزری ہوئی توقع تھی کہ صرف تیس برس کے عرصے میں کوئی ایک لیڈر چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اس وسیع براعظم میں بسنے والے چالیس کروڑ انسانوں کے دل سے تشدد اور نفرت بالکل ہی نکال پھینکے گا۔ یہ امر بہت لائق ستائش تھا کہ ان کی قیادت میں چلنے والی کئی ستیہ گرہ تحریکوں میں تشدد بے حد کم رہا تھا اور کروڑوں ہندوستانیوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے نفرت کی اس خوراک کی ضرورت نہیں پڑی تھی جس سے ابھرتی ہوئی قوم پروری علی العموم وابستہ ہوتی ہے۔

اس کا امکان ہے کہ اگست 1942 میں کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری کے بعد جو لاقانونیت رونما ہوئی اس کی وجہ سے عوامی رویے کے معیار گر گئے لیکن 47-1946 کے تشدد کی اصلی توجیہہ اس کھنچاؤ اور تناؤ میں ڈھونڈھنا ہوگی جو پاکستان تحریک نے مویدین اور مخالفین دونوں

میں پیدا کر دیا تھا۔ اس تحریک کا سنگ بنیاد یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان کے درمیان ماضی، حال اور مستقبل میں کچھ بھی مشترک نہیں تھا۔ آبادی کے بہت بڑے بڑے حصے مبہم امیدوں اور اتنے ہی مبہم خوف میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کوئی بھی یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان متحد رہے گا یا دو یا اس سے زیادہ ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گا یا یہ کہ ہندوستانی ریاستیں آزاد ہندوستان میں مدغم ہو جائیں گی یا خود مختار ہو جائیں گی۔ وسطی ہندوستان کے آدی واسی اور آسام کے ناگاؤں کو اب آزادی کے حلیف مل گئے تھے۔ پہلے انھوں نے کبھی آزادی کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ جنوب میں دراوڑستان اور مستقبل کے پاکستان کے دو حصوں کو ملانے کے لیے ہزار میل لمبی گزرگاہ کی بات چلنے لگی تھی۔ ''ہندوستان کا بلقانیانا (1)'' جو پہلے ایک بدشگونی سمجھا جاتا اب ایک واقعی خطرے کی شکل میں سامنے تھا۔ اس سے عوام کے خیالات جوش میں آنے لگے تھے۔ سوسائٹی کے اختلال پسند عناصر آنے والے انتقال اختیارات میں ایک دور خلا کا تصور کر رہے تھے، ویسا خلا جو اٹھارہویں صدی میں سلطنت مغلیہ کی شام میں نظر آنے لگا تھا۔

ان خطرات کے روبرو، مرکزی حکومت آپسی اختلافات میں مبتلا تھی اور صوبائی حکومتیں روز افزوں بددلی سے دوچار تھیں۔ برطانوی افسروں کے رویے میں اپنی ملازمتوں کے ختم ہو جانے کے خیال سے تلخی آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں سے بہت ہی کم ایسے تھے جن میں اس آتش فشاں تشدد سے جو چاروں طرف پھوٹ پڑا تھا نپٹنے کی خواہش یا صلاحیت تھی۔ ہندوستانی افسر، اگر خود جانب داریوں سے پاک بھی ہوتے تو بھی اپنے ماتحتوں کو چھوٹے چھوٹے مظالم سے نہ روک پاتے تھے۔ مسلم لیگ نیشنل کارڈس اور راشٹریہ سویمسیوک سنگھ وغیرہ کی طرح کی پرائیویٹ فوجوں کے وجود میں آ جانے سے امن و قانون کی مشینری ہی متزلزل ہو گئی تھی۔

گاندھی نے اس صورت حال کے دھماکہ خیز امکانات کو محسوس کر لیا تھا۔ انھوں نے کلکتہ کے زبردست کشت وخون' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ہم ابھی تک خانہ جنگی میں مبتلا تو نہیں ہوئے ہیں لیکن ہم اس کے قریب پہنچ رہے ہیں'' اکتوبر کے خاتمے سے لے کر جب وہ دلی سے نواکھالی کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے فرقہ وارانہ جنون کو کم کرنا اپنا اوّلین مشن بنا لیا تھا۔ ہر شخص کی طرح وہ بھی یہ بخوبی جانتے تھے کہ سیاسی جماعتوں کے مابین سمجھوتے سے ہی استقلال

واپس لایا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ سیاسی سمجھوتا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا اور تشدد سیاسی سمجھوتے کی نوعیت پر بھی اثر انداز ہوسکتا تھی۔ وہ اس سوچ میں تھے کہ اگر لیڈر راضی نہیں ہوتے تو کیا عوام کو راضی کیا جا سکتا ہے ان کے بہار اور بنگال کے دوروں کی وجہ سے عوام کو از سر نو تعلیم ملی لیکن ان کی دشواری یہ تھی کہ ان کی آواز کا مسلمانوں کے متوسط طبقے میں اب وہ وزن نہیں رہ گیا تھا جو ایک زمانے میں تھا۔ ہندو بھی بے چین تھے اور ان کی اس پالیسی پر معترض تھے جس کو وہ ''یک طرفہ ہتھیار ڈالنا'' کہتے تھے۔ اور پھر بھی وہ موخرالذکر کو اپنی رو میں بہالے جا سکتے تھے۔

اگر فرقہ وارانہ امن و امان واپس لانے کی ان کی کوشش میں کسی ایسے شخص کی کوششیں بھی شامل ہو جائیں جیسے مسلمانوں کے متوسط طبقے کی اطاعت حاصل ہوتی تو ان کی مشکلیں آدھی کم ہو جاتیں۔ 47-1946 میں مسلم دانشوروں پر جناح کا اثر نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا تھا وہ قائداعظم، یعنی عظیم لیڈر تھے جن کے چشم و آبرو کے اشاروں کی اطاعت کی جاتی تھی۔ اگر وہ مشرقی بنگال یا مغربی پنجاب کا دورہ کرتے تو وہ شاید یہ کاروبارِ جہالت روک لیتے لیکن اُن کے سامنے اگر اس طرح کی کوئی تجویز پیش کی جاتی تو وہ اُسے ہنسی میں اڑا دیتے کیوں کہ ان کی سیاسی جبلت فاقوں اور پا پیادہ دوروں سے صلح کر ہی نہیں سکتی تھی۔

چوں کہ جناح قانون داں اور پارلی مانی تھے اس لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ وہ طاقت کے استعمال پر یقین رکھتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں طاقت کے استعمال کی دھمکیاں دینے پر ضرور یقین تھا۔ ہم یہ دیکھ آئے ہیں کہ انھوں نے کس طرح 1938 میں کانگریس کو متنبہ کیا تھا کہ مسلمان ہندوستان کے اتحاد کو توڑ سکتے ہیں جیسے سوڈیٹن جرمنوں نے چیکوسلوا کیا کے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ کلکتہ کے عظیم خون خرابے اور بہار اور بنگال کے فسادات کے بعد، ان کے پاکستانی مقدمے کی بحث میں فرقہ وارانہ تشدد سب سے مضبوط دلیل بن گیا۔ انھوں نے پھر یہ آگاہی دی کہ اگر ہندوستان کو تقسیم نہیں کیا گیا تو اس سے بدتر صورت پیش آ سکتی ہے۔ اگر چہ امن کی اپیل پر دستخط ثبت کر کے انھوں نے ویول اور ماؤنٹ بیٹن کو ممنون کرم کیا لیکن انھوں نے اپنے جنگ جو ماتحتوں پر روک لگانے کی کوشش نہیں کی۔ خود انھوں نے دو دھارے بیانات دیے جن سے اس تشدد کو شہ ملی جس کی مذمت کرنا ان کا مقصد تھا۔

باب 52

مفتوح کی فتح

20رفروری کے بیان میں برطانیہ کی ہندوستان سے واپسی کا فیصلہ بھی ہو گیا تھا اور تاریخ بھی مقرر کر دی گئی تھی۔ چرچل نے دارالعوام سے سوال کیا تھا کہ ''ہم یہ کیسے امید کر سکتے ہیں کہ ہزاروں سال پرانی خلیج جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منہ کھولے ہوئے ہے، وہ چودہ مہینوں میں پٹ جائے گی؟ ان لوگوں کی نگاہ میں جو ہندوستانی صورت حال سے کماحقہٗ واقف تھے یہ چودہ مہینوں کی مدت کامیاب پسپائی کے لیے بہت کم نہیں بلکہ بہت زیادہ تھی۔ ڈاؤننگ اسٹریٹ[1] میں مسٹر اٹیلی کی کھڑکی سے ہندوستانی افق کا جو سیاہ ترین پہلو جھلکتا تھا وہ خانہ جنگی کے خطرے کا تھا۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ اگرچہ وہ یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ پرامن تبدیلی کے امکانات بہت روشن ہیں لیکن انھیں ایسا لگ رہا تھا کہ ایک شخص ایسا بھی ہے جو ہوا کا رخ بدل سکتا ہے اور وہ رِیَر ایڈمرل ماؤنٹ بیٹن ہیں۔ وہ مارچ 1947 میں لارڈ ویول کے جانشین ہو گئے۔

نئے وائسرائے کے اولین فرائض میں گاندھی کو گفت وشنید کی دعوت دینا تھا۔ مہاتما بہار میں اپنا امن مشن بیچ میں چھوڑ کر ٹرین سے نئی دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ انھوں نے وائسرائے کو

(1) ڈاؤننگ اسٹریٹ، برطانوی وزیراعظم کی مستقل رہائش گاہ ہے۔ ع، ج، ز

یہ مشورہ دیا کہ کانگریس۔ لیگ وفاقی حکومت ختم کر کے وہ جناح کو وزارت کی تشکیل کی دعوت دیں۔ ظاہر ہے کہ اس بلند ترین پیش کش سے گاندھی کا مقصد تھا کہ جناح کے دل میں کانگریس اور ہندوؤں کی جانب سے جو شبہات ہیں ان کا کلیۃً ازالہ کر دیا جائے لیکن برطانوی حکومت کو یہ مشورہ دوراز کار معلوم ہو رہا تھا۔ حال میں عارضی حکومت کے دوران کانگریسی لیڈروں کو مسلم لیگی ساتھیوں کا کافی تجربہ ہو چکا تھا اور ان کے دلوں میں سادہ کاغذ آگے بڑھا دینے کی خواہش بیدار نہیں ہو رہی تھی۔ اب دل جویانہ پیش کشوں کا وقت گزر چکا تھا، چنانچہ جب جناح ماؤنٹ بیٹن سے ملے تو انھوں نے ہندوستان کی تقسیم کی مانگ پھر دہرائی۔

تقسیم کے معاملے میں کانگریسی نقطہ نظر میں نئی تعین کے رجحان سے وائسرائے کا کام آسان ہو گیا۔ اب تک کانگریس کا یہ موقف رہا تھا کہ اگرچہ تقسیم ہونا ہی ہے تو سیاسی آزادی کے بعد ہو نہ کہ پہلے۔ مولانا آزاد کے لفظوں میں شادی کے پہلے ہی تو طلاق نہیں ہو سکتی تھی، لیکن عارضی حکومت میں چند روزہ مگر طوفانی کورٹ شپ کے بعد کانگیرسی لیڈروں کے ذہن زیادہ قریبی ملاپ کے خواب سے چھٹکارا پا چکے تھے۔ 1947 کے موسم بہار میں ان کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ نراج یا تقسیم۔ وہ اخرالذکر کو تو شئہ تقدیر سمجھ کر مان گئے تا کہ کم از کم ہندوستان کے تین چھوتھائی حصے کو اس اتھل پتھل سے بچا لے جائیں جس کا خطرہ اب پورے ملک کو لاحق ہو گیا تھا۔

اس طرح اس 3 جون کے پالان کے لیے اسٹیج تیار ہو گیا جس کے تحت 10 اگست 1947 کو برطانیہ کی جانب سے دو جانشین ریاستوں کو اختیارات منتقل کیے جانے والے تھے۔ تجاویز کی آخری شکل کی تشکیل میں وائسرائے کو دس ہفتوں تک ان تھک گفت وشنید کرنا پڑی اور اپنی اختراعی قوت اور ڈپلو میٹک صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لانا پڑا تب بھی جو شکل ابھری وہ کانگریس اور لیگ کے مابین ذواضعاف اقل مشترک تھا اگرچہ آخری فیصلہ جمہوری طریق کار یعنی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کی رائے دہندگی یا عام رائے شمار...... پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن یہ انجام پہلے ہی سے معلوم تھا کہ ہندوستان کا بھی بٹوارہ ہو جائے گا اور پنجاب اور بنگال کا بھی۔

گاندھی کو جس بات کا خوف تھا وہ آ گے آ ہی گئی۔ ہندوستان کو تقسیم ہونا تھا لیکن یہ تقسیم اوپر سے مسلط نہیں کی جا رہی تھی اس کو جواہر لال نہرو، دلبھ بھائی پٹیل، کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبران

کی اکثریت نے منظور کرلیا تھا۔ آخری مذاکرات میں گاندھی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن ان کی تقسیم کی مخالفت کھلا ہوا راز تھی۔ ان کے دلائل وہی تھے جو وہ کئی بار پہلے بھی دے چکے تھے ''جب تک برطانوی طاقت ہندوستان میں مصروف کار ہے، ہم لوگ مربوط طریقے پر سوچ ہی نہیں سکتے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کے نقشے کو بدل دے۔ اسے (برطانیہ کو) صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ہٹ جائے اور ہندوستان چھوڑ دے اور اگر ممکن ہو تو دست کشی پرامن طریقے پر کرے ورنہ اگر بدنظمی ہوتی ہے تو بھی موجودہ تاریخ پر یا اس سے پہلے ہٹ جائے'' جو تشدد گاندھی کے کانگریسی رفقا اور برطانوی حکومت کی رائے تقسیم کے حق میں زبردست محرک تھا اسی کو گاندھی تقسیم کے خلاف ایک ناقابل انکار دلیل سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک خانہ جنگی کے خوف سے تقسیم کو تسلیم کر لینے کے معنی یہ تھے کہ یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ اگر کافی حد تک تشدد برت لیا جائے تو پھر ہر چیز حاصل ہوسکتی ہے۔

تقسیم کے خلاف اتنے شدید خیالات کے پیش نظر گاندھی سے یہ امید کی جاسکتی تھی کہ وہ ماؤنٹ بیٹن پلان کی مخالفت کریں گے فی الحقیقت، اس سلسلے میں وائسرائے کو کچھ تشویش بھی تھی اور ایلن کیمپ بل جانسن نے لکھا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن گاندھی کے ساتھ انٹرویو دیتے وقت کچھ گھبرائے سے تھے۔ بہر حال گاندھی کسی ایسی مصالحت کی راہ کی رکاوٹ بننے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے جو کانگریس اور لیگ لیڈروں اور برطانوی حکومت کے مابین ہورہی تھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جس اجلاس میں میں ماؤنٹ بیٹن پلان پر بحث ومباحثہ ہوا اس میں گاندھی نے اپنے ذاتی خدشات کو چھپایا نہیں لیکن انھوں نے اپنی شخصیت کا وزن پلان کی منظوری کے حق میں استعمال کیا۔ نفس کشی کے اس عمل نے اس نازک مرحلے پر کانگریس کو پھوٹ سے بچالیا اور انھوں نے اپنی آزادی رائے بھی باقی رکھی۔

تقسیم کے فیصلے کے قطعی ہوجانے کے بعد، گاندھی کی تمام کوششیں اس امر پر مرکوز ہوگئیں کہ اس کے خطرات کو کم کیا جائے۔ انھوں نے جناح کی اس یقین دہانی کا خیر مقدم کیا کہ پاکستان میں ہندو اقلیت کو یکساں حقوق ومراعات حاصل ہوں گے اور مستقبل کی انڈین یونین سے شریک غالب کی حیثیت سے انھوں نے پرزور سفارش کی کہ وہ اقلیتوں سے نہ صرف منصفانہ بلکہ فیاضانہ برتاؤ کر کے اپنے پڑوسی کے سامنے ایک مثال قائم کرے۔

15/اگست 1947 کو برطانیہ سے ہندوستان کے ہاتھوں میں اقتدار کی منتقلی بڑی دھوم

دھام سے منائی جانے والی تھی لیکن گاندھی بینڈ باجوں اور جھنڈوں کے متعلق سوچنے کی موڈ میں نہیں تھے جس دن کی انھیں تمنا تھی اور جس کے لیے وہ اتنی کوششیں کرتے آئے تھے وہ آپہنچا تھا، لیکن ان کے دل سے موج انبساط نہیں اٹھ رہی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ ہندوستان کو آزادی ہندوستان کے اتحاد کی قربانی دے کر مل رہی تھی بلکہ آبادی کے بڑے بڑے حصے اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان تھے۔

شروع اگست میں کشمیر کے مختصر سے سفر کے بعد، گاندھی مغربی پنجاب سے ہو کر گزرے تو انھوں نے اس صوبے کے حالیہ فسادات کی لائی ہوئی بربادیاں دیکھیں اور پھر وہ مشرقی بنگال کے لیے روانہ ہو گیے جہاں کے ہندوؤں کو یہ خطرہ تھا کہ پاکستان کے قیام کے بعد فسادات کی ایک نئی لہر اٹھ پڑے گی۔

کلکتہ جا کر انھوں نے دیکھا کہ شہر فرقہ وارانہ لاقانونیت کی گرفت میں تھا جو ایک سال سے اس کی قسمت بن چکی تھی۔ مسلم لیگ وزارت کے خاتمے اور مسلم افسران اور پولیس کی اکثریت کے پاکستان چلے جانے کے بعد، اب پانسہ پلٹ گیا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کلکتہ کے ہندو پرانا قرضہ چکانے پر تلے ہوئے ہیں۔ سہروردی اب وزیراعظم نہیں رہ گئے تھے اس لیے وہ سلجھی ہوئی ذہنی کیفیت میں تھے وہ گاندھی سے ملے اور انھوں نے گاندھی سے درخواست کی کہ وہ نوا کھالی جانے کے بعد کلکتہ میں تالیف قلوب کا کام کریں۔ انھوں نے یہ بات اس شرط پر منظور کر لی کہ سہروردی انھیں کے ساتھ، ایک ہی چھت کے نیچے قیام کریں اور مشرقی بنگال میں ہندو اقلیت کے لیے مسلم رائے عامہ پر اپنا اثر استعمال کریں۔ ابھی وہ اپنی نئی رہائش گاہ میں منتقل ہی ہوئے تھے کہ ہندو نوجوان ہندوؤں کے ایک گروہ نے ان کے امن مشن کے خلاف مظاہرہ کیا۔ انھوں نے یہ وضاحت کی کہ وہ کس طرح بھائی بھائی کی باہمی جنگ کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور کس طرح یہ سمجھانے کی سعی میں مصروف ہیں کہ وہ نفرت اور تشدد کے ہاتھوں کہیں کے نہ رہیں گے جھلسی زمین پر ان کے الفاظ خوشگوار بارش کی طرح گر رہے تھے اور یہ نوجوان ان سے متفق ہو کر اپنے گھروں کو واپس گئے۔ راتوں رات کلکتہ کی حالت بدل گئی۔ فسادات رک گئے۔ 14/اگست کو آزادی کی شام دونوں فرقوں نے مل جل کر منائی۔ ہندو اور مسلمان سڑکوں پر اکٹھا ہو جاتے اور

ساتھ ساتھ ناچتے گاتے۔ اگست 1946 سے لوگوں کے دلوں کو جو کابوس دبوچے ہوئے تھا وہ یکا یک ہٹ گیا۔ عید کے دن ہندوؤں نے مسلمانوں سے مٹھائیوں اور تحفوں سے تبادلہ کیا یہ منظر 1920-22 کی تحریک خلافت کے پر عافیت زمانے کی یاد دلاتا تھا۔ گاندھی کی پرارتھنا سبھاؤں میں تین تین چار چار لاکھ آدمی اکٹھا ہوتے تھے اور وہاں ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی کے جھنڈے لہراتے تھے۔ گاندھی خوش تھے۔ انھوں نے کہا کہ ''ہم نفرت کا زہر پی چکے ہیں'' اس لیے یک جہتی کا آبِ حیات اب اور زیادہ میٹھا لگتا ہے۔''

یہ دوستانہ ماحول مشکل سے پندرہ دن قائم رہنے پایا تھا کہ پنجاب کے آنے والی قتل عام اور ہجرتوں کی خبر سن کر از سر نو شعلے بھڑک اٹھے۔ 31/اگست کی شام کو ایک ہندو ہجوم نے بیلی گھاٹا میں گاندھی کی رہائش گاہ پر دھاوا بول دیا۔ یہ ہجوم غصے میں بھرا ہوا، گالیاں بکتا ہوا اور تشدد پر آمادہ تھا۔ اس نے کھڑکیاں توڑ ڈالیں اور گھر کے اندر گھس آیا۔ تشدد آمیز شور و غضب میں مہاتما کے الفاظ ڈوب گئے۔ ایک گمان ان کے قریب سے اڑتا ہوا گزر گیا۔ وہ لاٹھی کی ضرب سے بس بال بال بچے۔ اسی کے ساتھ کلکتہ میں فسادات پھر عود کر آئے۔

امن کے لیے گاندھی کی کوششوں کو اس سے زبردست دھکا لگا۔ انھوں نے جواب میں پہلی ستمبر سے اس وقت تک کے برت اعلان کر دیا جب تک کلکتہ میں امن واپس نہ آ جائے۔ انھوں نے کہا کہ ''جو کام میرے الفاظ فی نفسہٖ نہیں کر پائے وہ شاید برت انجام دے سکے۔'' اس اعلان سے کلکتہ میں گویا بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں پر اس کا اثر ہوا، ہندوؤں کو اس سے شرم آئی کلکتہ کے گنڈے بھی اس خیال کو برداشت نہ کر سکے کہ گاندھی کا خون ان کے ضمیر پر ہو۔ خفیہ فرقہ وارانہ تنظیموں نے گاڑیوں پر لا دلا د کے غیر قانونی اسلحے مہاتما گاندھی کے قدموں پر خود سے لا کر ڈال دیے۔ تمام فرقوں نے امن کا عہد کیا اور گاندھی سے درخواست کی کہ وہ اپنا برت توڑ دیں۔ گاندھی راضی ہو گئے لیکن انھوں نے متنبہ بھی کیا کہ اگر لوگوں نے ذرا بھی وعدہ خلافی کی تو وہ ایسا برت رکھ لیں گے جسے توڑا نہ جا سکے گا۔

کلکتہ کے برت کو عام طور سے ایک معجزہ کہا گیا۔ لندن ''ٹائمز'' کے لفظوں میں (جس کا بار بار حوالہ دیا گیا ہے) اس (برت) نے وہ کام کیا جو فوجیوں کے کئی ڈویزن بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد کلکتہ اور مشرقی بنگال پر امن رہے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کا بخار اتر گیا تھا۔

اس کے فوراً ہی بعد گاندھی کو پنجاب جانے کا وقت مل گیا۔ ایک طرح سے اگست 1947 کے وسط میں اس صوبے میں جو آگ بھڑکی اسے مارچ 1947 کے فسادات کا ہی تسلسل سمجھنا چاہیے۔ پنجاب کے گاؤں اور شہر کو عجیب وغریب امیدوں اور اجنبی طرح کے خوف نے اپنے شکنجے میں کس لیا تھا اور وہ بیک وقت ڈر بھی رہے تھے اور کچی مورچہ بند لڑائی کی تیاریوں میں بھی لگے ہوئے تھے۔ ملازمتوں کے فرقہ وارانہ بنیادوں پر ردوبدل اور پولیس اور فوج کی صفوں میں فرقہ پرستی کے در آنے کی وجہ سے ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جس میں ہندوؤں کے لیے مغربی پنجاب میں اور مسلمانوں کے لیے مشرقی پنجاب میں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ پچاس لاکھ ہندوؤں اور سکھوں کا مغربی پنجاب سے مشرقی پنجاب کو اور اپنے ہی مسلمانوں کا اس کے برعکس سمت میں ہجرت کرنا انسانی مصائب کے لحاظ سے دل ہلا دینے والا سانحہ تھا۔ یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ جب وہ مہاجرین اپنے مصائب کے لحاظ سے دل ہلا دینے والا سانحہ تھا۔ یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ جب یہ مہاجرین اپنے مصائب کی داستانیں لے کر اپنی منزل پر پہنچیں گے تو تشدد شروع ہو جائے گا۔ دلی میں ستمبر کے پہلے ہفتے میں بالکل یہی ہو۔ گاندھی نے یہ دیکھا کہ ہندوستانی دارالخلافہ اپنی تاریخ میں پہلی بار بدترین قسم کے فرقہ وارانہ فسادات سے مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جب دلی جل رہا ہو تو پنجاب میں جانے کے کوئی معنی نہیں رہ گئے ہیں۔ حکومت نے فوری اور پرزور اقدامات کئے تھے۔ وزیراعظم جواہرلال نہرو نے کہا تھا کہ تشدد کو پوری قوت سے دبا دیا جائے گا۔ کابینہ کی ایک ایمرجنسی کمیٹی بنا دی گئی تھی اور شہر میں فوج بلا لی گئی تھی۔ لیکن پولیس اور فوج کے بل بوتے پر قائم کئے ہوئے امن سے گاندھی مطمئن نہیں تھے۔ تشدد کو لوگوں کے دلوں سے نکال پھینکنا تھا۔ یہ پہاڑ کی چڑھائی کی طرح مشکل کام تھا۔ شہر میں کئی مہاجر کیمپ قائم تھے، کچھ میں مغربی پاکستان کے مہاجر مقیم تھے اور کچھ میں دلی سے بھاگ کر جانے والے مسلمانوں کو پناہ دی گئی تھی تاکہ وہ سرحد پار کرنے تک وہاں قیام کر سکیں۔

ہندو اور سکھ مہاجرین کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ ان میں سے بیشتر اپنے گھروں، کھیتوں اور پیشوں سے اکھڑ گئے تھے اور اب غربت کے ان مصائب میں مبتلا تھے جن سے وہ آشنا نہ تھے کچھ حادثات کے سوگوار تھے اور سب کے سب تلخیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ دلی کی اقتصادیات میں دراڑ بنا کر گھسنا چاہتے تھے اور ان کی نگاہیں مسلمانوں کے مکانات اور دکانوں پر جمی ہوئی تھیں تاکہ

جو مکان اور دکانیں وہ پاکستان میں چھوڑ آئے تھے ان کی جگہ لے لیں مہاتما کا یہ مشورہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ''بھول جاؤ اور معاف کر دو'' اور ان لوگوں کے لیے اپنے دلوں میں کوئی کینہ نہ رکھو جن کے ہاتھوں انھوں نے تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ انھوں نے گاندھی کو ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا اور ان کے عدم تشدد کے بارے میں یہ کہا کہ تشدد اس سے بازی لے گیا۔ جب وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے کہ ایک دن وہ اپنے گھروں کو پاکستان واپس جائیں گے تو وہ بے اعتباری کے انداز میں مسکراتے تھے۔ جو کچھ یہ لوگ دیکھ آئے تھے وہ گاندھی نے نہیں دیکھا تھا۔ گاندھی کو ان مصائب کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جو وہ جھیل آئے تھے۔ انھیں اس کا علم نہیں تھا کہ اس المیے کا گاندھی کے دل پر کتنا بوجھ تھا۔ جب وہ اپنا مختصر سا کھانا کھانے بیٹھتے تو انھیں ان لوگوں کی یاد ستاتی جو بھوکے تھے رات کو جب وہ اپنی جائے قیام برلا ہاؤس کی چھت پر بارش کی رم جھم سنتے تو وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچ سوچ کر جاگتے رہتے جن کے سروں پر پورا سایہ بھی نہ تھا۔ مصائب کی داستانیں سن سن کر ان کی روح تپتی رہتی لیکن ان کے اس اعتماد میں کبھی تزلزل نہیں آیا کہ نفرت اور تشدد کا یہ بڑھتا ہوا بگولا صرف عدم تشدد سے رک سکتا تھا۔ ہر شام کو وہ اپنی پرارتھنا سبھا میں فرقہ وارانہ مسئلے پر کچھ نہ کچھ ضرور کہتے۔ وہ انتقام کے بے سود ہونے پر زور دیتے تھے۔ انھوں نے اہل دہلی کی تعلیم نو کے سلسلے میں اپنے کو تھکا مارا۔ وہ شکایتیں سنتے، حل تجویز کرتے، مختلف ملنے والوں کی ہمت افزائی کرتے یا تنبیہ، مہاجرین کے کیمپوں میں جاتے، مقامی افسروں سے رابطہ قائم رکھتے۔ یہ تھکا دینے والا اور بعض اوقات دل توڑ دینے والا روز کا معمول تھا۔

گاندھی نیم سنجیدہ اور نیم امزاحیہ نداز میں کہا کرتے تھے کہ وہ سوا سو سال کا زندہ رہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہندو روایات کے مطابق انسان کی عمر طبیعی یہی تھی۔ لیکن کلکتہ کے عظیم کشت وخون کے بعد جو فسادات کا سلسلہ شروع ہوا اس سے وہ اتنے رنجیدہ ہوئے کہ انھوں نے یہ بات بار بار دہرائی کہ وہ بھائی کے جھگڑوں کے یہ مناظر دیکھنے زندہ رہنا نہیں چاہتے۔ جب ان کی سالگرہ پر انھیں مبارکباد دی گئی تو انھوں نے کہا کہ ''مبارک باد کا محل ہی کیا ہے؟ کیا تعزیت زیادہ مناسب نہ ہوگی؟ جب دیوالی، یعنی روشنیوں کا تیوہار آیا تو انھوں نے کہا کہ جب لوگوں کے دلوں سے محبت کی روشنی بجھ گئی تو وہ تیوہار کیسے منائیں؟ جب ان کی مرید ایک انگریز خاتون میرا بین نے

انھیں مارچ 1948 میں اپنے ہمالیائی آشرم میں بلایا تو انھوں نے جواب دیا کہ ''لاش کو شمار قطار میں رکھنے سے کیا فائدہ؟''

خیال ہوتا ہے کہ کیا انھیں کچھ پہلے یہ علم ہو گیا تھا کہ آخری وقت جلد آنے والا ہے یا اس زمانے میں جو ذہنی اور روحانی اذیت ان پر گزر گئی ان جملوں میں صرف اس کی وقتی جھلکیاں تھیں؟ ایک بار انھوں نے یہ وضاحت کی تھی کہ موت اور حیات ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں موت کو انھوں نے ایک لاثانی دوست کہا۔ ایسے بہت سے مواقع آئے تھے جب ان کی زندگی نازک ترین دھاگے سے لٹکی ہوئی تھی۔ وہ صرف 27 برس کے تھے جب ڈربن میں انھیں تقریباً موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ گیارہ برس بعد جانس برگ میں ان کے ایک کھردرے ہم ڈن نے زدوکوب کیا۔ 1934 میں جب وہ پونا میونسپل ہال جا رہے تھے تو ایک بم سے وہ بال بال بچے۔ کئی برتوں میں تو وہ تقریباً موت کے دہانے پر پہنچ گئے تھے اور ان میں سے کم از کم دو میں تو ان کا بچ جانا ایک معجزہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اہنسا کے سپاہی کی حیثیت سے انھیں اتنی بار جان جوکھوں کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ شاید جنرلوں کو میدان جنگ میں بھی نہ کرنا پڑا ہو۔

13 جنوری 1948 انھوں نے برت شروع کر دیا۔ انھوں نے میرا بین کو لکھا کہ یہ ''میرا سب سے بڑا برت'' ہے۔ برت اس وقت تک نہیں ''ٹوٹے'' گا جب تک دلی میں امن واپس نہ آ جائے۔ یوں دیکھنے میں دہلی خاموش تھا۔ گورنمنٹ نے جو سخت اقدامات کئے ان کی بدولت خون خرابہ بند ہو گیا تھا لیکن گاندھی پچھلے ساڑھے چار مہینوں سے جس امن کے لیے کوشاں تھے وہ ''قبرستان والی خاموشی'' نہیں تھی۔ بلکہ ایسا امن تھا جو دلوں کے پھر سے ملنے کی علامت ہو۔ آخرالذکر طرح کے امن کے آثار نظر نہیں رہے تھے۔ مسلمان شہر میں آزادانہ آنے جانے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ مہاتما کو خبریں پہنچ رہی تھیں کہ مغربی پاکستان کے مہاجرین مقامی مسلمانوں کو ان کی دکانوں اور ان کے مکانوں سے خارج کرنے کے لیے گہری چالیں چل رہے تھے۔ یہ دلیل کہ ہندو اور سکھ بھی پورے مغربی پاکستان میں اسی طرح غیر محفوظ ہیں، انھیں غیر مربوط معلوم ہو رہی تھی۔

اس برت کا پاکستان پر خوش گوار اثر پڑا۔ وہاں اس عیارانہ پروپیگنڈے کا تاروپود بکھر گیا جس میں گاندھی کو ایک دشمن اسلام بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ مغربی پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ

لیڈروں نے ان کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ ہندوستانی جذباتی اعتبار سے ہل اٹھا جس مسئلے کے حل پر انھوں نے اپنی جان کی بازی لگادی تھی اس کے بارے میں لوگ سوچنے پر مجبور ہوئے۔ اس کا احساس تھا کہ کام فی الفور کرنا ہے۔ ایسی کوئی بات جلد کرنا تھی جس سے وہ صورت حال پیدا ہو سکے کہ وہ اپنا برت توڑ دیں۔ ان کے کہنے پر حکومت ہند نے پاکستان کو، خیر سگالی کے جذبے سے پچپن کروڑ روپے (ساڑھے چار کروڑ پونڈ) دیدے یہ رقم پاکستان کو متحدہ ہندوستان کے اثاثے میں پاکستانی حصے کے طور پر واجب الادا تھی لیکن کشمیر کی نزاع کی وجہ سے روک لی گئی تھی۔ 18 جنوری 1948 کو مختلف فرقوں اور پارٹیوں کے نمائندوں نے دلی میں گاندھی کے سامنے اس عہد نامے پر دستخط کیے کہ وہ دلی میں امن امان کے ضامن رہیں گے۔ برت توڑنے سے پہلے گاندھی نے ان سے بھی وہی کہا جو ستمبر 1947 میں وہ کلکتہ میں کہہ چکے تھے کہ اگر وہ لوگ اپنے وعدے پر قائم نہ رہے تو وہ مرن برت رکھ لیں گے۔

برت کے بعد فرقہ وارانہ تشدد میں قطعی طور سے باڑھ کے تارکے آثار نظر آنے لگے۔ گاندھی اپنے کو مستقبل کے لیے نسبتاً زیادہ آزاد محسوس کرنے لگے۔ انھوں نے مغربی پاکستان کے ہر مہاجر سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک ہر خاندان اپنے اصلی شہر یا گاؤں پھر سے نہ بس جائے۔ لیکن انھوں نے سوچا کہ وہ حکومت پاکستان کی اجازت لیے بغیر وہاں نہیں جاسکتے تھے۔ اسی عرصے میں انھیں اپنے آشرم سیوا گرام میں بھی جانے کا خیال ہوا۔ کئی مہینوں سے ان کا تقریباً سارا وقت فرقہ وارانہ مسئلے میں صرف ہو رہا تھا۔ یہ مسئلہ کتنا ہی شدید کیوں نہ رہا ہو لیکن وسیع تر تناظر میں ملک کی ترقی کی راہ میں اس کی حیثیت اس مقصد سے ہٹانے والی بات سے زیادہ نہیں تھی۔ ہندوستان کے اصلی مسائل یعنی لوگوں کی سماجی اور اقتصادی خوش حالی ان کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض مسائل پر وہ اپنی شام کی پرارتھنا سبھائیوں میں بلند آواز سے سوچا بھی کرتے تھے۔ انھوں نے ملک میں غذائی قلت کا سوال اٹھایا۔ انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ ''ہمارے پاس بہت زیادہ زرخیز زمین بھی ہے اور کام کرنے والوں کی بھی بہت بڑی تعداد ہے۔ اگر ہم دونوں کا استعمال کریں تو ہمیں کنٹرولوں کی ضرورت نہ پڑے گی'' کپڑے کے بارے میں انھیں کوئی شبہ نہیں تھا کہ گاؤں میں بسنے والے کروڑوں افراد اپنے گھروں کے اندر

ہی اپنی ضرورت بھر کپڑا اپنے جبری فاضل وقت میں ہی کات اور بن سکتے ہیں۔ وہ آگے کے کاموں کے متعلق سوچ رہے تھے۔ آئین سازی کام جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ ان کے دل میں آزاد ہندوستان کی حکومت میں شامل ہونے یا عملی سیاست میں داخل ہونے کا کوئی خیال بھی نہ تھا۔ لیکن وہ تعمیری کاموں کے لیے راہیں نکالنے کے سلسلے میں اپنا حق ادا کر سکتے تھے۔ دسمبر 1947ء میں انھوں نے تعمیری کام میں مشغول اداروں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس بلائی جو ان کی زیر قیادت قائم ہوئے تھے ان میں سے ہر ایک ایسے ادارے نے اپنے حلقہ (کار میں) ایک کام منتخب کر رکھا تھا۔ مثلاً چھوت چھات کا خاتمہ، بنیادی تعلیم کی توسیع، کھادی اور دیہی صنعتیں، چوں کہ ان سب کا مشترک مقصد غیر متشددانہ نظام کا حصول تھا، اس لیے وہ اس امکان پر بھی غور کر رہے تھے کہ ان تعمیر اداروں کو ملا کر ایک کر دیا جائے۔

سیاسی آزادی تو اب حقیقت بن ہی چکی تھی۔ اس لیے اب گاندھی کا ذہن روز افزوں طریقے پر سماجی اور اقتصادی اصلاحات اور اہنسا کی تکنیک کو نئی جلا دینے کی طرف مائل تھا۔

بہر حال، ان کی قسمت میں نہ تو پاکستان جانا تھا اور نہ تعمیری پروگرام کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنا تھا۔ 20/جنوری کی شام کو پہلی تنبیہ ملی، جب ایک بم اس جگہ سے چند فٹ کی دوری پر پھٹا جہاں وہ برلا ہاؤس میں پرارتھنا سبھا میں تقریر کر رہے تھے۔ اس دھماکے کا انھوں نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ دوسرے دن جب لوگوں نے ان کو بچ جانے پر مبارک بادیں دیں تو انھوں نے کہا کہ میں اس مبارک باد کا تب مستحق بنوں گا۔ ''جب اس دھماکے کے نتیجے میں میں گر کر مر جاؤں اور اس وقت بھی میرے چہرے پر ہنسی کھیلتی رہے اور حملہ آور کے لیے میرے دل میں کوئی بغض و کینہ نہ ہو'' انھوں نے بم پھینکنے والے کو ایک ''بہکا یا ہوا نوجوان'' کہا اور پولیس کو یہ رائے دی کہ وہ اسے پریشان نہ کریں بلکہ اس کو ترغیب و محبت کے ذریعے اپنا ہم خیال بنالیں۔ ایک پنجابی مہاجر مدن لال، جو گرفتار ہوا تھا۔ وہ دراصل اس گروہ کا رکن تھا جس نے گاندھی کو مار ڈالنے کی سازش کی تھی۔ ان زود جس نوجوانوں کو ہندومت کو باہر سے اسلام کا خطرہ نظر آتا تھا اور اندر سے گاندھی کا۔ جب مدن لال کا نشانہ خطا کر گیا تو ان کا سازشی ساتھی اور پونا کا نوجوان صحافی، ناتھورام گوڈسے، دلی آیا۔ جیب میں ایک پستول ڈالے وہ برلا ہاؤس کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ جہاں گاندھی کا قیام تھا

اور جہاں وہ پرارتھنا سبھائیں کیا کرتے تھے۔

مبہم طور پر ایک سازش کا اندیشہ کرتے ہوئے، مقامی حکام نے نگہداشت میں اضافہ کر دیا تھا۔ گاندھی بہرحال، اس کی اجازت دینے پر تیار نہ تھے کہ پولیس پرارتھنا سبھا میں آنے والوں کی تلاشی لے۔ انھوں نے پولیس افسروں سے کہا کہ ''اگر مجھے مرنا ہی ہے تو مجھے پرارتھنا سبھا میں ہی مرنا چاہیے۔ آپ یہ فرض کرنے میں غلطی کر رہے ہیں کہ آپ مجھے گزند پہنچنے سے بچا سکتے ہیں۔ میرا بچانے والا ایشور ہے۔'' 30 جنوری کی شام کو وہ برلا ہاؤس میں واقع اپنے کمرے سے باہر نکل کر پرارتھنا سبھا کے میدان کی طرف چلے وہاں سے صرف دو منٹ کا پیدل راستہ تھا۔ لیکن اس دن سردار پٹیل سے باتیں کرنے کی وجہ سے انھیں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ وہ اپنی پوتیوں، آرا اور منو (جنھیں وہ اپنی چہل قدمی کرنے والی چھڑیاں کہا کرتے تھے) کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ جب وہ پرارتھنا میدان کے قریب آئے تو پانچ سو کے مجمع نے ان کے جانے کا راستہ بنا دیا۔ بہت سے اٹھ کھڑے ہوئے، بعض تعظیماً جھک پڑے۔ انھوں نے کہا کہ انھیں افسوس ہے کہ انھیں آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ پھر انھوں نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ ٹھیک اسی وقت گوڈ سے مجمع کے کنارے آگے بڑھا اور اس طرح جھکا جیسے وہ مہاتما کے قدم چومنا چاہتا ہو اور پھر جیب سے پستول نکال کر جلدی جلدی تین گولیاں لگاتار چلائیں گاندھی فوراً تیورا کے گر پڑے۔ ان کے ہونٹوں پر ''ہے رام'' کے الفاظ تھے۔

یہ عجیب ستم ظریفی کہ اہنسا کے دیوتا کا خاتمہ متشددانہ طور پر ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نفرت کی تاریک قوتیں جیت گئی ہیں لیکن یہ بڑی مہنگی فتح تھی۔ جن گولیوں نے گاندھی کا سینہ چھید ڈالا تھا اس کی گونج کروڑوں دلوں میں سنائی دیتی رہی۔ اس جرم کی شرپسندی سے فرقہ وارانہ جنوں کی حماقت اور بے اثری بجلی کی چمک کی طرح یکا یک آنکھوں کے سامنے ابھر آئی۔ 31 رجنوری 1948 کو جمنا ندی کے کنارے آگ کے جن شعلوں نے مہاتما کے جسم کو جلا کر خاک کیا وہ اس آتش غضبناک کی آخری بھڑک تھی جس نے ہند پاک برصغیر کو اگست 1946 سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ گاندھی زندگی بھر اپنی پوری قوت سے اس آگ سے نبرد آزما رہے۔ ان شعلوں کی پیاس آخر کار ان کی موت ہی نے بجھائی۔

خاتمۂ کلام

جنوبی افریقہ سے واپسی کے پانچ برس کے اندر گاندھی ہندوستان کی عوامی زندگی پر سب سے نمایاں شخصیت بن چکے تھے۔ 1920 تک صف اول کے بیشتر سیاست داں ان کے جھنڈے تلے آ چکے تھے اور جو باقی بچے تھے وہ تقریباً کسی شمار وقطار میں نہیں رہ گئے تھے۔ سیاسی فتح شاذ ہی اتنی زیادہ شاندار اور مکمل ہوئی ہو۔ اس کے بعد کی تین دہائیوں میں، ایسے ادوار بھی آئے جب ان کے مخالفین نے انھیں دغے ہوئے کارتوس کی طرح از کار رفتہ سمجھ لیا تھا لیکن یہ خواہش خیال کی باپ ہے، والا معاملہ تھا۔ گاندھی اپنے منتخب کیے ہوئے لمحے پر پوری دھوم دھام سے واپس آئے اور ان کا اثر ونفوذ کم نہ ہوا۔

ان کی شہاب رفتار ترقی اور باقی رہ جانے والے اثر کا ایک سبب تو وہ گہری چھاپ تھی جو انھوں نے ہندوستانی عوام کے ذہنوں پر ڈالی۔ مہاتما کا عقیدہ عملی مشکلات کا حامل تھا۔ اس سے ان کے دورے ان کے لیے شاید امتحان بن جاتے تھے۔ لیکن اسی سے ان کی نقل وحرکت کے احترام میں فوری کامیابی یا ناکامی کے تصور کا دخل نہیں رہ گیا تھا۔

غیر معمولی طور پر ان کے نمایاں ہونے کے اور بھی اسباب تھے۔ جنوبی افریقہ کی جدوجہد نے انھیں پختہ کار بنا دیا تھا۔ انگلستان میں ایک طالب علم اور ہندوستان میں ایک وکیل کی حیثیت سے اعتماد نفس کی جو کمی ان کا تعاقب کر رہی تھی وہ اس منزل سے بہت آگے نکل آئے تھے اور ان

میں زبردست اعتماد نفس کے ساتھ ایسی کسرنفسی آ گئی تھی جو لوگوں کو سپر انداختہ کر دیتی تھی۔ جن لوگوں پر ان کی شخصیت کا جادو چل گیا تھا اور جس سے ان لوگوں کی زندگیوں کا تانا بانا ہی بدل گیا تھا ان میں بے انتہا متبائن طبائع اور صلاحیتوں کے مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ سی آر داس اور موتی لال نہرو کی طرح کے زبردست وکیل اور ماہر پارلیمانی من موہن مالویہ اور راجیندر پرشاد کی طرح کے انسان دوست، ولبھ بھائی پٹیل اور راج گوپال اچاری کی طرح کے حقیقت پسند، جواہر لال نہرو اور جے پرکاش نرائن کی طرح کے عینیت پسند، ان لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ انتہائی تکنیک ہی اس تقریربازی اور بم انگنی کا واحد عملی متبادل ہے۔ جن کے مابین اس وقت کی ہندوستانی سیاست غیر موثر طور پر گردش کر رہی تھی۔ ان لوگوں نے ذاتی آرام اور پیشہ ورانہ حوصلوں کو خیر باد کہہ کے اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ ریلوے ٹرینوں یا برطانوی جیلوں میں بسر کیا۔ ان لوگوں نے سیاست اور اقتصادیات کے بارے میں ان کے تمام خیالات کو قبول نہیں کیا، کم ہی لوگ ان کے مذہبی تصورات سے ہم آہنگ تھے، لیکن یہ سبھی ان سے ایک گہرے جذباتی رشتے سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ صرف ایک لیڈر نہیں تھے بلکہ ''باپو'' تھے ایسے باپ جو محبت اور عزت کے مستحق تھے۔ عوام میں بے انتہا مقبول ہونے اور کانگریسی لیڈروں سے ایک تعلق خاص کی بنا پر گاندھی چوتھائی صدی تک اپنی ذات سے ہندوستانی قوم پروری کے بنیادی اتحاد کی علامت اور قومی تحریکوں میں گروہ بندیوں کا جو تباہ کن رجحان ہے اس سیک بچاؤ کے لیے حفظ ماتقدم کی دیوار بنے رہے۔ دوسری سیاسی جماعتوں سے، وہ افتراق کے نقطوں سے زیادہ اتصال کے نقطوں پر زور دیتے اور اپنے مخالفین کا نہ تو وہ مذاق اڑاتے اور نہ ان کو برا بھلا کہتے۔ تین لبرل لیڈروں، تیج بہادر سپرد، ایم، آر، جیلر اور شری نواس شاستری سے وہ اکثر خط و کتابت کرتے، ان کے ساتھ بلند آواز میں سوچتے اور ان کی بے لاگ رائیں طلب کرتے۔ انھوں نے شری نواس شاستری کو لکھا کہ ''میرے لیے آپ کے تعاون سے زیادہ آپ کی راست گفتاری اہم ہے۔'' اگر مسلم لیگ کے لیڈروں سے اس طرح کے تعلقات قائم نہ ہو پائے تو اس کا سبب کوشش کا فقدان نہیں تھا۔

گاندھی کی نگاہ میں ہندوستان کی تحریک آزادی کی معنوی اہمیت حقیقتاً اسی بات میں تھی کہ یہ انتہائی ڈھنگ سے لڑی گئی۔ اگر کانگریس نے ستیہ گرہ کو اپنا نہ لیا ہوتا اور اہنسا کو قبول نہ کر لیا ہوتا تو

وہ اس میں کوئی دل چسپی ہی نہ لیتے۔ ان کو تشدد پر صرف اسی وجہ سے اعتراض نہیں تھا کہ مسلح بغاوت میں ایک غیر مسلح قوم کے لیے کامیابی کے امکانات گویا نہیں تھے بلکہ اس لیے بھی تھا کہ وہ تشدد کو ایک بھونڈا ہتھیار سمجھتے تھے کیوں کہ یہ جتنے مسئلے حل کرتا اس سے کہیں زیادہ پیدا کرتا اور اپنے پیچھے نفرت اور تلخی کے ایسے آثار چھوڑ جاتا جن کی موجودگی میں واقعی تصفیہ تقریباً ناممکن ہو جاتا۔

عدم تشدد پر زور دینا گاندھی کے ہندوستانی ناقدوں پر بھی بار تھا اور برطانوی معترضین پر بھی اگرچہ دونوں کے وجوہ مختلف تھے۔ برطانوی ناقدوں کی نگاہ میں عدم تشدد ایک نمایشی فریب تھا اور ہندستانیوں کی نظر میں یہ بڑی جذبات پرستی تھی۔ اہل برطانیہ جو ہندوستانی جدوجہد کو یورپین تاریخ کی عینک سے دیکھتے۔ انھیں اہنسا کے دعوے اتنے اچھے لگتے کہ سچ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کی آنکھیں گاندھی کی تحریکوں کی پرامن نوعیت کے مقابلے میں تشدد کے اکّا دکّا واقعات پر زیادہ جمی رہتیں۔ ریڈکل (انتہا پسند) ہندوستان سیاستدانوں کے نزدیک جو فرانسیسی اور روسی انقلابوں یا اطالوی اور آئرش (آئرلینڈ سے متعلق) قوم پروری کی تاریخ کا بغور مطالعہ کر چکے تھے۔ یہ بات بالکل عیاں تھی کہ طاقت صرف طاقت سے جھک گی۔ وہ اسے عماقت سمجھتے تھے کہ مواقع کو ہاتھ سے جانے دیا جائے اور مصافیاتی فوائد کی قربانی ایسے اسباب کی بنا پر دی جائے جن کا تعلق سیاست کے مقابلے میں اخلاقیات سے زیادہ ہو۔

گاندھی کے معترضیں میں یہ رجحان بہت زیادہ تھا کہ اہنسائی تحریکوں کو ایسے پیمانوں سے ناپیں جو ہنسائی جنگوں کے لیے بنائے گئے تھے۔ ستیہ گرہ اس لیے وضع نہیں کی گئی تھی کہ کوئی خاص مقصد، بزور حاصل، کیا جائے یا مخالف کو، کچل، دیا جائے بلکہ اس کا مقصد ایسی قوتوں کو حرکت میں لانا تھا جس سے دل بدل جائیں۔ ایسی حکمت عملی میں بالکل ممکن تھا کہ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہار کے بڑی لڑائی جیت لی جائے۔ درحقیقت، فتح یا شکست سے تحریک ستیہ گرہ کے مقصد کی صرف با مکمل تعبیر کی جا سکتی ہے۔ اس کا مقصد ایسا امن تھا جو فریقین کے لیے باعزت ہو۔

اس طرح گاندھی کی قیادت میں لڑائی جانے ولی ہندوستان کی جنگ آزادی اخلاقی یا دوسرے معنوں میں، نفسیاتی محاذ پر لڑی جا رہی تھی۔ انھوں نے جنوری 1920ء میں لکھا تھا کہ ”بدترین قسم کے مخالف ماحول میں بھی میں نے انگریزوں کو دلیل اور براہین کے قبول کرنے کا اہل

پایااور چونکہ وہ اپنے کو ہمیشہ منصف مزاج ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔اس لیے دوسروں کو صحیح بات کرنے پرآمادہ کرنے کے مقابلے میں انھیں (انگریزوں کو) شرم دلانا آسان ہے۔تبدیلی خیال دورخی تھی۔ ہندوستانیوں کے دل بدلنے کی ضرورت بھی، انگریزوں کے دل بدلنے سے کم نہیں تھی۔ گاندھی نے ہندوستان میں انگریزی راج کے خلاف بہت سخت باتیں کہی لیکن انھوں نے اس سے کہیں زیادہ سخت باتیں ان خرابیوں کے خلاف بھی کہیں جو ہندوستانی سماج کو تقسیم کیے ہوئے تھیں اوراندر ہی اندر کھوکھلا کر رہی تھیں۔

1947 میں خواہشات کے حصول کا آخری نقطہ طاقت کی منتقلی، بہت سے قومی اور بین الاقوامی عناصر کے عمل وردعمل کا نتیجہ تھا۔لیکن اس میں شک نہیں کہ برطانیہ کے اخراج کے وقت کا تعین اورطریقہ کار گاندھی کے ان اقوال واعمال سے متاثر ہوا تھا جوگاندھی جوتہائی صدی سے کہتے اورکرتے چلے آئے تھے۔اگرہم ماضی کا جائزہ لیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ 22۔1920۔ 32۔1930 اور 42۔1940 کی بڑی بڑی ستیہ گرہی تحریکوں کے مابین اتنا کافی وقفہ دیا گیا تھا کہ برطانیہ ازسرنوغورکرسکے اورگاندھی کے حسب منشا برطانوی ضمیر میں تبدیلی پیدا ہوسکے۔ یہاں یہ یادرکھنا اچھا ہوگا کہ اگست 1947 میں صرف ہندستانیوں نے ہی یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کی پشت سے ایک بوجھ گر پڑا بلکہ ہندستان میں موجود برطانوی لوگوں نے بھی پہلی بارخودکوآزاد محسوس کیا۔

اگرچہ دنیا کی نظروں میں ہندستان کی سیاسی آزادی میں گاندھی کا کردار ہی ناگزیر طور پرسب سے نمایاں رہا لیکن گاندھی کی زندگی کے خاص سوتے سیاست سے نہیں مذہب سے پھوٹتے تھے۔ انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ میں جوکچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں یا اس تیس برس کی مدت میں جوکچھ حاصل کرنے کی کوشش اورخواہش کرتا رہا ہوں وہ خدا کا روبرو دیدار اورموکش (نجات) کا حصول ہے۔اسی منزل مقصود کی تلاش میں لگا رہتا ہوں، نقل وحرکت کرتا ہوں اوراپنا سارا وجود اسی کے لیے وقف رکھتا ہوں۔ ان کی سرگرم ترین کوششیں روحانی تھیں۔ان کو ایک سیاسی وفد میں دیکھ کرسکریٹری آف اسٹیٹ مانٹیگو نے کہا تھا کہ '' آپ تو ایک سماجی مصلح ہیں۔آپ اس مجمع میں کہاں آگئے؟''

گاندھی نے وضاحت کی کہ سیاست میں حصہ لینا بھی ان کے سماجی کاموں کا ایک توسیعی جز و ہے۔ ''میں جب تک اپنے کو ساری نسانیت سے پوری طرح وابستہ نہ کرلوں، میں مذہبی زندگی نہیں بسر کرسکتا یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک میں سیاست میں حصہ نے لوں۔ آج انسانی زندگی کا پورا محیط ایک ناقابل تقسیم کل ہے۔ آپ سماجی، اقتصادی اور خالص مذہبی کام کو ایسے خانوں میں نہیں بانٹ سکتے جن میں پانی بھی نہ رس سکے''۔ انھوں نے کہا کہ ان کی نظر میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہوتا جو انسانی اعمال سے علاحدہ رہے۔ روحانی قانون خود اپنے کسی دائرہ کار میں کام نہیں کرتا بلکہ زندگی کے عام اعمال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ سچے مذہبی ہونے کے لیے کسی کو ہمالیہ جا کر ترک دنیا نہیں کرنا ہے اور نہ گھر اور فرقے کی حفاظت گاہ میں سمٹ جانا ہے۔

بہرحال، سیاست اور مذہب، ریاستی کاروبار اور اخلاقیات اتنے دنوں تک الگ الگ رہے ہیں کہ صاف اذہان ان دونوں کو مخلوط کرنے سے بھڑ کتے ہیں۔ سچائی، امور خیر اور محبت ایسی صفات سمجھی جاتی ہیں جن کا اطلاق صرف گھریلو اور سماجی دائرہ کار پر سمجھا جاتا ہے۔ سیاست میں مصالحت ہی سب سے بڑی قوت متحرکہ ہے۔ گاندھی کی پوری عملی زندگی اس دوہری اخلاقیات کے خلاف احتجاج تھی۔ انھوں نے متبرک اور سیکولر کو علاحدہ نہیں کیا۔ سیاست سے ان کی دلچسپی کا منبع یہ حقیقت تھی کہ انھوں نے ایک نئی تکنیک۔ ستیہ گرہ۔ کی تشکیل کی تھی۔ جس کا مقصد سیاست میں مذہب کی روح کو شامل کرنا تھا۔ مغربی مبصرین اکثر یہ سوال کیا کرتے تھے کہ گاندھی سنت سادھو ہیں یا سیاست داں۔ وہ ایسے سنت تھے جو سیاسیات میں داخل ہونے کے بعد بھی سنت بنے رہے۔

خود گاندھی سنت کے خطاب کو اتنا متبرک جانتے تھے کہ وہ اپنے کو اس کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ وہ تو ''ایک ناچیز جویائے حق'' تھے جس کو ''اس عظیم الشان نور کی صرف ایک دھندلی سی چمک'' دکھائی دی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ چند ابدی اطوار زندگی کے بارے میں تجربات کر رہے تھے لیکن وہ اپنے کو ایک سماجی سائنس داں بھی نہیں کہہ سکتے تھے کیوں کہ جو طریقے وہ استعمال کر رہے تھے ان کی سائنسی صحت کا وہ کوئی ایسا بین ثبوت پیش نہیں کر سکتے تھے جو موجودہ سائنس کا مطالبہ تھا۔ وہ یہ بھی دعویٰ نہیں کرتے تھے کہ ان سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ اور جب وہ اندھیرے میں راہ ٹٹول رہے ہوتے تو ساری دنیا میں اس کا اعلان کر دیتے تھے۔ اگر وہ اپنے بارے میں یہ کہتے یا سوچتے

تھے کہ وہ گویا خدا کا آلۂ کار ہیں تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایسے منتخب آلۂ کار ہیں جن پر مرضی خدا کا الہامی نزول ہوتا ہے۔ ان کا قول تھا کہ ''یہ میرا پختہ اعتقاد ہے کہ خدا اپنے کو ہر انسان پر الہامی طور سے ظاہر کرتا ہے۔ لیکن ہم اپنے اندر کی خاموش مختصر سی آواز کے لیے کان بند کر لیتے ہیں۔'' جب کسی نے انھیں کرشن مہاراج کا اوتار کہا تو اسے انھوں نے توہین مذہب قرار دیا۔ جب ان کے پرستاروں کی عقیدت عقل عامہ کی حدوں کو پار کر جاتی تو وہ انھیں اکثر روکا کرتے۔ ان کے دوروں کے درمیان ایک بار ایک گانو کے باشندوں نے ان سے کہا کہ ان کی موجودگی کی برکت سے ایک کنواں اعجاز نما انداز میں پانی سے بھر گیا۔ انھوں نے تنبیہ کی ''تم سب بے وقوف ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک اتفاقی بات تھی۔ خدا پر جتنا تمہارا اثر ہے، میرا اثر اس سے زیادہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ جس وقت کھجور کا درخت زمین پر گرنے لگتا ہے اس وقت اس پر ایک کوّا آ بیٹھتا ہے تو کیا تمہارے ذہنوں میں یہ خیال آئے گا کہ کوّے کے وزن سے درخت گر پڑا؟

ان کا انکسار، ان کی اکتسابی صفت نہیں تھی بلکہ اس کا سرچشمہ ضبط نفس کی وہ لگاتار جد وجہد تھی جو وہ اپنے بچپن سے اپنے آخری وقت تک کرتے رہے۔ ان کے سکریٹری مہادیو دیسائی نے لکھا ہے کہ ''ان نظروں میں (دل کے) اندر بیٹھے ہوئے مخالف سے نبرد آزمائی باہر کے مخالف کے خلاف زور آمائی سے زیادہ شدید تھی۔'' انھوں نے اپنی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے کہ میں اوسط درجے کا آدمی ہوں جس کی صلاحیتیں بھی اوسط درجے کی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں ''اسے تسلیم کرتا ہوں کہ میں ذہنی اعتبار سے بہت زیادہ تیز نہیں ہوں۔ لیکن میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ ذہن کی ترقی ایک حد ہے لیکن دل کی ترقی کی کوئی حد نہیں ہے۔'' یہ تاثر ناگزیر ہے صرف ذہنی تیزی کے مقابلے میں دل کی برتری کا اظہار کر کے گاندھی نے خود اپنی ذہنی صلاحیتوں کو اوسطیت کا تصور پیدا کرنا چاہا۔ انھوں نے کتابی علم حاصل کرنے کی زیادہ فکر نہیں کی۔ لیکن وقتاً فوقتاً جیلوں میں اسیری کے دوران وہ کتب بینی کی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے اور جو کچھ پڑھتے اس کا اچھا استعمال کرتے۔ ان کی خود نوشت سوانح اور جنوبی افریقہ کی ستیہ گرہ کی تاریخ ان کی اچھی قوت حافظہ کے ثبوت ہیں۔ اور ان کے رفقا اور مخالفین دونوں ہی ان کی ذہنی درّاکی کی گواہی دیتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود، یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر وجدان کا سہارا اور رہنمائی حاصل نہ ہوتو ان کی نظر

میں استدلال ایک مخصوص نقطے کے آگے بہت ہی ناتواں رہنما ثابت ہوتا ہے۔ جس حقیقت کی انھیں تلاش تھی وہ جامد نہیں بلکہ متحرک وجود رکھتی تھی۔ اس کے رنگا رنگ پہلوؤں کی نقاب کشائی کا سلسلہ برابر جاری رہتا اور کبھی ختم نہ ہوتا تھا۔ جب ان پر تناقض کا الزام لگایا جاتا تو وہ جواب دیتے کہ ان کی مستقل مزاجی کا تعلق سچائی سے ہے، ماضی سے نہیں۔ نئے نئے تجربات کی روشنی میں وہ اپنے خیالات کی ترمیم، توسیع اور تصحیح کرتے رہتے۔ ان کی روزانہ کی دعاؤں میں بھی ایک ارتقائی عمل دیکھا جاسکتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں انھوں نے ہندوؤں اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ کے پاتھ سے ابتدا کی۔ اس کے بعد ''زنداوستا'' قرآن کریم، اور بدھ مت اور جاپانیوں کے صحیفوں سے بھی اجزا شامل کر لیے۔ مرنے سے چند گھنٹے پہلے انھوں نے بنگلہ کی آخری مشق لکھی۔ بنگلہ زبان انھوں نے ایک سال پہلے پڑھنا شروع کی تھی تا کہ وہ زیادہ موثر طریقے سے فساد زدہ بنگال کی خدمت کرسکیں۔ مرتے دم تک انھوں نے طالب علمانہ ولولہ اور انکسار باقی رکھا۔

چوں کہ وہ ہر موضوع کی مسلسل توضیح و تکمیل کرتے رہتے تھے۔ اس لیے یہ آسان تھا کہ ذات پات، مشین یا کھادی وغیرہ کے بارے میں ان کے پہلے کے بیانات پیش کر کے ان میں تناقض کی نشان دہی کی جاسکے۔ جس بے درد پبلسٹی کی چکاچوند پیدا کرنے والی روشنی میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے اس میں ان کی ہر نقل و حرکت اور ان کا ایک ایک لفظ عوامی ملکیت بن جاتا تھا، لیکن اگر کوئی غیر شریفانہ خیال خواب میں بھی ان کے ذہن پر رواں دواں گزرتا تو وہ بخوشی ساری دنیا کو بتا کے شریک بنا لیتے۔ ٹالسٹائے کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ خود ان کے بارے میں بھی اتنا ہی سچ ہے۔ ''ٹالسٹائے کے نام نہاد تناقضات ترقی اور سچائی سے اس کی دِلی محبت کی علامت تھے۔ اس کے خیالات اکثر متبائن و متناقض معلوم ہوتے تھے کیوں کہ وہ برابر اپنے وضعی اصولوں سے آگے قدم بڑھاتا جاتا تھا۔ اس کی ناکامیاں عام ہو جاتیں اور اس کی جدوجہد اور کامیابیاں اس کی ذات کے اندر ہی رہ جاتیں۔

رابندناتھ ٹیگور نے ایک بار گاندھی کو نہایت ہی موزوں انداز میں ''انسانوں کا عاشق نہ کہ خیالات کا'' بتایا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے تمام مسائل کو روحانی الجبرا (جبر و مقابلہ) میں ڈھال لینا پسند کرتے تھے، لیکن گاندھی اپنی راتیں دوسروں کے حلق میں ٹھونستے نہیں تھے۔ انھوں نے متنبہ

کیا تھا کہ ''کسی بات کو آسمانی کتاب کی سی سچائی نہ مان لیا کرو چاہے وہ کسی مہاتما ہی کے منہ سے نکلتی ہو۔ پہلے سیاسی صحیفے، ''ہندسوراج'' میں انھوں نے جدید تہذیب پر اور اس کے تمام لوازمات۔ اسکول، ریلوے اور اسپتالوں، پر بے رحمی سے وار کیے تھے۔ لیکن نہ تو انھوں نے اپنے چیلوں پر یہ فلسفہ لادنے کی کوشش کی اور نہ انھیں اپنی طرح لنگوٹی پہننے پر مجبور کیا۔ اگا تھا ہیرسن نے لکھا ہے کہ وہ ان کو چائے نوشی کے خلاف لکچر دیا کرتے تھے لیکن جب وہ گاندھی کے دوروں پر ان کے ساتھ ہوتیں تو انھیں پابندی سے چار بجے شام کو چائے مل جایا کرتی تھی۔ ہندوستان اور بدیشوں کے ہزاروں افراد جو ان سے ملے یا خط و کتابت کی وہ محبت و اخلاق کے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات کی یادیں اپنے سینوں سے لگائے ہوئے رہے۔ ان اخلاقی وظائف کو وہ (گاندھی) بے انتہا مشغول رہنے کے باوجود کبھی نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ ان کی دلی تمنا یہی تھی کہ وہ ''کم ترین، پست ترین اور گم کردہ'' لوگوں میں گھل مل کر ایک ہو جائیں۔ وہ نہاتے وقت صابن کی جگہ پتھر استعمال کرتے، کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر پنسل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے جنھیں وہ بہ مشکل اپنی انگلیوں سے پکڑ پاتے، خطوط لکھا کرتے، ایک دیہاتی بے ڈھنگے سے استرے سے داڑھی بناتے اور ایک قیدی کے پیالے کے لکڑی کے چمچے سے کھانا کھاتے ممکن ہے کہ اس سادگی پسندگی سے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہو لیکن دراصل یہ ساری سخت کوشی ان ہندستانی عوام سے جذباتی ہم آہنگی کا ایک وسیلہ تھی جن کی غریبی اور مصائب ان کے دل و دماغ پر چھائے رہتے تھے۔ یہی ان کے تمام سیاسی، سماجی اور اقتصادی کاموں کی قوت محرکہ تھے اور انھیں کے بدولت عوام کے دلوں پر ان کی غیر معمولی حکمرانی تھی۔ اور کبھی کبھی یہی ان کے اور شہروں میں پلے ہوئے ہندوستانی دانش وروں کے درمیان دیوار بھی کھڑی کر دیتے تھے۔

ترک لذات سے گاندھی کی شخصیت میں درشتی پیدا نہیں ہوئی تھی اور وہ رنگ میں بھنگ کرنے والوں میں نہ تھے۔ ان میں بچوں کی سی خوش طبعی تھی۔ ان کے ہر ملاقاتی کو یہ امید ہوتی تھی کہ اسے دو ایک مزاحیہ فقرے تحفۂ ضرور ملیں گے۔ ان کی ایک خاتون ملاقاتی نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ اعصابی تکلیف میں مبتلا ہیں؟ گاندھی نے فوراً جواب دیا کہ مسز گاندھی سے پوچھیے۔ وہ آپ کو بتائیں گی کہ میں دنیا بھر سے تو بہترین برتاؤ کرتا ہوں لیکن ان سے نہیں

مسز ماٹلس نے بات بڑھاتے ہوئے کہا ''میرا شوہر تو مجھ سے بہترین برتاؤ کرتا ہے۔'' گاندھی نے جواب دیا کہ ''تب مجھے یقین ہے کہ مسٹر ماٹلس نے آپ کو بھاری رشوت دی ہے۔'' یہ پوچھے جانے پر کہ آپ شراب پینے والوں کے حق میں اتنے سخت گیر کیوں ہیں۔ گاندھی نے جواب دیا کیوں کہ میں ان لوگوں کے لیے نیک جذبات رکھتا ہوں جن کو اس عذاب کا بھگتان بھگتنا پڑتا ہے۔'' انھوں نے ایک جہاز راں سے پوچھا کہ ''میرے چارلڑکے ہیں۔ اس لیے میں آدھے فاصلے تک تو آپ کے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کرسکتا ہوں۔'' وہ ایسی صورت حال سے بھی خوش مزاجی کا پہلو نکال لیتے تھے۔ جس میں اس کی کوئی گنجائش نہ ہوتی تھی۔ جب ستمبر 1932ء میں ان کے پونا والے برت کے زمانے میں بردوا جیل میں ہندو لیڈر جمع ہوئے تو وہ میز کے بیچ میں بیٹھ کر بولے کہ ''میں صدارت کررہا ہوں۔''

انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اس بنیادی مسئلے کے لیے وقف کردیا تھا کہ انسانی تعلقات کے سلسلے میں اہنسا کی تکمیل وتوسیع کیسے کی جائے کئی موقعوں پر انھیں یورپ امریکہ میں دورے کی دعوت دی گئی لیکن یہ دعوتیں قبول نہ کیں کیوں کہ انھیں یہ بات بے تکی لگتی تھی کہ خود اپنے وطن میں اس کا کامیاب تجربہ کیے بغیر باہر کے ملکوں میں جاکر اس کی تبلیغ کی جائے اور جب آخرکار برطانیہ نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ہند، برطانوی تعلقات کو مساوات کی بنیادوں پر گاندھی کی تمناؤں کے مطابق بدل دے گا اور ایک بے خون خرابے کا انقلاب تشکیل پزیر ہوتا نظر آیا تو گاندھی فرقہ وارانہ جنون اور خون خرابے کو دور کرنے کے چکر میں پھنس گئے۔ اتحاد قومی کے تانے بانے کو جس کی آرزو میں انھوں نے زندگی گزاری تھی۔ گاندھی نے اپنی آنکھوں کے سامنے منتشر ہوتے دیکھا۔ جب وہ تشدد کی طاقتوں کو امن کی راہیں دکھا رہے تھے اس وقت بھی ناکامی کا تصور ان کے ذہن کا تعاقب کررہا تھا۔ ان کی ہر دل عزیزی کم نہیں ہوتی تھی۔ ان کو قوم کا باپو کہا جاتا تھا۔ حکومت کے سربراہ ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے درشنوں کے لیے جم غفیر جمع ہوتا اور ''گاندھی جی کی جے'' کے نعرے لگاتا رہا۔ یہ الفاظ ہمیشہ گاندھی کے کانوں ناگوار لگتے تھے۔ لیکن اب تو یہ دل کے آرپار ہوجاتے، کیوں کہ جب ہندوستان کے بڑے بڑے حصوں میں تشدد اور خوف کا دور دورہ ہو تو یہ ان کی جیت کیسے ہوسکتی تھی۔ اس المیے کے بہت سے اسباب تھے۔ ان میں بعض کی جڑیں حالیہ

ہندوستانی تاریخ میں اور بعض کی اس ملی جلی سیاسی و مذہبی تحریک میں پیوست تھیں جس نے عارضی طور پر لوگوں کے دماغوں میں خلل پیدا کر دیا تھا۔ گاندھی اتنے لمبے عرصے تک زندہ رہے کہ انھوں نے اپنے طریق کار کی دو نمایاں کامیابیاں دیکھ لیں۔ ان کے برت نے کلکتہ اور دلی کو اتنا شرمسار کیا کہ وہاں کے لوگ پرامن ہو گئے اور ان کی موت سے وہ مقصد حاصل ہو گیا جس کے لیے وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کوشاں تھے۔ یعنی یہ ہر برصغیر ہندو پاکستان میں معقولیت پسندی عود کر آئے۔

بہر حال گاندھی کی نگاہوں میں اہنسا کی معقولیت وصحت ان کی کامیابی یا ناکامی سے بے نیاز تھی۔ انھوں نے ''ہندسوراج'' میں مغربی مادیت اور فوج گردی پر اعتراضات پہلی عالمی جنگ سے پانچ سال پہلے اس وقت کیے تھے جب یورپ طاقت اور وقار کے عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ پچاس سال پہلے یہ اعتراضات شیخ چلی کے اعتراضات معلوم ہوتے لیکن آج جب کہ دنیا ایک تیسری عالمی جنگ کے کنارے کھڑی تھر تھر کانپ رہی ہے، یہ الہامی معلوم ہوتے ہیں۔ اخلاقی اقدار کو قربان کر کے مادی ترقی کے حصول کو ٹھکرا کر اور تشدد سے نا قابل استرداد طریقے پر کنارہ کش ہو کر گاندھی نے بیک وقت بیسویں صدی کی دو سر برآوردہ نظریات کمیونزم (اشتمالیت) اور سرمایہ داری (کیپٹلزم) سے براہ راست ٹکر لے لی۔ انھوں نے ایسے سماج کی پیش بینی کی اور اس کے لیے کوشاں رہے جو سماج کی لازمی ضروریات کو پورا کرے گا۔ (اس سے زیادہ نہیں) جس کے اقتصادی اور سیاسی ڈھانچے کی لامرکزیت سے نہ تو اندرونی استحصال کو تحریک مل پائے گی اور نہ بیرونی تصادم کو۔ ان کا یقین تھا کہ اسی طرح کے سماج میں موجودہ ریاست کی طرح کے جابرانہ آلات کی حاجت نہ ہوگی اور جو نہ صرف امن وامان قائم رکھنے کے لیے بلکہ بیرونی جارحیت سے بچاؤ کے لیے بھی اہنسا کی تکنیک کا سہارا لے گا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ گاندھی کا یہ خواب کبھی پورا بھی ہو سکے گا۔ افراد کی طرح افراد بھی گھسے پٹے راستوں پر چلنے پر مائل ہو جایا کرتے ہیں، چاہے آخر میں راستہ بند ہی کیوں نہ ملے۔ اپنے اہنسا کے خواب کو حقیقت کی دنیا میں بدلنے کی دشواریوں سے گاندھی واقف تھے۔ لیکن وہ جن کو بنیادی عقیدہ سمجھتے تھے اس پر مصالحت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ آخر وقت تک وہ اسی بات پر زور

دیتے رہے کہ اچھے نتائج بھی مشکوک وسائل کا جواز نہیں ہو سکتے وہ یہ بھی کہتے رہے کہ ہمارے اصلی دشمن خود ہمارے خوف، لالچ اور خود بینی ہیں۔ دوسروں کو بدلنے سے پہلے ہمیں خود کو بدلنا ہوگا، خاندان میں سچائی، محبت اور کارخیر کے قوانین کا اطلاق گروہوں، سماجوں اور قوموں پر بھی ہوتا ہے۔سب سے بڑھ کر یہ کہا۔اہنسا کا قانون نوع انسانی کا قانون ہے۔بالکل اسی طرح جیسے تشدد وحشیوں کا قانون ہے۔جن لوگوں کے ہاتھوں میں ملکوں کی قسمیں ہیں۔ممکن ہے انھیں یہ سب باتیں مرغوب تو معلوم ہوں لیکن بہت دور کا معیار نظر آئیں۔پھر بھی اس تھرمونیوکلیائی دور میں اگر تہذیب کو تلّے تلّے اور پگھلی ہوئی دھات کی شکل میں منتشر ہو کر نہیں رہ جانا ہے تو گاندھی کے دلائل کی ایک فوری ضرورت وموزونیت آج بھی ہے۔

مختصر فرہنگ

آشرم : کنج عزت: مشترکہ سماجی رہائش گاہ
اندولن : تحریک: اجتماعی تحریک
باپو : بابائے قوم، گاندھی جی
برہم چریہ : پرہیزگاری یا تجرد جو تلاش حق کے لیے وقف ہو۔
پاٹھ : ورد، تلاوت، پڑھنا
ترک موالات : دیکھیے عدم تعاون
تعلقہ دار : ہندوستان میں برطانوی راج میں قائم کیا گیا طبقہ جس کو مال گزاری وصول کرنے کا موروثی حق دیا گیا تھا۔
تھرمونیوکلیائی : برقیاتی وایٹمی توانائی سے متعلق
تنبیہ : چیتاونی، پیش آگاہی
درشن : دیدار، زیارت، کسی قابل عزت شخصیت یا دیوتا کی
دھرم : فرض (علی العموم مذہب کے معنوں میں مستعمل ہے)
سادھنا : ریاض
سادھو : دنیا سے کنارہ کش، تارک لذات، درویش
ستیہ گرہ یا ستیاگرہ : سچ پر قائم رہنا، سچ کی قوت یا روح کی قوت پر مبنی تحریک
سردودَے : ہمہ گیر خیر، عام انسانی بہبودی
سُوراج یا سوراج : اپنا راج (آزادی)

سنیاسی : تارک دنیا

عدم تعاون : ترک موالات، حکومت سے ہر طرح کا تعاون کرنے سے انکار کر دینا

کھادی : ہاتھ کا کتا اور بنا ہوا کپڑا

گاندھی واد : گاندھی ازم، گاندھیت

گرو : استاد، سالک، پیر

مقاومت مجہول : مظالم برداشت کر کے اہنسائی طریقے پر مقابلہ کرنا

مہاتما : (لغوی معنی) عظیم روح، مجازاً بڑا سنت، گاندھی جی کو بھی مہاتما کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

موکش : نجات

ویشنو : وشنومت کا ماننے والا

ہری جن : (لغوی معنی) خدا کا بچہ۔ یہ لفظ گاندھی جی نے ان لوگوں کے لیے وضع کیا تھا جنھیں اچھوت کہا جاتا ہے۔

ہڑتال : احتجاج کے طور پر یا سوگ میں کاروبار بند کر دینا

ہنسا : تشدد

منتخب کتابیات

(1) آرین پاتھ: ''ہندسوراج'' کا خصوصی شمارہ، تھیاسوفی کمپنی بمبئی، ستمبر 1931

(2) البیرونی، اے، اِچ: میکرس آف پاکستان (بانیان پاکستان)

(3) الگزینڈر، اچ، سی: دی انڈین فرمنٹ (ہندوستانی ہیجان) ولیم اینڈ نارگیٹ، لندن، 1929: انڈیا سنس کرپس (کرپس کے بعد کا ہندوستان) پنگوئین لندن، 1944

(4) امبیڈکر، بی، آر: راناڈے، گاندھی اینڈ جناح، تھیکر اینڈ کمپنی، بمبئی 1943، وہاٹ کانگریس اینڈ گاندھی ہیوڈن فاردی اَن ٹچ ایبلس (کانگریس اور گاندھی نے اچھوتوں کے لیے کیا گیا) تھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ، بمبئی، 1945

(5) اِلون، وی او ون سلو، جے: دی ڈاوَن آف انڈین فریڈم (آزادیِ ہند کا طلوع) ایلن اینڈ اَن ون، لندن، 1931

(6) ''انڈین اوپی نین'' گولڈن نمبر: 14-1906 (جنوبی افریقہ میں تحریک مقاومت مجہول، 14-1906)، فونکس، ناٹال، 1914

(7) اینڈریوز، سی، ایف: مہاتما گاندھیز آئیڈیاز (مہاتما گاندھی کے خیالات) ایلن اینڈ اَن وِن، لندن، 1929، مہاتما گاندھی، ہرزاون اسٹوری (مہاتما گاندھی: خود ان کی کہانی) ایلن اینڈ اَن وِن، 1930 مہاتما گاندھی ایٹ ورک (مہاتما گاندھی، مشغول عمل) ایلن اینڈ اَن وِن، لندن، 1931

(8) اینڈریوز، سی، ایف اور مکرجی، گرجا: وی رائز اینڈ گروتھ آف کانگریس (کانگریس کا عروج وترقی) ایلن اینڈ اَن وِن، لندن، 1938

(9) براک وے، فینراے: وی اینڈین کرائی سیس (ہندوستانی بحران)، وکٹر گولینز لندن،

1930
(10) برلا، جی، ڈی: ان دی شیڈو آف دی مہاتما (مہاتما کے زیر سایہ) اور ینٹ لانگ مین لمیٹڈ، انڈیا، 1903
(11) برنس، اے: کلر پرے جوڈس (رنگ کا تعصب) ایلن اینڈ ان، ون، لندن، 1948
(12) برنیز، راپرٹ: نے کڈ فکیر (برہنہ فقیر: وکٹر گولنز، لندن، 1931
(13) بریکس فورڈ، اِچ۔ان: ربل انڈیا (باغی ہندوستان) وکٹر گولنز، لندن، 1931
(14) بولیتھو، ہکٹر: جناح، جان مرے، لندن، 1954
(15) بولٹن، گلوانی: دی ٹریجڈی آف گاندھی (گاندھی کا المیہ) ،ایلن اینڈ اَن، ون، لندن، 1924
(16) بوس، نرمل کمار اسٹڈیز اِن گاندھی زم
(گاندھی واد کے مطالعات) انڈین ایسوسی ایٹڈ پبلشنگ کمپنی، کلکتہ، 1947
(17) بوس، سبھاش چندر: دی انڈین اِسٹرگل
(ہندوستانی جدوجہد) وشارٹ، لندن، 1935
(18) بیسنٹ، اینی: ہاؤ انڈیا راٹ فار فریڈم
(ہندوستان نے آزادی کی جدوجہد کیسے کی) تھیا سوفی کل پبلشنگ ہاؤس مدراس، 1915
(19) پارکھ، ترہری، ڈی: سردار ولبھ بھائی پٹیل
نوجیون پبلی شنگ ہاؤس، احمد آباد، جلد اول 1953
(20) پٹیل، جی، آئی: وٹھل بھائی پٹیل (لائف اینڈ ٹائم)
(وٹھل بھائی پٹیل۔حیات اور عہد) کتاب اول و دوم
(21) پٹیل، منی بین: لیٹرس ٹو سردار پٹیل (سردار پٹیل کے نام خطوط، نوجیون، احمد آباد، 1950
(22) پرساد، راجیند ر: گاندھی اِن چمپارن
(گاندھی چمپارن میں)، اس گنیس، مدراس، 1928، انڈیا ڈیوائڈ ڈ (تقسیم ہند) ہند کتابس لمیٹڈ، بمبئی، 1947 آٹوبائیوگرافی۔(آپ بیتی) بھارتی سدن، مظفر پور،

1947 ستیہ گرہ اِن چمپارن (چمپارن میں ستیہ گرہ) نوجیون پریس احمد آباد، 1949
(23) پولک، ایچ، ایس، ایل، بریلس فورڈ ایچ، این، پتھک لارنس: مہاتما گاندھی اوڈہمس پریس، لندن، 1949
(24) پولک، ملی گریہم: مسٹر گاندھی، دی مین
(مسٹر گاندھی: شخصیت) ایلن اینڈ اَن وِن، لندن، 1931
(25) پنجاب سب کمیٹی، انڈین نیشنل کانگریس: رپورٹس۔ جلد اول ودوم، لاہور، 1920
(26) پیارے لال: دی ایپک فاسٹ (رزمیہ برت) نوجیون پریس، احمد آباد، 1932
مہاتما گاندھی دی لاسٹ فیز (مہاتما گاندھی، آخری دور) جلد اول، نوجیون پریس احمد آباد، 1956
(27) تیندولکر: مہاتما، جلد اول نوپتہ جلد ہشتم، ٹائمز آف انڈیا پریس، بمبئی
(28) تیندولکر ڈی۔ جی، چیتھی راؤ ایم، مردولا سارا بھائی، وٹھل بھائک جھاوری (مدیران) گاندھی جی: ہز لائف اینڈ ورک (گاندھی جی کی حیات اور کارنامے) کرناٹک پبلی شنگ ہاؤس، بمبئی، 1944
(29) ٹامسن اینڈ گیرت: رائز اینڈ فل فل منٹ آف برٹش رول اِن انڈیا (ہندوستان میں انگریزی حکومت کا عروج اور حصول مقصد)
(30) ٹمپل ووڈ، لارڈ: نائن ٹرابلڈ ایسر (نو ہنگامہ خیز سال) کالنس، لندن، 1954
(31) ٹوکر، لفٹنٹ جنرل سر فرانس: وہائل میموری سروز
(جب تک یادداشت کام دے) کیل اینڈ کمپنی، لندن، 1950
(32) جارج، ایس۔ کے: گاندھیز چیلنج ٹو کرسچینیٹی
(عیسائیت کو گاندھی کا چیلنج) ایلن اینڈ اَن وِن، لندن، 1939
(33) جونس، ایم۔ ای: گاندھی لوز (گاندھی زندہ ہے)
ڈیو میکے کمپنی، نلیڈلفیا، امریکا۔ 1948
(34) جونس، ای اسٹیلے: مہاتما گاندھی، این انٹر پریٹیشن (مہاتما گاندھی ایک تعبیر) ہارڈ اینڈ

اسٹف ٹن، لندن، 1948
(35) جے پرکاش نارائن: گاندھی جیز لیڈرشپ اینڈ دی کانگریس سوشلسٹ پارٹی (گاندھی جی کی قیادت اور سودشلسٹ پارٹی)
(36) جیک، ہومر، اے: (تدوین) دی وٹ اینڈ وزڈم آف گاندھی (گاندھی کی بزلہ سنجی اور اقوال حکیمانہ) دی بیکن پرنس بوسٹن، 1951
(37) چتر ویدی اور ماجوری سائیکس: چارلس فری یر اینڈ ریوز
ایلن اینڈ ان ون، لندن، 1940
(38) چرچل، ونسٹن: دی سکنڈ ورلڈ وار (دوسری عالمی جنگ) جلد اول وسوم وچہارم، کیسل اینڈ کمپنی لمیٹڈ، لندن 1948، 1950، 1951
(39) چنتا منی، سی، وائی: اینڈ پالٹکس سنس دی میوٹنی
(غدر کے بعد ہندوستانی سیاست) این اینڈ ان وِن، لندن 1939
(40) دت۔ آر۔ پام: انڈیا ٹوڈے
(آج کا ہندوستان) پیوپلس پبلی شنگ ہاؤس، بمبئی، 1947
(41) دنت والا۔ ایم، ایل گاندھیزم ری کن سڈرڈ (گاندھی واد پر تازہ نظر) پدما پبلی کیشنز، بمبئی، 1944
(42) دوا کٹر آر آر کلچیز آف گاندھی جی
(گاندھی جی کی جھلکیاں) ہند کتابس بمبئی، 1949 سرو دے اٹس ٹیکنیک اینڈ ہسٹر؟
(سرو دے اس کی تکنیک اور تاریخ) ہند کتابس، بمبئی، 1946
(43) دھون جی، ان: دی پولیٹیکل فلاسفی آف مہاتما گاندھی (مہاتما گاندھی کا سیاسی فلسفہ)
نوجیون پبلی شنگ ہاؤس، احمد آباد 1951
(44) ڈیسائی، مہادیو: دی ڈائریز (ڈائریاں، یادداشتیں نوجیون پبلی شنگ ہاؤس، احمد آباد، 1951، دی ایپک ٹراونکور (ٹراونکور کارزمیہ) نوجیون پریس احمد آباد۔ 1931، دی گیتا اکارڈنگ ٹو گاندھی (گیتا گاندھی کی نظر سے) نوجیون پریس احمد آباد، 1946، مولانا

ابوالکلام آزاد ایلن اینڈ ان ون ،لندن، 1941 ،نیشنز وائس
(آوازقوم) نوجیون پریس احمد آباد، 1932 اے راجپس اسٹرگل
(ایک دیانت دار جدوجہد) نوجیون پبلی شنگ ہاؤس ،احمد آباد، 1951 دی اسٹوری آف
باردولی (داستان باردولی) نوجیون پریس ،احمد آباد، 1929
(45) دیش پانڈے، پی سی: گاندھیانہ
نوجیون پبلی شنگ ہاؤس احمد آباد، 1948
(46) ڈس آرڈرس انکوائری کمیٹی (ہنٹرس کمیٹی): رپورٹ ،کلکتہ 1919
(47) ڈنکن ،رونالڈ: سلیکٹڈ رائٹنگز آف مہاتما گاندھی۔
(گاندھی کی منتخب تحریریں) فیبر اینڈ فیبر ،لندن، 1952
(48) ڈوک، جوزف: ایم۔کے گاندھی جی اے نیشن اینڈ کمپنی، مدراس، 1909
(49) راج گوپالا چاری، سی: دی نیشنز وائس (آوازقوم)، احمد آباد، 1932
(50) رادھا کرشنن، ایس: (تدوین) مہاتما گاندھی۔ اسیز اینڈ ریف لک شنز (مہاتما گاندھی۔
مضامین اورخیالات) ایلن اینڈ اَن وِن، لندن، 1939
(51) رام چندرن، جی: اے شیف آف گاندھی اینکڈ وٹس، ہند کتابس، بمبئی، 1946
(52) راؤ، آر۔وی: گاندھین انسٹی ٹیوشنز آف واردھا (وردھا)
(وردھا کے گاندھیائی ادارے، تھیکرس، بمبئی 1947
(53) رولاں، رومین: مہاتما گاندھی۔ ایلن اینڈ ان ون لندن، 1924
(54) زکاریاز، ایچ۔سی۔ای رینسنٹ انڈیا
(احیاپذیر ہندوستان) ایلن اینڈ اَن وِن، لندن، 1933
(55) سائمن: ریٹراسپکٹ (پس منظر)، ہچن سن، لندن، 1952
(56) سمتھ، ڈبلو۔سی: ماڈرن اسلام اِن انڈیا
(ہندوستان میں جدید اسلام) وکٹر گولنز، لندن: 1946
(57) سمٹس، جے۔سی: جان کرسچین سمٹس کیسل اینڈ کمپنی لمیٹڈ، لندن، 1952

(58) سیتلواد: رکلک سنز اینڈ ریف لِک شنز (یادداشتیں اورتصورات) پدما پبلی کیشنز، بمبئی، 1946

(59) شر وڈ، رابرٹ۔ای: دی وہائٹ ہاؤس پیپرس آف ہیری ایل۔ہاپ کنس (جلد دوم)
ہیری ال ہاپ کنس کے وہائٹ ہاؤس کاغذات، لندن، 1949

(60) شری دھرنی، کے: وار ودھاوٗٹ والے لینس
(ہنسا کے بغیر جنگ) ہارکورٹ پریس اینڈ کمپنی، نیویارک، 1939

(61) شکلا، چندراشنکر: (مرتب) ان سی ڈینٹس آف گاندھی جیز لائف (گاندھی جی کی زندگی کے واقعات) وورا اینڈ کمپنی، بمبئی، 1949

(62) عظیم حسین: فضل حسین، لانگ مینس، گرین اینڈ کمپنی لمیٹڈ، بمبئی، 1946

(63) فشر، لوئی: اے ویک ودھ گاندھی
(گاندھی کے ساتھ ایک ہفتہ) ڈول، سلون اینڈ پیپرس، نیویارک، 1942، دی لائف آف مہاتما (حیات مہاتما) ہارپرس اینڈ برادرس، نیویارک، 1950

(64) کالیلکر، کاکا: اسٹرے گلمپسز آف گاندھی: این انٹر پر یٹیشن (گاندھی کی متفرق جھلکیاں: ایک تعبیر) نوجیون پبلی شنگ ہاؤس، احمد آباد، 1950، ٹو، اے گاندھین، کیپی ٹلسٹ (ایک گاندھیائی سرمایہ دار کے نام) (جمنالال بجاج کے ساتھ گاندھی کی مراسلت) ہند کتابس، بمبئی، 1951

(65) کانجی، دوارکاداس: گاندھی تھرومائی ڈائری لیوز
(گاندھی میری ڈائری کے اوراق کے آئینے میں) بمبئی۔1950

(66) کرپلانی، جے۔جی: دی گاندھین وے
(گاندھیائی طریقہ) وورا اینڈ کمپنی، بمبئی، 1938

(67) کرپلانی، کے۔آر: ٹیگور، گاندھی اینڈ نہرو (ٹیگور، گاندھی اور نہرو)، ہند کتابس، بمبئی 1947

(68) کرشن داس: سیون منتھس ودِھ مہاتما گاندھی (مہاتما گاندھی کے ساتھ سات مہینے) اس

گنیسن، مدراس، 1928

(69) کوپ لینڈ، آر: دی کانسٹی ٹیوشنل پرابلمس ان انڈیا: اے ای اسٹیٹ منٹ (ہندوستان کے آئینی مسائل: تازہ وضاحت) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن و بمبئی، 1944

(70) کوٹ مین، جے: انڈیا اِن 26-1925، 27-1926، 28-1927، 29-1928 (ہندوستان میں) کلکتہ

(71) کیٹ لن، جارج: دی پاتھ آف مہاتما گاندھی (مہاتما گاندھی کا راستہ) میکڈانلڈ اینڈ کمپنی، لندن، 1948 کیمپ بل جانسن، ایلن: مشن وِدھ ماؤنٹ بیٹن (ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مشن) رابرٹ ہیل، لندن، 1941

(72) گاندھی، ایم، کے: باپوز لیٹرس ٹو، میرا (48-1928)

(باپو کے خطوط میرا کے نام) (48-1928) نوجیون پریس احمد آباد، 194: کنس ٹرکیٹو پروگرام (تعمیری پروگرام)، نوجیون پریس، احمد آباد، 1941 ڈلھی ڈائری (دلّی ڈائزی) نوجیون پبلی شنگ ہاؤس، احمد آباد، 1948 اکنامکس آف کھادی (کھادی کی اقتصادیات نوجیون پریس احمد آباد، 1941 اِتھی کل ری جن (اخلاقی مذہب) اس گنیشن، مدراس، 1922 فار پے سی فسٹس (امن پسندوں کے لیے) نوجیون پبلشنگ ہاؤس، احمد آباد، 1929 گاندھی جیز کرسپانڈنس ودھ گورنمنٹ (حکومت سے گاندھی کی خط وکتابت) نوجیون پبلشنگ ہاؤس، احمد آباد، 1945 اے گائڈ ٹو ہیلتھ (رہنمائے صحت) اس گنیشن، مدراس، 1921 ہری جن نوجیون پریس، احمد آباد، 40-1933، 1942، 1946 ہندسوراج نوجیون پریس، احمد آباد، 1938، 14-1904، ناٹال نان وائلنس ان پیس اینڈ وار، نوجیون پبلشنگ ہاؤس، احمد آباد، حصہ اول، 1945 حصہ دوم 1949 راولٹ بل اینڈ ستیا گرہ (راولٹ بل اور ستیہ گرہ)

جی اے نیٹسن اینڈ کمپنی، مدراس، 1919، ستیا گرہ

نوجیون پبلشنگ ہاؤس، احمد آباد، 1951، ستیا گرہ اِن ساؤتھ افریقہ (جنوبی افریقہ میں ستیا گرہ) اس گنیشن، مدراس، 1928، سلف رسٹرینٹ ورسز سلف رِلائنس، (ضبط نفس

بنام عیش دوستی) نوجیون پبلشنگ ہاؤس، احمد آباد، 1947 ، ہسٹری آف ستیا گرہ آشرم، فرام یرودامندر، سنٹ پرسنٹ سودیشی، اسپیچز اینڈ رائٹگر۔
(ستیا گرہ آشرم کی تاریخ: یرودامندر سے، سوفی صد سودیشی، تقریریں اورتحریریں) جی۔ اے۔نٹیسن اینڈ کمپنی، مدراس، 1933، دی اسٹوری آف مائی اکس پری منٹس وِدٹرتھ (تلاش حق میں تجربات کی داستان) نوجیون پبلشنگ ہاؤس، احمد آباد، 1945، ٹوآشرم

......

(آشرم کی بہنوں کے نام) نوجیون پریس، احمد آباد، 1952، ٹوائے گاندھین کیپٹلسٹ
(گاندھیائی سرمایہ دار کے نام) ہند کتابس، بمبئی، 1951 ٹو دی اسٹوڈنٹس
(طالب علموں کے نام) نوجیوان پبلشنگ ہاؤس، احمد آباد، 1949، اِنٹوِدس لاسٹ
(آخرکار) نوجیون پبلشنگ ہاؤس، احمد آباد، 1951 وِمن اینڈ سوشل اِن جسٹس، نوجیون پریس، احمد آباد، 1942 ینگ انڈیا نوجیون پریس احمد آباد32-1919 ، ینگ انڈیا گنیسن، مدارس، جلد اول ودوم وسوم (22-1919ء، 26-1924، 28-1927)
(74) گاندھی، مانو بہن: باپو۔ مای مدر
(باپو۔ میری ماں) نوجیون پبلشنگ ہاؤس، احمد آباد، 1949
(75) رچرڈ۔ لی: اے ڈسپلن فارنان وائےلنس
(اہنسا کے لیے ایک انضباط) نوجیون پریس، احمد آباد، 1941، دی پاور آف نان والے لنس (اہنسا کی طاقت) نوجیون پریس، احمد آباد
(76) گورنمنٹ آف انڈیا: کانگریس رِسپانسی بلٹی فاردی ڈسٹربینسز (فسادات کے لیے کانگریس کی ذمہ داری) نئی دہلی، 1943، گاندھین آوٹ لک اینڈ ٹکنیکس (گاندھیائی نقطۂ نظر اور تکنیک) نئی دلّی
1953: ہومیج ٹو مہاتما گاندھی (مہاتما گاندھی کو خراج تحسین) نئی دہلی 1948، اسپیچز بائی لارڈ ارون (لارڈ ارون کی تقاریر) جلد اول ودوم، شملہ، 1930، 1932
(77) لاجپت رائے، لالہ: آئیڈیلس آف نان کوآپریشن

(عدم تعاون کے نصب العین) اس گنیشن، مدراس، 1924 ان ہے پی انڈیا (ناخوش ہندوستان) بنا پبلی شنگ کمپنی، کلکتہ، 1928

(78) لسٹر میوریل: انٹرٹیننگ گاندھی

(گاندھی کی میز بانی) آئر لانکلس اینڈ واٹسن لندن 1932

(79) لمبی: ٹرانسفر آف پاور (انتقال اختیارات) ایلن اینڈ ان ون، لندن، 1954

(80) مارکوئی آف ریڈنگ: روفس آئی نرکس، فرٹ مارکوئی آف ریڈنگ (روفس آئزکس، پہلا مارکوئی آف ریڈنگ) ہچن سن اینڈ کمپنی، لندن، 1945

(81) ماٹیگو، اینڈ ون، اس: این انڈین ڈائری

(ایک ہندوستانی روزنامچہ) ولیم ہائن مین، لندن، 1930

(82) مترا۔این۔این: (ناشر) انڈین اینول رجسٹرڈ

(سالانہ ہندوستانی رجسٹر) کلکتہ

(83) مسانی، آر، پی: دادا بھائی نوروجی

ابلن اینڈ اَن ون، لندن، 1939

(84) مشر و والا، کے جی: گاندھی اینڈ مارکس

(گاندھی اور مارکس) نوجیون پبلشنگ ہاؤس، احمد آباد، 1951

(85) مکرجی، بیریندر ناتھ: انڈین اسٹرگل فار فریڈم

(ہندوستان کا جہاد آزادی) کتب، بمبئی، 1946

(86) مہتا، اشوک اور پیڈ ردھنڈ، اچیت: دی کمیونل ٹرینگل انڈیا

(ہندوستان میں فرقہ وارانہ مثلث) کتابستان، الہ آباد، 1942

(87) میرا بین: باپوز لٹرز ٹو میرا

(باپو کے خطوط میرا کے نام) نوجیون، احمد آباد، 1949

(88) ناگ، کالی داس: ٹالسٹائے اینڈ گاندھی

(ٹالسٹائے اور گاندھی) پستک بھنڈار، پٹنہ، 1950

(89) نابیر، سی، سنکرن: گاندھی اینڈ انارکی
(گاندھی اور براج) ٹیگور اینڈ کمپنی مدراس، 1921
(90) نہرو، جواہر لال نہرو: این آٹو بایوگرافی
(ایک خود نوشت سوانح) جان لین، لندن، 1936، مادی ڈِس کوری آف انڈیا
(ہندوستان کی بازیافت) سنگت پریس، کلکتہ، 1941، ایٹین منتھس اِن انڈیا
(ہندوستان میں اٹھارہ مہینے) کتابستان، الہٰ آباد، 1938
دی یونٹی آف انڈیا (ہندوستان کی وحدت لنڈ سے ڈرمنڈ، لندن، 1941
(91) نیّر، سوشیلا: کستوربا۔ ویلنگٹن، پینی سلوانیا، ہنڈل ہل، 1948
(92) واکر، رائے: سورڈ آف گولڈ
(سونے کی تلوار) انڈین، نڈی ہنڈنس یونین، لندن، 1945
(93)...... بھارتی کوارٹرلی: گاندھی میموریل پیس نمبر (گاندھی یادگاری من نمبر شانتی نکیتن
1949،
(94) ووڈرف، فلپ: دی گارجینس (محافظین) جونیتھن کیپ، لندن، 1955
(95) ہارڈ نگ: مائی انڈین ایئرس
(میرا ہندوستانی زمانہ) جان مرے لندن، 1948
(96) ہندوستانی تعلیمی سنگھ: بیسک نیشنل ایجوکیشن
(بنیادی قومی تعلیم) نصاب، سیوا گرام، 1939 ایجوکیشنل رکنس ٹرکشن (تعلیمی تعمیر جدید)
سیوگرام، 1940
(97) ہندوستان ٹائمس: انڈیا اَن رکن سائلڈ
(ناراض ہندوستان) دلّی، 1943
(98) ہنگورانی، اے۔ پی: (مرتبہ ومطبوعہ درکراچی) ٹو دی اسٹوڈینٹس (طلبہ کے نام)
1935، ٹو دی ہندوز اینڈ مسلمز (ہندوؤں اور مسلمان کے نام) 1942
ٹو دی پرنز اینڈ دیر پیپل

(والیان ریاست اور اُن کی رعایا کے نام)1942 ٹو دی پروٹیگونسٹس آف پاکستان)
(پاکستان کے علم برداروں کے نام)1947
(99)ہوائے لینڈ، جان، ایس: انڈین کرائی سس
(ہندوستانی بحران)میک ملن، نیویارک، 1944
(100)یاجنک، اندولال، کے: گاندھی ایز آئی نیوہم
(گاندھی، جیسا میں نے انھیں پایا)، دلّی، 1945